انتساب

زہرا حیدر کے نام

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے، تندمزاج اور غصیلہ
اپنے موسموں اور اپنے غیض وغضب کا مالک
تباہ کن..
وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے.. سمندر نے ہمیں گھیرا رکھا ہے
خاتمہ کہاں ہے.......... بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے.....
خاتمہ کہیں نہیں ہے.. صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا....
یا غلط چیزوں کی تمنا کا..... یا غلط چیزوں کے خوف کا
یہ لمحے مستقل ہیں.... جس طرح وقت مستقل ہے

ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراوں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی ازیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا
لوگ بدل جاتے ہیں.. مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجودگی میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے
میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے
اور نا کے واسطے جو ابھی پچھتانے کے لے پیدا نہیں ہوئے
پچھتاوے کا گل سرخ
جو ایک ایسی کاتب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی
آگے بڑھو مسافروں ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النواع زندگیاں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو
آگے بڑھو.. تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا

یا جو دوسرے ساحل پر اترو گے

اس لمحے کہ.. دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے

مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو

یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں.. جانو

کہ موت کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر

بھی مرکوز ہو.. [اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے]

وہ محض ایک کرم ہے

جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہو گا

کرم کے پھل کا خیال نہ کرو آگے چلو

اور مسافروں اور ملاحو..

تم جو گھاٹ پر اترو گے اور

تم جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے

یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی یہ تمہاری منزل ہے

کرشن نے ارجن سے میدان جنگ میں کہا..

الوداع نہیں بلکہ آگے بڑھو.

مسافرو.......

[ٹی...ایس..ایلیٹ]

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

سے کم ہوگئی تھی، گو کہ اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے تھے.. برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے، اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کے ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں..ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی..گوتم کو خیال آیا گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں..اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا، آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا، شراوتی یہاں سے پورے پچیس کوس دور تھا اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پار کرنی تھی گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ان کے ہنسنے کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں،لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں، گوتم نے سوچا، انہیں بھلا کونسے مسئلے حل کرنے ہیں، اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے.... خصوصا اس کیسری ساڑھی والی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا..اسکے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی ..اسکے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھنویں.قریب پہنچکر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہو گیا

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا کوئی ودیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا..ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں ان میں چولھے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن کر گرا، اس نے ندی کی اور دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم نہروں کے خلاف ہاتھ پاوں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا

بڑی کٹھن زندگی ان بے چاروں کی ہوتی ہوگی..نرملا کو اپنے بھائی کا خیال آ گیا .جو کہ اس طرح کی ان گنت ندیاں چٹیل میدان اور دشوار گزار پہاڑیاں عبور کر کے بہت دور تکشلا گیا ہوا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا

جب یہ لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے..تیسری لڑکی نے بے دھیانی میں پوچھا..اس لڑکی کا نام سروجنی تھا

ہوتا کیا ہے جھک مارتے ہیں...کسی نئے دھرم کا او شکار کر لیتے ہیں ے کسی نئے فلسفے کا پرچار شروع کر دیتے ہیں..نرملا نے جل کر جواب دیا..اس کا اکلوتا بھائی تکشلا میں ریاضی اور صرف ونحو سے سر کھپانے کی بجائے یہاں ہوتا تو کیا چمپک اس سے بیاہ نہ کر لیتی

باہمن بچارے بھی کیا کریں، پڑھیں نہیں تو کہاں جائیں پڑھا تو نا کے بھاگیے میں لکھا ہے سروجنی نے منہ لٹکا کر کہا

ندی کے وسط میں پہنچا..تو بارش کی دوسری بوند گوتم کے سر پر آن گری برسات کی وجہ سے سرجو کا پاٹ بے حد چوڑا ہو گیا تھا سون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ جسے پاٹلی پیر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ پیر کر عبور کیا تھا، اس نے پیرتے ء پیرتے پلٹ کت ایک بار دیکھا، گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی مو

جو تھی جس کے بالوں میں چمپ کا پھول تھا ان لوگوں کو مینہ میں بھیگنے کا بھی ڈر نہیں ..گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہمک ہو گیا سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے، چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھا رہے تھے کنارے پہ پہنچ کر گوتم نے اپنے کپڑے نچوڑے اور ناتراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے مندر میں گیا جس کے ایک کونے میں وہ اپنا زادِ راہ چنڈی دیوی کو سونپ کر ایودھیا گیا تھا، ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اس کے موقلم تھے اور سفید ریشم کے چند ٹکڑے، اس کا کمبل تھا، ایک سفید رنگ کی دھوتی اور چمڑے کے چپل ..اس نے بے پروائی سے اپنی پوٹلی اٹھائی ..پیر صفا کر کے چپل پہنے اور مندر سے باہر نکل آیا چاروں اوڑ بڑا سناٹا تھا اور مندر کے آنگن میں تنہا اسے بڑا ڈر لگتا تھا..کیسی خوفناک بات ہے..فی شکل برہما جب شکل میں ظاہر ہوتا تو اسے گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے؟ کیا انسان کو دوسرے کے وجود پر اعتماد نہیں ؟ گوتم نیلمبر نے خوف کے جذبے کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا تھا، زندگی کا خوف..موت کا خوف..زندہ رہنے کا خوف..رگوید میں لکھا تھا کہ ابتدا میں خودی تھی جو کہ پرش کی شکل میں ظاہر ہوئی.اس نے چاروں اور دیکھا اور سوائے اپنے اسے کوئی نظر نہ آیا .اس نے کہا کہ یہ میں ہوں..چنانچہ وہ اپنے آپ کو میں سمجھنے لگا..اسے ڈر لگتا تھا چونکہ وہ تنہا تھا اسلیے جو اکیلا ہوتا ہے اس سے ڈر لگتا ہے.پھر اسنے سوچا کہ میرے سوا کوئی موجود نہیں پھر مجھے کاہے کا ڈر ہے..؟لہذا اس نے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا مگر

اسے مسرت حاصل نہ تھی

کیونکہ تنہائی میں اداسی ہوتی ہے

اور اداسی سے ڈر لگتا ہے ..مجھے اپنے روح کی تنہائی سے ڈرنا نہیں چاہیئے. گوتم نے اپنے آپ سے کہا.

مندر بہت پرانا تھا، آس پاس گوتم کو کوئی پروہت یا پجاری بھی نظر نہیں آیا تھا جس سے وہ پوچھتا کہ شراوستی جانے کے لیے کونسا راستہ اختیار کرے ۔یہاں سے کھیت ختم ہوتے تھے اور آگے شیشم کے گھنے جنگل تھے اور ڈھاک کے جھنڈ اور بیڑ اور ان گنت ندی نالے اور ان سب کو عبور کرکے اسے اپنے آشرم واپس پہنچنا تھا ہمندر کی سیڑھیاں اتر کر وہ گاؤں کی سمت بڑھا سرجو کے پار ایودھیا کی روشنیاں جگنوؤں کی ایسی جھلملا رہی تھیں. بارش کی دھند میں سرا منظر نیلا اور اودھا سا دکھائی دیتا تھا.جس میں نارنجی رنگ کی دھاریاں ایسی پھیل گئی تھیں. گوتم نے آبادی میں پہنچ کر دو تین دروزاوں پر دستک دی. رات کے کھانے کے لیے اسے صرف دال درکار تھی. ایک لپے پتے کچے مکان کے دوار پر روشنی جل رہی تھی ......ادھیڑ عمر کا گرہست اس روشنی میں بیٹھا کچھ پڑ رہا تھا.. برآمدے کے باہر گھپ اندھیرا تھا ...گوتم کی آواز سن کر وہ اسے شاکیہ منو کا کوئی بھشکو سمجھا..پھر وہ چراغ اٹھا کر باہر لایا ..اور اس کے اجالے میں اسے گوتم کے سفید کپڑے نظر آئے

آجکل یہاں شاکیہ منی کے بھکشوں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے میں سمجھا کہ تم انہی میں سے ہو اس نے رسان سے کہا.... جیسے یہ ہوا چلی ہے لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی گھر بار چھوڑ کر جنگل بسا رہی ہیں

مجھے تھوڑی سی دال دے دو

گرہست نے چراغ برآمدے کی منڈیر پر رکھا اور اپنی بی بی کو آواز دی اس کے بعد پھر سے باتون کا سلسلہ چل نکلا..رکمنی ..ایک برہمن برہمچاری ہمرے دوارے پر آئے ہیں..

پھر وہ گوتم سے مخاطب ہوا..سامنے نگر میں ایک بٹیا ہیں..رانی رینو کا ایسی روپ وان..کل میری بی بی جب ہاٹ کے لیے نگر گئی تو راج نواس کی داسیوں سے سنا کہ وہ بٹیا بھی کسی ویہار میں جانے والی ہیں.......یہ اندھیر دیکھو....اتنے میں اس کی بی بی آٹا دال لے آئی...جو گوتم نے اپنی چادر پھیل کر اس سے لے لیا اور اسے دعا دی گرہنی نے جھک کر اسے پرنام کیا اور اندر چلی گئی اس کامیاں کوش دلی سے ہنستا رہا..اچھی ہوا چلی ہے..میں تو کہتا ہوں کہ ماں باپ..اب اپنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کی فکر سے بھی نش چنت ہو گئے..اس نے اپنی بات جاری رکھی

اناج کی پوٹلی باندھنے کے بعد گوتم ذرا کی ذرا برآمدے کے کھمبے سے ٹکا..یہ گرہست بڑا خوش مزاج معلوم ہوتا تھا گوتم کا جی چاہا کہ کچھ دیر رک کر اس سے بات چیت کرے مگر اس کا مطلب تھا کہ وہ عیش و آسائش کی طرف راغب ہو رہا ہے...چنانچہ اس نے فوراً اس خیال کو دل سے نکال کر پھینکا..گو یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ بودھ طالب علموں کا گروہ ادھر آیا ہوا ہے..اگر کہیں مل گئے تو رات اچھی گزر جائے گی اسے بودھ طالب علموں اور فلسفیوں سے بحث مباحثہ کرنا اچھا لگتا تھا

وہ لوگ کدھر گئے ہیں..؟ اس نے گرہست سے پوچھا..یہ تو مجھے پتا نہیں

..باہمن تم اندر کیوں نہیں آجاتے..آؤبیٹھو..تمہاری سیوا تو میرا دھرم ہے

نہیں اب میں چل ہی دوں..گوتم نے جواب دیا..وہ اپنی اس عزت وتکریم کا عادی تھا.چلتے پھرتے ہر سے اس کا ادب کیا جاتا..سڑک پر سے گزر رہا ہوتا تو راہ گیر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے..بڑے بڑے شہزادے اس کی خاطریں کرتے .غریب کسان اسے آنکھوں پر بٹھلاتے..محض اس لیے کہ وہ طالب علم تھا اور علم کا محافظ

گرہست نے چراغ منڈیر پر سے اٹھایا اور اندر جا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا گوتم چند لمحوں تک اندھیرے میں کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا.اندر بچے کھیل رہے تھے..گرہست کی بیوی سانولی دبلی سی لڑکی جس نے اسے آٹا لا کر دیا تھا.چولہے کے آگے بیٹھی تھی..دروازے کی چوکھٹ پر پیاری مینا کا پنجرہ لٹک رہا تھا..کس قدر پرسکون منظر تھا،اس سے بھی اسے ڈر لگا..گرہیا گنی کے مدھم اجالے میں جگمگاتی ہوئی لڑکی ، جو کہ اس معمولی صاف ستھرے کچے مکان کی مالکن تھی..برآمدے پر جھکے ہوئے کیلے کے تھنڈے پتے..پروں میں چونچ دے کر سوتی ہوئی مینا..گر یہہ اگنی یونہی جلتی رہتی ہے اور ایک دن چتا کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چتا کی آگ کے انگاروں سے ایک اور گھر کے چولہے کی بنیاد پڑتی ہے، یہی آگ ون پوستھ گھر سے لے کر نکلتا ہے..یہ سارے دور ہر انسان پر گزرتے ہیں..اس پر بھی گزریں گے..مناظر کا ے ہوتے ہیں..وہ کبھی سمجھ ہی نہ پایا..شراوتی میں اس کا سہ منزلہ مکان تھا جس کے برآمدے کے چوبی کھمبوں پر رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے ..اس سڑک پر اس کا مکان سب سے اونچا تھا..اس کا باپ بہت دولت مند

آدمی تھا..اور اس کی بہن کا بیاہ حکومت کے ایک اعلی عہدے دار سے ہوا تھا یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا..فارغ التحصیل ہونیکے بعد اب ساری دنیا اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہو گی وقت اس کا اپنا تھا.فراخ دلی ءکے ساتھ وہ فلسفوں کو پرکھتا اور سوچتا.مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کیا تھا کہ وہ چیزوں سے خوفزدہ تھا..بارش میں بھیگتی لڑکیاں جو کہ اس پار گھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں...برگد کا یہ جنگل جس میں نارنجی رنگ کا لباس پہنے بھکشوؤں کی ٹولی کہیں گھوم رہی ہو گی اس ادھیڑ عمر کے گرہست کی بیوی جس کا نام رکمنی تھا یہ سب چیزیں کیوں تھیں

آبادی سے لوٹ کر وہ مندر کی طرف واپس آیا..آنگن میں پہنچ کر اس نے زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر چولہا بنایا..اور مٹی کی ہانڈی میں چاول ابلنے کے لیے چڑھا دیے

کچی پکی دال بھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار سے پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا ..سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی..چاند بہت مدھم تھا اور کہیں بادلوں میں چھپا ہوا تھا..ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی.سرا جنگل اندھیرے میں سائیں سائیں کر رہا تھا..صبح سویرے اٹھ کر اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے..اس نے سوچا..اسی وقت دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی چند لمحے منتظر رہنے کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ گیا...نیچے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا..اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی

تم کون ہو بھائی؟...نیچے سے کسی نے پوچھا

میں ہوں۔۔گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا

تمہارا کیانام ہے؟

میں کا کوئی نام نہیں ہوتا ؟

تفریق کے لیے نام ضروری ہے۔۔۔۔

شراوستی کے جن پنڈتوں کے ہاں پیدا ہوا وہاں کے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا نام گوتم رکھا گیا تھا

بھائی گوتم نیچے آجاو

تم خوداوپر کیوں نہیں آتے

اونچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے

ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تمہیں کیا معلوم جسے تم اونچائی سمجھ رہے ہووہ پاتال سے بھی گہری ہو

بھائی۔۔۔۔اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا، کیاتم بھگوت ہو؟

نہیں مگر تم مندر سے نیچے نہیں اترو گے

نیچے سانپ ہونگے اور کیڑے مکوڑے ۔۔اور کیڑوں مکوڑوں سے دوستی کرنا ابھی میں نے شروع نہیں کیا۔۔۔اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا۔۔۔۔۔ممکن ہے کہ یہ آوزا سی جین سنیاسی کی ہو۔۔ پاٹلی پتر کے شاہی خاندان نے جین عالموں کو بہت سر چڑھا رکھا تھا۔۔اور باضابطہ ان کے سدھانت کا مطالعہ کرتے تھے میں یہاں پتھر کے فرش پر لیٹا ہوں۔۔۔تم بھی یہیں آجاو۔۔اس نے باآواز بلند پھر کہا۔۔۔۔۔سوفسطائی۔۔۔شک پرست۔۔دہریے۔۔منطقی۔۔جنگلوں جنگلوں بحثیں کرتے مل جاتے تھے۔۔۔۔۔یہ بھی ان

میں سے کوئی دل جلا ہے.....گوتم نے سوچا.....ان گنت منطقی گنگا کی وادی میں گھومتے پھرتے تھے..ماہرین کلام روایتی مذہب پر حملہ کرتے.....آراء اور راشیاء کی ضیافت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے...ان میں سے بہت سے مابعد الطبیعاتی نظریات کے حامل تھے..اکثر مادہ پرست تھے..جین اور بودھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سوفسطائی بھی..انہی گھنے گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے بادشاہ اور شہزادے جٹائے بڑھائے سادھوں کی سی زندگی گزار رہے تھے..اور پچھلی صدی میں کپل وستی کے شہزدادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا...ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہلے سے موجود تھے..خیالات کی اس سلطنت میں انہوں نے بھی..جو شاکیہ منی سدھاوتے کہلائے.....فلسفے کی ایک اور نوآبادی قائم کر دی تھی

باسٹھ مختلف نظریات ......اور زندگی ایک ہے ....انسان تنہا ہے ... گوتم نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح لیٹا رہا......

تم کون ہو بھائی....کچھ دیر کے بعد گھبار کر اس نے دوبارہ آواز دی..اب یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں....گوتم اگر تم اپنی اصلیت مجھ سے چھپانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی آپتی نہیں......

نام آوازوں کی ایک سسنشٹی ہے بھائی گوتم...اور ہری شنکر کی آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں..کیونکہ یہی میرا نام ہے....

بھائی ہری شنکر کیا تم کرشن واسودیو کے بھگت ہو؟

نہیں میں اس سے اتر پچھم کی اور سے آرہا ہوں..جہاں شیوا کی ارادھنا کی

جاتی ہے ..گوتم میں نے کاشمیرا کی برف میں بڑی بڑی خوبصورت جگہیں دیکھی ہیں..بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ زندہ رہنا بڑی نعمت ہے

میں نے زیادہ سیاحت نہیں کی مجھے اس کا بڑا دکھ ہے

صرف اسی کا دکھ ہے تم نے دکھ کے فلسفے پر کتنا غور کیا ہے بھائی گوتم ؟

آجکل میں اسی پر غور کر رہا ہوں

جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ہم لوگ فلسفہ اور ساہیتہ کی بجائے گنت ودیا اور قانون اور طبیعات پر زیادہ دھیان دیا کرتا تھے ...لیکن رنج سے میرا بڑا گہرا سمبندھ ہے گوتم نیلمبر

کیا تم اجینی سے آرہے ہو.....

نہیں.....اس سے بھی بہت آگے سے

تکشلا ؟

ہاں.......

میرا وہاں جانے کو بہت جی چاہتا ہے.تم نے اپنی تعلیم ختم کر لی ؟

ہاں پھر میں بہت بڑے سفر پر نکل گیا.اپار سمندر کے کنارے میں نے دوارکا کے درشن کیے...میں متھرا گیا...برھم ورتھ میں استھا کے کھنڈر میں نے دیکھے..گوتم میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے...کیا تم کبھی وقت کے خوف سے لرزے ہو

ہاں گوتم نے آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا، اندھیرے مندر کے برآمدے پر جھکے ہوئے پیپل کے پتے سرخ نظر آرہے تھے

کیا تم بودھ ہو

ہاں تمہیں کیسے معلوم ہوا

شام جب میں بھیک مانگنے کے لیے گاؤں میں گیا تھا تو ایک گرہست نے مجھے بتلایا تھا کہ تم لوگوں کی ایک ٹولی ادھر آئی ہوئی ہے

تم......بھی.....ہو؟

میں نے اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھ چھوڑا ہے

اور دل کا......؟ دل اور ذہن کا کیا سمبندھ؟

میں تم کو ایک بات بتلاوں.....؟ اتنا کہتے کہتے دوسرا نوجوان منڈیر کود کر مندر کے برآمدے میں آ گیا. بحث کے جوش میں اس نے اپنے کھڑاووے اتر کر ایک طرف پھینک دیے اور چنڈی کے سامنے سے دیا روشن کر کے اس کی روشنی میں گوتم کو دیکھنے لگا، گوتم اٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا.. اس نے بھی دلچسپی سے نووارد کو دیکھا جو کہ بہت دور سے آ رہا تھا

تم یہاں کہیں آس پاس میں کاشی واشی میں پڑھتے ہو..؟ دوسرے لڑکے نے گوتم کے قریب پاوں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

میں شراوستی میں پڑھتا ہوں، کاشی کی پاٹ شالہ تو خالی مہا پنڈت تیار کرتی ہے

.

اور تم کیا بننا چاہتے ہو؟

یہی تو سمجھ میں نہیں آتا..

تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے گوتم نیلمبر..

تم بھی اس اندھیارے میں سے نمودار ہو کر مجھ سے یہی سوال کرنے آئے ہو ..؟ گوتم نے چڑ کر کہا.اب ہوا میں خنکی آ چلی تھی..جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا..جو سوجر پر سے بہتی ہوئی آ رہی تھی..اس کی جھونکوں میں چراغ کی لو جھلملا اٹھی..گوتم نے اپنے نئے ساتھی کو غور سے دیکھا..اس کا ذہین اور خوبصورت چہرہ گوتم کو مانوس سا نظر آیا ..گہری سایہ جڑی ہوئی بھنوئیں..کتابی چہرہ اور گھنگھریالے بال..یہ شکل میں نے پہلے کہاں دیکھی ہے؟ ابھی ابھی دیکھی ہے..گوتم نے ہڑ بڑا کر سوچا.اگر یہ گھنگھریالے بال منڈوا دے تو شاید کچھ مختلف معلوم ہو..ورنہ یہ تو جانا پہچانا سا چہرہ ہے

تم نے اپنا سر نہیں گھٹوایا...کیسے بھکشو ہو.گوتم نے ذرا بشاشت سے سوال کیا

میں نے بھی اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھ چھوڑا ہے

اور تمہارا سنگھ؟

میرا سنگھ اور میں دو مختلف چیزیں ہیں...میں آزاد ہوں.اور مزید آزادی کی تلاش میں مصروف

تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

نوجوان نے دریا کی سمت اشارہ کیا اس پار کا

اچھا..گوتم ذرا چونک کر اٹھ بیٹھا

تمہیں اتنا اچنبھا کاہے کے لیے ہوا؟ ہم سب کو کہیں نہ کہیں تو پیدا ہونا ہی ہے ..ممکن تھا کہ میں میمنس میں پیدا ہوا ہوتا اور تم یاوادیپ میں؟.....ہری شنکر نے تبسم کے ساتھ گوتم کو دیکھا

تم یہیں کے رہنے والے ہو اور اب بھکشو بنے اجنبیوں کی طرح گھوم رہے ہو

ہم سب ایک دوسرے کے لیے ازلی اور ابدی اجنبی ہیں

گوتم خاموش ہو گیا.. ہری شنکر.. اس نے اپنے دل میں کہا. تم بحث میں مجھے ہرا نہیں سکو گے. شا کیہ منی بھی آخر اسی کوشل دیس کی رہنے والے تھے. وہ شراوتی میں آ کر برسوں رہے. انہیں پروان نزی حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی، مگر سارا ملک ایک نئے نارنگی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا... اس کی تیوری پر بل آ گئے .. اس نارنجی ساری والی لڑکی کی یاد اس کے ذہن میں کوندی اور اسے بڑی کوفت ہوئی .. جب سے یہ ہوا چلی ہے لڑکیاں بھی گھر بار تج کر جنگل بسا رہی ہیں .. تمہیں ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حلیہ بنایا ہے؟ اس نے زرا جھنجھلا کر کہا. بھکشو کا فلسفہ اور تمہاری ساری پری بھاشا اپنشدوں میں موجود ہے. شا کیہ منی شروع سے آخر تک کپل کے نظریوں سے متاثر تھے .. خود بدھ کا لفظ وید سے نکلا ہے. کوئی چیز خیالات کی دنیا میں نئی کول اور غیر متعلق نہیں ہے. تم کا پر یوگ کیوں کرتے ہو..؟

ہری شنکر چپکا بیٹھا رہا.. پھر اس نے زرا مسکرا کر پوچھا. تم کو لڑکیوں کی کیا فکر ہے.. کوئی خاص لڑکی وِیہار میں جانے والی ہے.....؟

تم لوگ اس طرح ہنستے کیوں ہو.. دیکھو تمہارے آنند پر کیا بیتی تھی.. گوتم نے اور زیادہ چڑ کر کہا

گوتم نیلمبر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا.. ہری شنکر نے ٹانگیں اور پھیلا کر آرام سے لیٹے ہوئے جواب دیا

تم کاہے سے بھاگ رہے ہو... گوتم نے غصے میں پوچھا

تم کاہے کی تلاش میں ہو.. ہری شنکر نے کہا..میرے یہاں تو ساری تلاش ختم ہو چکی ہے

اگر میری درسگاہ میں اعلی اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں یہی کھڑاووں تمہارے ناک پر لگاتا...

ہری شنکر نے قہقہہ لگایا...اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں تمہیں اپنا دوست بنالیتا

تم خود پرست ہو

اور تم ذہن کے غرور میں مبتلا ہو

تمہیں ناٹک سے دلچسپی ہے؟ گوتم نے موضوع بدلا

تھی....مختصر جواب ملا

اچھا....مگر الفاظ کا ناٹک تو تم ہر سے کھیلتے ہو..ہری شنکر خاموش رہا..اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے گوتم جوش میں آ کر بولتا رہا.تین سو سال ہوئے تمہاری تکشلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پانی تھا..اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہو..الفاظ کو بھی ملتوی کر کے دیکھو

ہری شنکر کروٹ بدل کر کہنیوں کے بل لیٹ گیا..گوتم میں نے پانینی کی آٹھوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے..میں کاشمیرا کے مدرسوں میں گیا ہوں..جہاں سنسکرت کو مکمل بنایا جارہا ہے..میں نے یاونون کی بولی بھی سیکھی ہے اور پارسیکاون کی بھی ...لیکن اب میں الفاظ ختم کرنا چاہتا ہوں

کیونکہ... ہری شنکر کہتا رہا.. زبان... الفاظ وعدے کرتے ہیں جو کہ نبھائے نہیں جاتے.. خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں.. ان کے معنی کی کھوج میں بھاگنا شروع کیا تو بھٹک کر میں کہاں سے کہاں جا نکلا.. اسی وجہ سے گوتم سدھارتھ نے کہا تھا کہ...

لیکن گوتم نیلمبر نے ہری شنکر کی بات کاٹی .لیکن اوم کے تین حرفوں اور ساپا سا کے تین سروں کے درمیان .....تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے ...آواز آکاش کا ایک گن ہے

کہے جاؤ.. ہری شنکر بولا

برہسپتی مادہ پرست آکاش کو نہیں مانتے... تم تو مانتے ہو

مگر تمہارے ہمنام ... گوتم..... نے تو کہا تھا کہ اگر آواز ابدی ہے تو زبان سے پہلے ہی لفظ سنائی دے جانا چاہیے ... کیونکہ آکاش اور ہمارے کانوں کے درمیان کوئی روک نہیں ہے.. ہری شنکر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا

لفظ بھی ابدی ہے... گوتم نے جواب دیا. حرف م ہمیشہ سے موجود ہے یا حرف ن اس کو جب بھی ادا کیا گیا ہوگا اس کی آواز یہی رہی ہوگی.. جیمنی کہتا ہے کہ آواز اس کے لیے ابدی ہے کہ سننے کے بعد دماغ کو یاد رہتی ہے اور بیک وقت ہر جگہ موجود ہے اور کبھی ختم نہیں کی جاسکتی

اور اسی لیے ویدوں کو ..... کیونکہ وہ الفاظ ہیں .... کبھی رد نہیں کیا جاسکتا ؟... ہری شنکر نے نظریں اٹھا کر پوچھا

تم کیسے فلسفی ہو جو کہ الفاظ پر یقین نہیں رکھتے... گوتم نے جھنجھلا کر جواب دیا

.. پانی تمہارے تکشلا کے استاد کہا تھا اپنے یا دوسروں کے خیالات کے مظاہر صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں.. ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے .. الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاؤ گے؟ آواز الفاظ کا پراکرتک گن ہے... اور مادہ ابدی ہے... وید زبان کی شکل میں برہما ہے.. اور مادہ برہما ہے

وقت کو ابدیت سمجھ کر تم لوگوں نے بہت گڑ بڑ پھیلا رکھی ہے.. ہری شنکر نے دو بارہ فرش پر لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا

معنی اصل چیز ہے.... گوتم نے جواب دیا... پانی کا کہنا ہے کہ سارے الفاظ کا ماحاصل خالص وجود ہے ... ست.. اصلیت اور مختلف چیزوں کے لیے برہما کے الگ الگ نام ہیں .. وہ سامنے سے گزرتا ہوا بھورا سور .... گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایودھیا کی لڑکیاں... تم... ہری شنکر یہ سب مہمان آتما ہیں

تم تعجب ہے اب تک ویدانت سے آگے نہیں بڑھے

انت کے آگے اور کیا ہو سکتا ہے

تم ہی بتاؤ

پرم آتما اور جیو آتما میں اودیا کی وجہ سے دوئی قائم ہے... لہٰذ الفظ اور غیر لفظ دو برہما ہیں اور لفظ پر دھیان کر کے غیر لفظ کا انکشاف ہو سکتا ہے

وہ غیر لفظ میں خود ہوں... ہری شنکر نے کہا.. گوتم خاموش ہو گیا

علیت کا قانون بجائے خود مکمل ہے... کوئی چیز دوسری چیز کے مانند نہیں ہے .صرف اپنے لمحاتی وجود کے علاوہ کسی شے کا کسی شے سے کوئی تعلق نہیں، سمجھے .. سب وقتی ہے اور مصیبت ہے .. سرد کھم دکھم ؛؛؛ ہری شنکر نے کہا. جسم اور آتما دونوں فانی

ہیں..دونوں کے اکٹھا ہو جانے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا...آتما ابدی نہیں ہے..انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے..محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے...ایک لڑکی تھی...سو رہے ہو بھائی گوتم؟

نہیں کہے جاؤ

ایک لڑکی تھی..اس نے بھی مجھے ابدیت کا قائل کرنا چاہا تھا..وہ بھی ساپا سا میں زمنا و مکان کو محیط کرلیا کرتی تھی....وینا پر وہ صبح صبح بھیرو اور میگھ بجاتی...دوپہری کو جب ساری دنیا سونے کے رنگ میں رنگ جاتی....تب میں اس سے دیپک اور شری راگ سنتا....رات پڑے وہ ہنڈول گاتی..اس لڑکی کو سنگیت کا جنون تھا

تم نے گیت اور الفاظ ملتوی کردیے مگر سر رہیں گے...سر اٹل ہیں....گوتم بولا

کچھ دیر کے بعد ہری شنکر نے پھر کہنا شروع کیا..میں جب اتر کوشل کی سرحد پر پہنچا تو فلم استھان کے پہرے دار نے للکار کر مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آ رہے ہو؟ میں یہیں سے گیا تھا اور یہیں لوٹ کر آیا ہوں..میں نے جواب دیا اور یہی تم سب کا حشر ہوگا...اس چکر سے بچنے کی کوشش کرو

تم اس کا مطلب سمجھے..پہرے دار نے اپنے ساتھی سے کہا..یہ بھی کوئی فلسفی جان پڑتا ہے اور پھر دونوں کوڑیاں کھیلنے میں مصروف ہوگئے..مگر میں جب ایودھیا میں داخل ہوا تو مجھے پتا چلا کہ سر ابھی باقی ہیں..گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت زبردست ہے..ملک..بستیاں..نئے نئے لوگ..بھانت بھانت کی بولیاں..میں نے پاٹلی پتر سے لے کر پشکلروتی تک سارا راستہ یہی کھڑاووں پہن کر طے کیا ہے..یہاں سے کچھ فاصلے پر گومتی کے کنارے لکھشن ناوتی آباد ہے..جسے سری لچھمن نے بسایا تھا

..سنگم پر پریاگ ہے ..پھر کانیا کبج .ہستاپور اور تکشلا ..اس کے آگے سرحد کا شہر پشکروتی ..اس لمبی شاہراہ پر میں نے بہت طویل سفر طے کیا .مگر ہنڈول کے سر برابر میرا پیچھا کرتے رہے ..تم کئی سال میں تکشلا میں رہا اور انہیں بھلائے رکھا .یہاں لوٹ کر پھر وہ آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں ..تم مجھ سے لفظ اور آواز کی ابدیت کی بات کرتے ہو ..مجھ سے پوچھو ..مجھےمعلوم ہے یہ سب جگہوں کے سحر کا اثر ہے اصلیت کچھ نہیں ..سر دم دھم دھم

سنا ہے وہ پراچین ایودھیا کی رانی رینوکا ایسی خوبصورت ہے

کس کا ذکر کرتے ہو ..ہری شنکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا

پتا نہیں گوتم نے جواب دیا ..پھر وہ بھی آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ رہا

مقدس سرجو ..رگ وید میں بہنے والی ندی ..میری ماں .....نہ جانے کب تک اسی طرح بہتی رہے گی ..سامنے میرا شہر ہے ..ہری شنکر کی خوبصورت مدھم آواز اس کے کانوں میں آتی رہی ..خوبصورت ..شاندار ایودھیا ..کتنے زمانے سے اسی جگہ پر راتوں کو یونہی جگمگاتا رہا ہے ..کتنے جگ بیتے جب منو کا بیٹا اس کا پہلا بادشاہ بنا تھا ..اور شیو بھگت بھاگیرت اور ڈگ وجے فاتح عالم ..رام چندر ایودھیا ..اجکا ..برہم کا شہر ..جسے کوئی جیت نہیں سکتا .تم نے کبھی اس نگری کے رقاصوں اور سنگیت کاروں کو دیکھا ہے ؟یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو ؟راج محل میں بسنت کا تہوار منایا ہے ؟یہیں پر چمپک رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھر والے اور میری بہن میرے منتظر ہیں ..جس طرح سی کرشن کو اپنی بہن سبھدرا بڑی پیاری تھی ویسے ہی میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا .مگر میں نے اس کی محبت کو دوسری محبتوں اور

وفاداریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر او وچن لوٹ آیا......رام نے چودہ برس کے بن واس کے بعد لوٹنے کا وچن دیا تھا..میں بھی آیا ہوں..مگر سدھارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے آزاد کر دیا ہے....میری بہن...رام چندر کی بہن شانتا کے جیسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسی ایودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی..ایسے ہی نر ملا اور چمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں....دیکھو الفاظ نے پھر میرے ساتھ غداری کی ہے..اس نے اداسی سے بات ختم کی

گوتم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا..باہر درختوں پر بارش برسنا شروع ہو گئی تھی..برسات کا موسم ہے..یہ موسم سارے بھکشو وہاروں میں بسر کرتے ہیں ..گوتم کو خیال آیا..اس نے کروٹ بدل کر ہری شنکر سے پوچھا تم شرون کا زمانہ کہاں گزارو گے؟

پتا نہیں

تمہارے باقی دوست کہاں جا رہے ہیں؟

میرے ہم سفر.تمہارا مطلب ہے

ہم سفر ہی کہہ لو

یہ بھی معلوم نہیں

تکشلا تو برہمنوں کی درسگاہ ہے.تم وہاں کیسے پہنچ گئے

میں...میں تو پچھتاوں کے دیس بھی رہا ہوں..جہاں اتر کے نیلی آنکھوں والے سفید فام ولایتی شیو کی عبادت کرتے ہیں..میں نے ایراوتی [راوی] اور

چندر بھاگ [چناب] کی وادیوں کی سیر کی ہے ..میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں .. پورب میں ونگا تک گیا ہوں ..میں نے برہم پترا اور سندر بن اور چندرا دیپ کی دلدلوں میں جنگلی دھان اگتے دیکھے ہیں ..جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال ک ندھوں پر چھٹکائے مرگ نینی لڑکیاں ہرے بانوں کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور پریوں کی طرح گاتی ہیں ..گوتم زندگی کا پھیلاو بہت عظیم ہے ..اس وسعت سے بچتے رہو ...کائنات .....اوراس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوتی ہے ؟ کہاں جاتی ہے ؟ ہم کہاں پیدا ہوئے ؟ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں ..اور یہاں سے کہاں جائیں گے ؟ .تم جو برہما سے واقف ہو ۔ ذرا بتلاو دکھ یا سکھ کس کے حکم سے یہاں رہ رہے ہیں ؟وقت یا فطرت .....یا ..حادثے ..یا عناصر کو سمجھا جائے یا سے پر جوش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پرم آتما ہے ؟ ہری شنکر نے بات ختم کی

اپشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزدای میں پیدا ہوئی ہے ، آزادی موجود رہتی ہے اور آزادی میں سموجاتی ہے

وہی ابدیت ...ہری شنکر نے رنجیدہ آواز میں کہا ...آزادی اور ابدیت خودا یک قید نہیں ؟

بارش تیزی سے شروع ہوگئی ..دیا ہوا کے جھونکے سے بجھ چکا تھا ..شنکر نے اینٹوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا گوتم نے اپنی سفید چدر اوڑھ کر دیوار کی طرف کروٹ بدل لی ..دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ اندھیرے میں پلکیں جھپکاکیے ..پھر پروائی کے جھونکوں سے انہیں بھی نیند آگئی

اس رات گوتم کو عجیب عجیب خواب نظر آئے ،منڈی کی کوٹھڑی میں سے نکل کر

چنڈی دیبی اپنے گوری کے روپ میں چھن چھن کرتی باہر آئیں..پھر وہ کیسری ساری والی لڑکی مے تبدیل ہونا شروع ہوئیں..اس کے بعد ان کی شکل پھر مختلف نظر آئی.. پہلے وہ دلہن بنیں..ستی کے روپ میں مہادیو سے ان کا بیاہ ہوا..پھر پل کی پل میں ایک بوڑھی عورت..درگاہ سے بھی زیادہ خوفناک..آلتی پالتی مارے ان کے سرہانے آن بیٹھی..اور زور زور سے رونے لگی میری ماں..میری ماں..گوتم نے لرز کر کہا..لیکن بوڑھی عورت نے دانت نکوس کر جواب دیا..میں تمہاری ماں نہیں ..ارے میں نے تو ویشالی کی...اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ایک پہل درخت کی شاخ پر سے ٹوٹ کر آنگن میں آن گری اور گوتم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا.شنکر بڑے سکون سے سو رہا تھا.بارش تھم چکی تھی..ندی کے کنارے چنڈال کسی کی لاش مرگھٹ کی سمت لیے جا رہے تھے اور کشتیوں کی روشنی اندھیرے میں اگیا بھتال کی طرح چمک رہی تھیں..اس نے جلدی جلدی منتر پڑھنا شروع کر دیے..بہت دیر کے بعد اسے نیند آئی

منہ اندھیرے جب شنکر کی آنکھ کھلی..اس وقت گوتم چنڈی پاٹھ میں مصروف تھا ..گھاٹ پر برہمن کھنکار رہے تھے آم کا باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج اٹھا تھا..گوتم عبادت کے باہر نکلا.تو ہری شنکر اسے دیکھ کر مسکرایا..دفعتا گوتم نے اس کو پوچھا ....ویشالی میں کون رہتا تھا؟

میں ویشالی کی کسی مہیال سے واقف نہیں ہوں..شنکر نے بری سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا..گوتم کو اس کی بے تکی ہنسی پر بہت غصہ آیا

وہ دونوں مندر کی سیڑھیاں اتر کر جنگل کے راستے پر آ گئے..ندی کے کنارے

بھکشوؤں کا گروہ نہانے کے لیے آیا ہوا تھا

تم اب شراوستی واپس چلے جاتے ہو...شنکر نے پوچھا

ہاں تم نہ چلو گے ..وہاں سے کچھ فاصلے پر کپلاوستی ہے..ادھر پورب میں کوسی نگر ہے..اور گیا.تم ان سب جگہوں کی یاترا کے لیے نہ جاؤ گے؟

تم اپنا مطلب بیان کرو

میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو.تم میرے آشرم میں ٹھہر سکتے ہو ..یا اگر میرے ماں باپ کی عزت بڑھانا چاہو تو شہر کے اندر میرا گھر ہے

میرا ارادہ کاشی جانے کا تھا.مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میری راہ میں حائل ہوتے ہو..

یہی بات دوسری طرح بھی کہی جا سکتی ہے.تم میرا راستہ کھوٹا کر رہے ہو ..بھائی ہری شنکر..پگڈنڈی پتلی ہو اور دو راہگیر آمنے سامنے آن کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک کو ہٹ جانا چاہیئے..ورنہ دونوں کھڈے میں جا گریں گے گوتم نے کہا

پھر میں تمہارے ساتھ شراوستی کیوں چلوں..اس لیے کہ تمہیں میرے مزہب سے دلچسپی ہے یا اس لیے کہ تم ایودھیا کی کماری چمپک کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو؟

ہری شنکر اگر تم نے شاکیہ منی کے چیلوں کا یہ گیروا پہناوانہ پہن رکھا ہوتا تو میں تمہاری ٹھکائی کر دیتا..گوتم نے دل میں کہا

وہ دونوں آبادی چھوڑ کر شرواستی کی طرف بڑھنے لگے

آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے،ہوا میں کچی کلیوں کی مہک اڈ رہی تھی

..کدم کے ایک جھنڈ میں مور پر پھیلائے ناچ رہا تھا..کھیتوں کی منڈیر پر دھانی اور کپاسی ساڑیاں پہنے ہوئے کسن عورتیں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں اسوک کے جنگلوں میں جگہ جگہ جو دیوا ستھان اور دیوگرہ بنے ہوئے تھے گوتم ان پر پھل پھول چڑھاتا راستہ طے کرتا جا رہا تھا شنکر خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا

شام پڑے دونوں لڑکے مور پالنے والوں کے ایک گاؤں کی فصیل میں داخل ہو گئے، ان گنت مور چاروں اور باغوں میں گھوم رہے تھے چھپروں کے نیچے مور کے پروں کے پنکھے اور مورچھل تیار کیے جا رہے تھے..چوپال میں گانا ہو رہا تھا

گوتم اور ہری شنکر کنوئیں کے من پر بیٹھ گئے.. پل کی پل میں سارے میں خبر پھیل گئی تھی دو ودیارتی گاؤں میں مہمان آئے ہیں..ان کی آؤ بھگت شروع ہوئی ..شنکر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہا

ایک لڑکی دو خوبصورت پنکھیاں نزر کرنے کے لیے آئی تھی..گوتم نے لڑکی کے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا..اس کے پروں پر انگلیاں پھیریں..لڑکی بڑے ادب سے آشیرباد کی منتظر کچھ فاصلے پر کھڑی رہی...یہ پنکھے کہاں کہاں کن کن دور دراز کے شہروں اور ملکوں کو بھیجے جائیں گے..کیسے کیسے لوگ ان کو استعمال کریں گے..وہ سوچ رہا تھا..یہ پنکھیا جو میں چھو رہا ہوں..یہی ایودھیا کے بازار میں جا کر بکے گی اور شاید وہی لڑکی اسے خرید لے گی..پھر اس نے دونوں پنکھیاں واپس کر دئیں..ہمیں عیش و آرام کا حکم نہیں..ہمیں تمہارے یہ خوبصورت پنکھے نہیں چاہیئے..مور کے پروں کو ہم بن میں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں..اس نے جلدی جلدی کہا..لڑکی نے پنکھیاں اٹھالیں اور پرنام کے لیے جھکی اور شنکر چونکہ بھکشو

کا نارنجی لباس پہنے ہوئے تھا اس نے آگے بڑھ کر شنکر کے پاوں چھو لیے

تمہارا نام سجاتا تو نہیں... گوتم نے ہنس کر اس سے پوچھا..اور شنکر پر نظر ڈالی وہ اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا

نہیں ..میرا نام نند بالا ہے..سجاتا میری بڑی بہن ہے لڑکی نے سادگی سے جواب دیا اور پھر کنوئیں کے من پر سے اتر کر گاوں کی طرف لوٹ گئی

بھائی گوتم ہر زمانے میں ہر قدم پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی...کوئی سجاتا اور وہ تمہارے پاس آ کر تمہاری پرستش کرنا چاہے گی..اب بھی وقت ہے کہ آنکھیں کھولو ..ہری شنکر نے کہا

صبح سویرے پھر وہ اپنے سفر پر چل نکلے اور دو دن تک چلتے رہے..اب شراوستی زیادہ دور نہیں تھا...شیشم کے جنگلوں کے اختتام پر آبادی شروع ہو گئی تھی..سڑک پر دو رویہ درخت لگے تھے..جن کے پرے امرا کے مکانات تھے..ان مکانوں کے باغوں میں نقلی پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں..اور امرود اور انار کے درختوں کے جھنڈ تھے جن پر سبز پروں والے طوطے شور مچا رہے تھے..پالتو مور مرمریں تالابوں کے کنارے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے..جامن کے درختوں میں جھولے پڑے تھے..مکانوں کی دیواروں کی سفیدی ہلکی ہلکی دھوپ میں دور ست جگمگا رہی تھی

برابر کی پگڈنڈی پر سے خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ بیلوں پر بیٹھا گاتا بجاتا گزر گیا

چلتے چلتے دفعتاً رک کر شنکر نے گوتم کو مخاطب کیا...بھائی گوتم ویشالی کی امبیا پالی

تھی گوچمپک اور سجاتا اور نند بالا سب ایک ہی ہیں ..اپنے ذہن کو انتشار سے محفوظ رکھو ..اور پھر یکلخت شنکر پگڈنڈی پر سے اتر کر واپس شیشم کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا گوتم اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا

۲..............................

شراوستی کا خوبصورت شہر راپتی کے جنوبی کنارے دور دور تک پھیلا ہوا تھا..اس کے اتر میں ذرا فاصلے پر ہماوت کے گلابی اور نیلے پہاڑ ایستادہ تھے اور دیودار کے گھنے جنگلوں اور آس پاس ترائی کے نرکلوں میں باگھ اور بگھیلے گھومتے تھے

پہاڑوں کا یہ سلسلہ بہت اوپر سے آ رہا تھا جہاں مان سرود کی جھیل تھی..جس کی شفاف لہروں پر دنیا کی آتما کا راج ہنس اکیلا تیرتا تھا..ہماوت کے اونچے پہاڑ ونگا اور کامروپ تک پھیلے تھے ان پہاڑوں کے اس پار اتر میں سونے کی رنگت والی کنچوں کا دیس تھا، وادیوں میں ان گنت روپہلے آبشار اور ٹھنڈے پانی کی ندیاں تھیں..اور خوشبودار چتوں کے درخت اور دھان کے کھیت اور تاریک خنک جنگلوں میں گروکل بنے ہوئے تھے جہاں ملک کے نوجوان لڑکے ....شہزادے اور مفلس برہمن اور کشتری امیر زادے علم حاصل کرنے میں جٹے تھے

انہیں جنگلوں میں.. پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر جہاں دن میں بھی گھپ اندھیرا رہتا تھا.. ہاتھی پلے تھے ..راجن سال میں ایک بار کھیدا کے لیے وہاں آتے تھے ہاتھی پکڑنے والے ہانکا لگاتے ..درباریوں کا پڑاؤ ہوتا..جنگل میں منگل لگ جاتا ہاتھیوں کا راستہ تلاش کرنے والا اور سدھانے والوں کا عملہ جنگلوں کے کنارے لکڑی اور بانس کے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا ان کی لڑکیاں مونگے اور فیروزے

کے روپہلے زیور پہنے بالوں کی مینڈھیاں گوندھے ہاٹ بازار کے لیے جب میدانوں کی طرف آتیں تو شہری لڑکیاں ان کی رنگ برنگی سیاہ ..سرخ اور زرد دھاریوں والی پوشاک کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتیں

اتر کوشل کی ریاست میں نگر.. پور اور نگریاں...شہر اور قصبے اور گاؤں ان ہرے بھرے میدانوں میں آباد تھے جنگلوں کی افراط تھی..جن کی لکڑی سے خوبصورت مکان بنائے جاتے..اب آبادی بڑھ رہی تھی اور جنگل کٹتے جاتے تھے

شراوستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا..دور کے دیشوں سے آئے ہوئے لوگ یہاں رہتے تھے ..الگ الگ محلوں میں کاری گر..سنار..بزاز..آڑھتی اور دوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں..ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے قوانین

چوروں تک کی کنڈلی معہ ایک ضابطہ شاستر کے پاس موجود تھی بارہ مہینے چہل پہل رہتی ..ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا..ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا ..مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگار خانوں میں مصروف رہتی تھیں ناٹک منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا..ناٹک اور ناٹکائیں زرق برق کپڑے پہنے ،، چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں ..چوراہوں پر مداری اپنے کرتب دکھاتے ..بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں ..اچکوں اور ٹھگوں کا مجمع رہتا.تہواروں کے موقع پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے گاتے پھرتے ..دوم نقلیں کرتے ..دیش ناریاں چھن چھن کرتیں اپنی گلیوں میں ٹہلتیں امیر زادیاں سولہ سنگھار کیے تھالوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں..عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی

رتھ کار..مٹی کے برتن بنانے والے.کلاں اور بید کی ٹوکری بننے والے شہر کے باہر رہتے تھے..آبادی سے بالکل الگ تھلگ چنڈالوں کی بستی تھی ان کا پنچم طبقہ چاروں زاتوں سے کم تر تھا..محض لاشیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسمت میں لکھا تھا یہی ان کا پیشہ تھا..وہ صرف مردوں کی اترن پہن سکتے تھے ان کو حکم تھا کہ ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کھانا کھائیں اور محض کانسی کے گہنے استعمال کریں

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا.شراوتی میں کپلاوتی کے شاکیہ منی آن کر رہے تھے اور انہوں نے اور ان کے حواریوں نے اپنے واعظوں میں بتلایا کہ آدمی پیدائش کی بناء پر نہیں بلکہ عمل کی بناء پر ملیچھ یا اچھوت بنتا ہے اور اب نارنجی لباسوں والے بھکشوں کی ٹولیاں بستی بستی گھوم کر چنڈالوں اور اچھوتوں کو نیک عمل کی تلقین کر رہی تھیں

شراوتی کی رونق ہر موسم میں قائم رہتی..گرمیاں آتیں تو امراء اپنے باغوں میں تالابوں کے کنارے جا بیٹھتے..یا خنک تہہ خانوں میں آرام کرتے..شام کے سمے بازار میں کھوے سے کھوا چھلتا..بوڑھی عورتیں موتیا اور چنبیلی کے گجرے گھروں کی ڈیوڑھیوں پر لے جا کر بیچتیں..خوبصورت لڑکیاں اونچے مکانوں کے جھروکوں سے نیچے جھانکتیں

شہر سے باہر کھلے سبزہ زاروں میں کشتری سورما سندھ اور ایران اور عرب کے اصیل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر آتے..گاؤں کی سمت جانے ولے سایہ دار کچے راستوں پر کسانوں کی بیل گاڑیاں اور بہلیاں چرخ چوں کرتی نرم روی سے چلتیں

۳...

مون برت رکھنے والے برہمنوں کی مانند ..سال بھر گم سم رہنے کے بعد مینڈکوں نے طوفان کے دیوتا سے زندگی کی لہر حاصل کی ہے اوراب کیسے زور زور سے چلا رہے ہیں جس طرح طالب علم اپنے استاد کے الفاظ یک زبان ہو کر دہراتے ہیں اسی طرح ایک مینڈک دوسرے مینڈک کی بولی نقل کرتا ہے سب کے سب تلیا میں لیٹے برساتی راگ الاپنے میں جٹے ہیں

گوتم نے مسکرا کر کتاب بند کر دی اور نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا بارش جھما جھم برسنا شروع ہو گئی تھی مینڈک ٹرا رہے تھے مور جھنکارتے تھے ..پپیہا غل مچا رہا تھا ..ساون کی گھٹائیں جھوم کر اٹھی تھیں رگ وید میں صدیوں پہلے برکھا رت کی جیسی منظر کشی کی گئی تھی ...وہ منظر ویسے کا ویسے بالکل اس کے سامنے موجود تھا..کٹی کے پھونس پر لوکی کی بیل پھیلی تھی اس پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے وہ کٹی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا..جس پر سرسوتی میگھ راگ بجا رہی تھی امن اور سکون کا راگ .....میگھ؟....اس کا ذکر میں نے ابھی کسی سے سنا ہے؟..کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پا سکا..مجھے غیر ضروری باتیں کیوں یاد رہتی ہیں .....اس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی...اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا..ساون کی پورن ماشی آ گئی تھی اور پڑھائی شروع ہونے والی تھی گوتم نیلمبر اپنے آشرم واپس آ چکا تھا..آشرم شہر سے دور اسوک کے جنگل میں واقع تھا..ندی کے کنارے کنارے جھونپڑوں میں طالب علم رہتے تھے ..اس

پار گرو کے کھیت تھے جو کہ سرکار کی طرف سے آشرم کو ملے تھے... بارش تھمتی تھی تو طالب علم ان میں کام کیا کرتے تھے۔خزاں کے مہینے میں تبت کی طرف سے اڑتے ہوئے ہنس آتے اور بسنت کے زمانے میں لوٹ جاتے.. طالب علم صبح صبح جب اشنان اور عبادت کے لیے گھاٹ پر جاتے تو انہیں اپنے یہ خاموش رفیق سنیاسیوں کی طرح مراقبے میں ڈوبے ملتے

گوتم اپنے گرو کے پاس جنہیں اچاریہ کا درجہ حاصل تھا..مدتوں سے پڑھ رہا تھا.. یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا..اس دوارن اس نے ناٹک لکھنے اور تصویریں بنانے میں بہت شہرت پائی تھی اپنے آشرم سے باہر دوسری درسگاہوں میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا اگر یہ پیدائشی شاعر ہے تو اسے پروہت بنانے کا کیا فائدہ؟ اس کے معلم نے سوچا تھا...مگر گوتم کے پاس یہی راستہ اٹل تھا راج دربار میں پروہت کی مسند اس کی منتظر تھی جس پر اس وقت اس کا باپ بیٹھا تھا...ممکن ہے کہ ایک روز وہ ایکا پروہت کے رتبے تک پہنچ جائے اور اتر کوشل کے علاوہ دوسری ریاستوں کا بھی مشیر بنے وہ بے حد ذہین لڑکا تھا اور اس کے پورو دیس میں علم کی بہت قدر کی جاتی تھی اسے فنون جنگ بھی سیکھنے پڑے تھے اور اگر اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی تو تب بھی اس کا کوئی نقصان نہ تھا مغرب کے کورو پنچالوں کے ہاں سیناپتی کو پروہت پر فوقیت حاصل تھی.. گوتم اندر پرستھ جا کر فوج میں نوکری کرسکتا تھا۔مگر اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ صرف ناٹک لکھا کریگا۔فن کے نظریوں پر کتابیں تصنیف کرے گا۔تصویریں اور مجسمے بنائے گا..شاعروں نے سماج سے ہمیشہ بغاوت کی ہے.. پر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گرو کا بڑا خیال تھا

.....وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے اس کے گرو کو دکھ پہنچے..

گرو چیلے کا یہ سلسلہ صدیوں سے..عالموں کے بادشاہ جنک اور رشی دتاتریہ کے زمانے سے چلا آرہا تھا..اسی آشرم کے آس پاس..ایک ہزار سال قبل...سرجو کی ایک شاخ ملینا ندی کے کنارے ایک مشہور درسگاہ موجود تھی یہ کنج..جہاں گوتم اور اس کے ساتھیوں کے جھونپڑے تھے..یہیں دوسرے لڑکے گھوما کرتے ہونگے

دوسرے لڑکے......دوسری لڑکیاں

برہمچاریہ کی زندگی بسر کرکے لڑکیاں بھی اکثر اعلی تعلیم حاصل کرتیں..رگ وید کی کئی نظمیں اور،،راہبات کے نغمے،،لڑکیوں نے لکھے تھے...شاعرہ اپالا کی نظمیں گوتم نے پڑھی تھیں......لڑکیاں بھی کیسی عجیب ہستیاں ہوتی ہونگی..گوتم کو اکثر خیال آتا

دوسرے برہمن زادوں کی مانند گوتم نیلمبر کی پڑھائی بھی پانچ سال کی عمر سے شروع کردی گئی تھی..اب وہ پورے چوبیس سال کا ہو چکا تھا..اور اس نے الہیات تمثیل..ادب ..بھوت ودیہ .علم عناصر ..ریاضی ...صرف ونحو ..منطق ..فلسفہ ..اخلاقیات ..اداکاری..کیمیا.طبیعات.....نصاب کے سبھی علوم پڑھائے گئے تھے ..فن سپہ گری کے علاوہ وہ راگ ودیا کا بھی ماہر تھا..اتر پردیش کے رہنے والے اہل زبان سمجھے جاتے تھے..گوتم کو بھی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا

برسوں سے اس کی زندگی اسی دھڑے پر چل رہی تھی..وہ ماں باپ سے الگ آشرم میں رہتا..گرو کے جاگنے سے قبل طلوع آفتاب کے وقت اٹھ بیٹھتا..ندی پر جاکے نہانے کے بعد ..جنگل کے خاموش ترین حصے میں بیٹھ کر عبادت کرتا

..درختوں کے مقدس کنجوں سے..جو دیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے معنون تھے اس سے سریلے بھجنوں کی آوازیں بلند ہوتیں..عبادت کے بعد گوتم آبادی میں جا کر دن بھر کی خوراک کے لیے بھیک حاصل کرتا..پھر لکڑیاں چن کر لاتا اور روگ کی کٹی کی آگ روشن کی جاتی..آشرم میں روزانہ چاول ابالے جاتے تھے..اور جو کی روٹی بنتی تھی..شراوستی میں بڑے بڑے قصاب خانے موجود تھے..شہر کی دعوتوں میں اکثر گائے کا گوشت بھی پکتا تھا..لیکن طالب علموں کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی لہذا گوتم اور اس کے ساتھی گرو کو کھلانے کے بعد خود بھی اکیلے بیٹھ کر ساگ پات ہی کھاتے تھے

اس دیس کے رہنے والوں کو صفائی کا جنون تھا..آشرم میں دن میں دس بار جھاڑو بہاری کی جاتی..پیتل کے برتن جھونپڑوں کے برآمدے میں رکھے جگر جگر کرتے..بات بے بات پیر دھوئے جاتے..تنکا بھی فرش پر نظر نہ آتا، پھر باغ کی صفائی کی جاتی..اس ساری مشقت، کے بعد پڑھائی ہوتی..پڑھائی کے بعد یاد خدا برہمچاریہ کے قوانین کٹھن تھے..گوتم کو شروع سے سکھلایا گیا کہ وہ عطر پھول استعمال نہیں کرسکتا..سرمہ لگانے..جوتا پہننے..بارش یا دھوپ میں چھتری لے کر چلنے کی اسے سختی سے ممانعت تھی..دریا پار کرنے کے لیے وہ کشتی استعمال نہیں کرسکتا تھا..اسے بتالیا گیا تھا کہ طالب علم کو دن بھر کھڑا رہنا چاہیئے..رات بیٹھ کر گزارنی مستحسن ہے..موٹا جھوٹا پہننا اور روکھا سوکھا کھانا اس کا وطیرہ ہے..لڑکیوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا اس کا فرض ہے..بے ضرورت دوڑ بھاگ نہ مچاؤ..زبان نہایت صاف اور شستہ بولو..ایک لفظ بھی غیر فصیح منہ سے نکلنے نہ پائے..لڑکیوں کا

مزاق کبھی نہ اڑانا..عیش وعشرت..راگ رنگ سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے ..شہر کے سرکاری قمار خانے میں معزز ین شام کو جمع ہو کر جوا کھیلتے..گوتم جو کہ طالب علم کی حیثیت سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا تھا..محض خواب میں ہی سکوں کے درشن کر سکتا تھا..چناچہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ قیمتی دوشالہ اوڑھے گھٹنوں کے بل بیٹھا پن پہ پن داو پہ لگا رہا ہے..اور اس کے چاروں اور عجیب عجیب شکلوں کے لوگ جمع ہیں..ایسے لوگ جو کہ اس نے جاگتے میں شراوتی کے بازار میں بھی کبھی نہیں دیکھے تھے

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا لہزا جب کبھی وہ شراوتی کے ناچ گھر یا قمار خانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا

ناچ گھر کی سیڑھیوں پر سے اکثر پاتریں گھنگھرو سنبھالے اترتی یا چڑھتی نظر آتیں سبھی طالب علم اسی طرح گور کے تابع تھے بعض مرتبہ وہ گرو کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے بھیک مانگ کر سب سے پہلے گرو کو لا کر دیتے اور اکثر خود بھو کے رہ جاتے پچھلے وقتوں میں پنچالوں کے علاقے کا ایک طالب علم جو کہ تکشلا میں پڑھتا تھا، اپنے استاد کے کھیتوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے بند باندھنے کے بجائے خود پانی کی آڑھ میں لیٹ گیا تھا

طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات ونسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور رہے، شیخی اور خودنمائی کے جزبات پر قابو پائے دماغ کا سکون اور دل کا صبر وضبط حاصل کرے

ساون کی پورنماشی سے لے کر پوس کی پورنمائشی تک پڑھائی ہوتی تھی ،طریقہ تعلیم سوال و جواب پر مبنی تھا.. چیلا سوال کرتا گرو اس کا جواب دیتا..پھر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر آپس میں بحث و مباحثہ کرتے ،بال کی کھال نکالی جاتی

اگر کبھی سیاسی ہنگاموں ،جنگوں یا بیرونی حملوں کی وجہ سے پڑھائی ملتوی کرنا پڑتی یا تہواروں کی چھٹیاں ملتیں تو گوتم اکیلا ہی اپنی کٹی میں بیٹھا چراغ جلائے رات رات بھر نظمیں لکھا کرتا...گیدڑوں کا چلانا پڑھائی کے لیے برا شگن تھا .مرگھٹ میں اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا منع تھا

جاڑوں کی راتوں میں نزدیک کے جنگل میں گیدڑ چلاتے ۔ بے چاروں کو سردی لگتی ہے..اوڑھنے کے لیے راجن سے کمبل مانگتے ہیں..گوتم کی ماں بچپن میں اس سے کہا کرتی تھی..جب وہ اپنے شاندار مکان کے ایک اندرونی کمرے میں گرم ،کپڑوں میں ملفوف ..چھپر کھاٹ پر لیٹا پنچ تنتر کے قصے..چنداماوں اور ان کی بیوی روہنی اور راہو اور کیتو کی کہانی سنتا تھا..چندا اس کے ماموں تھے..سب بچوں کے ماموں تھے.کیونکہ ماموں کا رتبہ اس عہد میں بڑا تھا..وہ ماں کا بھائی تھا..اور ماں بے حد تکریم ہستی تھی ..جاڑوں کی طویل راتوں میں گیدڑ چلاتے تھے..سارا جنگل چاندنی میں سائیں سائیں کرتا ،چندا ماموں اوپر کمرے میں تیرا کرتے.. اسے اپنی ماں یاد آ جاتی.پھر وہ کوشش کر کے دوبارہ صرف ونحو میں منہمک ہو جاتا

طویل چھٹیوں کے زمانے میں گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یا تنہا اپنے موقلم یا رنگوں کی کلیاں لے کر دور دور نکل جاتا..اسی طرح وہ ایودھیا گیا..ایک مرتبہ کوسمبی جا پہنچا.مگدھ میں راج گیر کے کھنڈر اس نے چاندنی رات میں دیکھے اور

بہت اداس ہوا اور وہیں بیٹھ گیا...اس نے بھیم بسیار کے آخری دنوں کے متعلق ایک ناٹک لکھا..یہ ایک واقعہ تھا کہ اب اس کا دل صرف ونحو میں نہیں لگ رہا..وہ چاہتا تھا کہ محض فن کے نظریات پر اور بہت کچھ پڑھے اور لکھے قدم قدم پر جو سوالات ذہن کو الجھاتے ہیں ان کا کوئی حل کھوجے..ہری شنکر جو کہ اسے ایودھیا سے واپسی پر ملا بہت دلچسپ تھا.مگر اس کے معدومیت کے فلسفے سے بھی گوتم کو ڈر لگنے لگا ..قدیم برہمنوں کا فلسفہ تھا..زندگی سے موسیقی سے ..زندہ رہنے کی لگن سے بھرپور لیکن اپشدوں کی موسیقی نے زندگی کو اور گہرا کر دیا تھا..وہ جواب تک بڑے صبر و ضبط اور ذہنی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اسے اب سرجو کے گھاٹ پر بیٹھی لڑکی یاد آجاتی جس نے کیسری ساری پہن رکھی تھی...اس کا دل چاہتا کہ ایودھیا واپس جا کر اسے تلاش کرے پتا چلائے کہ وہ کون ہے کیا کرتی ہے؟...شنکر اس کمبخت منحوس بودھ بھکشو سے، جو کہ پل کی پل میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے..؟

اقامتی درسگاہوں میں نئے نئے نظریات کی ہوا وقتاً فوقتاً چلا کرتی تھی اسی طرح اپشندوں کے مختلف فلسفے وجود میں آئے ...ان کی شرحیں لکھی گئیں مختلف مدارس فکر قائم ہوئے ..بدھ مت تازہ ترین ذہنی رواج تھا گوتم نیلمبر کے مدرسے میں بہت سے لڑکے اسی مسلک کے حامی ہو چکے تھے گوتم کی کٹیا میں شام پڑے دوسرے طالب علم آن بیٹھتے شہر کے مصور..سنگ تراش ؛ شاعر ؛؛ لیکھک اور اس طرح کے دوسرے لوگ جن کا تعلق فنون لطیفہ سے تھا اور کلا جن کا پیشہ تھا گوتم کے چھوٹے سے کمرے میں محفل جمتی لپے تلے فرش پر چٹائی بچھائی جاتی ..درمیان

میں چراغ جلتا رہتا. رات گئے تک مختلف موضوع زیر بحث لائے جاتے. ادب اور فنون کے نئے اور پرانے نظریوں پر تبادلہ خیالات ہوتا.. سنگیت کا مظاہرہ کیا جاتا .. سیاست کا بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا.. گوتم کے دوستوں میں سبھاو کے نیتا شامل تھے طالب علم تھے جو کہ سایست پر کتابیں لکھا کرتے تھے.. ان محفلوں میں سیاسی موشگافیاں کی جاتیں.. ریاست اور عدم ریاست میں کا ے فرق ہے؟ راجہ اور پرا جا میں کیا تعلق ہونا چاہیئے.. وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جائیداد ریاست کو غیر ریاست یا مہاتما بدھ کی سکھ وتی سے ممیز کرتی ہے اور سکھ وتی وہ کیفیت ہے جس میں انسان کا جسم بھی اس کا اپنا نہیں اور ریاست اور ریاست کی حدود سے ماوراء ہو کر انسان یا تو جانور بن جاتی ہے یا خدا.. ملکیت... یہ میرا ہے.... کے تصور اور دھرم کے احساس سے ریاست بن جاتی ہے اور ملکیت کی اجازت رایست عطا کرتی ہے ملکیت ریاست کا نتیجہ ہے.. اس کی وجہ نہیں. لہذا سیاست کے طالب علموں نے طے کیا کہ ریاست اس کیفیت کا نام ہے جہاں دروازے کھلے چھوڑ کر سو سکتے ہوں عورتیں زیور پہن کر مرد کے بغیر رکھوالی کے باہر نکل سکتی ہوں اور ملکیت. فرض اور سزا کی بنیاد پر ریاست قائم ہوتی ہے.. مہابھارت میں لکھا تھا کہ ڈنڈ یعنی سزا نہ ہو تو طاقتور کمزور

کو اس طرح کچلیں .. جسطرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے .. اور مہابھارت کی کتاب .. شانتی .. میں لکھا تھا کہ انسان خطرناک حد تک حریص اور تشدد پسند ہے .. لہذا یہ میرا ہے کا فقرہ بھلا دینا چاہیئے .. مامتوا. احساس ملکیت سارے جھگڑے کی جڑ ہے؛؛ ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے.. تہذیب اسے

اخلاق سکھا دیتی ہے اور متمدن بناتی ہے ..ریاست ڈنڈ کے زریعے انسان کی جبلت کو ضابطے میں لاتی ہے .. بادشاہ ڈنڈ دھر ہے .مگر وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں .لہزا منو نے حکم دیا تھا..کہ نالائق بادشاہ کو بھی ڈنڈ سزا دے سکتا ہے ..ریاست اور سیاسی نظام انسان کے لیے ضروری ہے ..مہابھارت اور منو دونوں کے نزدیک حکومت کو سخت گیر ہونا لازمی تھا..کیونکہ انسان فطرتا بد تھا.عوام کا فرض تھا کہ وہ اپنے وزن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں سپاہی کو محاز پر مرنا ہوگا..طالب علم شادی نہیں کر سکتا.. بادشاہ کا کام انصاف کرنا ہے...یہ تفریق عمرانیات کی بنیاد پر کی گئی تھی.. چنانچہ ریاست ظہور میں آتی ہے ..تو پرجا کے ساتھ لامحالہ ورن آشرم کا بھی ظہور ہوتا ہے..اگر پرجا اپنے فرائض انجام نہ دے تو ورن آشرم کا خاتمہ ہے

سیاسیات بڑے متضاد نظریے تھے جو کہ گوتم نے پڑھے تھے..جیمنی نے کہا تھا کہ افعال اچھے اے برے انسان کے خود پیدا کردہ ہیں..ورنہ دنیا کے دکھوں کا سرچشمہ اگر خدا کو قرار دے دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ظالم ہے..لہذا جیمنی نے ثابت کیا کہ دنیا کی اخلاقی قوت کے لیے کسی خدائی نظام کی ضرورت نہیں..گوتم کے بدھ ساتھی بھی یہی کہتے تھے

سیاسی آزادی کا تصور ان سب کو بہت عزیز تھا..یہ آزاد انسانوں کا سماج تھا ..یونان..مصر.. بابل..نینوا::اور ایران کی ہم عصر تہذیبوں کے برعکس اس دیس کا معاشی نظام غلامی کے ادارے پر مبنی نہ تھا.شہنشاہ بھی ابھی تک نمودار نہ ہوئے تھے .ترائی کے علاقوں میں کشتریوں کی جمہوریتیں مہابھارت کے زمانے سے بھی پہلے سے موجود تھیں..بادشاہ زمین کا مطلق العنان مالک نہ تھا..اسے الوہی درجہ بھی

حاصل نہ تھا..کرم کی طاقت کے ساتھ کسی خود مختاری کی گنجائش نہیں..کرم نے ہر شے کو غیر ضروری بنا دیا ہے...گوتم کے ایک ہم جماعت نے اپنے ایک مقالے میں لکھا..لہذا خدا بھی پاداش اور مکافات کے قانون کو توڑ نہیں سکتا..اس قسم کے نظریات کی موجودگی میں مطلق العنان حکومت کا قیام ناممکن تھا...جمہوریتوں کے زمانے میں کوی نے بادشاہ کو سنگھ مکھیا کی حیثیت سے مخاطب کر کے کہا تھا..تیرے ہاتھ میں راج آیا ہے..اٹھ اور اسی شان سے حکومت کر کے....تجھ کو عوام نے اپنا بادشہا چنا ہے....انسانوں کے اندر کی طرح اپنی راہ چل..تو جو گوپا ہے گوالا ....وردنا..اٹھ اور دنیا کے گلے کی رکھوالی کر

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں..جنوب کے راجہ بھون کہلاتے تھے..شمال کے وراٹ اور مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی..یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلا رہے تھے..جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا ..اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکرٹ بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہو ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا..چکروتی بادشاہ....جس کی مملکت کے ساتھ رتھ کا پہیہ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہے

اور شاکیہ منی نے کہا تھا...میں شہنشاہ ہوں اے سیلا...میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے....

۴..

وشنو گپتا.....گوتم نیلمبر کی کٹی میں ایک شام حسب معمول محفل سجی ہوئی تھی

اکلیش نے جو کہ نیا نیا تکشلا سے لوٹ کر آیا تھا..ایک نئے نام کا ذکر کیا..وشنو گپتا ..نیتی پر اس کے وچار بھی سننے کے قابل ہیں....تکشلا میں تو اس نے اپنی ذہانت کی دھوم مچا رکھی تھی میں نے سنا ہے کہ وہ آجکل کسم پور کے دربار میں موجود ہے

تم کاے کرتے رہتے ہو...گوتم نے اکلیش سے پوچھا

میں......میں نے ایک نئ مورتی شروع کی ہے..کسی روز شہر آؤ تو دکھلاؤں

تم شلپا کاروں کی منڈلی میں شامل ہو گئے ہو؟ کیوں کشتریوں کا نام ڈبوتے ہو..گوتم نے اسے چڑاتے ہوئے کہا

تکشلا سے لوٹ کر بہت دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا.....کوئی جنگ ہی شروع نہیں ہوئی....کیا کرتا..اکلیش نے ہنس کر جواب دیا

جنگ......وملیشور جو کہ ایک کونے میں بیٹھا ایک انیمی سے شاعر سے زبردستی اس کی نظم سن رہا تھا.....کان کھڑے کر کے بولا..تم کو کسم پورے کی تازہ خبریں معلوم ہیں؟

سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے...دھن نند جوال مکھی کے منہ پر بیٹھا ہے...وہ کہتا رہا..اتنی بڑی فوج کا خرچہ دیس کو اٹھانا پڑ رہا ہے..پھر جوگیشور نے مڑ کر کہا..یہ شراوتی میں وقائع نویس تھا..دودھ..دہی..نمک..کھانڈ ..گھاس..لکڑی..پھل..پھول...ترکاری..بیگار..ڈھور ڈنگر...ہر چیز میں سرکار اپنا حصہ بٹا رہی ہے..تم سمجھتے ہو پرجا چپ رہے گی؟

ملک کے سیاسی حالات پر زور و شور سے گفتگو شروع ہو گئی...گوتم ایک طرف کو خاموش بیٹھا سنتا رہا...عجیب عجیب نام لیے جا رہے تھے...واقعات دہرائے جا

رہے تھے ..رائیں دی جارہی تھیں..ان سب میں شامل اورسب سے الگ بیٹھا وہ سنتا رہا....خودبھی اپنے تئیں بحث ومباحثہ میں شامل پایا..کبھی وہ جوش میں آ کر زور سے بولتا کبھی ہنستا..کبھی کسی ساتھی سے کسی نکتے پر جھگڑا کرنے لگتا.لیکن ایک گوتم نیلمبر کٹیا سے باہر موجودتھا.جنگلوں میں گھوم رہا تھا سرجو کی لہروں کوعبور کرنے میں مصروف تھا.....

ترائی کے نرکلوں میں گھاس پرسر رکھے لیٹا تھا...جبکہ یہ گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں سے مگدھ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کرنے میں منہمک رہا

مگدھ میں ان دنوں نندوں کی حکومت تھی

..جوخدائے دولت کبیر سے بھی زیادہ امیر تھے

مگدھ ملک کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا..ایک زمانہ تھا جب کوشل بھی عروج پر تھا اجین کے بادشاہ مہاسین نے یہاں کی شہزادی سے شادی کی تھی.مہا کوشل اور راور پرسن جیسی ہستیاں یہاں حکومت کرتی تھیں...عہد عتیق میں،، جب ایودھیا اس سارے دیس کی راج دھانی تھی..اس کے سورما شہزادے دور دور دکن اور لنکا تک مہمیں سر کرنے کے لیے جاتے تھے..ایودھیا کے شاہی خاندان کی ایک شاخ نے شرواستی میں اپنا راج قائم کرنے کے بعد شاکیہ اور کاشی کے علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا...پھر ایک وقت ایسا آیا جب اتر کوشل کی طاقت کی ٹکر جنوبی مگدھ سے ہوئی

مگدھ والے ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی گڑ بڑ پھیلاتے آئے تھے.. یہاں کا ایک راجہ جرا سندھ جنگ عظیم میں سری کرشن اوران کے ساتھیوں کے خلاف لڑا تھا

...اور بھیم کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا... پرستان کا ایسا شہر گری ورج اس کا پایہ تخت تھا اور وہ راجہ ایسا زور آور تھا... مہا بھارت میں لکھا تھا کہ بھوج ہنس کے اٹھارہ حکمران اس کے رعب سے اتر پچھم بھاگ گئے تھے ...گری ورج کے قلعے میں سینکڑوں بادشاہ اس نے قید کر رکھے تھے جس طرح پہاڑوں کے غار میں شیر ہاتھیوں کو قید کرتے ہیں اور انہیں سری کرشن دیو کے پتر نے آ کر آزاد کیا تھا...اسی جراسندھ کے باپ راجہ براہدرتھ نے تخت و تاج اس کے حوالے کر کے غور وفکر کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی دونوں رانیوں کے ہمراہ بن کی راہ لی تھی اور بنوں میں جا کر فلسفی سا کیانہ کا چیلا بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رشیوں کے گھر میں راکھشس جنم لیں گے

مگر جنگ عظیم سے بہت پہلے اسی علاقے کی شمالی ریاست متھلا پوری کی راج دلاری ایودھیا کے شہزادے سے بیاہ کر آئی تھی، کوشل دیس کی اس بہو کا نام سیتا تھا

ویدوں کے عہد سے لے کر اب تک مگدھ پوری طرح سے برہمنوں کے اثر میں کبھی نہ آیا تھا.. یہاں کی آبادی ہمیشہ مخلوط رہی ...ان کی اونچی ذاتوں کو بھی باہر والوں نے کبھی خالص نہ سمجھا تھا...اور مگدھ کے برہمن اور کشتری بھی کوشل دیس والوں کی نظروں میں حقیر تھے پچھلی دونوں صدیوں میں شیش ناگ خاندان کی مگدھ پر حکومت رہی...اس خاندان کے بادشاہ بھیم بسار کے عہد میں شہزادہ مہاویر اور شہزادہ سدھارتھ نے اپنے فلسفوں کا پرچار کیا تھا

زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسواں مہاویر جو ویشالی کے کنڈ گرام میں پیدا ہوا...اہنسا کی تلقین کرتا سارے دیس میں گھوما..اور پھر دو رنگا کے جنگلوں کی

طرف نکل گیا.... کپل وستی کے لمبنی گرام میں پیدا ہونے والا سدھارتھ جو کہ گری ورج کی سبز پہاڑیوں پر چلا..نرنجن ندی میں نہایا...پیپل کے درخت کے سائے میں جسے گیان حاصل ہوا.شراوتی اور کاشی کے باغوں میں..جہاں ہرن کلیاں بھرتے تھے..اس نے وعظ کیے اور جو کوسی نگر میں مرا..

بھیم بسیار کے زمانے میں یہ دونوں آئے تھے..اس کی راجدھانی کا نام گری ورج تھا..اس کے چاروں اور سرسبز پہاڑیاں تھیں..اور خوبصورت دریا اور اس کی سرزمین شاداب تھی اور سونا بہا کر لانے والی سون ندی اس میں بہتی تھی

کوشلا دیوی..شراوتی کی شہزادی...مہاراجہ پرسین جیت کی بہن.....بھیم بسیار کی ملکہ نے گری ورج کے اتار میں راج گیر آباد کیا لیکن اس کے بیٹے اجات سترو نے اپنے باپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا..اور کود سنگھاسن پر جا بیٹھا...رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رو رو کر جان دے دی..تب شراوتی کے پرسن جیت نے گرج گرج کر کہا..میری لاڈلی بہن مرنے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی..اتر کی جمہوریتیں کاشی کوشل کی ساتھی بنیں...اور کوسی نگر اور ویشالی اور شراوتی مگدھ کے مقابلے میں صف آراء ہوئے

تب مگدھ کے وزراء نے ویشالی والوں کے حملوں کو روکنے کی خاطر پاٹلی گرام کی چھوٹی سی بستی کے چاروں اور ایک فصیل بنائی

مگر اجات سترو جیتا اور اپنے ماموں راجہ پرسن جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا ..اس کے پوتے اودے نے کسم پور آباد کیا پاٹلی گرام...پشپ پور::پاٹلی پتر ..پھولوں کا شہر..پریوں کا شہر...ملک کا سب سے عظیم الشان دارلسلطنت...جہاں

سون ندی کے کنارے کنارے دلیش ناریوں کے نقرئی بجرے تیرا کرتے تھے ..
جہاں پاٹلی کی کلیاں بالوں میں سنوارے سنہری آنکھوں والی سورنا کشتی لڑکیاں مر مریں چبوتروں پر رقص کرتیں

اور گوتم سدھارتھ نے پیش گوئی کی تھی کہا یک وقت آنے والا ہے .... جب یہ شہر آگ اور سیلاب اور جنگ کی نذر ہوگا...اودے اس شہر کا بانی ایران کے شہر داریوش اول کا ہم عصر تھا جس نے یونان پر قبضہ کیا

گوتم نیلمبر کو ایران سے بہت دلچسپی تھی اکلیش اور جو دوسرے طالب علم تکشلا سے واپس آتے، گوتم ان سے کرید کرید کر اس انوکھے ملک کے متعلق پوچھتا ... پارسیکاؤں کے شہنشاہ جو کہ بہت زبردست اور مطلق العنان تھے .... ان کی راج نیتی کے اصول جانے کیا ہونگے ان کے مذہب

میں اگنی کی پرستش مقدم تھی وہ ویدوں کے سارے خداؤں کو پوجتے تھے . ویو کے علاوہ جسے وہ واہیو کہتے تھے ..وہ سورج دیوتا متر اکو مانتے تھے .. ان کی زبان سنسکرت کی بہن تھی .. سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بھی آریا تھے۔

مگر دوسرے ملکوں پر وہ حملہ کیوں کرتے ہیں ؟ ۔گوتم نے اداسی کے ساتھ کہا ..انسانوں کیا یک جماعت کو دوسری جماعت پر قابض نہ ہونا چاہیئے .. کسی ایک قوم کا دوسری قوم کو تسخیر کرنا .. کسی ایک تہذیب کا دوسری تہذیب کی بیچ کنی کرنا غلط ہے ..اخلاقی گناہ ہے ... سایت کے نظریے کی بات مت کرو کہ ایک مچھلی دوسری مچھلی کو کھاتی ہے

ایرانیوں نے جب گندھارا دلیس پر حملہ کیا تو وہاں کے راجہ نے بھیم بسیار کے

پاس اپنا سفیر بھیجا تھا ہخامنشی شہنشاہیت نے سپت سندھو کے اتر پچھمی علاقوں کو اپنا باج گزار بنائے رکھا۔ سب سے زیادہ چاندی یہیں سے ایرانی خزانے میں داخل کی جاتی تھی

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی... اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا... اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اتراپتھ صوبے سبھی شامل تھے اور سریوش کے بعد دارا نے کہا تھا.. میں دارایوش ہوں.. شہنشاہ.. شاہوں کا شاہ.. ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں... اس وسیع و عریض زمین کا حاکم... گشتاسپ اک بیٹا... ایرانی.... ایرانی کا بیٹا.. آریہ... آریہ گھرانے کا فرزند.. اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پر تیرتے تھے...

اور دارایوش اول کے بیٹے ارتخشیر نے اتراپتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا.... یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے.. اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان م دیوں کے مندروں کی بنیادیں ہلا دئیں...

سوس کی کیا خبریں ہیں... تم تو وہاں آئے ہو.. وقائع نویس نے اکلیش کو مخاطب کیا تاھ

پچھلے دنوں کچھ تاجر پری سی پولیس سے جان بچا کر تکشلا آئے تھے وہ کہتے تھے کہ ایران میں بہت زبردست لڑائی چھڑی ہے

کہیں اور جنگ چھڑ گئی ہے..؟.. وملیشور نے دوسرے کونے سے سر اٹھا کر

سوال کیا

یاونوں نے جب سے ایران کی غلامی سے چھٹا کارہ پایا ہے...ایرانی سلطنت کمزور ہوتی جارہی ہے...تمہیں ایک بات بتادوں...اکلیش نے گوتم کو مخاطب کر کے کہا..وشنو گپتا مجھ سے کہتا تھا کہ ہمارے دیش کو بھی ایک چتر انت ریاست کی ضرورت ہے...جس کی دنیا کے چاروں کھونٹ تک وسعت ہو..مضبوط سامراجیہ

مجھے مضبوط سامراجیہ نہیں چاہیے..گوتم نے کہا..

ایرانیوں کی سلطنت ان کے شاہی خاندان کی پھوٹ نے ختم کی..اکلیش اطیمنان سے کہتا رہا...پچھلے دنوں اروشیر سوئم قتل ہوا.پھر اس کے بیٹے کو زہر دے دیا گیا...ان کے یہاں اتنی خون کی ندیاں بہی ہیں کہ اس کے بعد تخت پر بٹھانے کے لیے انہیں کوئی بھائی بھتیجا زندہ نہ ملا...اور وہ ایک دور کے عزیز دار کو پکڑ لائے ..پرسی پولیس کے اتجر کہتے تھے کہ دارا یوش سوئم بہت بہادر بادشاہ ہے..لیکن اس غریب کو یاونوں کے سیناپتی سکندر نے شکست دی جو کہ دور پچھم سے بڑی بھاری فوج لے کر آیا تھا

گوتم سنتا رہا...بھاری فوجیں.....خون کی ندیاں..شکست..فتح...اکلیش کتنے مزے سے یہ خوفناک واقعات بیان کر رہا تھا

اور اب سارا ایران سکندر کے ہاتھ میں ہے..اکلیش نے بات ختم کی

یعنی پارسیکاؤں کی چتر انت ریاست کا مالک...اب جس کا تم نے نام لیا ہے ...سکندر ہے.....

گوتم نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پوچھا..ہاں.....وہی ہے...اکلیش نے

یکلخت ذرا ہچکچا کر جواب دیا..وہ گوتم کے تبسم کے معنی سمجھ گیا تھا.....

بھائی اکلیش تم کھشتری ہو..حکومتیں قائم کرنا اور حکومتیں اکھاڑ کر پھینک دینا تمہارا کام ہے..میں تمہیں کیا سمجھا سکتا ہوں....گوتم نے کچھ دیر کے بعد آہستہ سے کہا.....

گوتم اکلیش نے چراغ میں تیل ڈال کر اسے پھر وسط میں رکھ دیا..اور گوتم کو غور سے دیکھنے لگا تم کو اگر کسی جنگ میں شامل ہونا پڑے تو کیا تم لڑنے سے انکار کرو گے؟

گوتم اکلیش کے اس سوال سے لڑکھڑا گیا..یہ سوال وہ مدتوں سے اپنے آپ سے کر رہا تھا....کیا دنیا میں ایسے لوگوں کی جگہ ہے جو کہ بغیر لڑے زندہ رہنا چاہتے ہوں...؟ اسے جو فنون جنگ سکھائے گئے ہیں کیا وہ استعمال کرے گا....؟

تم سمجھتے ہو کہ پرجا چپ رہے گی...کٹی کے دوسرے کونے میں بیٹھا ہوا جوگیش ولیشور سے کہہ رہا تھا...

ہرگز نہیں...دوسرے نے جوش سے جواب دیا..کوئی دن جاتا ہے...کوئی دن .....دیکھ لینا

گوتم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو کہ مگدھ کے سیاسی حالات پر زور شور سے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے.....

اجات سترو کے پوتے کے بعد مہا پدم نند پاٹلی پتر کے تخت پر قابض ہوا...اس کی ماں شودر تھی اور اس کا باپ نائی ....یہ مہا پدم پتی نند تھا..... بے حد و حساب دولت کا مالک...اور اگر سین تھا....زبردست فوجوں کا سپہ سالار ...اس کے

بعد اس کے آٹھ بیٹے بارہ سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اسی لیے یہ خاندان نو نند کہلایا... اس کا آٹھواں بیٹا دھن نند تھا.. جس کے خزانے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے پٹے پڑے تھے.... اور جس کے لشکر میں بیس ہزار سوار؛؛ دو لاکھ پیادے.. دو ہزار جنگی رتھ اور تین ہزار ہاتھی تھے... اور جو محصول بڑھائے جا رہا تھا... اور جس کی پرجا بے چین تھی

سارے دیش میں برہمنوں اور کشتریوں کا راج تھا.. سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی.. لیکن مگدھ میں مہا پدم پتی نند کے عہد سے کھشتریوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کے آغاز سے ہوا تھا

شراوتی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے .. برہمنوں کا احساس برتری.... آریاؤں کے اس دور کی یادگار تھا... جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی.. اس زمانے میں روما کا ہم عصر سماج اور فرانس کا کیتلک معاشرہ کاہنوں.... جنگجو سپاہیوں اور عام کاریگروں کے فرقے میں بٹا ہوا تھا... اور اس احساس برتری کا برہمنوں کے پاس اب بہر حال کوئی عالج نہ تھا...

اور گو طالب علم کا فرض تھا... کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے... لیکن گوتم اور اس کے جمہوریت پسند ساتھی شودروں کو بہر حال برداشت نہ کر سکتے تھے..

پاٹلی پتر کا دھن نند جو الاکھی کے دہانے پر بیٹھا تھا

۵..................................

ایک روز طالب علموں کی ایک ٹولی کے ساتھ ہری شنکر بھی آشرم میں آن موجود

ہوا...گوتم جو اس سے اپنی کٹی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک تصویر بنا رہا تھا...اسے دروزاے میں کھڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا...

میں اندر آجاوں..دہلیز پر پہنچ کر شنکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا

آو آو......کیسے آنا ہوا......گوتم نے گلہری کی دم کا موقلم اور رنگوں کی کلیاں اور سفید چینن پٹہ ایک طرف کو سمیٹتے ہوئے کہا

ہری شنکر آتے کے ساتھ ہی چینن پٹے کو گور سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا

گوتم نے جلدی سے فرش پر دوبارہ جھاڑو پھیر کر چٹائی بچھائی....بھوج پتر....ریشم اور تانبے کی تختیوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو جو انبار چاروں طرف بکھرا پڑا تھا اسے سمیٹ کر ایک کونے میں رکھا...دوسرے کونے میں گنتی کے چند برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے..کھڑکی کے نزدیک اس کا کمبل بچھا تھا...جس پر وہ رات کو سوتا تھا...اس کا کشکول چھپر کے ایک بانس میں ٹکا تھا کٹیا میں اس وقت خاصی بے ترتیبی تھی....گوتم کو بڑی ندامت محسوس ہوئی.....وہ ہری شنکر کی سحر انگیز اور پر سکون شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا...جانے یہ مجھے کیسا بے ڈھنگا لڑکا سمجھے گا...اس نے پریشان ہو کر سوچا...پھر سرعت سے مہمان نوازی میں جت گیا

اس نے ٹھنڈے پانی کی گڈوی ہری شنکر کے س سامنے رکھی..پھر برآمدے میں جا کر چولہا روشن کے اور چاول ابلنے کے لیے چڑھا دیے..

ہری شنکر متبسم انداز میں اپنے میزبان کی یہ ساری تیاریاں دیکھ رہا تھا گوشت کے بغیر مہمان نوازی مکمل نہ ہو سکتی تھی..اسی بڑابڑاہٹ میں وہ چادر کو کندھے پر ڈال کر باہر جانے کے لیے اٹھا

کہاں جاتے ہو...؟شنکر نے چونک کر دریافت کیا

بستی سے ماس مانگ لاوں...ابھی آیا

ماس........ہری شنکر کے خوبصورت چہرے پر کرب کی لہر دوڑ گئی

ارے ...گوتم دفعتا خاموش ہو گیا.اسے اور زیادہ خفت محسوس ہوئی..اسے اپنی بے وقوفی پر سخت غصہ آیا...وہ جانتا ہے کہ ہری شنکر بھکشو ہے..اور راہنسا کے اس نئے اصول کا قائل ....پھر اسے شنکر کو ماس کھلانے کا خیال کیسے آیا کیونکہ وہ خود مدتوں سے ماس کھانے کے لیے بے چین ہے..لیکن برہمچاریہ کے قوانین کو توڑ نہیں سکتا ..اور یہ انوکھا بے تکا بھکشو اسے بے حد عزیز ہے اور اپنی عزیز ہستی کو اپنی پسندیدہ شے ہی پیش کر کے دل کو سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے..اس طور پر اپنی حماقت کا تجزیہ کر کے اسے ذرا اطیمنان حاصل ہوا..دفعتا اسے خیال آیا کہ ایک اور پسندیدہ شے ہے جو کہ وہ سوجو کے پاس چھوڑ آیا ہے...غالباوہ دونوں چھوڑ آئے ہیں..اور اس ء ہری شنکر جانتا ہے ...اور حسد کا جزبہ اس کے دل میں اٹدا...اور اس کے چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا..

پھر وہ ہری شنکر سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا..وہ اتنے دنوں تک کہاں رہا ؟..کہاں کہاں گیا؟..کیا کیا سوچا...کیونکہ سوچنا ہی ان لوگوں کا خاص مشغلہ تھا

اس کے بعد اس نے شنکر کے سامنے سے اس کے جھوٹے برتن اٹھائے

تم میری اتنی عزت کیوں کرتے ہو..شنکر نے پوچھا..

پتا نہیں..کیونکہ اگر دیکھا جائے تو میں خود کافی عزت کے قابل ہوں..اس نے ہنس کر جواب دیا

برہمن ایک بات بتلاو

ہوں

خواہشیں تم کو بہت ستاتی ہیں

یعنی

مثلاً..یہی ماس کی خواہش

پتا نہیں...

تم نے کبھی قربانی کے فلسفے پر غور کیا ہے؟

آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں ..مگر کس طرح کی قربانی ...جان کی ...یا روح کی ...؟ جو بھی شے تمہارے تصرف میں آئے گی ..وہ گویا اپنے وجود کی قربانی تمہیں دے گی

میں سمجھا نہیں

تم خوب سمجھتے ہو

میں کیا کر سکتا ہوں اگر ..گوتم نے گھبرا کر بات کو ٹالنا چاہا...اگر میرے پس منظر میں خون ہے ..میرے چاروں طرف خون ہے ..میں اتنے سارے خون کا کفارہ کس طرح ادا کرونگا؟

ہری شنکر خاموش رہا..پھر وہ دونوں کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے

باہر سبزہ زاروں میں کسانوں کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں ...اور چرواہوں کی بانسریوں کی آوازیں آرہی تھیں ...شکاریوں کے بالوں میں سجے ہوئے پر ہوا میں لہراتے تھے ..ندی کے اس پار کھشتری امیر زادے اپنے باغوں میں

تیر اندازی سیکھنے میں مصروف تھے

زندگی جاری تھی

مجھے زندگی کے متعلق کچھ بتلاو

تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے ...میری زندگی سے علیحدہ ہے ..میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا

گوتم نے ڈھیرے سے کونے میں جا کر تاڑ کا ایک صاف پتہ اٹھایا..مجھ سے امن کے متعلق باتیں کرو..میں لکھوں گا..وہ...اس نے قلم نکالا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا..میں اپنی کتاب کا دوسرا باب لکھوں گا

لیکن تمہاری کتاب کا آخری باب کون لکھے گا...

سارے میں تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے..جس میں ہم اور تم پتوں کی طرح ڈول رہے ہیں...مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی زمہ داری مجھ پر ہے یا نہیں ...؟ بتاو میں کیا لکھوں...گوتم نے پوچھا

وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں ...سب خواب کی طرح گزر رہا ہے ....گزر جائے گا...ہری شنکر نے جواب دیا

گزر جائے گا یا گزرتا رہے گا...؟ گوتم نے پوچاھ

یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے....

مجھے اہنسا کے متعلق بتاو

برہمن ہو کر اہنسا کے قائل ہونا چاہتے ہو...ہری شنکر نے ہنس کر پوچھا

گوتم بھی ہنسا....ہاں بڑی عجیب بات ہے ہے ناں؟ اس نے نظریں اٹھا کر

شنکر کو دیکھا

جانوروں کو مارنا ہزاروں برسوں سے برہمنوں کا خاص مشغلہ رہا ہے..جب یہ آریہ مشرقی یورپ اور وسط ایشیا کی چراگاہوں میں گھومتے تھے.تب زندہ رہنے کے لیے اور گرم رہنے کے لیے درندوں کا شکار ان کے لیے ضروری تھا...اسی وجہ سے گنگا اور جمنا کے انتر ویدی علاقے میں آن کر بسنے کے بعد بھی ان کی معرفت اوران کے فلسفے کے ارتقاء میں جانورون کے خون بہانے کا بڑا دخل رہا ہے...ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی...سام ویدوں کے اصولوں کے مطابق قربان گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی...خود تخلیق کائنات مابعد الطبیعات کے نقطہ نظر سے ایک عظیم آفاقی قربانی تھی..اور کائنات کی کلیت اور اس کے بقاء کی علامت تصور کی جاتی تھی:...چکروتی راجہ کے لیے گھوڑے کی قربانی لازمی تھی

کھیتوں کے اس پار الاؤ روشن کیے جا رہے تھے..بہت دور گاؤں کے سرے پر چوپال میں محفل جمی تھی..بھاٹ جنگ عظیم کی داستان سنا رہا تھا..شام کے مکمل سناٹے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی پاٹ دار آواز کی لہر تیرتی ہوئی گوتم کی کٹی سے آٹکرائی...پھر خاموشی چھا گئی...

لیکن گوتم کا دل دھڑکتا رہا

یہ سناٹے مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتے ہیں..الفاظ کے خاتمے میں بھی میری نجات نہیں..گوتم نے اپنے آپ سے کہا اور رہری شنکر کو دیکھتا رہا...

قربانی کا تصور...لڑائی کا فلسفہ...جنگ اور امن کا مسئلہ..یہاں برہمن تلوار

لیے گھومتے تھے ....اور کھشتری فلسفی بن جاتے تھے ..ورن اور جاتی کی تفریق ابھی شدید نہیں تھی ...نیتی شاستر ..ویدوں اور اتہاس پرانوں کی تعلیم برہمن اور کھشتری دونوں کے لیے لازمی تھی...ویدوں کے عہد میں پتھی کرت اگنی ...راستے تیار کرنے والی مقدس آتش ...کی عبادت گھنے جنگلوں میں پگڈنڈیاں بناتی مشرق تک پہنچ چکی تھی.... پورب میں گوتم نیلمبر کے سفید فام ہم قوموں نے ناگاوں کو اپنی تہذیب کے دامن میں سمیٹا...پچھم میں سندھو کے کنارے بسے ہوئے شہروں پر اندر کا قہر ٹوٹا ... ہری یوپیا کا نگر میدان کارزار میں تبدیل ہو گیا ...جہاں نادر کے زرہ بکتر میں ملبوس ...سپاہی لڑے اور فتح یاب ہوئے ...سندھو کا شہر... جہاں کہنیوں تک کپڑے پہنے ہوئے... ماتھے پر تلک لگائے ہوے ... گلے میں سیاہ پوتھ پہنے ...کندن کے رنگوں والی سہاگنیں ...شیو ...درگاہ ...دیپ ...لاکشمی اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتارتیں یہ لوگ جنہوں نے اپنے تمدن کو راجھستان ...سوراشٹر اور پچھمی اتر پردیش تک پھیلایا تھا....ایک روز شمال مغرب کے اونچے پہاڑوں کے اس پار.... کسی انجانے دیش سے گویا اندر مہاراج کا سب رفتار جنگی رتھ آیا..اور ان سب کو روندتا ہوا آگے نکل گیا

برہم ورت پہنچ کر یہ سنہری رتھ رک گئے....اور ان لوگوں نے اندر پرستھ آباد کیا...اور حمدیں لکھیں اور موسیقی تیار کی

اب تہذیب کے مرکز اندر پرستھ اور یادو خاندان کی راجدھانی سے ہٹ کر مشرق تک آچکے تھے ...یہ ایودھیا اور شرواستی اور اجینی کے عروج کا زمانہ تھا ...مگدھ اور اتر کوشل کے انتہائی مہزب باشندے اب شمال مغرب اور سرسوتی کے

اس پار رہنے والوں کو نیم وحشی اور جاہل گردانتے تھے

گوتم نیلمبر کی تاریخ عظیم ناموں سے پر تھی..ان میں سے بہت سے نام اب روایت اور اسرار کے دھندلکے میں جا چھپے تھے ...جس طرح ہماوت کی اونچی پہاڑیوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے...

گوتم کو ماضی سے ڈر لگتا تھا...کیا ضرورت تھی....کیا وجہ تھی کہ ان سب کا یہ تسلسل قائم تھا...جاری و ساری...اور کب تک ایسا رہے گا...ڈگ وجے شری رام چندر کے عہد سے دواپار شروع ہوا تھا..جس کا اختتام جنگ عظیم پر ہوا...مہا بھارت کے بعد ...سری کرشن کے عالم موجودات سے روپوش ہونے کے ساتھ ہی کالی یگ شروع ہو گیا...جو کہ اب تک باقی تھا

اس کالی یگ میں کیا ہو گا؟

پرانوں کی داستانیں اس نے پڑھ رکھی تھیں...جن میں کائنات کی مادے سے تخلیق کا بیان تھا...اور خداوں اور فلسفیوں کے قصے اور شاہی خاندان کے نسب نامے ... پراکرت کی تاریخوں پر ان قصوں کی بنیاد تھی ...جو کہ صدیوں سے درباروں اور چوپالوں میں داستان گو سناتے آ رہے تھے ...ان پرانوں میں چالیس چالیس ہزار اشعار ہوتے تھے ....جو وشنو اور شیو کی حمد کے ساتھ شروع کیے جاتے تھے... پرانوں کے مطابق ارجن کے پوتے کے وقت سے لے کر جس کے دربار میں پہلی بار جنگ نامہ مہا بھارت سنایا گیا تھا..مہا پدم نند کے عہد تک ایک ہزار سال کا وقفہ گزر گیا تھا...ارجن سے لے کر اودے تک چوبیس پشتیں گزر چکی تھیں...اودے کے دور حکومت میں شاکیہ منی پیدا ہوئے

گوتم نیلمبر نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا جو کہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پیتل کی ایک تختی پڑھنے میں مصروف تھا۔۔کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول غروب آفتاب کی روشنی میں قرمزی نظر آرہے تھے۔۔۔گوتم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی

اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہوگا؟ کہ کون کس سے برتر ہے۔۔۔کس نے کس پر فتح پائی۔۔۔کون کورو ہے کون پانڈو؟

جنگ عظیم آج سے سینکڑوں برس قبل کوروکیشتر میں لڑی گئی تھی۔۔۔اور ہستنا پور کے ان بہادروں کے قصے۔۔جنہوں نے دروپدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندر پرستھ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا۔۔گانے والے وینا اور مردنگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے سورماؤں کا تذکرہ رگ وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا جس میں ہر چیز اصل سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔۔بادلوں کی گرج۔۔ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔۔عظیم معرکے۔۔۔۔دلاور سورما۔۔نورانی رشی۔۔۔آسمانی سنگیت۔۔پری وش لڑکیاں۔۔شکنتلا۔۔دمینتی۔۔کاشی کے راجہ کی بیٹی امبا۔۔۔یہ سب طلسماتی ہستیاں ڈیڑھ دو ہزار برس قبل زندہ رہی ہونگی۔۔انہی جگہوں پر چلتی پھرتی ہونگی۔۔یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب سا لگتا۔۔کہ ایک وقت تھا کہ نربدا اور تاپتی کے درمیان راجہ نل کی حکمرانی تھی۔۔دمینتی برار کی راج کماری تھی۔۔سیتا مہارانی کے بابا کا ملک اسی گنگا کے اتر میں گنڈک ندی کے کنارے آباد تھا۔۔پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہوگیا۔۔اور یہ وقت جس میں وہ زندہ تھا وہ خود گوتم نیلمبر برہمن۔۔ہری شنکر بھکشو۔۔جو کہ کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تاھ۔۔اور رایودھیا کی چمپک اور باہر آشرم کے کنج میں ٹہلتے ہوئے طالب علم۔۔یہ سب کے سب ایک آن میں ما

ضی کے دھندلے ..نا قابل یقین..غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے ..جن کی کائنات کے ..وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہوگی ..بھیم..دریودھن..کرشن..ارجن..

اگر کسی وقت مجھے جنگ میں شامل ہونا پڑ گیا تو کیا میں لڑوں گا؟..اس نے چوروں کی طرح ہری شنکر کو دیکھا..اکلیش کہہ رہا تھا کہ جنگ کوئی دن جاتا ہے کہ چھڑ جائے گی.تم لڑو گے؟..اس نے یکلخت بآواز بلند سوال کیا..

ہم محض اپنے خیالات کا نتیجہ ہیں..ہری شنکر نے جواب دیا

لیکن کیا تم لڑو گے؟ گوتم نے ضد سے دہرایا

ہر انسان سے اس کے افعال..ضرورت یا حادثے یا اس کی فطرت کی وجہ سے سرزد ہو جاتے ہیں..وہ خود مختار نہیں ہے ذمہ داری کی کوئی اہمیت نہیں..ہری شنکر تختیاں ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے نزدیک چلا گیا

دفعتاً دریا پر بہت سی روشنیاں جھلملا اٹھیں..

کسی کی بارات جا رہی ہے..گوتم نے اظہار خیال کیا....

ہوں....

یا ممکن ہے شاہی بجرے نے ادھر کا رخ کیا ہو..

چلو باہر چلیں..اندھیرے میں میرا دم گھبراتا ہے..ہری شنکر نے بیک وقت وحشت زدہ ہو کر کہا

وہ دونوں آشرم کے باغ سے نکل کر گاؤں کے راستے پر آ گئے..بارشوں کا زمانہ....ختم ہو چکا تھا.فضا میں ہلکی سی خنکی آ گئی تھی چوپال کی طرف سے بھاٹ کے

گانے کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی

گوتم خاموشی سے شنکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا..پھر ٹھٹک کر اس نے اداسی سے کہا.تم خود پرست ہو ہری شنکر..تم کو دوسروں کی پروانہیں..اپنے ذہن کے بل پر اپنے آپ کو ارہت کے درجے پر پہنچا دینا کونسی بڑی بات ہے..تم کو اس سے کیا غرض کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے

مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے..ہری شنکر نے مختصر جواب دیا..آؤ ادھر چل کر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

گوتم چپ ہو گیا...وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے

تم بھیشم کا قصہ سنو گے..مجمعے کے قریب پہنچ کر گوتم نے غیر یقنی سے انداز میں اپنے اس تھی سے پوچھا

کیا حرج ہے اسے جواب ملا

ان دونوں کے برہمچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تعظیماً ان کے لیے جگہ خالی کر دی..بھاٹ لہک لہک کر قصہ سنایا گیا..گوتم نے اسے پہچان لیا..اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر اسے پرنام کیا اور خود بھی قصے سننے میں مصروف ہو گیا..یہ لوگ صدیوں سے اسی طرح گاتے بجاتے اور ان داستانوں پر سر دھنتے چلے آرہے تھے...رگ وید کے زمانے سے اندرا اور دوسرے خداوں کی تقدیس کے لحن الاپے جاتے تھے بادشاہوں کے اشومیدھ [گھوڑے کی قربانی] منعقد کروانے والے فرمانرواوں کے قصے پڑھے جاتے تھے..اس نے ایسے ایسے دان دیے..ایسی ایسی لڑائیاں لڑیں..ایسی ایسی فتوحات حاصل کیں اور کاہن ہوترا

سے کہتا۔۔قصے کا آغاز کرو۔قربانی کرنے والے کو دوسرے انسانوں سے اوپر اٹھا

و۔۔شام پڑے بربط نواز اترمندر راگ کی دھن میں رمزیہ گیت چھیڑتے

عہد عتیق میں ارجن ۔۔واسو دیو اور دوسرے بہادروں کے دربار میں اسی طرح

وینا۔مردنگ اور شنکھ کی سنگیت میں یہ نغمے الاپے گئے تھے

سر مسلسل ہے۔۔۔۔

پرانے زمانے میں درباری بھاٹ کھشتری ہوتا تھا۔۔بعد میں درباری شاعری نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا۔۔اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ختم ہو رہی تھیں۔۔۔اور شاعر جو کہ پہلے درباروں سے وابستہ تھے۔۔اب گلی گلی اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی روزی کماتے تھے۔۔رسمی اور باضابطہ مزہب کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔۔خالص رزمیہ شاعری میں مزہبی عنصر شامل ہو رہا تھا۔۔پروہتوں نے مہابھارت کے جنگ نامے کو اخلاقیات کے درس میں تبدیل کر دیا تھا۔۔۔کھشتری بھاٹ کی جگہ برہمن داستان گو نے حاصل کر لی تھی۔۔تاریخ رفتہ رفتہ پیچھے پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔۔تاریخ کے کردار فلسفیانہ اور مذہبی لبادہ اوڑھ چکے تھے

اب داستان گو کاشی کے راجہ کی بیٹی تینوں بیٹیوں کی کہانیاں سنا رہا تھا۔۔جن کو بھیشم میں ان کے سوئمبر کے وقت لے اڑے تھے۔۔کچھ دیر کے بعد ارجن کا قصہ شروع ہوا۔۔گوتم اب ذرا آرام سے ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا تھا۔۔ہری شنکر ماحول سے بے نیاز دوسری سیڑھی پر بیٹھا رہا۔۔

یہ ارجن بھی خوب شے تھے۔۔گوتم نے سوچا۔سب سے پہلے انہوں نے درپدی سے بیاہ رچایا۔جب بارہ برس کی بن باس انہیں ملی تو وہ سری کرن کی بہن سبھدرا کو

بھگا کر لے گئے جلا وطنی کے زمانے میں منی پور کی شہزادی چترانگدا سے شادی کر لی..ان سب کے علاوہ بھائی ارجن نے الوپی کو پرچایا..وہ الگ..گوتم کو ہنسی آ گئی وہ ذرا غور سے کہانی سننے میں مصروف ہو گیا

اس وقت تک دونوں فریق کوروکھشتر کے میدان میں آمنے سامنے پہنچ چکے تھے..رزمیہ شاعری میں نسلوں یا قوموں کی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کا ذکر نہ ہوتا تھا.. بہادر سورماوں کا مقابلہ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ اصل موضوع تھا ..شہرت حاصل کرنا سورماوں کا اصل مقصد حیات تھا..اور اپنی شجاعت پر نازاں ہونا اس کے لیے جائز..اس کے حریف کے لیے لازم تھا کہ اس کے ہم پلہ ہو ..بادشاہوں کے بیٹے اپنے سے کم حیثیت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے تھے..جس وقت گوتم سبھا سے اٹھ کر باہر جانے لگے..اس سے ارجن للکار کر کرن سے اس کا شجرہ نسب دریافت کر رہا تھا

مہابھارت کے یہ سارے کردار جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے..یہ روایتیں نہیں تھیں..تاریخی شخصیتیں تھیں..حتکہ نیم الوہی کردار بھی صحیح تھے..جن کی دیبی لکشمی کی طرح کنول کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی..اور جن کی جٹاوں سے گنگا بہتی تھی..کیونکہ گوتم اپنے ملک کے شعراء کے زور تخیل کا بڑا قائل تھا..اور دیو مالا بہر حال فلسفے کی ٹھوس شکل تھی..اور روایت کا جال بن لینا ذہن کے لیے بہر حال آسان ترین بات ہے..گوتم خود بھی شاعر تھا اور شاعر ہمیشہ اپنے کرداروں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہی آئے ہیں..اروشی اگر اپسرا تھی تو کیا وہ لڑکی جو کہ ایودھیا کے گھاٹ پر بیٹھی تھی..کوئی بھی کوی اسے اپسرا نہیں سمجھے گا تو کیا سمجھے گا کیا وہ اس روز پا

نی کے کنارے بیٹھی جل پری نہیں محسوس ہو رہی تھی؟

سڑک پر آ کر تاروں بھرے آسمان کے نیچے گوتم نے ایک لمبا سانس لیا.. بھاٹ کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی.. بھیم.. ارجن.. کرن.. بھیم

جگمگاتے ہوئے بجرے دریا کو عبور کر چکے تھے.. اور دور سے ندی کے گھاٹ پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی.. یہ کسی کی بارات ہے؟

اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا

نہیں تو.. راجن ایودھیا سے آئے ہیں.. راہ گیر نے جواب دیا

گوتم نے چونک کر شنکر کو آواز دی.. پھر پلٹ کر چاروں طرف نظر دوڑائی.. لیکن شنکر حسب معمول غائب ہو چکا تھا.. اور گاؤں والوں کی بھیڑ میں جو کہ چوپال کے باہر جمع تھی شنکر کا پتا چلانا لا حاصل تھا..

گوتم نے چادر کندھے پر ڈالی اور شہر کی طرف چل کھڑا ہوا

وسط شہر میں پہنچ کر اسے اپنی حویلی کی روشنیاں دکھلائی پڑیں.. وہ فوراً دوسری گلی میں مڑ گیا.. سنہرے اور سبز اور گلابی مکان پر ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی.. ایک عورت لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے چھاگل بجاتی قریب سے گزر گئی.. تاڑی خانوں میں ہلڑ مچ رہا تھا

دکانوں پر خرید و فروخت ہو رہی تھی.. بازار کی سڑک پر دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں.. ان کی جھلملاتی روشنی میں شہر کے امیر زادے اور بانکے زرتار کپڑے پہنے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھرتے تھے.. بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں.. اس ہجوم میں خود کو موجود پا کر ایک لمحے کے لیے گوتم کو بڑا اچنبھا سا

ہوا..میں یہاں کیا کر رہا ہوں..تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شہر سے باہر نکل گیا..جدھر آم کے کنج میں ایک خاموش عمارت پتوں میں چھپی کھڑی تھی..اس عمارت کے سامنے جھیل تھی..جھیل میں ایک اکیلی ناؤ جس کا ملاح مسافروں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا..

اس عمارت میں سو سال ادھر شاکیہ منی آ کر رہے تھے..اس کنج میں ان کے چیلے گھوما کرتے تھے..صرف سو سال ادھر

گوتم کا جی چاہا کہ وہ عمارت کے اندر جائے اور اس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہے..مگر قریب جانے کی بجائے وہ پھر صرف آدھے راستے سے لوٹ آیا ..اور آہستہ آہستہ آشرم کی طرف روانہ ہو گیا

آزادی نہیں ہے..آزادی نہیں ہے..کھلی فضاؤں میں..بر ساگر کی لہروں میں ..ذہن کی وسعت میں..آزادی کہیں نہیں ہے میں بندھا ہوا ہوں..میں کچھ نہیں کر سکتا..کچھ نہیں کر سکوں گا..

یہاں تک کہ ایک روز تاریخ ....ناموں کا تسلسل..زمان و مکان مجھے نگل جائیں گے..

آشرم میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گرو کے جھونپڑے میں چراغ جل رہا تھا ..وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا..جہاں اکلیش اور دوسرے طالب علم جمع ہو چکے تھے

۶..

گرو نے وینا ایک طرف رکھ دی اور سر اٹھا کر گوتم کی طرف دیکھا.....یہ ہے .....یہ ہے.....یہ نہیں ہے.....یہ نہیں ہے.....

ہاں گوتم نے جواب دیا...

قید کی حالت میں آنند مایہ سب سے بڑی مسرت ہے جو جیو حاصل کر سکتا ہے

..گرو نے کہا

آنند مایا سب سے بڑی مسرت ہے..گوتم نے دہرایا

مقید روحوں کے لیے پرکھوں کی راہ موجود ہے..وہ جسے بار بار جنم لینا ہے...

میرے پرکھ... بھاٹ کی آواز گوتم کے کانوں میں گونجی

اور روح دھوئیں اور رات اور راماوس کی اندھیری تاریخی راتوں میں سے گزرتی ہے ..وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا ..وقت سے تم بچ نہیں سکتے ..اور اپنی اصلی حالت کو پا کر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی...

گرو نے مزید کہا

وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں ..کوئی منطق ..کوئی طاقت..وقت پر تمہار اقابو نہیں رہ سکتا..جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا ہے

لیکن آنکھیں کہاں ہیں؟..گوتم نے سوال کیا..پراکرتی اندھی ہے..اور پرش لنگڑا رہی ہے..جو کہ اندھی پراکرتی پر سوار ہے..

پراکراتی اندھی ہے اور بے حس..گرو نے جواب دیا..پرش اسے دیکھتا ہے تو شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور دخلی اور ذہنی دنیا میں اکٹھا ارتقاء ہوتا ہے..اور ادراک اور خیال کی تخلیق..پراکرتی ابدی ہے..ہمہ وقت مصروف عمل..جب تک پرش کی نظروں میں رہے ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے..بے حس مادہ ذہن کی جوت سے روشن ہو جاتا ہے..ذہن میں بڑی طاقت ہے

ذہن میں بڑا خطرہ ہے..اکلیش نے کہا..ویدانت میں لکھا ہے..گیان نیکی اور بدی سے زیادہ اہم ہے.....کیونکہ خیر و شر مایا میں شامل ہیں..اور گیان مایا سے نجات دلاتا ہے

...میں گیان سے عاجز آچکا ہوں...

گرو نے کہا..ادراک انانیت کے بغیر کام نہیں کر سکتا..لہذا دنیا کو خارجی اور عملی میں تقسیم کرنا ضروری ہے..یہ میں ہوں..یہ باقی دوسری چیزیں ہیں..برہما ایک ہے..جیوآتمائیں بہت سی ہیں..جو کچھ ہے وہ اس کا نتیجہ ہے..ہم اپنی حسیات کی وجہ سے نہیں ہے..پراکرتی رقاصہ ہے..پرش اسے دیکھ رہا ہے..جب وہ اس کی طرف سے آنکھیں اٹھالیتا ہے..تو وہ بھی اسے نہیں دیکھتی..کیونکہ دوسرے پرش اسے دیکھ رہے ہیں..بالآخر وہ ان پرشوں کو آزادی عطا کر دیتی ہے...پرش باہر اندھیری رات میں آ کر آزاد ہو جاتا ہے..

لیکن دکھ کون سہتا ہے؟پرش یا اس کی پارکراتی..گوتم نے سوال کیا

دکھ کا تعلق پراکرتی سے ہے..مقید زندگی کا حساس بذات خود تکلیف ہے..گرو نے جواب دیا

ویدانت والے کہتے ہیں..کہ پرش ایک ہے..ایکم است..اکلیش نے پوچھا

ہاں اور کپل کا کہنا ہے کہ پرش ایک ہوتا ہے..تو اگر ایک انسان خوش ہوتا ہے تو سارے انسان خوش ہوتے ہیں..ایک رنجیدہ ہوتا تو سارے کے سارے رنجیدہ ہو جاتے..لیکن انسان اپنے اعمال اور اپنی نسل اور اپنی زندگی کے ادوار اور ورن آشرم کے لحاظ سے مختلف ہیں..گرو نے کہا

بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا.. کہ پراکراتی کے گن اعمال پر اثر انداز ہو تے ہیں.. لیکن خودی یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں.. اکلیش نے کہا

اورشا کیہ منی نے پوچھا ہے کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں.. ممکن ہے یہ سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں.. گوتم نے دل میں سوچا

پراکراتی کے تین گن ہیں.. نیکی.. شدت اور تاریکی.. گرو نے کہا

گوتم آہستہ سے اٹھا.. اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا.. اور دوبارہ ندی کی سمت چل دیا.. کچھ دیر قبل جس طرح بھاٹ کی آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا.. اب گرو اور اکلیش کی کی مدھم آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں.. ست کار یہ وار.. او دیا.. مایا.. شکتی .. پراکرتی.... پراکرتی کے گن..

ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے خود کو ٹھنڈی گھاس پر گرا دیا

اپنشد میں لکھا تھا کہ جس کو اپنی آتما کی تمنا ہے اس کے لیے باپ باپ نہیں ، ماں ماں نہیں.. دنیا دنیا نہیں.. دیوتا دیوتا نہیں.. چور چور نہیں.. قاتل قاتل نہیں ہے .. اس کو نیکی اور بدی کی فکر نہیں ہے.. کیونکہ وہ دل کے سارے رنجوں پر فتح پا چکتا ہے

گوتم نیلمبر اب چوبیس سال کا ہو چکا تھا.. اتنی مدت میں پہلے وہ سوفسطائی بنا پھر اس نے شو کی پوجا کی.. ہری کا بھگوت بنا.. کپل کے نظریوں پر اس نے بسیط شرحیں لکھیں.. اس نے اپنے ہم نام فلسفی گوتم کا مطالعہ کیا.. جس نے براہمنوں کے مذہب کے قوانین بنائے تھے اور وقت کے مسئلے پر سوچ بچار کیا تھا.. ہری شنکر سے ملنے کے بعد اسے گوتم سدھارتھ سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی.. لیکن ابھی تک وہ اس دلیس کی ازلی اور ابدی سوچنے اور کھوجنے والی روح تھی.. جو کہ کبھی اور کسی جگہ مطمئن

نہ ہوتی تھی..جو برابر اس سوال کے جواب کی تلاش میں مصروف تھی کہ ہم کس طرح جانیں؟

وہ مدتوں سے اس کھوج میں تھا...

ہم کس طرح جانیں یہ سب کیا ہے..

وہ سہا ہوا گھاس پر لیٹا رہا.پچھلے پہر کی مدھم چاندنی سائیں سائیں کر رہی تھی..لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ اس کا ذہن صفر کے نقطے تک پہنچ گیا..پھر اس نے اپنے آپ کو ان گنت حصوں میں تقسیم کر دیا..بہت سے گوتم جو بول رہے تھے..گا رہے تھے..لکھ رہے تھے..قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے..اداس سے..اچنبھے میں تھے ..اسے اور زیادہ ڈر لگا..گرو کی آنکھوں میں اسے وہ خود نظر آیا..جو کہ چراغ کی روشنی میں اسے گھور رہی تھیں..اور بالوں کی سفید جٹائیں اسکے کندھوں پر بکھری تھیں ..کلیش کا مسکراتا چہرہ..بازار کے لوگوں کی شکلیں.نوکیلی مونچھوں والے زرگر ک.. پرسکون چہرے والے بھکشو..چندھی آنکھوں والے پہاڑی..ان سب میں اسے اپنا آپ نظر آیا..اور اسے اور زیادہ ڈر لگا..آجکل اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی ویران مندر کے تاریک گربھ گرہ میں چھپ جائے اور اندر سے کنڈی چڑھا لے..گربھ گرہ کے خیال پر اسے چنڈی کی بھیانک مورتی یاد آئی ..جس نیا سے سرجو کے کنارے ڈرایا تھا

یہ ساری دنیا مل کر چاروں طرف سے اس پر حملہ آور کیوں ہو رہی تھی؟ سب اس کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے تھے..اس لشکر میں وہ گھاٹ والی لڑکی شامل تھی ..ہری شنکر شامل تھا..گرو پرشوتم اور سارے نئے اور پرانے حکماء شامل تھے....خدا

کا تصور شامل تا تھ ..اس نے آنکھیں بند کرلیں ..اور کوشش کر کے اپنے ذہن کو ماسواء سے عاری کرنا چاہا اس نے سوچا کاش وہ کم ازکم یوگا کا ہی ماہر ہوتا ...کاش ایک لطیف سا خلاء اس کے ذہن میں آ کر کہیں سے بھر جاتا ..آخر اس کا کیا قصور ہے؟ اس نے تو ہمیشہ جاننے کی کوشش کی ہے ...

اسے وقت سے نہیں ڈرنا چاہیئے

وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سڑک کے کنارے بیٹھ گیا ..تھکے ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کرلیں ..اس نے سوچا جیسے وہ زمان مکان سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اوپر اٹھتا جارہا ہے ..چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح صرف وہ تنہا موجود ہے ..دنیا کا ازلی اور ابدی انسان ..تھکا ہوا ..شکست خوردہ ..بشاش ..پرامید ..رنجیدہ ..انسان جو خدا میں ہے اور خدا سے الگ ہے ..کائنات کا اولین ذی ہوش جسے یہ ساری چاندنی ..سارے پھول ..ساری ندیاں ..سارا حسن دے دیا گیا ہے ..اولین روشنی کا زمانہ اور برہمنا کا سارا محل سنسان پڑا ہے ..اس میں محض نور ہے ..نور کی دنیا سے ایک ہستی آن گری ہے جو پرش ہے اور اکیلا ہے ...

اس اولین انسان نے آنکھیں کھول کر چاروں اور نظریں دوڑائیں ..اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور دور دور تک بستیاں جگمگا اٹھی ہیں ...اور کھیتوں میں سرسوں لہراتی ہے اور اودگاتری برہمن ست تانتو ساز کے سو سو تار چھیڑ کر سام وید کے گیت گا رہے تھے ..اور اندورم جھم برس رہی ہے ..باغوں کا نوجوان خدا اندر لڑکیوں کی چنریاں اپنی پھور سے بھگوئے ڈالتا ہے ...سنہرے بالوں والے نوجوان

آریہ سورما میدان میں رتھ دوڑا رہے ہیں ..ان کے ہاتھوں میں تیر کمان ہیں ..یہ جنگ اور شاعری کے دیوتاؤں کے پرستار نوجوانوں کا عہد ہے ..شجاعت کا دور .. طاقتور کمزور کو زیر کرتا ہے ..یہ بے خوف نڈر انسان عناصر سے ..ظلم سے ..موت سے لڑتے ہیں ..سوم پی کو رقص کرتے ہیں ..ان کا فلسفہ تیاگ کا فلسفہ نہیں ہے ..یہ زندگی پر جی جان سے عاشق ہیں ..انہوں نے پھولوں کے نگر آباد کیے ہیں ..مٹی کے فصیلوں والے پور بنائے ہیں ..لکڑی کے مکانوں میں اگنی شالائیں روشن ہیں ..پتھر کے قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں جمنا کی وادی میں گائیں چر رہی ہیں ..رنگین پگڑیاں باندھے ..بالوں کی چار چار چوٹیاں گوندھے ..مرگ نینی لڑکیاں پشپ کرما کے لیے پھول چن رہی ہیں ... ہمالیہ کی وادی میں عظیم شوالک دریا بہہ رہا ہے ..سبزہ زاروں میں ویویکا ..اور الکھ نند اور بھاگرتی ندیاں گنگناتی ہیں ..سریو ..اور ورناوتی کوشل دیس کو سیراب کر رہی ہیں ..اتر میں گیہوں کے کھیتوں کی کبھہ اور وتستا اور ویاس آبیاری کرتے ہیں ..جنوب میں مہاندی بہتی ہے

یہ سریلی ندیوں کا بہت اتم سنگیت ہے

درائے کی لہریں چاندی میں راوں ہیں ..گوتم نے آنکھیں بند کر تصور کیا

وہ اس سے دو ہزار برس قبل کی دنیا میں پہنچا ہے ..وہ اس خنک ..آرام دہ .. پیاری زمین پر بیٹھا ہے ..یہ زمین اس کی زمین ہے اسے اس زمین سے عشق ہے ..صدیوں سے وہ اس زمین کو سینچ رہا ہے اس نے اس میں خوبصورت درخت لگائے ہیں ...دلفریب شہر بسائے ہیں ..اس زمین پر اس نے محبت کی ہے

سنہرے بالوں والا بلند و بالا آریہ جو اپنے سنہری رتھ پر دھرتی کو روندتا مغرب

سے مشرق کی طرف آیا تھا۔۔اندر کی کمان اس کی معیت میں ... پاربتی اس کے ساتھ ساتھ ناچتی آ رہی ہیں... برہما کی بی بی سرسوتی نے اپنی بطخ پر سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔۔علم تیرا ہے۔۔گنیش نے سونڈ اٹھا کر قلم اس کے ہاتھ میں دے دیا

تخیل میں کتنی طاقت ہے...جس نے عناصر اور چرندوں پرندوں کو شخصیتیں عطا کی ہیں۔۔پرتھوی اور رورونا۔۔اندھیرا آسمان اور اگنی اور اندر...عناصر کی یہ تمثیلیں فلسفے کی اولین مجسم شکلیں ہیں۔۔ان کے ذریعے سبب کے قانوں کو مزین کیا جا رہا ہے۔یہ دنیا کے اولین فلسفی ہیں۔۔فلسطین کی پہاڑیاں خاموش پڑی ہیں۔اسرائیل کے نغمہ نواز ابھی پیدا نہیں ہوئے۔۔مگر ان شاعروں کی آواز برہم ورت پر جھکے ستاروں سے جا ٹکرا رہی ہے۔۔یہ صبح کے ستاروں کے راگ ہیں...اور خدا کے بیٹوں کی للکار...انہوں نے فطرت کے اس عظیم الشان ناٹک کو اتنے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔۔ان کو کھوج لگی ہے۔۔یہ سب کیوں ہے؟اس کا مصنف کون ہے؟اداکار کون؟تماشائی کون؟مترا روز روشن کو سامنے لاتا ہے۔۔ہم سب کا دوست ورونا اندھیرے آسمان کا مالک ہے۔سوریہ روشنی کا خزانہ ہے۔۔اوشا صبح کی کنواری...وایو ہوائیں چلاتا ہے...ماروت طوفان کے فرشتے ہیں...پش دیوتا سڑکوں اور گلوں کا نگہبان ہے۔۔روز آسمانوں کا چنگھاڑتا بیل ہے...عالم بالا کا سرخ سور...

اوورونا.....ایک صاف گہری آواز فضا میں گونجی۔۔گوتم نے گھاس پر لیٹے لیٹے پہچانا۔۔یہ اس کی اپنی آواز تھی۔۔جو کہ دو ہزار سال قبل بلند ہوئی...وہ اونی شال لپیٹے

..کانوں میں کرن شوبھا اور گلے میں سنہری رکما پہنے ایک اونچی چٹان پر کھڑا تھا ..اس کے ہاتھ میں سرمنڈل تھا..اس نے پکار کر کہا..کیونکہ اندھیرے آسمان کے نیچے اس سے وہ تنہا کھڑا تھا

ادورونا.....ہم نے اپنے رفیق..اپنے بھائی..اپنے دوست..اپنے ہمسائے یا کسی اجنبی کا دل دکھایا ہے..تو ہماری اس خطا کو درگزر کر...

اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تیرے قوانین کی جو خلاف ورزی کی ہو...

ادوروناس کی سزا نہ دے

اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ کہتا تھا

میں؛؛جو بیوقوف ہوں اور جاہل ہوں

میں نے چاہا کہ دیوتاؤں کے چھپے ہوئے گھر کا پتا چلاؤں

میں نے مینوں سے پوچھا

وہ جس نے چھ آسمانوں کو سہارا دیا

کہیں یہ وہی تو خدائے واحد نہیں؟

پہلوٹھی کے لڑکے کو کس نے دیکھا ہے؟

وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں..اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا

وہ کون جنگل تھا..کون درخت..جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی؟

وہ کون تھا کہ جو جاننے والے کے پاس یہ پوچھنے کے لیے گیا؟

یم.....دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتا لگایا

پھر اس شاعر نے سوچ کر دوسرے شاعر کو جواب دیا

وہ طاقتور ترین دنیا کا باپ ہے

وہ مبارک ہے یعنی شیو ہے

اس کے قہر سے گائیں اور انسان مر جاتے ہیں

پھر اس نے پوچھا

موت مجھے ختم کر دے گی.. موت کو کون ختم کرے گا؟ وہ کون سی چیز ہے جو کہ انسان سے اس کی موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟ مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوتا ہے؟ راجہ پرکشت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو کہ ہر شے پر قادر ہے لیکن ہر شے سے علیحدہ ہے؟

موت سے سہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی...

وسیع مہربان دھرتی... ماں.. اسے اپنی گود میں جگہ

نوجوان لڑکی.. جو کہ اون کی طرح ملائم ہے

تجھے تباہی سے بچائے رکھے گی

دھرتی.... اپنے آپ کو دھیرے دھیرے جھکو رے دے

اسے اپنے بوجھ سے نہ دبا

اسے آرام کرنے دے

اسے اس طرح چھپا لے جس طرح ماں اپنے بچے کو آنچل اوڑھا لیتی ہے

شمشانوں میں روشنی ہو رہی ہے

اگنی اس کو جلانا نہیں اس کی کھال.. اس کے جسم کو بھون کر رکھ دینا

اسے کھا لینے کے بعد اسے اس کے پرکھوں کے پاس بھیج دینا

جب یہ اپنے پرکھوں کے پاس پہنچ جائے گا تب خدا کی مرضی پوری ہو گی

اور ایسا ہوا کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں ...اس کی سانس ہوا میں تحلیل ہو یا آسمان کے پاس جائے یا زمین پر رہے ..جیسا سا کا مقدر ہو ..اور اس کے ہاتھ پاوں پودوں کی شکلوں میں پھر سے نمودار ہوں

انسان بہت کمزور نکلا .... جو کہ اپنی ساری دھوم دھام ..ساری شان وشوکت .. سارے ارادوں کے باوجود ختم ہو جاتا ہے ..شاندار شہر نیست ونابود ہو جاتے ہیں ...دریا غائب ہو جاتے ہیں .. پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں .. باغوں میں بسنت منانے والوں کا نشان تک نہیں ملتا

ہر شے فانی ہے ...صرف ستوپ باقی بچتے ہیں

مسرت بیکار ہے ... دل کی لگن بیکار ہے ..اب میں کسے پکاروں ؟.. کس کی مناجات کروں ؟

اندر کی مناجات کرو ..رگ وید کے شاعروں نے کہا ...

اندر کی مناجات کرو ..آواز بازگشت لکڑی کے مکانوں اور پتھر کے قلعوں میں گونجی ...

اندر کی مناجات کرو ..اگر وہ واقعی ہی موجود ہے

اندر کا کوئی وجود نہیں ..... دوسرے شاعر نے سوال کیا

اسے دیکھا کس نے ہے ؟ میں کس کو پوجوں ؟ اور اندر نے گرج کر گھنگھور گھٹاوں کو جواب دیا ..

میں ادھر ہوں ...او مغنی مجھے دیکھ ..

میں ساری مخلوقات سے عظیم ہوں

نظام کائنات نے مجھے عظیم تر بنایا ہے..

پھر انہوں نے کہا..او پہاڑوں پر رہنے والے رور..اپنے تیز..قہرناک تیروں سے

کسی انسان کو کسی حیوان کو نقصان نہ پہنچا

کیونکہ موت خوفناک ہے..

لیکن موسیقی موت کو ختم کر دے گی..موسیقی کی وسعت..اس کی گہرائی میں موت کہیں تنکے کی طرح ڈوب کر رہ جاتی ہے..موت دراصل بہت حقیر ہے..موسیقی خدا ہے

روید کے شاعر چٹان پر بیٹھے رہے..نیچے وقت کا تاریک دریا بہہ رہا تھا..اس دریا کی سطح پر چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا ہو گئے..

اس اولین موسیقار کے ہاتھ میں وینا تھی..انہوں نے سات سروں کی سرگم تخلیق کر لی تھی..سرگم کا ایک ایک سر وینا کے تاروں پر علیحدہ علیحدہ گونج رہا تھا..

اب سارے تار اکٹھے ہو کر ایک آواز پیدا کر رہے ہیں...

وشو دیو....سارے خدا ایک ہیں...اگنی..اوشا..ورنا..سوما..کندھرو..ساری طاقتیں ایک وشو بھونانی ہیں....

تدا ایکم...خدا ایک ہے...مضراب کی ایک جھنکار سے فضا مرتعش ہو گئی.....

مگر میں کس کی عبادت کروں

کس کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں

اور شاعر نے خود ہی جواب دیا

وشو کرما.. وشو دیوا مہمان اسی

تو سب کا خالق ہے خدائے بزرگ و برتر.. پرجاپتی....

کون کھمبا تھا...کون سہارا

کس طرح ایسا ہوا کہ وشو کرما نے اپنی طاقت سے زمین بنائی اور آسمان تانا

....

وہی ایک خدا ہے جس کی چاروں طرف آنکھیں ہیں...

اور منہ...اور بازو....اور پاوں

جو اپنے دو بازووں اور پروں کی دھونکنی سے دنیا کو گھڑتا ہے

سب سے پہلے نور پیدا ہوا...وہ سارے وجود کا خدا تھا....

اس نے آسمان اور زمین بنائے...

میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں..؟

وہ جو زندگی اور طاقت بخشتا ہے....

ابدیت اور فنا جس کی پرچھائیاں ہیں...

میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں؟

وہ جو اس سانس لیتی اور سوتی ہوئی کائنات کا مالک ہے

وہ جس نے فضا میں روشنی کی پیائش کی ہے

جس نے جگمگاتے عظیم پانیوں کو تخلیق کیا ہے....

وہ جو ایکا دیوا ہے اور پران اور سکھمبا [سہارا]

قصہ مختصر یہ کہ وہ برہما ہے

خدائے واحد.... جو کہ نہ مرد ہے اور نہ عورت... اس کی کوئی جنس نہیں... کوئی ثانی نہیں.. نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے.. نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے.. ایکا دیوا

برہما جو کہ بڑھتا ہے جو باہر لاتا ہے.. اور پھیلاتا ہے... جو کہ دنیا کی تخلیق کا مادی سبب ہے.. لیکن خود غیر مادی ہے.. اور دنیا جو اس نے تخلیق کی خود غیر حقیقی ہے

محض اوم اصل حقیقت ہے... خلا... روشنی اور آواز

لفظ..... جو اس زبان سے ادا ہوتا ہے.. برہسپتی... جو پھیلتا ہے.... برہسپت کی حیثیت سے برہما خدائے نطق ہے

لفظ جو کہ شروع میں تھا اور خدا تھا.. مدتوں بعد فلسطین کے حکماء یہ جملہ دہرا کر ایک نئے خیال کا پرچار کریں گے.. یونان میں لوگوس کے مسئلے کی ترویج ہوگی.. عہد نامہ قدیم میں صوفیہ علم کی صورت میں ظاہر ہوگی

ویدوں کی تقدیس مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے

کیونکہ وید زبان کی شکل میں برہما ہے..

اب لفظ اور خیالات کے باہم رشتے پر غور کیا جا رہا ہے.. زبان نے ایک حمد میں کہا...

میں وایو اور رورا اور وشو دیو کے ساتھ گھومتی ہوں

میں مترا.. درونا.. اور اگنی کی مددگار ہوں

میں ملکہ ہوں.. دولت جمع کرتی ہوں... میں جاننے والی ہوں..

ان سب میں افضل جن کی عبادت کرنا چاہئیے

بغیر جانے انسان مجھ پر ہی بھروسہ کرتا ہے..

میں جسے پسند کروں اسے برہما..رشی اور اگنی بنا دیتی ہوں....

میں رور کی کمان موڑتی ہوں تا کہ وہ جو برہما سے متنفر ہے..اسے ختم کیا جا سکے

..

میں جنگیں کرواتی ہوں..میں ہوا کی مانند چاروں کھونٹ پھیلتی ہوں

شبد برہما..

برہما جو کہ بذات خود ذہن ہے اور کنول کے ریشے سے زیادہ لطیف بادل کی چھایا سے زیادہ ہلکا..جو کہ اس کائنات کا حامل ہے..جو کہ اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے تا کہ دوسرے پیدا ہوں...

وہ دوسرا میں خود ہوں..آتما....جو ذہن اور زبان اور سانس کا دوسرا نام ہے ..جو کہ خود اپنی گواہ آپ ہے..اور جو روح..کائنات اور... پرماتما بھی ہے

اب برہمن اور آتما کا مجرد تصور وحدت وجود کے نظریے کے لیے راہیں تیار کر رہا ہے

پرجاپتی کے تخیل نے واحدانیت کا بیج بویا

شروع میں پانی تھا جس پر پرجاپتی ہوا کی طرح منڈلایا..اور کائنات کی تخلیق کی

فلسطین کا فلسفی بعد میں کہنے والا تھا....شروع میں پانی تھا جس پر روحیں دھوئیں کی طرح منڈلاتی تھیں

ان شاعروں کے تخیل نے ساری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا..ان

کے لاشعور کی وسعت میں قطب شمالی کی طویل راتیں.. مدھم سرخ سورج اور وسیع سبزہ زار تھے کھلی فضائیں موسم کی تبدیلیاں.. پھولوں کے رنگ.. بسنت رت کی زردی. سرسوں اور کپاس اور ٹیڈو اور ہار سنگھار اور ساون بھادوں کی جھڑیاں اور مور کی.... مینہ آو... مینہ آو کی صدائیں اور جب درخت جامن.. فالسے اور کروندوں سے لد جاتے ہیں اور خزاں... جب دھان کی فصل کٹتی ہے اور سردیاں.. جب چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور کھلیانوں کے اوپر ہیمنت کا چاند دھند میں تیرتا ہے.. یہ موسموں کی راگ مالا انہوں نے اس وینا کے تاروں میں قید کر لی ہے... برہما اور شکتیا کا تصور سنگیت میں ڈھل چکا ہے.. برہما راگ ہے.. سرسوتی راگ رانی... پانچ سر مہا دیو نے تخلیق کیے ہیں.. کھرج اور پنچم پاروتی نے بنائے ہیں.. فضائے بسیط تو نبورو.. نارومنی اور چترسین کی موسیقی سے گونج اٹھتی ہے.. یہ عناصر کی موسیقی ہے جسے متشکل کر لیا گیا ہے

نٹ راج کا ڈمرو.. آکاش تت ساء کا مظہر ندا جس میں ساری آوازیں پیدا ہوتی ہیں.. رور آندھیوں کا خدا اپنی پرشکوہ وینا چھیڑ رہا ہے

جمنا کے کنارے مہا وشنو بانسری پر نغمہ حیات بجا رہے ہیں.. گوپیاں.. آفاقی طاقتیں.. اس کی دھن پر رقصاں ہیں

کائنات ان گنت سازوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے. راگ تخلیق ہو رہے ہیں.. جن کی پر دیپ سے آواز کی دنیا جھلملا اٹھی ہے.. فضائے بسیط میں بھیرو.. مالکونس.. ہنڈول.. میگھ.. دیپک.. سری کے دیو گرج رہے ہیں

اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہوا میں پر پھیلاتی ہیں.. جنگل کے پر

ندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھی اور دوست ہیں، ان کی آواز..ان کے رنگ اور ان کی چال کو رقص و نغمہ کے تخیل میں محیط کرلیا گیا ہے مور کھرج میں جھنکارتا ہے پپیہا رکب میں اپنی گھٹ لگاتا ہے بکری گندھار میں ممناتی ہے کلنگ مدھم میں پکارتا ہے کوئل کی کوک میں پنچم کا سر ہے..دھیوت گھوڑے کا ہنہناتا ہے .نکھاد ہاتھی کی چنگھاڑ ہے..

تان پورے پر سر چھیڑا گیا..تان پورے کی آواز جو گیت سے پہلے شروع ہوتی ہے گیت کے دوران موجود ہوتی رہتی ہے اور گیت ختم ہونے کے بعد تک گونجتی رہتی ہے.سر جو ذات مطلق ہے..جو ہمیشہ سے تھا.... ہے...اور رہے گا

سنگیت کار کے فن میں فلسفے..رنگ و نور.خیالات اور جزبات کا دھارا کھا بہہ رہا ہے

اس شاعری اور موسیقی کے پس منظر میں بہت عظیم رنگوں اور آوازوں کی دنیا پھیلی ہے..آسمان سے الوہی پانی برستا ہے اور الوہی شفاف ندیوں میں بدل جاتا ہے..آسمان کی روشنی کا سمندر راوشا کے اجالے کے ساتھ ساتھ صبح کے راگوں میں گھل مل جاتا ہے اور اس مقدس کھرے پر سنہری دیبی سرسوتی تیرتی ہے سرسوتی جو کہ تخلیق کرنے والی ماں کا تصور ہے..جو راگنی ہے..جو علم ہے....جو زندگی کا مقصد ہے..علم سے آزادی ملتی ہے..علم سراے وجود کی بنیاد ہے.گیان میں نجات ہے ..[سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر لوٹ آیا جہاں وہ اس سے موجود تھا]. قید اس لیے ہوتی ہے..اس نے گھاس پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا کہ خودی اپنے آپ کو اپنے ذہن سے مماثل کر لیتی ہے اور لہذا اس دکھ اور گناہ اور ذہنی اور اخلاقی

کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے..اور پراکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہوتا ہے...

یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے.....

یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں..

یہ تجربہ کرتے کرتے میں کدھر نکل جاؤنگا..

لیکن کوئی پروا نہیں

سوال حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں..صحیح عمل اصل چیز ہے

وہ گھاس کی پتیوں کو توڑ کر اکٹھا کرتا رہا اور پھر زمین پر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی..اور درختوں کے جھرمٹ میں کسی یوگی کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی..اس نیم تاریکی میں اس کی روشنی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہوئی..

پتا نہیں بیچارا اس وحشت اور ویرانے میں وہاں بیٹھا کیا سوچتا ہو گا..گوتم کو یاک لمحے کے لیے بڑا اچنبھا ہوا

وہ ان شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا..وقت سنسناتا ہوا اس کے چاروں اور ڈول رہا تھا..ذہن کی جوت کے آگے اب قربانیوں کی آگ مدھم پڑ چکی تھی..انسانی دماغ دیو مالا کی تخلیق مدتیں ہوئیں کر کے ختم کر چکا تھا..خیال کے صنم خانے آباد ہو کر نئے پرانے بھی ہو گئے..دماغ اب دقیق مسلوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا..مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا..اصل چیز فلسفہ تھا اور ما بعد الطبیعات..سارے ملک میں خیالات کی فرمانروائی تھی اور آزادی..افکار اور مزہبی رواداری...ایک ہی کنبے کے افراد برہما کے مختلف مظاہر کی کوشش کرتے اور

متضاد نظریوں پر یقین رکھتے.. مادہ پرست.. ثنویت کے قائل.. ملحد.. بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیونکہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا.. ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی.. ذرا برابر سرکنے کو تیار نہ تھا.. مگر ان سب نے علم معقولات کو سب سے زیادہ فوقیت دی تھی.. حسی ادراک.. استنباط.. اور لفظ کی شہادت اور سند پر اس جستجو کی بنیاد تھی..

ملحد حکیم کپل کئی سو سال قبل گزرا تھا... چونکہ ادراک.. استنباط اور لفظ کی شہادت میں سے کوئی چیز بھی خدا کے وجود کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکتی تھی.. لہذا کپل نے بڑی دلیری سے ایشور کی بجائے ان ایشور پر زیادہ توجہ دی تھی.. منطقی کی حیثیت سے وہ خدا سے منکر ہونے کی بجائے محض اسی پر مطمئن رہا کہ شہادت کے عام زرائع سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کرسکتا.. گو اس قدر روادار تھا کہ عوام کے دیوتاؤں شیو اور وشنو تک گوارا کر لیتا تھا کہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہی ہوں.. لیکن اس کے نزدیک یہ محض تخلیق شدہ دنیاوی خدا تھے اس کے خیال میں ایشور تک کا وجود مظاہری تھا.. ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ کوئی چیز زمان و مکان میں مقید ایسی نہیں جو بلا آخر حقیقت اور ابدیت پر مبنی نہ ہو

کپل ناستک یا معدومیت پرست نہ تھا.. سیدھا سادا ملحد تھا.. برہما کے بجائے اس نے پراکرتی کو وجہ کائنات ثابت کیا.. پراکرتی یا فطرت.. جو کارن کاریہ نظریے کی بنیاد تھی پر ان کرتی اولین کارن ہے.. ذہن خودی.. حواس خمسہ اور عناصر اربعہ اس کی ترکیب اور سارا ارتقاء اس میں مشتمل ہے اور پرش جو کہ خالص روح ہے.. جو کہ نہ کسی کا کارن ہے اور نہ کاریہ.. اور پراکرتی الگ کھڑا ہے.. پرش ابدی

شخصی شاہد ہے..اوراس کے اوپر پراکرتی کے ملاپ سے دنیا ظہور میں آتی ہے.ان دونوں کے علاوہ تیسری کوئی طاقت نہیں ہے.اور دونوں کی علیحدگی سے قطعی کامل مسرت اور مطلقیت پیدا ہوتی ہے..کپل کا کہنا تھا کہ ارتقاء محض اتفاقاً نہیں ہوا..موجودہ کائنات کے پس منظر میں کوئی اور حقیقت رہی ہوگی..کاریہ کارن میں پہلے سے موجود رہتا ہے

ویدانت والے موحد خدا پرست جو کہا یک برہما کو قادر مطلق جانتے تھے کاریہ اکرن بھید کے مسئلے پر متفق نہیں تھے..ان کے نزدیک کاریہ اور کارن ایک ہی تھے کیونکہ ہر شے برہما تھی.بتت قوم اسی...تو...وہ...ہے..جیو آتما..بندہ..دراصل..وہ..ہے..تو ہی خدا ہے..

لیکن ہر شے برہما ہے.تو یہ دوئی کاہے کے لیے؟..کپل کے ملحد ساتھیوں نے پوچھا

یہ دوئی دراصل مایہ کا فریب ہے..مایا پراکرتی کا...انہوں نے جواب دیا..مدہ پرست کپل کی فطرت کو ویدانت والوں نے برہما کا سایہ قرار دیا..انہوں نے ادراک پر الہام کو ترجیح دی..ادراک اور استنباط محض عالم موجودات کے لیے ہی سند سمجھے جاسکتے تھے..اگر برہما ایک ہے تو دنیا میں کثرت کیوں ہے..؟ تجربے متنوع کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن برہما کی ذات کا ایک پہلو..نام روپ بھی ہے..اس کی مایا...شکتی اور پراکرتی دنیا کی تخلیق کرتی ہے..

لیکن اصل ذات خداوندی نام.روپ اور مایا سے بلند تر اور بے نیاز ہے.....گنی جن کے لیے ساری دنیا سراب کی مانند ہے..اصل برہما غیر مشروط اور قطعی ہے

..ہماری اودیا کی وجہ سے وہ ہمارے ذہن میں آ کر مشروط.. عملی.. خالق اور شخصی بن جاتا ہے....دنیا کی تخلیق بھی اودیا اور اصلی اودیا کی وجہ سے ہمارے ادراک سے باہر ہے...یا شکتی کے زریعے ہوئی اور اس کی وجہ سے برہما کا درجہ کم ہو گیا بڑھا نہیں.. برہما صفات سے متاثر نہیں.. جس طرح ہماری اپنی مشروطیت ہماری اصلی روح کو متاثر نہیں کرتی.. جس طرح صفات زدہ برہمائیں تکلیق کرتا ہے. اسی طرح ہماری مشروط آتما اس برہما کو تخلیق کرتی ہے...مایا کی دوسرا تھ میں زگن برہما سگن بن جاتا ہے

نا....نا.... برہما کے لیے ہم محض یہی کہہ سکتے ہیں.. وہ یہ نہیں ہے....وہ یہ بھی نہیں ہے.. ویدانت میں لکھا تھا....وہ ست بھی ہے اور است بھی ہے.. وجود بھی ہے اور عدم وجود بھی ہے.. عظیم ترین وجود اور عدم وجود.. یوں کہ جن چیزوں کو دنیا وجود سمجھتی ہے وہ اس سے مختلف ہے.. برہما شخصی ہے.. اس کی خارجی صفات نہیں ..اگر وہ جانتا ہے تو محض خود کو جان سکتا ہے.. جس طرح سورج اپنے آپ کو روشن کرتا ہے.. ہمارا برہما کے متعلق علم محض برہما کا احساس ہو سکتا ہے.. جو کہ خود ہمارا اپنا احساس ہے.. مکتی سے ایشور.. مظہری خدا اپنے آپ سے غائب ہو سکتا ہے

یہ حکماء بجائے خود بدعتی تھے.. کیونکہ فلسفی تھے. ویدانت والوں نے اسی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے خود ویدوں کو منتخب کیا اور الہام سمجھ کر ان کے آگے جھکے ..گو سند کو بڑی آسانی سے منظور یا نامنظور کیا جا سکتا تھا.. خود کو پل کا ایسا منطقی بھی ویدوں کو کہیں کہیں سے اس شرط کے ساتھ مان لیتا تھا کہ وید بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے

ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دنیا دونوں ابدی ہیں.. محض زندگیوں کا تسلسل قائم ہے ..اور ابدالاباد تک رہے گا.. چندرو کے نزدیک آتما اور دنیا ایک حد تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں ..اننتانکتوں کے نزدیک دنیا یا محدود تھی یا غیر محدود اس کے استھ ہی دناے محدود تھی نہ غیر محدود.. سیاوادیوں کا خیال تھا کہ ہر چیز ہے بھی اور نہیں بھی ..وہ کوو کسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے ..دوسری دنیا ہے یا نہیں حادثہ ہے یا نہیں ..جزاوسزا ہے یا نہیں.. حیات بعد الممات ہے یا نہیں...

کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے ..کیو نکہ ان کا کہنا تھا کہ انہیں خود یا دتھا کہ کچھ عرصہ قبل وہ نہیں تھے اور اب ہیں

صدیاں گزرتی گئیں ..ذہنی اپشندوں کی شدید مابعد الطبیعات سے اکتا گیا ..رفتہ رفتہ خدا جو کہ فلسفے کا مسئلہ تھا شخصی بنا

تا کہ بالآخر دل کو ذہن پر فتح حاصل ہو.. رورایک ہے..ایک اپنشد میں لکھا گیا ..جو انسانوں کے دل میں رہتا ہے اور اسے پہچان کر ساری اودیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے..

مابعد الطبیعات کے کارن نے اوتار کا روپ دھارا..اضافی کا مطلق سے تعلق خرد کے بجائے وجدان ٹھہرا.... بے جنس برہما ردبنا..

وشنو جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے..

نارائن جو خود مجھ میں ہے

درندابن سے بانسری کی تان بلند ہوئی ..اور گنگا اور جمنا کے کناروں پر چھا گئی

انگ رنگ ساگرم

مدھوسودن.....جو کہ محبت کا اتھاہ سمندر ہے..گردھر گوپالا..کرشنا..کرشنا..کرشنا

گوتم نے گھاس پر سے سر اٹھایا اور ندی پر سے برستے سناٹے کو دھیان سے سننے لگا..

اور کرشنا نے کہا..اوارجن میں بے پایاں وقت ہوں..میں تباہ کن موت ہوں ..میں رازوں کا سناٹا ہوں..میں ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا ہوں..او کنتی کے بیٹے میں پانی کا سوادہوں ..سورج اور چاند کی روشنی .. میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں..میں آکاش کی آواز ہوں..میں انسانیت کا اجتماعی شعور ہوں..اوکنتی کے بیٹے..میں عورت کی ذہانت اور وفاداری اور رحم دلی ہوں ..میں گاتری منتر ہوں...میں اچھوں کی اچھائی ہوں..اوارجن میرے الوہی مظاہر بیکراں ہیں..میں عالم الغیب ہوں..لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا

اور کرشنا نے کہا..مجھے چاہو..مجھ سے محبت کرو..میں تمہارا سکھا ہوں..تمہارا ساتھی..تمہارا محبوب..میں محبت کا سمندر ہوں..انگ رنگ ساگرم

کائنات اس کی بانسری کی آواز سے مسحور ہوگئی..پھر ویشالی کے مہاویر نے کہا ..خداوند عالم کا کوئی وجود نہیں..دنیا بادی ہے اور اپنے وجود میں قائم اور مادے اور خلا اور دھرم اور ادھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے..صرف یہی ایک حقیقت ہے..

اور شاکیہ منی نے کہا..خدا ہو یا نہ ہو...حقیقت محض یہی ہے کہ دکھ موجود ہیں.. باسٹھ فلسفے اودیا کے باسٹھ گن ہیں..محبت بے کار ہے..فلسفہ بے کار ہے..سب مہا

موہ ہے..سب مایا ہے..سب دھوکہ ہے..شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود..ہر شے خلا غیر حقیقی ہے..پھر یہاں خواہشوں کا گزر کہاں؟..کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی..؟کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں..ہر شے اپنا لمحاتی وجود خود ہے..اور شاکیہ منی نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں..حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں..

ہر شے تکلیف ہے..سروم دکھم دکھم..ہر شے فانی ہے....جسم اور روح دونوں کی کوئی اصلیت نہیں..روح لازاول نہیں..محض اس کو تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں..روح کا آواگون نہیں محض کرم کا آواگون ہے..انسان اس طرح دفعتا بجھ جاتا ہے..جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کر دیا جائے..صرف واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم ہے..اور رہے گا

پانی کی نقرئی لہریں کنارے تک آ آ کر لوٹتی رہیں..گوتم نے آگ پر سے نظریں ہٹالیں اور ندی کو دیکھا جو کہ بڑے سکون سے رواں دواں تھی..

میں دکھ سہنا چاہتا ہوں..میں کمزور بننا چاہتا ہوں..میں اپنی حماقتوں کا نظارہ خود کرونگا..میں تکلیفیں اٹھاؤں گا..

دل اور دماغ کے رنج اور آزمائشیں..میں مکتی نہیں چاہتا..میں مکتی بالکل نہیں چاہتا..رحم بہت بڑی چیز ہے شاکیہ منی..لیکن ممکن ہے کہ مجھے خود ہی تم پر بہت ترس آتا ہو..سوال یہ بھی ہے کہ مقدس شہزادے کہ کون کس پر ترس کھائے گا..؟

وہ اٹھ کھڑا ہوا..افق پر صبح کا اجالا بکھرنے لگا..لیکن دھند لکے کی وجہ سے ندی کا دوسرا کنارہ ابھی صاف نظر نہیں آرہا تھا..اس نے ایک طویل انگڑائی لی..اور پانی

میں کود گیا...

رات وہ کچھ سویا تھا کچھ جاگا تھا...رات اس نے بڑی بے چینی سے گزراری تھی ..پانی سے باہر نکل کر اس نے آشرم کی طرف جانے کی بجائے اس نے گھنے جنگل کارخ کیا..اور ساحل کی ریت پر ایک سمت کو روانہ ہو گیا...

ے..

ترائی کا راستہ جو شراوتی سے اتر کی طرف جاتا تھا..اس میں دونوں طرف پیڑ تھے ..اور اونچے اونچے سرکنڈے اور ڈھاک کے جنگل اور رنگ برنگے پھولوں والی جھاڑیاں میں لمبی دموں اور جھلملاتے پروں والے پرندے سیٹیاں بجاتے تھے ..اور ادھر ادھر چکر کاٹ کر پھر گھنے جنگلوں میں چھپ جاتے تھے ..دریا اس پھولوں کے جنگل میں سے لہراتا ہوا گزرتا تھا..اس کے مشرقی کنارے پر گھاٹ تھا..جہاں شاہی بجرا رات کو کنارے پر آن کر لگا تھا

ایودھیا اور اتر کوشل کے علاقے کے حکمران ارجن اور ان کے کا دربار صبح سویرے کھیدا کے لیے اتر کی طرف کوچ کرنے والے تھے..مگر راسی تلاش کرنے والوں نے اطلاع دی تھی.کہ ہاتھیوں کے علاقے میں بالکل غیر متوقع بارش شروع ہو گئی ہے..بجرے سے اتر کر شاہی قافلہ ہاتھیوں..پالکیوں..رتھوں اور بیلوں پر سوار ہو رہا تھا..جب یہ خبر ملی تو قافلے نے اپنا رخ پھر گھاٹ کی طرف موڑ لیا..اور گرو پروشتم کے آشرم سے چند میل کے فاصلے پر مہوا کے جھنڈ میں خیمے لگ گئے...

آنا فانا جنگل میں منگل ہو گیا..باغ جہاں صرف ہرنوں کی ڈاروں اور مرغابیوں اور موروں کی عمل داری تھی..اور جہاں کبھی اکا دکا طالب علم مراقبے میں

غرق کسی پگڈنڈی پر سے گزرتا نظر آ جاتا تھا.. وہاں پل کی پل میں میلہ سا لگ گیا ..شراوتی کے سنار اور بزاز اپنی اپنی دکانیں شہزادیوں کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے اٹھا لائے.. پھول والوں نے تازہ کلیوں کے انبار لگا دیے.. بھاٹوں نے اپنا ڈیرا جمایا.. اور لہک لہک کر قصیدے گانے لگے.. بنجاروں کی ٹولیاں.. طوطے۔ مینائیں.. پالتو بندر اور موتی منکے خچروں اور بیلوں پر لاد کر اس امید میں آ کر دور کھڑی ہو گئیں کہ شاید کوئی راج کماری طوطا خرید لے.. کئی مصور اور سنگ تراش اپنا اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کی نیت سے آن موجود ہوئے.. نٹ اور بازی گر اپنے کرتب دکھلانے لگے.. رات کو مشعلوں اور الاو کی روشنی سے جنگل کی چڑیاں جگ اٹھتیں اور خوب شور مچاتیں..

شاہی قافلے کی لڑکیاں دن بھر باغوں میں گھومتیں.. اندھیرا پڑے ندی میں جا کر تیرتیں.. کبھی دن میں تیر کمان لے کر ہرنوں کا شکار کرتیں.. ورنہ پھر خیموں کے نیچے یا درختوں پر بیٹھ کر گپیں ہانکتیں..

دو تین دن کے اندر ہی چمپک کا اس بے مصرف زندگی سے جی اکتا گیا.. وہ بنجاروں سے ان کے موتی.. بزازوں سے ان کے ریشم.. چینی اور پشمنے.. سناروں سے ان کے گہنے اور مصوروں سے ان کی تصویریں خرید چکی تھی.. کسی سائل کو لوٹانا اس کے بس کا کام نہیں تھا... دکانداروں سے اس نے بیکار کی چیزیں بھی خرید لی تھیں.. کہ کہیں ان کا دل نہ ٹوٹ جائے.. وہ لوگوں سے ان کی بیوقوفی کی باتیں سنتی رہتی تھی اور کبھی ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ آپ لوگ سب کے سب عموماً کس قدر گدھے ہیں.. لوگ اسے اپنی اپنی کتھائیں سناتے تھے.. ہر انسان اس سے

ہمدردی کا خواہاں تھا..کیونکہ سارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑی گنی ہے ..بڑی نیک دل ہے بڑی فیاض ہے..یہ ہے ..وہ ہے ..دنیا بھر کی باتیں اس کے لیے مشہور تھیں اور اسے ہنسی آتی تھی..

تین دن جنگل میں رہ کر اس کا دل مسلسل اس سیر و شکار سے گھبرا گیا..اس نے نرملا کو ساتھ لیا..اور چپکے سے آبادی کی طرف چل کھڑی ہوئی..سامنے آم کا گھنا جھرمٹ تھا..یہاں بڑا سکون تھا..اور خنکی....آسمان پر جھٹ پٹے کے قرمزی رنگ بکھر گئے تھے اور باغ میں رہٹ چل رہا تھا..

آؤ ادھر چلیں جدھر سے گانے کی آواز آ رہی ہے

نرملا نے کان لگا کر کچھ سنتے ہوئے تجویز کیا

چلو یوں سب راستے ایک جیسے ہیں..چمپک نے کہا

وہ پتوں کو روندتی آم کے جھرمٹ کی اور بڑھتی رہیں..درختوں کی شاخوں میں سے دور کسی آشرم کے جھونپڑے نظر آ رہے تھے..

یہ کون جگہ ہے..چمپک نے کدم کی ایک شاخ پر ہاتھ رکھ کر ٹھٹھکتے ہوئے کہا..

یہ سامنے کون لڑکے ہیں..نرمال نے بے ساختہ سوال کیا

ہر جگہ برہمچاری لباس والے لڑکے دیکھ کر اسے اپنا بھائی یاد آ جاتا تھا

۸...

گوتم نیلمبر تین دن اور تین راتیں مستقل بھوکا پیاسا ندی کے کنارے کنارے ادھر ادھر گھومتا رہا..رات کے وقت وہ گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہا..پھر ریت پر ببول کے کانٹے بچھا کر ان پر سو یا

ایک دن سارا اس نے چیونٹیوں کو آٹا کھلانے میں صرف کیا..جو کہ وہ ملاحوں سے مانگ کر لایا تھا..پھر وں اس نے آنکھیں بند کر کے منتر پڑھے

لیکن چوتھے روز وہ اس قدر جھنجھلایا کہ اس نے واپسی کی ٹھان لی

شام پڑے وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا آشرم کی کو جانے والی سڑک پر چل رہا تھا کہ اس نے کسی نے پیچھے سے آواز دی

اس نے مڑ کر دیکھا..اکلیش اس کی سمت ہنستا ہوا آ رہا تھا

بھائی گوتم....تم تین دن سے کہاں غائب تھے..سارے میں تمہاری ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے..

میں تو یہیں تھا..تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو..؟...گوتم نے سکون سے پوچھا

وہی جو کہ تم کر رہے ہو..اکلیش نے خوش دلی سے جواب دیا..

میں تو بھگوان کی لیلا دیکھ رہا ہوں..

میرا بھی ان دنوں یہی مشغلہ ہے

آشرم میں سب خیریت ہے ..گوتم نے یونہی بات جاری رکھنے ء کے لیے پوچھا..اس وقت اسے احساس ہوا کہ ہری شنکر ٹھیک کہتا تھا...الفاظ بیکار ہیں

ہاں تم اس طرح خیریت پوچھتے ہو جیسے برسوں کے بعد لوٹے ہو...وہاں تو یہ خبر اڑ گئی ہے..کہ تم چتوون کے لیے اندھیرے جنگلوں میں چلے گئے..اب کبھی نہ لوٹو گے

مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے..گوتم نے دفعتا کہا..چلو سامنے پڑاو ہے..وہاں

سے لے کر دکھشنا لے لیں..

میں دیکھتا ہوں تم کسی اور چکر میں یہاں آئے تھے..

کیسا چکر... گوتم نے سادگی سے پوچھا..وہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہوا جا رہا تھا..

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہونگے کہ چیلا اتنا سعادت مند نکلا..اکلیش نے پھر خوش دلی سے کہا..

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہونگے...کہ چیلا اتنا سعادت مند نکلا..اکلیش نے پھر کوش دلی سے کہا....

گرو کو تو خوش ہونا چاہیے..تین دن تین راتیں میں نے بھگوان کی لیلا کا نظارہ کیا..گوتم نے معصومیت سے جواب دیا

بھگوان کی لیلا کی ایک جھلک تو کل میں نے بھی دیکھی..تیر کمان لیے ایک ہرن کے پیچھے

بھاگ رہی تھی..مجھے آتا دیکھ کر فورا درخت پر چڑھ گئی..

گوتم کو سمجھ میں نہ آیا کہ اکلیش کیا کہہ رہا ہے..وہ اداسی سیا کلیش کی بشاش شکل دیکھتا رہا..

املتاس کے پتے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور پگڈنڈی پر آکر ان کے چاروں اور گر گئے..

ہر طرف خوبصورت درختوں پر زرد اور سرخ پتوں نے آگ ایسی لگا رکھی تھی ..سارا باغ شام کی مختلف روشنیوں سے جھلملا رہا تھا..

بن دیوی..بن دیوی دور جھرمٹ میں کوئی بھجن گاتا ہوا جا رہا تھا..بن دیوی تمدور سے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہو..

کبھی ہمارے گاؤں میں آو..

کیا تمہیں آدمیوں سے ڈر لگتا ہے..؟

گوتم اور اکلیش ہوا کی مدھم خوشبو حلق میں اتارتے گھاس پر چلتے رہے...

جب گئیوں کے ڈکرانے کا جھینگر جواب دیتا ہے اور گھنٹیاں بجتی ہیں..اس سے بن دیوی ہرے کنجوں میں رقصاں ہوتی ہے..

طالب علم بھجن گاتا ہوا جھرمٹ میں غائب ہو گیا..

بن دیوی......کبھی اس کی جھلک دکھلائی پڑ جاتی ہے....

جیسے بہت دور گائیں چر رہی ہوں

یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہوا

رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے...

جیسے کہیں دور گائیں چر رہی ہوں..

یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہو...

رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے..

جیسے کہیں دور بیل گاڑیاں گزرتی ہوں...

جیسے کوئی اپنی گئیوں کو پکارے

جیسے درخت گرے.....

یا بہت دور کوئی چپکے چپکے روتا ہو..

بن دیوی جو کہ جنگلی پھول کھا کر جیتی ہے...جو جہاں جی چاہے ٹھہر کر آرام کرتی ہے..

جو مہکتی ہے....جو سارے جنگل کی ماں ہے.

گوتم اور اکلیش گاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے..کچھ فاصلے پر بانسری بجاتے ہوئے لڑکوں کی ایک ٹولی آبادی کی اور جا رہی تھی...آج زراعت کی دیوی سیتا اور کھیتوں کے خدا کھیشتر پتی کی عبادت کا تہوار تھا..گاوں میں بڑی چہل پہل تھی ....

بالآخر گوتم تھک کر ایک درخت کے نیچے ٹھٹک گیا..

ایک طرف دیویاں ہیں ..دوسری طرف اپسرائیں اور درختوں کی پریاں ..دونوں وقت ملتے ان درختوں کے سائے میں کھڑے نہ ہونا..اکلیش نے اسی طرح مصنوعی سنجیدگی سے کہا

کیونکہ درختوں کی پریاں انسانوں کو ورغلا کے لے جاتی ہیں..دیکھنا کسی اور پاٹلی پتر کی بنیاد ہیں نہ پڑ جائے

ارے یہ سامنے کون کھڑا ہے..گوتم نے یکلخت ہڑبڑا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

کون..اکلیش نے کہا.مہابھرت کے کوی نے پوچھا..ہے تو کون ہے جو کہ کدم کے درخت کی ٹہنی جھکائے ہے..؟دیوتا ہے اے یکشی یا اپسرا؟درختوں کے اسرار بہت گہرے ہیں گوتم بھائی.....

کیسے درخت؟

گوتم تم بھولتے ہو کہ ہمیں لڑکیوں پر نظر نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے ..اکلیش نے دفعتا سنجیدہ ہوتے ہوئے جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک درخت کی اوٹ میں چلا گیا

گوتم نے چونک کر دوبارہ سامنے دیکھا

کدم کے نیچے اجودھیا کے گھاٹ والی لڑکی کھڑی تھی

۹..

چمپک نے گوتم کو نہیں دیکھا..وہ نرملا سے باتیں کرتی ہوئی دوسری پگڈنڈی پر مڑ گئی

اکلیش ایکل پتھر پر بیٹھ کر دھیان میں مصروف ہو چکا تھا..آؤ آشرم چلیں ..اس نے ایک آنکھ کھول کر گوتم کو مخاطب کیا

انہوں نے پھر راستہ طے کرنا شروع کر دیا

گاؤں کے قریب پہنچ کر گوتم رک گیا..آشرم میں کچھ کھانے کو ملے گا....

میں دیکھتا ہوں کہ تم بیحد مادہ پرست ہوتے جا رہے ہو...

میں پوچھتا ہوں تمہاری ءکٹی میں چاول ہونگے ؟

نہیں آج صبح سے سب لڑکے سیتا کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں..ایک روز اور بھوکے رہ لو

میں دکھشنا لے کر ابھی آتا ہوں

اچھا اکلیش چپ ہو گیا مگر جلدی آنا گوتم بھائی..

بھائی اکلیش ابھی آیا...

اکلیش سے پیچھا چھڑا کر وہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گیا جدھر لڑکیاں گئی تھیں..جلدی میں کانٹوں پر دوڑنے سے اس کے پاؤں بھی زخمی ہو گئے

چمپک پڑاو کے نزدیک پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے..اس نے پلٹ کر دیکھا

اس کے سامنے وہ سر جو کو تیر کر پار کرنے والا لڑکا کھڑا تھا جس کی کالی آنکھیں تھیں اور کھلی رنگت اور جس نے برہمن طالب علموں کا سفید لباس پہن رکھا تھا

مجھے معلوم تھا کہ ایودھیا والے ادھر آئے ہوئے ہیں..میں نے سوچا کہ آج کی بھیک ادھر سے ہی لے لوں..وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا..

تم کہاں پڑھتے ہو؟چمپک نے پوچھا

ادھر کل پتی گرو پرشوتم کے آشرم میں.

جنگل میں بن دیوی کا بھجن تم ہی گا رہے تھے

کہہ نہیں سکتا کہ میں کون ہوں اور جو بھجن گا رہا تھا وہ کون ہے

اچھا یہ بات ہے..؟ آؤ کسی روز مجھ سے بحث کرو.چمپک نے تبسم کے ساتھ کہا

..

اس جگ میں ماتیری اور گارگی کی جانشین بننے کا تمہارا ہی ارادہ ہے..وہ فورا بحث پر تیار ہو گیا

ارادہ ایک نہایت فضول لفظ ہے..شاید تمہیں معلوم نہیں کہ عام طور پر الفاظ کے معنی نہیں ہوتے..تمہارے مضامین کیا ہیں؟

فلسفہ.. اخلاقیات ....اور ...پھر گوتم دفعتاً جھنجلا کر چپ ہو گیا... یہ لڑکی اسے بیوقوف بنا رہی تھی

تم تصویریں بناتے ہو؟

ہاں.....

میں نے سنا ہے کہ گرو پرشوتم کے آشرم کا گوتم نیلمبر تصویریں اچھی بناتا ہے .تمہاری شکل دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہارا نام ہی گوتم نیلمبر ہو سکتا ہے. میں ناموں کے اسرار کی بہت قائل ہوں. تم ناموں کے اسرار کے قائل نہیں ہو؟

میں وہی ہوں جس کا تم نے شاید چند احمقوں سے ذکر سنا ہو اور تم نے ٹھیک سنا ہے

تو غالباً تم بھی میری تصویر بناؤ گے.. آج صبح یہاں سے چتر کار آئے تھے

میں پر-تما کاریک ہوں.. صرف تخیل کی بناء پر دل کی آواز سن کر تصویریں بناتا ہوں

اس نے ذرا فخر سے کہا میری قدر وشوا کرمن الوہی مصور تک کو کرنا پڑے گی جو کہ سب سے بڑا چتر کار ہے

وشوا کرمن....تو تم ملحد نہیں ہو؟ آج کل تو طالب علم کپل اور شاکیہ منی کے زیادہ قائل ہیں

مجھے آٹا لا کر دو.. میرا راستہ کھوٹا ہوتا ہے.. گوتم نے زرا بگڑ کر کہا.. اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ مدتوں گھوما گھوما پھرا تھا اور اب جب کہ وہ اس کے سامنے تھی تو وہ کھڑا کھڑا اس سے جھگڑا کر رہا تھا.. کیونکہ اسے یکلخت یہ احساس ہوا کہ

وہ اس کی اپنی چیز تھی اس کے اپنے وجود کا.. اپنے ذہن اور دل کا ایک حصہ... یہاں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا.. کسی تکلف .. غیریت یا حجاب کی گنجائش یا ضرورت نہ تھی وہ اسے ازل سے جانتا تھا

اس نے دوسری لڑکی پر نظر ڈالی جو کہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی.. گوتم نے اسے پھر ذرا دھیان سے دیکھا.. یہ لڑکی ہری شنکر کی بہن تھی

چمپک خیمے کے اندر جا کر آٹا نکال لائی.. اور گوتم کے کشکول میں ڈال دیا

اب جاؤ.. پھر کبھی آنا.... چمپک نے کہا

وہ اسے پرنام کر کے پڑاؤ سے باہر آ گیا.. اسے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں.. اور راجن کے لاؤلشکر سے ان کا کیا تعلق ہے.. خیموں کے آس پاس نا کی طرح کی بہت سی لڑکیاں گھوم رہی تھیں.. مگر یہ دونوں اس ہجوم میں سب سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتی تھیں..

یہ دونوں کون ہیں.. اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بڑھیا سے پوچھا جو کہ تیز تیز قدم رکھتی رسوئی کی طرف جا رہی تھی

بڑھیا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا.. تم تو برہمچاری نظر آتے ہو.. اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا.. پھر تم کو یہ جان کر کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک راج گرو کی بیٹی چمپاوت ہے... اور دوسری راج کماری نرمل ہے اور یہ دونوں راجن کے ساتھ کھیدا کے لیے جا رہی ہیں اور تم آئندہ ادھر نہ آنا.. آج کل بہت سے چور اچکے سنیاسیوں کا بھیس بدل کر ٹھگی کرتے پھرتے ہیں..

کلٹنی کہیں کی چڑیل... گوتم نے چپکے سے کہا اور آشرم کی طرف روانہ ہو گیا

دوسرے دن وہ چادر لپیٹ کر پھر پڑاو کی سمت چل کھڑا ہوا.. سارے میں گھوما مگر وہ اسے نظر نہ آئی.. [راج گھرانے کی لڑکیاں یوں بھی مجمع عام میں سامنے نظر نہ آتی تھیں] ممکن ہے کہ وہ اندر کسی زربفت کے شامیانے کے نیچے کسی طوطے کو بیٹھی پڑھا رہی ہو.. یہ سوچ کر وہ مسکرایا.. اس نے سن رکھا تھا کہ طوطوں کو پڑھانا امیر زادیوں کا مشغلہ ہے... ممکن ہے کہ وہ پالکی میں بیٹھ کر سیر کرنے کے لیے شہر چلی گئی ہو وہ شراوستی کی طرف مڑ گیا.. جہاں سڑکوں.. بازاروں اور جھروکوں میں بہت سے چہرے نظر آئے جو کہ ایک جیسے تھے.. وہ پھر باغ کی سمت لوٹ گیا.. شاہی خیمے میں کاتک پورنیما کے تہوار کی تیاریاں کی جا رہی تھیں.. ان گنت لڑکیاں پھول سنبھالے ساز اٹھائے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں.. رنگ برنگی ساریاں پہنے ہری شاخوں کے نیچے رقص میں مصروف تھیں.. ان میں چمپک کون سی ہے.. اس نے ہڑبڑا کر سوچا.. کیونکہ اب اسے ہلکا سا شبہ ہوا کہ عورتیں سب ایک سی ہوتی ہیں.. ان میں سے چمپک کون ہے.. اس نے ذرا اچنبھے سے دل میں کہا

میں یہ ہوں.. کدم کے درخت کے پیچھے سے کود کر وہ نیچے اتر آئی

وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا..

تم بھی اداس ہو.... میں اس اداسی سے اب عاجز آ چکی ہوں.. کل سے نرملا بھی بہت رنجیدہ ہے.. آؤ ہمارے ساتھ ناچو..

میرا خیال تھا کہ تم میرے ساتھ بحث کرنا چاہتی تھیں..

فی الحال تو میرا جی ناچنے کو چاہ رہا ہے

نرملا کیوں رنجیدہ ہے..

اس کا بھائی راج پاٹ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے ..کل تمہیں دیکھ کر اسے اپنا دلارا بھائی یاد آ گیا

آنند نے بھی دنیا ترگ دی تھی یہ راہیں بہت کھٹن ہوتی ہیں..

ٹھیک کہتے ہو...

اس کے بھائی کا نام کیا ہے؟

مہاراجکمار ہری شنکر.....

اور اس نے دنیا.....

دنیا کے علاوہ اس نے اور بہت کچھ تیاگ دیا.. گدھا کہیں کا..چمپک نے گوتم کی بات کاٹی

گوتم نے اسے دھیان سے دیکھا

سنا ہے آنند نے اپنی چہیتی سندری کو چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی سدھارتھ گوتم کے ذرا سے کہنے پر

تو پھر تمہارا مطلب..؟

میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں سندریاں اور رہوں گی اور لاکھوں آنند اور ہری شنکر.. یہ چکر تو بہت وسیع ہے چمپک رانی

تیاگ کا فلسفہ خود اپنی جگہ ایک اور چکر نہیں؟

اس سندری کو کیا اس بات کا بہت رنج ہے ..گوتم نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا

وہ خاموش رہی...

اور اگر آنند واپس آ جائے تو.... کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی پورا راہت نہیں بن سکا.. اس کی ارہ کی مشکلیں ابھی باقی ہیں.. وہ بار بار لوٹ آتا ہے.. وہ ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہوا..

یہ تو بہت بڑی خبر ہے.. چمپک نے کہا.. کیونکہ آزادی بڑی بھاری چیز ہے.. اس سے کہنا کہ کیا وہ بھول گیا.. کہ شاکیہ منی نے مہامتی سے کیا کہا تھا؟

کیا کہا تھا؟ گوتم نے زرا چڑ کر پوچھا

شاکیہ منی نے کہا تھا.. اے مہامتی جس طرح ناٹک کے ناچ گانے.. وینا بجانے مصوری اور دوسری کلاوں کی مہارت بتدریج حاصل ہوتی ہے اسی طرح ارہت بھی ایک دن میں نہیں بن جاتا ہمارے مہاراج کمار نے بھی تو تیاگ کو ایک قسم کی کلا سمجھ رکھا ہے

وہ باتیں کرتے کرتے تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئے جو کہ خیمہ گاہ کے عقب میں تھا.. دور سے آشرم کے جھونپڑے نظر آ رہے تھے.. جن پر پھیلی ہوئی کدو اور لوکی کی ہری بیلیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں.. لیکن تم کچھ کہنا چاہتے ہو.. کیا بات ہے؟ چمپک نے سوال کیا

اظہار... اسے محسوس ہوا کہ وہ اظہار نہیں کر سکتا سارے اظہار کا ایک مقصد ہے جو کہ اظہار سے ماورا ہے.. میں کیا کہنا چاہتا ہوں.. چلو میں تمہیں اپنی تصویریں دکھاوں.. اس نے گڑبڑا کر کہا

اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا... اس نے بشاشت سے پوچھا

تم سمجھتی ہو کہ میں بالکل نکما تخیل پرست مسخرہ ہوں.. جیسے سب طالب علم ہو

تے ہیں ..مگر چمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراوستی کا گوتم نیلمبر بہت بڑا چتر آچاریہ بن چکا ہے..اس نے بچوں کی طرح غصہ سے کہا اور پھر چمپک کو دیکھنے لگا کہ شاید وہ خفا ہو گئی اور اب اسے ترکی بہ ترکی جواب دے گی..مگر وہ چپ رہی

وہ منڈیر پر خاموش بیٹھی رہی ..کیونکہ اسی طرح آج سے چند سال پہلے ہری نے اس سے کہا تھا.تم مجھے نکما اور تخیل پرست مسخرہ سمجھتی ہو جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں..لیکن ایک روز تم سنو گی چمپا رانی ..کہ ایودھیا کا مہاراج کمار بہت بڑا ریاضی دان بن چکا ہے

اظہار مقصد سے ماورا ہے..ویدانت میں آیا ہے..کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے زیر اثر کائنات سراب کی ایسی دکھلائی پڑتی ہے..جس طرح پیاسے ہرن کو ریگستان میں ندیاں نظر آتی ہیں..اسی مرگ ترشنا نے مجھ کو..ہری کو بہت پریشان کیا تھا

مقصد کیا ہے؟ اصل مقصد کیا ہے ....وہ منڈیر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی ..اگر تمہارا آنند تمہیں کہیں ملے تو اس سے کہ دینا سندری مرگ ترشنا سے بھی آزاد ہو چکی ہے اسے فکر نہ کرنا چاہیئے

تم.....یہ خبر صحیح ہے کہ وہ یہار میں جانے والی ہو..؟

شاید ....کیا حرج ہے؟....یہ تجربہ بھی کر دیکھنا چاہیئے ...سبھا رانی نے تو اپنی آنکھیں نکلا کر دی تھیں..کہ دنیا کی ترغیبات سے بچیں

چمپک تمہاری عمر کتنی ہے؟

کئی سو سال..اتنے سو سال کہ مجھے بھی یاد نہیں رہا..اس نے ہنس کر کہا

چند روز ہوئے میں نے بھاٹوں سے بھیشم اور ارجن کا قصہ سن کر یہ سوچا تھا

..کہ چتر انگدا اور الوپی کیسی رہی ہونگی.

مجھے دیکھ کر تمہیں معلوم ہو گیا..؟ وہ پھر ہنسی..اور اسنے کہا..تم تو پر-تما کار یک ہو

ہاں

لیکن تم بھولتی ہو کہ ہر فن پارہ نام وت اور روپ وت کا امتزاج ہے..ایک سے کان دوسرے سے آنکھ آشنا ہوتی ہے...

لیکن جو شے خالص ماہیت ہے..جس کا ادراک خالی عقل کے زریعے کیا جاتا ہے..اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا..ورنہ تم خود اپنے نظریے کی تردید کر رہے ہو

خالص ماہیت صرف ماہیت ہے موزونیت نہیں..گوتم نے جواب دیا...کسی مادی علامت کے زریعے اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اسے مادی علامات سے مماثل نہیں سمجھ جا سکتا

آکاش روپم لکھیا.....چمپک نے ہنس کر کہا

خالص ہیت...گوتم نے جوش سے بولنا شروع کیا..وجود کی تشریح کرتی ہے خود اس کا وجود نہیں..

تم کیا بنانا چاہتے ہو؟

میں تم کو بتاؤں گا ایک دن ضرور بتاؤں گا کہ میں کیا بنانا چاہتا ہوں.تم میرے گرو سے نہیں ملو گی؟

نہیں....میں نے ایودھیا میں اپنے اساتذوں سے تھا پڑھا ہے کہ وہ لوگ مجھے پڑھا پڑھا کر اکتا گئے..دیکھو تو نرملا کے کتنے مزے ہیں...دن بھر سنگھار پٹار میں

مگن رہتی ہے۔۔۔ناچ اور گانا سیکھ چکی ہے۔۔ پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔۔

نرملا تمہاری بہت دوست ہے؟

وہ ہماری اور تمہاری مہاراج کماری ہے

پڑھنا تو اس کا بھی فرض ہے

اس کا فرض ہے کہ اب وہ گھر بسائے۔۔چمپک نے بزرگوں کی طرح کہا۔۔۔تم بھی تو اپنا برہمچاریہ کا زمانہ ختم کر کے بیاہ ویاہ کر ڈالو گے۔۔۔۔۔

پیچھے سے چھاگل کی آواز آئی۔۔۔نرملا بہت سارے پھول ٹوکری میں اٹھائے مالنی بنے ہوئے پگڈنڈی پر سے آ رہی تھی۔۔۔گوتم کو دیکھ کر اس نے ٹوکری منڈیر پر رکھ دی۔۔۔اور ہاتھ جوڑ دیئے۔۔گوتم نے بڑے پہنچے ہوئے اور مقدس برہمن کی طرح اسے آشیرباد دی اور الٹے پاؤں لوٹ گیا۔۔۔۔

علاوہ تصویریں اور مجسمے بنانے کے تم ناٹک بھی اچھا کھیل سکتے ہو۔۔چمپک نے بشاشت سے کہا اور گوتم کو درختوں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی

۱۰۔۔۔

مبارک ہیں وہ جن کو شانتی میسر آ چکی ہے۔۔چمپک نے دل میں دہرایا اور اسے گوتم سدھارتھ کا وہ وعظ یاد آ گیا جو کہ انہوں نے گیا میں دیا تھا۔۔۔ساری چیزوں میں۔۔۔۔اے پروہت۔۔آگ لگی ہے۔۔آنکھیں آگ میں جلتی ہیں اور اشکال ۔۔اور بصیرت۔۔۔حسیات۔۔۔وفور شوق۔۔آوازیں۔خوشبوئیں۔۔۔ذہن و دماغ۔۔۔جسم۔۔۔ تصورات۔۔۔سب دھڑ دھڑ آگ میں جل رہے ہیں۔۔۔اور نفرت اور محبت اور پیدائیش اور بڑھاپے اور موت اور رنج و الم اور دکھ اور گریہ زاری اور مایوسی نے اسے

پروہت یہ الاو تیار کیا ہے...

آشرم کا طالب علم لڑکا واپس جا چکا تھا..جنگل پروائی ہوا میں سنسنا رہا تھا ..درکتوں کے نیچے سے چند بھگونیاں کشکول سنبھالے اپنی جھونپڑیوں کی طرف واپس جا رہی تھیں ان کے چہروں پر کس قدر سکون تھا کیونکہ وہ ندی میں داخل ہو چکی تھیں...اس راستے پر چل رہی تھیں جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی..کیا میں بھی ندی میں داخل ہو سکوں گی..چمپک نے اداسی سے سوچا..مبارک ہیں وہ..اس نے دل میں دہرایا..اس نے پلٹ کر خیمہ گاہ پر نظر ڈالی..جہاں جشن کی تیاریاں کی اج رہی تھیں..پھر وہ چپکے سے منڈیر سے اتر کر اس پگڈنڈی پر آ گئی..جدھر سے گوتم اپنے آشرم کی طرف اور لوٹا تھا..اور جس پر سے گزرتی ہوئی بھگونیاں ندی کے کنارے اپنی جھونپڑی کی طرف گئی تھیں

چمپک درختوں کی ٹہنیوں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی راپتی کی طرف روانہ ہو گئی ..سامنے کچھ فاصلے پر کٹی تھی..جس پر ترئی کی بیل پھیلی تھی...اور اس میں سے گانے کی آواز بلند ہو رہی تھی... یہاں اس نے سن رکھا تھا کہ بزرگ ترین راہبہ سمن رہتی ہے..جو کہ کوشل دیس کے ایک راجہ کی بہن تھی اور پچاس سال سے سنیاسن کی اس کٹی میں رہتی آئی تھی

شرواستی بھگونیوں اک سب سے بڑا مرکز تھا..اس وقت ان کی ٹولیاں بھیک مانگ کر لوٹ رہی تھیں ان میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں..چمپک حیرت اور اچنبھے سے ایک طرف کھڑی ان کو دیکھتی رہی..انہوں نے کام لوک فتح کر لیا ہے اور برہم لوک میں داکل ہو چکی ہیں....کیا میں بھی کبھی کام لوک فتح کر

سکوں گی...اسے گوتم نیلمبر کی بات یاد آئی..اسے ہری شنکر کا خیال آیا..جو کہ برسوں سے اس کے دل میں رہتا تھا..ان بھگونیوں نے کام لوک کس طرح تسخیر کیا..وہ سوچتی رہی مگر اس کی ہمت نہ پڑی..کہ ان کے قریب جا کر ان سے بات کرے..وہ جو زرتار بنارسی ساڑھی اور سونے کے زیورات سے مزین تھی..وہ جو جی بھر کر راگ اور رنگ کی دنیا سے محظوظ ہوتی تھی..حسیات کی کنیز جو جب سے اس لڑکے سے باتیں کر کے آئی تھی جی ہی جی میں ایک نامعلوم سی خوشی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی.وہ ایسی حقیر بندی...ان اونچی..پوتر..دیو بالاؤں سے کیا بات کر سکتی تھی...؟

بہن ....ادھر آؤ...وہاں کاہے کو کھڑی ہو...ان میں سے ایک نے گویا اس کی کشمکش کو بھانپ لیا..ادھر آؤ...ہمارے سنگ بیٹھو..ایک بھگونی نے قریب آ کر بڑی شفقت سے اسے کہا..

میں.......دیوی سمن سے مل سکتی ہوں....؟

ہاں کیوں نہیں...بہن سمن تو تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہیں

ڈرتے ڈرتے چمپک اس نوجوان بھگونی کے ساتھ کٹی میں داخل ہوئی

سامنے سمن بیٹھی تھی..جوش عقیدت سے چمپک کا گلہ رندھ گیا...اور اس کو اپنے جسم میں جھجھناہٹ ایسی محسوس ہوئی..سری کرشن کی پجارن چمپک کسی خدا کو نہ ماننے والی راہبہ سمن کے آگے جھک گئی..

باہر اندھیرا چھا رہا تھا...سمن ان سب سے الگ مرگ چھالے پر بیٹھی تان پورہ بجا بجا کر گا رہی تھی...

یہ گانا راہبہ چتا نے راج گیر کی چوٹیوں پر گایا تھا...

گو کہ میں کمزور اور دکھی ہوں اور میری جوانی ختم ہو چکی ہے

اور میں لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھی ہوں ..اور میری چادر میرے کندھے سے لٹکی ہے..

اور میرا کاسہ الٹا ہے..

چٹان کے سہارے کھڑے ہو کر میں نے اپنی خودی کو سہارا دیا ہے..

اور آزادی کی ہوا میرے چاروں اور منڈلا رہی ہے

بدھ کی خواہش پوری ہوئی

چمپک کٹی کی دہلیز میں بیٹھی رہی ..بھگونیاں گا رہی تھیں ...یکلخت چمپک نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بنارسی ساڑھی یہیں پھینک کر اور کیسری دھوتی لپیٹ کر ان سے آن ملے گی ان لوگوں کے اور اس کے درمیان مغائرت کی جو دیوار کھڑی ہے اس کو وہ اپنے اس لباس اور اس زندگی کے ساتھ کبھی بھی عبور نہیں کر سکتی..

مجھے کچھ گوتمی کے بارے میں بتلاو .....کچھ شاکیہ منی کے بارے میں ...اس نے ڈرتے ڈرتے سمن سے کہا

سمن خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی ..ایک لمحے کے لیے چمپک کو ڈر سا لگا ..ان آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کی چھایا جھلملا رہی تھی اور چمپک کو معلوم تھا کہ سمن کتنی بوڑھی ہے ..اور چمپک کو وقت سے ڈر لگتا تھا.

مجھے کچھ اپنے سنگ کے بارے میں بتاو .....اس نے ہڑبڑا کر دوبارہ کہا

سمن اٹھارہ برس کی عمر میں اپنا راج گھرانہ تج کر سنگھ میں شامل ہوئی ..وہ بیس سال کی تھی جب شاکیہ منی نے مہاپری نروان حاصل کیا ..اس کو گئے اسی سال ہو

چکے تھے ..اٹھارہ برس کی عمر میں راج کماری سمن کے حسن کی شہرت دور دور تک پھیلی تھی ..اب ایک اٹھانوے سالہ بوڑھیا پھونس گھیرو لباس پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی .....دنیا تج کر بھی اسے کیا ملا تھا؟ چمپک کے دل میں کسی چور نے پوچھا ..اگر میں نے دنیا چھوڑ دی تو مجھے شانتی مل جائے گی؟ اور اگر یہاں بھی شانتی نہ ملی تو..؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں..پھر اس نے آہستہ سے سمن کی ساری کے کنارے کو چھوا..سمن گزرتے ہوئے وقت کی گواہ..شاکیہ منیکے قدموں میں بیٹھ چکی تھی ..جیت وون ویہار کی گندھ کٹی معطر کمرہ جس میں مہاتما بدھ رہتے تھے..میں داخل ہو چکی تھی ..کنڈل کیشی سے مباحثے کر چکی تھی ..چمپک نے اس کی ساری کے کنارے کو چھوا اور اسے محسوس ہوا..جیسے اس لمس کے زریعے وہ شاکیہ منی تک بھی پہنچ گئی ہے..اور اس احساس سے اسے ایک لمحے کے لیے بڑا سکون ملا.....

روہنی ندی کے کنارے شاکیہ منی کا وعظ سننے کے بعد ملک کے پانچ سو امراء نے دنیا تیاگ دی تھی..ان کی بیبیاں شاکیہ منی کی خالہ اور سوتیلی ماں پجاپتی کے پاس آئیں..جنھوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی .اور انہوں نے پجاپتی سے کہا کہ ہم بھی ترک عالق کے خواہش مند ہیں..شاکیہ منی نے ان کا سنگھ قائم کیا..اور شہزادیاں اور گرہستنیں اور ہر طبقے اور ہر عمر کی لڑکی بھگوانی بننے لگی.ان کے نغموں سے جنگل اور وادیاں گونج اٹھیں..وہ گرو کی چیلی بن کر بعد میں خود گرو بنتیں..دوسروں کو پڑھاتیں..دھرم کا پرچار کرتی تھیں..علمی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں..پنا جو کہ پہلے چندر بھاگ ندی کے کنارے پیدا ہوئی تھی..اور جس نے اب کے سے شرواستی کے ایک امیر گھرانے میں جنم لیا تھا...اور

جس نے جوانی ہی میں ارہت کا درجہ حاصل کیا..اور دھیرا اور بھدرا اور ابھی روپ نندا جسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا..اور بنارس کی ویشیا او دھا کاشی اور اتما جو کہ پہلے جنم میں داسی تھیں..اور دوسرے جنم میں شرواستی کے ایک سیٹھی کے یہاں پیدا ہوئی اور راجہ بھیم بسیرا کے پروہت کی لڑکی سوما جو کہ جیت ون کے نیم تاریک کنج میں بیٹھی تھی..اور ....مارا ....[ابلیس] نے ..ہوا میں نمودار ہو کر اسے مخاطب کیا..کہ او عورت جس کے پاس صرف دو انگلیوں کا احساس ہے..تو اس میدان کو تسخیر نہیں کر سکتی جس پر بڑے بڑے رشی منی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں..[کیونکہ عورت جو کہ سات آٹھ سال کی عمر سے رسوئی میں چاول ابالنا شروع کرتی ہے اور سارے وقت یہ دیکھنے کے لیے کہ چاول گلے ہیں یا کہ نہیں انہیں ڈوئی سے نکال نکال کر اپنی دو انگلیوں کی مدد سے مسل مسل کر ان کی گنی دیکھتی ہے]پر سوما نے مارا کو مار بھگایا..اور ارہت بن گئی اور ویشالی کی طوائف وملا اور ویش لی کے سپہ سالار کی لڑکی سہا جس نے گایا.....میں جسے چیزوں کا...کیا..کیوں بہت ستاتا تھا..اور گزرتے وقتوں کی یاد بہت تنگ کرتی تھی ..میں نے خودکشی کی ٹھانی .تا کہ پھر سے اس دنیا میں ذلیل زندہ رہوں..مگر مجھے راستہ مل گیا اور بدھ کی خواہش پوری ہوئی..اور شرواستی کی برہمن زادی ملکا اور ویشالی کی رقاصہ امبا پالی اور ہنس وتی شہر کی سندری نندا اور راج گیر کی سنہرے بالوں والی کنڈل کیشی جو کہ ایک ڈاکو کے عشق میں دل شکستہ ہو کر پہلے جین سنیاسن بنی اور جو کہ سیب کی ٹہنی ہاتھ میں لے لے کہ گاؤں گاؤں للکارتی پھرتی تھی..کہ کوئی ہے کہ جو آن کر بحث میں مجھے ہرائے.اور چندا اور ارج گیر کی ملکہ کھیم جو کہ اپنے حسن پر بڑی مغرور تھی..اور جس نے بانس کے

جھنڈ میں پہلی بار شاکیہ منی کو دیکھا۔اور خوبصورت امیر زادی انو پم اور مہارانی کھیم کی سہیلی وجے اور سجارانی ...آم کے باغ میں ایک نوجوان نے ان پر ڈورے ڈالنے چاہے تھے تو جنہوں نے اپنی آنکھیں نکال لی تھیں

یہ سب اب دوبارہ پیدا نہیں ہونگی کیونکہ انہوں نے ارہت کا درجہ حاصل کرلیا تھا...یہ سب ندی میں داخل ہو چکی تھیں....باہر کوئی اسے آواز دے رہا تھا...

وہ کٹی سے نکلی...خواصیں اور ہرکارے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے تھے کیونکہ جشن کے لیے خیموں میں اس کا انتظار کیا جارہا تھا...

عورتوں کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے..؟سو سال قبل یہیں شروستی میں ایک اہم سوال کیا گیا تھا....

ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں آنند....جواب ملا تھا

لیکن فرض کیجیے وہ نظر ہی آجائیں

ان سے بات مت کرنا

لیکن اگر وہ خود سے بات کرنے لگیں تو....؟

برابر جاگتے رہنا......

کئی راتوں تک متواتر جاگتے رہنے کے بعد دفعتاً گوتم کو نیند کا زوردار جھونکا آگیا۔لیکن کوشش کرکے اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں

طالب علمی کے زمانے میں جب وہ آشرم میں یا کتب خانوں میں مختلف کتابیں پڑھتا تو عجیب وغریب متضاد نظریے عورتوں کے متعلق اس کے مطالعے میں آتے...مہابھارت کی بارھویں کتاب میں لکھا تھا کہ عورت کبھی غیر مقدس ہو

ہی نہیں سکتی ...لیکن تیرہویں کتاب کا بیان تھا کہ عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے ..اس کی طبیعت میں اوچھا پن ہے ..اسور یہ کہ اچھے گھرانوں کی خواتین طوائفوں کے ملبوسات اور گہنے پاتوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں..ساور چونکہ سارا شر پیدائیش کی وجہ سے ہی ظہور میں آتا ہے..اور عورت پیدا کرنے والی ہے لہٰذا عورت ہی دنیا کے سارے شر کی ذمہ دار ہے....اور یہ عورت صرف محبت کی بھوکی ہے..اور سخت نا قابل اعتبار

لیکن اسی صحیفے میں یہ بھی لکھا تھا کہاں سب کمزوریوں کی باوجود عورت کی عزت کرنا چاہئیے..ساتھ ہی ساتھ عورت کو دیوی کا درجہ حاصل تھا..اس کی وفاداری .شرافت...شرم وحیا کی رشی منی قسمیں کھاتے تھے...لیکن شرواتی کی ویشائیں اور ناٹک میں اداکاری کرنے والی نائیکائیں اور سیاسی خدمات انجام دینے والی جاسوس عورتیں اور وش کینیائیں بھی تو عورتیں ہی تھیں

اور اروشی نے اپنے چاہنے والوں سے کہا تھا کیوں اپنی اجن کے پیچھے ہاتھ دھوکو پڑے ہو...خود کو بھیڑیوں کے پنجوں سے بچاو...

عورتوں سے دوستی رکھنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے دل بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں...

اور دوسری طرف گندھاری تھی...جس نیا پنے اندھے منگیتر کی خاطر خود بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی اور انوسیا اس قدر وفا شعار تھی کہ اپنے پتی کو خود اپنی سوتن کے گھر پہنچانے کے لیے گئی تھی اور کہیں پر یہ بھی لکھا تھا کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے آدمی سائے کے سمان ہیں..اور منو مہاراج نے کہا تھا کہ جس جگہ

عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتا خوشی سے رہتے ہیں

لیکن شا کیہ منی نے کہا تھا..عورت بیوقوف ہوتی ہے آنند.......عورت حاسد ہوتی ہے آنند..عورت بد باطن ہوتی ہے آنند....عورت سے بچو....عورت سے بچو ناری.بزتی ہے....مجسمہ شر

ایک مرتبہ شا کیہ منی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اسی جیت ون میں موجود تھے جو کہ جھیل کے اس پار نظر آ رہا تھا...اور رراجہ پر سین جیت نے ان کی دعوت کی تھی ....اور انند جو کہ کہیں باہر گیا تھا..اس دعوت میں نہ پہنچ سکا تھا

خوبصورت آنند نے اپنا کشکول اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح سوچ میں ڈوبا شہر میں بھیک مانگنے کے لیے نکل گیا...اس کے لیے کشتری اور چنڈال سب برابر تھے..اور اسے اپنی نیک نامی کا بڑا خیال تھا..اور بڑے وقار کے ساتھ اس نے شہر کی پناہ کی خندق عبور کی.اور شرواستی کے پھاٹک میں داخل ہوا...اور بھیک مانگتے مانگتے ایک مشہور رقاصہ کے دروازے پر پہنچا..اور رقاصہ کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی اور اس نے ایسا جادو ڈالا کہ بچارہ آنند دکھشنا لینا بھول کر سیدھے اس کے گھر میں داخل ہو گیا

اور شاہی محل کے ایوان ضیافت میں بیٹھے بیٹھے شا کیہ منی کو علم ہوا کہ آنند بڑی آفت میں مبتلا ہے اور انہوں نے دوسرے چیلے کو اس کی دستگیری کے لیے روانہ کیا

اور شا کیہ منی نے آنند سے کہا...میں اپنے پری نروان کے بعد چاہتا ہوں کہ تم سب میرے خاص چیلے...بودھی ستو..مہاستو اور ارہت...مکمل نجات حاصل کرنے کی بجائے آخری کلپوں میں دوبارہ پیدا ہونا منظور کر لو....تم طالب علموں...عام

آدمیوں.. بادشاہوں.. وزیروں.. امیروں... برہمچاریوں حتکہ طوائفوں اور بیواؤں اور بدمعاشوں.. اور چوروں اور قصابوں اور بساطیوں کی صورت میں جنم لو... تاکہ تم ہر طبقے کے انسانوں میں گھل مل کر انہیں مکتی کا راستہ دکھلا سکو.. صرف مرتے وقت اپنی اصلیت ظاہر کرنا ورنہ بدعتی تمہیں ورغلائیں گے..

اگر کوئی چیلا اپنے پہلے کلپ کی عادتوں کو ترک نہ کر سکا تو تم اس پر وہ اسرار منکشف کرنا جو کہ مجھ پر بودھی درکت کے نیچے کنول کے پھولوں کے درمیاں ظاہر ہوئے تھے

آنند ابھی جب اس لڑکی نے تم کو بہکایا یہ محض اس جنم یا اس کلپ کا اتفاقی حادثہ نہ تھا.. کئی کلپوں سے تم اس کی کشش میں مبتلا ہو... لیکن وہ پچھلے کلپوں کا بندھن اب ٹوٹ چکا ہے تم اور وہ اب آزاد ہو...

آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا.. ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا؟ آنند جو اسرار تم پر منکشف ہوئے وہ تمہارے سوا کون جانے گا؟ ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے

شاہی خیمہ گاہ کی جانب سے جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں.. کبھی کبھی گھنگھرووں کی جھنکار سنائی دی جاتی تھی.. چودھویں تاریخ کا چاند ڈولتا ڈولتا آشرم کے اوپر آ گیا.. اور اس کے اجالے میں پھلوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے انتہائی پرسکون نظر آ رہے تھے.. اکا دکا چراغ جل رہے تھے... باقی طالب علم سو چکے تھے.. صرف اب تک وہی جاگ رہا تھا

جانے اس سمے راجن کے پڑاؤ پر کیا ہو رہا ہوگا؟ روشنی .. موسیقی .. اور رقص .. اس نے اپنے ذہن میں چمپک کے تصور کو انہی تین چیزوں سے وابستہ کر رکھا تھا روشنی .. موسیقی .. اور رقص

وہ آہستہ سے اٹھا اور کاندھے پر چادر اچھی طرح لپیٹ کر دبے پاؤں آشرم سے باہر نکلا اور مہوا کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا .. اس سمے وہ بڑی بھاری چوری کر رہا تھا .. اور اس چوری پر شدت سے مسرور تھا .. اس کا سایہ زمین پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا .. اس کے پیروں کے نیچے خشک پتیاں زور زور سے کھڑکھڑا رہی تھیں .. ایک گلہری اس کی آہٹ پر چونک کر تیزی سے بھاگی .. ادھر ادھر دیکھتا ہوا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے .. وہ دھیرے دھیرے سے مہوے کے باغ میں داخل ہوا .. جہاں مشعلوں کی روشنی تیز ہو رہی تھی .. وسط میں منڈپ ایسا بنا تھا جس کے ایک جانب سنگیت کار لڑکیاں سر منڈل اور چھتارے اور جھانجھ لیے بیٹھی تھیں .. راج گھرانے کے مرد اور عورتیں چاروں اور جمع ہنسنے بولنے میں منہمک تھے ایودھیا کے لوگ رقص اور موسیقی میں اپنی مہارت کی وجہ سے سارے دیس میں مشہور تھے .. اس مجمعے میں ہر شخص کلاونت جان پڑتا تھا ..

دفعتاً گوتم کی نظر اس بوڑھی خادمہ پر پڑی .. جس نے کل اسے ڈانٹا تھا .. وہ ذرا گھبرا کر ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا .. اگر کوئی اسے اس سمے دیکھ لے تو کیا ہو .. وہ گوتم نیلمبر آشرم کا سب سے سعادت مند اور قابل طالب علم .. مشہور لیکھک اور چتر کار .. برہمچاری .. اس سمے چوروں اور آوارہ گردوں کی طرح ایک خیمے کے پیچھے چھپا لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا

۱۱..

ناچ....ناچ..ناچ

چھایا پتھ کہکشاں.. پر اپسرائیں ناچ رہی تھیں..مرگ گھٹ میں کالی رقصاں ہے..دل کے سنہرے ایوانوں میں شیو ناچتا ہے..اور گوکل میں نٹور گردھاری.... کیلاش پر اوما ناچتی ہے..اور یہاں راپتی کے کنارے..مہوا کے جھرمٹ میں... خزاں کے چاند تلے وہ ناچ رہی ہے..جسے کوئی کماری چمپک کہتا ہے..کوئی چمپا رانی..کوئی چمپاوتی..اس کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کے ان گنت روپ ہیں...اس کی اداسی..اس کی ہنسی...اس کی مسکراہٹ..اس کا دکھ..اس کا ویراگ.. اس کی مسرت..اس کی نفرت..یہ ایسے بھاو اور ایسے رس ہیں جنہیں بھرت منی بھی نہیں سمجھ سکتے...کسی شلپ شاستر میں اس ناچ کا ذکر نہیں..جو کہ میں نے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا..کسی نند کشور..کسی بھرت منی نے اپنی کتابوں میں اس کی مدراوں کا تذکرہ نہیں کیا..اس ناچ کے قوانین نہیں بنائے.....یہ بڑی انوکھی راس لیلا ہے...یہ بڑا اتم شرنگار رس ہے..لڑکیاں سازوں پر چھایا راگ الاپ رہی ہیں ..سبز طوطے پر سوار کام دیو اپنا پھولوں کا بان چلاتا ہے...اور پراکراتی مایا بن جاتی ہے..شو کی تیسری آنکھ کے شعلے نے کام دیو کو جلا کر بھسم کر دیا تھا..لیکن کام دیو تو اننگ ہے..انسانوں کے دلوں میں موجود ہے.....شیو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا

اور وہ اس طرح ناچ رہی ہے مانو پاروتی نے دیبی اوشا کی بجائے اسی کو بھرت ناٹیم کی تعلیم دی تھی..رقاص شہزادے ارجن نے آسام کی چتر نگدا اور دکھشن کی راجکماری اترا کی جگہ اس کو اپنا شاگرد بنایا تھا..وہ جو سفید ساری پہنے کمدنی التسو کا

تہوار منا رہی ہے اس نے بالوں میں کیسر کے پھول اڑس رکھے ہیں. اس کے جوڑے کو رتنا جلی نے ڈھانپا ہوا ہے.. اس کے گلے میں وجنتی مالا ہے.. جس کے صدف اور یاقوت.. زمرد اور نیلم اور ہیرے چاندی میں جھلملاتے ہیں اس کے گلے کی ملثاولی اور شیکر ہار اور سفید موتیوں کی سدھ ایکاولی کی چھوٹ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے.. اس کے کانوں میں کرن پھول ہیں.. اس کے کنول ایسے پیروں میں پدپد ما جگمگا رہی ہے... اس کے ماتھے پر طلائی سیس پھول سجا ہے. وہ سولہ سنگھار کیے اپسرا اشر دوتی کی طرح خزاں کے چاند تلے ناچتی ہے.... سارا شرواستی سارا ایودھیا سارا کسم پورہ سارا جمبو دیپ.... کاتک پورنماشی منا رہا ہے.. اور شیو نے آنکھ کھولی ہے.. خزاں جو کہ شیو کے جسم کی مانند زرد ہے.. شیو بھبھوت رمائے ہاتھی کی کھال پہنے لیٹا ہے.. اس کی جٹاوں سے گنگا بہہ رہی ہے.. اس کے ماتھے پر ہلال جگمگاتا ہے.. وہ بہت کم کم ہنستا ہے........... چترم ساگزرنے کے بعد وشنو اپنی گہری نیند سے جاگا ہے وشنو جو کہ اننت ل امحدود عقل کا مظہر شیش ناگ. کی پیٹھ پر پڑا سوتا تھا.. وشنو چیتر جو کہ خلا کو نگل چکا ہے.. جو کہ ساری کائنات کا زہر ہلال پی چکا ہے.. اننت پر بیٹھا ہوا وہ زمان و مکان کی قید سے بلند ہے.. اور وشنو اپنی ڈمرو بجا رہا ہے.. اور زمان و مکان اس کے ڈمرو کی آواز پر لرز رہے ہیں.. اور سبزہ زاروں پر چاند کی روشنی برس رہی ہے.. اور چاندنی فضا میں گھل گئی ہے.. اور جب دنیا احساس اور چھونے اور دیکھنے اور تجربہ کرنے کی دنیا اس قدر دلکش ہے تو اس میں مرگ ترشنا کا کیا دخل؟ یہ سب اصلیت ہے.. زندگی سب سے بڑی اصلیت ہے.. تخلیق سب سے بڑی حقیقت ہے.... تخلیق عظیم ہے.. شکتی کی تقدیس کرو جو کہ تخلیق کرتی ہے

..دیوی کی تقدیس کرو جو کہ ماں ہے..ماں....اوما....گوری..لکشمی.....جس کا دوسرا نام آشا ہے..جس کا دوسرا نام کملا ہے..جس کے تصور کی تشکیل کنول کے پھولوں نے کی....وہ چمپا کے پھول کی طرح معطر ہے...وہ ماں ہے...جیسے کہ زمین ماں ہے..جیسے ندی ماں ہے..ماں الوہی ہے..عورت الوہی ہے...کیونکہ ماں ہے..چمپک الوہی ہے...اس کی حمد کرو..اس کی عبادت کرو..اس کے آگے جھک جاو...وہ اس خنک زرد گھاس..اس ہری زمین کی دیبی ہے...ابدی ماں..اور ابدی رفیق..میری بہت پرانی ساتھی ہے...کیا میں اسکو نہیں جانتا؟

رگ وید میں لکھا ہے کہ میاں بیوی وہ ہیں جو کہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں

کیا کبھی ایسا ہوگا کہ اسے وواہ[رتھ] میں بٹھلا کر اپنی دلہن کی طرح اپنے گھر لے جاوں گا...؟

۱۲...

مجمع چونک اٹھا...ایک نوجوان خیمے کے پیچھے سے نکلا..منڈپ میں آکر اس نے جھک کر گھنگھرو باندھے..اور اپنی سفید چادر ایک طرف پھینک کر انند تانڈو ناچتا سامنے آگیا...

مجمع مسحور ہوکر اس کا رقص دیکھتا رہا.....لگتا تھا کہ جیسے نٹ راج نے اپنا فن اسے خود سکھلایا ہے وہ خود ہی نٹ راج ہے

چمپک ناچتے ناچتے رک گئی..اس نے رقاص کو اچنبھے سے دیکھا

مردنگ زور زور سے بجتی رہی...سندھیا تانڈو ناچتا ہوا وہ منڈپ کے وسط میں

آ گیا..

اس نے شو کی مانند رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے..اس نے آٹھوں رس دکھلائے..یہ وشنو کا سرنگار رس ہے..یہ اندر کا ویر رس ہے....یہ یم کا کرونا ہے...یہ رودرا کا رور رس ہے...یہ کال کا بھیانک رس ہے...یہ گندھرو کا ابھت رس ہے...یہ شانت رس ہے....یہ شو کا رقص ہے...اس کی ذراوں میں کائنات کا سارا عمل ارتقاء مضمر ہے...اس کی زبان سارا اظہار ہے..اس کا لباس چاند اور ستارے ہیں..شو جو کہ جسم تان ہے اور مجسم سنگیت..جو کہ آفاقی لے کا مظہر ہے

مادر کائنات اوماہاوتی کو کیلاش کے سب سے اونچے تخت پر بٹھا کر نٹ راج اس کیاس منے ناچتا ہے...سرسوتی وینا بجارہی ہے..اندر بانسری...برہما جھانجھ بجاتا ہے...لکشمی گاتی ہے...اور وشنو مردنگم بجارہا ہے..سارے دیوتا اور گندھرو اور سدھ اور رودیا دھر آس پاس کھڑے ہیں...یہ شام کا سمے ہے..سندھیا کا رقص ہے ..

چمپک اپنی جگہ سے اٹھی اور ناچتے ہوئے اس کے برابر ہوگئی...

ان دونوں نے مل کر اوتا ماتڈا شروع کر دیا..وہ گوری تھی اور شنکر کے ساتھ رقصاں تھی..

چاندنی کھلے میدانوں پر نغمہ ریز تھی..اور چاندی کے رنگ کے بال ندی پر تیر رہے تھے اور چاندی کے رنگ کے سارس پروں میں چونچ چھپائے بالو پر سو رہے تھے اور کاتک کا پورا چاند پھولوں کے اوپر سے جھانکتا تھا

مگر وہ رات بھی ختم ہوئی..اور تہوار منانے والوں کا ہنگامہ کم ہوا..اور ان کے

گیتوں اور گھنگھروں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں ..اور پو پھٹنے سے تک شاہی خیمہ گاہ پر خاموشی چھا گئی...اور منڈپ میں پھولوں کے چند گجرے اور کلیوں کے سے انبار بکھرے پڑے رہ گئے

۱۴...

صبح ہوئی.. ہمالیہ کی چوٹیوں پر دھند تیر رہی تھی .تالابوں میں سرخ کنول کھل گئے تھے ...گاؤں کی سڑک پر جاتی ہوئی گنوالنوں کی رنگین گگریاں دھوپ میں جگمگا رہی تھیں مہوا کے پیلے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی مدھوکر .شہد کی مکھی..اس کے کانوں میں بھنبھایا کی...اور جب سورج کی تیز کرنیں اس کے پپوٹوں میں گھسیں تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا..اور اس نے اپنے آپ کو تالاب کی شکستہ سیڑھیوں پر لیٹا ہوا پایا ...اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا..وہ کہاں تھا اور یہ سب کیا تھا ؟...اس نے دماغ پر بہت زور ڈالنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا

چمپک......چمپک.....چمپک

سارے وقت مدھو صرف یہی بھنبھاتی رہی تھی...وہ اطمینان سے انگڑائی لے کر اٹھا اور دوسری انگڑائی لے کر پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا...دفعتا اس کی نظر مہوا کے جھنڈ پر پڑی ..جو کہ سنسان پڑا تھا.. یہ جگہ جہاں ساری دنیا کی رونقیں سمٹ آئی تھیں ..اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی ..ایک ہرن درخت کے پیچھے سے بھاگا.. چند گلہریاں بیل کے پھل کترتی رہیں.. ہرے طوطوں کی ایک ڈار شاخ پر سے اڑ گئی ...جنگل خاموش پڑا رہا..وہ حیران و پریشان وہیں بیٹھا تھا..پھر اسے رفتہ رفتہ بہت دھندلے خواب کی طرح یاد آیا اس جگہ رات بھر پہلے شاہی خیمہ گاہ تھی..اور اس میں

وہ منڈپ کے نیچے رات گئے تک ناچا تھا..وہ سب ناچے تھے اور جب ان اچتے ناچتے وہ تھک گیا تھا تو راجن سے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا..اور اس نے راجن کے ساتھ خوب جی بھر کر مدرا پی تھی اور بھنا ہوا ماس کھایا تھا...اور زرزنگار چھتر کے نیچے اطلسی مسند پر بیٹھا تھا..اور اس محفل رنگ و بو میں اس کی نظریں برابر چمپک کی متلاشی تھیں..لیکن وہ رقص ختم ہونے کے ساتھ ہی شہزادیوں کے ساتھ زنان خانے کی طرف چلی گئی تھی...اور اس کے انتظار میں وہ پو پھٹے سے تک وہاں بیٹھا رہا..جب وہ منڈپ سے باہر نکل کر لڑکھڑاتا ہوا آشرم کی طرف لوٹ رہا تھا.. اس وقت اسے نیند کا جھونکا آیا تھا..اور وہ تالاب کے کنارے پڑ کر سو گیا تھا...اور صبح صبح کوچ کا نقارہ بجا تھا..اور خیمے اٹھا دیے گئے تھے..اور جب شاہی قافلہ کھیدا کے لیے روانہ ہو رہا تھا..اس وقت چمپک نو ملا کے ساتھ تالاب کے کنارے سے گزری تھی..اور نرملا نے اس سے کہا تھا..کیسا انوکھا برہمن ہے..پرسوں تم سے چتر کاری کے متعلق بحث کر رہا تھا...رات کونٹ راج کی طرح ناچا..اور اسوقت بچوں کی طرح پڑا سوتا ہے..جانے سے پہلے آؤ اسے جگا کر پرنام تو کر لیں..

چمپک چند لمحوں کے لیے خاموش گم سم کھڑی رہی تھی اور پھر اس نے جواب دیا تھا..نہیں..کیونکہ جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے..اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے..ان لوگوں کی طرف دیکھو جو کہ مسلسل جاگتے رہتے ہیں

اور اب مہوے کے باغ میں مکمل سناٹا تھا..وہ تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا..اس ایک رات میں وہ دفعتاً کتنا بڑا ہو گیا تھا..اس نے دل کی کائنات کی سیاحت کی تھی..اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا...اور وہ اس تجربے سے غیر مطمئن نہیں تھا..

لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا جیسے شیوا کی بجائے زندگی کا سارا ہلاہل اس نے خود پی لیا ہو.. یہ کیسا انوکھا تجربہ تھا.. اس کی شرط تو اس نے کپل سے نہیں لگائی تھی.. اور ہری شنکر تو کہیں ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑا رہ گیا تھا

اس کا جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے.. اور شاہی قافلے سے جا ملے.. راجن کا ایک حقیر کہار بن کر ان لوگوں کے ساتھ چلے.. اس لڑکی کے پیچھے پیچھے افق کے دوسرے کنارے تک پہنچ جائے

لیکن وہ تو اس سے چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی.. اس نے اسے قریب آ کر جگایا تک نہیں

چنانچہ وہ مجھ سے ایک بات کہے بغیر ہی چلی گئی.. اور ایک لمحے کے لیے اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی.. اس کا یہ احساس شدید ہو گیا کہ وہ اس سے الگ نہیں.. اس کے وجود میں شامل ہے.. اسے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو مجھ سے ہر سمے باتیں کرتی رہتی ہے.. مگر یہ بھی غلط ہے.. بکواس میں تو اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں.. میں مایا کے فریب میں اچھی طرح مبتلا ہو چکا ہوں.. وہ مجھ سے الگ ہے.. بہت دور ہے.. بھلا میں کہاں اور وہ کہاں..؟ یہ سب جھوٹ ہے

بہت اچھا... اس نے تالاب کی سیڑھی پر سے اٹھتے ہوئے کہا.. [یہیں اس روز وہ بیٹھی تھی] تم اپنے کروفر کے ساتھ ہاتھیوں کے شکار کے لیے روانہ ہو چکی ہو.. اور زندگی.... تمہارے بنا بھی گزر سکتی ہے

آشرم کے راستے پر چلتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے .عنقریب اس کا باپ اسے گھر لے جانے کے لیے آئے گا.. گرو اسے رخصت کر

تے وقت اپنی نصیحت دہرائیں گے ..وہی الفاظ دہرائیں گے جو کہ ہر فارغ التحصیل طالب علم کے سامنے صدیوں سے دہرائے جا رہے تھے ..سچ بول اور دھرم کر ..(دھرم؟) آشرم کے سارے لڑکے اس کے عمر بھر کے ساتھی اسے گھاٹ تک پہنچانے جائیں گے ..فضیلت کی پگڑی باندھ کر وہ آنکھوں میں پہلی بار انجن لگائے گا ..کانوں میں منی کنڈل پہنے گا ..کیسری لباس کے ساتھ کاندھوں پر اونی کمبل ڈال کر پیروں میں جوتی پہن کر بالوں میں تیسی کے کانٹوں سے بنی کنگھی اڑسے .. چھتری لگائے وہ شان سے شراوستی کی سڑکوں پر نکلے گا ..ایودھیا اور پاٹلی پتر کے دربار وں میں جائے گا ..وہ پروہت کی مسندوں پر بیٹھے گا ..حکومت کے منتری منڈل میں شامل ہوگا ..جبکہ بیچاری مورکھ لڑکی مگدھ کے کسی اجاڑ وحشت خیز وہار میں سر گھٹائے بیٹھی شاکیہ منی کے بتلائے ہوئے نروان کے حصول میں جٹی ہوگی

اگر وہ اپنے ذہن پر اس قدر غرور کر سکتی ہے تو کیا میں اپنے رتبے پر نازاں نہیں ہوں ..اور خالی مسوری اور سنگتراشی میں کیا رکھا ہے ..؟ میں ستر ادھر بنوں گا .. میں قوانین بناؤں گا ..منو کپل اور جیمنی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے ..میں ذہن کی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دونگا ..علم میرا ہے ..گنیش کا قلم میرا ہے ..؛ اگر چمپک میری نہیں ہوسکتی ..تو کیا اندھیرا ہوگیا ..سرسوتی تو میری ہے وہ مجھے کبھی بھی اس طرح چھوڑ کر نہیں جائے گی

اور چمپک میں رکھا ہی کیا ہے ..خوبصورت تو دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں .. نرملا کتنی خوبصورت تھی ..چمپک اگر غور سے دیکھ جائے تو تم ایسی بھی حسین نہیں

اس کی شکل کیسی تھی بھلا ..؟ اس نے غصے سے چلتے چلتے تین چار کنکروں کو ٹھوکر

لگائی۔۔میں نے کم از کم یہ تو طے ہی کر لیا ہے۔۔کہ تمہاری تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔۔میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔۔میں تو اس کی شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔شکل محض ہیولے ہے۔۔میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے۔۔اسے صرف وشواکرمن پہچان سکتا ہے

وہ اپنی کٹی میں داخل ہوا۔۔پھر باہر نکل آیا۔۔اور ادھر ادھر گھوما پھرا۔۔آشرم کے لڑکوں نے اسے حیرت سے دیکھا کسی نے اس سے پوچھا۔کل رات سے نظر نہیں آئے۔۔کہاں تھے؟

تو اس نے رکھائی سے ان کی بات ٹال دی۔۔

اکلیش سے اس نے جھوٹ بولا تھا۔۔کہ ندی کے کنارے تپسیا کر رہا تھا۔عمر میں پہلی بار اس نے جھوٹ بولا تھا اور اب اسے سارے جھوٹ بہت اچھے لگ رہے تھے۔۔اس نے سندھیا نہیں کی نہ گرو کے درشن کے لیے گیا آشرم کے کنجوں میں مارا مارا پھرتا رہا

میں اس کی تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا میں پرِیتما کاریک ہوں۔۔فن پارے کو زندگی کے سارے رشتوں سے بلندتر ہونا چاہیئے۔۔اس نے بار بار دل میں دہرایا۔۔لیکن بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔۔وہ کلاکار تھا۔۔اور تخلیق کی لگن نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا

دوسرے روز صبح سویرے وہ اپنا تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا سامان لے کر مہوے کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔تالاب کے کنارے بیٹھ کر اس نے گیرو پیسا اور سرخ رنگ تیار کر لیا۔نیل کی پڑیا مٹی کے کٹورے میں گھول دی۔۔ہلدی اور کیسر

سے زرد اور زعفرانی رنگ تیار کیے.. دوسرے رنگوں کے لیے جڑی بوٹیاں ابالیں. اور سفید چینی پٹہ سامنے پھیلا کر تصویر بنانے بیٹھ گیا. مگر روپ اور اروپ کی کشمکش نے پھر اس کا موقلم روک لیا.. میں کیا بناؤں؟ پھر اس نے سوچا کہ معنی کا کوئی مقام نہیں ہوتا.. ایک ہی معنی کو مختلف علامتوں کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے.. اور ان علامتوں کو مختلف مقامات سمجھا جا سکتا ہے.. ان کی وجہ سے معنی محدود نہیں ہو جاتے.. تصویر رنگ نہیں مصور کی روح ہے.. دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں جنہوں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا ہے.. رنگے ناودیا تے چترم.. آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جو کہ سطح پر موجود ہیں.. جس طرح شاعری محض بیان ہے جسے حس نے تحریک دی ہے.. جس کا کوئی مقام نہیں.. حس تجربہ جس میں موجود ہے...

اسے یاد آیا.. ویدانت والے کہتے ہیں.. ذات مطلق اموَرت ہے.. جس کی کوئی شکل نہیں.. جو کہ ادراک سے باہر ہے.. وہ ذہنی تصور یا خیال بھی نہیں.. اس لیے ویدوانت والوں کے نزدیک فن کا تصور اپار برہما یا کمتر درجے کی حالت سے آگے نہیں بڑھتا.. برہما ایشور ایسی ذات ہے جسے شکل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے.. اور اس تصویر کا اصل مخرج روشنی ہے.. اس کی اصل ہیت یا سروپ مختلف چیزوں کی ہیت ہے.. وشواروپ

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیال محض علامت کے ذریعے ہی دیکھنے والوں تک پہنچایا جا سکتا تھا.. سارے چترکار اور نقاد کم از کم اس بات پر متفق تھے.. اسی نظریے نے اصنام پرستی کی ترویج شروع کی تھی

مگر خیال سے علیحدہ گوتم نے سوچا.. زندہ ہستی تو بذات خود زندگی ہے.. علا

مت نہیں..اس کی طرف کشش جزبات پر مبنی ہے..پھر کلا کار خالص خیال کو کس طرح پیش کرے..؟اس کا رویہ تو غیر جانبدار نہیں رہ پائے گا..دھیان..جو کہ کلا کار کا اصل فن ہے..سالم نہیں رہ سکتا...خالص ہیت.....شئے کا تصور جو کہ خود شے ہے...اصل دھیان ہے....شے کی شخصی کیفیت کو کس طرح نظر انداز کیا جائے؟

حقیقت زندگی سے آنکھیں نہیں چرائیہ جا سکتیں

اسی طرح تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے بیت سی تصویریں بنائیں ..اور بگاڑ دیں...سرخ مٹی سے بہت سی مورتیاں گھڑیں اور توڑ ڈالیں

آشرم کے لڑکوں میں کانا پھوسی شروع ہوئی...یہ گوتم کچھ باولا ہوتا جا رہا ہے ..اسے کیا ہو گیا ؟ **اکلیش** نے غصے سے کہا..نہیں گوتم باولا نہیں ہوا..اس پر ایک استری کی دھن سوار ہے..ایسی شرمناک بات آج تک اس آشرم میں کبھی ہوئی تھی ..؟کال کار بنتا ہے اور خیال کی بجائے روپ کے پیچھے بھاگ رہا ہے

شہر کی چتر شالاوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ..گوتم نیلمبر کیا اب ناگرک [فیشن ایبل پورٹریٹ پینٹنگ]مصوری کرے گا..سنا ہے کہ اس نے ایودھیا کی کماری چمپک کی تصویر بنائی ہے..ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے..چتر کاروں کی منڈلی کے پرکھ نے اظہار خیال کیا..اب وہ پریتما کاریک نہیں رہا..

گوتم تصویریں اور مجسمے بناتا رہا..اس نے آشرم کی زرد دیوراوں پر مٹی اور برادہ اور چونا پھیر کر گہرے رنگوں کے خطوط بنائے..اس نے سرخ مٹی کی مورتیاں ڈھالیں..اب تک جو تختیاں سینکی جاتی تھیں..ان پر زیادہ تر مابعد الطبیعات کی علامتوں کے نقوش ابھرے ہوئے ہوتے تھے..تر شول اور زندگی کا درخت اور زمین

کے کنول اور دنیا کے پہیے اور کنول کے سنگھاسن اور آگ کے ستون ..گوتم نیلمبر کی تختیوں پر گاؤں کے مناظر تھے عورتیں ..بیل ..پتے ..گائیں ..پھولوں کے نمونے ... کسان لڑکے ..ان نقوش میں قوت تھی ...اور زندگی کی سرخی اور تپش .. ماورائے حیات کی بجائے یہ اصل حیات تھی .... یہ زمین کی اپنی تخلیق تھی

پھر ایک دن اس نے سدرشن یکشی کا مجسمہ مکمل کرلیا ..سدرشن یکشی جو کہ کدم کی ڈالی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی

شہر کے فنکاروں نے اسے دیکھ کر سراہا ..چتر شالاؤں اور مندروں میں اسے نا پسند کیا گیا عوام جن میں فن کا ذوق عام تھا ..اسے دیکھ کر خاموش رہے ..نقادوں نے گہری نظروں سے اس کو جانچا ..لیکن گوتم کی تعریف کسی نے نہیں کی ..سب کو اچنبھا تھا

فنکاروں اور ذہن پرستوں کے حلقوں میں اس کے متعلق زوردار بحثیں چھڑ گئیں گوتم خاموشی سے سب کی سنتا رہا خود کچھ نہ بولا ..وہ فلسفے کا راستہ چھوڑ چکا تھا اس لیے یہ نہ بتا سکا کہ خالص جمالیاتی تجربہ دراصل کیا شے ہے؟ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ کس طرح دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے؟ روپ اور اروپ .. بھاو اور ابھاو کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا کون تھا؟ وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو ان کے اسرار کو پتھر میں مقید کر لے .... انسان جیسے وہ ہیں ..ویدانت کے پرستار کی حیثیت سے ..اس نے سوچا کہ خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے ..بجلی کی طرح ہے اکھنڈ ہے اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا خود ظاہر ہوتا ہے یعنی سوپر آکاش ہے ..جس طرح کے فنکار کا تصور وشوا کرمن کے تصور میں شامل ہے اس طرح دیکھنے وا

لا آتم یا خودی میں شامل ہے ۔۔جو ہمہ وقت دیکھتا ہے۔۔۔اور جس کا سروپ ساری کا
ئنات کا مظہر ہے ۔۔وشوا روپ۔۔۔روپم روپم پرتی روپ۔۔جمالیاتی لگن کا مکمل نمونہ
وہ ہے جو کہ دنیا کی تصویر کو محض خودی سمجھتا ہے۔۔۔جو کہ خودی کی سطح پر بنائی گئی ہے
۔۔۔یہ وہی خالص وجود ہے خالص ادراک اور خالص حیات ۔۔۔۔دل کا نگار خانہ
جہاں کہ ساری تصویریں موجود ہیں۔۔سارے تخیل موجود ہیں۔۔جہاں پہنچ کر ساری
شبہییں ایک ہو جاتی ہیں جہاں مختلف رنگین شیشوں میں سے ایک ہی روشنی گزرتی
ہے اور ہر شے جو کہ ڈھنگ سے بنائی گئی ہے اور سچائی سے بنائی گئی ہے۔۔مکمل فن
پارہ ہے ۔۔اور فن کار اور دیکھنے والے دونوں کے لیے ہی یہ ایک ہی مارگ ہے
۔۔۔۔اور سمجھنے والے وہ وان پر بدھا سے سمجھ سکتے ہیں

سدرن یکشی کی تخلیق کے ساتھ ہی سنگتراشی کا ایک نیا مدرسہ شروع ہوا
۔سنگتراش کا فن خالص دنیاوی بنا۔۔۔ان مجسموں میں شدید حقیقت پسندی تھی یہ کدم
اور پاتلی کے درختوں کی پریاں ۔۔ اندر لوک کی دیو مالائیں دراصل ایودھیا اور
شرواستی کی امیر زادیاں تھیں۔۔گاؤں کی کسان لڑکیاں تھیں۔۔جو کہ دراصل زندگی
میں پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں۔۔ساون گاتی تھیں۔۔۔۔کھیتوں کی نرائی کرتی
تھیں

سدرشن یکشی کمر پر سے بل کھائے ہوئے انداز میں کھڑی تھی۔۔اس کی باہیں
گداز تھیں۔۔آنکھیں بہت بڑی بڑی۔۔اس کا جسم بہت مضبوط اور سڈول تھا۔۔یہ
خطوط اور حجم کے توازن۔۔شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج
تھا۔۔اس انداز میں جان تھی اور حرکت اور قوت اور آزادی۔۔۔اور زندگی اور اطمینان

کی شدید کیفیت ... یہاں قید نہیں تھی ..بندھن نہیں تھا..کلا کار کو بلا آخر قید سے آزادی ملی تھی..اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنائے گا؟

اب سنگتراش راہب نہیں رہا تھا..اس نے خوبصورت ..تندرست ..مسکراتی ہوئی عورتوں اور مردوں کے پیکر تراشے ..عورتیں جو دل آویز کاہلی اور آسائش کے احساس کے ساتھ کھڑی تھیں یا بیٹھی تھیں..ان کے چہروں پر افسردگی کہیں نہیں تھی ..چہرے جو کہ سوچ میں ڈوبے مسکرا رہے تھے ...یہ بہت حقیقی...بہت اصل بہت واقعاتی دنیا تھی...دنیا جو کہ آس پاس چاروں اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور کلا کار جس کی شکتی اسے سرسوتی کا چہیتا بناتی تھی..سکون سے زندہ رہنے کا خواہاں تھا

ایک روز گوتم اپنی چند نئی تصویریں لے کر کملیشور کے نگار خانے میں پہنچ گیا وہاں حسب معمول اس کے اسرے دوستوں اور مخالفوں کا مجمع موجود تھا اس گروہ میں اسے چند لپی کار (رپورٹر) اور رچی وید ک بھی نظر آئے..اور اسے ذرا تعجب ہوا ..یہ سب ایک زمانے میں سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے اس کی کٹیا میں جمع ہوا کرتے تھے سب لوگ چپ چاپ کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے .. انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہے ..وہ چپ چاپ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور نیچے بازار کی چہل پہل کو دیکھنے لگا

تم کو نہیں معلوم..کملیشور نے بلا آخر بات شروع کی

کیا...؟ گوتم نے پوچھا

تم نے کچھ بھی نہیں سنا؟ آخر کس دنیا میں رہتے ہو؟

کیا ہوا؟ بتاؤ تو

باہر کسی نے کنڈی کھڑ کھڑائی...اور اکلیش داخل ہوا..اس کی اسنس پھولی ہوئی تھی اور اس کے پیر گرد آلود تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں دور سے بھاگتا ہو آرہا ہے

بھائیو..اپنا اپنا سامان سمیٹو اور فورا یہاں سے بھاگ نکلو

کیوں کیا ہوا..گوتم نے سوال کیا..

مگدھ میں لڑائی چھڑ چکی ہے..بھائی گوتم..چندر گپت کی فوجیں سارے دیس پر قبضہ کرتی ہوئی اس طرف آرہی ہیں..اب یہاں ہل چل جائیں گے..میدانوں میں سہرام نیہ جنگ کے دیوتاوں نے اپنا رقص کرنا شروع کر دیا ہے...اب تمہار وقت ختم ہوا..موت جنگ کا نقارہ بجاتی تمہارے تعاقب میں آرہی ہے..موت جو کہ روپ اور اروپ..بھاو اور ابھاو کے جھگڑوں کو مٹا دیتی ہے..اکلیش تھک کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں.تھوڑی دیر بعد اس نے کہا.راجن کھیدا سے واپس آرہے تھے.جب وشنو گپتا کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا.. سب کے سب مارے گئے

سب کے سب..گوتم نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا..

ہاں....سنا ہے کہ شہزادیاں ندی تیر کر پنچالوں کے علاقے کی اور نکل گئیں مگر سپاہی نا کے تعاقب میں ہیں..

کاے چمپک بھی ماری گئی ہوگی؟

وہ کون ہے؟اکلیش نے آنکھ کھول کر بڑی بے رحم آواز میں کہا..جنگ میں انسان نہیں رہتے صرف نام رہ جاتے ہیں..پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا

تم کہاں جاتے ہو بھائی اکلیش؟

میں لڑنے جاتا ہوں..مگر شاید تم نہیں لڑو گے..کیونکہ تم اہنسا کے قائل ہو چکے ہو ..اس نے اپنی چپلوں سے گرد جھاڑی اور اسی سکون سے باہر نکل گیا

جنگ....امن...خونریزی...اہنسا

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔اس نے کملیشور کو مخاطب کیا: ''مجھے کوئی بتاؤ، تم سب کلاکار اور عالم جو یہاں موجود ہو، بتاؤ کس وقت لڑا جائے۔ کس وقت نہیں۔کوئی ہری شنکر سے یہ پوچھنے جاؤ، جیو ہتیا کس سے جائز ہے کب نا جائز؟'' وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ ''بھائیو مجھے نند راجہ سے کوئی دلچسپی نہیں، میں وشنو گپتا کو نہیں جانتا۔چندر گپت سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ سب مل کر مجھے اپنی لڑائی میں کیوں گھسیٹتے ہیں، لیکن مجھے بھی دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ مجھے تو ان سب کی جانیں پیاری ہیں۔ میں خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں اب کیا کروں گا۔'' کھڑکی کے پٹ سے سر لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس اثنا میں لوگ، جو نگار خانے میں موجود تھے اپنے اپنے جوتے پہن کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے جانے کی آہٹ پر گوتم نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ کمرہ سنسان پڑا ہے، وہ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے تک بھاگا اور زور سور سے چلانے لگا: ''ارے اپنی اپنی مورتیاں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو، یہ ٹوٹ جائیں گی۔ بھائیو۔ بھائیو۔''

لیکن دفعتاً نیچے بازار میں شور قیامت بلند ہوا۔شہر پر جنگی رتھوں اور ہاتھیوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ پل کی پل میں سارا بازار رن میں تبدیل ہو گیا۔ ڈھول اور

ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی جھنکار اور عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی صداؤں کے خوفناک بھنور میں اس کی اپنی آواز ڈوب کر رہ گئی، وہ سکتے کے عالم میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ بازار کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اس کے چتر کار ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ چانکیہ کے سپاہی بڑی صفائی سے لوگوں کی گردنیں اتارنے میں مشغول تھے۔ گوتم کی نظروں میں اندھیرا چھا گیا، آخر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نگار خانے کی سیڑھیوں سے اترا۔ اس نے مرے ہوئے کملیشور کے ہاتھ میں سے تلوار نکالی اور خواب کے عالم میں چلتا، تلوار گھماتا، کیونکہ خودفنون جنگ میں طاق تھا، سڑک پر اتر گیا۔

گوتم رات گئے تک لڑتا رہا اور آخر کار زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گلی میں گر پڑا جہاں چاروں طرف اہل شہر کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔

افق کے نزدیک شہر سے کچھ فاصلے پر جیت ون کی عمارت چپ چاپ درختوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس کا کلس اندھیرے میں مدھم مدھم یوں جھلملا رہا تھا جیسے اس سارے نقشے پر خاموشی سے ہنستا ہو۔

۱۴

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ دیس پر اب مور کے نشان والے شہنشاہ کا راج ہے، وہ جو دیس کی چتر انت ریاست کا پہلا سمراٹ ہے۔ اتہاس پران میں ایک نئے باب

کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نسب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر رک گئے ہیں۔ یہ پر یہ درشن نری چندر، انسانوں کا چاند، جو پاٹلی پتر کے سنہاسن پر طلوع ہوا ہے۔

یہ شودر ماں کا بیٹا، جسے گڈریوں نے پالا، جسے چانکیہ نے ٹکشلا میں پروان چڑھایا اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے ننانوے کروڑ اشرفیوں کے خزانوں کے قصے خواب وخیال ہوئے۔

یہ عہد جدید ہے۔

چندر گپت بڑا زبردست بادشاہ ہے، اس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا ہے، اس کا پایہ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوفزدہ ہیں۔ اس کے ہزار ستونوں والے چوبی محل میں دور دور کی سلطنتوں کے سفیر موجود ہیں۔ اس کے دربار میں ملیچھ دوسری زبان بولنے والے غیر ملکی لوگوں کا ہجوم ہے۔ دور پچھّم کے دیسوں کی سفید فام لڑکیاں محل میں نرتکیوں اور داسیوں کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراستہ ہے۔ وسیع تماشا گاہ میں نیزہ بازی اور رتھوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ سڑک پر سے سمراٹ کی سواری گزرتی ہے۔ جلوس میں موسیقار شنکھ بجاتے بجاتے ساتھ ساتھ جارہے ہیں۔ چوراہوں پر رقص ہو رہا ہے۔ جھروکوں میں سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ عوام جے شبد بولتے ہیں۔ اب گرام بھوجک ان سے زبردستی لگان وصول نہیں کرتا، اب وہ چوری اور بدامنی کی آفتوں سے محفوظ ہیں۔ ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔

کیونکہ وشنو گپتا، جس کا دوسرا نام چانکیہ ہے، جس کا دوسرا نام کوٹلیا ہے، جس نے مہاپدم نند کو اپنی سیاست سے شکست دی، وہی وشنو گپتا مشیر سلطنت ہے۔ (اور شاکیہ منی نے کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں لیکن فتح وشکست سے بلند شانت آدمی سکھ میں رہتا ہے۔)

لیکن ہر فتح یا شکست تاریخ کے راستے پر ایک موڑ ہے جس کی وجہ سے دنیا کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس فتح کے بعد سے عوام پہلی بار قومیت کے تصور سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کو ایک مبہم سا احساس ہوا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو بہت سارے قبیلوں اور ذاتوں اور خاندانوں سے بلندتر ایک اور شے ہے، وہ ایک ایسی قوم ہیں جنہوں نے چندر گپت پریہ درشن کی قیادت میں ایرانیوں اور یونانیوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کیا ہے۔

وشنو گپتا، تکشلا کا برہمن، اپنے سیاسی تصورات کو اب عملی جامہ پہنا رہا ہے، وہ جانتا ہے کہ نیکی کا سیاست میں بدلہ نہیں ملتا۔ سیاست میں جرائم کی بھی سزا نہیں دی جاتی۔ جزا و سزا کے مسئلے کو اس نے دھرم شاستر والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے، وہ کہتا ہے سیاست میں صرف غلطی سے احتراز کرنا چاہئے۔ ریاست کی بہتری شخصی فائدے سے برتر ہے۔

معدنیات، بازار، منڈیاں، نہریں، آبپاشی، شفاخانے، مالیات، تجارتی گودام، باغات، محصول، دیوانی، فوجداری، طلاق، شادی، وراثت کے قوانین، تعلقات عامہ، امور خارجہ، دفاع، چراگاہوں اور قصاب خانوں کے اس نے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں۔ سارے میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ جو برہمن

اپنے علم کے ذریعے روزی نہیں کما سکتے اور نا کام سوداگر، حجام، نجومی، نوکر چاکر، طوائفیں اور کسان، ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو سکتا ہے۔ سادھوؤں کے بھیس میں ادھر ادھر گھوم کر جاسوس چندر گپت کے تخت و تاج کی حفاظت میں جٹے ہیں۔ بغاوت کا پتا چلاتے ہیں۔ ویشیاؤں کے گھروں اور قمار خانوں میں جا کر عوام کے خیالات سے باخبر رہتے ہیں۔ جرائم کی بیخ کنی کے لیے بھیدی کا کام کر رہے ہیں۔ سارے میں امن قائم ہے۔ منو نے کہا تھا جہاں سیاہ فام سرخ آنکھوں والی ڈنڈ مجرموں کو ختم کرتی زمین پر گھومتی ہو وہاں کی پرجا تنگ نہیں ہوتی۔

یہاں بادشاہ ڈنڈ دھر ہے اور پرجا خوش ہے۔

پاٹلی پتر پر اتنی رونق اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مگدھ نام نرتی (پراکرت مگدھ کی عوامی بولی) میں بدلتی جا رہی ہے۔ ناٹک اور موسیقی کے فنون اپنے عروج پر ہیں۔ گلی کوچوں سے گیتوں کی تانیں بلند ہوتی ہیں۔ کاریگر نئے نئے زیور گھڑ رہے ہیں۔ دور دور کے ملکوں کا سامان بازاروں میں فروخت ہو رہا ہے۔ بیراگی اور سپیرے گلیوں میں دوتارہ اور بین بجاتے پھر رہے ہیں۔ بہروپیے منڈپوں کے نیچے سوانگ بھر رہے ہیں۔

این ناٹک منڈلی، جو کاشی سے آئی ہے، نئے نئے تماشے دکھا رہی ہے۔ ان ناٹکوں کا لیکھک پہلی بار پاٹلی پتر آیا ہے لیکن اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ

بہت بڑا گنی اور کلاونت ہے، ایک زمانے میں چتر کار تھا اور مورتیاں بناتا تھا۔ نٹ (رقاص) ہے۔ بہت معرکے کا ناچتا ہے۔ ناٹک (ایکٹر) ہے۔ غضب کی اداکاری کرتا ہے۔ بھرت منی کا سارا فن اس نے گھول کر پی رکھا ہے۔ برسوں برس اس نے ایودھیا کے گنی جنوں اور گندھرپوں کی سنگت میں گزارے ہیں۔ سارے سر اس کے قابو میں ہیں، بڑے بڑے گائیک اس کا لوہا مانتے ہیں۔ پرتب بھی اسے چین نہیں پڑتا۔ سارے دیس میں گھوما گھوما پھرتا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ کسی ایک فن کو اپنی پوری توجہ کا مرکز نہیں بناتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بادل کی چھایا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

اس ناٹک کی بہت دھوم مچی ہے، سارا پاٹلی پتر ناٹک گھر کی اور امنڈا چلا آ رہا ہے۔ خواتین کے رتھوں اور پالکیوں کا تانتا بندھا ہے۔ راج محل کی شہزادیاں، امیروں، وزیروں اور تاجروں کی بیٹیاں، انتظامی ملازمتوں کے افسروں کی بیبیاں، سبھی رنگ برنگی ساریاں، زرنگار پٹکے اور سنہری کردھنیاں پہنے آ آ کر ناٹک گھر کے ایوان میں بیٹھ رہی ہیں۔ بن بیاہی نوجوان لڑکیاں اس اداکار اور لیکھک کو دیکھنے کی بہت مشتاق نظر آتی ہیں۔ انہوں نے سن رکھا ہے کہ وہ بہت خوبصورت آدمی ہے اور خواتین کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ کلا کی اچھائی یا برائی کے مسئلے کو کلاکار کی شکل وصورت سے گڑبڑا دیتی ہیں۔

سفید پردہ ایک طرف کو سرکایا گیا۔ منقش چوبی رنگ بھومی کا عقبی پردہ کلسوں، پٹکوں اور تصویروں سے سجا تھا۔ سازندوں کی روشن چوکی سامنے بیٹھی تھی۔ سنگیت کار لڑکیوں نے پہلو کے ستونوں سے برآمد ہو کر مہادیو کی استوتی کی اور ان میں

سے ایک لڑکی ٹولی سے باہر آ کر کمر پر ہاتھ رکھے ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ یہ لڑکی تمثیل کی نائیکہ تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں موتیا کا گجرا گندھا تھا اور اس کی طلائی کردھنی میں یاقوت جڑے ہوئے تھے۔

پھر پردیپ کی روشنی میں رنگ بھوم کے سفید روغنی تختوں پر وہ نمودار ہوا جس کا اتنی دیر سے سب کو انتظار تھا۔ اس نے کیسری رنگ کے ریشمین کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں کرن بھوشن جگمگا رہے تھے، وہ بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے خلاء میں دیکھتا باوقار انداز سے قدم رکھتا سامنے آیا اور چند لمحے تک سب کی طرف نظر ڈال کر اس نے قاعدے کے مطابق نٹی سے اس ناٹک کے موضوع کے متعلق مکالمہ شروع کیا۔ مجمع اس کی خوبصورت آواز سے مسحور ہمہ تن گوش رہا۔ سب ٹکٹکی باندھے اپنی اپنی جگہ پر ساکت و صامت گردنیں آگے بڑھائے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

مکالمے کے دوران میں کسی بات پر زور ڈالنے کے لیے اس نے پہلے اپنا دایاں اور پھر بایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

تماشائی چونک اٹھے ان کے چہروں پر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خوبصورت اور انوکھے کلاکار کے دونوں ہاتھوں کی کئی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

گوتم نیلمبر کے سامنے ایک اور شہر تھا۔ تماشائیوں کا ایک اور ہجوم جو حسب معمول عقیدت اور محبت سے اسے دیکھ رہے تھے، وہ سب کو تماشے دکھاتا تھا لیکن اس کا تماشا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جس طرح رنگ بھومی کے پردے کے پیچھے ایک

اور رنگ بھومی ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

پاٹلی پتر کے یہ مہذب باوقار شہری، جو ایوان میں بیٹھے اس کے مکالمے پر عش عش کر رہے تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا وہ کیسی کیسی دنیاؤں کی سیاحت پر نکلا ہے۔ اس نے زندگی کے سارے تجربے کر دیکھے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں۔ جن چیزوں سے اس نے بچنا چاہا، جن باتوں کو اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی محض یہ سوچنا چاہا کہ زندگی محض خلاء ہے یا محض روشنی یا محض تاریکی مگر یہاں محض کا وجود نہ تھا، وہ ماسوا کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ دنیا قدم قدم پر اپنے ہر روپ میں اس کے سامنے موجود اس کا منہ چڑا رہی ہے، وہ جنگ کے خلاف تھا اور اس نے اپنی تلوار سے شراوتی کے معرکے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل کیا۔ پانچ انسان۔۔۔ جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے۔ اسی کی طرح بولتے تھے، گیت گاتے، اسی کا ایسا دل و دماغ رکھتے تھے، وہ برہمچاری تھا لیکن برہمچاریہ کے سخت قوانین کو توڑ کر اس نے ایک لڑکی کو دیوانہ وار چاہا۔ اس کی سوچ کو منجمد کرنے کے لیے، اس کے پیکر تراشنے کی خاطر اس نے کلا کی دنیا میں پناہ ڈھونڈی۔ یہ بالآخر اس کی اپنی دنیا تھی۔ خالی الفاظ اور سوکھے فلسفے کے مسائل سے بلند تر۔ یہاں رنگوں اور پتھروں کی سنگت میں وہ زندہ رہا، لیکن جنگ میں لڑتے سے ''دشمن'' کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہو گئیں۔

شراوستی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا تھا اور پھر نیزے کے ایک وار کی تاب نہ لا کر گر پڑا تھا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ رات کی سیاہی آسمان پر سے مدھم ہوتی جا رہی ہے، وہ

زخموں سے چور ہے اور اس کے ہاتھ لہولہان ہیں۔ اس نے لیٹے لیٹے بڑی مشکل سے اپنی ہتھیلیوں کو پھیلایا جو خون میں لت پت تھیں۔

تب اسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ، انگلیاں، جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں، خون میں نہلا دی جاتی ہیں۔ کسی خاموش وِیہار میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ کلاکار کی حیثیت سے انسان کا ہاتھ اس کے لیے بہت بڑی علامت تھی۔ انگلیاں، جو رقص کی مدراؤں کے ذریعے کائنات کے سارے اسرار، ساری زندگی کے معنی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مکان بناتی ہیں۔ باغوں کو سینچتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں۔ تھپک تھپک کر بچے کو سلاتی ہیں۔ آرتی کے لیے نارنجی پھول چنتی ہیں اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ انگلیاں تیر گری کرتی ہیں۔ نیزے ڈھالتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کا اپنی گرفت سے گلا گھونٹتی ہیں۔

تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہو گا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ کرم کے فلسفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اگر یہ فلسفہ میرے پاس نہ ہوتا تو میں سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاتا۔

ذرا سی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور راشوں کو پھلانگتا، گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا۔ جہاں اس کی ماں تھی جو اس کے زخم دھوئے گی، اس کو اپنی گود میں سلائے گی۔

لیکن اس کا مکان سنسان پڑا تھا۔ یہاں وہ بیس سال بعد اس وقت پہنچا تھا جب اس کے ماں اور باپ چند گھنٹے قبل لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔

لڑکھڑاتا ہوا وہ شہر سے باہر آشرم کی سمت روانہ ہوا جہاں ہو کا عالم تھا۔

جھونپڑے خاموش پڑے تھے۔ گرو کی کٹیا خالی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ مہوے کے باغ میں داخل ہوا اور تالاب کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا، اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو ارغوانی کر دیا۔

ایک نوجوان گوالن نے، جو ادھر سے گزر رہی تھی، اسے سسکتا ہوا دیکھا، وہ گھبرا کر دوڑی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس نے پانی سے اس کے گھاؤ صاف کیے، اسے گائے کا تازہ دودھ لا کر کھلایا۔

اور بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اسے بڑے زور سے ہنسی آ گئی۔

گوالن اسے اچنبھے سے دیکھنے لگی۔ کیسا انوکھا سپاہی ہے۔ میدان جنگ سے لڑتا مرتا ہوا آ رہا ہے اور ہنستا ہے۔

اس کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اس وجہ سے اس نے ازراہ مذاق بھی گوالن سے یہ نہ پوچھا کہ تمہارا نام سجاتا ہے یا نند بالا۔

کیونکہ اسے اس سے ہری شنکر کے الفاظ یاد آ چکے تھے۔ ''بھائی گوتم! ہر زمانے میں ہو موڑ پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی کوئی سجاتا اور وہ نزدیک آ کر تمہاری خدمت تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے آنکھیں کھول لو۔'' یہ دوسرا تجربہ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت کی خدمت، اس کی پرستش کو ٹھکرانا خدا کا سب سے بڑا ناشکرا پن ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ گوالن کے کنگنوں کو چھوا، پھر اس کے پلو پر سر رکھ کر سو گیا۔

گوالن اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی جہاں وہ کئی دن۔۔ جب تک اس کے زخم اچھے نہیں ہوئے۔ اس کا مہمان رہا۔ یہ اس کا ہمسایہ گاؤں تھا لیکن اب اجاڑ پڑا

تھا۔گاؤں کے بہت سے باسی مہاراج چندر گپت کی فوج کے خوف سے بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے۔گوالن نے اسے روکنا چاہا لیکن ایک روز وہ چپکے سے اس گاؤں سے نکل گیا۔نندبالا، کہ یہی اس گوالن لڑکی کا نام تھا، بہت روئی لیکن وہ ندی پار کر کے بہت دور پہنچ چکا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک میں امن قائم ہوا۔چندر گپت کی سلطنت مستحکم ہوگئی۔گوتم گھومتا پھرتا کاشی جانکلا، وہ عالم برہمن تھا۔سوائے اپنے علم وفن کے اس کے پاس کوئی اور تجارت نہ تھی، لیکن اسے فکر نہیں تھی۔ودیارتھی برہمچاری کی حیثیت سے اسے ہمیشہ سے بھوکا رہنے اور سختی اٹھانے کی عادت تھی۔اسے یہ ونجاروں کی ایسی زندگی بری نہیں لگی، مگر اب وہ عالموں کی صحبت سے اور ان سے بحث کرنے سے بچتا تھا۔

کاشی میں ایک ناٹک گھر کی نایکا سے اس کی ملاقات ہوئی جو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئی۔اس نے گوتم کو اپنی منڈلی میں شامل کر لیا۔

اپنی کٹی ہوئی انگلیوں سے اب وہ تصویریں نہیں بنا سکتا تھا۔مورتیاں نہیں ڈھال سکتا تھا۔ناچ نہیں سکتا تھا، صرف اداکاری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔طالب عالمی کے زمانے میں اس نے ناٹک لکھے تھے۔فن اداکاری کا مطالعہ اس کی تعلیم کا ایک جزو رہ چکا تھا، وہ فلسفی، عالم، چترکار اب نایک بن گیا۔

نٹ شاستر میں لکھا تھا کہ اداکار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں طویل ہوں۔ہونٹ سرخ، دانت چمکیلے۔اس میں وقار، تمکنت اور غرور ہونا چاہئے۔اسے فن عروض، فن خطابت اور فنون لطیفہ پر دسترس حاصل ہونی چاہئے۔گوتم میں

یہ سارے وصف موجود تھے۔ یہ علم بحرِ ذخار تھا۔ اس کا رتبہ بلند تھا۔ اسے بھی رقص اور موسیقی کی مانند الوہی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا تھا کہ برہما نے اندر کی خواہش پر پانچوں وید کی حیثیت سے ناٹک قائم کیا۔ شیو اس فن میں دیوتاؤں کے استاد بنے۔ پاروتی نے اپسراؤں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ وشواکرمن نے رنگ بھوم تیار کی۔ پر ایک مرتبہ گندھرو اور اپسراؤں نے ایک تمثیل میں ایک رشی کا مذاق اڑایا جس کی بددعا کی وجہ سے ان اداکاروں کو دیولوک چھوڑ کر دنیا میں آنا پڑا، یہاں بھی ان کے درجے میں کمی نہیں آئی۔ اداکار کشی لو کہلاتے تھے کیونکہ رام کے دونوں بیٹے خانہ بدوش مغنیوں کے بھیس میں اپنے باپ کے دربار میں پہنچے تھے۔

سارا عالم بہروپ سے خوش ہوتا ہے۔ گوتم ان روایتوں کے متعلق سوچ کر خیال کرتا۔ بہروپ ایک اور حقیقت ہے۔

ناٹک کا فن بہت ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھا۔ بھرت منی نے اس کے قوانین کی تشکیل کی تھی۔ انہوں نے اڑتالیس قسم کے نائیک اور پونے چار سو اقسام کی نائیکاؤں کی فہرست بنائی تھی۔ انہوں نے ہدایت کاری اور رنگ بھوم کی آرائش اور اداکاروں کے اوصاف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ سکون اور توازن تمثیل کے لیے لازمی تھا، شدید المیے اور قتل و دہشت کے مناظر سے گریز کیا جاتا تھا تاکہ تماشائیوں کے ذہنی سکون میں خلل نہ پڑے۔

فراق تمثیل کا خاص موضوع تھا۔ گوتم نیلمبر نے بھی اس روایت کو قائم رکھا، فراق کے علاوہ اور کون سے موضوع وہ اپنے لیے منتخب کر سکتا تھا؟

ناٹیہ، نرتیہ اور نرت کے سام گیت میں اس نے خود کو سمو دیا۔ ایک روز ناٹک

گھر کی اس نائیکا نے اس سے کہا: ''میں نے سنا ہے تم بہت اچھا ناچتے ہو، مجھے بھی سکھلا دو۔''

''تم کو سکھلا دوں۔۔؟ تم کو ابھی اور سیکھنے کی ضرورت ہے؟'' گوتم نے چڑ کر کہا، ''مجھے تو کچھ نہیں آتا جاتا۔'' اس روز اس پر شدید بدمزاجی اور چڑچڑاہٹ کا دورہ پڑا ہوا تھا، وہ سہم گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: ''پتہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں انہوں نے تم کو خود ناچتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''کون لوگ۔'' وہ پھر گر جا۔

''جانے کون۔ ایودھیا کے کچھ نٹ بتا رہے تھے ایک دفعہ انہوں نے جنگ سے پہلے کسی تہوار میں تمہیں ناچتے دیکھا تھا۔''

ایودھیا کے۔ گوتم کا دل ڈوب سا گیا، وہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ اسے اس لڑکی پر ترس آیا، وہ اس پر کتنی بری طرح فریفتہ تھی۔ بے چاری۔ ''وہ کون لوگ تھے۔'' اس نے پھر کہا۔ ''کیا معلوم۔ ناٹک گھر میں دسیوں طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔'' لڑکی نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اچھا اب میں گھنگرو باندھتی ہوں۔''

وہ اوما تانڈو کرتی رہی، وہ اسے دیکھا کیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گھنگروؤں کی آواز اس کے کان میں پہنچا کی، وہ ایک اور حقیقت سے دوچار ہوا۔ سارے نظام کائنات میں لے ہے۔ آفاق میں لے ہے اور چدمبرم، انسان کا دل، جو کائنات کا مرکز ہے، شو اس میں ناچتا ہے۔ شو کسی تخیلی خدا کا نام نہیں جو پہاڑوں پر رہتا ہو۔ وہ میرے اپنے دل میں موجود ہے، وہ جو تخلیق ہے اور تخریب

بھی ۔ جو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے ۔ جو وجود اور عدم وجود، موت و زیست کا مکمل قانون ہے۔

اور ہر شے میں تال لے اور سر پنہاں ہے۔ تخلیق اور ارتقا اور بقاء اور تخریب میں رقص ہے۔ روح کی تشکیل اور اس کی آزادی میں رقص ہے۔ برہما جس نے تخلیق کی ہے۔ وشنو جو بقا ہے رور جو خاتمہ ہے۔ مہیشور جس نے روحیں تشکیل کی ہیں۔ سدیشور جو انہیں ان کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں جو ذات مطلق ہے، جو ازلی اور ابدی رقاص ہے۔

اس ناچ کے رس اور بھاؤ انسان کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کیفیتوں کے عکاس ہیں اور آفاقی تصورات سے انہیں نسبت دی گئی ہے۔ شرنگار رس وشنو کا ہے، اس میں ان کے اوتار نٹور گردھاری ورندا بن میں اپنی گوپ لیلا رچاتے ہیں۔ ویر رس کڑکتے گرجتے بادلوں کے سنہرے خدا اندر سے منسوب ہے۔ کرونا ترحم کا جذبہ ہے۔ یم سے اس کا رشتہ جوڑا گیا ہے۔ رور غیض کی کیفیت ہے۔ ہاسیا سفید رنگ میں ملبوس مزاح ہے۔ بھیانک رس کا رنگ سیاہ ہے۔ کال سے منسوب بھاسیہ شیو کے مہاکال روپ کی نیلی علامت ہے۔ اوبھت رس میں حیرت ہے۔

ان کیفیتوں کے اظہار کے لیے مکمل قوانین ہیں۔ ان کے لیے کس طرح کی اداکاری کی جائے، کیسے رنگ ہوں، کیسے پس منظر، کون کون راگ۔

میگھ، سری، ہنڈول، توڑی، چھایا، للت، شرنگار رس کے، محبت کے راگ ہیں۔

گوری، سوم اور دیو کرتی ویر رس کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ رام کلی اور آساوری کرونا کے راگ ہیں۔ شنکرا بھرنا ہاسیہ کا نغمہ ہے۔

ادا کار رقاص اپنے سر، اپنی آنکھوں، اپنی بھوؤں، اپنے بازوؤں، اپنے ہاتھوں، اپنی انگلیوں، اپنے پیروں، اپنے پورے جسم، سارے وجود کے ذریعے کائنات و زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں اور انگلیوں اور بازوؤں میں آہنگ قائم کر کے ناچتا ہے۔ آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پینتالیس قسمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار قسمیں اور ہر قسم کی چوبیس علیحدہ علیحدہ شاخیں۔ ان گنت طرح کے لوچ اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہے۔ جس طرح گایتری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جیسے آرتی کے پردیپ میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناچ ہیں۔

کاشی کی خوبصورت پاتر اس کے سامنے ناچا کی۔ اس نے پیروں کی مختلف چالوں کا مظاہرہ کیا: یہ مور کی چال ہے، یہ ہرن کی، یہ ہاتھی کی، گھوڑے، شیر اور مینڈک کی۔ کودنے کے پانچ، قدم رکھنے کے دس، چکر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔ ہاتھوں کی دو سو سینتالیس مدراؤں نے ساری کائنات کو سمیٹ لیا ہے۔ ساری کیفیات، احساسات، خیالات۔ درخت، پھل، پھول، پرند، عہد عتیق کے شہنشاہ۔ انسانی رشتے دیوی دیوتا۔ وشنو کے اوتار، چتر ورن، تاریخی ہستیاں، ساتوں سمندر، مشہور ندیاں، ساتوں طبقات ارضی، ساتوں طبقات سماوی۔ ان سب کا مدراؤں کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ المیہ اور طربیہ اداکاری کے

سارے اتار چڑھاؤ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تال، لے اور گیت کا مکمل آہنگ ہے۔

یہ بھرت ناٹیم ہے۔

شیو کا ناچ، بھرت منی نے جس کے قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے۔

کاشی کی رقاصہ بھرت ناٹیم ناچ رہی ہے جس طرح ایک مرتبہ چمپک ناچی تھی، جس طرح جب تک تال اور لے اور سر قائم ہے بھرت ناٹیم ناچا جائے گا۔

مگر میں نٹ راج کا ایک حقیر بندہ کبھی نہیں ناچ سکوں گا کیونکہ میں اپاہج ہوں۔

اس نے لڑکی کو غصے سے دیکھا جو ناچے جا رہی تھی، وہ خود شنکر نہیں تھا، وہ گوری بھی نہیں تھی۔ تخیل کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ تب اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں۔

لڑکی ناچتے ناچتے اکتا کر اس کے قریب آ بیٹھی اور اداسی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس آدمی کو کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی، مگر کیا آدمی کو سمجھنا ضروری بھی ہے۔۔۔؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کم از کم گزرتے ہوئے وقت کے اس حصے میں میرا ہے۔۔۔؟

تمثیل گھر کی اس حسین لڑکی کا نام امبیکا تھا، یہ بڑی مشہور اداکار تھی۔ بڑے بڑے امیر زادے اور بانکے اس کے نام کی مالا جپتے تھے مگر وہ ریجھی بھی تو کس پر۔۔۔ایک مفلس برہمن طالب علم جس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

تب گوتم ایک اور حقیقت سے آگاہ ہوا، تم جس کو چاہتے ہو تمہاری پروا نہیں

کرتا اور جو تم پر جان دیتا ہے اس میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے ہزاروں کر چکے تھے مگر اس کے لیے نیا تھا۔

امبیکا میں روپ وتی ہونے کے علاوہ وہ ساری خوبیاں اور ہنر موجود تھے جو ایک رقاصہ اور اداکار کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے، وہ سنگیت کار تھی۔ شاعری کرتی تھی۔ پھولوں کو سجانے کا فن جانتی تھی۔ ضلع جگت کی استاد تھی۔ فن باغبانی، تیر اندازی اور منطق کی ماہر تھی۔ اس کی آنکھیں بادام کی ایسی تھیں۔ اس کا رنگ خزاں کے پتوں کی مانند پیلا تھا۔ کستوری کی پنکھڑیوں کا غازہ چہرے پر مل کر، کم کم اور کاجل سے آراستہ ہو، نفیس مینا کاری کے گہنے پہن کے جب وہ تماشا گاہ میں نمودار ہوتی تھی چاروں اور تہلکہ مچ جاتا تھا۔

پر گوتم ان تمام اوصاف کے باوجود اس پر ملتفت نہ ہوا، وہ امبیکا کی منڈلی کے ساتھ سارے میں گھوما۔ موریہ سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ فنون لطیفہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اب گوتم بھی امیر زادوں کے سے ٹھاٹھ سے رہتا۔ شرابیں پیتا۔ نت نئی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا اور پھر فوراً ان سے اکتا جاتا۔ امبیکا، اس کی پجارن، اس کی ان ساری بری عادتوں کے باوجود اس کی پرستش کیے گئی، وہ اس کی محبت کے جواب میں اس سے انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کرتا اور اس کو دکھ پہنچا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کی بدمزاجی، اس کے اکل کھرے پن، اس کے غرور اور اس کی عشرت پسندی کے قصے بھی مشہور ہو چکے تھے۔

یہ سب تھا مگر ایک خیال دل و دماغ پر برابر مسلط تھا، اس کی روح کی گہرائیوں میں تان پورے کے سروں کی طرح گونجتا رہتا تھا۔ چمپک۔۔ چمپک۔۔۔چمپک۔۔۔۔

اس نے چمپک کی تلاش میں دور دراز کی یاترائیں کیں، شاید وہ زندہ ہو۔ مارے جانے سے بچ گئی ہو۔ شاید کسی پرانے مٹھ و بہار میں دکھائی دے جائے، وہ شاکیہ منی کی بھکشنوں کی ٹولیوں کو غور سے دیکھتا، وہ ہر پنگھٹ، ہر بزاز کی دکان، ہر سنگیت منڈلی میں، ہر اس جگہ چمپک کو تلاش کرتا جہاں لڑکیاں جمع ہوتی تھیں مگر وہ کہیں نہ ملی۔

تب اس نے تھک کر اپنی کھوج ختم کر دی اور امبیکا کی محبت کے آگے اپنی ہار مان لی۔ اب وہ صرف امبیکا کے ساتھ ہی رہتا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف توجہ بھی کم کر دی۔ امبیکا کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا سکون آ گیا تھا جو صرف ایک گرہست ہی کو میسر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ امبیکا کو افسوس سے دیکھتا، یہ بے چاری میرے لیے کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اس کے بال سفید ہو جائیں گے، اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑ جائیں گی۔ خوبصورت عورت کی اصل موت اس کا بڑھاپا ہے۔ بیوقوف امبیکا کیوں نہیں ان لوگوں کی طرف دیکھتی جو سچ مچ اس کی قدر کرتے ہیں۔

مگر برس اسی طرح نکلتے گئے۔ گوتم نیلمبر اب اڑتیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے بھنورا ایسے کالے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے، وہ اب بھی اسی طرح ہنستا تھا۔ مشرقی ونگا کی ملائم ململ اور قیمتی ریشم میں ملبوس اپنے منقش رتھ میں

امبیکا کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلتا تھا۔

آج وہ پاٹلی پتر میں موجود تھا اور حسب معمول تمثیل کے دوران میں امبیکا کے ساتھ مکالمہ ادا کر رہا تھا اور تماشائی اسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ تماشائی جو بہروپ کے عاشق ہیں، جو اصل گوتم نیلمبر کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

۱۶

خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خواب پرست لڑکیوں نے حیرت اور دکھ سے اپنے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

انہیں خواتین کی صفوں میں ایک طرف چمپک بیٹھی تھی۔ اس نے نقرئی پھولوں والی اودے رنگ کی ریشمیں ساری پہن رکھی تھی اور اپنی سہیلی سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اسے گوتم نیلمبر نظر آیا، وہ لرز اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند تیرنے لگی اور اس دھندلکے میں گوتم کا چہرہ اس کے سامنے جھلملاتا رہا۔

گوتم نے گرج کر کچھ سناتے ہوئے دیکھا اور تماشائیوں کے اس ہجوم میں اسے وہ دکھلائی دی، وہ چند لمحوں تک اپنا مکالمہ فراموش کر کے وہ مبہوت اسے دیکھتا رہا۔

پھر یکلخت اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

کیونکہ چمپک جو اودی ساری پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی، جو اتنے انتظار، اتنی تلاش کے بعد اسے یوں اچانک نظر آ گئی تھی۔ گوتم نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ اس کی مانگ میں سیندور تھا اور پیروں میں سرخ مہندی اور بچھوے اور اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے تماشا گاہ کے فرش پر سہیلیوں کے ساتھ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اور آن کی آن میں وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا کیونکہ پہلے وہ مقدس تھی اب مقدس تر ہو چکی تھی، وہ ماں تھی اور اب یک بیک اس پر انکشاف ہوا کہ شکنتلا، دمینتی، ساوتری اور سیتا کیسی رہی ہوں گی، کیسی لگتی ہوں گی۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات، حادثے، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں۔

وہ سنبھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہو گیا۔

وہ آپ ہی آپ چپکے چپکے آنسو پیتی رہی۔ ایک شخص نے دنیا تیاگی پھر بھی اس کی یاد دل سے نہ ہٹا سکا، وہ ہری شنکر تھا۔ ایک شخص نے اس کی یاد سے بچنے کے لیے تیاگ کی بجائے دنیا میں پناہ ڈھونڈی اور پھر بھی ویراگی رہا گو ظاہر میں مکمل دنیا دار بنا، وہ گوتم نیلمبر تھا، وہ خود، وہ دکھیاری نہ دنیا تیاگ پائی نہ دنیا میں زندگی کی مسرتوں ہی کو حاصل کر سکی۔ یہ سب مایا کے کھیل تھے۔

اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔ راجن کے قتل کے بعد اسے دوسری شہزادیوں کے ساتھ پکڑ کر پاٹلی پتر لایا گیا۔ ایودھیا کے راج گھرانے کی ساری لڑکیوں سے فاتحین نے

شادیاں رچائیں۔ اس کا بیاہ بھی چانکیہ مہاراج کے ایک افسر سے کر دیا گیا جو پچاس سالہ، موٹا، گنجا اور نہایت چالاک برہمن تھا جو مالیات کے محکمے میں ملازم تھا اور ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔

چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی۔ جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرہ پتنیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی، اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی عام باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔

اس نے احتیاط سے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پتی ورتا عورت ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

کچھ دیر بعد جب تمثیل کا پہلا باب ختم ہوا اور پردہ گرا تو اس نے آہستہ سے اپنی داسی کے کان میں کچھ کہا۔ داسی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی سرعت سے باہر چلی گئی۔

۱۷

پہلے باب کے خاتمے پر گوتم بھی تنگ بھومی کے پیچھے سنگھار کمرے میں گیا جہاں دوسرے اداکار آ کر جمع ہو رہے تھے۔

''ایک داسی تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' امبیکا نے آئینے کے سامنے اپنی مالائیں اتارتے ہوئے مڑ کر اس سے کہا۔

"کون ہے؟" گوتم نے پوچھا۔ اس کی آواز میں سے ساری درشتی، سارا چڑچڑاپن غائب ہو چکا تھا۔ امبیکا اس کی اس اچانک تبدیلی پر ہکا بکا رہ گئی، وہ کس قدر شانت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔

"پتا نہیں۔" امبیکا نے ذرا ہکلا کر جواب دیا، "تم خود دیکھ لو۔" اور پھر وہ اپنے ملبوسات اٹھا کر دوسری رقاصاؤں کی طرف چلی گئی۔

گوتم سنگھار کمرے کی سیڑھیوں پر آیا جو باہر باغ میں اترتی تھیں۔

نیچے ایک سانولی سی خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر گوتم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس نے کہا: "میری رانی نے تم کو پرنام کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا تم جاتے وقت ان سے مل کر نہ جاؤ گے۔"

وہ ایک سیڑھی اتر کر نیچے آیا اور چند لمحوں تک گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا: "نہیں۔ اپنی رانی سے کہو، جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر جاگتے رہتے ہیں۔ ان سے کہنا، اب میں بھی جاگ رہا ہوں اور اب کوئی شے میرے راستے میں نہیں آ سکتی۔ اور ان سے یہ بھی کہنا کہ کیا وہ بھول گئیں کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے مرد سائے کے سمان ہیں۔۔؟ اب تم جا سکتی ہو۔"

وہ چھاجھن بجاتی تمثیل گاہ کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد واپس آ گئی اور اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ وہ اب تک وہیں سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا: "میری رانی کہتی ہیں تمہارا خیال ٹھیک ہے، اگر اب جاگ گئے ہو تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے، انہوں نے کہا ہے کہ تم پتی

ورتا کے معنی کیا جانو، لیکن ٹھیک ہے، کسی شے کو تمہارا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، اب تم بھی جا سکتے ہو۔۔۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ جلدی سے منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر تماشائیوں کے ہجوم میں غائب ہوگئی جو دوسرا باب شروع ہونے کے لیے اندر جا رہے تھے۔

تمثیل ختم ہونے کے بعد گوتم تماشائیوں پر نگاہ ڈالے بغیر رنگ بھوم سے باہر نکلا۔ سنگھار کمرے میں جا کر اس نے اپنے ریشمیں کپڑے اور گہنے اتارے۔ ایک سفید چادر کندھے پر ڈال کر ننگے پاؤں وہ ہجوم کی نظروں سے بچتا تماشا گاہ سے باہر آ گیا اور اس قدر تیز رفتاری سے شہر کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی مجرم قید خانے سے نکل بھاگا ہو اور ڈرتا ہو کہ پہرے دار اسے پھر سے نہ پکڑ لیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرایوں میں تیز روشنی جل رہی تھی۔ طعام خانوں میں سے کھنکھتے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شفاخانوں میں مریض لیٹے موت کا یا تندرستی کا انتظار کر رہے تھے۔ بازاروں میں چاندی اور تانبے کے سکے کھنک رہے تھے۔ سوتی ساریاں پہنے مزدور عورتوں کی ٹولیاں کپڑا بننے کے سرکاری کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہتھیار خانوں میں اسلحہ گھڑے جا رہے تھے۔ دریا کی بندرگاہ پر جہاز بن رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ویشیاؤں کے علاقے میں سے گزرا جہاں ٹھگوں، جواریوں، مداریوں اور نقلی جادوگروں کے اڈوں پر جوا ہو رہا تھا۔ دور سے راج محل کے بلند کنگورے نظر آ رہے تھے۔

اس وقت سمراٹ اپنے دیوان خانے میں لیٹے چانکیہ مہراج کے ساتھ چتر

رنگ (شطرنج) کھیل رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر بھی وہ مسکرایا۔

ایک ویشیا اس کے قریب سے اسے بغور دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ غالبًا یہ بھی دوسری قابل ویش ناریوں کی مانند جاسوسی کے محکمے میں ملازم تھی۔

سوال یہ ہے، چانکیہ مہراج سے کوئی پوچھے، اس نے دل میں کہا، کہ کون کس پر جاسوسی کرے گا؟ وہ پھر مسکرایا۔

اب اندھیرا چھا رہا تھا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے فصیل کے برجوں میں پہرے دار للکار رہے تھے، وہ ایک پھاٹک کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اس شہر پناہ کے چونسٹھ پھاٹک ہیں۔ کونسا پھاٹک میری منزل کے راستے پر کھلتا ہے۔۔؟

پہرے دار نے اسے کوئی غریب باعزت برہمن سمجھ کر خاموشی سے باہر جانے دیا۔ وسیع خندق عبور کر کے وہ شاہراہ پر آ گیا جو پریاگ کی سمت جاتی تھی۔

سون ندی عبور کرنے کے بعد کئی دن تک وہ سرگرم سفر رہا۔ راستے میں اندھیرے جنگل پڑتے تھے اور ندیاں نالے۔ ندیوں کے کنارے سادھو تپسیا میں مصروف تھے۔ ون پرستھ، جو گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے، برسات میں بارش میں شرابور ہوتے، جاڑوں میں بھیگے کپڑے پہنتے تاکہ جسم کی تکلیف زیادہ ہو۔ اسے یاد آیا وہ ابھی ایک بار ببول کے کانٹوں پر سویا تھا، پانی میں ایک ٹانگ سے رات بھر کھڑا رہا تھا۔

ون پرستھ کے بعد سنیاس کا دور آتا ہے جب تارک الدنیا انسان مستقل سفر میں رہتا ہے۔ غالبًا میرا ابھی یہی دور ہے، وہ زمانہ جس میں نہ موت کی تمنا رہتی

ہے نہ زندگی کی، وہ چلا گیا۔ راہ میں شہر تھے، سرکاری کھیت، آشرم، مور پالنے والوں کے گاؤں۔ اس کا ٹھکانہ کدھر ہے؟

لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی، وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی، وہ اس کا ساتھ دے گی۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا:

زمین (رگ وید کی ایک حمد) تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں، میں مغلوب نہیں ہوا، مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں، مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

زمین تیرے اندر کیا کچھ ہے۔ تو جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے انسانوں کو اپنے اوپر لادے ہے، جس نے ہزاروں ندیوں کی صورت میں مجھے دولت عطا کی ہے۔ کون گاؤں، کون جنگل، کون سبھائیں زمین پر ہیں، جہاں ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔ زمین مجھے ٹھکانہ دے۔ مجھے کہیں ٹھکانہ دے۔

اسے چلتے چلتے کئی دن گزر گئے۔ طرح طرح کے پودوں اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک جھک آئیں پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ چھیڑ رہی تھیں۔

کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چنریاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے اس منظر کو دیکھا۔

بڑھتی جاؤ۔۔ بڑھتی جاؤ، او جو کی بالیو۔ تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں

سے محفوظ رہو۔ جو کی الوہی بالیو۔ سمندر کی طرح اتھاہ رہو، وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امٹ (رگ وید کی ایک حمد) رہیں۔

اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ بادلوں میں سے ایک قطرہ ٹپ سے اس کی پلکوں پر آن گرا۔ جس طرح سیپی میں بہار کی بوندیں ٹپک جاتی ہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پھر پگڈنڈی پر آ گیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے، وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ اس نے اندر کو اپنی معیت میں کھڑا پایا۔ رور اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسرت میں ڈوب کر اس نے بادلوں پر نگاہ ڈالی۔ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بوندیں پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ بارش کے قطرے اس کے خوبصورت اداس چہرے پر جھرنے کی طرح گرا کیے۔۔ اس نے آہستہ آہستہ رور کی تقدیس کی:

رتھ بان (رگ وید کی حمد) کی طرح جو اپنے گھوڑوں کو کوڑے لگاتا ہے، وہ بارش کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ آسمان پر بادل امنڈ آئے ہیں اور دور سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہوا تیز ہے اور بجلی چمکتی ہے۔ پودے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آسمان پر دھند چھائی ہے۔ زمین پر بیج گرے ہیں اور زرخیز بارش سب کے لیے برسے گی۔ گرج اور دھاڑ۔ دھاڑ اور گرج۔ بیج بو۔ پانی کے زوردار چھینٹے اڑاتے رتھ میں اڑتا ہوا، برستا ہوا آ، تاکہ جل اور تھل

ایک ہو جائیں۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ پھر صبح ہوئی اور بارش تھمی اور روشنی پھیلی۔ کنجوں میں شنکھ پھونکے جا رہے تھے۔ ندیوں کے کنارے برہمن اوشا کی حمد الاپ رہے تھے۔

روشنی پھیل گئی۔ برہمنوں نے کہا۔

ان گنت آنے والی صبحوں میں سب سے پہلی، گزری ہوئی صبحوں کے راستے پر چلتی ہوئی اوشا زندہ انسانوں کو اٹھا رہی ہے لیکن جو مر چکا ہے اسے وہ نیند سے نہیں جگائے گی۔

تو، جس کے رتھ میں اودے گھوڑے جتے ہیں، پروہت اور شاعر تیری تقدیس کرتا ہے۔۔ برہمنوں نے کہا۔

دولت مند لڑکی، آج کے دن ہم پر اپنا فضل کر۔

بہادر بیٹے اور گائیں اور گھوڑے عطا کرنے والی اوشا، شاعر اپنی حمد وایو (ہوا) سے بلند تر آواز میں ختم کر رہا ہے۔

خداؤں کی ماں، جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔۔ اور ایسا ہو کہ مترا اور ورونا اور سندھو اور زمین اور آسمان ہماری حفاظت کریں۔ برہمنوں نے کہا۔

گوتم ہوا کے نرم جھونکوں کی زد میں چلتا آگے بڑھتا گیا۔

خداؤں کی ماں۔ جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔

برہمنوں کی آواز اس کے پیچھے دریا پر پھیلتی گئی۔۔ وہ مندروں کی قطار کے

سامنے سے گزر کر پھر جنگل کے راستے پر آ گیا۔

سامنے ایودھیا تھا۔

تب وہ بھیگی مٹی پر دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا شکست خوردہ۔ بشاش۔ پر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے اور سامنے ایودھیا کا سنہرا شہر تھا، جو بارش کے دھندلکے میں یوں جگمگا رہا تھا مانو سارا کا سارا سونے کا بنا ہوا اور اس میں سے جگر جگر کرتی تیز کرنیں نکل رہی تھیں۔

پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں یقین تھا اور شان اور غرور۔ اس نے اپنے خدا کو للکار کر مخاطب کیا۔ اس نے کہا:

خداوند۔ ۔تو جو آگ ہے، تو سورج ہے، ہوا، چاند، ستاروں والا آسمان، تو برہما ہے، پانی ہے، پرجاپتی ہے۔

تو عورت ہے، تو مرد ہے، تو نوجوان ہے، تو لڑکی ہے، تو وہ بوڑھا ہے جو اپنی لاٹھی ٹیکتا لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے، تو اپنے چہرے کا رخ ہر سمت کیے پیدا ہوتا ہے۔

تو گہری نیلی مکھی ہے، تو سرخ آنکھوں والا سبز طوطا ہے، تو طوفانی بادل ہے، تو سارے موسم ہے، تو سمندر ہے۔

۔۔ دو پرند، چہیتے دوست، ایک درخت پر بیٹھے ہیں۔ ایک پھل کھا رہا ہے دوسرا اسے ٹکر ٹکر دیکھتا ہے۔ اسی درخت پر انسان بیٹھا ہے۔ اداس، اپنی کم طاقتی پر متحیر، لیکن وہ جو دوسرے کو مطمئن دیکھتا ہے اور اس کی عظمت پہچانتا ہے اس کا اپنا دکھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو رگ وید کی اس امٹ ہستی کو نہیں جانتا جس کے اندر خدا

رہتے ہیں رگ وید کا اسے کیا فائدہ ہوا۔؟ وہ جو اسے جانتے ہیں مطمئن بیٹھے ہیں۔

وہ جو اسے پہچان گیا، جو لطیف سے لطیف تر ہے، جس کے بہت سے روپ ہیں، جو شیو، یعنی سرور ہے۔

اور جب روشنی بلند ہوتی ہے تو نہ دن باقی رہتا ہے نہ رات، نہ وجود، نہ عدم وجود۔ صرف شیو باقی ہے، وہ ابدی روشنی ساوتری کی ہے، جس روشنی سے عقل پیدا ہوئی۔

اس کا حسن دیکھا نہیں جاتا۔ اس کے جلال اور عظمت کی شبیہ نہیں بن سکتی، وہ دل میں موجود ہے۔

تو جو پیدا نہیں ہوا، ان الفاظ کے ساتھ کوئی تھر تھر کانپتا تیرے نزدیک آتا ہے۔ اور رو رمیری حفاظت کر۔

وہ دنیا میں تنہا پرندہ ہے، وہ آفتاب کی مانند ہے۔ جو سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ انسان جو اسے جان جائے موت پر سے گزر جائے گا۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سفر کا نہیں۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا جسم مرتعش تھا، جس طرح تان پورے کے تار جھنجھناتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سرجو بے نیازی سے رواں تھی۔

پھر اسے لگا جیسے اسے کوئی دور سے آواز دے رہا ہے بارش کی وجہ سے دریا کا پاٹ بیحد وسیع ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے سنا لیکن آواز اس کے کانوں تک صاف

نہیں آرہی تھی۔ اس نے بہت غور سے، ماتھے پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نارنجی پوشاک میں ملبوس ایک ہیولے سا ڈول رہا تھا۔

تب اس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی (اس لڑکی نے کیسری ساری پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے) سے پوچھا: ''کچھ جانتی ہو، ندی کے اس پار کون رہتا ہے؟''

''کچھ بھکشو لوگ ہیں۔'' لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ ''وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔''

''تم اسے جانتی ہو؟''

''میں اسے جان کر کیا کروں گی۔۔؟'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھا ذرا میں اس سے مل آؤں۔''

''ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے؟ ۔۔ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔''

''کیا حرج ہے۔۔ ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔''

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے، پپیہے چلاتے تھے بھنورے گونج رہے تھے۔ بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں پر آن گرے۔ اس نے جھک کر انہیں اٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی میں کود گیا اور دوسرے کنارے کی طرف پیرنے لگا۔

دوسرے کنارے پر ایک ادھیڑ عمر کا بھکشو، نارنجی پوشاک میں ملبوس، دیر سے

اس کی راہ تک رہا تھا۔ گوتم کو اپنی اور آتے دیکھ کر اس کا چہرہ انبساط سے جگمگا اٹھا۔

وہ ندی آدھی سے زیادہ عبور کر چکا تھا تب اس نے بھکشو کی آواز سنی:

''بھائی گوتم۔''

''ہاں بھائی ہری شنکر۔۔۔ پہنچتا ہوں۔۔۔ ٹھہرے رہو۔۔'' اس نے زیادہ تیزی سے پیرنا شروع کر دیا۔

اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھپیڑے سے وہ کنارے کے بہت قریب پہنچ گیا مگر اب پانی کی لہریں اونچی ہو چکی تھیں۔ اس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی ایک کنگر کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ چاروں اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لمحے کے لیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر، جس کا ماضی سے تعلق ہے، آنے والے زمانوں میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔

سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا

اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوئی۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دور جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھونگھٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھل پھول چڑھا کر آگے چلی جاتیں۔ اس نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں اور پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پتھروں کے نیچے، جہاں لہروں کا بھنور ایسا بنا تھا، اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لمحے کے لیے وہ متعجب سا ہو گیا، وہ یہاں آ کر کیا کر رہا ہے؟

چمپا اب تک نہ آئی تھی۔ اس نے دوبارہ ندی کی طرف دیکھا۔ شاید کشتی میں آتی ہو، مگر کشتی میں چند دیہاتی بھجن گاتے اپنی دھن میں مگن ایک سمت کو چلے جا رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑی پر پھیلی ہوئی امر بیل کا ایک پتا توڑا۔ کدم کی ٹہنی پھولوں سے لدی تھی۔ چند پھول ٹپ ٹپ اس کے سر پر آ گرے۔ اس نے پگڑی اتار کر ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی تلوار کے منقش قبضے کو چھوا۔ پھولوں کے اس ہجوم میں تلوار اسے بہت بے تکی معلوم ہوئی۔ اس نے آہستہ آہستہ تلوار کمر سے علیحدہ کر کے گھاس پر رکھ دی۔

تب پانی میں پیرتی ہوئی چمپا گھاٹ پر آ گئی۔

''ہم تو سمجھے تھے تم کہیں اور مارنے مرنے کے لیے چل دیے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو نہیں۔ پر اب شاید چلا جاؤں۔ کچھ عرصے بعد۔''

''کہاں۔'' لڑکی نے گھبرا کر پوچھا۔

''بہار۔۔اوراس سے بھی آگے، بنگال۔۔''

''وہاں جا کر کیا کروگے۔یہیں رہو۔''

''وہاں میرے بھائی بند ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو۔تمہارے بھائی بند کہیں پہاڑوں میں لوٹ مار مچاتے ہوں گے۔گوڑ کے دربار میں ان کا کیا کام۔''

''تم میرے بھائی بندوں سے بہت خفا ہواور دوسری بات یہ کہ وہ لوٹ مار نہیں مچاتے۔یہ ترکوں اورافغانوں کا مشغلہ ہے۔میں عرب ہوں۔میرا کام فلسفہ دانی ہےاور۔''اس نے ذرا رک کر کہا،''میری ماں ایرانی تھی اور ایران والے،او بیوقوف لڑکی شعر کے پرستار ہیں،خون نہیں بہاتے۔''

وہ اسی طرح ہنستی رہی۔اب وہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔

''ہنستی رہو۔ایک روز زبردستی اڑا کر لے جاؤں گا۔پھر بعد میں جو چاہنا کہنا۔''

''ہے ہے۔ایسا اندھیر نہ کرنا۔شکر کرو یہ گاؤں ہے جہاں تم سے بات کر لیتے ہیں تو کوئی برانہیں مانتا۔جونپور میں اگراس طرح تم گھنٹوں ہم سے باتیں کرتے تو دیکھتے اپنا حشر۔''

''جونپور میں تو میں تم کو قطعی بھگا لے جاتا۔لے جا کر سیدھا اپنی حویلی میں بند کر دیتا۔''

''رام رام۔کیسی باتیں کرتے ہو۔جونپور میں ہمارا ایسا مہاتما سمان بادشاہ

رہتا ہے، مجال ہے جو تم ایسی حرکت کرتے۔''

''اجی دیکھے ہیں تمہارے مہاتما سان بادشاہ۔''

''کیوں۔ ایسے ایسے گیت بناتا ہے۔ جو انسان اتنا بڑا سنگیت کار ہو وہ دیوتا نہیں تو اور کیا ہوگا۔ ایک روز بھین نے مجھے ایک بڑا پیارا گیت حسینی کانڑا میں سنایا تھا۔ بھین کہتے تھے کہ یہ سلطان کی سنگیت ہے۔ اسے خیال کہتے ہیں۔''

''اب تم موسیقی پر تقریر کرو۔ اور کل تم اپنے برآمدے میں بیٹھی کس کو حسینی کانڑا سنا رہی تھیں؟ تم کتنے آدمیوں سے ملتی ہو۔؟''

''تم کو اس سے مطلب۔ کمل جی تم اپنا رعب مجھ پر مت جھاڑو۔ صوبیدار ہو گے اپنی فوج کے ہوگے مجھ پر کاہے کی دھونس ہے۔''

میں صوبیدار نہیں ہوں۔ لاحول ولاقوۃ۔۔۔ ویسے سپاہی کا پیشہ ہی مرد کو سجتا ہے۔''

''قاتل کا پیشہ۔۔''

''پھر تم نے کمینی باتیں شروع کیں۔''

''اچھا اب نہیں کہنے کے، مگر ہو تم قاتل ضرور۔۔۔ جانے کتنی ماؤں کے بیٹوں کو اس تلوار سے مارا ہوگا۔۔ ہائے ہائے۔''

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں فوجی نہیں ہوں۔ سلطان کے کتب خانے کا نگران ہوں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے۔''

''اس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، پستکیں، جنہیں سمجھ دار لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ

جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں تمہارا بھائی صبح سے شام تک چوکی پر بیٹھا بائیں سے دائیں طرف کھینچا کرتا ہے ان کی کتابیں بنتی ہیں۔ سمجھیں۔''

''جانتی ہوں، مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔''

''چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی! ایک مرا یار ہے اودلے سنگھ راٹھور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا۔'' کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ ''تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔''

''ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے، تم کویتا لکھتے ہو۔''

وہ جھنجھلا گیا: ''تم عورتوں سے بحث کون کرے۔'' اس نے امر بیل کا ایک پتا اور توڑا۔

''دیکھو'' لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، ''جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔''

وہم۔۔وہ کیا چیز ہے؟''

''تم کو سمجھانا بیکار ہے۔''وہ پھر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

کمال الدین نے درختوں کے سائے کی اور دیکھا جو ڈھلتے جا رہے تھے۔

''اچھا چمپاوتی تم کو خدا کے حوالے کیا۔''وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

''ایودھیا سے تم ابھی چلے جاؤ گے؟''

قریب سے درویشوں کی ایک ٹولی گزری، ان میں سے ایک نوجوان نے چمپا اور کمال کو دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں اور سر جھکائے آگے چلا گیا۔

''یہ بھی کیا مسخرے لوگ ہیں۔''کمال نے اظہار خیال کیا۔

''مسخرے نہیں ہیں۔ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان کا مذاق مت اڑانا۔''چمپا نے یکلخت غصے سے کہا۔''ایک روز یہی تمہارا ساتھ دیں گے۔''

''تمہارے بھائی نے تمہیں اچھی خاصی پنڈتائن بنا رکھا ہے۔ میں کسی روز اس سے مناظرہ کروں گا۔''

''وہ کیا ہوتا ہے۔''

''اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔۔''کمال الدین نے جاتے جاتے مڑ کر رکاب میں سے پیر نکال کر اسے سمجھانا شروع کیا،''کہ جیسے دو مذہب ہیں نا۔۔ ایک تمہارا۔۔ ایک میرا۔۔''

''میرا اور تمہارا کوئی الگ الگ مذہب ہے۔۔؟ میں تو ایک ہی سمجھتی ہوں۔''

''پھر تم نے خرقہ پوشوں والی باتیں شروع کر دیں۔۔ تو مطلب یہ۔۔''اس نے پھر سمجھانا شروع کیا۔۔''کہ دو فریق اپنے اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کریں، اسے مناظرہ کہتے ہیں۔''

''سچائی ثابت کرنے والے ہم اور تم کون۔۔وہ تو ستیہ پیر ہے جو سب جھوٹ سچ کا فیصلہ کرتا ہے۔کہے کبیرا ک رام جپیوری۔ہندو ترک نہ کوئی۔''

''پھر تم نے تقریر شروع کی۔تم کاشی جا کر اپنے کبیر کی چیلی کیوں نہیں بن جاتیں۔مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔''

''کاشی تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے مگر اس سے پہلے تم کو اپنی تلوار اتارنا پڑے گی۔''

''یہی شرط ہے؟''

''بالکل یہی شرط ہے!''

''تم کو تو جونپور کا قاضی ہونا چاہیے تھا۔۔اچھا خدا حافظ۔۔''

وہ دریا کی طرف بڑھا۔''اس پار وہ ٹوٹے پتھروں کا اونچا ڈھیر ایسا کیا ہے؟''

''وہ۔۔ارے وہ تو بہت پرانے مندر کے کھنڈر ہیں۔سینکڑوں ہزاروں برس پرانے۔۔''

''اور اس کے ادھر وہ جھونپڑیاں ایسی ہیں، ان میں کون رہتا ہے۔''

''ان میں بھی صوفی لوگ رہتے ہیں۔۔۔بھگت۔۔۔''

''تب تو تمہارا وقت بہت اچھا کٹتا ہوگا۔۔صوفیوں کی سنگت۔۔مسئلے مسائل ،ذکراذکار۔۔ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے کس قدر دلچسپ مشغلے ہیں۔''

''اور کیا کریں۔۔تمہارے جونپور کی شہزادیوں کی طرح محل سرا میں بیٹھ کر شطرنج کھیلا کریں۔''

''بالکل۔۔لیکن میری محل سرا میں شطرنج کے علاوہ کتابیں بھی ہیں۔

سینکڑوں۔۔اور تم اس قدر عالم فاضل پہلے ہی سے ہو۔ میں تم کو عربی فارسی بھی پڑھا دوں گا۔'' وہ دفعتاً جھینپ کر سرخ ہوگئی۔ کمال نے اسے تبسم کے ساتھ غور سے دیکھا۔ ''مگر تم عربی بولتی عجیب مسخری لگو گی۔۔نہیں بھائی۔ تم چمپا وتی ہی رہو۔ تمہارے روپ میں میں نے عورت کا حسین ترین روپ دیکھا ہے۔۔اچھا خدا حافظ۔۔'' وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے: ''تمہارا پڑاؤ یہاں ختم ہوا۔۔اب کہاں جاتے ہو؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''بہرائچ۔۔وہاں جانے کتنے دن لگ جائیں۔''

''بارشیں شروع ہونے والی ہیں، اپنا خیال رکھنا۔''

''ہاں۔ میں اپنا خیال رکھوں گا۔ خدا حافظ و ناصر بیوقوف لڑکی!''

وہ اسے بیوقوف لڑکی کہا کرتا تھا اور اس خطاب میں کتنا اتھاہ پیار چھپا تھا۔ وہ آنسو پی کر مسکرائی۔ کمال الدین نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور سڑک پر پہنچ کر غبار میں غائب ہوگیا۔

لڑکی گھاٹ پر سے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوگئی جس کی کھپریل پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اور جس کے سبز رنگ کے کواڑوں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگ برنگی تصویریں منقش تھیں۔ برآمدے میں اس کا بڑا بھائی چٹائی پر بیٹھا کبیر کی نئی بانی کاغذ پر نقل کر رہا تھا۔ اس کے قریب دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔ دروازے طاق پر بھوانی کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی جس کے سامنے رکھی ہوئی دھوپ کی پتلی سی لکیر لہرائی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ چمپا نے دروازے کے

قریب کھڑے ہو کر اس پرسکون منظر کو دیکھا اور اپنے آنسوؤں کو خشک کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

۱۸

بہرائچ کی چھوٹی سی آبادی میں پیلے رنگ کے کچے مکان ادھر ادھر بکھرے تھے۔ خاک آلود راستوں پر سے بیل گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اداسی کی بے رنگ، بے نام کیفیت سارے میں طاری تھی۔ سنا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بے حد عظیم الشان شہر آباد تھا جسے شراوستی کہتے تھے۔ اس کے سوم ونشی بادشاہ بڑے جاہ وجلال والے تھے اور نجومیوں نے شراوستی کے سوہل دیو سے کہا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب اتر سے دیوزاد بلند وبالا ترک آ کر تمہارا خاتمہ کر دیں گے اور غزنی کے محمود کا ایک سپہ سالار ادھر آیا جس کا نام مسعود غازی تھا اور اس مسعود غازی نے سوہل دیو کا خاتمہ کر دیا اور دلی میں قطب الدین ایبک آیا اور اس کے سپہ سالار احمد بختیار نے کوشل دیس اور مگدھ اور بنگال کے سارے بت پرست بادشاہوں کا خاتمہ کر دیا۔

اور شراوستی اور نالندہ اور وکرم شالا کے سارے برہمچاری اور بھکشو اپنے اپنے پوتھی پترے وہیں چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے یا مر کھپ گئے یا نیپال اور تبت کی اور نکل گئے۔

لیکن جس طرح شاکیہ منی پچھلے دو ہزار سال میں وشنو کے اوتار بنا دیے گئے

تھے اور مہایان بدھ مت کے مندروں میں ہزاروں دیوی دیوتا آباد ہو چکے تھے اور سارا بنگالہ اور سارا بہار تانترک منتروں اور دیبی تارا کے بھجنوں کی سریلی آوازوں سے گونج رہا تھا اسی طرح بت شکن سالار مسعود غازی پچھلی دو صدیوں میں بالے میاں کے روپ میں کوشل دیس کے سنواسیوں کے لیے ایک اور دیوتا بن چکے تھے۔ ان کے مزار پر گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ ان کے جھنڈے اٹھائے جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی بارات نکلتی۔

یہ کیسی عجیب باتیں تھیں۔

ابوالمنصور کمال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آرہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گونالندہ اور وکرم شیلا اور اجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوتی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب وغریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب وغریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الہیات۔

مگر کچھ لوگوں کو پیدائشی سنک ہوتی ہے اور کشمیر کے زین العابدین اور گوڑ کے علاؤالدین حسین شاہ کی طرح جونپور کا حسین شرقی بھی انہی سنکی لوگوں میں سے تھا۔ ان بادشاہوں نے مزید بت شکنی کے بجائے ان پوتھی پتروں میں دلچسپی لینا

شروع کر دی۔

حسین شرقی کو جب بھی دلی کے سلطان بہلول اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی وہ اپنا طنبورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راگوں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرتا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ پچھلے دنوں اسے ایودھیا کے چند پنڈتوں سے معلوم ہوا تھا کہ بہرائچ کے کسی مٹھ میں ڈیڑھ پونے دو ہزار سال پرانے سنسکرت کے کچھ تانب پتر موجود ہیں۔ اس نے اپنے کتب خانے کے جواں سال نگران ابوالمنصور کمال الدین کو ان پنڈتوں سے ملنے کے لیے ایودھیا بھیجا۔

کمال الدین ایودھیا چند دنوں کے لیے گیا تھا لیکن اس کا وہاں اتنا جی لگ گیا کہ اسے تقریباً یاد ہی نہ رہا تھا کہ اسے وہاں سے آگے ترائی کی طرف بھی سفر کرنا ہے کیونکہ ایودھیا میں اسے انہی پنڈتوں میں سے ایک کی بہن نظر آئی جو چمپاوتی کہلاتی تھی۔

اپنے دقیانوسی فلسفوں کو چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق، جن کی تلاش میں کمال ان کے پاس گیا تھا، سرجو کے کنارے رہنے والے یہ پنڈت لوگ ایک نئے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اس چکر کا نام انہوں نے بھگتی رکھ چھوڑا تھا، وہ لوگ دن رات نرگن رام، نرگن رام جپورے بھائی کی رٹ لگایا کرتے۔ ان ہی کے یہاں کمال الدین شنکر اچاریہ اور و لبھ اور را ماند کے ناموں سے آشنا ہوا اور اب وہ سب کے سب کاشی کے بھگت کبیر کے پیچھے دیوانے ہوئے جارہے تھے لیکن کمال کو بھگت کبیر یا کسی اور بھگت یا سنت یا اچاریہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ

اپنے آپ کو فلسفی نہیں سمجھتا تھا، وہ مورخ بننا چاہتا تھا۔ اسے دنیا کی قوموں کی تاریخ بڑی عجیب لگتی۔ سلطان نے اسے مختلف مبہم قسم کی تاریخیں لکھنے پر مامور کر رکھا تھا اور اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ لیکن اب سلطان کا حکم تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے سنسکرت اور پالی اور پراکرت اور اردھ مگدھی میں لکھی ہوئی ان بے تکی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ یہ کام بھی زیادہ غیر دلچسپ نہ تھا گو وہ جلد از جلد جونپور واپس پہنچنا چاہتا تھا جہاں شاہی محل میں سلطان کی بھانجی رہتی تھی جس کے لیے اس نے بہت سی نظمیں لکھی تھیں اور جس کے تصور میں اس نے بہت سی چاندنی راتیں کتب خانے کی برجیوں میں بیٹھ کر جاگتے ہوئے گزار دی تھیں۔

لیکن ایودھیا میں اسے ایک برہمن زادی ملی جو اس سے ہر وقت کبیر کی باتیں کیا کرتی، اس سے الٹی سیدھی بحثیں کرتی اور کچھ عرصے کے لیے وہ جونپور کی شہزادی کو بھول گیا۔

اب وہ چمپاوتی ہی کے خیال میں کھویا رہتا کیونکہ وہ بڑی انوکھی، بڑی نئی سی چیز تھی۔ ناجیہ اور رام رباب اور شہزادی سلیمہ بانو بیگم سے بالکل مختلف۔

مرد ہمیشہ تنوع پسند کرتا ہے۔

پرانی کتابوں کی جستجو میں وہ سارے مٹھوں میں گیا جو پانچ چھ سو سال قبل یہاں شنکر اچاریہ کے چیلوں نے قائم کیے تھے۔ شراوتی کے کھنڈروں میں گھوما جو بہرائچ کی بستی سہت مہت کے علاقے میں پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور جہاں دن میں الو بولتے تھے اور رات میں چمگادڑیں اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ ایک روز اسے انہی کھنڈروں میں پتھروں اور شہتیروں کا ایک بہت بڑا انبار نظر آیا جس

کے چاروں طرف گلیاں تھیں۔ یہاں کبھی شاندار بازار رہا ہوگا اور اونچی اونچی حویلیاں بنی ہوں گی، وہ حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس عمارت کے اندر گیا۔ اس کے سارے کمروں میں گھوما۔ گودام، نشست کے ایوان، جن کی دیواروں میں آتش دان تھے، کوٹھڑیاں، غسل خانے، آبگنوں میں بنے ہوئے کنویں اور تالاب۔ مکان کے شمالی مشرقی حصے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جنوبی مشرقی کونے میں باورچی خانہ تھا۔ پندرہ سولہ کمرے سارے میں پھیلے تھے۔ چاروں طرف برآمدے تھے۔ اوپر کی منزل میں جھروکے تھے۔ وسط میں آنگن کے گرداگرد جو برآمدی تھا اس کے ستون ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے تھے۔ ان ستونوں کے اختتام پر ہاتھی کے سر تراشے ہوئے تھے۔ یہ جانے کس کا مکان رہا ہوگا، کمال نے سوچا۔ پھر اس نے ایک دیہاتی کو آواز دی جو گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے سامنے کی شکستہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ دیہاتی رک گیا اور اسے پراسرار، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کمال کو ایک پھریری سی آئی۔ اس نے ہمت کر کے حلق صاف کیا اور بولا: ''اے بھائی۔۔ جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟ یہاں کے راجا کا تو نہیں۔۔''

''راجا کا۔۔'' دیہاتی کھلکھلا کر ہنسا گویا بہت بڑا لطیفہ اس نے سنا ہے۔ ''ارے راجا کا مکنوا اتنا چھوٹا۔۔؟ راجا کے محلوا پر تو ہل چل گئیں۔ ای تو ہجارن برس پرانی حویلی ہوئے۔ پرکھن سے سنے ہن ای ما کوؤ باہمن پروہت رہت رہے۔ ان کا لڑکوا ہو بڑا او دوان رہا۔''

''اس لڑکے کا نام جانتے ہو۔۔؟''

''ہم کا جانی۔۔ ہم نیچ نام ناہیں یاد رکھت ہن۔ نام مٹ جات ہیں۔ کھالی

کھدائے کا نام امر ہو۔۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ اپنا گٹھا سنبھال کر آگے بڑھ گیا۔

کمال کو بڑی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ سلطان کا فرمان ہے اس ملک کی تاریخ لکھو۔ ایسے ابدیت پرست لوگوں کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے جو اپنے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے!

پھر اس نے مٹھ میں جا کر ایک پنڈت سے پوچھا: ’’کھنڈروں میں سے جو سب سے بڑا کھنڈر ہے وہ کس کا ہے۔‘‘

اس نے بھی کمال کو بڑی پر اسرار نظروں سے دیکھا گویا یہ غیر ملکی عالم کیسا فضول سوال کر رہا ہے۔ ’’یہاں ان گنت چکرورتی راجہ ہو کر گزر گئے ہیں۔ چندر گپت موریہ، اشوک پریہ درشن، سمدر گپت۔ چندر گپت موریہ سے قبل یہاں بڑے بڑے چتر کار رہتے تھے اور سنگتراش اور لیکھک لیکن ان کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں انسان زندہ رہتا ہے۔‘‘

’’لاحول ولا قوۃ۔‘‘ کمال نے دل میں کہا۔ تاریخ لکھنا ناممکن ہے، ان تانب پتروں کے مصنفوں کا نام بھی موجود نہیں تھا جن کا ترجمہ کروانے کے لیے وہ یہاں آیا تھا، وہ گھوم پھر کر اسی کھنڈر میں واپس آ گیا اور ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

یکلخت اسے بغداد اور نیشاپور کی یاد نے بے طرح ستانا شروع کر دیا۔

کمال اس ملک میں تازہ وارد تھا، اسے جونپور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے۔ بائیس سال کی عمر تک اس نے بغداد کے مدرسے میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بہت سے نظریوں پر غور وفکر کیا تھا، وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخر الدین رازی اور اندلس کے ابن رشد اور ابن العربی کا مفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گرو سمجھتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے۔ ابن خلدون کے مکتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا جب قاہرہ میں اسے اطلاع ملی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشاپور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ اہل سیف کے ساتھ ساتھ اہل علم بھی اب ایک نئے ملک کا رخ کر رہے ہیں جس کا نام ہند ہے۔ کمال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسط ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تغلق آباد پہنچا۔

دنیا عجیب ہنگاموں کے دور سے گزر رہی تھی بلکہ کمال کو تو یاد تھا کہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بے چارے انسان پہ کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پچھلی صدیوں میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تہ و بالا کر دیا۔ عیسائی سطوریوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندلس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جل کر علم کا جو دھوم دھام سے چراغاں منایا تھا وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی زرد آندھیوں نے سارا کا سارا بجھا کر رکھ دیا۔ بنو امیہ کا دمشق، بنو عباس کا بغداد، عبدالرحمٰن کا اشبیلیہ۔ آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھنچتی تھیں۔ اس

قیامت کے بعد بچا کھچا علم جو باقی رہا تھا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا ایتھنز، جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا، بغداد کے ساتھ ساتھ اجڑا۔ اسکندریہ کی خانقاہیں سنسان ہوئیں، صرف ایک خیال باقی رہا۔ دنیا ناپائدار ہے، دنیا فانی ہے، دنیا قابل نفرت ہے۔ فلسفہ اب محض شیعوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا اور شیعہ ہمیشہ بڑی گڑبڑ پھیلاتے تھے، ہر قسم کی نظریاتی اور سیاسی فتنہ پردازی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اب سلجوقی ترکوں کا دور دورہ تھا۔ ان جہانبانوں کو نت نئے ملک تسخیر کرنے سے ہی کہاں فرصت تھی کہ وہ فلسفے کی ریشہ دوانیوں میں اپنا سر کھپاتے اور بہر حال وہ بھی راسخ العقیدہ کٹرسنی مسلمان تھے، عجمی شیعوں کی طرح بدعتی تھوڑا ہی تھے۔

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنون لطیفہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تخریب پسند تاتاری مغرب میں مسلمان ہوئے مشرق میں انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سبکتگین کے دور میں کابل کے ہندو ترکی شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق البیرونی نے کہا کہ ہندو اس حملے سے ریت کے ذروں کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستان پارینہ میں شامل ہو چکی ہے، جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندریہ تباہ ہوا تھا اسی طرح متھرا اجڑا اور نالندہ، قنوج

اور اجین۔ یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنھوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹمٹماتے رہے، کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا!

اور اسی خونریز دور میں جنوب کے پرسکون ساحلوں پر خوبصورت کلیسا تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور مہابلی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔

یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔

انتشار اور بدامنی کے اس دور میں صوفیوں کی خانقاہوں میں علم محفوظ رہا اور خرقہ پوش قلندر اب ایک ایک کر کے اس نئے ملک کی طرف آ چکے تھے اور آ رہے تھے جسے محمود نے تسخیر کیا تھا۔ ان قلندروں نے بنگال، بہار، اودھ، راجستھان، دکن اور گجرات، سندھ اور پنجاب میں نئے وہیار آباد کیے۔

محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے۔ دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ قرطبہ کی مسجد میں عیسیٰ ابن مریم کے مجسمے سجا دیے گئے تھے۔ قسطنطنیہ کے کلیسائے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تموچن کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک، دلی کو تہس نہس کر کے سمرقند واپس

جا چکا تھا۔

شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ جونپور شیراز ہند کہلا رہا تھا۔ اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی فقط ستر سال گزرے تھے۔ صاحبقراں کے حملے کے بعد کی گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک الشرق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کی بادشاہتوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی، انہوں نے خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں، گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہل علم آ کر جونپور میں جمع ہو رہے تھے۔

ابوالمنصور کمال الدین نے بھی دلی میں چند روز ٹھہرنے کے بعد جونپور آ کر دم لیا۔

اس کے سامنے ایک بالکل نئی عجیب وغریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جونپور، کاشی، ایودھیا اور بہرائچ اور ان سب جگہوں کے مسلمان ان سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ جو بت پرستوں کے طریقے سے رہتے سہتے تھے۔ پشمین پوشوں اور جوگیوں کے ساتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گیت گاتے اور جھومتے تھے۔ ان کی عورتیں عبائیں پہننے کے بجائے عجیب طویل سی سفید یا رنگین چادر جسم سے لپیٹ لیتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں بڑی حیا تھی۔

پچھلے چند سال سے اس کی زندگی سلطان حسین شاہ کے ساتھ یا میدان جنگ میں کٹتی تھی یا محفل چنگ ورباب میں۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں لیکن حال و قال سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے امام غزالی اور ابن رشد دونوں کو اپنے

اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور مسلسل خانہ جنگیوں، بغاوتوں، سیاسی شورشوں اور بدامنیوں کے باوجود، کہ یہ ہنگامے زندگی کا لازمی جزو تھے، وہ نا امید نہیں تھا، وہ ہر شے کو استعجاب سے دیکھتا۔ وہ بہت سے ملک گھوم چکا تھا۔ ہند میں آ کر بھی اس نے اپنے سیاہ گھوڑے پر بڑی دور دور تک سیاحت کی تھی۔ ناموں میں، جگہوں میں، انسانوں میں جو اسرار تھا اس نے اس کو بہت مسحور رکھا۔ شیراز اور بدخشاں کے لالہ زار، کاشغر، یارقند اور بخارا کی گلیاں جن کی دیواروں پر چینی گلابوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور جہاں ترچھی آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی لڑکیاں رقص کرتی تھیں اور دریائے جیحوں کا ساحل اور سنہرے بالوں والے ترکمانوں کی خیمہ گاہیں۔ شمال مغرب کے کوہستان جہاں یونانیوں، سیتانیوں، ترکوں، چینیوں اور ایرانیوں نے مل جل کر سنگتراشی کی ایک نئی دنیا آباد کی تھی اور پھر ہند کے جنوب میں مہاندی کے سرسبز کنارے اور آندھرا دیس، اور کیرالا، تامل ناڈو اور کورومنڈل کی ہری گھاٹیاں اور سلطنت وجے نگر کے خوبصورت باغات اور لرزہ خیز مندر جن کے آنگنوں میں تاڑ کے درختوں کے نیچے بادامی آنکھوں والی دیوداسیاں ہیرے کی لونگیں پہنے بھرت ناٹیم ناچتی تھیں۔

خداوندا! کیسے کیسے لوگ تھے، کیسی کیسی قومیں! دنیا کتنی عجیب، کتنی دلکش، کتنی خوفناک، کتنی قابل قدر چیز تھی۔

ہند کتنا حسین ملک تھا۔

لیکن یہ بہر حال اس کا وطن نہیں تھا۔

اور گو اس کے بہت سے حصوں پر مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں لیکن بہر حال

یہ مجموعی طور پر دارالحرب تھا کیونکہ کافروں کی یہ بڑی زبردست آماجگاہ تھی۔

اور اگر یہ دارالحرب نہ بھی ہوتا تب بھی اس کا وطن نہیں تھا۔ یہ سامنے لہریں مارتی ہوئی سرجو بھلا دجلے کا کیا مقابلہ کرسکتی تھی۔ آم کے سائے میں وہ سکون میسر نہیں جو کسی نخلستان میں چشمے کے کنارے کھجور کے تلے بیٹھ کر الفارابی کے نظریات پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔

گو آم بھی اپنی جگہ پر خوب درخت ہے۔

غریب الوطنی کے احساس نے اسے بہت رنجیدہ کیا، اس نے کھنڈر کے ستون سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں یہاں سے آخر واپس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے طے کیا کہ وہ جونپور واپس جا کر سلطان سے معذرت چاہے گا اور دمشق لوٹ جائے گا۔ دمشق؟ اسے یکلخت یہ نام بھی بے حد اجنبی سا لگا، وہ دمشق جا کر کیا کرے گا؟ نیشاپور میں اس کا کیا رکھا ہے؟ بغداد کو اس سے اب کیا واسطہ؟ یہ سوچ کر بھی اسے بڑا دکھ ہوا۔

اور اس قدر بے تکے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر اس کسان کو دیکھا جو انگوچھا سر پر لپیٹے زور زور سے بارہ ماسا الاپتا بستی کی اور لپکا جا رہا تھا۔

وہ جس کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کلدانیوں اور قبطیوں اور اسوریہ والوں کی روایات اور یونان تھا اور روم، اور مقدس سلطنت روم کی مشرقی مملکت جسے ورثے میں ملی تھی، اور عجم کے گلستان، اور نیل کے ساحل اور مغرب کے لامحدود پہاڑی سلسلے، وہ ایک بالکل مختلف کائنات تھی اور اس کائنات سے اس

کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں سنا تھا کہ جوگی ہوا میں اڑتے تھے اور جہاں کامروپ کی ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں اور جہاں بنگال اور بہار کے تانترک معبدوں میں لرزہ خیز جادو ٹونے ہوتے تھے اور جہاں گورکھ ناتھ کے چیلوں کے گورکھ دھندے عقل کو چکرا دیتے تھے۔

لیکن ابو ریحان البیرونی نے اس ملک کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ کمال نے پڑھ رکھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ غزنی اور ہرات میں یہاں کی دولت کے متعلق کیسی کیسی حکایات مشہور تھیں اور کتنی عجیب بات تھی کہ فلک کی گردش نے اسے واقعی اس بے تکے ملک میں لا ڈالا تھا جہاں یہ سارے روایتی ہیرے جواہرات وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں کی جگمگاہٹ کا نظارہ کیا تھا۔ اس نے اس دیس کی حسین مہ جبین عورتوں کو دیکھا تھا جو چلتی تھیں تو ان کے پاؤں کے زیور چھن چھن بولتے تھے۔ اس نے یہاں کی عجیب مدہوش کن موسیقی سنی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں نے یہاں سے لوٹ کر بغداد میں اس سے تذکرہ کیا تھا کہ یہاں کے مرد شراب نہیں پیتے اور عورتیں وفادار ہوتی ہیں۔

عورتوں کی وفاداری سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس دنیا سے نکل کر وہ آیا تھا، جس دنیا میں وہ رہتا تھا، اس میں عورت اسی وقت داخل ہو سکتی تھی جب خود اسے عورت کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی رفاقت کا مطالبہ کر سکے۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

کمال نے عورت کو ہر روپ میں دیکھا تھا۔ سمرقند اور قاہرہ کے بازاروں میں

بکنے والی کنیزیں، مال غنیمت کے طور پر حاصل کی ہوئی لڑکیاں، سلاطین کی حرم سراؤں میں مقید مہ جبینیں۔ عورت جو ہمیشہ ہر حالت میں مرد کی جائیداد تھی، اس کے رحم و کرم پر زندی تھی۔ اس کی خوشنودی کے لیے جس کی تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، کوئی تمنائیں، کوئی زندگی۔

مگر بہر حال خداوند تعالیٰ کی یہ مخلوق بہت دلچسپ چیز تھی۔ ایک حد تک زندگی میں اس کی اہمیت بھی تھی، مگر اس کے آگے اور بہت سی دنیائیں تھیں جن میں پہنچ کر عورتوں کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ذہن کی دنیا، روح کی دنیا۔ گو جذبات کی دنیا میں ایک حد تک کمال اسے شریک کرنے کے لیے تیار تھا مگر کسی گہرے جذباتی تجربے میں کسی عورت نے اب تک اس کی رفاقت نہیں کی تھی کیونکہ دراصل یہ محض اس کا حق تھا کہ وہ مختلف عورتوں کو پسند کرے، وقتاً فوقتاً ان سے محبت کرتا رہے۔ اس کی محبوبہ کو یہ حق کہاں سے پہنچتا تھا کہ وہ بھی اس سے وفا کا مطالبہ کرے۔ اس کا تو صرف یہی کام تھا کہ گڑیا کی طرح سجی بنی بیٹھی رہے۔ کمال جس زبان میں شاعری کرتا تھا اس کی روایت تھی کہ شجاع سورما اپنی محبوبہ کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ یہ بڑا دل آویز تصور تھا۔ غزالی آنکھوں والی شہزادی سرخ گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے الکبیر کے کنارے محل کے جھروکے میں بیٹھی ہے۔ جھروکے کے نیچے سورما شاعر رباب بجا بجا کر اسے اپنے خطرناک عشق کے نغمے سنا رہا ہے۔ یہ نغمے جو چاندنی راتوں میں وادیوں اور پہاڑی راستوں پر گونجتے تھے اور جن کی گونج فرانس اور الپس کے اس پار تک پھیل چکی تھی۔ سورما شاعر محبوبہ کو اونچے سے ستون پر بٹھا کر اس کی پرستش کرتا تھا اور جب چاہتا تھا

اسے اس ستون پر سے اتار دیتا تھا۔

اس اجنبی بے تکے ملک میں آن کر اس نے خدا کی خوبصورت بے زبان مخلوق کو ایک نئے روپ میں دیکھا: وہ تو خود ہاتھ میں رباب لیے محبت کے نغمے الاپ رہی تھی، رادھا بن کر کرشن کی پرستش کرتی تھی، لیکن یہ پرستش اتنی عظیم چیز تھی کہ اس کے قابل بننے کے لیے کرشن کو خدا کا درجہ حاصل کرنا پڑا تھا، وہ ہنستے ہنستے آگ کے شعلوں میں بھی کود جاتی تھی۔۔اس کی وفا شعاری کی قسمیں بڑے بڑے ولی اللہ کھاتے تھے۔

کمال چپ چاپ کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سامنے کی اور دیکھتا رہا، اسے وہ سارے نغمے یاد آئے جو چند روز پہلے ایودھیا میں چمپا نے اسے سنائے تھے۔یہ نغمے بھجن کہلاتے تھے اور کرشن اور رام کی بھگتی کا ان میں تذکرہ تھا اور ان سے زیادہ سرشاری کی کیفیت اس نے پہلے کبھی کسی زبان کی شاعری میں نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین سال میں اس نے جونپور کے شاہی کتب خانے میں رہ کر اس ملک کی مختلف بولیاں سیکھی تھیں۔اسے اپنے ہفت زبان ہونے پر بڑا ناز تھا مگر وہ ان لوگوں کے دل کو نہیں سمجھ سکا تھا۔یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔بڑے انوکھے مرد اور عورتیں تھیں۔ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے فلسفہ کائنات کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ اجنبی، اس پرائے دیس میں، سرد غیر مانوس پتھروں پر بیٹھا رات کے سایوں کو دیکھا کیا۔

مدھم سی روشنی سارے میں پھیل گئی۔

پورنیما کا چاند کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی چھت میں سے نیچے جھانک رہا تھا اور اس کی کرنوں نے سنگ سرخ کے شکستہ فرش پر عجیب عجیب زاویے بنا دیے تھے۔ فرش پر طرح طرح کے مبہم نقش و نگار بنے تھے جن کو سینکڑوں برساتوں نے مٹا کر بے حد مدھم کر دیا تھا۔۔ یہ ترشول، اور زندگی کا درخت، اور زمین کا کنول اور کائنات کا پہیہ اور کنول کا سنگھاسن، اور آگ کا ستون۔ جانے ان انوکھی علامتوں کا کیا مطلب ان لوگوں کے ذہن میں رہا ہوگا۔ معنی کیا ہوتے ہیں؟ کمال حیرت سے ان نقوش کو دیکھ کر سوچتا رہا۔ باہر مہوے کے باغ پر ہولناک، ہلاکت خیز سناٹا منڈلا رہا تھا۔

اور پھر اس سناٹے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ایسا لگا جیسے تاریک ویران گلی میں سے بھاری بھاری رتھ گزر رہے ہیں اور ان رتھوں پر زرتار چھتروں کے نیچے، کانوں میں سونے کے کنڈل اور دوشالے اوڑھے اجنبی انسان بیٹھے اسے جھانک رہے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بڑے خوفناک طریقے سے ہنستے تھے۔ اس کا منہ چڑاتے ہوئے گویا کہتے ہوں، دیکھو جس طرح ہم ختم ہوئے ہیں تم بھی نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے دروازے میں چندر گپت نرّی چندر کھڑا تھا۔ انسانوں کا چاند، ہند کا سمراٹ، مگر وہ یہاں کہاں سے آیا؟ کمال

نے لاحول پڑھی، وہ تو عیسیٰ کے پیدا ہونے سے تین سو سال پہلے ہی جہنم واصل ہوا تھا۔ کم بخت نے آخر دنوں میں جین سنیاسی بن کر اپنے آپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا، مگر وہ تو وہاں موجود کھڑا مسکرا رہا تھا، پھر اس کے پیچھے سے ایک اور آدمی نے اپنا سر نکالا اور بندر کی طرح کود کر اس کے سامنے آ گیا اور مخاطب کیا۔۔۔

دیکھو میرا نام اشوک ہے۔ اشوک پریہ درشن۔ میں سارے بھارت ورش کا شہنشاہ تھا اور جب میں مرا تو صرف ڈیڑھ آنولے کا مالک تھا، اس نے مٹھی کھول کر آدھا آنولہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔

اس کے بعد ان پلید روحوں کی یلغار شروع ہوگئی، وہ رتھوں سے اتر اتر کر سارے میں پھیل گئے۔ بندروں کی طرح شہتیروں سے لٹک گئے، ستونوں پر جا چڑھے، آنگن کے خشک حوض میں قلابازیاں کھانے لگے۔ ان سب نے مل کر باریک آواز میں کووں کی طرح کائیں کائیں شروع کر دی، وہ سب کمال کے چاروں طرف ناچ ناچ کر ایک ساتھ چلا رہے تھے:

میں بھرت منی ہوں۔ میں نے رقص اور تمثیل کے قوانین بنائے تھے۔

میں تکشلا کا وشنو گپتا ہوں، میں نے ارتھ شاستر لکھی تھی۔

میں راجہ بھوج ہوں۔

میں محض گنگوا تیلی ہوں۔

اندھیرے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں، میں کالی داس ہوں۔

میں قنوج کا راج شیکھر ہوں۔

مجھے بھبھوتی کہتے ہیں۔ میں کانیا کبج میں رہتا تھا۔ میں نے ''مالتی مادھو'' لکھا

تھا۔

میں بھرتری ہری ہوں، میں نے کہا تھا نا کہ دنیا میں محض ایک رنگ بھومی ہے اور ہم سب اداکار ہیں۔تم نٹ ہو، میں نٹ ہوں، ہم سب نٹ ہیں۔

مٹی کی گاڑی ہانکتا ہوا شدرک (ڈرامہ ''مٹی کی گاڑی'' کا مصنف) صحن سے باہر چلا گیا۔

پھر چھن چھن کرتی بہت سی پچھل پائیاں ایک قطار میں آن کھڑی ہو گئیں اور اٹھلانے لگیں۔

ہم کشمیر، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کی رانیاں ہیں جو بڑی شان سے خود حکومت کرتے تھے۔

میں شہزادی راجیشری ہوں، میں نے اپنی بحثوں سے چین کے عالموں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

میں کمار دیوی ہوں۔

میرا نام پر بھاوتی تھا۔ہائے تم مجھ کو بھی نہیں جانتے؟

میرا نام ہرش نے رتناولی رکھا تھا۔بے چارہ ہرش۔۔۔

اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے، جو کان میں قلم اڑسے اب تک مراقبے میں محو تھا، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ہم سری پرتھوی ولبھ کہلاتے تھے۔اس نے مقرر کی طرح ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔

ہم جو گویا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چہیتے تھے اور ہم سب کو ملیچھ ترکوں نے آ کر ٹھکانے لگا دیا۔ٹھکانے لگا دیا۔ٹھکانے لگا دیا۔

اب بڑے زور سے تلواروں کی جھنکار گونجی اور ان کی چمک سے نیم تاریکی میں اجالا سا ہو گیا اور سر کٹ کٹ کر چاروں طرف گرنے لگے۔ ہم چندیلے راجپوت ہیں، ہم بھگیلے ہیں، ہم پرمار سورما ہیں، ہم راٹھور ہیں، ہم چوہان ہیں، ہم آلہا ہیں، ہم اودل ہیں۔

سب نے ایک ٹانگ پر کود کود کر ناچنا شروع کر دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر آلہا اودل گا رہے تھے، اس قدر غل مچا کہ ابوالمنصور کمال الدین کا دماغ چکرا گیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ افق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور باہر مہوے کے باغ میں چند کسان آلہا اودل گاتے ہل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔

یہ بہرائچ تھا اور وہ بت پرستوں کے زمانے کے ایک کھنڈر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا شام کرن گھوڑا باہر ایک ستون سے بندھا ہنہنا رہا تھا اور بارش جھکی کھڑی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے دوبارہ لاحول پڑھی اور انگرائی لے کر اٹھا اور فجر کی نماز پڑھنے کے ارادے سے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ندی کی اور چل دیا۔

۲۱

دن بھر پنڈتوں کے ساتھ تانب پتروں پر سر کھپانے کے بعد کمال مٹھ کے باہر

گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل صبح سویرے وہ ایودھیا کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ معاً بارش کا قطرہ اس کے چہرے پر آن گرا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ افق پر گھنگھور گھٹائیں امنڈ کر اٹھی تھیں۔ بہت جلد ندیاں نالے چڑھ جائیں گے۔ مینڈک ٹرائیں گے، جل تھل ایک ہو گا۔ کمال نے ایک چھپر کے نیچے جا کر پٹکا کھولا اور کچے فرش پر لیٹ گیا، پھر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ مدتوں بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب کمال کو لگاتار تین چار مہینے بعد اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ شرقی سلاطین کی دلی کے بادشاہوں سے مستقل جنگیں چھڑی رہتی تھیں۔ کمال کو کوئی دن ایسا یاد نہ تھا جب کسی نہ کسی نئے معرکے کی وجہ سے اس کے کتب خانے کے کام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ پہلے سلطان محمد شاہ اور اس کے بھائی شاہزادہ حسین میں جنگ ہوئی، پھر شہزادہ حسین نے جونپور کا سلطان بن کر خود دلی پر چڑھائی کر دی۔ ان معرکوں میں کمال سلطان کے ساتھ کالپی اور اٹاوے اور سنبھل میں مارا مارا پھرتا۔ مہینوں اس نے بدایوں، کویل، مارہرہ، شمس آباد اور برن کی خاک چھانی۔

برکھا شروع ہو چکی تھی، ندیوں اور جھیلوں پر بارش کی بوندوں کی ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ بہرائچ کے پورب میں راپتی بہتی تھی۔ پچھم میں سرجو رواں تھی۔ یہ دونوں ندیاں بڑی دور نیپال دیس سے نکل آئی تھیں اور کس بے پروائی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ یہ سامنے والی سرجو، جو بت پرستوں کی نظروں میں بڑی مقدس تھی، (یہ دریاؤں کا مقدس ہونا کمال کی سمجھ میں نہ آیا!) اسی طرح گاتی گنگناتی کچھ آگے جا کر گھاگھرا سے مل جاتی تھی اور گھاگھرا کے کنارے ایودھیا

آباد تھا جہاں چمپاوتی رہتی تھی اور بارش ہو رہی تھی اور اس وقت وہ اسی سرجو ندی کے کنارے کہیں کسی درخت میں جھولا جھولتی اور ساون گاتی ہو گی کیونکہ کمال کو اچانک خیال آیا کہ لو ساون کا مہینہ آن پہنچا۔ یہ موسموں کا سحر۔ ہر مہینے کے نام کے ساتھ اس کی اپنی کیفیت تھی۔ اس مناظر، اپنے رنگ، اپنے راگ۔ چند ماہ قبل ویسا کھ تھی۔ سارے میں بسنت رت چھائی تھی، پھر جیٹھ اور اساڑھ کا مہینہ آیا جب مہوا کے باغ میں لوئیں چلتی تھیں اور بیل درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے، پھر بھادوں آئے گا، پھر کوار اور کاتک جب اداس چاندنی خنک زرد رنگ سارے میں گھول دے گی۔

یہ اس کا وطن نہیں مگر وہ کم از کم موسموں کے سحر سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

اس نے پگڑی سر کے نیچے رکھ کر کروٹ بدلی اور معاً چمٹا بجنے کی آواز اس کے کان میں آئی، اس نے کاہلی سے آنکھ کھول کر دیکھا ایک سادھو بارش سے بچنے کی خاطر چھپر میں آن بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے دھونی رمانے میں مشغول تھا۔ کمال کی موجودگی کی اس نے کوئی پروا نہیں کی اور اپنی کھڑ پڑ میں لگا رہا۔ کمال اٹھ بیٹھا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ موسم کا اثر تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں کو گلہریوں کو، ان چرواہوں کو، جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے جنگل میں سے گزر رہے تھے، ان سب کو گلے سے لگا لے۔ خوب چلا چلا کر ساون گائے۔ دنیا کتنی پرسکون، کتنی آرام دہ تھی، وہ طوطے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لیے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آ رہے تھے۔ یہ سب اس کے دوست تھے، اس

کے لیے تھے، وہ ان سے علیحدہ کب تھا؟ ''جے رام جی کی ۔۔''اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اپنی آواز سن کر، اپنی زبان سے یہ الفاظ نکلتے پا کر خود بڑا تعجب ہوا۔

سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ''جے رام جی کی۔''اس نے جواب دیا۔ ''کہو سپاہی ۔۔کہاں سے آنا ہوا۔۔''

''میں ۔۔سپاہی نہیں ہوں ۔''

''سلطان کے آدمی تو ہو۔۔''

''ہاں ۔۔مگر میں کتابیں لکھتا ہوں ۔''

''اچھا۔۔'' سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور پھر چمٹا اٹھا کر رام نام کا ورد شروع کر دیا۔ گویا کمال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل ضمنی تھا۔

''بابا۔۔تم یہیں رہتے ہو۔۔''کمال نے پھر بات شروع کی۔

''نہیں ۔ہم جونپور کے رہنے والے ہیں ۔''

''ارے!'' کمال نے بے اختیار ہو کر خوشی سے کہا، ''تب تو تم میرے ہم وطن ہو۔۔''

دوسرے لمحے اسے اپنے اس انجانے جذبۂ مسرت پر بڑا تعجب ہوا۔ ہم وطن؟ مگر جونپور اس کا وطن کہاں تھا؟ وہ تو بغداد کا باشندہ تھا۔۔ اسے سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔

''نرگن رام ۔۔نرگن رام جپو رے بھائی۔'' سادھو آنکھ بند کیے یکسانیت کے ساتھ ٹرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کمال کو خود ہی مخاطب کیا: ''آج کچھ قلندر بالے میاں کے مزار کے لیے جھنڈے لے کر راپڑ سے ادھر آئے ہیں۔''

''اچھا۔''

''وہ کہتے تھے کہ ہمارے سلطان اور دلی والے میں پھر ٹھن گئی۔۔۔اب کی دفعے ہمارا سلطان بچتا نظر نہیں آتا۔۔مقابلہ بڑا کٹھن ہے۔۔نرگن رام۔۔۔نرگن رام۔''اس نے پھر ٹرانا شروع کر دیا۔

کمال چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سادھو کے قریب گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔بابا پھر سے بتانا۔''

چھپر میں سات آٹھ کسان جمع ہو چکے تھے اور ان سب نے مل کر سادھو کے ساتھ رام نام کی رٹ لگانا شروع کر دی تھی۔کمال کے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ جلدی سے پٹکا کمر سے باندھ کر برستی بارش میں باہر نکلا اور سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرائے کے برآمدے میں اودے سنگھ راٹھور اس کا منتظر تھا۔

''تم۔۔تم یہاں کہاں۔۔''کمال نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔''تم تو گوالیر میں تھے۔''

''میں گوالیر ہی سے آ رہا ہوں،میرے ساتھ چلو۔۔۔عالم پناہ نے تمہاری کھوج میں مجھے بھیجا ہے۔''

''مجھے کھوجنے اتنی دور آئے ہو،میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔''

''عالم پناہ بھی یہیں بہرائچ میں موجود ہیں اس وقت۔۔۔''اودے سنگھ نے کہا،تم یہاں گیان دھیان میں لگے ہو،ادھر دنیا بدل چکی ہے۔۔سلطان بہلول

نے تمہارے مالک پر راپڑی میں حملہ کر دیا۔ آؤ، یہاں بیٹھ جائیں تو میں تم کو سارا ماجرا سناتا ہوں۔" وہ بڑے اطمینان سے کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ "جب اس پر حملہ ہوا تب وہ جمنا جی پار کر کے ہمارے راجا سے مدد لینے کے لیے گوالیر آیا، ہمارے راجا نے اسے کمک پہنچائی۔ میں اس کی فوجوں کو لے کر کالپی کی اور بڑھا۔۔ گھمسان کا رن پڑا۔" اودے سنگھ نے خالص فوجیوں والی تفصیل سے سنانا شروع کیا، پھر وہ جھک کر تنکے سے برآمدے کے کچے فرش پر نقشہ بنا کر کمال کو سمجھانے میں منہمک ہو گیا۔ "یہ دیکھو۔۔ ادھر بہلول کی فوجیں ہیں ادھر ہم ہیں۔ بیچ میں جمنا میا ہیں۔ اب نہ ہم ندی پار کر سکتے ہیں نہ وہ۔۔۔ سمے بیتتا جاتا ہے۔ تب ایک دن کیا ہوتا ہے کہ ترلوک چند سلطان بہلول کو ندی پار کروا دیتا ہے۔۔" پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ "ترلوک چند کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"بکسر کا حاکم ہے۔۔۔ بکسر گئے ہو؟"

"نہیں۔" کمال جھلا گیا۔ "اصل واقعہ بیان کرو۔"

"ہوتا کیا۔۔ دلی کی فوجیں برابر ہمارا پیچھا کرتی رہیں، ہم جونپور کی طرف لوٹے، وہاں بھی دلی والوں نے ہمارا مقابلہ کیا۔ ہم جونپور کو خدا حافظ کہہ کر بہرائچ آ گئے۔ تمہارا جونپور اب سنسان پڑا ہے۔ اس میں دن کے وقت الو بولتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "عالم پناہ نے کہا تھا تم کئی مہینے سے یہاں ہو۔۔ صبح سے تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مٹھ کے پنڈتوں سے تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوا۔"

کمال نے تلوار کمر سے باندھی اور راودھے سنگھ کے ہمراہ لشکر کی سمت روانہ ہو گیا جو راپتی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔

ادھر جدھر جیت ون تھا۔

۲۲

بہرائچ سے وہ لوگ قنوج گئے جو کالندی اور گنگا کے سنگم پر آباد تھا، وہاں بھی انہیں بہلول لودھی سے شکست کھانا پڑی اور بالآخر سلطان حسین تھکا ہارا بہار میں پناہ گزین ہوا۔

بہار۔۔ یہ ایک نیا علاقہ تھا۔ ہرا بھرا، خوبصورت، جہاں سون ندی بہتی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں نالندہ کے دارالعلوم کے کھنڈر دل میں عجیب دہشت پیدا کرتے تھے۔ یہاں ابوالمنصور کمال الدین سلطان حسین کے دوسرے وفادار امراءاور افسروں کے ساتھ بیٹھ کر منصوبے بناتا تھا کہ جونپور کی سلطنت دوبارہ کس طرح حاصل کی جائے۔

جونپور میں اب دلی کا ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطنت شرقیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ شیرازہند اجڑ چکا تھا۔

ابوالمنصور کمال الدین، قاضی شہاب الدین جونپوری کا جانشین، مورخ، محقق، اب سیاسی سازشوں کا بھی ماہر ہو گیا۔ دن رات وہ سلطان کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا ترکیبیں سوچا کرتا۔۔ دلی کے سلطان کو کس طرح زیر کیا جائے؟

اب سلطان بہلول مر چکا تھا اور اس کا خوبصورت اور شاندار بیٹا سکندر ہند کا بادشاہ تھا جس کی ماں کا نام ہماوتی تھا، جو شرع محمدی کا بڑا پابند تھا، جو اپنے باپ سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔

بہار کے ان پناہ گزینوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بساط جنگ پر ایک بار پھر پانسہ پھینکا۔

کیونکہ لڑنا مرنا، ہار جیت ہی مردوں کے مشاغل ہیں۔

سلطان حسین اپنی جوڑ توڑ کے ذریعے کئی بار جونپور میں باربک شاہ کے خلاف بغاوت کروا چکا تھا، اب کی مرتبہ اس نے جوکا سے مل کر ایک بڑی بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ کمال اس کا سفیر خاص تھا، دن رات وہ اپنے شیام کرن گھوڑے پر سوار ادھر سے ادھر سازشیں کرواتا تھا۔

ایک رات منزلیں مارتا وہ جوکا کے گاؤں پہنچا۔ گڑھی پر جا کر اس نے آواز دی۔ جوکا اس وقت اندر پوجا میں مصروف تھا۔ اس کا جوان بیٹا چراغ ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے شک سے پوچھا۔ باربک شاہ خود کمزور تھا لیکن جب سے اس کا بڑا بھائی سلطان سکندر دلی کے تخت پر بیٹھا تھا پرجا اپنی جان کی خیر مناتی تھی۔

''میں سلطان کے پاس سے آیا ہوں۔''

''کون سے سلطان کے پاس سے۔''

''تمہارا سلطان! حسین شاہ۔''

''آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ بھائی۔'' نوجوان کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ چراغ کی روشنی میں کمال نے اسے دیکھا، وہ اسی کا ہم عمر رہا ہوگا، وہ سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں اسے لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''میرا نام ہری شنکر ہے۔ میں جوکا کا بیٹا ہوں۔ میں سلطان کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔'' وہ ایک زمین دوز کمرے میں داخل ہوئے جہاں بھوانی کی مورتی کے آگے مدھم سا دیا جل رہا تھا اور دیواروں پر ڈھالیں اور تلواریں آراستہ تھیں۔

بھوانی کی مورتی اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی لیکن اسے اس وقت یہ احساس تھا کہ وہ بھی اب اس دیس، اس ماحول کے اسرار میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔

''اچھا سنو۔'' اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا، ''تمہارے پاس کتنے ہاتھی ہیں؟ کدھر سے حملہ کرو گے۔''

دوسرے لمحے وہ دونوں نہایت تندہی سے جنگ کا نقشہ سوچنے میں منہمک ہو گئے، ان میں سے ایک ہندو تھا دوسرا عرب اور یہ دونوں افغانوں سے لڑنے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدر مشترک صرف ایک شے تھی۔۔ دو دھاری خون آشام تلوار اور ایک دوسرے فریق کو ختم کر دینا ان کا واحد مقصد حیات تھا۔

چند روز بعد انہوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور سلطان سکندر ان کی سرزنش کے لیے جونپور پہنچا اور حسین شرقی کو دوبارہ شکست ہوئی اور سنگیت کار بادشاہ، جس کی آدھی عمر راگ تخلیق کرنے کے بجائے میدان کارزار میں لڑتے بھڑتے کٹی، ایک مرتبہ پھر بہار کی طرف واپس لوٹا۔

اب کمال کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اس نے اس قدر خونریزی دیکھی تھی، اس نے اتنے انسانوں کو قتل کیا تھا، اس نے اتنی بے بس عورتوں کو دیکھا تھا۔ اس نے سلطان حسین کے دربار کے امراء کو اس حالت میں سلطان سکندر کے سامنے جاتے دیکھا تھا کہ عمامے ان کی گردنوں میں رسیوں کی طرح بندھے تھے اور وہ پاپیادہ قیدیوں کی مانند فاتح کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ لوگ، جو عالم، شاعر اور اہل قلم تھے، اور ان کا فاتح بھی علم دوست اور شاعر تھا، لیکن کتابیں بے کار تھیں، علم فضول تھا، فلسفے بے معنی تھے کیونکہ انسان کا خون ان سب چیزوں کے باوجود بہتا تھا۔ خداوند!۔۔۔ دکھی انسانیت کس طرح ساری کی ساری خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاریخ سے اس کو جس قدر دلچسپی تھی اب اتنی ہی نفرت ہو گئی۔ اس نے سلاطین کے نسب ناموں اور ان کے ادوار اور ان کی سلطنتوں کے واقعات کو بھول جانا چاہا۔

اس نے یہ بھی فراموش کرنا چاہا کہ سلطان کی بھانجی جنگی قیدی کی حیثیت سے اب دلی میں تھی اور سلطان سکندر کے حرم میں داخل کی جا چکی ہوگی۔ اس کے دوست اودے سنگھ راٹھور نے اسے غیرت دلائی۔۔!

"کیسے بے شرم ہو، تمہاری شہزادی دلی میں ہے اور تم بہار میں چین سے بیٹھے ہو۔ اسے چھڑا کر لاؤ، جا کر سلطان سکندر کو قتل کرو یا مجھے اجازت دو میں اس کا کام تمام کر دوں۔ شہزادی کو واپس لے آؤں۔" کمال یہ باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کون سا راستہ اختیار کرے۔

بہار سے غریب الوطن سلطان حسین نے بنگال کا رخ کیا۔ کمال اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ گوڑ کے سلطان حسین شاہ نے جونپور کے شکست خوردہ بادشاہ کو

اپنے یہاں پناہ دی جس کے سارے پرانے ساتھی بچھڑ چکے تھے، جس کا کتب خانہ تباہ ہوگیا تھا۔ خالی طنبورہ اب جس کا رفیق تھا۔ طنبورہ اس سے کبھی دغا نہیں کرے گا۔

اب میری روح کو کاہے کی تلاش ہے؟ گوڑ کے شاہی باغات میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتے ہوئے کمال خود سے سوال کرتا۔ بنگالے کی لڑکیاں بے حد دلکش تھیں، یہاں کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ یہاں کی موسیقی بہت دلنواز تھی۔ اسے جونپور کی شاہزادی یاد نہیں آئی، اسے چمپاوتی کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اسے خدا کی تلاش نہیں تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے عورت کی تلاش بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا وجود اس دہشت ناک خلاء میں ڈول رہا تھا جہاں محض عمیق سناٹا ہوتا ہے۔

اس سناٹے میں صرف ایک سوچ بار بار گونجا کرتی۔۔ میں جب تک اس چکر میں رہوں گا، مجھے دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ دوسرے مجھے مارنے کے درپے رہیں گے۔ انسان دراصل انسان نہیں ہیں خونخوار بھیڑیے ہیں۔ انسان مجھے کہاں ملے گا۔۔؟

طرح طرح کی آوازوں نے اس سناٹے میں بہت سے بھنور پیدا کر دیے۔ میں اس سامنے والے انسان کو مار ڈالوں کیونکہ اس نے سر پر چوٹی رکھی ہے اور گائے کو پوجتا ہے اور اگر میں نے اس کو قتل کرنے میں سبقت نہیں کی تو وہ میرا کام کردے گا کیونکہ میرے سر پر چوٹی نہیں ہے۔۔؟

خوبصورت شوپوری کی اس لیے مجھے اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہئے کیونکہ وہاں لاکھوں کروڑوں مورتیاں مندروں میں سجی ہیں، لیکن وہ مورتیاں میرا کیا

بگاڑتی ہیں؟

اگر ان مورتیوں کو میں گوارا کرتا ہوں تو کیا میں مسلمان نہیں رہا۔۔؟

اسلام کیا ہے۔۔؟

ان سوالات نے اسے دیوانہ کر دیا۔

ان سے بچنے کے لیے اس نے شراب میں پناہ لی، اس نے ملک کے سارے خطوں کی عورتیں دیکھی تھیں۔۔ خوبصورت مضبوط جسموں والی مراٹھنیں۔ گجرات اور کاٹھیاوار کی نازک اندام لڑکیاں جن کے چہروں کی رنگت کندنی تھی۔ بیجاپور کی خوش آواز طوائفیں۔ بنگالے کی جادوگرنیاں جن کی آنکھوں میں جادو تھا اور باتوں میں ٹونا، جن کے لیے مشہور تھا کہ راتوں رات درختوں پر بیٹھ کر آسام کی سمت اڑ جاتی تھیں! اور بندرابن کی شوخ وشنگ گجریاں، متھرا کی اہیرنیں، پورب کی سانولی سلونی کہارنیں۔ قنوج کے باغوں کی وہ مالینی، جس نے اسے ایک بار بیلے کے گجرے بنا کر دیے تھے۔

موسم بدلتے رہے، وہ دل کی ویرانی سے گھبرا کر راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوا لیکن سارنگی کی تانت میں اسے موت کی ہچکیاں سنائی دیں۔ اس نے لکھنوتی کی پاتروں کو ناچتے دیکھا مگر حسین رقاصاؤں کے بجائے اسے مردہ عورتیں دانت نکوستی نظر آئیں۔

طرح طرح کی آوازیں، عجیب وغریب گیتوں کے بول، مردہ زبانوں کے جملے اس کے دماغ میں ہر وقت شور مچاتے، وہ اس اندرونی شورش سے عاجز آ گیا۔ سناٹا اس قدر پر شور ہو سکتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا، وہ، جو ہفت زبان تھا، اس

نے کوشش کی کہ ساری بولیاں، سارے الفاظ کسی طرح بھول جائے۔ حافظہ کس قدر اذیت دہ شے تھی!

ایک روز کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا: ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ ہیرا جنم امول تھا، ہیرا جنم امول تھا، وہ جھنجلا کر کسی دوسری رقاصہ کے یہاں جا پہنچتا۔ اس سے کہتا: گن کری چھیڑو۔ مدھو مادھوی سناؤ۔ للتا راگ الاپو، وہ طنبورہ اٹھاتی، وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلتا۔ مغنیہ کے گیتوں کے بجائے کوئی دوسرے الفاظ اس کا تعاقب کرتے۔ سانس نقارہ کوچ کا، سانس نقارہ کوچ کا۔ باجت ہے دن رین۔ دن رین۔ دن رین۔ آخر اس نے لکھنوتی، گوڑ اور سنار گاؤں کی چہل پہل چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا جہاں صرف گہرے رنگوں کی راجدھانی تھی اور تالابوں میں کنول کے سرخ پھول جگمگاتے تھے اور جہاں بڑہل اور مولری کی چھاؤں میں ویشنو پجاری اور پجارنیں رادھا اور کرشن کی محبت کے گیت گاتے تھے۔ ویرانوں میں اسے اگلے وقتوں کے ونگا پتی اور گوڑیشور۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے پال بادشاہ۔ بادشاہوں کے سنسان محل نظر آئے جن میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان کی دیواروں پر اس نے رقاصاؤں کے مجسمے دیکھے۔ ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں جو یہاں سے مور پنکھی جہازوں پر بیٹھ کر جاوا کے شلیند ر دربار میں رامائن کا سنگیت ناٹک دکھانے کے لیے جاتی تھیں۔ اس وقت ان کے خوبصورت بازوؤں اور طویل آنکھوں پر چھپکلیاں چل رہی تھیں۔ پال اور سین بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں کے سائے میں کوئی قدیم قبرستان تھا جس کی شکستہ دیوار کے نیچے ایک بوڑھا ہانپتا کانپتا بیٹھا کھانس رہا تھا، برابر کے

کھیت میں ہل چلایا جا رہا تھا۔ سامنے مہانند اور یا بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ تب اچانک اس کے دماغ کا شور تھوڑا سا مدھم ہوا۔ اس بانی کا مطلب اس کی سمجھ میں تارے کی طرح روشن ہونا شروع ہوا جو مدتیں گزریں ایودھیا میں اسے کسی نے سنائی تھی۔ اس سے کسی نے کہا تھا: آج کال کے بیچ میں جنگل ہوگا باس۔ اورے اورے ہل چلیں گے، ڈھور چریں گے گھاس۔۔ ڈھور چریں گے گھاس۔ ڈھور چریں گے۔۔۔

آخر جب دل کی وحشت نے زیادہ زور باندھا تو اس نے بنگال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ حسین شرقی کو گوڑ میں اس طرح تنہا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اسے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی۔

مگر جذبے سب اضافی ہوتے ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور ایک روز خاموشی سے شاہی محلات سے نکل کھڑا ہوا۔ گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر وہ ایک جہاز پر بیٹھ گیا، اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

دریا پر روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ لنگر اٹھایا گیا۔ ملاح بشاش آوازوں میں گا رہے تھے۔ کمال ایک کونے میں بیٹھا رہا، وہ جہاز پریاگ جا رہا تھا۔ پریاگ جو کاشی سے آگے تھا۔ عظیم گنگا بہت دور سے بہتی ہوئی آ رہی تھی، اس کے ایک سرے پر اتھاہ سمندر تھا۔ کمال نے آنکھیں بند کرلیں، دن گزرتے گئے۔ کشتی گنگا کی سطح پر آگے بڑھتی رہی۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی میں بڑی چہل پہل تھی۔ بھاگل پور کے قریب ایک گاؤں سے براتی دلہن کا سرخ ڈولا لے کر کشتی میں سوار ہوئے۔ دولہا نے زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ دلہن لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے تھی۔ اس کے پیروں

میں چاندی کے بچھوے تھے اور اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں میں چوڑیاں اور ہاتھی دانت کے کڑے کھن کھن بولتے تھے اور وہ پھکو پھکو رو رہی تھی۔ براتی بلڑ مچا رہے تھے۔

کمال کشتی کی دیوار کے سہارے بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا۔

''سنو چمپاوتی مجھ سے بیاہ کرلو۔''

''ہوں۔''

''ہوں کیا۔ میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ، عاقبت سدھر جائے گی اور اس زندگی میں مجھ ایسا دلچسپ آدمی ملے گا۔''

''رام رام۔۔کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان۔ مجھے تو تمہارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔ جونپور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لوگے۔۔۔!''

اب بھی وقت ہے چمپا رانی، دیکھنا کسی دن کسی سر گھٹے پنڈے کے پلے باندھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹہل کروائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی۔ کبھی اپنے اس خوفناک مستقبل پر غور کیا ہے۔؟''

''میں تو تمہارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مر کے تو دیکھو!''

''سنو چمپا، سچ مچ، مجھ سے بیاہ کرلو۔''

''کاہے اپنی ذات بگاڑتے ہو، تم سیدزادے ٹھہرے۔''

''تم بھی برہمن ہو اور ویسے تمہاری ذات اور اونچی ہو جائے گی، سیدانی کہلاؤ

گی! مجھ سے بیاہ کر لونا بھئی۔‘‘

’’مگر ہم تو تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔‘‘

وہ سن کر چکرا گیا۔ ’’وہ کیسے۔۔۔۔‘‘ ’’میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے۔ یعنی کہ ۔۔۔میں۔۔تم۔۔میرا مطلب ہے کہ۔۔‘‘

’’اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔‘‘ وہ ہنستی رہی۔ ’’ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں، یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے!‘‘ وہ اسی طرح بے فکری سے ہنسا کی۔ ہم تو صرف ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو، ہمارا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ۔‘‘

’’جنم جنم کا ساتھ، کیا خرافات ہے۔‘‘ کمال نے بھنا کر کہا۔ ’’پھر تم نے جادو گری کی باتیں شروع کیں۔‘‘

’’اس میں جادو کیا ہے؟‘‘ چمپا نے حیرت سے پوچھا۔ ’’کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود سے پسند نہیں کر سکتی، ہم نے تمہیں چنا ہے اور ہم تمہارے آگے جھکتے ہیں۔‘‘

’’کیا کفر بکتی ہو، میں نعوذ باللہ کوئی خدا ہوں۔‘‘

’’ہو تو سہی، دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔‘‘ وہ پھر زور سے ہنسی۔

اور پھر اس نے کہا تھا: ’’اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہو نا۔‘‘

’’کرتا کیوں نہیں ہوں۔‘‘

’’تو پھر اتنی گھبراہٹ کا ہے کی۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہہ۔۔۔۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔۔کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔‘‘ اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر غائب ہو گئی۔

یہ ایودھیا کا کنج نہیں تھا، گنگا کی سطح تھی۔ اس کا جہاز سکون سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا اور براتی دھماری گا رہے تھے اور لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دلہن رو رہی تھی، دلہن، جو گوری رنگت کی دبلی پتلی بہاری لڑکی تھی، جانے کس دیس کو جاتی تھی، کس زندگی کی طرف، کس موت کی طرف اس کا رخ تھا۔ جہاز مونگیر پہنچا۔ براتی اس کا ڈولا لے کر کنارے اتر گئے۔ گھاٹ کے ہجوم میں سرخ رنگ کا ڈولا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جہاز نے دوبارہ لنگر اٹھایا۔ گنگا کے دونوں طرف سرسبز کھیت تھے اور گاؤں اور بارونق شہر اور دنیا اپنے حال میں مگن تھی۔

پٹنے کے گھاٹ پر بہت سے مسافر اترے، بہت سے سوار ہوئے۔ نئے مسافروں میں چند امیر زادے تھے، ایک جوگیوں کا گروہ تھا۔ ایک نارنجی لباس والا بھکشو تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا۔

پٹنے کے امیر زادے دن بھر چوسر کھیلنے میں مصروف رہتے۔ کاٹھیاواڑ کے دو تاجر، جو اپنا سامان لے کر دلی جا رہے تھے، اپنے بہی کھاتے میں لگے تھے۔ جوگی رام دھن میں منہمک تھے۔ کمال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بھکشو نے اس کا امیرانہ لباس دیکھا اور چپ چاپ جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان جوگیوں میں سے ایک کمال کے قریب سے گزرا، وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی۔

''بھائی، تم مسلمان ہو۔'' کمال نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''انسان ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''میں۔ میں بھی انسان ہوں۔'' کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا۔

''کیا چاہتے ہو۔''

''یہ پتا نہیں۔''

''اگر اپنے دل کا بھید خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمہارا کیا کام۔۔۔ ادھر جا کر بیٹھو۔''

اس نے امیر زادوں کی طرف اشارہ کیا، ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا ہے۔

''تم کہاں جاتے ہو۔''

''کاشی۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''وہاں کیا نہیں ہے؟ وہ شیو پوری ہے، وہاں مسرت ملتی ہے، وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ، وہ جو گرو ہے میرا، لیکن افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوا دی اور اس کو نہ جانا۔'' وہ ٹھٹھک گیا۔ ''تم جونپور کے کمال الدین ہو نا۔۔''

کمال مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

میں سلطان سکندر کا سپہ سالار تھا۔ میں چنار کے معرکے میں تم سے لڑا تھا بلکہ تم نے اپنی تلوار سے مجھے زخمی بھی کیا تھا، یہ دیکھو۔'' اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا جس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنا چکارہ، جسے وہ بائیں ہاتھ سے بجا رہا تھا، فرش پر رکھ کر وہ کمال کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تم کو اور بتاؤں، جب تم گوڑ کے

دربار میں رنگ رلیاں منا رہے تھے وہ جنگلوں میں تمہارے انتظار میں روتی پھرتی تھی لیکن کوئی راج ہنس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا۔‘‘

کمال کا دل دھڑ کنے لگا، یہ جوگی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ غیب کا علم جانتا تھا؟

’’میں اپنی فوج لے کر ایودھیا سے گزر رہا تھا۔ راپڑی میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں اس کا بھائی مارا گیا، وہی جو چتر ویدی پنڈت تھا اور وہ جنگلوں میں روتی پھرتی تھی۔ ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتی تھی کہ شاید تم ہی آ گئے۔ کیونکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس ضرور واپس لوٹ کر آ ؤ گے۔ مجھے سپاہی دیکھ کر تمہارا پتا پوچھتی وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں تو اسے تمہارے متعلق کچھ نہیں بتا سکا، پھر معلوم نہیں وہ کہاں گئی۔‘‘

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گرجا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’دنیا بہت بڑی ہے‘‘ جوگی کہہ رہا تھا۔ تم اس کو ڈھونڈ نہیں سکتے، وہ تم کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ زندگی میں دو انسان صرف ایک مرتبہ ملتے ہیں، اگر بچھڑ جائیں تو ان کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا مطلب جانتے ہو؟ اتنا کہہ کر جوگی نے پھر اپنا چکارہ اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

گنگا بہتی رہی۔ چاندی کی وسیع چادر پر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کیں۔ شاہی بجرے، تجارتی جہاز، مچھیروں کی ڈونگیاں، ان کے بادبان شام کو ڈوبتے سورج کے مقابل میں ہوا سے پھول کر یوں پھڑ پھڑاتے گویا بے شمار راج ہنس ماسر دور کی سمت اڑنے کے لیے پر تولتے ہوں۔ کشتیوں میں سے گانے کی

آوازیں بلند ہوئیں۔ جوگیوں کے سمرن فقیروں کے ذکر، ویشنو پجاریوں کے بھجن، تاجروں کے جہاز ملک کی منڈیوں کی طرف جا رہے تھے۔ گجرات اور بنگال کے سوتی کپڑے، بنارس کا ریشم، دکن کے ہیرے دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ چین کے عالم، تبت اور کشمیر کے بھکشو، عرب سیاح، ایران کے نقاش، جاوا کے رقاص، ملک میں امن قائم تھا۔ دلی میں سلطان سکندر حکومت کرتا تھا زندگی میں بڑی گہما گہمی تھی۔

''خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے، بھائی مجھے شانتی چاہیے۔'' کمال نے آہستہ سے کہا۔

بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت، آج ویساکھ پورنیما تھی، آج کی رات دو ہزار سال ادھر، اسی گنگا کے اس پار، ترائی کی ایک بستی میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ آج ہی ویساکھ پورنیما کے روز انہیں گیان حاصل ہوا تھا۔ چودھویں کا چاند دریا کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ دریا پر مکمل سناٹا طاری تھا۔

''مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔'' کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ''خیال۔۔۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا، خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں ہے۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں، لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔'' اس نے گہری آواز میں کہا۔

''مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''شونیا۔۔سناٹا۔۔شونیتا۔۔جو ذات مطلق ہے۔ جو صفر کا تصور ہے۔''

''مجھے اس تصور سے وحشت ہوتی ہے۔'' کمال نے کہا۔''۔۔اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔'' اس نے مہایان مذہب کے بھکشو کو شک وشبے کی نظروں سے دیکھا۔

جہاز ایک گاؤں کے کنارے ٹھہرا۔ ساحل پر چاندنی رات میں وسنت کے دیوتا کا تہوار منایا جارہا تھا۔ کمال گھاٹ پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتا رہا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر کا رخ کرے۔ دفعتاً اسے ویشنو پجاریوں کی ایک ٹولی نظر آئی جو اس کے جہاز سے اتری تھی، وہ ان کے پیچھے ہولیا، کسی نے اس پر نظر نہ ڈالی۔

بہت دن تک وہ اسی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک ہرے جنگل میں پہنچا، اسے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ قریب جولاہوں کی بستی تھی۔۔۔ معطر ہوائیں درختوں میں امنڈ رہی تھیں۔ سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہرا نظر آرہا تھا۔ ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ بھنوروں کی ایسی کالی جامنیں ہری گھاس پر ٹپ ٹپ گرتی تھیں۔ کسم رنگ کی ساریاں اور لہنگے پہنے لڑکیوں نے آم کی ڈال میں جھولے ڈالے تھے۔ چاروں اور گھن بیلی اور روپ منجری اور سدرشن اور رماتی کھلی تھی۔

گلے میں تلسی مالائیں پہنے ویشنو جوگنیں کٹھل کے درخت کے نیچے بیٹھی کھڑتال بجاتی تھیں۔ گلابی آنکھوں والے طوطے شاخوں پر بیٹھے تھے۔ ترتی

بجاتے، کمنڈل ہاتھ میں لئے جوگی اپنی یاتراؤں پر جا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں جنگلی تیتر بول رہے تھے۔

تالاب کے کنارے رس بیلی مہک رہی تھی۔ مہوا کے جھنڈ میں سے گیتوں کے خوبصورت سر بلند ہو رہے تھے۔ کمال ایک کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جنگل اور ساون کی ان صداؤں کو سنتا رہا۔

تب اس کو معلوم ہوا وہ سناٹے میں تھا، یہ سناٹے کے مختلف پرتو تھے، وہ عالم حیرت میں تھا۔ یہ سناٹا ذات مطلق تھا۔ بھکشو کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

پھر اس نے غور سے سنا۔ مہو کے جھنڈ میں ویشنو پجارنیں جو گیت گا رہی تھیں اس کے الفاظ اب اسے صاف سنائی دے رہے تھے۔ یہ تو بردوان کے جے دیو گوسوامی کی آواز تھی۔

اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ دھیان سے سنا۔ پجارنیں گا رہی تھیں۔

صندل کے گرم جنگلوں پر سے بہتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ مہک لا رہی ہے۔ جہاں الائچی کی جھاڑیوں سے چرائی ہوئی خوشبو پھیلی ہے، جہاں شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

ان کنجوں سے یہ پروائی آ رہی ہے جہاں وہ ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اسی مہینے میں تنہائی بہت کھلتی ہے۔

کیتکی کی کلیاں اور زرد پھول کام دیو کے بان کی مانند جگمگاتے ہیں سپاتل کے شگوفوں پر بھنورے سوتے ہیں۔ مادھوی ہوا میں جھوم رہی ہے اور ریشمی موگرے اور اس سے وہ کنجوں میں ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں

تنہائی بڑی کھلتی ہے۔

جیسے گرم ہونٹ بند آنکھوں کو چھولیں اسی طرح سورج کی کرنیں آم کی کیریوں پر پڑ رہی ہیں اور وہ پرسکون جمنا کے کنارے رقصاں ہے۔ موسم گل میں وہ تنہا نہیں ہے۔

وہ گوپیوں کے ساتھ ناچ کر یونہی اپنا سمے گنوا دے گا جب کہ رادھا اس کی منتظر ہے؟ پجارنوں نے گیت کا دوسرا انترہ اٹھایا۔

جیسے دور جانے والے مسافر کو کوئل کی آواز سن کر اپنے دیس کی ندی کنارے آموں پر گنگناتے بھنوروں کی یاد آ جائے اس طرح یک بیک اسے رادھا کا خیال آیا۔

اور رادھا نے دیکھا زریں لباس پہنے، بالوں کو خود رو پھولوں سے سجائے، اپنے سرخ ہونٹوں کے رنگ کے یاقوت سے مزین، وہ گوپیوں کے ساتھ رقصاں ہے،

کمال کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ سنتا رہا۔

پجارنوں نے گایا۔

کوئل کی آواز سے راہی کو تکلیف پہنچتی ہے۔

ان مسرتوں کا رنج جو حاصل نہ ہوئیں۔

ان سیاحتوں کا رنج جو کی نہ جا سکیں۔

ان محنتوں کا رنج جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اور مسرتوں کے باوجود

مسرت میں کرب چھپا ہے کیونکہ کرب پیہم ہے۔

کمال اٹھ کھڑا ہوا۔ پجارنوں کی آواز، جے دیو کے الفاظ رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔

اور جے دیو نے کہا تھا: میں منتظر ہوں، محبت تو وہ بھی کرتا ہے جس نے محبت دیر میں شروع کی۔

مہری اور گوریا چڑیوں کی سنگت میں وہ جنگل کے سایہ دار راستوں پر ادھر ادھر بھٹکتا پھرا، اور تب دفعتاً درختوں کے جھرمٹ میں اسے گنگا کا پانی جھلملاتا نظر آ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اس طرح گھومتا پھرتا بنارس پہنچ چکا ہے۔ سامنے دوسرے کنارے پر شو پوری تھی جس کے شوالوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے اور سینکڑوں ہزاروں گھنٹے ایک ساتھ بج رہے تھے اور ہوا میں عود کی مہک تھی اور گلیوں میں عبادت کے پھول بکھرے پڑے تھے اور گھاٹ کی لاتعداد سیڑھیوں پر لوگ نہا رہے تھے۔ کاشی۔۔ ازلی اور ابدی شہر۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں دن بھر بے مقصد پھرتا رہا، اب اس کے پیروں میں سکت باقی نہیں تھی اور وہ بے طرح تھک چکا تھا۔ جنگل کے اختتام پر جولاہوں کی بستی تھی، وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کی چوپال کی طرف بڑھا۔

ایک اہیر نے اسے سر جھکائے جاتا دیکھ کر اس سے کہا: ''بھیا، لگت ہے تم بہوت دور سے آئے رہے ہو۔ تمرے پیرن ماماٹی کتنی لاگی ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔''

''آؤ بیٹھو۔ ستو کھاؤ۔'' اہیر نے کہا اور اسے ایک سائبان میں لے گیا۔

''کپڑوں سے تو بڑے دھنوان دکھلائی پڑت ہو۔ اس اچرچ میں کاہے پھرے ہو۔ سلطان کے منشی ہو؟''

''میں کسی سلطان کا منشی نہیں ہوں۔''

''لو آرام سے بیٹھو، یہاں چھاؤں ہے۔'' وہ جوتے اتار کر سائبان میں بیٹھ گیا اور چاروں اور دیکھنے لگا۔ سامنے آم اور جامنوں کا گھنا باغ تھا جس میں وہ دن بھر گھومتا رہا تھا۔ مہوے کے جھنڈ میں سے اب بھی ویشنو مغنیوں کے گانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف دوپہری کھلی تھی۔

لو بھئی چمپاوتی، اس نے دل میں کہا، تمہاری شرط پوری ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ میں اپنی تلوار اتار پھینکوں تو تم مجھے اپنے ساتھ کاشی لے چلو گی، میں نے اپنی تلوار دریا کی لہروں کے سپرد کر دی ہے اور میں کاشی پہنچ گیا ہوں۔

لیکن تم کہاں ہو۔

سامنے سے قلندروں کی ایک ٹولی گزری۔ بہت سے سنیاسی کنڈل پہنے، ترسول ہاتھ میں لئے گھاٹ کی سمت جا رہے تھے۔ جولاہوں، اہیروں اور مفلسوں کا ایک ہجوم کھڑتالیں سنبھالے بھجن گاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

چمپا نے کہا تھا: ان کا مذاق نہ اڑانا، یہ بہت پیارے لوگ ہیں۔ ایک روز یہی تمہارے کام آئیں گے۔

وہ آہستہ سے سائبان سے نکلا اور اس ہجوم کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ لوگ اپنے مرشد کے پاس جا رہے تھے، وہ جولہرتارا تالاب میں سے نکلا

تھا۔ وہ اسی جگہ پر رہتا تھا جہاں مولری کے پیڑ تھے اور جہاں رس بیلی مہکتی تھی۔

۲۳

میاں کبیر صبح کے وقت کرگھے پر بیٹھ کر کپڑے بنتے، کپڑوں کا گٹھر بنا کر پیٹھ پر لادتے، بنارس کی گلیوں میں جا کر پھیری لگاتے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے مولری کے جھنڈ میں مجمع لگتا۔ چکارے سنبھالے جاتے، کھڑتالیں بجتیں۔ بھجن گائے جاتے، یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس دنیا میں جنگیں ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں آتما بھوت دانت نکوسے دلوں کے تعاقب میں ہیں۔

سارے میں میاں کبیر کی شہرت پھیلی تھی۔ ان کی بانیاں کسانوں اور جاہلوں کی زبان پر تھیں۔ دور دراز کے خطوں سے لوگ ان کی اور کھنچے آتے تھے۔

کاشی کے پانڈوں کو اور دلی کے مولاناؤں کو اور سلطان سکندر کو، جو بڑا کٹر مسلمان تھا، یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن وہ سب کیا کر سکتے تھے؟ سارا دیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پچھلے تین سو سال سے اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ اجمیر کے معین الدین اور اپنے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور گجرات کے نرسنگھ مہتا اور بنگال کے بیر بھوم کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے ودیا پتی اور مہاراشٹر کا درزی نام دیو، پریاگ کے رامانند اور جنوب کے مادھو اور ولبھ اور

بادشاہوں اور چھتر پتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر کمال نے دیکھا کہ اس دوسری دنیا میں مزدور اور نائی، اور موچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔ کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی۔ اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے، یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے۔ اونچی ذاتوں کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ یہاں محبت کا راج تھا اور کمال، جو انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، اس نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بستے ہیں۔ یہ اہیر، جس نے چوپال میں بٹھلا کر ستو حاضر کیا تھا، اس کی جان لینا نہیں چاہتا کیونکہ اسے کسی سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔ اسے تو دونوں وقت باجرے کی روٹی مل جاتی ہے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب؟ یہ کسان، جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بچی کو بیر کھلا رہا ہے، اسے کیا پرواہ کہ دلی میں آئندہ کون حکومت کرے گا؟ سلطان حسین حاکم ہو تب بھی وہ اسی طرح ہل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہو تب بھی۔ ان ''ترکوں'' سے پہلے جب پرتھوی راج بادشاہ تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی جیٹھ کی دھوپ میں ہلکان ہوتے تھے۔ ساون میں گاتے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو خاموشی سے مر جاتے تھے۔

تب کمال نے سوچا۔۔ کہ گو مذہب کی حیثیت زندگی میں اہم سمجھی جاتی ہے لیکن محبت ظاہری مذہب سے برتر شے ہے۔

محبت اصل شے ہے۔

دور دور سے لوگ کاشی آ کر کبیر کے قدموں میں بیٹھ رہے تھے۔ کمال ان سب کی باتیں شوق سے سنتا، ان کی سیوا کرتا۔

کاشی میں ایک روز کوچین کا ایک اندھا برہمن وارد ہوا، وہ کبیر کا نام سن کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کا ایک بازو لڑائی میں کٹ چکا تھا لیکن وہ ایک ہی ہاتھ سے رام دھن پر کھڑتال بجاتا تھا۔ اسے دیکھ کر کمال کو احساس ہوا کہ وہ جنگوں اور تباہ کاریوں سے پناہ لینے کے لئے یہاں بھاگ آیا ہے مگر باہر کی دنیا میں لڑائیاں اسی طرح جاری تھیں۔

''بھائی تمہاری جان کس نے لینی چاہی تھی؟'' کمال نے اس سے پوچھا۔

''فرنگیوں نے۔''

''فرنگی۔؟''

''ہاں۔عیسائی۔۔ بہت دور پچھّم سے آئے ہیں۔۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

اتنی مدت ہند میں رہ کر وہ نصاریٰ کے وجود کو بالکل بھول چکا تھا جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے کٹے مرتے تھے۔ تاریخ میں اس کی دلچسپی پھر عود کر آئی، وہ کھسک کر مالابار کے برہمن کے پاس بیٹھ گیا۔

''یہ عیسائی کدھر سے آئے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔ صلیبی جنگوں کے

سارے واقعات اسے ازبر تھے۔

''پرتگال۔۔کوئی دیس ہے۔''

اس نام سے تو وہ واقف تھا۔دوسرے عربوں کی طرح علم جغرافیہ کا وہ بھی ماہر رہ چکا تھا۔پرتگال اندلس کے پاس تھا۔اندلس۔۔۔اس کے دل پر ایک برچھی سی لگی، وہ لوگ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اب یہاں بھی آن پہنچے۔ کمال کو یہ معلوم نہ تھا کہ پرتگالیوں کو ان کے بادشاہ نے اور پاپائے روم نے حکم دیا تھا کہ جس طرح مسلمان ہسپانیہ سے نکالے گئے اسی طرح ساری دنیا میں جہاں جہاں ملیں چن چن کر ان کا قلع قمع کرو، ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

''انہوں نے گوا کی ساری مسجدیں ڈھا دیں، مندروں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔'' اندھا برہمن کہتا رہا، ''گوا کے ایک ایک مسلمان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ میں ہندو تھا اس لئے بچ گیا۔''

نوجوان برہمن۔۔۔جو اپنی نور سے عاری آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے دو تارے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔یہ کالی کٹ کے راجہ کی بحریہ کا افسر تھا اور راجہ کے امیر البحر قاسم اور میر حسن کے ساتھ جی توڑ کر پرتگالیوں سے لڑا تھا اور اپنی آنکھیں ان کی بارود کی نذر کر کے اور ایک بازو کٹا کر یہاں پہنچا تھا۔کمال کو سلطان سکندر کا وہ سپہ سالار یاد آیا جو اسی طرح جوگی کا روپ دھارے اسے جہاز پر ملا تھا۔

''ہماری ہار ہوئی یا جیت۔'' کمال نے آہستہ سے سوال کیا۔

''ہم نے ترکی کے راجہ سے مدد مانگی تھی۔ترکی کا جنگی بیڑا مصر دیس سے ہماری سہائتا کے لئے آیا مگر پرتگالی بڑے زبردست ہیں۔'' اس نے اپنی بے نور

آنکھیں بند کرلیں اور دوتارہ بجانے میں مصروف ہوگیا۔ اب شام ہورہی تھی اور لوگ کیرتن کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ کمال اٹھا اور کوچین کے اس اندھے کا ہاتھ تھام کر اسے راستہ بتلاتا ہوا لوگوں کے گروہ میں مل گیا۔

بغداد اور جونپور کا ابوالمنصور کمال الدین، مورخ، محقق، سیاست دان، سپاہی، جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا، بالآخر کاشی کے پنج گنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔

۲۴

لیکن بہت سے بنیادی سوال، سوچنے والے ذہن کے لئے، ابھی باقی تھے۔ کبیر نے اس سے کہا: سنو بھائی سادھو، ہری سے پریم کرو، تمہارے دکھ آپ سے آپ مٹ جائیں گے۔ دکھ سنیہ۔۔۔ دکھ کی حقیقت اس کو جہاز پر اس تانترک سدھ نے بھی سمجھانا چاہی تھی، لیکن ہری کون تھا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اس سوال پر ایتھنز میں اور اسکندریہ میں اور بغداد میں بڑی لمبی بحثیں کی جا چکی تھیں۔ ہزاروں برس قبل اسی گنگا کے کنارے کپل نے اور جیمنی نے اور شہزادہ سدھارتھ نے اس پر سوچ بچار کیا تھا اور سات سو سال گزرے مہاندی کے اس پار کیرالا میں ایک بہت بڑا عالم پیدا ہوا تھا، اس کا نام شنکر اچاریہ تھا۔ کمال نے عہد عتیق کے کپل کا مطالعہ شروع کیا اور کتاب بند کرکے سوچا: نوفلاطونیوں کی عقل فاعل پرش ہے جو عقل حیوانی، پراکرتی، پر اثر انداز ہوتی ہے؟ انسان کا خدا سے اتصال نروان ہے۔۔۔

طریقت اور مارگ دونوں رحیم تک پہنچتے ہیں جو رام ہے؟

گوتم سدھارتھ کے سنہرے راستے پر صدیوں تلک مسافروں کے قافلے گزر رہے جنہوں نے دنیا میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں بنارس اور سانچی، اور امراوتی اور اجنتا اور باغ کے نگارستان سجا ڈالے مگر زمانے نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور مالوہ اور قنوج اور مگدھ اور گوڑ میں پھر ہری کی بھگتی کا چرچا ہوا۔ کیدار ناتھ سے لے کر دوارکا تک شیو کے عظیم الشان مندر تعمیر ہوتے چلے گئے۔ شاکیہ منی کا راستہ مہایان مذہب اور تانترک اسرار میں تبدیل ہو گیا اور شاکیہ منی وشنو کے اوتار بن کر انہی مندروں میں براجنے لگے۔ نارنجی لباس والے وہ بھکشو جو موروں کے نشان والے بادشاہ چندر گپت نزی چندر کے وقت سے بھی پہلے جنگلوں میں نمودار ہوئے تھے ایک ہزار سال کی الٹ پھیر کے بعد سدھ کہلاتے تھے اور بنگال اور بہار کے معبدوں میں جادو ٹونے کرتے تھے۔ مہایان مذہب کا مہا سکھ کا تصور خرافات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

کہ ہر بڑا آدرش آخر میں یونہی تباہ کیا جاتا ہے۔

لیکن آدرش کیا شے ہے؟

یکلخت کمال کو محسوس ہوا کہ وہ بھی بال کی کھال کھینچنے کی عادت اختیار کر چکا ہے جس طرح اس نے آس پاس کی درگاہوں میں لمبی لمبی چوٹیاں رکھائے برہمن طالب علموں کو چھیوں فلسفوں کے مسائل کی مین میخ نکالتے سنا تھا۔

قرب و جوار کے گاؤں میں بنارس اور جھوسی اور منگھر میں اسے بے شمار فقراء ملے جن کی خانقاہوں میں جا کر اس نے تصوف کی باتیں سنیں۔ قصبوں اور شہروں

میں عظیم الشان مدرسے تھے جہاں ایک سے ایک جید عالم تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے عمامے پہنے شیخ الجامعہ جب اس کے سامنے پالکی میں بیٹھے ہوئے نکلتے تو اسے بغداد کی یاد آ جاتی۔ نیم تاریک مٹھوں میں پنڈت اپنے پوتھی پتروں سے سر کھپا رہے تھے۔ گنگا کے کنارے کنج میں کبیر اور ان کے چیلے پریم پریم کی رٹ لگائے جا رہے تھے مگر وہ ہمیشہ کا ضدی خود پسند عرب، اس نے تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کیا اور جس طرح وہ سلطان حسین کے مستعد سپاہی کی حیثیت سے نئے معرکے سر کرنے کے لئے اپنی برق رفتار رہوار پر بیٹھا بیٹھا پر شورندیوں میں کود پڑتا تھا، اسی طرح اب اس نے اندھیرے سمندر کو لبیک کہا جس میں اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں روحیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ بہت سے لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بہت سے کشتی کا بادبان اتار کر قناعت سے ایک طرف کو ہو بیٹھے تھے اور خود کو ہواؤں کے حوالے کر دیا تھا۔ بہت سے اپنے ٹوٹے پھوٹے جہاز کے تختوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو کب کے ڈوب چکے تھے۔ ساحل تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ کیونکہ ساحل نظر نہیں آتا۔ سمندر بہت وسیع تھا اور اتھاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا سارے میں چھایا تھا۔۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ انہوں نے روشنی کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ بہت سے سمجھتے تھے کہ جو چراغ انہوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں جلائے ان کی روشنی میں وہ اس سمندر کو عبور کر لیں گے مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی تھی، ساحل نظر نہیں آتا تھا۔

کنارہ کہاں ہے؟ وہاں پہنچ کر کیا ملے گا؟ صحیح عقیدہ کیا ہے اور خدا کا تصور؟ محبت؟ ویراگ میں کیا حاصل ہوتا ہے؟ نجات کیا ہے؟

پنڈتوں سے اس نے ان کے خدا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ گو کبیر نے اس سے کہا تھا: ''کاشی کے پانڈے تم کو اور باتیں بتائیں گے۔ میں کاشی کا جولاہا ہوں تم تو میرا گیان بوجھو۔'' مگر اس نے اس بات کی سنی ان سنی کر دی اور ان تاریک مٹھوں اور پراسرار معبدوں کو اس نے باہر سے جھانک کر دیکھا جن کے اندر اسے قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ عود و لوبان کا دبیز دھواں، دیوی دیوتاؤں کے عجیب و غریب بت، مندروں کے اندھیرے پختہ آنگن، پیچ در پیچ گلیاں اور چبوترے اور موکھے جن کے اندر رکھی ہوئی کسی دہشت ناک مورتی کی جھلک اسے نظر آ جاتی۔ منتروں کا جاپ، پھولوں اور مٹھائیوں کے انبار بیلوں اور گایوں اور بندروں اور طوطوں کی یلغار۔ سیڑھیوں پر جمع پجاریوں کی بھنبھناہٹ، گھنٹوں کی آواز، کیا ان لوگوں کے ذہن، ان کے الہیات کے مسائل بھی ان ہی تنگ و تاریک ان گنت برجیوں، گلیوں اور کوٹھڑیوں والے مندروں کی طرح پیچ در پیچ گنجلک اور اور نا قابل فہم ہیں؟ یہ کون جناتوں کی قوم ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کو تو اپنے ذہن پر بہت ناز تھا۔ کیا وہ مدرسہ نظامیہ کا زمانہ بھول گیا؟

یہ صحیح تھا کہ ہندو فلسفے اور الہیات کے چھ کے چھ مدرسے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادق تھے اور اسے خود کبھی فلسفے اور مابعد الطبیعیات سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ سارے بنیادی مسائل کی طرف سے آنکھ موند کر محض ہری پریم کی رٹ نہیں لگائے گا۔ ہری کون ہے؟ ہری کون ہے؟ یا رام یا رحیم؟ وہ خدا کو کس نام سے پوجے؟ کیا نام ضروری ہے؟ اور خدا کون سا ہے اور کیا وہ بھی ضروری ہے؟ دنیا بھر میں اہل بدعت اور شک پرستوں اور دہریوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے

اسلام، اس کے ایمان میں خلل آ چکا تھا۔

اس نے ایک روز چپکے سے کبیر کے کنج سے نکل کر دریا پار کیا اور ایک زبردست جٹا دھاری پنڈت کے پاس جا پہنچا جن کے علم و فضل کا دور دور شہرہ تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ مناظرے کے لئے نہیں آیا ہے، وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مگر علم اس قدر وسیع تھا، اسے اپنے غیر اہم ہونے کا شدت سے احساس ہوا اور وہ کہاں سے شروع کرے؟ زمانے کتنے پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں کے دائرے۔ ملک اتنا وسیع تھا، وہ اس کے محض ایک حصے میں اس وقت موجود تھا۔ ابھی اس کو بنگال اور دکھن اور مہا گجرات اور تامل ناڈو کی بھی خبر نہیں تھی، وہاں کے علماء وہاں کے گیت کار، وہاں کی خانقاہوں اور فقیہوں کا اسے رتی بھر بھی پتا نہ تھا۔

وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔ عمل اور علم اور محبت، تینوں رستے اس کے سامنے کھلے تھے، وہ کس پر پہلے چلنا شروع کرے؟

عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلپ شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہابھارت اور پرانوں میں اس کا مذکور تھا۔ مہابھارت میں کرشن نے ارجن کو عمل کی راہ دکھائی تھی۔ ویدک خداؤں کا ملک پر ہزاروں برس سے راج تھا جو رفتہ رفتہ فلسفے کی علامتوں کے بجائے عوام کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے براجے رہے تھے۔

اس کرم مارگ کے متعلق اس نے پڑھا کہ یہ علت و معلول کا رشتہ ہے جس کے ذریعے انسان اور کائنات ایک دوسرے سے بندھے ہیں اور بندش ہمیشہ

تکلیف دہ ہوتی ہے اور نجات کرم کے چکر سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرا راستہ علم کا تھا۔ ویدک عہد کے بعد کے حکماء نے طے کیا تھا کہ محض عمل سے نجات ممکن نہیں۔ خود عمل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جاننا چاہیے، یہ کھوج لگانے کا رستہ بہت طویل تھا۔ اپنشدوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس سے علت و معلول کا چکر ٹوٹ سکے۔ اس تحقیق نے چھ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو جنم دیا تھا۔ منطق کے اصول وضع کیے گئے۔ کپل نے کہا۔ پرش اور پراکرتی، روح اور مادہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں۔ مادہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے۔ روح کائنات سے علیحدہ ہے۔ کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے، کیونکہ ذہن، شخصیت، خودی روح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی روح مادے میں گھل مل جاتی ہے اور اس کی مکتی اسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے۔ مادے میں مبتلا رہنے کا نتیجہ دکھ ہے، اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد ہو سکتی ہے۔ کپل دہریہ تھا۔ اس کے نزدیک تخلیق اور ارتقاء خدائی کارنامہ نہیں بلکہ مادے کی فطرت تھی۔

پھر کمال نے پتن جلی کے یوگ ستر پڑھے۔ اس کا ایشور خالق کائنات نہیں بلکہ روح ازلی تھی جو مادے میں مبتلا نہیں ہوئی۔ ویدانت والے وحدت الوجود کے قائل تھے۔

عہد عتیق کے برہمن قانون ساز گوتم کے فلسفہ علم میں اس نے وجود اور عدم وجود، بھاؤ اور ابھاؤ کی تفصیلات پڑھیں۔ گوتم نے ادراک، منطق اور استنباط کے ذریعے چیزوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا خلاء میں سے

پیدا ہونے کے بجائے ابدی ذرات، زمان و مکان اور ذہن و دماغ نے تخلیق کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مٹی اور پانی کی طرح ساری مرکب اشیاء کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور رہا ہوگا کیونکہ وہ نتیجے کی حیثیت میں موجود ہیں۔ زمان و مکان اور ذرے لامحدود ہیں۔ کسی سبب کا نتیجہ نہیں لہٰذا مرکب اشیاء کا سبب کوئی ذہین محرک ہے۔ ورنہ مرکب جوہر کے مادی اسباب یعنی ذروں میں وہ ضابطہ و تنظیم نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ان کے نتائج کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ذہین محرک کو مادی اسباب کا براہ راست علم ہوگا اور نتائج کی کارفرمائی کی طاقت بھی۔ کوئی انسان اس علم اور طاقت کا حامل نہیں۔ لہٰذا برہمن قانون ساز گوتم نے کہا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا مسبب الاسباب خدا ہے۔

وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلا نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑبڑایا، یہ مسئلہ بھی سامی نظریہ کائنات سے یکسر جداگانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روز قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا۔ جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہو گی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لئے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہٰذا چھونے اور محسوس کرنے کی دنیا ہی وجود کی ساری ممکنات سلب نہیں کر لیتی۔ اس نے پڑھا: ''زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقاء اور

اشکال اور ہیئتوں کے پر پیچ نمود اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔''

پھر ایک گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے خلاء تھا اور اس میں کائنات کو ظہور رہوا۔ یہ وحی اور الہام کے قائل خدا پرستوں کا گروہ تھا۔ حقیقت پرستوں کا نظریہ تھا کہ فطرت خدا کے ساتھ ابد سے موجود ہے اور آزاد ہے۔ خدا محض صانع اور آفریدگار ہے۔ عینیت پرستوں کے نزدیک خدا کے علاوہ اور کوئی شئے حقیقی نہیں تھی۔ پنچ راتریوں کا عقیدہ تھا کہ وشنو ذات حقیقی ہے اور لاکشمی بحیثیت کریہ شکتی مشیت ایزدی اور بحیثیت بھوت شکتی کائنات کی ماں ہے۔ بدھ مت والوں کا قول تھا کہ خدا اور روح دونوں کا وجود نہیں۔

وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔۔؟

ویدانت نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شنکر اچاریہ کے مطالعے میں پھر سے جت گیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ملک میں بدھ مت کو زوال آچکا تھا۔ گندھارا اور کاشمیر اور وادی سوات اور مکران اور بلوچستان اور مدھیہ پردیش ہر جگہ دوبارہ مہیشور کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ ملایا اور سیام دیش اور چمپا کے دور دراز ملکوں میں نیل کنٹھ شیو کی آرتی اتاری جارہی تھی جس نے ساری کائنات کا زہر پی کر اپنے گلے کو نیلا کیا تھا۔

یہ تصورات بے حد لرزہ خیز تھے۔ مہابھیرو، آفاق کا خوفناک جوگی، جو اپنے ہاتھوں میں برہما کی کھوپڑی کا کشکول لیے ڈمرو بجاتا، تین ڈگ بھر کے تینوں

دنیاؤں کو عبور کر لیتا تھا اور فقیروں کی طرح اپنے بیل پر بیٹھا کائنات میں مارا مارا پھرتا تھا۔ مہا کال۔۔۔ برہما وشنو مہیش کا تیسرا، تباہ کن روپ۔۔۔ شیونٹ راج۔۔۔

مدھیہ پردیش اور دکھن میں لنگم کے معبد تعمیر کر لیے گئے تھے۔ گپتا عہد میں اب شہو مہاراج کی عملداری تھی۔ عرب سیاح اپنے سفرناموں میں اس عجیب و غریب مذہب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ خداؤں کی فوج کی فوج تھی جو ہر طرف کودتی پھاندتی پھر رہی تھی، خوفناک عفریت نما دس ہاتھ والی سیاہ فام ڈائنیں، پریوں کی ایسی نرم و نازک دیبیاں۔ چاند اور سورج، آگ اور بادل، ہاتھی کی شکل والا اور بندر کی شکل والا، ناگ اور کچھوے اور تیرتھ اور میلے اور یاترائیں اور تہواروں کا غل غپاڑہ اور خونی قربانیاں اور جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے کا ایک ہنگامہ بپا تھا۔ سمندر پار کمبوج دیش اور یاوا اور ساٹرا میں نئی برہمن شاہنشاہیت کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شیو کی ڈمرو سارے میں بج رہی تھی۔

ہندو مذہب کی تجدید اور نئی تنظیم میں اس اکیلے نوجوان کا کتنا بڑا حصہ تھا جو آٹھویں صدی عیسوی میں مالابار کے ساحل پر الور ندی کے کنارے شوگرو برہمن کے یہاں پیدا ہوا۔ علم کے راستے پر چل کر ایک طرف جس نے اپنشدوں اور گیتا اور برہم ستر کی تفسیریں لکھیں اور دوسری طرف مذہب کو فلسفہ طرازیوں سے بے نیاز کر کے عوامی بنایا جو سارے ملک میں مٹھ قائم کرتا اور مذہب کا پرچار کرتا پھرا اور بتیس سال کی عمر میں مر گیا۔

ہندوستان کا عظیم ترین مفکر۔۔۔ شنکر اچاریہ! اس کے فلسفے کا مرکز خدا کی وحدانیت تھی۔ خدا، جو خالص ذہن اور خالص وجود تھا۔۔۔ نرگن۔۔۔ اور دنیا جو

مایا تھی۔

لیکن جس طرح دنیائیں دو طرح کی تھیں۔۔۔ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی، اسی طرح علم دو طرح کے تھے۔۔اعلیٰ اور ادنیٰ۔ برہما اور ایشور۔ چنانچہ عوام، جو شنکر اچاریہ کے ذہن کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کو اس نے پروہتوں کے حوالے کر کے برہمن عملداری کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

۔۔۔نیتی۔۔۔نیتی۔۔۔یہ نہیں ہے۔یہ بھی نہیں ہے۔ یعنی برہما کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا۔۔اپنشدوں میں لکھا تھا۔شنکر اچاریہ نے اس کی تشریح کی۔۔نیتی نیتی کا مطلب عدم وجود نہیں۔ ذات حقیقی مکمل بھرپور وجود ہے، اور ست، وجود، چیت، شعور جو کائنات کو منور کرتا ہے برہما ہے اور ابدی ہے۔ست چیت اور آنند برہما کی صفات ہیں بلکہ خود اس کی ذات ہے۔علم برہما کا جوہر ہے۔ساگن برہما یا ایشور زندہ خدا ہے۔ پراکرتی اور مایا کے ساتھ برہما ساگن بن جاتا ہے، وہ بیک وقت ایشور بھی ہے اور جیو یعنی شخصی خودی بھی، شنکر اچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔

فلسفی مادھو اچاریہ نے دوئی کے نظریے کا پرچار کیا۔ اس کے نزدیک برہما اور جیو کے علاوہ تیسری ہستی مادی دنیا کی تھی۔ رامانج نے کہا: برہما اور مایا الگ الگ نہیں بلکہ سب برہما ہے۔۔۔برہم مایا۔۔۔

کمال پنڈتوں سے برہم ستر کی تفسیر پڑھتا رہا۔شنکر اچاریہ نے کہا کہ حقیقت کو دو مختلف معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ایک راستہ یہ علم کا تھا جس پر کمال خود گرتا پڑتا پشتم پشتم چلا آ رہا تھا، تیسرا راستہ ابھی باقی تھا۔ جانے اس میں اتنی ہمت باقی

رہ جائے گی کہ وہ اس راستے کو بھی آزما سکے۔

''مدرسوں میں جزا و سزا اور خیر و شر کے مسئلے پر طویل بحثیں جاری تھیں۔ مسلمانوں کے بہتر کے بہتر فرقے بزعم خود صحیح راستے پر تھے۔ صوفی اور درویش اپنے اپنے حلقے پھیلائے بیٹھے تھے اور خدا کی محبت میں آہیں بھر رہے تھے۔ اس نے معتزلیوں سے مباحثے کیے جو مذہب کو عقل سے پہچاننے کے مدعی تھے۔ شیعوں نے اسے اپنی جانب بلایا جن کا حلول کا فلسفہ اہل ہنوز کے فلسفوں سے ملتا جلتا تھا۔

ملامتیوں کے قصے بھی اس نے سن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا تصور شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مراقبے اور سمادھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکرا رہا تھا، یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دور تک جاتا تھا۔ ابھی تو وہ پہاڑ کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صوفیوں نے اسے اپنی اور بلایا۔ انہوں نے کہا: آخری حقیقت روشنی ہے۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ جو نور نہیں اس کا وجود نہیں۔ چند اور درویشوں نے اسے بتایا: آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور کمال کے ذکر کی گونج اس نے ان کنجوں میں سنی۔ کیونکہ یہ ہندوستان تھا۔ یہ فرید الدین عطارؒ اور ہجویریؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور بہاء الدین زکریاؒ اور جلال الدین سرخپوشؒ اور معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ملک تھا اور کون

بدقسمت ہوگا جو اس ملک میں آ کر بھی وہ نا پا سکے جس کی اسے تلاش تھی۔

مگر ابھی تو وہ کپل اور شنکر اچاریہ کے ابواب بھی نہ پڑھ پایا تھا۔ کیا وہ یونہی خالی الذہن خالی دماغ لے کر ان سنتوں اور صوفیوں کے پاس چلا جائے۔۔۔؟ دل میں شبہے رکھے اور ان معصوم لوگوں کو دھوکا دے؟

ایک رات وہ گھنٹوں بیٹھا مٹھ کی دیوار کے نیچے سوچا کیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے، وہ اندر نہ جا سکتا تھا۔ اسے یہ اشلوک بہت اجنبی لگے۔ سارے جونپور کے علماء اور کاشی کے پانڈے اسے حلقہ باندھے دانت نکوستے نظر آئے۔ وہ ان سے علیحدہ نیچے موجود تھا۔ کوئی اس کی بات ہی نہ سنتا تھا، وہ دیوار کے نیچے بیٹھا رہا۔

صاحبو مہروبان۔۔۔ صاحبو مہروبان۔۔۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

رات کی ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ قریب سیڑھیوں پر چند پہاڑی آن بیٹھے تھے اور وہ اکتارے پر الاپ رہے تھے۔۔ صاحبو مہروبان۔۔ صاحبو مہروبان۔۔ صاحبو۔۔

اس نے انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کمال الدین۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبیر کا صاحب تمہیں واپس بلا رہا ہے، وہ جو بہت مہربان ہے۔ دونوں راستے تم نے دیکھ لئے، لیکن ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔ اس پر چل کر شاید تم اس تک پہنچ سکو۔ ہاں۔۔۔ ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔

اس نے دوبارہ گھاٹ کا رخ کیا اور گنگا عبور کر کے کبیر کے کنج میں واپس جا پہنچا۔

اب تو لگتا تھا جیسے عمر بھر سے وہ انہیں فضاؤں میں سانس لیتا آیا تھا۔ جہاں ڈھاک کے جنگلوں سے قرنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ جہاں گورکھ ناتھ کے جوگی شیر کی کھالیں اوڑھے کانوں میں کنڈل ڈالے سینگی اور نرسنگھے بجاتے جسم پر بھبوت ملے ان جنگلوں میں گھومتے تھے۔ جہاں ڈھاک پھولتی تھی۔ یہ کیسی انوکھی فضائیں تھیں جہاں نوے قسم کے ناتھ اور چوراسی قسم کے سدھ پہاڑوں کی گپھاؤں اور نیم تاریک مٹھوں اور لرزہ خیز معبدوں میں اپنے اپنے دائرے پھیلائے بیٹھے تھے اور کپالک اور کالا مکھ بدن پر راکھ ملے، کھوپڑیوں کے ہار پہنے، کڑا بجاتے چاروں اور گھومتے تھے۔ ایک سے ایک پرم ہنس اور یوگی ندیوں کے کنارے کٹیوں میں بیٹھا تھا۔

یہ سکون بخش ماحول جہاں گیت تھے اور ڈھول اور منجیرے کی صدائیں، بسنت رت آتی تو سارے میں زرد اور دھانی رنگ پھیل جاتے۔ گریکھم رت میں درختوں سے مہوہ ٹپکتا اور آم کے درخت بور سے لد جاتے۔ رنگیلی برکھا رت میں چندریاں ہوا میں لہراتیں، لاؤنیاں گائی جاتیں لڑکیاں پکوان پکاتیں۔

بھادوں کے مہینے میں گنگا مائی کا جوش اور غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ شرو کے موسم میں پیلی چاندنی سارے میں پھیلتی اور اداس سہاگنیں اپنے پردیسی شوہروں کی یاد میں برہا الاپتیں، چرخہ کاتتیں اور ساس نندوں سے لڑتیں۔

ہیمنت رت آتی۔ اگھن اور پوس کی سرد ہوائیں چلاتیں، الاؤ جلتے، آلھا اودل گایا جاتا۔ ماگھ اور پھاگن کے مہینوں میں کھیتوں پر پالا برستا۔ چنے اور ارہر کے پودوں پر اوس کے قطرے جگمگاتے کسانوں کے جھونپڑوں سے چکی کی گھر گھر کی

صدائیں بلند ہوتیں۔

آوازوں اور رنگوں کی اس دنیا میں وہ مکمل طور پر رس بس چکا تھا۔

یہ سب تھا مگر چمپا نہیں تھی، اسے کون زمین نگل گئی؟ کون آسمان کھا گیا؟ کون چتا کے شعلوں کی وہ نذر ہوئی؟ کس ندی کی لہروں نے اسے اپنی اور کھینچا؟

یہ کون بتا سکتا تھا؟ ان گنت تہوار آئے اور نکل گئے۔ رکھشا بندھن اور بھیا دوج اور جنم اشٹمی اور ہولی اور دیوالی اور محرم اور رام لیلا۔ کسی ہنگامے کسی میلے کسی گاؤں کسی بستی میں وہ نظر نہ آئی، وہ سارے میں مارا مارا پھرا، ایک دوبارہ وہ ایودھیا گیا، اس کا جی چاہتا تھا کہ عمر انہیں سبزہ زاروں، سرجو اور گنگا کے ان ہی ساحلوں پر گزار دے۔

چمپا کی یاد اب ایک عجیب حیثیت سے اس کے دل میں رہتی تھی۔ بھگتی مارگ میں اس نے دیکھا تھا کہ وشنو، انتریامی ایسا خدا ہے جو دلوں کے اندر رہتا ہے، وہ باپ ہے، شوہر ہے، ماں ہے، دوست ہے، رادھا کے لئے کرشن ہے، کرشن کے لئے رادھا ہے۔ اس نے سوچا کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا فاصلہ تو بہت طے کرتے ہیں مگر چمپا ان گنت اندھیروں میں میرے لئے اجالا کرتی جاتی ہے۔ جب وہ ساون کی راتوں میں لڑکیوں کے گیت سنتا تو دنیا بالکل نئی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی کیونکہ اب اسے معلوم تھا کہ الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ ویراگن جو پیا کی تلاش میں اندھیری رات میں نکل کھڑی ہوئی، برہا کی رات فراق تھی۔ جوگن، گوری، سہاگن، خدا کا بندہ تھا۔ پتی، منوہر، گردھر گوپال، خدا تھا جس کی کھوج میں گوری راج پاٹ چھوڑ بنوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عرب و

نجم کی شاعری کی تصوراتی کائنات سے جو اس کا رشتہ اب تک رہا تھا وہ اس رشتے سے بالکل مختلف تھا جو اس نے ان الفاظ، ان سروں مدھم رنگوں سے قائم کیا۔

خدا ساقی نہیں تھا، خدا پتیم تھا۔ ہری، شیام، کنہیا اور رام۔۔۔ مو ہے رام سے کوئی ملا دے۔ مو ہے رام سے۔ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں کوئی کہے بندرا بن میں۔۔۔ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں۔۔

وہ مہینوں یونہی ادھر ادھر پھرا کیا۔ ایک بار وہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا مچی۔ لاابالی سیلانی آدمی ہے بغداد لوٹ گیا ہو گا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب؟ وہ تو گھاگرا کے کنارے کنارے گھومتا پھرتا تھا، جب وہ لوٹ کر آیا اسے جولاہوں کی بستی واپس جاتے ہوئے ڈر سا لگا۔ گرو اسے ڈانٹیں گے تو نہیں کہ تم اب تک کس چکر میں مبتلا ہو، لیکن میاں کبیر اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ تال سوکھ کر پتھر بھیو، ہنس کہیں نہ جائے۔ پچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھائے انہوں نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کپڑے کا تانا تیار کرتے ہوئے کہا۔

کمال وہیں مٹی سے لپے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا اور کرگھے کی آواز سننے لگا۔ ہنس کہیں نہ جائے ہنس کہیں نہ جائے، وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا پچھلی پریت کا ناطہ تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ وفا کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔ وفا کا راستہ تو اسے چمپا ہی نے سمجھایا تھا، وہ کبیر کے ساتھ ساتھ ایسے رہتا جیسے گنگا کے جلو میں جمنا جی بہتی ہیں اور چمپا اس کے ساتھ ساتھ اس طرح تھی جیسے سنگم کے ساتھ سرسوتی جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔

مگر یہ ساتھ بھی چند روزہ تھا۔ کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعتی جولاہا عوام کو گمراہ کر رہا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے گنگا میں ڈبو دیا مگر وہ ضدی جولاہا، جل تھل راکھت ہیں رگھوناتھ، کا نعرہ لگاتا پانی سے باہر نکل آیا۔

دلی کا سلطان بڑا دیالو اور دین دار مسلمان تھا، اس نے میاں کبیر سے کہلوایا کہ وہ شر سے محفوظ رہنے کے لئے کاشی سے کہیں دور چلے جائیں۔

۲۵

میاں کبیر بنارس سے جلاوطن ہوئے۔ شو پوری کا جنگل اجڑ گیا جہاں مولسری مہکتی تھی اور سدرشن کے پھول کھلے تھے۔ میاں کبیر کا کرگھا سنسان پڑا تھا، ان کے مکان پر خاموشی چھائی تھی۔ کمالی، ان کی چھوٹی سی بچی بستی کی گلیوں میں روتی پھرتی تھی۔ کاشی نواسیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کمال نے ایک بار پھر اپنا رخت سفر باندھا اور گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر بنگال جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا، اس کے ایک سرے پر یہاں سے سینکڑوں میل دور گوڑ تھا جہاں وہ آج سے کئی سال ادھر اپنے سلطان کو تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

چند ہفتوں بعد جہاز پٹنہ پہنچا۔ پٹنے میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شرقی گوڑ سے بھاگل پور آ گیا تھا اور یہاں چند سال گزرے اسی جلاوطنی کے عالم میں خدا کو پیارا ہوا۔

سلطان حسین شرقی جس نے موسیقی کی دنیا میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا تھا۔ جنگوں میں لڑا بھڑا، جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور ختم ہو گیا۔

لیکن حسینی پیا، جس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں امن نصیب نہ تھا، سر میں ڈوب کر زندہ رہا۔

سر کی لہروں پر بہتے ہوئے اب کمال نے نئی نئی دنیاؤں کی سیر شروع کی۔ نغمہ جو سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نغمہ حق جسے کبیر انہد ناد کہتا تھا۔ باجت انہد ڈھول رہے۔ تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے۔

موسیقی کی یہ ساری دنیا اس کی اپنی تھی۔ جے دیو اور ودیا پتی اور چنڈی داس کے بھجن، ماہی گیروں اور کسانوں کے گیت، کوچہ گرد فقیروں کے لحن۔ اس دنیا میں حملوں اور شب خونوں اور فوجوں کی یلغار، سیاسی تلاطموں، جلاوطنی اور موت کا کھٹکا نہ تھا۔ موسیقی کی وحدت خدا کی وحدت تھی۔

بنگال پہنچ کر وہ گنگا کے کنارے ایک ایسے گھاٹ پر اترا جس کا نام اس کو معلوم نہ تھا۔ یہاں پان کی بیلیں پھیلی تھیں اور دھان کے کھیت تھے اور جھیلوں میں نیلے پھول کھلے تھے۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی مرشد کی خانقاہ تھی، اس نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ بنگال جو سریلی آوازوں کا وسیع بھنور تھا۔ باول گانے والوں کی ٹولیاں اک تارہ بجاتی گلی گلی گھومتیں۔ داستان گو گا گا کر روپ کتھائیں سناتے۔ مانجھی اور سپیرے اور ہاتھی پکڑنے والے ہر سمے گاتے رہتے۔ کرشن اور رادھا کی محبت میں ہر انسان سرشار نت نئے راگ الاپتا پھرتا تھا۔ اس سحر انگیز سرزمین کے باسیوں کی رگ رگ میں موسیقی رچی تھی۔ کمال ان کوچہ گرد شاعروں کے ساتھ

سارے میں گھومتا پھرا۔ پورب میں دریاؤں کی لہروں پر اپنی ناؤ کھیتا وہ چاٹگام کی پہاڑیوں اور اراکان تک جا پہنچا۔ یاتریوں کے ساتھ وہ سیتا کنڈ گیا جہاں اونچی پہاڑی پر، جس کے دونوں طرف گہرے کھڈ تھے اور جن میں باگھ گھومتے تھے، سیتا مہارانی کا مندر تھا۔ پہاڑی کے گھنے پر خطر جنگلوں میں صدیوں پرانے مٹھ تھے اور پہاڑی کے دامن میں سنگ سرخ کے تالاب کے کنارے کنارے معبد بنے تھے اور بڑ کے درختوں کے نیچے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی کیرتن گاتی تھیں۔

چاٹگام کا علاقہ دلفریب تھا۔ بل کھاتے تند رو عظیم دریا، خطرناک بن، خوشبودار پھول اور پھل، سرسبز پہاڑی راستے، بانس کے گھنے جھنڈ جن کے اندر عمیق تاریکیوں میں خانقاہیں تھیں۔

ایک روز وہ ان جنگلوں میں سے گزر رہا تھا اسے ایک تالاب کے کنارے چند لوگ اکتارہ بجا کر گاتے دکھلائی دیے، وہ ان کے قریب پہنچا۔ یہ نظام ڈاکو کا گیت تھا جو وہ لوگ لہک لہک کر انتہائی عقیدت کے ساتھ گا رہے تھے، اس کی دھن کیرتن کی ایسی تھی۔ ایسی نعمت کمال نے آج تک نہ سنی تھی، وہ دلچسپی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس گیت کا مصنف ان علاقوں کا بہت بڑا ڈاکو تھا جو سو سال گزرے یہاں لوٹ مار مچایا کرتا تھا اور پھر صوفیوں کی سنگت میں پڑ کر خود بھی بہت بڑا ولی اللہ بن گیا تھا۔

اگر محمدؐ اوتار جنم نہ لیتے ۔۔۔ کیرتن منڈلی نے گایا ۔۔۔
تو اللہ کی حکومت تر لوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمو نمو ہے عبداللہ اور آمنہ

جے ہو ملہ نگری کی اور سارے اولیاء کی اور بی بی فاطمہ کی جو سارے جگ کی ماتا ہیں۔ جے ہو اتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔

جے ہو پورب سے نکلتے سوریہ کی

اب میں وندرابن کے سامنے جھکتا ہوں۔

بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ ندیوں اور ساگروں کو میرا پرنام

جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی

جے ہو دھرتی ماتا اور پوتر سنکھا ندی کی

نو پاڑا کی مسجد کو میرا پرنام

کیونکہ وہ بڑا پیر ایک باران خطوں سے گزرا تھا

اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سیتا دیوی اور ان کے

مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام

جے ہو۔۔ جے ہو۔۔ جے ہو۔۔

کمال حیرت زدہ بیٹھا یہ عجیب وغریب نعت سنتا رہا اور پھر گانے والوں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا، اب وہ بغداد سے ہزاروں لاکھوں میل دور نکل آیا تھا۔۔ مذہب اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور پس منظر سے کس طرح متاثر ہوتا ہے، کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی سرزمین میں پھیلتی ہیں۔ کمال گاتا رہا۔ جے ہو جے ہو۔۔ جے ہو۔

اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا، یہ بنگالی زبان تھی جو اودھ اور بہار کی بولیوں سے زیادہ مختلف نہ تھی اور سنسکرت سے قریب تر تھی اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی طرح تیزی سے اس کی نشوونما ہو رہی تھی۔

یہ بڑی میٹھی زبان تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا۔ اسی میں بات چیت کرتا، اسی میں سوچتا، اسی میں لکھتا۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربار جونپور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ گو وہ دربار اس وقت لٹ چکا تھا لیکن حسین شرقی اور اس کے ساتھیوں کی شان وشوکت بہر حال باقی تھی لیکن دنیا تو اب مدتیں ہوئیں جونپور کے ابوالمنصو رکمال الدین کو بھول چکی تھی۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ خوبصورت نوجوان، جس کے سر کے بال کنپٹیوں پر سے تھوڑے سفید ہو چکے ہیں اور جو چمپا کے درخت کے نیچے بیٹھا ایک باول سے کنچن مالا کی کہانی سن رہا ہے۔ یا اک تارہ بجا بجا کر کبیر داس کی کوئی بانی الاپ رہا ہے یا کاغذ قلم لئے بنگال زبانی میں کوئی لوک کہانی قلمبند کرنے میں مصروف ہے، یہ کون ہے؟

گاؤں کے اور باول گانے والوں سے گیتی کتھائیں سنتے اس سرزمین کے بہت سے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے۔ پال بادشاہوں کا بنگال جب گوتم بدھ کے پجاری یہاں موتی رولتے تھے۔ جب پدما اور بھاگیرتی اور مدھو متی پر میور پنکھی جہازوں کے بجرے تیرتے تھے۔ جب ان سایہ دار راستوں پر سے پھولوں سے ڈھکے پشپ رتھ گزرتے تھے جن میں بیٹھی چترنی ناریاں مدھر مدھر ہنستی تھیں۔ جگمگاتے محلوں میں رہنے والی ملکہ مینامتی۔ زرنگار چتر ڈولوں کے

سرخ پردوں سے جھانکتی دلہنیں، وہ سب کہاں گئیں؟ وہ شان وشوکت کا زمانہ کیسے ختم ہوا؟ بدھ بنگال جو ہیرے جواہرات اور سونا اور چاندی اور موتی رولتا تھا وہ سب کیا ہوا؟ اب تو سین بادشاہوں کے محلوں میں بھی الو بولتے تھے۔ گوتم بدھ اور دیبی تارا اور درگا بھوانی اور وشنو کے پجاری دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے نقشے کس طرح بدلتے ہیں، کمال آنکھیں بند کر کے سوچتا۔

کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا، وہ۔۔۔ مورخ، محقق، سیاستدان، سپاہی، صوفی، کبیر کا چیلا۔۔۔ اب گیت کار بن چکا تھا۔

اسی طرح گھومتے پھرتے وہ سونار گاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔ اس لڑکی کا نام شنیلا تھا، وہ ذات کی شودر تھی۔ ایک روز جب وہ تالاب کے کنارے گاگر لے کر آئی تھی کمال اس کے لمبے بالوں اور سیاہ پلکوں پر عاشق ہو گیا، یہ عمر اور ذہنی پختگی عشق کرنے کی نہیں تھی لیکن روح اور دل کی کائناتوں کی ساری مسافتیں طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے، ایسا سکون جس میں پرخطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ یہ سکون اسے اس سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے حاصل ہو گیا۔ گویا یہی اس کی منزل تھی۔ جونپور کی شہزادی ایک بہت دھندلا سا خواب تھا جو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ ایودھیا کی برہمن زادی اس کی روح اور دل کے اس تہہ خانے میں موجود تھی جس کے دروازے مقفل کر کے اس کی کنجی اس نے خود ندی میں پھینک دی۔

کیونکہ یاد زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے۔

شنیلا اب اس کی بیوی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شودر ہونے میں کیا قباحت ہے۔ اس نے شنیلا کا نام آمنہ بی بی رکھا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بانس کے جھونپڑے میں رہنے لگا۔

گزر اوقات کے لئے وہ کھیتی کرتا، اس کے کھیت میں دھان بوئے تھے اور اس کے جھونپڑے کے سامنے چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سنگھاڑے تھے اور کنول کے پھول اور جس میں روپہلے پروں والی بطخیں تیرتی تھیں۔ جب آسمان پر اندر کی کمان نکلتی اور جوہی کے پھولوں پر بھونرا گنگناتا تو وہ اپنے چھوٹے سے مکان کے برآمدے میں اپنے ساتھی گیت کاروں کے ساتھ بیٹھ کر انندلہری بجاتا۔ آمنہ اپنے لوچدار جسم پر تیز جامنی یا تیز سبز رنگ کی ساری لپیٹے پیتل کا گھڑا کمر پر سنبھالے تالاب کی اور جاتی نظر آتی۔

دن گزرتے گئے۔ دکھی بنگال نے، جس کے سلاطین ہمیشہ آپس میں کٹتے مرتے رہتے تھے، اب چند دنوں سے چین کا سانس لیا تھا۔ گوڑ کے تخت پر سید السادات علاء الدین ابوالمظفر حسین شاہ براجمان تھا۔ وسط ایشیا کے شہر ترمذ سے آئے ہوئے خاندان کا یہ غریب سید، جو سلطان ابن سلطان نہیں تھا اور جس کی شرافت اور قابلیت کی بنا پر عوام نے اسے خود منتخب کر کے اپنا بادشاہ بنایا تھا، اس کے عہد میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں۔ قتل و غارت کے بازار سرد ہو چکے تھے، ایک نئی زبان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ بنگال کا یہ عظیم ترین مسلمان بادشاہ جس کے دور میں ودیاپتی ٹھاکر اور مہاپربھو چیتن سری کرشن کے عشق کے سریلے نغمے الاپ رہے تھے۔ راج محل کی پہاڑیوں سے پتھر بہا بہا کر گوڑ لائے جا رہے تھے اور نئی

نئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کی جارہی تھیں۔ دربار میں علمی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔

کئی برس بیت گئے۔ کمال کے بچے جوان ہو چکے تھے، اس نے اپنے لڑکوں کے نام جمال اور جلال رکھے تھے، اس کی لڑکی کا نام سکینہ بی بی تھا، وہ اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کے دونوں لڑکے ماہر تعمیرات تھے اور گوڑ اور سنار گاؤں میں عمارتیں بنوانے میں مصروف تھے۔ گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد اور گن منت مسجد کا نقشہ جمال نے تیار کیا تھا۔ جمال گوڑ کا میر عمارت تھا۔ بڑا سونا مسجد کی سبز اور نیلی اور سفید اور زرد اور نارنجی پچی کاری میں بنگال کے سارے رنگ سمیٹ لیے گئے۔ ان کے ستون، ان کی محرابیں اور گنبد خالص دیسی تھے۔ یہ عمارتیں بھی پال اور سین عہد کی تعمیرات کی روایت میں شامل ہو گئیں۔ یہ بنگالی طرز تعمیر تھا۔ کمال کی لڑکی کی شادی بردوان کے مرشد زادوں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے آمنہ کو اپنے ہاتھوں سے اسی تالاب کے کنارے دفن کیا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اب بھی وہ دن بھر برآمدے میں بیٹھا مرشدی اور معرفتی نغمے لکھتا اور گاتا، اس کے بیٹے گوڑ سے اپنے گاؤں واپس آتے اور اسے ملک کی سیاست کی خبریں سنایا کرتے، لیکن یہ خبریں اب ایس بالکل کسی دوسرے سیارے کی باتیں معلوم ہوتیں۔

کیونکہ بغداد کا ابوالمنصور کمال الدین، جو پچاس سال ادھر عراق سے ہند آیا تھا، کوئی دوسرا انسان تھا۔ یہ کوئی مختلف انسان تھا جو بالوں کی لٹیں اور داڑھی بڑھائے چارخانہ تہمد باندھے ہاتھ میں ایک تارہ لئے ویشنو نغمہ الاپ رہا تھا۔

ابوالمنصور کمال الدین بنگالے کا باشندہ تھا۔ بنگالی تھا، چنانچہ جب دور پچھم دلی میں ایک بار پھر سلطنت بدلی اور سلطان ابراہیم ہارا اور ترچھی آنکھوں والا منگول ظہیر الدین جیتا اور دنیا کا بوجھ سہارنے والی گائے نے اپنا سینگ تبدیل کیا تو اپنے بڑے لڑے جمال سے یہ سارے سنسنی خیز واقعات سن کر اس نے ذرا سی بھی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس کے بیٹے جلال نے اس سے کہا کہ وہ مغلوں کے لئے عمارتیں بنانے دلی جا رہا ہے تب بھی وہ خاموش رہا، اس نے ساری دنیا گھوم کر اپنی منزل تلاش کی تھی۔ اب دنیا اس کے بیٹوں کے سامنے پھیلی تھی، وہ بھی اپنی منزلیں خود تلاش کریں گے۔

مگر اب امن کے دن ختم ہونے والے تھے۔ بنگالے پر سید علاءالدین حسین شاہ کے بیٹے ناصر الدین نصرت شاہ کی حکومت تھی۔ مغلوں سے ہارنے کے بعد دلی کے افغان، جو کل حکمرانی کرتے تھے، آج پناہ گزینوں کی حیثیت سے گوڑ اور لکھنوتی کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مرتبہ جونپور کے حکمران انہی افغانوں سے مار کھا کے یہاں پناہ لینے آئے تھے۔ یہ افغان کمال کو ہر جگہ ملتے اور گوڑ کے بازاروں میں راستہ چلتے چلتے لوگوں کو روک روک کر انہیں اپنی گزشتہ عظمت اور جاہ وجلال کے قصے سناتے۔ گوڑ کی گلیوں ہی میں کمال نے ایک روز ایک پرتگالی دیکھا جو اکڑتا ہوا ایک سمت کو چلا جا رہا تھا۔ کمال اپنی لاٹھی کے سہارے کھڑا اچنبھے سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے برسوں پہلے کا وہ اندھا برہمن یاد آیا جو ان سے ہارنے کے بعد کوچین سے کاشی آیا تھا۔ اس وقت پرتگالیوں کا جہازی بیڑا چاٹگام کی بندرگاہ میں موجود تھا اور وہ لوگ گوڑ میں بھی

دندنا رہے تھے۔

وقت تیزی سے نکلتا گیا۔ گوڑ کے سیاسی حالات بگڑنا شروع ہوئے۔ اب وہاں ناصرالدین کا بھائی غیاث الدین راج گدی پر بیٹھا تھا۔

ایک روز کمال نے خبر سنی کہ بہار کے شیر خان نے غیاث الدین سے بنگالے کا تخت چھین لیا، پھر معلوم ہوا کہ دلی کے شہنشاہ ہمایوں اور شیر خان میں گھمسان کا رن پڑا اور ایک روز چند باولوں نے آ کر کمال کو بتایا کہ مغل بادشاہ دھوم مچاتا گوڑ میں داخل ہو چکا ہے اور اسی کے نام کا سکہ ٹکسال میں گھڑا جا رہا ہے۔ دور دراز ترکستان سے آئے ہوئے تاتاری پر بنگال نے ایسا جادو کر دیا کہ اس نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھا ہے، یہ سب خبریں کمال کو بڑی عجیب بچپنے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہتیں بدلتی ہیں تو جگہوں اور انسانوں کے نام بھی بدل دیے جاتے ہیں۔ انسان اپنے اقتدار کا سکہ جمانے کا کس قدر شوقین ہے؟ ہرے بھرے بنگال کی بدامنی بڑھتی گئی۔ شیر خان پھر گرجتا ہوا آیا اور دلی کے مغل کو واپس دلی بھگا کر دوبارہ بنگال پر قابض ہو گیا۔ ملک سہا ہوا تھا۔ ہمایوں اور شیر شاہ میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ اسی لڑائی میں جمال گوڑ کی گلیوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ایک رات شیر خان کے سپاہیوں نے اس گاؤں کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں کمال کی جھونپڑی تھی۔ سپاہی لوٹ مار مچاتے اس کے گھر تک آن پہنچے، باہر نکلو، وہ چلا رہے تھے۔ تم سب سے بڑے فسادی ہو، تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، تمہارے بیٹے دلی جا کر مغلوں سے مل گئے ہیں۔ تم غدار ہو، تم کو تو ہم جان سے مار دیں گے، تم کو گوڑ لے جا کر قید خانے میں ڈال دیں گے۔ ارے وہ گیت بنانے والا ابوالمنصور یہیں رہتا ہے نا۔

باہر نکل او بڈھے، اندر کس سازش میں لگا ہے۔ کمال کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چراغ اٹھا کر دروازے تک آیا اور حیرت سے سپاہی کو دیکھنے لگا، وہ غل مچاتے اس کی اور بڑھے، کمال مضبوطی سے دروازے کی چوکھٹ تھام کران کے سامنے ڈٹ گیا، وہ بہت بوڑھا پھونس ہو چکا تھا اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر وہ جم کر کھڑا رہا۔ اس کے پاس اپنی مدافعت کے لئے تلوار بھی نہیں تھی، وہ گوڑ لے جایا جائے گا؟ اس نے کس کا قصور کیا ہے؟ اسے افغانوں اور مغلوں کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے امن سے رہنے دیا جائے۔ یہ اس کا ملک ہے۔ اس کا وطن! یہاں اس کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی بی بی کی قبر ہے، یہاں اس کے دھان کے ہرے کھیت ہیں، اس نے اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ اس نے گیت بنائے ہیں، وہ یہیں رہے گا۔ اسے غدار کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہ دار الحرب نہیں ہے دار السلام ہے۔ اس لمحے اسے انکشاف ہوا دار الحرب اور دار السلام میں کوئی فرق نہیں، صرف رویے کا فرق ہے، لڑائیاں دو مذہبوں کے درمیان نہیں ہوتیں دو سیاسی طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔

سہسرام کا شیر خاں اور دلی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔ دار السلام بھی دار الحرب بن سکتا ہے اگر اس میں شر کا وجود ہو۔

شیر خاں کی فوج کے اجڈ سپاہی یہ سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے زور سے کمال کو دھکا دے کر گرایا اور بلڑ مچاتے آگے بڑھ گئے۔

کمال اپنے گھر کی دہلیز پر اوندھے منہ گرا، اس کے منہ سے خون کی ندی بہہ گئی

اور چند گھنٹے تک سسکتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح پڑا پڑا خاموشی سے ختم ہو گیا۔

ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے، پرانا نظام بدل چکا ہے۔ گوڑ اور لکھنوَتی اور پٹنہ اب خواب و خیال ہوئے۔ ترکوں کی دلی کا بھی خاتمہ ہوا۔ دلی اب مغلوں کی ہے۔

لیکن وہ کسان موجود ہے، وہ جو گھٹنوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بو رہا ہے، وہ جو بیلوں کی جوڑی ہنکاتا میگھنا کے کنارے کنارے جا رہا ہے، وہ بھاگرتی کی سطح پر کشتی کھیتا اور گیت گاتا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی سمت رواں ہے، وہ مرشدوں اور بھگتوں کے قدموں میں بیٹھا کیرتن اور معرفتی نغمے الاپ رہا ہے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین زندہ ہے اور زندہ رہے گا، وہ تو اپنے چھوٹے سے نوکے میں بیٹھا پدما کی تند رو موجوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ نوکا پدما کی لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب ناکے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر پدما کے اس بوڑھے فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے سے عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت اور خطروں سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ''پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے؟'' اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ تو معمولی سی ہوا ہے، پریشان مت ہو۔'' پیٹر نے جواب دیا۔ ''مگر

ذرا اس کالے سؤر سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا الاپنے کے بجائے چپّو کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔"

"سو رہا ہے کیا بوڑھا کتا۔" سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ چپّو چلانے میں مصروف رہا۔ "یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ جب تک ہنٹر نہ لگاؤ ان میں چستی نہیں آتی۔" پیٹر نے کہا۔ سرل نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چھوئی۔

"او آدمی۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"ابوالمنشور۔۔۔ صاحب۔"

"ابوالمنشور۔۔۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو تم ذرا زیادہ طاقت سے چپّو چلاؤ۔۔ سمجھے۔"

"جی صاحب۔" وہ پھر چپّو پر جھک گیا، نوکا چلا کیا۔ کنارے پر دونوں طرف اناناس اور کیلے کے جھنڈ تھے۔ دور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کی چھت کے اندر جھانکا جہاں ابوالمنشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جا نماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو پدما کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھایا ہے۔ اس عجیب وغریب ملک میں جسے "بنگال" کہتے

ہیں۔جسے ''انڈیا'' کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے چاروں اور نظر ڈالی۔روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔برابر سے ایک بڑا اشمپان گزر گیا۔چاند بہت دور بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

۲۶

جب سرل ہاورڈ ایشلے نے کوئنز کالج کیمبرج سے بی۔اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی،اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آ کر اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہو کر دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے۔اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا یہیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا، وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاؤنڈ کا نفع ہوا۔نیٹو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ان کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو، اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

میں وہاں سونے کے محل کھڑے کرلو گے۔۔۔کیا کہا؟ تم شاعری کرنا چاہتے ہو۔ ڈرامے لکھا کرو گے؟ وکالت بڑا نوبل پیشہ ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔ چند روز بعد پیٹر اسے سٹی میں اپنے چچا کے پاس لے گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ڈائریکٹر تھا۔

سرل کو کلکتے میں ملازمت مل گئی۔ ایک روز وہ ٹل بری سے ایک انڈیا مین پر بیٹھا اور ڈوور کی سفید چٹانیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ انگلستان چھوڑ رہا ہے۔ انگلستان جہاں کینٹ میں اس کا قصبہ ہے اور جہاں کیم بہتا ہے اور جہاں گولڈ اسمتھ اور کوپر اور گرے اور برک نے جنم لیا تھا، جہاں ہوگارتھ اور گینز برو اور رینالڈز نے تصویریں بنائی تھیں۔ ٹرنر کے سورج کی روشنی میں ڈوبے ہوئے مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے اور لندن کی گلیوں میں سودا بیچنے والیوں کی آوازیں اور قصباتی گرجا گھروں کے گھنٹوں کی صدائیں اور بلند و بالا جارجین محلات میں سے بلند ہونے والی چیمبر موسیقی مدھم ہوئی۔ انگلستان جہاں سکون تھا اور مکمل حسن۔ بنگال اور کینیڈا اور جنوبی امریکہ سے آئی ہوئی دولت نے ملک کو مالا مال کر دیا تھا۔ نت نئے فیشن ایجاد ہو رہے تھے، اونچے اونچے قصر تعمیر کیے جا رہے تھے، باغات سجائے گئے تھے، غریب امیر ہو چکے تھے، امیر ہیرے موتی رولتے تھے، ہر طرف صرف ایک چرچا تھا۔ دولت۔ دولت۔ سرل جو ادب کا اسکالر تھا، جسے دولت سے غرض نہیں تھی، وہ بھی اسی دھن میں جا رہا تھا، وہ مفلس طالب علم بنگال پہنچ کر امیر ہو جائے گا۔ لندن میں اس کا بھی ایک محل ہوگا، یا کون جانے شاید وہ کسی وحشی ہندوستانی سردار سے

جنگ کرتا ہوا مارا جائے اور مدراس یا میسور میں اس کی گمنام قبر بنے۔

اس نے ایک پھریری لی اور ڈیک سے ہٹ آیا۔ سمندر بہت بھیانک تھا۔ دنیا میں اس وقت کیا کیا ہو رہا تھا اور وہ دراصل خود کتنا حقیر تھا۔ اس جہاز پر کیسے کیسے لوگ سوار تھے اور کیسے کیسے ارادے اور تمنائیں لیے اس اندھیرے میں ایک منزل کی سمت رواں تھے۔ ان سب کا حشر کیا ہوگا؟ کمپنی کے تاجر، کلکتہ کونسل کے وہ ممبر جو رخصت کے بعد واپس جا رہے تھے، مدراس کا چیف جسٹس، اعلیٰ خاندانوں کی چند بن بیاہی لڑکیاں جو حسب معمول اس امید میں ہندوستان جا رہی تھیں کہ وہاں ان کی شادیاں ہو جائیں گی، جہاز کا کپتان حیدر علی کے معرکے کے قصے سنا رہا تھا، پٹنے اور ڈھاکے کے نیل کے تاجر ہر وقت اپنی کاروباری باتوں میں مگن رہتے اور سب کے سب متواتر مدیرا پیتے۔ کوئنز کالج کیمرج کے خاموش کواڈرینگل سے نکلنے کے بعد سرل نے دیکھا دنیا دراصل یہ تھی۔

پھر جہاز جنوبی افریقہ کے ساحلوں سے پاس سے گزرتا ہندوستان کے قریب تر ہو گیا۔ راس امید تک پہنچتے پہنچتے سرل نے اندازہ لگایا کہ ایک بن بیاہی اعلیٰ خاندان کی لڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے، وہ ان سب میں معمولی شکل کی تھی اور کسی فوجی کپتان سے شادی کرنے جا رہی تھی جو فورٹ جارج میں تعینات تھا، مگر وہ سرل کی صورت پر ریجھ گئی، پھر اس نے جہاز کے کپتان اور دوسرے ساتھیوں سے سرل کے مالی حالات کا پتا لگایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی بہت غریب ہے اور کمپنی میں فیکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر جا رہا ہے اور لڑکیوں کے بجائے فی الحال کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کے بعد مس ازابیل نے شورے کے ایک

موٹے تاجر سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب نہ ہوتا تو مہینوں کا سفر اجیرن ہو جاتا۔

دنیا بدلتی جا رہی تھی، وہ سکون، جس میں ڈوبا ہوا انگلستان وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا تھا، زیادہ دن اس حالت میں نہیں رہے گا۔ نئے نئے کارخانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے اس کے وطن کے پھولوں کی رنگت بدل دی تھی۔

پھول، بہاریں، پیرس، ہائے پیرس، وائے۔۔۔ سرل نے ایک گہری سانس لی۔ پیرس بھی تو ابھی ابھی خون میں نہایا تھا۔ انقلاب۔۔۔؟

روسو۔ والیٹر۔ آزادی۔؟

امریکہ کی جنگ آزادی۔؟

جہاز اب مڈغاسکر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق تھا۔ حبشی غلاموں کا وطن اور مشرق سرل کا منتظر تھا۔ چین اور ہندوستان اور ایران اور مصر سب چلا چلا کر اسے پکار رہے تھے، او بھائی سرل آؤ ہم نے تمہارے سواگت کے لیے ساری تیاریاں کر رکھی ہیں۔ انجیلیں لے کر اور بندوقیں اور تلواریں لے کر آؤ اور آ کر ہماری کھال اتار لو۔ کانپور اور ڈھاکے کے پرانے پاپیوں نے اسے بتانا شروع کیا: سمجھ سے کام لو تو چند سال میں لکھ پتی بن جاؤ گے۔

''یہ سراج الدولہ کون تھا۔'' سرل نے پیٹر جیکسن نے پوچھا۔

''سراج الدولہ'' پیٹر نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''میں تم کو اس کا سارا واقعہ تفصیل سے سناؤں گا۔ میں قاسم بازار میں رہ چکا ہوں، بڑا سخت بیہودہ تھا۔ ظالم، مکار، مگر ہمارے وفادار دوست بھی ہیں۔ مثلاً اودھ کا موجودہ نواب۔

"وہ کون ہے؟"

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں، پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دو سو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہر حال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ "نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فلانا اور ڈھماکا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔" پیٹر نے بات ختم کی۔

سامنے بمبئی کا ساحل نظر آ رہا تھا۔

ہندوستان۔۔۔!!

جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ مسافر اتر کر ساحل پر آ گئے۔ ڈیڑھ سو سال قبل تک سورت کی بندرگاہ پر مغل کسٹم افسر یورپیوں کا ناطقہ بند کر دیا کرتے تھے مگر اب اپنی حکومت تھی۔ سرل کے سارے ساتھی ٹھاٹھ سے سیٹی بجاتے جہاز سے اترے اور بہت سے سیاہ فام انسانوں نے آ کر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دوڑ دوڑ کر ان کا اسباب اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی پالکی پیٹر کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تی۔ سرل اس کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر مالابار ہل کی طرف چلا۔

سڑک کے دونوں طرف دولت مند پارسیوں کے مکان تھے، جن کی عورتیں لکڑی کی بالکنیوں میں سے جھانک رہی تھیں اور نیچے بچے کھیل رہے تھے۔ مضبوط جسموں والی مراٹھی عورتیں تیز رنگوں کی ساریاں پہنے ساحل کی ریت پر چل رہی تھیں۔ مالابار ہل پر پھول کھلے تھے۔ بارش ابھی ہو کر تھمی تھی۔ انگریزوں کی کوٹھیوں کی کھپریل کی چھتوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں کھلی تھیں اور کیلے اور ناریل کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پیٹر اور سرل کا میزبان پھاٹک تک ان کا استقبال کرنے کے آیا۔ پھر انھوں نے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں بیٹھ کر چاء پی۔ گوانیز خانساماں جو اپنے آپ کو پرتگالی کہتا تھا لپک لپک کر مہمانوں کی خاطریں کرتا رہا، پھر بے ہنگم سا سایہ پہنے میری باہر آئی جو صاحب خانہ کے بچوں کی کھلائی تھی۔

میری پہلی یوریشین لڑکی تھی جو سرل نے دیکھی۔ سرل اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ کونے میں حبشی لڑکا لپا جھپ اس کے

جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ یہ لڑکا دوسرے غلاموں کے ساتھ ڈغاسکر سے درآمد کیا گیا تھا اور جتنی دیر وہ کمرے میں رہا۔ سرل کو بڑی وحشت محسوس ہوتی رہی مگر بہرحال یہ مشرق تھا۔ شام کو وہ سب ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اردشیر، صاحب خانہ کے پارسی کوچمین نے جھک کر مودبانہ لہجے میں پوچھا: ''کس طرف؟''

''چرچ گیٹ چلو'' پھر میزبان نے سرل سے کہا، ''نوجوان لڑکے ہمارا شہر تمہارے شاندار کلکتے کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں تم جارہے ہو مگر بمبئی کی بھی کیا بات ہے۔'' اپالو سے لے کر چرچ گیٹ تک گھاس کے سرسبز قطعے تھے اور ناریل کے گھنے جھرمٹوں کے درمیان پانی کی جھیلیں جگمگا رہی تھیں۔ دور کولابا کے لائٹ ہاؤس میں روشنی چمک رہی تھی۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی، اس رات میزبان کے یہاں کھانے پر سرل کو دو پارسیوں سے ملوایا گیا۔ یہ دونوں جہاز سازی کے کارخانے کے مالک تھے اور فرفر انگریزی بول رہے تھے۔ کس قدر بھانت بھانت کے باشندے اس ملک میں ہیں۔ سرل نے حیرت سے پوچھا۔

چند روز بعد وہ پیٹر جیکسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے لیے سورت گیا۔ مغربی گھاٹ کا خوبصورت علاقہ اور کلیان اور ناسک کا حسن اور سرسبز پہاڑی راستے جن پر نیلا کہرہ چھایا ہوتا اور تاپتی کے کنارے۔ مہا گجرات دیش کے سبزہ زاروں پر سورت بسا ہوا تھا۔ سورت۔۔۔ مغلوں کی بندرگاہ سو سال پہلے جس کی آبادی لندن اور پیرس سے زیادہ تھی اور جس کے باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور جہاں رنگین چنریاں اوڑھے لڑکیاں کاشی کے آگے دیے جلانے کے بعد گربا ناچتی

تھیں۔

بمبئی لوٹ کر آنے کے بعد سرل دوسرے جہاز کا منتظر رہا جو اسے مدراس اور کلکتے لے جائے۔ پیٹر جیکسن فی الحال یہیں ٹھہر رہا تھا، اب سرل کو تنہا سفر کرنا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک حد تک عادی ہو چکا تھا۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب نئی نئی دنیائیں اس کی نظروں کے سامنے جھلملا رہی تھیں۔ ناریل کے جھنڈوں میں چھپی ہوئی مسجدیں اور مندر۔ برہمنوں اور مسلمانوں کی آبادیاں۔ سنہرا شہر گوا ولندیزوں کا سرنگا پٹم جس کی عمارتوں کو دیکھ کر اسے ایک لمحے کے لیے ایمسٹرڈم کی یاد آئی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ یورپ۔۔ یورپ۔۔ کس قدر دور رہ گیا تھا۔ پانڈی چری میں کئی فرانسیسی جہاز پر آئے، وہ دوسرے جہاز سے فرانس جا رہے تھے، ان میں تین راہبات تھیں اور ایک سوربون کا طالب علم۔۔۔ وہ فوراً سرل سے گھل مل گیا۔ وہ ماں باپ سے ملنے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا، وہ جلدی جلدی کندھے اچکا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ پیرس کی باتیں۔ یونیورسٹی کی اور انقلاب کی باتیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ فرانس زندہ باد، وہ اسی طرح جوش سے بچوں کی طرح نعرے لگاتا اتر کر کشتی میں بیٹھ گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جانے اس کا کیا نام تھا اور اس میدان رستاخیز میں اس کا کیا حشر ہو گا، ہر طرف خونریزی تھی اور جنگیں۔ بنگال میں جنوب میں، یورپ میں نپولین نے اودھم مچا رکھی تھی۔ سارا یورپ جل رہا ہے اور کئی مرتبہ اور جلے گا اور اس ہنگامے میں کیمرج اور سوربون کے طالب علم آندھی کے پتوں کی

طرح کھو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

اور وہ، سرل ہاورڈ ایشلے، خلیج بنگال کے پانیوں پر محوسفر ہے اور ہر طرف موت دانت نکوسے کھڑی ہے۔ سامنے میسوری ہیں اور مرہٹے۔ شمال میں چڑھی ہوئی داڑھیوں اور گھیر دار شلواروں والے افغان اور سکھ تلواریں چمکا رہے ہیں اور چاروں کھونٹ وحشت ہے اور تباہی اور دلی میں دکھ ہے۔ فیض آباد میں دکھ ہے۔ مرشد آباد میں دکھ ہے، یہ سب سرل کو نہیں معلوم، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دلی میں شاہ عالمگیر ثانی اس وقت چندا بائی کا رقص دیکھنے کے بعد استاد تان رس کان سے خیال چندر کونس بلمپت میں سننے میں مصروف ہیں۔ پھر مدراس نظر آیا۔ فورٹ سینٹ جارج۔ اور شہر کے مکانات جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بندرگاہ میں ملیح پرسکون شکلوں والے ہندو سوداگر جہاز پر آئے۔ دوباشوں نے اسے گھیر لیا۔۔ سب مصر تھے کہ وہ انہیں اپنا گماشتہ بنائے۔ لندن اور بمبئی میں دوستوں نے مدراس کے گورنر اور اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملنے کے لئے جو تعارفی خط دے دیے تھے ان کو جیب میں ٹٹولنے کے بعد ذرا گھبراہٹ کے ساتھ سرل جہاز سے اترا۔ یہاں پیٹر جیکسن اس کی رہنمائی کے لیے موجود نہ تھا۔

مدراس میں جہاز پانچ چھ دن ٹھہرا۔ اس نے والا جاہ نواب ارکاٹ کا محل دیکھا۔ مندروں اور قلعوں کی سیر کی۔ سینٹ طامس روڈ کی انگریزی کی دکانوں پر نظر ڈالی، ایک روز وہ ٹہلتا ٹہلتا یوریشین آبادی کی سمت نکل گیا۔

یہاں اسے ایک مکان کی سیڑھیوں پر ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ دوغلی نسل کی حسین لڑکی۔۔ وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ ایک سیاہ فام

عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر نکلی اور دہلیز پر بیٹھ کر دال چاول بیننے لگی۔ سرل کو دیکھ کر تین چار بچے باہر آ گئے، پھر ان کا باپ برآمد ہوا جو ایک بے حد مفلس یوریشین معلوم ہوتا تھا۔ سرل ان کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ''اندر آؤ گے؟'' ایک بچے نے پوچھا، وہ سب متحیر تھے کہ انگریز صاحب ان کے محلے کی طرف کیسے آن نکلا۔ سرل کی قوم انگلستان میں طبقاتی کاسٹ سسٹم کی شدت سے قائل تھی۔ ہند میں انہوں نے سیاہ اور سفید کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی تھی۔ مدراس بلیک ٹاؤن، یوریشین ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن میں بٹا ہوا تھا۔ سرل نے کیمرج میں رہ کر اٹھارویں صدی کی لبرل ازم کا بڑا پرچار کیا تھا مگر کالے اور گورے کی تقسیم اس کی سمجھ میں آتی تھی، اب اس نے دیکھا کہ ہند میں رہنے والے گورے کالوں کی چھوت لگ جانے کے بعد اپنے درجے سے گر چکے تھے۔ یہ یوریشین وائٹ ٹاؤن کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے، وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہ لڑکی اسے دوبارہ نظر آئی، وہ اپنے گھر کی باڑ پھلانگ کر آگے آگے جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے سرل کو پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ بخدا یہ یوریشین لڑکی بے حد حسین تھی۔ ان بھورے بالوں والی سفید فام انگریز امیر زادیوں سے کہیں زیادہ دلکش جو گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو پولکا ناچتی تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں مرہٹہ اور گجراتی اور مالاباری عورتوں کی ایسی تھی۔ سیاہ، اور باحیا اور رسیلی اور خوفزدہ سی۔ اسے یہ لڑکی بے حد اچھی لگی۔ ''ذرا بات سننا'' اس نے جلدی جلدی قدم بڑھا کر اسے جا لیا۔

''تم یہیں رہتی ہو؟'' اس نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

''ہاں، تم نے ابھی میرا مکان دیکھا تو ہے۔ تم کلکتے سے آئے ہو؟''

''نہیں، کلکتے جا رہا ہوں۔ لندن سے چلا تھا، یہاں بمبئی سے آ رہا ہوں۔''

''بہت سفر کرتے ہو۔''

''ہاں۔ اور ابھی بہت سفر کرنا ہے، تم یہاں کب سے رہتی ہو؟''

''ہمیشہ سے۔''

''ہمیشہ سے۔''

''مگر تم تو عیسائی ہو۔''

''ہاں۔ کیا ہندوستانی عیسائی نہیں ہو سکتے؟'' پھر وہ ذرا ٹھٹکی۔ ''میرا دادا انگریز تھا۔ بالکل تمہاری طرح کا، میری ماں ہندوستانی ہے۔''

وہ گڑبڑا گیا۔ پیٹر جیکسن نے اسے جہاز پر نصیحت کی تھی کہ یوریشین قوم سے میل جول بالکل نہ بڑھانا۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہم وطنوں نے یہاں آن کر کالی عورتوں سے اتنی شادیاں کیں اور تعلقات قائم کیے کہ لے کے پوری نسل کو سیاہ فام بنا دیا۔ تمہارا باپ زندہ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ سرل نے پوچھا۔

''وہ کیا بیٹھا ہے سیڑھیوں پر، تم نے دیکھا نہیں۔ شراب کی دکان کرتا ہے۔''

''آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔'' سرل نے ہمت کر کے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی ذرا جھجکی اور پھر سر پر اپنا سیاہ جالی کا رومال ٹھیک کر کے بنچ کی طرف بڑھی جو سڑک کے کنارے پڑی تھی، یہ راستہ گرجے کو جاتا تھا۔ اس کی کلائیوں میں سبک سی تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔

''تم کیتھولک ہو؟ سرل نے ایسے تجسس سے پہلے کسی سے سوالات نہ کیے

تھے۔

''ہاں''

وہ بڑے باوقار انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پھر دفعتاً جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اسے مخاطب کر کے بولا: ''تم۔تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔میرے ساتھ کلکتے چلو۔''

لڑکی نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''اس نے کہا۔

''کیوں نہیں۔''

''میرا باپ مجھے مار نہیں ڈالے گا،تم کیتھولک نہیں ہو اور اونچے طبقے کے انگریز ہو اور آج کے بعد شاید تم مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔تمہاری طرح کے بہت سے سیاح مدراس آتے ہیں۔''اس نے اداسی سے درخت کا پتا توڑا۔

سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدت سے اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔''سنو'' اس نے بڑے جذبے سے کہا۔''سنو'' مگر وہ پھر ہڑبڑا گیا۔اس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

''مجھے ماریا ٹیریزا کہتے ہیں۔''

''ماریا ٹیریزا مجھے تم سے عشق ہے۔''

اس رات وہ گورنمنٹ ہاؤس کی بال میں جانے کی بجائے چپکے سے یوریشین

ٹاؤن بھاگ آیا اور اس کی اگلی رات اور اس کی اگلی رات۔ چوتھے روز صبح جہاز کلکتے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔

سفر کی تیاری کرتے وقت اسے معلوم ہوا کہ یہ کیا زبردست حماقت تھی، وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ اب تک اس نے ماریا سے شادی کے لیے کہا بھی نہیں تھا مگر وہ بیوقوف لڑکی خالص ہندوستانی عورتوں کی مانند شاید دل میں اسے اپنا دیوتا تصور کرنے لگی تھی، جب وہ اسے خدا حافظ کہنے گرجے کے باغ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وہ ایک گٹھڑی کپڑوں کی ہاتھ میں سنبھالے اس کے ہمراہ کلکتے چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اپنی ساری قابلیت اور شاعرانہ انداز بیان اور ڈرامے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ماریا ٹیریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کا ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ وہ جلدی ہی اسے بلوا بھیجے گا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔

اس چھوٹے سے جذباتی ایڈونچر کے بعد سرل پھر اپنی منزل مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ خلیج بنگال کی نیلگوں وسعت میں داخل ہوتے ہوتے وہ اس لڑکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاز اب کلکتے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہوکر جہاز نے لنگر ڈالا اور پائلٹ کے انتظار میں مصروف ہوگیا۔ مسافر عرشے پر نکل آئے۔ سامنے بنگال کا ساحل تھا۔ پائلٹ کے ساتھ جہاز فلطا روانہ ہوا، وہاں مسافر اتر کر کشتیوں میں بیٹھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے ذاتی بجرے آئے ہوئے

تھے۔۔۔سرل اس ہنگامے میں کسی کو نہیں جانتا تھا، وہ جلدی سے کود کر ایک کرائے کی کشتی میں بیٹھ گیا۔ مانجھیوں کی ایک پوری پلٹن نے چپو چلانے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد بندرگاہ کے شوروغل سے نکل کر کشتی پرسکون کھلے پانیوں پر آ گئی۔آس پاس مسافروں سے بھری دوسری کشتیاں چل رہی تھیں۔ پانی کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے۔ دور گھنے جنگلوں میں سے کبھی کبھی شیروں کے گرجنے کی آواز اور گیدڑوں کی صدائیں سنائی دی جاتی تھیں۔ کشتی میں مچھروں نے بھنبھانا شروع کر دیا تھا۔کلکتہ ابھی بہت دور تھا۔محلات کا شہر۔سونے اور چاندی کی بستی۔مشرق کا لندن۔اب رات ہو رہی تھی۔بنگالے کا سحر انگیز چاند پانی کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔مانجھی اپنی زبان میں گا رہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوئی۔

پھر منظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔کشتی گارڈن ریچ پہنچ رہی تھی۔ساحل پر دونوں طرف شاندار مکانات بنے تھے۔دریا کے دائیں کنارے پر کلکتہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔کلکتہ جو اب دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جا رہا تھا، بالآخر اس کے سامنے موجود تھا۔گھاٹ پر بنگالی بنئے مسافروں کی گھات میں موجود تھے۔اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے دوست احباب آئے ہوئے تھے۔جن نوواردوں کے دوست یہاں موجود نہ تھے اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا کر پرتگالی مسافر خانوں کا رخ کر رہے تھے۔گھاٹ کے اس رنگارنگ مجمعے سے باہر نکل کر سرل بھی ایک پالکی میں بیٹھا اور شہر کی گنجان آبادی سے باہر نکل کر پالکی بردار بارک پور کی طرف بڑھنے لگے جہاں سرل کو فی الحال قیام کرنا تھا۔

بارک پور میں انگریزوں کے کنٹری ہاؤس تھے۔ ولندیزیوں کے سیرام پور اور فرانسیسیوں کے چندر نگر تک ان مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے آس پاس سرکاری عمارات تھیں۔ شان دار گورنمنٹ ہاؤس جہاں چند سال پہلے کارنوالس دھوم دھام سے براجتا تھا اور اب جہاں سر جان شور فورٹ ولیم کا گورنر جنرل بننے والا تھا، پھر رائیٹرز بلڈنگ جس میں سرل کا دفتر تھا۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت۔ آس پاس بلیک ٹاؤن تھا۔ جس میں ہندوستانی، پرتگالی، ارمنی، یوریشین اور مفلوک الحال یورپین بستے تھے۔

چورنگی روڈ پر کلاسیکل طرز کی عالی شان عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہال، پیل پائے والے برآمدے، چوڑے زینے، جھلملیوں والے دروازے اور اونچے دریچے۔ دریا کے کنارے کنارے انگریز امراء کے گارڈن ہاؤس تھے، جن کے باغیچوں میں ہندو اور چینی مالی کام میں مصروف تھے۔ کوٹھیوں کے عقب میں شاگرد پیشے تھے۔ جہاں مرغیاں او بطخیں گھوم رہی تھیں۔ تالاب تھے جن میں واٹر کیلی کھلی تھی اور مچھلیاں پلی تھیں۔

چھ مہینے بعد سرل نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اب میں سیٹل ہو چکا ہوں اور خدا کی عنایات کا شکر گزار ہوں، میرا بنگالی گماشتہ اشوتوش ڈے جو فراٹے سے انگریزی بولتا ہے میرے سارے معاملات کا نگران ہے۔ میرے عہدے میں بھی ترقی ہونے والی ہے اور میں مفصل میں نیل کی تجارت شروع کر رہا ہوں، میں نے ایک مسلمان منشی نوکر رکھا ہے۔ جس کا نام ابوالمکارم ہے، وہ مجھے فارسی اور بنگالی پڑھاتا ہے اور میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقہ بردار اس کا پیچوان بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ اور سائیس اور چابک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور نائی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل ایشلے بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جو مڈل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پر ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

صبح سات بجے دربان اس کی کوٹھی کے ہال کا دروازہ کھولتا۔ دھوپ جھلملیوں

سے چھن چھن کر اندر آنے لگتی، تو سرل اپنی مسہری سے اٹھتا۔ اس کے سرکار اور چپراسی کاغذات لے کر فرشی سلام کرتے بیڈ روم میں داخل ہوتے۔ حجام اس کا خط بناتا۔ وگ سر پر جمانے کے بعد واسکٹ پہنتا ہوا وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا جہاں وہ چاء پیتا جاتا اور پیچوان کے کش لگاتا۔ کاروبار اور سرکاری کام کے سلسلے میں جتنے غرض مند صبح صبح سلام کرنے آتے وہ سب میز سے کچھ فاصلے پر مودبانہ کھڑے رہتے۔ سرل بے نیازی سے احکام صادر کرتا۔ دس بجے کے قریب یہ سارا جلوس پالکی کی طرف بڑھتا اور پالکی اس کے دفتر کی طرف روانہ ہوتی۔ چار بجے واپس آ کر سرل کلکتے کے قاعدے کے مطابق شام کے سات آٹھ بجے تک سویا کرتا، اس کے بعد لباس تبدیل کر کے اور بن سنور کے خواتین سے ملنے کے لئے نکل جاتا، سوشل کالز کرتا۔ کورس میں ہواخوری کرتا یا کہیں ڈنر پر چلا جاتا۔ کس قدر مکمل اور فرصت کی زندگی تھی اور اسی آرام اور آسائش کے ساتھ اس کا بنک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ تجارت میں اسے بے اندازہ منافع ہو رہا تھا۔ گورنر جنرل اس سے بے حد خوش تھا۔ افواہ تھی کہ اسے شاید دوامی بندوبست کے انتظام کے سلسلے میں کسی اہم عہدے پر مفصل میں یا لکھنؤ ریذیڈنسی بھیج دیا جائے۔ کلکتے میں وہ ماؤں کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ بال رومز میں اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بن بیاہی امیر زادیاں اکثر سوچتیں کہ وہ کون خوش قسمت لڑکی ہوگی جس سے امیر اور ہینڈسم سرل ایشلے بیاہ کرے گا۔

مگر لیڈی پیملا یا لیڈی سنتھیا کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے اس غیر معمولی ذہن اور دماغ کے مالک سرل ایشلے نے ایک بڑی ہی معمولی اور عامیانہ

حرکت کی یعنی ایسی حرکت جو عام طور پر سبھی دولت مند انگریز کرتے تھے اور جو ہندوستان کے انگریز ''نوابین'' کا عام دستور تھا۔

یعنی سرل ایشلے نے بھی ایک نیٹو عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

انگریز ''نوابوں'' کا انگلستان میں بھی خوب مذاق اڑایا جاتا، وہاں کا جاگیردار طبقہ ان کو اپنے ہم پلہ سمجھنے سے منکر تھا۔ کل کی بات تھی کہ یہ لوگ سٹی میں معمولی تاجر یا گرگے تھے۔ اور نو دولتئے تاجر سے پشتینی زمیندار کی ہمیشہ سے الجھی رہی ہے مگر ہندوستان میں ان لوگوں نے اپنے لیے ایک الف لیلوی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ پٹنہ، ڈھاکہ، قاسم بازار، بالاسور اور ہگلی کے تاجر، مرشد آباد، لکھنو، بنارس، گوالیار اور دلی درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دینے والے ڈپلومیٹ، کلکٹر، جو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ضلعوں میں تعینات تھے۔ فوجی افسر جنہوں نے اودھ میں چھاؤنیاں چھائی تھیں۔ فوجی ایڈونچررز جو ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں اونچی بنے دندنا رہے تھے۔ یہ سب اب سرل کے ساتھی تھے۔ سرل ان کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا تھا۔ پلاسی کے بعد سے لکشمی نے ہندوستانیوں نے روٹھ کر فرنگی کا گھر دیکھ لیا تھا۔ انگریز کے یہاں من برس رہا تھا۔ شہر کی چورنگی میں ان کے ٹاؤن ہاؤس تھے۔ شہر سے باہر بڑے بڑے باغات میں انہوں نے بنگلے بنوا رکھے تھے۔ اودھ اور مرشد آباد کی ریذیڈنسی میں رہنے والے انگریزوں کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ شورے اور نیل کے تاجر کروڑ پتی ہو چکے تھے۔ نوابوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا آدرش تھا۔ حرم، حقہ، شعر و شاعری، ناچ رنگ، مرغ بازی۔۔ یہی مشاغل ان فرنگیوں کے تھے۔۔۔ ہندوستانی نوابوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں

سمجھوتہ کر کے ایک انتہائی مہذب فضاء کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوانی ملنے کے بعد انگریز سویلین بنگال میں منظر عام پر آیا، یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔ کلکٹر کی حیثیت سے اضلاع میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جاگیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی گھل مل چکا تھا۔ پلاسی کے بعد کمپنی کا فیکٹر فقط دولت جمع کر کے وطن واپس جانے کے بجائے اب نواب کہلانے کے خواب دیکھتا تھا اور اردو ادب میں دلچسپی رکھتا تھا اور حرم میں دس دس دیسی عورتیں رکھتا تھا۔

سرل بھی شنیلا کو اپنی کوٹھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔

سیاہ لمبے بالوں اور نشیلی آنکھوں والی شنیلا ڈھاکے کے قریب کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ انگریز نواب اور ہندوستانی نواب نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس سے تہذیب و تمدن وغیرہ کو تو خوب ترقی ہو رہی تھی مگر شنیلا دیبی کا باپ اسی طرح فاقے کر رہا تھا بلکہ اب اس کے فاقوں میں زیادتی ہو گئی تھی کیونکہ ڈھاکے پر اقتصادی تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ شنیلا کی سات بہنیں تھیں جن میں تین بال ودھوا تھیں اور چار کی ابھی شادی نہیں ہو سکی تھی، اس کا ایک بھائی تھا جسے کلکتے کے ایک گودام میں ملازمت مل گئی تو اس نے اپنی بہنوں کو ڈھاکے سے بلوا بھیجا۔ اس گودام کے مالک کا نام سرل صاحب تھا۔

سرل صاحب ابھی لڑکا ہی سا تھا مگر کلکتے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک روز شنیلا پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی کہ سرل صاحب نے کہیں اسے دیکھ لیا۔

سرل صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کافی دل پھینک واقع ہوئے ہیں، گو کلکتے کی مسی بابا لوگ اس سے خفا رہتی تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی میم کیوں نہیں بنالیتا۔ شنیلا کا بھائی اپنی مفلسی سے تنگ آ کر سوچ رہا تھا کہ وہ سیرام پور جا کر عیسائی ہو جائے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اس کو اپنی بہنوں کے بوجھ سے نجات ملے گی۔ مشن والے آپ ہی ان کے شادی بیاہ کی فکر کریں گے، مگر اسی روز سرل صاحب کے سرکار نے آ کر اس سے کہا: ''صاحب نے تمہیں یاد کیا ہے۔'' اور اس کے اگلے روز شنیلا سرل صاحب کی کوٹھی پر پہنچا دی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو افلاس سے نجات ملی۔

ہر معاشرے کی اپنی اقدار بن جاتی ہیں، یہ اس وقت کا عام دستور تھا۔ نسلی تعصب ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا بہت سے انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی بیٹی شہزادی فیض النساء اور کمبلے کی شہزادی ظہور النساء بیگم کی شادیاں انگریزوں سے ہوئی تھیں۔ کلکتے کے جوب چارنوک کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔

سرل صاحب نے شنیلا سے بیاہ نہیں کیا، مگر شنیلا ناخوش نہیں تھی، وہ شان سے کوٹھی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دیسی عورتیں اعلیٰ طبقے کے انگریزوں کے زنان خانے میں براجتی تھیں۔ ان کے بچے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔

مگر سرل کو معلوم تھا کہ اس کی اور شنیلا کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا، وہ مدراس یا

کلکتے کے یتیم خانے میں داخل کر دیے جائیں گے۔ بڑے ہو کر ان کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملیں گی وہ رالف کی طرح کلرکی کریں گے یا کسی رجمنٹ میں شامل ہو کر بینڈ بجاتے مرہٹوں سے لڑنے جایا کریں گے۔ اس کی لڑکی کو کسی انگریز نواب زادی کی آیا بننا پڑے گا یا کسی فوجی افسر کی داشتہ۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ یوریشین طبقہ کس قدر زبردست ٹریجڈی کا حامل ہے، تب اسے خوبصورت ماریا ٹیریزیا دآئی جسے وہ مدراس میں ایسے کمینے پن سے چھوڑ آیا تھا۔

یوریشین طبقے کی بنیاد پرتگالیوں کی آمد کے زمانے سے پڑی تھی، پھر فرنچ اور ولندیزیوں نے آ کر اچھوتوں کو عیسائی کیا، جو شخص بوٹ اور ہیٹ پہن کر بگڑی ہوئی پرتگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں میں نسلی تعصب نہیں تھا۔ ان کی آمد سے اس طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یوریشین بڑے قابل رحم لوگ تھے۔ بے چارے کرانی، جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودر اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرل کو یہ سب سوچ کر جھرجھری سی آئی تو کیا اسے لیڈی سنتھیا سے شادی کر لینا چاہئے، پھر شنیلا اپنی رسیلی آواز میں اسے پکارتی اور وہ ہڑبڑا جاتا اور پالکی میں بیٹھ کر کورس کی طرف نکل جاتا۔ اس کی زندگی بڑی مصروف اور بڑی ہنگامہ خیز گزر رہی تھی۔ گورنر جنرل کے بال اور پبلک بریک فاسٹ، ہیسٹنگ اسٹریٹ اور علی پور کے کانسرٹ اور رقص، گارڈن ریچ کے جشن اور تقریبات، پھر مفصل کے سفر۔ ڈھاکہ، چاٹگام، مرشد آباد، چوبیس پرگنہ، مونگیر۔ سارا بنگال اور سارا بہار اس کے قدموں میں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کے سارے آبی راستے اس کے لیے کھلے تھے۔ نیل کے ان گنت کاشتکاروں کی زندگیوں اور

قسمتوں کا وہ مالک تھا۔ دھالی شری اور ہری منگل اور کرنافلی اور مدھومتی اور شوبنسری کی لہروں پر اس کی کشتیاں نیل کی باربرداری کر رہی تھیں۔ ڈھاکے کے مغلوں کا عظیم الشان ناؤواڑہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی: ''ابولمونشور اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو ذرا طاقت سے چپوار چلاؤ!'' اس نے کہا۔

بوڑھا زیادہ کوشش سے چپوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، کس قدر سخت جان لوگ ہیں، اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑا تھا۔ دریاؤں میں اتنے طوفان آتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں مگر یہ لوگ اسی بے حیائی سے جئے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اس نے گھڑی دیکھی، اب رات کے نو بج رہے تھے، اسے آج ہی رات کو راجہ گریش چندر رائے کی زمینداری پر پہنچنا تھا۔ کلکتے میں حکومت میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ایک دو دن بعد جان شور جانے والے تھے اور نیا گورنر جنرل آ رہا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی جانا تھا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ اس نے پیٹر سے پوچھا۔ پیٹر خراٹے لے رہا تھا۔ سرل نے لالٹین اٹھا کر بنگال گزٹ پر نظر ڈالی۔ کل کا اخبار تھا۔

آٹھ جون ۱۷۹۸ء سرل یک بیک چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے، ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم

توڑ چکی تھی، اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرز دلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹرز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان پلانٹرز کے بھائی بند تھے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین جو دن بھر نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا اس وقت اپنے نئے آقا سرل ہاورڈ ایشلے کو نوکے میں بٹھا کر اس پار لیے جارہا تھا اور چاند پدما کے پانیوں پر اتر آیا تھا اور ہوا میں خنکی آچکی تھی اور اناس اور کیلے کے جھنڈ میں گیدڑ بول رہے تھے۔

کیونکہ رات بہت ہولناک تھی۔

۲۷

کنارے پر آکر رادھے چرن نے لالٹین اونچی کی اور اس کی روشنی کو پانی پر چمکایا۔ دور افق پر سے ایک کشتی سبک روی سے تیرتی ہوئی گھاٹ کی طرف جارہی تھی، انہوں نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور چادر لپیٹ کر وہیں اکڑوں بیٹھ گئے قریب باشا کا جھونپڑا تھا جس میں گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ بانس کے جھنڈ کے نیچے ان کا اپنا چھوٹا سا مکان تھا۔ جس کے دروازے پر چراغ جل رہا تھا۔ سارے میں ایک ہیبت ناک سناٹا تھا جس میں صرف راجہ گریش چندر رائے کے محل کی طرف سے سازوں کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں، سنا تھا وہاں پٹنے اور

لکھنؤ تک کی طوائفیں آئی تھیں۔ راجہ صاحب کو لاٹ صاحب نے خلعت عطا کی تھی، اس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ کلکتے سے صاحب لوگ اس میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ چوپال میں عجیب طرح کی خاموشی طاری تھی۔

''کچھ بات کرو دادا۔'' پرمود نے چلم کی راکھ کریدتے ہوئے اداس آواز میں رادھے چرن سے کہا۔

رادھے چرن خاموشی سے گھاٹ کی اور دیکھتے رہے۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

ایسی ہی راتوں میں گھنگریالے بالوں والے ستیہ پیر ستیہ نرائن (گوڑ کے سلطان علاء الدین حسین شاہ کا صوفی نواسا جو بنگال کے مسلمانوں کے لیے ستیہ پیر اور ہندوؤں کے لیے وشنو کا اوتار ستیہ نرائن بن گیا۔) ماتھے پر صندل کا ٹیکا لگائے ہاتھ میں بانسری لیے نارنجی لباس پہنے اپنی کمر کی زنجیریں جھنجھاتے پدما کے کنارے کنارے جاتے نظر آ جاتے ہیں، اگر مجھے کبھی ستیہ نرائن مل جائیں تو میں ان سے پوچھوں، تو میں ان سے کیا پوچھوں۔۔۔؟ رادھے چرن اکڑوں بیٹھے سوچا کیے۔

بہت سی زنجیروں کے جھنجھنانے کی آواز نے سناٹے کو توڑا۔ رادھے چرن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ستیہ پیر تو نہیں ان کے چند فقیر موجود تھے۔ بانسوں کے جھنڈ سے نمودار ہو کر وہ رادھے چرن کے مکان کی طرف مڑ گئے تھے اور دروازے پر کھڑے حسب معمول صدائیں لگا رہے تھے۔

رادھے چرن نے بڑے کوفت کے ساتھ ان کو دیکھا۔ ستیہ نرائن کے بھکاری

ان کے دوار پر کھڑے تھے اور ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ اچھی فصل کی دیبی لکشمی کے بھجن گانے والے یہ مسلمان فقیر گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے۔ صدیوں سے یہ فقیر اسی طرح گاتے بجاتے آئے تھے۔ گاؤں کی ہندو عورتیں ان کی جھولی میں آٹا اور چاول ڈالتی تھیں اور ان سے دعائیں لیتی تھیں۔ یہ ان کو اچھے شگون کی باتیں بتاتے، سانپ کے کاٹے کا اپنے منتروں سے علاج کرتے، ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں تھی۔ پچھلے سال انہوں نے شنیلا کے لیے کہا تھا، جب وہ دکھشنا دینے باہر آئی تھی، کہ یہ بیٹی پدمنی ہے، پھر انہوں نے پدمنی کی ساری نشانیاں شنیلا کی ماں کو بتلائی تھیں۔ پدمنی جو چڑیوں کے جگنے سے پہلے جگتی ہے۔ شام پڑے گھر میں چراغ جلاتی ہے، اپنے شوہر کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہے۔ بیٹی بڑے نصیبوں والی ہے، انہوں نے بشارت دی تھی۔

ان کی آواز سن کر شنیلا کی ماں دہلیز پر آئی، اس کے مٹکے خالی پڑے تھے۔ فقیروں کو دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ یہ ستیہ پیر اور مانک پیر اور لکشمی اور چنڈی ان سب دیبی دیوتاؤں کی قوم پر اسے بڑا غصہ آیا، یہ سب دھوکے باز ہیں، سارے دیبی دیوتا۔ اس نے ساری کے آنچل سے آنسو خشک کرنا چاہے اور چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی، وہ حسب معمول سیتلا اور چنڈی اور شیوا کا جاپ کیا کیے "شنیلا کہاں ہے۔" بالآخر ان میں ایک نے پوچھا۔

"کلکتے۔" رادھے چرن کی بی بی نے کہا۔

"وہاں کیا کر رہی ہے؟"

"اس کا۔۔۔۔ اس کا بیاہ ہو گیا" اس نے آہستہ سے جواب دیا، اس

نے یہ نہیں بتایا کہ شنیلا کو پردے سے نکلنا پڑا اور وہ ایک فرنگی کی کوٹھ میں رہ رہی ہے۔ مسلمان فقیروں نے آشیرباد دی۔ ''میں نے اس کا ماتھا دیکھ کر بتایا تھا سبھا گن لکشمی ہے۔ پدمنی، ہمارا داماد کیا کرتا ہے۔۔۔۔؟''

''کلکتے میں کام کرتا ہے۔''

''اچھا۔'' فقیروں نے اطمینان سے مزید دعائیں دیں اور واپس مڑنے لگے، اب ان کو ہر گھر سے یہی سننے کو ملتا تھا۔ ہمارے پاس دان کے لیے کچھ نہیں۔ ان کو اس قحط سالی کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے کال کو پڑے تقریباً تیس سال گزر چکے تھے جب سنا تھا کہ فرنگیوں کی راجدھانی کلکتے کی سڑکیں فاقے سے مرتے ہوئے انسانوں کی لاشوں سے پٹ گئی تھیں، مگر اب کلکتے کی سڑکیں دور دور تک پھیل چکی تھیں، اب گاؤں گاؤں لوگ مر رہے تھے۔

''ٹھہرو۔۔۔۔'' شنیلا کی ماں نے کہا۔ ''میں نے پرفلا کو ہاٹ بھیجا تھا۔ شاید وہ کچھ لے آیا ہو۔''

مگر فقیر دعاؤں کی بوچھاڑ کرتے اداس قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔ شنیلا کی ماں اپنے بھانجے کا انتظار کرتی رہی۔

مگر وہ ہاٹ سے گھر لوٹنے کے بجائے سامنے چوپال میں جا بیٹھا تھا، اس کے سارے ساتھی منہ لٹکائے بیٹھے تھے، وہ تین دن سے تیل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تیل سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ نمک عنقا تھا، چاول کی وہ صورت کو ترس گیا تھا۔ چھالیا اور تمباکو اور چاول اور نمک اور ہر شے کی تجارت پر کمپنی بہادر کے فرنگیوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ دریاؤں پر ان کی کشتیاں مال سے لدی ہوئی چل رہی

تھیں مگر بازار میں قیمتیں آسمان تک پہنچ چکی تھیں۔ چوپال میں سات آٹھ آدمی اور آن کر بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں: ''اوجیت دادا تم بھی ڈھاکے سے آ رہے ہو؟'' پرمودر نے پوچھا۔ ''ہاں میں بھی اور دلیپ بھی اور سب۔ اب وہاں کھانے کو نہیں ملتا، سارے کرگھے ٹوٹ گئے، اب ہم بھی ہل چلائیں گے۔ تمہارے راجہ صاحب ہمیں زمین جوتنے دیں گے؟'' اوجیت نے کہا۔

''پتا نہیں۔'' پرمودر نے اکتا کر جواب دیا، وہ یہ سب سوچتے سوچتے عاجز آ گیا تھا مگر اس کا دماغ اب کام نہ کرتا تھا۔ لوگ جوق در جوق دیہات کا رخ کر رہے تھے۔ زرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جہاں پیداوار کم تھی، لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا زمانے پلٹتے دیکھے۔ رادھے چرن نے چوپال کے ہجوم پر نظر ڈال کر سوچا۔ کارنوالس کے نئے قانون نے بالکل ہی کمر توڑ دی تھی۔ تین چار نوجوان لڑکے ان کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔

''دادا تمہاری نوابی میں بھی ایسا ہوتا تھا'' اشوتوش نے سوال کیا۔

''کیا؟'' رادھے چرن نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''یہی سب مہنگائی۔۔۔۔اور کال۔۔۔دنگا فساد۔''

لمبی سفید بکرے کی ایسی داڑھیوں والے دو ہندو بوڑھے ناریل کرید کر لڑکوں کو دھندلی آنکھوں سے دیکھا کیے، یہ دونوں بکسر میں لڑے تھے۔ گاؤں ان

پرانے وقتوں کے بڈھوں ٹھڈوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مغلوں اور نوابوں کے زمانوں کے گن گاتے تھے اور روتے تھے۔

''وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہماری عورتوں کو پردے سے نکلنا پڑے گا، ہمارے بچے گلیوں میں بھوکے مریں گے۔ ہمارے بادشاہ کا تاج گر پڑے گا۔ مہا بھارت میں لکھا ہے۔'' بوڑھے پھونس دھن گوپال مزمدار نے کہنا شروع کیا۔

''ارے مہا بھارت کو چھوڑو دادا۔'' پرفلا نے جل کر اس کی بات کاٹی۔ یہی تو ان بوڑھوں میں ایک عیب تھا۔ بات بے بات پر سراج الدولہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ یہ دھن گوپال دادا ابھی ابھی کچھ داستان شروع کرنے والے تھے۔ پرفلا نے ان کو ہتھے پر ہی ٹوک دیا۔ ''کیا گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔۔۔۔'' اس نے کہا۔ '' کلکتے چلو۔ جہاں شیام وا گئے ہیں (شیام رادھے چرن کا لڑکا تھا جو سرل صاحب کے گودام میں ملازمت کر رہا تھا) اور لاٹ صاحب کی چاکری کرو۔ شراج کے زمانے لد گئے دادا۔''

رادھے چرن حیرت سے سنتے رہے، یہ لڑکا پرفلا بالکل مارواڑیوں کی ایسی باتیں کر رہا تھا، یہ ذہنیت اس میں کہاں سے آ گئی؟ ان کو مارواڑیوں سے نفرت تھی۔ رادھے چرن پرانے شرفا کے اس طبقے میں سے تھے جو فارسی پڑھتا تھا۔ مغلوں کی سرکار کا نظم و نسق سنبھالتا تھا اور باقی وقت پوجا پاٹ میں لگا رہتا تھا، مگر اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ

تجارت کر کے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بنیوں کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیردار اور کسان کے درمیان کا

یہ نیا سرمایہ دار طبقہ انگریز کا دوست اور دست راست تھا اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔

''لاٹ صاحب کی چاکری۔'' دھن گوپال نے کھانسنے کے بعد جوش سے بولنا شروع کیا، اس کی داڑھی لالٹین کی روشنی میں ہلتی ہوئی مضحکہ خیز معلوم ہوئی، وہ خود بہت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ ''لاٹ صاحب'' اس نے دہرایا۔ ''اس سے مطلب؟ ہمارا بادشاہ ابھی دلی میں موجود ہے، وہ تمہارے لاٹ صاحب کا دماغ ٹھیک کردے گا۔''

''تمہارا بادشاہ اندھا کر دیا گیا ہے گوپال دادا'' پرفلا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''تم جانے کس دنیا میں رہتے ہو، تمہارے بادشاہ نے پہلے ہی دیوانی کلائیو کے حوالے کیوں کردی۔ اب دماغ ٹھیک کرے گا۔'' پرفلا تلخی سے ہنسا۔ دونوں بوڑھے چپ چاپ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ رادھے چرن نے کوفت سے پرفلا پر نظر ڈالی۔ ان لڑکوں کو کچھ سمجھانا بیکار تھا، یہ بھی بتانا بیکار تھا کہ بادشاہ نے اپنی مرضی سے دیوانی نہیں دی۔ کلائیو نے زبردستی حاصل کی تھی۔ اس فاقے زدہ ملک میں پیدا ہونے والے ان نوجوانوں کو کس طرح یقین آ سکتا تھا کہ یہی بنگال دیس کا زرخیز ترین صوبہ تھا۔ یہی بنگال فردوس ہند کہلاتا تھا، اس وقت اس دیس میں پرائے ملک انگلستان کا زمینداری نظام رائج نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی مصنوعات کی برآمد پر محصول نہیں لگے تھے۔ اس وقت لوگ ذاتی جائداد کے تصور سے آشنا نہیں تھے، یہ سب رادھے چرن کے دیکھتے دیکھتے ہوا تھا۔ چند روز قبل جب دوامی بندوبست کے سلسلے میں دورہ کرتا ہوا ڈھاکے کا انگریز کلکٹر یہاں آیا تو

اس نے اپنے دربار میں رادھے چرن کو بلا کر کہا تھا کہ ہم یہ سب تمہارے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی بدانتظامی سے تباہ کر دیا تھا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو صاحب۔ ہمارے نوابوں کے یہاں بدانتظامی نہیں تھی، میں کا۔ستھ ہوں، میرے پرکھ صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوڑھی گنگا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس بھی کھو دیے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔۔۔تم۔۔۔'' اور جب رادھے چرن غصے سے کانپنے لگے تھے تو ان کو کلکٹر کے چپراسیوں نے کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس روز اس کمرے میں ایک انگریز مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفر نامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سننے کے بعد اس نے قلمبند کیا تھا۔ ''بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں، اس ملک میں کوئی اتحاد نہیں۔ دراصل اسے ایک ملک کہنا ہی نہیں چاہیے، یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہندو مسلمان ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں، یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔''

رادھے چرن دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھے رہے۔ کشتی اب ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ایک بلند و بالا نوجوان فرنگی بیٹھا تھا جس کے وگ کا پاؤڈر اور تلوار کا دستہ چاندنی میں جھلملا رہا تھا۔ مونشور واداہانپتے کانپتے نوکے کو کھے رہے تھے۔

رادھے چرن نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔علی وردی نے مرتے وقت نوجوان سراج سے کہا تھا: فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اور ان کی رعایا کی دولت کے آپس میں حصے بخرے کر دیے ہیں۔ اس کی طاقت زبردست ہے، ان کو قلعے اور فوجیں حاصل نہ کرنے دینا ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔ اس وقت چوبیس سالہ سراج مرشدآباد میں تھا۔ فرنگی اس کی توہین کے طور پر اسے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھیوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس نے ملک کے ان تاجروں کا محصول معاف کر دیا تھا مگر خود نواب کے علاقے سے جو سامان آتا، انگریز اس پر زبردست محصول لگا رہے تھے۔ کلکتے کی تسخیر کے بعد بھی سراج نے انگریزوں کے عہدنامے پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا تھا۔ رادھے چرن کا باپ ان سب معرکوں میں سراج کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ انگریزوں نے ہگلی میں قتل و غارت مچایا تو سراج نے لکھا: تم نے میری پرجا کو تاراج کیا ہے۔ تم اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو، اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمہاری ساری مراعات واپس کر دوں کیونکہ جنگ تباہ کن ہے، تم مجھ سے امن کے معاہدے کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔ سراج نے لکھا: مرہٹے، جن کو کسی مقدس انجیل کا واسطہ نہیں ہے، اپنے معاہدوں پر قائم ہیں اور تم جو خدا اور عیسیٰ کی قسمیں کھاتے ہو اپنے وعدوں کو توڑ ڈالتے ہو۔

اور ایڈمرل واٹسن نے جواب دیا تھا: ''میں ایسی آگ تمہارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کا سارا پانی نہ بجھا سکے گا، میں ایسی آگ لگاؤں گا۔ میں ایسی آگ۔۔۔'' یکا یک مشعلوں کی روشنی سے افق جگمگا اٹھا۔ بوڑھی گنگا کی موجیں

جھلملا رہی تھیں۔ صاحب کی کشتی گھاٹ پر پہنچ چکی تھی۔ راجہ گریش چندر رائے اور ان کے حوالی موالی گھاٹ پر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ رادھے چرن نے بڑبڑا کر سر اٹھایا اور اس کی روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا گئیں، وہ چادر لپیٹ کر آہستہ سے اٹھے اور اپنے نیم تاریک مکان کی طرف مڑ گئے۔

چوپال میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سہم کر ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ راجہ صاحب کے پیادے رات کی دعوت کے لیے بیگار پکڑنے کی غرض سے چوپال کی سمت آ رہے تھے۔

۲۸

پچیس سال گزر گئے۔

ڈھاکہ کے کارخانوں میں الو بول رہے تھے، سارے ملک میں لوہے کی بھٹیاں مدتیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تاریک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندوستانی جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور نئی سرمایہ داری کی نیو اٹھائی جا چکی تھی، اب باضابطہ شہنشاہیت کا دور تھا۔ مرشد آباد جو کبھی کلائیو کو لندن سے عظیم تر دکھلائی دیا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ کلکتہ گنجان شہر بن چکا تھا، اسی کلکتے میں علی پور روڈ پر سرل ہاورڈ ایشلے کی عظیم الشان عمارات کھڑی تھیں۔ سرل ہاورڈ

ایشلے، پچاس سالہ، دنیا دار، کامیاب، جہاندیدہ، پرانا پاپی، گھاگ جان کمپنی کا اہم ستون نئی اردو نثر کا مربی اور سرپرست، اودھ کے بادشاہ کا لنگوٹیا یار، اس سے اپنے شکاری کتوں سے ہلو ہلو کرنے کے بعد اب بوچے میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے، اس کے فزیشین نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھے، محنت کم کرے، غم کم کھائے، شراب اس سے بھی کم پئے، روز باقاعدہ ہوا خوری کرے، ورنہ مر جائے گا۔ فزیشین کی ان نصیحتوں پر اسے ہنسی آتی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بے حد گھٹیا ہے۔ گھٹیا، کامیاب، دولت مند، اوسط قسم کا انسان جو پچاس سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو اس کے طبیب اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ سارے گورنروں، اعلیٰ حکام اور دوسرے بڑے آدمیوں کے طبیب بھی ان سے یہی کہتے تھے۔

وہ کس قدر گھٹیا آدمی تھا۔ سرل نے کوفت کے ساتھ اپنے شاندار محل پر نظر ڈالی جس کے باغ میں فوارے چل رہے تھے اور کالے ملازمین کی پلٹن کام میں مصروف تھی۔ خداوند۔۔۔ مجھے تو نے اتنا ذلیل کیوں بنایا؟ پھر اس نے چند اہل کار اپنی طرف آتے دیکھے اور وہ جلدی سے اپنا بڑے صاحب والا انداز چہرے پر طاری کر کے بوچے میں جا بیٹھا۔ قاصد گورنمنٹ ہاؤس سے آئے تھے، اپنے کلرک کے ذریعے چند کاغذات اسے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کے پاس بھجوانے تھے۔ بنگال کے حالات مخدوش تھے، اضلاع کے مسلمان کسانوں نے اودھ کے چند باغی مولویوں کی سرکردگی میں سر اٹھایا تھا اور فتنہ فساد پھیلاتے پھر رہے تھے۔ دریائی اور خشکی کے راستے محفوظ نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں پریشانی تھی۔ اودھ

کے بادشاہ کے پاس ان کاغذات کا پہنچنا ضروری تھا، اسے مفسدوں کا سر کچلنے کے لیے ندیا کے ضلع بھی جانا تھا (ندیا کے ضلع میں پلاسی باغ تھا جس میں آم کے گھنے کنج تھے اور موسم گرما کے عروج پر جب آم میں بور آ رہے تھے وہاں کرنل کلائیو، سراج سے لڑا تھا)۔ندیا۔۔گورنمنٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اس سرکاری خط میں اس نام کو پڑھ کر اور بہت سی باتیں ذہن میں آ گئیں۔ناموں اور لفظوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی، ہر چیز کا کسی نہ کسی شے سے تعلق تھا۔ساری دنیا ساری کائنات اسے کوئی نہ کوئی افسانہ سنانے کے لیے تلی بیٹھی تھی، اپنا افسانہ وہ کس کو سنائے گا؟

خط پر دستخط کر کے قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ پھر چلنے کے لیے تیار ہوا۔آسمان پر بادل گھر آئے تھے، سامنے سڑک پر چند کالے مرگلے آدمی ایک ارتھی اٹھائے ہری بول ہری بول کے ہولناک نعرے لگاتے جلدی جلدی قدم اٹھاتے مرگھٹ کی طرف جا رہے تھے۔سرل کو ایک پھریری سی آئی اور اس نے جھک کر ایک سوگوار سے پوچھا: ’’کس کی ارتھی لیے جاتے ہو؟‘‘

’’ڈھاکیشوری کے رادھے چرن بابو۔‘‘

سرل چونکا، رادھے تو شنیلا کے باپ کا نام تھا۔

شنیلا کون تھی۔۔؟

دنیا میں ہزاروں رادھے چرن ہوں گے اور اس نے شنیلا کے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا جو سنا تھا کہ کبھی کبھی اپنے بیٹے سے ملنے گاؤں سے آ جایا کرتا تھا اور کافی خبطی اور بد دماغ بوڑھا تھا۔

سرل ٹوپی اتار کر سڑک کے کنارے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ارتھی والوں نے

بڑی حیرت سے اس کو دیکھا۔ انگریز حاکم جو زندہ بنگالیوں کے ساتھ جوتے لات سے بات کرتا تھا مرے ہوئے بنگالی کی یہ تکریم کیوں کر رہا تھا؟

بے چارے رادھے چرن بابو۔ کاش تم چند لمحوں کے لیے زندہ ہو کر اپنی یہ عزت افزائی دیکھ لیتے۔

جلوس آگے نکل گیا۔ ہری بول، ہری بول کی آوازیں مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کہاروں نے ادب سے پوچھا: ''صاحب کدھر جائیے گا؟''

سرل پھر بوچے میں جا بیٹھا۔ ''جہاں چاہو چلو۔''

اس نے زندگی کی ہنگامہ خیزیاں دیکھی تھیں۔ موت کی گرم بازاری کا نظارہ کیا تھا، اس نے دنیا کے ہر رنگ کو ہر پہلو سے پرکھا تھا۔ انسان کس طرح جیتے تھے، کس طرح مرتے تھے، یہ گورکھ دھندا کیوں تھا؟ گہری ندیا اگم جل زور بہت ہے دھار۔ کھیوٹ سے پہلے ملو جو اترا چاہو پار۔ کھیوٹ کہاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کسے تھی، مگر روح کا یہ غم کیسا تھا جو مدتوں سے کھائے جا رہا تھا۔ کسی دور، کسی حال میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زندگی سے اسے جتنی توقعات تھیں ان سے کہیں زیادہ مہربانی سے زندگی اس سے پیش آئی تھی مگر زندگی کو اس نے اپنی طرف سے کیا دیا تھا؟ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا: یہ پر رونق خوبصورت شہر، اس کی دولت اس کی آبادی، سب اس کے قدموں میں بکھری تھی، اسے چاروں طرف کے انسان اپنا منہ چڑاتے نظر آئے۔ چوراہے پر پہنچ کر کہاروں نے کندھا بدلنے کے لیے بوچہ زمین پر رکھا، سامنے ایک پرتگالی شراب خانہ تھا۔ ہگلی کے برطانوی اور اطالوی ملاح دروازے پر بلڑ کر رہے تھے، اندر کوئی زور زور سے ہارپ بجا رہا

تھا۔ ایک عورت سر پر سیاہ جالی کا رومال اوڑھے تیز تیز نظروں سے اسے گھورتی شراب خانے کے دروازے میں داخل ہوگئی۔

''ٹھہرو، یہیں رکو۔'' سرل نے چلا کر کہاروں سے کہا، انہوں نے بوچہ دوبارہ زمین پر دھر دیا۔ سرل کود کر اس عورت کے پیچھے پیچھے دوڑا، وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کو کلکتے کے اس گھٹیا یورپین شراب خانے میں گھستا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک پیلی رنگت اور بجھی بجھی آنکھوں والا یورپین بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سرل کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مارے رعب کے اس کی زبان ہکلا گئی۔ ''سر۔ سر۔'' اس کے آگے اس کی آواز حلق میں ڈوب کر رہ گئی۔

سرل خاموشی سے اسے دیکھا کیا۔ ساری دنیا کے شراب خانوں کے کاؤنٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے یہ ان کے مالک کس قدر پراسرار لگتے تھے، ان سب کی بڑی خاموش برادری تھی۔ یہ آوارہ گردوں، چوروں، اچکوں، بدمعاشوں اور طوائفوں کی اپنی مخصوص اداس دنیا تھی۔

اتنے میں وہی عورت تیز تیز آواز مین بولتی تیزی سے قدم رکھتی ایک لکڑی کے زینے پر سے اتری، نیم تاریکی میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ اب دو برطانوی ملاح غل مچاتے اندر آ چکے تھے اور ان کے ساتھ دو بے حد حسین یوریشین لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک لڑکی بہت زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔

اس لڑکی کے چہرے پر سرل کو اپنی آنکھیں نظر آئیں، وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

''کدھر جاتے ہو سرل صاحب۔'' اس عورت نے، جس کے پیچھے وہ اندر آیا تھا، یکلخت اس کے سامنے آ کر دروازے میں اس کا راستہ روکتے ہوئے استہزاء سے

کہا۔ اس کے بندے جھلکورے کھا رہے تھے اور وہ خاصی بے تکی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر اس نے بڑے اطمینان سے سرل کو گھورنا شروع کیا۔ ''سرل صاحب، اپنی لڑکی سے ملتے جاؤ، تم نے مجھے کلکتے بلایا تھا۔ میں پچیس سال سے تمہاری منتظر ہوں۔ میں اسے چار سال کا گود میں اٹھا کر یہاں لائی تھی مگر تمہارے چوبداروں نے مجھے آج تک تمہاری کوٹھی میں گھسنے ہی نہیں دیا، میں کیا کرتی۔۔ تم نے تو میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا، تم جاننا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہیں۔ دیکھ لو، اس طرح گزرتی ہیں۔

''سرل صاحب، تم تو بنگال گورنمنٹ کے بہت بڑے افسر ہو۔ کچھ میرے لیے روپیوں کا بندوبست کر دو۔ سنا ہے نیٹو عورتوں نے تم سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ میں تو پھر ایک حد تک تمہاری ہم قوم ہوں۔''

سرل پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، اسے محسوس ہوا ابھی اسے دل کا دورہ پڑے گا اور وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے گا۔ اسی وقت سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی گزری جس میں کلکتہ کرانیکل کے چند صحافی بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر سرل کی جان ہی نکل گئی، اگر کسی طرح ان کو اس معاملے کی خبر ہو گئی تو کل تک یہ سارا واقعہ کلکتے بھر کی سوسائٹی میں مشتہر ہو گا۔ ولایت تک بات پہنچے گی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اس کا چوبدار بھاگ کے اس کے پاس آیا: ''صاحب، آپ کا جی ماندہ ہے۔ چلئے۔'' پھر بوچے میں جا بیٹھا۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

''حضور گھر چلئے گا؟'' کہاروں نے پوچھا۔

گھر؟ اس کا گھر کہاں تھا؟ ''نہیں باغ والے بنگلے چلو۔'' اس نے غصے سے کہا۔ اپنے باغ میں پہنچ کر وہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

بوچہ آگے بڑھتا گیا۔

جلدی۔۔۔۔ جلدی۔ اس نے کہاروں کو ڈانٹا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا، یہ زندگی کا فانوس تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف رنگا رنگ تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے رفقہائے کار، فورٹ ولیم کالج کے منشی اور نثار، ایشیاٹک سوسائٹی کے محقق، اودھ کے شعراء اور فن کار، حتیٰ کہ لکھنؤ کی چمپا بائی۔ یہ سب مل کر اس کی روح کے غم کو نہیں مٹا سکتے تھے۔

اس کی روح کے غم کیا تھے؟۔۔ عورتیں۔۔؟

ہرگز نہیں۔ عورتو کے مسئلے نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کامیاب، مطمئن انسانوں کی زندگیوں میں ایک خاص خانہ ہوتا ہے جو صنفِ لطیف کے لیے وقف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں، ناکامیاں، رومان، ازدواجی زندگی کی مسرتیں یا بے کیفیاں، یہ سب چیزیں اس لیبل کے تحت آتی ہیں جس پر ''عورتیں'' لکھا ہے۔ سرل ایشلے، جس نے شاعر کی نظروں سے دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا، اب شاعر کے بجائے ایک کامیاب انسان بن چکا تھا، اس کی روح کا دکھ یہ تھا کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔ اس **ملک** سے، جس نے اپنی ساری جمع پونجی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ ان عورتوں سے، جنھوں نے وقت کے مختلف حصوں میں اسے چاہا۔ مدراس

کی ماریا ٹیریزا، ڈھا کیشوری کی شنیلا اور بہت سی عورتیں جو اس کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر اس پر نچھاور ہوئیں۔ سرل ایشلے نے دنیا سے سب کچھ حاصل کر لیا لیکن اس کے بدلے میں دنیا کو کچھ دیا نہیں، یہ بڑی بدنصیبی کی بات تھی، اگر اس کے عہد میں مذہب کا چرچا ہوتا تو شاید وہ خدا میں پناہ ڈھونڈتا لیکن دنیا عقلیت پرستی اور سائنس اور مادیت کی طرف جا رہی تھی۔ بنک آف انگلینڈ چرچ آف انگلینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ زندگی کے معنی تھے اور زیادہ سرمایہ اور زیادہ تجارت، حکومت اور زیادہ ترقی اور اقتدار۔ اپنے گارڈن ہاؤس میں پہنچ کر اس نے اس ہفتے کی ڈاک دیکھی، کچھ دیر سویا پھر پیچوان کے کش لگانے کے بعد دوبارہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ دل کی ویرانیاں بھی تھیں مگر فرض اسے پکار رہا تھا کہ ندیا کے ضلعے میں جا کر باغی کسانوں کی سرزنش کرے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تھا کہ ان باغیوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں، گو دل کی ویرانی کہتی تھی لکھنؤ چلو، وہاں دربار کی رنگینیوں میں سارے غم دھل جائیں گے۔

کوٹ پہن کر وہ پھر بوچے پر سوار ہوا اور چورنگی کی طرف لوٹا، جدھر اس کا دفتر تھا۔

۲۹

نوجوان بنگالی کلرک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اب تک فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ گھنگھریالے بال اس کے ماتھے پر آن گرے تھے۔ میز پر چاروں طرف

مٹیالے کاغذات کا انبار تھا۔ باہر برآمدے میں اڑیہ قلی لڑکا اونگھتا جاتا تھا اور پنکھے کی ڈور کھینچ رہا تھا۔ سرل کو دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور پنکھا زیادہ تیزی سے کھینچنے لگا۔

''گڈ آفٹر نون سر۔'' نوجوان نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

''گڈ آفٹر نون۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''گوتم نیلمبر دت ہسر۔''

''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں کل ہی پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے دفتر سے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔''

''کب سے کام کر رہے ہو؟ ابھی تو لڑکے ہی معلوم ہوتے ہو۔'' سرل نے دلچسپی سے پوچھا، اس کا نیٹو لوگوں سے یہ دوستانہ انداز ایک زمانے میں کارنوالس کو بہت کھلا کرتا تھا کیونکہ جب سے جان کمپنی کو سیاسی اقتدار ملا تھا کارنوالس نے پالیسی تبدیل کر دی تھی۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہندوستانی محکوم۔ انہیں کسی حالت میں بھی نیٹو لوگوں سے برابری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہسٹن بہادر، وارن ہیسٹنگز کے زمانے خواب وخیال ہو چکے تھے۔ کارنوالس کے عہد سے انگریز اور نیٹو کے درمیان سماجی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی مگر سرل اولڈ سکول کا 'نواب' تھا۔ اسی طرح شاعروں سے ملتا۔ مجرے سنتا۔ اودھ ریذیڈنسی میں رہ کر اس پر ہندوستانیت کا رنگ اور بھی گہرا ہو چکا تھا، اسے کارنوالس یاد آیا۔ گڈ اولڈ کارنوالس جو غازی پور پہنچ کر ہیضے کا شکار ہو گیا، اب تو اس کی ہڈیاں بھی قبر میں گل گئی ہوں گی۔ اسے

موت کے احساس نے پھر گھبرا دیا، اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر بنگالی کلرک پر نظر ڈالی۔ ''تم نے کہاں پڑھا ہے؟''

''سنسکرت کالج بنارس اور یہاں'' اس نے جواب دیا، ''کلکتہ کالج میں ایف۔اے تک پڑھا ہے، اب بی۔اے کرنا چاہتا ہوں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے'' سرل نے واقعتاً خوش ہو کر کہا۔ ''دفتر کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہا کرو۔'' پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نیلمبر دت کو پھر بلایا۔

''سفر کرنا پسند ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کبھی شاہ اودھ کی عملداری میں گئے ہو؟''

''میں بنارس سے آگے کبھی نہیں گیا۔''

''اب جاؤ گے۔؟ چند ضروری کاغذات ہیں، تمہارے ساتھ مسلح دستہ جائے گا، میں خود نہیں جا سکتا کیونکہ مجھے اضلاع کا دورہ کرنا ہے۔ گھر جا کر سامان باندھو۔ اکلیش سے کہو جہاز میں تمہارے لیے کیبن کا بندوبست کر دے۔''

''یس سر۔ تھینک یو سر۔'' وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر کاغذات پر جھک گیا۔ سرل اسے بڑی محبت سے دیکھا کیا۔ انسانوں کو پہچاننے، ان کی روح کے اندر جھانکنے کی اس نے اس سے پہلے کوشش کیوں نہیں کی تھی؟

جہاز نے، جو کلکتے سے بنارس جاتا تھا، ابھی لنگر نہیں اٹھایا تھا۔ بارشوں کا موسم آ چکا تھا اور مونگیر اور پٹنے تک گنگا کی موجیں ہلاکت خیز تھیں۔ گوتم نیلمبر سامان

سفر درست کرنے کے بعد اب بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کا چھوٹا سا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی سب راج شاہی میں رہتے تھے اور کھیتی کرتے تھے۔

اس سے شام ہو چکی تھی۔ آنگن کے کونوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ گلیوں میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی، وہ اپنے کمرے کے برآمدے میں، جس کی سیڑھیاں گلی میں اترتی تھیں، چٹائی بچھائے لالٹین جلائے ایک موٹی سی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اور بار بار ڈکشنری دیکھتا جاتا تھا، اتنے میں آہٹ ہوئی اور اس نے سفید ساری میں لپٹی ایک چالیس سالہ عورت سامنے کھڑی دیکھی، وہ جلدی سے اٹھا اور نمسکار کرنے کے بعد اس سے پوچھا:

''کیا بات ہے ماں۔؟ کس سے ملنا چاہتی ہو۔؟''

''تم ہی سے۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں۔ تم سرل صاحب کے کلرک نہیں ہو۔؟''

''ہاں ہوں تو۔''

''میں شنیلا ہوں۔''

''شنیلا۔ ماں۔؟'' اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ''تمہاری کیا سیوا کروں؟''

''میں۔ میں سرل صاحب کی بیوی ہوں۔''

''اچھا۔؟'' اسے یاد آیا دفتر میں اسے کسی نے بتایا تھا کہ سرل صاحب کے زنانخانے میں برسوں سے ایک ہندو عورت رہتی تھی جس کو کچھ عرصے سے انہوں

نے علیحدہ کر دیا تھا اور اس کے لیے دوسرا مکان لے رکھا تھا۔

''تم کو صاحب بہت مانتے ہیں، میرا ایک کام کر دو گے، تم لکھنؤ جا رہے ہو نا۔؟''

''ہاں۔ماں۔''

''تم نے چمپا بائی کا نام سنا ہے؟''

''چمپا بائی۔وہ کون ہے؟''

''لکھنؤ کی بڑی مشہور طوائف ہے۔صاحب جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اس پر ہزاروں خرچتے ہیں، میری اب بات بھی نہیں پوچھتے۔میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک بوڑھا باپ تھا وہ بھی مر گیا۔بھائی اپنے کاروبار میں لگے ہیں۔بھاوج اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے۔''جاؤ اپنے فرنگی کے پاس۔''اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''میری ایک لڑکی بھی ہے، وہ دس سال کی ہوئی تو اسے صاحب نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا، وہ ولایت سے لوٹ کر آئی ہے تو مجھے پہچانتی بھی نہیں۔اسے لوگوں کو بتاتے شرم آتی ہے کہ اس کی ماں کالی عورت ہے۔''

نیلمبر کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صاحب کی ایک لڑکی بھی ہے۔''تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟''

''مارگریٹ اجابل، پر میں اسے بیلا پکارتی تھی۔''

''تم عیسائی ہو گئی ہو؟''

''نہیں، مگر بیلا ہمارے دھرم کو بہت برا سمجھتی ہے۔تم چمپا سے کہو وہ صاحب کا خیال چھوڑ دے، تم لکھنؤ سے آ کر مجھ سے ملو گے نا، تم مجھے بتاؤ گے تم نے چمپا سے

کیا کہا؟"

"میں تم سے ضرور ملوں گا ماں۔" گوتم نیلمبر نے کہا، پھر وہ اسے پہنچانے کے لیے گلی میں اتر آیا۔ "تمہاری پالکی کدھر ہے؟"

"میں پیدل آئی تھی، تم میری فکر نہ کرو۔" گلی کے اندھیارے میں اس کی سفید ساری کچھ دیر تک جھلملاتی رہی پھر وہ موڑ پر پہنچ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ گوتم نیلمبر برآمدے میں واپس آ کر دوبارہ اپنی ڈکشنری پر جھک گیا۔

۳۰

لکھنؤ کے رومی دروازے میں پہر دن چڑھے کی نوبت بجنے والی تھی۔ بیل گاڑیاں اور شکر میں چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں، ان بیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور پھل لدے تھے اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نخاس میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امراء کے محلات کے پائیں باغ صاف کیے جا رہے تھے۔ ملازمین باسی پھولوں کے گلدستے اور گجرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ساقنوں اور تنبولنوں نے اپنی اپنی دکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے، دو گھڑی ہنس بول کر، زردہ کھا کر یا حقے کے دو کش لگا کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیبوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے، جھلنگے، حبشی سپاہی، راجپوت عہدے دار، محلات شاہی کے پہرے پر مستعد

کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں، ابھی بجروں کے چلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ساحل دریا پر بنی ہوئی کوٹھیوں کا عکس شفاف پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ساون کے اودے بادلوں اور آس پاس کے سبزے کی وجہ سے گومتی بھی سبزہ رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش، ٹیڑھی کوٹھی، کنکروالی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل، سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے۔ باغوں میں پڑکا لگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی طعام خانوں کی رونق دوبالا ہوئی۔ بھٹیارنیں مصروف ہوئیں۔ لوگ اپنے اپنے کارخانوں سے کھانا کھانے کے لیے نکلے۔ دیوان خانوں میں دستر خوان بچھے۔ بیگمات نے خس کی ٹٹیوں کے پیچھے چوسر کی بساطیں بچھائیں۔ مہریاں اور خواصیں پاندان کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگنے میں مصروف ہوئیں۔ کڑھائیاں چڑھائی گئیں۔ سہ پہر کی نوبت بجی، دن ڈھلنا شروع ہوا۔ دلفریب باغات میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ رمنا میں پلے ہوئے جنگلی جانور چنگھاڑتے پھرے اور ہرن کلیلیں بھرا کیے۔ چریا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موتی محل پر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔

چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ ہواؤں میں خوشبوئیں امنڈ آئیں۔ شام اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آراء ہوئی۔ سارے شہر کو رنگا رنگ کی خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھڑکاؤ کی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو، گندھیوں کی دکانوں کی مہک، قنوج کے بیلے اور جونپور کے گلابوں کی خوشبو،

مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی لپٹ ۔ بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوشبو، پھر گلی کوچوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے، لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے ۔ انہوں نے باغوں کا رخ کیا۔ گلی کوچوں میں سے نغمے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں ۔ خوش شکل اور خوش لباس کنجڑنیں، تیز وطرار تنبولنیں، حسین اور حاضر جواب بھٹیارنیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی تھیں ۔ گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے تھے اور گولیاں کھیلتے تھے ۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور طنبورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں ۔ ندی کنارے بیٹھے ہوئے جوگی تری بجاتے تھے ۔ نئی بیاہی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے ان کا بھائی میکے سے ڈولی کب بھیجے گا۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے ۔ بچیاں پکوان بنا رہی تھیں، ہر شخص مسرور تھا ۔

لوگو! خوش ہو لو کہ دنیا فانی ہے، جانے کتنے دن کا چین تمہارے نصیبوں میں لکھا ہے ۔ آپس میں ہنس بول لو، غنیمت جان لو کہ یہاں دو چار ہم جنس مل بیٹھے ہیں ۔ کل کیا جانئے کیا ہو ۔ کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین ۔ باقی صرف خدا رہے گا جو کہیں بہت دور بیٹھا اس لیلا کا تماشا کرتا ہے وہ خدا جو صوفیوں کا ہے اور فرنگی محل کے مولویوں کا اور بالا ناتھ کے جوگیوں کا اور وہ کسی سے بھی اپنی انگلی اٹھا کر کہہ سکتا ہے: بس، اب ختم کیا جائے ۔

اے حقیر اور بے بس اور مضحکہ خیز انسانو! تم سب ایک مکڑی کے غیر مرئی جال میں گرفتار ہو چکے ہو، مکڑی کو تم پہچانتے نہیں ہو کیونکہ تمہارا جال غیر مرئی ہے ۔

کب تک تمہاری یہ مسرت رہے گی، بے چارے لوگو! مسرت بڑی عظیم چیز

ہے۔دوسروں سے ان کی مسرت نہ چھیننا۔

یہ لوگ جوان سڑکوں پر چل رہے ہیں، گا رہے ہیں، خوش ہیں، انہوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ یہ باوقار، بانفاست، باوضع، پرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ جوان باغوں میں جمع ہیں بڑے اہم لوگ ہیں کیونکہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں۔اٹھارہویں صدی کے فرانس کی مانند انہوں نے جینے کے فن کو اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نام، یہ صورتیں بڑی اہم ہیں، جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔شجاع الدولہ، بہو بیگم، بینی بہادر، ٹکیٹ رائے اور اودھ کے یہ مرنجان مرنج باشندے جو ہزاروں سال سے گھاگرا اور گومتی کے کنارے رہتے آئے ہیں۔رام چندر کے زمانے میں بھی یہی لوگ تھے۔شجاع الدولہ کے زمانے میں بھی یہ لوگ زندہ تھے۔یہ کسان اور جوگی۔ دریا کے کنارے وہ ننگا گوسائیں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شجاع الدولہ کی فوج میں شامل ہو کر بکسر میں انگریزوں سے لڑا تھا۔یہ پرامن کسان اپنا **ملک** بچانے کے لیے نواب کے سپاہیوں کی حیثیت سے مرہٹوں سے ٹکر لیتے تھے۔ یہ مرنجان مرنج ملواہے اور گوالے عظیم آباد تک پہنچ کر انگریزوں سے بھڑ گئے تھے، امن نہیں تھا۔سندھیا کی فوج نے گنگا پار کا علاقہ تباہ کر رکھا تھا۔ الہ آباد میں کلائیوڈز ٹیبل پر شاہ عالم کا تخت بن چکا تھا۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ کی زبردست فوج سے گھبرا کر عہدنامہ کیا تھا کہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے مگر حسب معمول وہ اس وعدے سے پھر چکے تھے اور جب فیض آباد کا شجاع الدولہ مرا اس کو صدمہ تھا کہ انگریزوں کو **ملک**

سے نکال نہ سکا۔ شجاع الدولہ جو مہاجی سندھیا کا پگڑی بدل بھائی بنا تھا۔ یہ نام اس داستان کے ہیں۔ داستان صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فن داستان گوئی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے کہ خود بھی یہ قصہ سناتے سناتے قصے میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ان کا قصہ مضحکہ خیز ہے!

لکھنؤ پریوں کے شہر کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ مانوس گلیاں، سڑکیں، محلے، گنج، کٹڑے، باغ، ناکے، بارونق، آباد، بھرے پرے۔ یہ قلعہ مچھی بھون ہے۔ یہ معالی خان کی سرائے ہے۔ یہ آصف الدولہ کے جان نثار راجہ جھاؤ لال کا پل ہے۔

ذرا ٹھہرو، آصف الدولہ۔۔ یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھے، وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو دکان دار صبح کو اپنی دکانیں بولتے ہیں؟ جس کو نہ دے مولا۔ اس کو دے آصف الدولہ، جو کہتا تھا ''جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے، عمارت بناتے چلے جایئے۔'' جس نے قحط سالی کے زمانے میں پرجا کو روزی مہیا کرنے کے لیے امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا کہ شرفا، کو مٹی ڈھوتے اور اینٹیں چنتے شرم نہ آئے۔ دیالو، سخی، دیوتا سمان آصف جس نے باغات، بارہ دریاں، شیش محل اور ہاتھی دانت کے بنگلے بنوا ڈالے جو غریبوں اور اہل کمال کی پرورش اور قدر کے لیے نت نئی تجویزیں دماغ سے اتارتا تھا۔ جری شجاع الدولہ کا سخی بیٹا آصف۔ اس کے فرانسیسی جنرل کلاڈ مارٹن کے قلعے کونسٹیشیا کے باغ میں بہار کے سارے پھول کھلے ہیں۔ فرح بخش

کوٹھی کے نیچے سے ندی سبک خرامی سے بہہ رہی ہے۔ طعام خانے کے دریچوں کے نیچے سے کشتیاں گزر رہی ہیں۔ برسات میں کوٹھی کی نچلی منزلیں تہ آب ہو جاتی ہیں تو جنرل اوپر کی منزلوں میں چلا جاتا ہے۔ فرانسیسی معماروں کی بنائی ہوئی کوٹھیوں میں جھاڑ فانوس سجے ہیں۔ پیانو رکھے ہیں۔ ولایتی فرنیچر جھل جھل کر رہا ہے۔

یہ شہر ایودھیا اور بنارس کی قدیم موسیقی کا محافظ ہے۔ یہاں کی بھیروی سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں محرم کے زمانے میں بہاگ اور پیلو اور سوہنی گھل جاتی ہے۔ بیگمات کے محلوں کی چہار دیواری میں لے دار اور گلے باز ڈومنیاں سال بھر جشن موسیقی مناتی رہتی ہیں۔ چوک کے کمرے اور مضافات کے باغ اور بارہ دریاں باکمال ڈیرے دار طوائفوں کی تانوں سے گونجتی ہیں۔ چاندنی راتوں میں کہار اور مزدور منڈیروں پر بیٹھ کر برہا گاتے ہیں۔ برج کے رہس دھاری راس لیلا کا سوانگ رچاتے ہیں۔ برہمن رقاص ایک گھنگرو بجا کر ناچ رہے ہیں اور آس پاس سارے میں موت کا گھنگرو بج رہا ہے۔ پچھلے ستر اسی سال سے یہ ناٹک فیض آباد اور لکھنؤ کے رنگ بھوم پر کھیلا جا رہا ہے۔ ان کرداروں کی اہمیت باہر والے نہیں سمجھ سکتے۔ ان سب نے مل کر اس دنیا کی تخلیق کی ہے جو اودھ کے باشندوں ہندو و مسلمانوں کی اپنی دنیا ہے۔ یہ لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں، ان جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے۔ ان کی جیسی زبان، مذاق، لباس۔ یہ لوگ، غریب امیر عورت مرد، جوٹھا کر امام بخش اور لالہ حسین بخش، مرزا مینڈھو اور نواب کمن کہلاتے ہیں اور امامن مہری اور مرزا جنگلی اور سکھ بچن لونڈی اور

نواب بسنتی بیگم، یہ سب روتے ہیں، ہنستے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، لڑتے ہیں۔ شجاعت ان کا شیوہ ہے، آن پر جان دینا۔ شرافت، احسان مندی، وفاداری، نیکی ۔۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ سماج کی جتنی اچھائیاں اور جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں، اسی لیے یہ لوگ بڑے جذباتی ہیں ۔ بتاشے اور کوڑی پر ناچنے والے رقاص، کشمیری بھانڈ، جل ترنگیے، بین کار، باورچی برہمن، طبلچی، شاعر، مرثیہ گو، داستان گو، کالیستھ، فوجی، بانکے، چنڈو باز، بھگت باز، نقال، بہروپیے، عالم، فاضل، کلاونت، یہاں رزم و بزم ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ اصل روانی معاشرہ ہے۔

لکھنؤ سے ستر میل کے فاصلے پر بنگلہ فیض آباد ہے۔ رام کا شہر ایودھیا جسے شجاع الدولہ نے دلی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ جہاں گلاب باڑی ہے اور گھاگرا کے گھاٹ اور بڑے مغلوں کے زمانے کی مساجد۔ دلی میں اب بچارے چھوٹے چھوٹے مغل بیٹھے ہیں۔ یہ مضحکہ خیز چھوٹے مغل بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کو سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔

دلی کا ایک شہزادہ لکھنؤ میں پڑا ہے۔ بنارس میں پناہ گزین ہے۔ اودھ دربار سے اس کو دو لاکھ سالانہ وظیفہ دیا جاتا ہے، یہ امیر تیمور صاحبقران کی اولاد ہے۔

اور ایرانی شیعوں کی اولاد اس سمے اودھ پوری میں ڈگ وجے رام چندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اور اس نے اپنی اس زبردست وراثت کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بادشاہت ہندوؤں کے لیے ان کی قومی ریاست کے مترادف ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا اختلاف کوئی نہیں جانتا کیونکہ گڑھی کا ٹھاکر اور محل کا نواب دونوں

جاگیردارانہ اقدار کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور ان کی پرجا، جس میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں، ان کے سپاہیوں کی لاٹھیوں سے یکساں پٹتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ایک ہیں۔

مذہبی تفریق کو پرجا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ محرم میں بلوے نہیں ہوتے نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجایا جاتا ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان دیوالی مناتے ہیں کیسا الٹا زمانہ ہے۔ نواب بہو بیگم ہر سال ہولی منانے فیض آباد سے اپنے بیٹے کے پاس لکھنؤ آتی ہیں۔ ساری سلطنت میں ہندو راجاؤں نے مسجدیں اور امام باڑے بنوا رکھے ہیں۔ لکھنؤ سے اسی میل کے فاصلے پر بہرائچ ہے جسے ہزاروں برس پہلے شراوتی کہتے تھے۔ جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے۔

ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہندو مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں۔ جیٹھ مہینے میں ان کا میلہ لگتا ہے۔ سرخ نیزے اور جھنڈے اٹھائے ڈفلی بجاتے ہزاروں ہندو مسلمان دیہاتوں سے ان کے مزار کا رخ کرتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان صوفی ستیہ پیر کی مانند جو ستیہ نرائن بن چکے ہیں۔ بت شکن سالار مسعود عرف بالے میاں نے اودھ کے ہندوؤں کے لیے بالناتھ کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مقبرے کے قریب کا اگن کنڈ بالارکھ کی دھونی کہلاتا ہے۔ درگاہ کی نذر مجاور اور پوجا کے محاصل پنڈے حاصل کرتے ہیں۔ پنڈوں اور مجاوروں میں آپس میں اس آمدنی کی تقسیم کے متعلق معاہدہ ہے۔ سر ل ایشلے کے دوست بشپ ہیبر اور ان کے ساتھی، جو آج کل اس ملک میں چاروں اور گھوم کر اپنے سیاحت

نامے قلمبند کر رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور ویسٹ منسٹر میں ہماری حکومت کو چاہیے کہ ان وحشیوں کو اپنے جہالت اور تعصب سے نجات دلانے کے لیے جلد از جلد مزید انجیلیں اور مزید بندوقیں بھیجے۔

لکھنؤ کے باسیوں کو خبر نہیں کہ ان بے چاروں کے لیے بندوقوں سے لدے ہوئے جہاز کلکتے کی اور آ رہے ہیں۔ آغا میر شاہ زمن کے وزیر اعظم ہیں۔ مسیتا بیگ کوتوال شہر کا حاکم ہے جس نے عہد سعادت علی خان کے ڈھومی بیگ کوتوال کی انصاف اور امن پروری کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ شہر میں مکمل سکون ہے۔ مشہور ڈاکو محرم منانے کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہیں اور پھر جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں۔ بانکے مفسدوں کی سرزنش کے لیے موجود ہیں۔ ہوا میں اشرفیاں اچھالتے چلے جایئے کوئی نہ پوچھے گا۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں، ایک کی بیٹی سارے محلے کی بیٹی سمجھی جاتی ہے۔ وضع داری اور شرافت پر جان دینے کا عام رواج ہے۔

یہ ابو المظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر کا دار السلطنت ہے جن کی شادی میں روپیوں یا اشرفیوں کے بجائے ہاتھیوں پر سے ہیرے جواہرات کی بوچھار کی گئی تھی جن کو لوٹ کر غریب غربا دولت مند ہو گئے تھے، ان کے حرم سرا میں فرنگی کرنل ایش کی بیٹی مبارک محل براجتی ہے۔ ان کی بیٹی کی شادی بنگالے کے قاسم علی خاں کے لڑکے سے ہوئی ہے۔

اک ذرا ٹھہرنا۔ کون قاسم علی خاں۔ بنگالے کا آخری خود مختار نواب، وہ سید

زادہ جو اپنی شکست کے بعد دلی جا کر جلاوطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال فروخت کر کے اس کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

یہ شاہ زمن کا دارالسلطنت ہے۔ شاہ زمن نے گومتی کے کنارے امام باڑہ نجف اشرف تعمیر کرایا ہے۔ محرم میں اس میں چراغاں کیا جاتا ہے تو لگتا ہے طلسم ہوشربا کا ایک منظر ہے۔

بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ سودے والے اپنی اپنی شاعرانہ صدائیں لگا رہے ہیں۔ دکانوں میں دنیا جہان کا مال فروخت ہو رہا ہے۔ سعادت علی خاں کے عہد کی بنی ہوئی عمارتوں میں قہقہے گونج رہے ہیں، ان خوبصورت عمارتوں کی آرائش دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔ اتنی خوبصورتی اور نفاست پائدار ہو سکتی ہے!

حسن پائدار نہیں ہوتا۔ شاکیہ منی گوتم سدھارتھ نے ایک مرتبہ کاشی کے ہرنوں کے باغ میں کہا تھا۔ ہر شے فنا ہے، فنا سے بچو، دکھ سے بچو، سائے سے بچو اور ویدانت میں لکھا ہے کہ مایا کی مثال ایسی ہے گویا بانجھ عورت کا لڑکا سراب کے پانیوں میں نہانے کے بعد آسمان پر اگے ہوئے پھول پہن کر ہرن کے سینگوں سے بنی کمان ہاتھ میں لیے باہر نکلے۔ مت بھولو کہ رام چندر کے ایودھیا اور پرسن جیت کے شراوستی اور چندر گپت کے پاٹلی پتر اور کالی داس کے اجین اور حسین شرقی کے جونپور اور علاءالدین حسین کے گوڑ میں بھی زندگی کا حسن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور مت بھولو کہ ہر حسن میں موت پوشیدہ ہے۔

سڑک پر سے ایک سکھ پال گزر رہی ہے جس کے گنبد پر سنہری کلس سجا ہے اور

شوخ وشنگ مہری جس کا چھٹکا پکڑے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔ کہاروں کی وردیاں سرخ رنگ کی ہیں اور ان کی سرخ پگڑیوں پر مچھلی کے طلائی نشان بنے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ والی لاٹھیاں ہیں۔ راہ گیروں کی نظریں اس سکھ پال پر جمی ہیں، یہ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی چمپا کی سکھ پال ہے۔

وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

وقت اور حسن اور موت۔

باغوں میں میلے ہو رہے ہیں۔ مرغوں اور بٹیروں اور مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائیاں منعقد کی جا رہی ہیں۔ انگریز ریذیڈنٹ بادشاہ کے ساتھ بریک فاسٹ کھاتا جاتا ہے اور سامنے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا ہے، مشاعرے ہو رہے ہیں۔ دربار میں یکتائے روزگار رقاص پرکاش جی کتھک ناچ رہا ہے۔ شوالوں میں بھوانی کی پوجا ہو رہی ہے۔ آم کے کنجوں میں ملہار اڑ رہا ہے۔ شمشان گھاٹ پر وہ جو اس ہنگامے سے نکل گئے ہیں پھونکے جا رہے ہیں۔ نخاس میں داستان طرازوں نے اپنی محفلیں آراستہ کر رکھی ہیں۔ علماء اور حکماء کی مجلسوں میں مباحثے جاری ہیں۔ بھنگڑیے سبزی گھوٹنے میں محو ہیں۔ سرسنگھار اور بخیرے اور پکھاوج کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ قبرستانوں میں قبریں کھودی جا رہی ہیں۔

فنا۔ فنا۔ ہر شے فنا ہے۔

وقت فنا میں شامل ہے۔

وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا

ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔

اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بجے گی۔

چار پہر دن گزر چکا ہے۔ چار پہر رات گزر جائے گی، ہر پہر میں آٹھ گھڑیاں ہیں، ہر آٹھویں گھڑی پر گجر بجتا ہے۔ انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں اتر رہا ہے۔

وقت موت ہے۔

۳۱

عہد آصفی کے بنے ہوئے رومی دروازے کی نوبت کی آواز گوتم نیلمبر کے کانوں تک پہنچی، اس وقت اس کی شکرم شہر کے ناکے میں داخل ہو رہی تھی۔ ناکے پر اس نے سپاہی کو اپنا پروانہ راہداری دکھلایا۔ بادشاہ اودھ کے سپاہی نے پوچھا: ''قبلہ کہاں سے تشریف لاتے ہیں'' اس نے بتایا: ''کلکتے سے الہ آباد کے بینی گھاٹ تک جہاز پر آیا تھا، وہاں سے اسٹیج کوچ اور شکرم پر بیٹھا بارش سے بھیگتا چلا آتا ہوں۔''

''کہاں کا قصد ہے قبلہ؟''

''ریذیڈنسی۔''

سپاہی نے ایک لمحے کے لیے اسے غور سے دیکھا۔ ''فرنگی سرکار سے جناب کا سلسلہ ہے؟''

''ہاں'' اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

''ہاں میاں'' رام دین دوسرے سپاہی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا، ''خدا کسی نہ کسی وسیلے سے رازق ہوتا ہے، فرنگی کی سرکار ہی سہی۔''

اس کے بعد رام دین نے پہلے سپاہی کو ایک باموقع شعر سنایا اور گوتم نیلمبر کو داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ گوتم نیلمبر نے بچپن میں فارسی ضرور پڑھی تھی مگر ان لوگوں کی ٹکسالی اردو اس کے پلے نہ پڑی، یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ ملک میں ابھی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں نیٹو بادشاہ اب تک حکومت کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ شکرا آگے بڑھی۔

یہ شہر کے مضافات تھے۔ سڑک کے کنارے چند اہیر بھوبھل میں بھوری لگا رہے تھے۔ کہار جامن کے نیچے بیٹھے ستو گھولتے تھے۔ چھکڑوں پر منوں آم لدے چلے جاتے تھے۔ ایک پیپل کے نیچے لکڑ سلگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا جوگی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے بھوانی کا مٹھ تھا۔ نیلمبر نے غیر شعوری طور پر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی کالی ماں کو پردیس میں دیکھ کر اسے بڑی تقویت ہوئی۔ ریذیڈنسی نواب سعادت علی خان مرحوم کی ایک اطالوی طرز کی کوٹھی تھی جسے فرنگیوں نے خرید لیا تھا، وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ صاحب نواب کمال رضا بہادر کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کی آمد کی اطلاع اودھ سرکار کے سررشتۂ اخبار کو بھجوا دی گئی۔ دوسرا ہرکارہ گولہ گنج میں نواب کمال رضا بہادر کے مکان پر پہنچا۔

نواب ابوالمنصور کمال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ (جو دراصل چوبیس

سالہ نواب کمن کا وہ نام تھا جو محض شاہی اور ریذیڈنسی کی تقریبات پر لیا جاتا تھا) کھانے کے بعد ریذیڈنٹ کے ساتھ بیٹھے چوسر کھیلتے تھے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرشد آباد اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں سے ان کی قرابت داری تھی، کافی بڑا تعلقہ کلیان پور میں تھا۔ خوش شکل تھے اور خوش آواز۔ مرثیہ خوانی پوری راگ داری سے کرتے تھے اور میر انیس کے ساتھ ساتھ مجلسیں پڑھتے تھے۔ شہر کی طوائفیں ان پر عاشق تھیں۔ شاعر تھے اور دیوان مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ شادی سولہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی، اب تک متعدد خانہ زاد لونڈیوں سے متمتع کر چکے تھے۔ ان دنوں چمپا جان پر لٹو ہو رہے تھے، مگر اب معلوم یہ ہوتا تھا کہ کلکتے والے سرل صاحب کی طرح یہ ریذیڈنٹ صاحب بھی اس کے رقیب بننے پر تلے بیٹھے تھے۔ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ چوسر کی چال بھی سوچ رہے تھے کہ چوبدار نے آ کر اطلاع دی کہ ایک بنگالی بابو کلکتہ گورنمنٹ سے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ نیلی گارد میں باریابی کے منتظر ہیں۔

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ برآمدے میں جلترنگ بج رہی تھی، ابھی چمپا آنے والی تھی۔ ریذیڈنٹ کو بڑا غصہ آیا۔ جب سے لارڈ ایمہرسٹ کلکتے میں گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اس نے اپنے انتظامات اور مستعدی سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اچھی خاصی ڈاک بٹھا دی تھی، ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی پیغامبر کلکتے سے یہاں پہنچتا رہتا تھا۔ دل چمپا کے ناچ میں پڑا تھا مگر برطانوی حکومت کی وفاداری اور فرض کے عظیم تصورات نے چمپا کے خوش آئند ہیولے کو دھندلا دیا۔ ریذیڈنٹ صاحب فوراً نیلی گارد لوٹ گئے۔

''یہاں چمپا بائی کہاں رہتی ہیں؟'' دوسرے روز گوتم نیلمبر نے ریذیڈنسی کے ایک منشی سے دریافت کیا۔ ہری شنکر زیر لب مسکرایا۔ یہ بنگالی بابو بھی اہل دل معلوم پڑتے ہیں، بھئی واہ ہم جانتے تھے یہ بیٹھے لکھا پڑھی ہی کرتے رہیں گے۔

''کیا آپ بی چمپا صاحب کے یہاں تشریف لے جایئے گا؟''

''ہاں'' اس نے گھبرا کر جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہری شنکر اس کی گھبراہٹ پر بہت متعجب ہوا کیونکہ ہری شنکر کے اس معاشرے میں طوائف کا درجہ بہت اہم تھا اور باعزت۔ جس کے بغیر مہذب سوسائٹی مکمل نہیں تھی۔ منشی ہری شنکر نے ہرکارے کے ذریعے چمپا کو اطلاع بھجوائی کہ سرل صاحب کے منشی ملنا چاہتے ہیں۔ چمپا نے کہلوایا: زہے نصیب، ضرور آویں۔

شام پڑے جب موتیا اور خس کی خوشبو ہوا میں امنڈی اور زمین پر کیوڑے اور گلاب کا چھڑکاؤ کیا گیا، چوک روشنیوں سے بقعہ نور بن گیا تب گوتم نیلمبر دت کا ہوادار چمپا جان کے سبز رنگ کے سہ منزلہ مکان کے سامنے جا کر رکا جس کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے تھے اور پھاٹک پر وردی پوش چوبدار کھڑے تھے۔

گوتم جھجکتا ہوا ہوادار پر سے اترا اور دوشالہ کندھوں سے لپیٹتا زینے پر چڑھا۔

کمرے پر بڑا جماؤ تھا۔ فرش پر سفید چاندنی کھنچی تھی۔ سفید چھت گیری میں جھاڑ آویزاں تھے۔ طاقچوں میں کنول اور گلاس روشن تھے۔ صحنچی، جو چوک کے رخ کھلتی تھی، اس پر گلات کی بیل چڑھی تھی۔ دروازوں کے برابر پھولوں کے بڑے بڑے چینی کے گملے رکھے تھے جن سے سارا کمرہ معطر تھا۔ صحنچی میں کسی نے مال گنج چھیڑ رکھا تھا۔ چاروں طرف قد آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں میں گوتم

نیلمبر کو عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں۔ ایسے لوگ جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کدھر کو جائیں گے؟ یہاں اس معطر کمرے میں کب تک ان کا جماؤ رہے گا؟ یہ لوگ جو شربتی کے چنے ہوئے انگرکھے اور گلبدن اور مشروع کے کلیوں دار پائجامے اور دوپلی اور نکے دار ٹوپیاں اور مندیلیں پہنے شالی رومال اوڑھے اطمینان سے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے ان کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں، ان میں جوان اور ادھیڑ اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ متین، ثقہ، سنجیدہ، مہذب، نہایت خاموشی اور اہتمام سے یہ لوگ بیٹھے بڑے تکلف اور اخلاق سے آہستہ آہستہ رک رک کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک کونے میں راجہ شیو کمار وفا کے کسی شعر پر بحث ہو رہی تھی، دوسری طرف چند حضرات موسیقی کے کسی نکتے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔

نیلمبر دت لمحے بھر کے لیے شرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا، اس نے اپنا بہترین چوغہ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر مندیل تھی مگر اس کی شکل وصورت ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ پردیسی ہے۔ حاضرین محفل نے اسے دیکھ کر تہذیب کی وجہ سے کسی اچنبھے کا اظہار نہ کیا۔ نواب کمن نے، جو صدر نشین تھے، اسے اپنے قریب بلا کر مسند کے قریب جگہ دی اور اس سے خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔

''ہمارا بھی کلکتے جانے کو بہت جی چاہتا ہے مگر معاذ اللہ بہت جوکھم کا سفر ہے۔'' انہوں نے کہا، وہ گنگا جمنی گڑگڑی پیتے جاتے تھے اور ان کے خوبصورت

چہرے پر فانوس کی روشنی آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ''بنگال کے زمینداروں کا کیا کہنا، بڑے بڑے رفیع الشان روساء اس ملک میں ہیں۔ جناب کا تعلقہ بنگالے میں کس طرف ہے۔۔؟'' نواب کمن کے ایک مصاحب نے پان کی تھالی پیش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''میرا تعلقہ کہیں نہیں ہے، ملازمت کرتا ہوں۔''

''ملازمت؟''

اب نیلمبر کو پھر وہی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی جس کا اسے ناکے پر سامنا کرنا پڑا تھا۔ ''میں کمپنی کی سرکار میں ملازم ہوں۔''

''خوب۔'' نواب کمال رضا نے پہلو بدلا۔ ''تب تو جناب انگریزی بھی پڑھے ہوں گے۔''

کسی اور نے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ تھوڑی سی شدبد ہے۔''

''اچھا بھلا کتنی۔ خط پڑھ لیتے ہیں؟''

نیلمبر دت مسکرایا۔ ''جی ہاں'' اب ذرا اس نے آرام کا سانس لیا۔ یہ بڑے نیک طینت اور بھولے لوگ تھے، ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت تھی، گو یہ عجیب بات تھی کہ یہ بھی اسی دنیا میں رہتے تھے جس میں وہ زندہ تھا۔

نواب کمن اس سے نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے رہے جن کے انتقال کو چند سال ہی گزرے تھے اور جنہوں نے لکھنؤ میں کلکتے کے طرز کی عمارتیں بنوا کر شہر کو یورپین رنگ دے دیا تھا۔ گوتم نیلمبر ان کو کلکتے کی باتیں بتلاتا رہا۔

اتنی دیر میں ساز ملائے گئے۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نک سک سے درست، چمپئی رنگت، سیاہ بھنورا بال اور سیاہ آنکھیں، ناک میں ہیرے کی لونگ پہنے، اودے گرنٹ کے فرشی پائجامے میں ملبوس گوندنی کی طرح زیوروں سے لدی بڑے ٹھسے سے چلتی ہوئی آ کر وسط میں بیٹھ گئی اور بڑے دلفریب انداز میں اس نے جھک کر نیلمبر دت کو تسلیم کی، پھر اس نے شہانا میں آصف الدولہ کی غزل شروع کی:

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف

تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

تماشا خدائی............

سامعین مسحور ہو کر اس کی آواز سنتے رہے۔ گوتم نیلمبر اس کی شکل دیکھنے میں محو تھا۔

کلکتے کا انگریزی داں برہمن کلرک لکھنؤ کے جادو میں گرفتار ہو گیا، دن گزرتے گئے۔ بارشوں کی وجہ سے کلکتے تک کے راستے بند تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔ بھادوں کا مہینہ آیا۔ اماوس کی راتیں جب چمپا اپنی صحنچی میں بیٹھ کر گوڑ ملہار گاتی۔ جب کنجوں میں کرشن کنہیا کے لیے جھولے ڈالے گئے۔ برج کے رہس دھاریوں نے کرشن لیلا کے سوانگ تیار کیے۔ چمپا رادھا بنی۔ کبھی چمپا کو گوتم نے ہز میجسٹی شاہ زمن غازی الدین حیدر کے دربار میں دیکھا جہاں وہ آواز کے شعبدے دکھائی تھی، اس نے چمپا کو جمعرات کے روز درگاہ حضرت عباس جاتے دیکھا۔ میلوں اور

باغوں میں دیکھا۔ گومتی پر بجرے میں تیرتے دیکھا، ہر طرف چمپا تھی۔

وہ شنیلا کا جو پیغام اس کے پاس لے کر آیا تھا کب کا بھول چکا تھا۔

اس رات جب وہ چمپا کے یہاں سے لوٹا آدھی رات کا گجر بج چکا تھا، نیچے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد چمپا نے حاضرین سے اجازت چاہی تھی اور کورنش بجالانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی، چلتے چلتے رک کر اس نے نیلمبر سے کہا تھا: ''آپ ہی بنگالے سے آئے ہیں نا، پھر بھی آتے رہیے گا، ہم غریبوں کو بھول نہ جایئے گا۔'' اس کے بعد محفل برخاست ہوئی تھی۔ اب گلیوں میں سائے پھر رہے تھے۔ سارا شہر سوتا تھا۔ صرف چوک کے بالاخانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر اب وہ بھی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ نواب کمن اور دوسرے معززین اپنے ہواداروں، تامجانوں، پالکیوں اور بوچوں پر سوار ہو کر اپنی محل سراؤں کی طرف جا چکے تھے۔ سوتا ہوا شہر۔

اس سے گوتم نیلمبر حسب معمول جاگتا تھا، وہ تو اکثر اپنی راتیں جاگ کر گزارتا تھا۔ راج شاہی میں، جہاں اس کا جھونپڑا دھان کے کھیتوں میں تھا، وہ اپنی کوٹھڑی میں دیا جلا کر رات رات بھر بنگالی پڑھا کرتا تھا۔ بنارس میں رات گئے تک وہ لیمپ کی روشنی میں سنسکرت کا مطالعہ کرتا تو عجیب باتیں اس کے دماغ میں آتیں۔ مابعدالطبیعیات، یہ جانے کس زمانے کی باتیں تھیں اور کس قدر غیر ضروری مگر کالی داس اور بھرتری ہری اور راج شیکھر پڑھ کر وہ سوچ میں کھو جاتا، کیا کبھی ایسا زمانہ بھی تھا جب ہم نیٹو لوگ ایسے قابل ہوتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔

کلکتے میں وہ رات رات بھر پڑھتا اور پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا، آج پہلی

مرتبہ رات کو ورڈز ورتھ اور شیلے اور کالی داس کے متعلق سوچنے کے بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصور نے اپنا تسلط جما لیا۔ اسے بڑا غصہ آیا، کوفت بھی ہوئی۔ عورتوں کے مسئلے پر اس نے بہت کم سوچا تھا۔ راج شاہی میں جب سترہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے وہ بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس اور کلکتے کی طالب علمانہ زندگی میں ہزاروں مصروفیتیں تھیں۔ عاشقی کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا، ابھی تو اسے بی۔ اے کرنا تھا۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنا اس کا مقصد حیات تھا، پھر ممکن ہے وہ انگلستان بھی جا سکے۔

لکھنؤ کی اس ویشیا سے اس سے مطلب؟ وہ سر جھکائے سڑک پر آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کے کہاروں نے اسے آواز دی: فینس ادھر ہے خداوند، وہ مڑا اور فینس پر سوار ہو کر اپنے جائے قیام کی طرف چل دیا۔ دوسرے روز سے بھادوں کے جھالے شروع ہو گئے۔ دن بھر وہ ریذیڈنسی کے دفتر میں بیٹھا رہتا، کبھی کاغذات لے کر آغا میر وزیراعظم کے مکان پر جاتا، کئی بار وہ شاہی محل بھی گیا اور ہز میجسٹی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو انگریز بادشاہوں کا لباس پہنے (جو گوتم نیلمبر نے ولیم چہارم کی تصویروں میں دیکھا تھا) مرصع کرسی پر بیٹھے تھے اور ریذیڈنٹ جھک کر بڑے ادب سے ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا، دن اسی طرح مصروفیات اور چہل پہل میں گزر جاتا، رات قیامت بن کر آتی۔

رات، جو چمپا کی راجدھانی تھی۔ اس رات میں گوتم نیلمبر دت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی زندگی اور دنیا میں ویشیا کا خیال ہی کراہت انگیز تھا، پھر وہ سوچتا عورت جو دیبی ہے۔ لکشمی، گوری، اوما۔ جو ماں ہے اور بہن اور بی بی اور بیٹی۔

اسے طوائف نہیں ہونا چاہیے، یہ بڑی زیادتی ہے، پھر اسے خیال آیا کہا جاتا ہے عورت تو محض دکھ سہنے کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اس میں عورت کی عظمت ہے جس کی ساری عمر مرد کی ٹہل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے۔ پتی ورتا عورتیں، بال ودھوائیں۔ یتیم لڑکیاں جن کو ورثہ نہیں ملتا۔ عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے، جو ستی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے مگر اس چمپا کو دیکھو جو خود جل کر مرنے کے بجائے دوسروں کو جلا جلا کر مارتی ہے۔

نا استری سوتنترم۔ منو مہاراج میں لکھا ہے۔ عورت آزاد نہیں ہے، بالکل صحیح تھا۔ رامائن کی چھٹی کتاب میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ خطرے کے وقت، شادی کے موقعے پر اور عبادت کے سمے عورت باہر آجائے تو قابل اعتراض نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ عورت کے وید پڑھنے سے بڑا انتشار پھیل سکتا ہے۔

سنتے ہیں کہ کسی زمانے میں دیس کی عورتیں باکمال ہوتی تھیں، پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ بے پردہ گھومتی تھیں اور جانے کیا کیا۔ اپنے گاؤں کی مسلمان عورتوں سے اس نے بھانومتی اور کنچن مالا اور کسم مالتی مالا اور رانی مینامتی کی جو روپ کتھائیں بچپن میں سنی تھیں ان سب میں بھی پرانے وقتوں کی عورتوں کی بڑائی کے قصے تھے، لیکن یہ سب گپ تھی۔ بھلا ہماری عورتیں جو اس قدر جاہل اور پس ماندہ ہیں کبھی بھی بہتر حالت میں رہی ہوں گی، یہ عقل میں نہیں آتا۔ نا استری سوتنترم۔

شہنشاہی اور جاگیردارانہ سماج میں عورت کو آزادی محض اسی وقت میسر ہوتی ہے جب وہ بازار میں آکر بیٹھ جائے تب اس کو عزت بھی ملتی ہے دولت بھی، پھر

اس کے لیے شعروشاعری کرنا بھی جائز ہے لکھناپڑھنا بھی۔ ورنہ علیحدہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپابائی اسی نظام کی پروردہ تھی اور گوتم اس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ خود ان نئے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا اور جاگیردارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقدار الگ بنا رہا تھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔

منشی ہری شنکر کے ساتھ وہ ایک روز کشتی میں ندی پار کر کے مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے رمنا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نظر سامنے پڑی، ایک سنہرا بجرا آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔

''دہائی ہے کمپنی بہادر کی!'' اس کی کانوں میں ایک نقرئی آواز آئی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ چمپا کی آواز تھی جو دوسرے بجرے میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کو گھبرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اگر وہ اہل لکھنؤ کی صحبت میں ذرا زیادہ رہ لیا ہوتا تو جواباً کہتا کہ حضور یہ فقرے ہم پر تیز کرتی ہیں، مگر وہ بالکل ہڑبڑا گیا۔ سامنے سے آغا میر کا بجرا آ رہا تھا۔ چند اور مرصع اور منقش کشتیوں میں امراء و وزراء، صاحبان عالیشان، یعنی انگریز اور شہر کی نامی طوائفیں رمنا جا رہی تھیں۔ دریا پر مچھلی اور گھوڑے کی شکلوں کے بجروں کا میلہ سا لگا تھا۔ اتنے میں چمپا کی کشتی قریب آ گئی۔

''ہماری کشتی میں آ جائیے۔'' اس نے کہا۔

''تا کہ آپ ان کو بھی لے ڈوبیے۔'' ہری شنکر نے جواب دیا، اس کے بعد دونوں میں ضلع جگت شروع ہو گیا، ہنستے بولتے یہ سب گھاٹ پر پہنچے۔ بارہ دری کی

طرف جاتے ہوئے ہمت کر کے گوتم نیلمبر نے طے کر ڈالا کہ جو فرض اسے شنیلا دیبی نے سونپا تھا اسے ادا کر کے کم از کم اپنے ضمیر کو ہلکا کر لے۔ جس وقت چمپا پائنچے اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی گوتم نیلمبر نے اس سے پوچھا:

''تم سرل صاحب کو جانتی ہو۔''

وہ چپ رہی۔

''چمپا بائی جی میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔''

''اچھا جانتے ہیں، پھر تم سے کیا۔''

''ان کی بی بی ہے، کلکتے میں۔'' اسے توقع تھی کہ یہ سن کر چمپا کا رنگ فق ہو جائے گا، عرق ست اس کی پیشانی پر چمکنے لگے گا مگر وہ اطمینان سے بولی: ''اچھا تو پھر۔ جتنے لوگ ہم سے ملتے ہیں سب کی بیبیاں ہوتی ہیں۔''

''ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔'' نیلمبر نے اور زیادہ اہمیت کے ساتھ کہا۔

''سب کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، تم اپنا مقصد بیان کرو۔''

''تم سرل صاحب سے قطع تعلق کر لو، یعنی اب کے سے جب سرل صاحب یہاں آئیں تو ان سے نہ ملنا، وہ ریذیڈنٹ بن کر یہاں آنے والے ہیں اگلے مہینے۔''

چمپا ٹھٹھک گئی اور ایک لمحے کے لیے اس بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ ''آپ عجیب ہونق انسان ہیں۔ حضرت یہ کہئے کہ اب آپ کی ہم پر طبیعت آئی ہے!''

نیلمبر کو چکر سا آ گیا۔ حد ہو گئی بیہودگی کی، اس کا جی چاہا وہیں سے الٹے پاؤں واپس چلا جائے مگر اب لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ خلقت جمع ہو چکی تھی۔ بادشاہ

سلامت اور اہل دربار اپنی کرسیوں پر فروکش ہو رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا، وہ جا کر ایک طرف کو چپکا کھڑا ہو گیا۔

واپسی میں اسے نواب کمن اور ریذیڈنٹ کے ساتھ ساتھ تک گھاٹ آنا پڑا۔ بجرے میں چمپا کا ساتھ ہو گیا۔ اس کشتی میں اور کوئی نہ تھا، وہ اسے بڑی محبت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''سنو جی'' اس نے دفعتاً کہا۔ ''ہم سرل صاحب کو ہزار دفعہ چھوڑ دیں گے، مگر تم ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ۔ تم ہمیں بہت زیادہ بھا گئے ہو۔''

وہ خاموش رہا۔

چمپا کی رنگت سرخ ہو گئی۔ ''تم نے سنا۔ ہم۔ چمپا جس پر ایک عالم جان دیتا ہے خود بے حیا بن کر تم سے یہ کہہ رہے ہیں، مغرور آدمی۔''

وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں تیزی سے جھلملانے لگیں، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بجرا اب چھتر منزل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''ہم نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا، بد بخت مغرور آدمی۔ اپنے آپ پر زیادہ نازاں نہ ہونا، یہ وقت بہت جلد گزر جائے گا'' کشتی گھاٹ تک پہنچ گئی۔

گوتم نیلمبر نے آنکھیں کھول لیں، وہ اسے تیوری پر بل ڈالے غور سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ ہنس پڑی۔ ''ہونق آدمی۔'' اس نے پیار سے کہا۔ ''بات کرنے کی تم کو تمیز نہیں اور تم پر ہم عاشق ہوئے ہیں، یہ قدرت کا تماشا دیکھو!'' نیلمبر چپ چاپ بجرے پر سے اترا۔ چمپا نے اپنی سکھ پال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہمارے یہاں آؤ گے نا؟ از برائے خدا ضرور آنا۔ میاں نیلمبر صاحب۔ تم کو کیا

کہہ کر پکاروں؟ پنڈت جی مہاراج۔ ورنہ پانڈے جی پچھتائیں گے۔ دال چنے کی کھائیں گے۔''

نیلمبر دوسری طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی اور ہری شنکر کی پالکی اور کہاروں کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

''ہم سے ملو گے نا؟''

''نہیں''نیلمبر نے مختصر سے جواب دیا اور جلدی سے جا کر اپنی پالکی میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وہ تین دن تک نہیں سو سکا، اس دوران میں اس کے پاس چمپا کے متعدد پیغام آئے۔ اس قدر اچانک اس عورت نے یہ کیسا ناٹک کھیلا تھا، مگر عورت کے چرتر آج تک کون سمجھ پایا ہے۔ یہ لڑکی، بڑے بڑے دھنوان اور سورما جس کے ناز اٹھاتے تھے، اسے میری کون سی ادا بھا گئی۔ منشی ہری شنکر نے فائلوں پر سے سر اٹھا کر اس سے کہا: ''بھائی نیلمبر۔ ہمارے کاشی کے کبیر داس کہہ گئے ہیں۔

چھوٹی موئی کامنی سب ہیں بس کی بیل

بیری مارے داؤں سے یہ ماریں ہنس کھیل

مگر تم اس کے یہاں چلے کیوں نہیں جاتے، اس میں کیا حرج ہے؟''

نیلمبر اودھ کے اس لالہ بھائی کو نہ سمجھا پایا کہ چمپا کے یہاں جانے میں کیا حرج ہے۔

''بھگوان نے ناری ہمارا جی بہلانے کے لیے تو بنائی ہے۔''ہری شنکر نے پھر کہا۔ نیلمبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ناری تو بڑی مقدس چیز ہے، اسے تم دل کا

بہلاوا سمجھتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''ارے میاں'' ہری شنکر نے حقے کا کش لگا کر ہنس کے جواب دیا، ''ہم نے اس کوچے میں بڑے بڑے جٹا دھاری برہمن چکر لگاتے دیکھے ہیں، تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

نیلمبر اٹھ کر باہر آ گیا اور ریذیڈنسی کے باغ میں بلا مقصد ٹہلنے لگا۔ مالی مولری کی چھاؤں میں چلم پیتے تھے اور شاگرد پیشے میں کہاروں کی محفل میں کٹورا چل رہا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے برآمدے میں منڈیاون چھاؤنی سے آئے ہوئے دو گورے شراب کے نشے میں دھت ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، اتنے میں اسے ٹیلے کی ڈھلان پر زرد رنگ کا دوپٹہ اوڑھے جمنا مہری اوپر چڑھتی نظر آئی۔ جمنا مہری جو چمپا کی پیغامبر تھی، وہ خاموشی سے پھر اندر چلا گیا۔

کوار کا مہینہ لگ چکا تھا اور الہ آباد میں جہاز کلکتے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کاغذات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لیے تیار ہوا۔

جب وہ ناکے کی طرف جا رہا تھا، یکایک اس نے گاڑی بان سے پوچھا: ''یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔''

''نخاس۔۔۔خداوند۔۔۔''

''ادھر گاڑی موڑ لو۔''

''بہت خوب۔۔۔خداوند۔''

شکرم چمپا کے مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی، وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر گیا۔ چمپا صحنچی میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کی آواز سن کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

''تم آ گئے۔''

''نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔''

''دو گھڑی رک جاؤ، دودھ کھاؤ گے، شربت منگوا دوں؟'' اس کا تامل دیکھ کر اس نے کہا۔ ''برہمن کی دکان سے جل پان منگوا دوں؟''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے معلوم ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''میں۔ میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔''

''خدا حافظ۔''

وہ دروازے میں ٹھٹکا رہا۔

''ہمارے شہر کا دستور ہے دعا دیتے وقت کہتے ہیں: سوا غم حسینؑ کے خدا کوئی غم نہ دے، یہ دعا میں تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسینؑ کا غم بھی نہیں جانتے، تم تو جانتے ہی نہیں غم کہتے کسے ہیں۔''

''سنو، چمپا،'' نیلمبر نے دھیرے سے کہا۔ ''تمہاری زندگی اتنی رنگین ہے، بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی، کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے۔''

''ہاں میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا، تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوت چھات نہیں کرتے۔''

''سنو۔'' اس نے چمپا کو پھر سمجھانے کی سعی کی۔ ''تم کو میں اس لیے پسند ہوں کہ ان سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمہارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔''

''کیا تمہارے دیس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔'' اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو ہنسی آ گئی ''ہوتی کیوں نہیں مگر تمہاری جیسی نہیں، اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

''اللہ۔ کس قدر طنطنہ ہے، معلوم ہوتا ہے راجہ جھاؤ لال کے جانشین آپ ہی ہیں۔'' چمپا نے ہنسنے کی کوشش کی۔

اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ شہر میں چاروں طرف پنجشاخے چڑھائے گئے۔ فانوس جگمگائے، قندیلیں جلیں، نیچے سڑک پر سے ایک بارات گزر رہی تھی۔ تخت رواں پر ناچ ہوتا جا رہا تھا۔ ماہی مراتب کی قطار میں لڑکے بالے اور شہدے اچھلتے کودتے چل رہے تھے، دوسرے تخت رواں پر سوانگ اور کرتب ہو رہے تھے۔ روشن چوکی بج رہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی بالا خانے کی کھڑکیوں پر آ کر پڑی، اس روشنی میں چمپا کا کامدانی کا دوپٹہ جھک جھک کرنے لگا۔ نیچے ڈومنیاں سوہا گاتی جا رہی تھیں۔ چمپا کھڑکی میں آ کر بارات دیکھنے لگی۔ ''جانے کس سہاگن کی بارات ہے۔'' اس نے کہا، نیلمبر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس کی مانگ میں سیندور ہو گا، پیروں میں مہندی، ناک میں سہاگ کی نتھ۔'' اس نے آہستہ سے اپنی مانگ کو چھوا جس میں افشاں چنی تھی لیکن جو سیندور سے عاری تھی، اب یہ پھر ناٹک کھیل رہی ہے۔ گوتم نیلمبر نے پریشان ہو کر سوچا۔

''آدمی اس قدر کٹھور ہوتا ہے۔'' چمپا نے کہا۔

''ہمیشہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے پر یہ الزام رکھتے آئے ہیں، یہ تکرار

بھی فضول ہے۔''

''تم ابھی جارہے ہو۔''

''ہاں۔''

''صبح ہوتے ہوتے لکھنؤ سے بہت دور نکل چکے ہوگے۔''

''ہاں۔''

''یہ دوہا سنا ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کی بھور کبھی نہ ہوئے''

نیلمبر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ شہر کا شہر کسی میلے کے لیے ایک سمت کو رواں تھا۔ گلیوں میں سنڈے موچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ قلما قنیاں، حبشنیں، ہڑونگیاں، چونے والیاں، قصباتی پاتریں چھن چھن کرتی ٹولیاں بنائے باغ کی طرف جارہی تھیں۔ بانکے اپنی تلواریں چمکار ہے تھے۔ مدکیے، چرسے، بھنگڑیے چنڈو خانوں میں جمع تھے۔ چوطرفہ غل مچا تھا۔ دنیا کس قدر رنگا رنگ جگہ تھی، اسی دنیا کو بھرتری ہری نے رنگ بھوم کہا تھا۔

اس رنگ بھوم پر ایک بے معنی ناٹک یہ بھی کھیلا جارہا تھا، اندھیرا چھانے لگا۔ اس کی شکرم نیچے منتظر کھڑی تھی۔

بھاگو میاں، بھاگو یہاں سے جلدی۔ کلکتے کا راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔ کلکتے چلو۔ تمہارا ٹھکانہ وہیں ہے میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔

پھر وہ جلدی سے اپنا کاغذات کا بقچہ سنبھال کر تیزی سے زینے سے اترا، اس

نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا اور سیدھا شکرم میں پہنچ کر دم لیا۔

گاڑی کے پہیوں نے سڑک کے پختہ فرش پر شور مچانا شروع کیا۔ بارات کا ہنگامہ ابھی باقی تھا۔

بھیڑ میں سے نکلتی شکرم آغا میر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئی۔ نوعمر کوچبان، ہٹیے گا مہربان، ذرا بچ کے قبلہ، کی ہانک لگاتا شہر کے باہر نکل آیا۔ اب وہ حضرت گنج کی مانوس سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف اونچی گوتھک وضع کی انگریزی عمارتوں میں کنول جلتے تھے۔ سڑک پر سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے اور ہاتھی اور پالکیاں گزر رہی تھیں۔

یہ راستہ نسبتاً سنسان تھا، وہ ناکے پر پہنچ گئے۔ جامن کے نیچے چند بیراگی بیٹھے تھے جنھوں نے پر اسرار آنکھوں سے نیلمبر کو دیکھا، ان میں سے ایک وہی تھا جسے نیلمبر نے پہلے روز تاکا تھا۔ اسے بھوانی کے مٹھ کے سامنے عود سلگ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے مورتی کو غور سے دیکھا۔ ماتا کو وہ کالی کے روپ میں جانتا تھا، اب وہ شکر گزار ہوا کہ ماتا نے اسے اپنے جوگ مایا (جوگ مایا درگاہ کا ایک روپGoddess of illusion) کے روپ کے بھی درشن کرا دیے۔ ماں، میں نے تمہاری یہ لیلا ابھی دیکھ لی، اب واپس جاتا ہوں۔ اپنی شکتی سے اسی طرح میری حفاظت کرتی رہنا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ایک جوگی، جس نے پہلے روز اس سے بات کی تھی، اس سے گویا ہوا: ”بڑی جلدی واپس جاتے ہو۔“

"سراب کے ساحل پر تاخیر کرنا عقلمندی نہیں، یہ تمہارا شہر سراب کا شہر ہے۔"
نیلمبر نے لکھنؤ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دور مچھی بھون میں چوتھے پہر کا گجر بجا۔ بیراگی نے اسے دھیان سے دیکھا: "سراب کی حقیقت اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آجاتی بچہ۔"

"بابا۔" نیلمبر نے رک کر کہا، "جو لوگ مایا نے اپنے دسوں ہاتھوں سے مجھے اپنی اور کھینچنا چاہا، لیکن دیکھو میں صحیح و سالم واپس لوٹ رہا ہوں۔"

"ہم میں سے کوئی صحیح و سالم نہیں ہے، ہم سب کمہار کے کھلونے ہیں اور ہر سے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی مضبوطی پر نازاں نہ ہونا۔" پھر اس نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اسے سونگھا۔

"دیکھو، اس میں کتنی خوشبو ہے، اس مٹی کو لے جاؤ۔ کٹک میں جوگ مایا کا مندر ہے، اس میں چڑھا دینا۔"

نیلمبر نے ہاتھ بڑھا کر مٹی لینے میں پس و پیش کیا، یہ گورکھ ناتھ کا جوگی پھر اپنے گورکھ دھندے دکھا رہا تھا۔

"لے لو۔۔۔ یہ لکھنؤ کی مٹی ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ اس شہر کا جادو یہ ہے کہ چھٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے۔"

جوگی بڑی شستہ زبان بول رہا تھا۔

"بابا۔۔ تم بیراگی کیوں بن گئے۔" نیلمبر نے پوچھا۔

"تم۔۔۔ تم مجھے جانتے ہو۔۔؟" جوگی نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔"

''ہاں، جاننا بہت مشکل ہے، اور جاننے والے کو کون جان گا۔'' جوگی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیلمبر نے اپنشد میں یہ جملہ پڑھا تھا۔ بیراگی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلمبر کے جذبہ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔

''بابا۔۔۔ میں پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو؟''

''کیوں۔ کیا تمہارا ابھی اس راہ پر چلنے کا ارادہ ہے۔''

''ارے۔۔۔ نہیں تو۔۔''

''کیوں جی۔۔ فرنگی کی جاسوسی کرتے ہو؟''

نیلمبر کے دل پر یہ بات موگری کی طرح جا کر پڑی۔ جوگی کے لہجے میں اتھاہ حقارت تھی۔

''میں۔ میں فرنگی کی جاسوسی نہیں کرتا۔'' اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''سچ کہتے ہو؟'' جوگی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''ہاں۔ بالکل سچ۔''

''اچھا تو سنو، میں راجہ بینی بہادر کا بیٹا ہوں۔ راجہ بینی بہادر کا نام سنا ہے؟ وہ مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ کے نائب السلطنت تھے جو جناب عالی (نواب اودھ) اور عالیجاہ (نواب بنگال) کے ساتھ جی توڑ کر تمہارے صاحبان عالی شان کی فوج سے لڑے تھے۔ گنگا کے کنارے ایک طرف میرا بہادر باپ اور بنارس کا راجہ بلونت سنگھ اور گوسائیں ہمت بہادر اور روہیلے تھے۔ دوسری طرف فرنگیوں کا لشکر۔۔۔ گوسائیں ہمت بہادر کے ننگے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے

تھے۔ دنا دن سمرو کی توپ چلتی تھی مگر فرنگیوں نے میرے باپ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں کی باڑھ اور تلنگوں کی یورش میں ہمارے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار ایک ایک کو پکارتا پھرا، ارے کم بختو کدھر بھاگ رہے ہو۔ جناب عالی نے للکار للکار کر سراسیمگی سے کہا، تم مغل کہلاتے ہو اور میدان چھوڑ کر بھاگتے ہو۔۔۔ مگر ہماری فوج۔۔ درگاوتی ندی پار کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں ندی میں ڈوب گئے۔۔ ہندوستان پر قیامت گزر گئی۔۔۔''وہ ذرا کی ذرا دم لینے کے لیے رکا، جوش کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، پھر یہ سرخی اداسی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: ''تمہاری فرنگی سرکار نے اسی وقت دیکھ لیا کہ اس قوم میں اتفاق جاتا رہا۔ عالیجاہ اور جناب عالی ہی میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شقے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گہر کو دلی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتے سے شرائط کرنے پر آمادہ ہیں، یہ کیسا ذلیل ملک ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے سے اعتبار اٹھ گیا ہے، میرا باپ جناب عالی کا سب سے زیادہ نمک حلال اور وفادار ملازم تھا، دشمنوں کے بہکائے میں آ کر جناب عالی نے اس کو نمک حرام تصور فرمایا اور اس کی سزا کے درپے ہوئے۔''

''ارے۔۔۔'' نیلمبر کے منہ سے نکلا۔

''جناب عالی نے منڈیاون چھاؤنی میں میرے باپ کے خیمے میں قیام فرمایا اور کھانے کے بعد میرے بابا سے کہا: ''راجہ تم بھی اس وقت شکار کو چلو۔'' انہوں نے عرض کی۔ ''غلام نے بدولت حضور بہت سے شکار دیکھے ہیں۔'' فرمایا:

''آج کا شکار بہت عجیب و غریب ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا، جو دم ہے غنیمت ہے۔'' وہ بابا کو اپنی خواص میں بٹھا کر اپنے لشکر کی طرف چلے، بابا سمجھ گئے کہ یہ میرا دام گرفتاری ہے مگر کیا کر سکتے تھے۔ حکم حاکم مقدم تھا۔ عالی جناب کے حکم سے بابا کی دونوں آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ ان کا علاقہ ضبط سرکار ہوا۔ تیرہ سو گھوڑوں، اٹھارہ ہاتھی اور پورے توپ خانے کے علاوہ ایک وسیع زمینداری کے میرے بابا مالک تھے، میں صرف اس مرگ چھالا کا مالک ہوں۔''

جوگی خاموش ہو گیا۔۔۔

نیلمبر مبہوت بیٹھا قصہ سنتا رہا۔ جوگی نے آگ میں ایک لکڑ اور ڈال دیا اور اکڑوں بیٹھ کر کہنے لگا: ''سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے، تم اس کی حقیقت کو کیا جانو! تم اسی چکر میں شامل ہو اور رہو گے۔۔ مجھے سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے، کمپنی کی خوشی اور ناخوشی، بادشاہ کے عتاب، کسی چیز کی پرواہ نہیں۔۔ میرے بابا کو اندھا کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندھا کون کر سکتا ہے، سوائے میرے خود کے۔ جاؤ۔ اب تم کو دیر ہوتی ہے۔ کٹک میں جب جوگ مایا کے مندر میں جاؤ تو دیکھنا کہ اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان گنت دروازے اور ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ کھلتا ہے اس کے بعد تیسرا۔ اس طرح کی بھول بھلیاں اور غلام گردشیں چاروں طرف بنی ہیں جن سے انسان نکل نہیں سکتا، تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو، مگر تم غلطی پر ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔''

نیلمبر اٹھا، جھک کر اس نے جوگی کے قدموں کے پاس سے مٹی اٹھائی اور بھاری بھاری قدم رکھتا شکرم میں آن بیٹھا۔ گاڑی بان نے باگیں سیتا پور جانے والی

سڑک کی طرف موڑ لیں۔

معاً پل کے نزدیک شکرم رک گئی۔ گاڑی بان نیچے اترا، سامنے ایک انگریز فوجی گھوڑے سے اتر کر ایک راہ گیر کو کوڑے لگا رہا تھا اور انگریزی میں گالیاں دیتا جاتا تھا۔

یہ منڈیاون چھاؤنی تھی۔ چاروں طرف انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں اور فوج کا میس اور گرجا اور فوجی ہسپتال۔

گورا راہ گیر کو اچھی طرح پیٹنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

''سالے۔۔ ہمارا ہی کھاتے ہیں ہم ہی پر غراتے ہیں۔'' گاڑی بان نے، جس کا نام گنگا دین تھا، غصے سے کہا۔ ''شاہ جمن کے وقت میں یہ اندھیرا۔'' وہ بڑبڑاتا رہا۔ گوتم نیلمبر پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ رات گئے وہ راجہ نلکیٹ رائے کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالہ میں اترے۔ گنگا دین اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ ریذیڈنسی کے سپاہی اور ہرکاروں کو دیکھ کر، جو نیلمبر کے ساتھ شکرم سے اترے تھے، دھرم شالہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ بنگالی بابو ہیں۔ کلکتے جا رہے ہیں، انگریزی جانت ہیں، ان سے پوچھو ہری مال گجاری میں کمپنی بہادر کب کمی کرے گی۔ سنا ہے نئے قانون لندھن میں بنے ہیں، یہاں بھی لاگو ہوں گے۔ ان بے چارے کو کیا معلوم، کیوں نہیں بنگال اور اودھ میں ایکئے قانون لاگو ہوت ہیں۔ اے بابو صاحب۔۔ مال گجاری میں کمی کروائیے، ہمری تو کمریں ٹوٹ گئیں۔ آنگن کے پختہ فرش پر نیلمبر کے چاروں اور مجمع لگ گیا، یہ سب آس پاس کے

دیہات کے کسان تھے جو اپنے اپنے مقدمے اور فریادیں لے کر دارالسلطنت جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا پھونس قصباتی زمیندار لاٹھی ٹیکتا نیلمبر کے قریب آن کر بیٹھ گیا۔ ''کون جات ہو؟'' اس نے چراغ کی روشنی میں نیلمبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''برہمن۔''

بوڑھے نے نیلمبر کے پاؤں چھوئے۔ ''ٹھاکر میرے گاؤں چلے چلو تو تمری سیوا کروں، میرا مکان ہیاں سے کوس بھر ہے۔''

''مجھے صبح سویرے ہی سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بابا سیوا تو مجھے تمہاری کرنی چاہیے، میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔'' نیلمبر نے کہا، اس کا دل بھر آیا، یہ لوگ سب کے سب کتنے معصوم بھولے تھے۔ اسے دکھ ہوا کہ وہ اودھ پوری چھوڑ کر جا رہا ہے۔

''ٹھاکر۔'' بوڑھے نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ''اپنی انگریجی سرکار سے کہو ہم پر زیادہ جلم نہ توڑے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔

''نکھلو سے آتے ہونا۔؟''

''ہاں۔''

''ہواں ہمرے بادشاہ کے درشن کیے؟''

''ہاں۔''

''ہمرے بادشاہ کو کمپنی بہادر نے روپے کے لیے تنگ کر رکھا ہے۔''

''پتا نہیں۔''

"ٹھاکر۔۔۔تم کو معلوم ہے۔" اب بوڑھے نے زیادہ جوش سے بولنا شروع کیا۔ "کمپنی بہادر نے وچن ہمارے بادشاہوں کو دیے اور ایک ایک کر کے سب کو توڑا۔۔۔تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے۔"

اے لیجیے۔ یہ پھر بکسر اور جناب عالی کا قصہ شروع ہو گیا، بوڑھے نے نیلمبر کو لحظہ بھر کے لیے دیکھا۔

"تم کو ان قصوں سے دلچسپی نہیں ہو گی لیکن یہ گھاؤ ہمرے دلوں پر لگے ہیں اور یہ گھاؤ تازہ ہیں، ہمرا دیس کمپنی بہادر نے تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔ تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے انگریزوں نے لکھا پڑھی کی تھی کہ وہ پینتیس ہجار سے زیادہ فوج نہیں رکھیں گے، اب منڈیاؤں میں عالم دیکھو۔ آصف الدولہ بیکنٹھ باشی کلکتے لکھا: انگریزی فوج سارے ملک کی آمدنی کھا گئی۔ گھر کے آدمیوں کو کھانے کو نہیں بچتا۔ کھیت اجڑ گئے۔ فرنگی افسر خود کو ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔ کب تک میرے گلے پر یہ چھری رہے گی؟ کل اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔۔ٹھاکر ہم بہت دکھی لوگ ہیں۔ جب منرو نے حملہ کیا ہمرے سپاہی یا حسینؑ، یا حسینؑ کہہ کر روتے جاتے تھے اور لڑتے تھے۔ اس طرح ہم نے فرنگیوں سے جنگ کی، مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں، مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں، پر اب ہمارے پاس کمپنی کے خزانے میں دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ نیلمبر چپ چاپ بیٹھا چراغ کی لو دیکھتا رہا۔ دوسرے حلقے میں چند کسان بیٹھے نواب سعادت علی خاں مرحوم کی خوش انتظامی کا تذکرہ کر رہے تھے جنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ملک کی بگڑی بنا دی تھی، مگر شاہ زمن

بچارے اب کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے بس میں کچھ نہیں۔''۔۔۔وہ کہہ رہے تھے۔

چراغ کی لو ہوا میں جھلملایا کی۔ نیلمبر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ چاندنی رات تھی۔ منڈیر پر بیٹھے چند نوجوانوں نے برہا گانا شروع کر دیا۔

نیلمبر نے دیکھا کہ اس ملک کا بچہ بچہ، بوڑھا جوان، ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتا تھا۔ جوگی، جس نے اپنے باپ بنی بہادر کا قصہ اسے سنایا، اسے بھی یہاں کے بادشاہ یا اس حکومت سے نفرت نہیں تھی، وہ تو غالباً شجاع الدولہ سے بھی خفا نہ تھا جس نے اس کے باپ کو اندھا کروایا۔ اس کا محض یہ خیال تھا کہ دنیا مایا جال ہے اور اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے، دوسرے یہ کہ ملک خدا کا تھا اور حکم بادشاہ کا اور بادشاہ کی اطاعت سب کا دھرم تھا۔ یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے، ہر زبان پر آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے قصے تھے۔ آصف جس نے اپنی سخاوت سے کہاروں کو پالکیوں پر سوار کرا دیا اور سعادت جس نے حسن انتظام سے ملک کے خالی خزانوں کو دوبارہ پر کر دیا اور یہ سب لوگ، اودھ کے یہ سارے باشندے، جن سے نیلمبر ملا فرنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔

۳۲

کلکتے واپس پہنچ کر وہ پھر اپنی جانی بوجھی مانوس دنیا میں کھو گیا۔ دفتر، کتابیں، انگریزی اور بنگالی اخبار، لیکچر، وہ شنیلا سے ملنے دھرم تلہ گیا مگر وہاں پہنچ کر اسے

معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ برسات کے زمانے میں وہ پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی، اسے سانپ نے کاٹا اور وہ مر گئی۔ سرل صاحب مفصل میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔

نیلمبر نے اپنے برآمدے میں لوٹ کر سیتل پاٹی نکالی اور لیمپ جلا کر پھر ڈکشنری پر جھک گیا، مگر اب اس کا دل ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا خوبصورت گارڈن ہاؤس تھا۔۔۔ اس کے باغ میں لیچی کے درخت تھے اور یہاں بہت سے نوجوانوں کا مجمع لگتا تھا، اس جگہ پر رام موہن بابو رہتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رام موہن بابو کا لیکچر سننے گیا۔ مذہب کے متعلق اس کے ذہن میں جو الجھنیں تھیں ان میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ کالی گھاٹ نہ جاتا، گھر میں بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا: کیا سیرام پور والے ٹھیک کہتے ہیں؟ کیا رام موہن بابو صحیح راستے پر ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ ان سوالات سے جھنجھلا کر اس نے طے کر لیا کہ جب تک وہ خود بہت اچھی طرح مطالعہ نہ کر لے خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ کمپنی بہادر کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ ہندو کالج میں داخل ہو گیا، اسی کالج میں شہر کے ایک رئیس پرنس دوار کا ناتھ ٹیگور کا لڑکا دیوندر ناتھ بھی پڑھتا تھا، وہ دونوں کلاس کے بعد اکٹھے بیٹھ کر مغربی فلسفے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ خدا اور روح کی کھوج لگاتے۔ دیوندر ناتھ میں ساری صوفیوں والی خاصیتیں تھیں جو نیلمبر کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ شام کو وہ رام موہن رائے کے گھر جا کر ان کی محفل میں شامل ہوتے اور عالموں فاضلوں کی

گفتگو سنتے یا موحدانہ بھجن گاتے یا نیلمبر دیوندر ناتھ سے حافظ کی غزلیں سنتا۔

جس سال نیلمبر دت نے بی۔اے کیا اسی سال سے وہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن بن چکا تھا، جب ہی ایک روز اس نے اخبار میں پڑھا کہ سر سرل ہاورڈ ایشلے کا فالج گر جانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی میم صاحب، لیڈی ایشلے، جن سے انہوں نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی مع اپنے دو سالہ لڑکے کے دارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔

سرل کو بہار کے ایک اداس اور اجنبی ڈاک بنگلے میں موت آئی، وہ دورہ کر کے لوٹا تھا اور بوٹ اتار کر آرام کرسی پر لیٹا تھا۔ اسی وقت ہرکارے نے اسے اس کی بدمزاج، مغرور اور خاصی بدصورت بیوی کا خط لا کر دیا تھا جس میں اس نے دارجلنگ کی سوسائٹی کی تازہ خبریں لکھی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ ننھا سرل اب بہت شیطان ہو گیا ہے، آج اس نے ایک قلی کو اپنی ننھی سی چھڑی سے خوب پیٹا۔ خط پڑھنے کے بعد سرل نے اخباروں کے پلندے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا یکا یک اسے محسوس ہوا کہ وہ مرنے والا ہے، اس نے اپنے چوبدار کو آواز دینی چاہی مگر اس کی زبان میں لکنت آ چکی تھی۔ دوسرے لمحے وہ ختم ہو گیا۔

کلکتے کے اخباروں میں اس کے متعلق مضمون لکھے گئے، اس کی سوانح عمری شائع ہوئی۔ برطانیہ اور ہندوستان کی اس نے جو خدمات کی تھیں ان کا مفصل تذکرہ مضامین میں کیا گیا۔ اپنی عمر کے چالیس سال اس نے بنگال میں گزارے تھے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی یاد میں خاص جلسہ کیا۔ کالجوں میں اس پر تقریریں ہوئیں، اس کے پندرہ دن بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

لیڈی ایشلے، جو مدراس کے چیف جسٹس کی بہن تھی اور شراب بہت پیتی تھی، اپنے لڑکے سرل کو لے کر سارے سازو سامان کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔ سر سرل مرتے وقت لاکھوں کروڑوں کا آدمی تھا، اس کا روپیہ سٹی میں بھی لگا تھا اور کلکتے میں بھی۔ بڑے ہو کر اس کے بیٹے سرل ایڈون ڈیرک ایشلے نے اپنے باپ کے کمائے ہوئے روپے سے زبردست کاروبار شروع کیا جس کی شاخیں جنوبی امریکہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنت برطانیہ اب ساری دنیا پر چھا چکی تھی۔ برما میں ٹین کی کانیں تھیں، ملایا میں ربڑ کے جنگلات، چین میں افیم کی تجارت۔

ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد اب باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا، سارا مشرق اب مرحوم سر سرل ہاورڈ ایشلے کے بیٹے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون ایشلے کا تھا۔

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ اول

۴۴

ایک دن پروفیسر گوتم نیلمبر دت بند گھوڑا گاڑی سے اتر کر اپنے مکان کی برساتی میں داخل ہوئے تو مالی نے ان کو اطلاع دی کہ مٹیا برج والے نواب صاحب آپ سے ملنے آئے تھے، بڑی دیر آپ کی راہ دیکھا کیے، ابھی ابھی واپس گئے ہیں۔ نیلمبر الٹے پاؤں باہر گئے اور سڑک پر آ کر جلدی سے چاروں اور دیکھنے لگے۔ سامنے ایک بوڑھا سفید جامدانی کا انگرکھا پہنے جریب ٹیکتا سڑک کے کنارے کنارے چلا جاتا تھا۔ نیلمبر دت نے لپک کر اسے جالیا۔

''اخاہ میاں نیلمبر صاحب'' بوڑھے نے خوشی سے کھل کر کہا۔ ''ہمارا خیال تھا آپ سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔''

''کیوں نواب صاحب، خیریت تو ہے۔ آپ سے تو یوں بھی برس گزر جاتے ہیں ملنا نہیں ہو پاتا، اب آیئے چل کر دو گھڑی اندر بیٹھیے۔ میری نواسی سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے لوٹ کر آئی ہے، آپ نے شاید ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔''

نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کو مکان کے اندر لے آئے۔

''اچھا میاں۔'' نواب صاحب نے ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم کو دیکھ لیا، تمہارے بچوں کو دیکھ لوں، پھر جانے زندہ لوٹنا نصیب ہو

نہ ہو۔''

''کیوں۔کہاں کا قصد ہے۔لکھنؤ۔۔؟''

''کربلائے معلی جا رہا ہوں۔خدا وہیں یہ مٹی عزیز کرے، یہاں اب کیا رکھا ہے۔''ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے مشہدی رومال نکال کر آنسو خشک کیے۔

نیلمبر دت ان کو محبت سے دیکھتے رہے۔ملازم چائے لے کر آیا۔ڈرائنگ روم ہمعصر وکٹورین طرز میں سجا ہوا تھا۔دیواروں پر ان گنت تصویریں تھیں۔مناظر اور فوٹو گراف، موتیوں کے پردے دروازوں پر پڑے تھے۔فرن اور پام کے پودے پیتل کے گملوں میں رکھے تھے۔برابر کے کمرے میں پیانو بج رہا تھا۔پیانو کی آواز یکلخت نیلمبر دت کو بڑی اداس معلوم ہوئی، انہوں نے آواز دی:''نیلما بٹی، باجہ بند کرو اور یہاں آؤ، دیکھو تمہارے مٹیا برج والے چاچا آئے ہیں۔''

ایک پندرہ سالہ لڑکی اندر آئی، اس نے جھک کر نواب صاحب کے پاؤں چھوئے۔

''یہ میری نواسی ہے نواب صاحب، اسکول ہی میں رہتی ہے۔''وہ دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔پندرہ سالہ لڑکی جو شادی کر کے گود میں بچہ کھلانے کے بجائے اسکول میں انگریزی پڑھ رہی تھی اور ارگن باجہ بجاتی تھی۔

نواب کمن نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔کلکتے کی روشنیاں چاروں طرف جگمگا اٹھی تھیں۔شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔نیلمبر دت ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے دونوں کے پاس مشترکہ موضوع گفتگو کوئی نہیں

تھا سوائے ماضی کے، مگر ماضی کی یاد کو نیلامبر دت کہاں تک گھسیٹ سکتے تھے، ان کے سامنے مستقبل تھا۔ نواب کمن کے پاس صرف ماضی تھا۔ وضع داری نبھانے کے لیے دونوں بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملتے تھے، جب لکھنؤ اجڑا اور کلکتے میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی آباد ہوئی مٹیابرج میں دوسرا لکھنؤ بسایا گیا۔ اس وقت نواب کمن نے، جو سلطان عالم کے ساتھ یہاں آ گئے تھے، نیلامبر دت کو ملاقات کے لیے بلوایا، وہ اس سے کلکتے کا مشہور اخبار نویس بن چکا تھا۔ اس نے اب تک کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور وہ برہمو سماج کے پلیٹ فارم کا شعلہ بیان مقرر تھا۔ نیلامبر ان سے پابندی سے سال میں دو ایک بار ضرور مل لیتا تھا، جب راجہ سریندر موہن ٹیگور کے یہاں موسیقی کی تجدید کی بنا ڈالی گئی اور ملک بھر کے موسیقار کلکتے میں جمع ہونا شروع ہوئے اس وقت بھی نیلامبر نے نواب کمن کو یاد رکھا اور نئی سنگیت کی محفلوں میں مدعو کرتا رہا۔

اب کمروں میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ باہر گلیوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جن میں مینڈک ٹراتے تھے مکان کی بالائی منزل پر نیلامبر بابو کے بیٹے منورنجن دت کے یونیورسٹی کے ساتھی تھیٹروں میں ان دنوں چند بہت اچھے اچھے ڈرامے اسٹیج کیے گئے تھے۔ منورنجن کے دوست مائیکل مدھوسودن نے ایک نیا ڈرامہ لکھا تھا، اس سے وہ سب اس کی پریکٹس میں جٹے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ کیمپبل میڈیکل اسکول میں ایک لڑکا کھڑکی میں بیٹھا ہارمونیم بجا رہا تھا۔

منورنجن تو رولتا کی نئی انگریزی نظم پڑھ رہا تھا۔ ہارمونیم کے سر اور لڑکوں کے قہقہوں اور مکالموں کی آوازیں نیچے ڈرائنگ روم تک پہنچ رہی تھیں۔

نواب صاحب جریب پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ یہ ایک دوسرا زمانہ تھا، دوسرا عہد، یہ ۱۸۷۱ء تھا۔ دنیا بوڑھی ہو چکی تھی۔ نواب کمال رضا کی دنیا۔ نیلمبر دت بھی ان ہی کے ہم عمر تھے مگر ان کی دنیا اب جوان ہو رہی تھی، یکلخت نواب کمن کو احساس ہوا کہ اس نئی دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ دارالسلطنت کے اس جدید ڈرائینگ روم میں بیٹھے وہ خود کو بے حد مضحکہ خیز نظر آئے۔

"نواب صاحب! منورنجن لکھنؤ کے کیننگ کالج میں قانون کا لیکچرار ہو کر جا رہا ہے۔" گوتم نیلمبر دت کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ یہ آواز بھی کسی دوسرے کرے سے آ رہی تھی، وہ چونک پڑے۔ "اچھا۔ اچھا۔ ماشاء اللہ سے۔ انہوں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "جائیں، سدھاریں، ان کو امام ضامن کی ضامنی میں ۔۔۔ دیا۔" پھر وہ جریب کے سہارے اٹھے اور نیلمبر دت کو خدا حافظ کہہ کر مٹیا برج لوٹ گئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ نیلمبر دت نواب کمن کے جانے کے بعد تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں ٹہلتے رہے، انہوں نے گھومنے والی الماریوں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کی، مگر اس میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا، الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے مجلد فائل، قانون کے رسالے، کمیٹیوں کی رپورٹیں اور قراردادیں۔ ہر طرف مسائل تھے اور مسائل کا حل انہوں نے پالیا تھا۔

مسائل کا حل انہوں نے پالیا تھا؟ نیلمبر دت کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہوا بند تھی اور رات گرم تھی، باہر سڑکوں پر لیمپ مدھم مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ دفعتاً عروس البلاد کلکتہ

ان کو بے حد خوفناک معلوم ہوا، وہ گھبرا کر باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایسی ہی راتوں میں دکھی روحوں کی پرواز کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنگن میں کیلے اور پام کے پتے ساکن کھڑے تھے۔ پختہ حوض کے کنارے ایک کتا دم ٹانگوں میں سمیٹے سو رہا تھا، اگر ان کو آواگون میں یقین ہوتا تو شاید وہ سوچتے کہ یہ کتا کسی کی دکھی روح ہے، وہ برآمدے سے اتر کر گیندے کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔ اوپر منورنجن کے کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپبل میڈیکل اسکول کا لڑکا ابھی تک دریچے میں بیٹھا تھا، وہ بھی ہارمونیم کے پردوں پر سر رکھ کر سو چکا تھا۔ منورنجن کے کمرے سے جو زینہ باغ میں اترتا تھا اس کی آخری سیڑھی پر بیٹھا کوئی تورولتا کی نئی انگریزی نظم آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ چاند اب دت ہاؤس کے عین اوپر آچکا تھا۔

برآمدے میں لڑکوں کا ایک گروہ بیٹھا تورولتا کی نظم پر سر دھن رہا تھا:

محبت اور روشنی اور نغمے کو تمہاری تلاش ہے۔

روشنی قرمزی آسمانوں پر موجود ہے

نغمے لارک گا رہا ہے

محبت میرے دل میں ہے

ایک دوسرے سے جدا

ہم فطرت کے مقصد کو کھو رہے ہیں

اپنی قسمت کو دھوکا دینے کے لیے ہم کیوں کوشاں ہیں

میری محبت تمہاری روح کے لیے تخلیق کی گئی ہے

تمہارا حسن میری آنکھوں کے لیے

اب جاگ اٹھو

میں منتظر ہوں اور روتی ہوں

تم کہاں ہو

اس دھرتی پر ایک بے آسرا،

بیمار، بدصورت اور حقیر

بچے کی طرح میں پیدا ہوئی

پیدائشی بدقسمت لڑکی۔۔۔۔

ہر ایک نے مجھے ٹھکرا دیا ہے

پھر میرے ہونٹوں سے ایک نالہ بلند ہوا:

خدایا۔۔۔!

اور خدا نے جواب دیا:

گائے جا۔۔۔ بے چاری لڑکی۔۔۔ گائے جا۔۔

نیلمبر دت مبہوت اس نظم کو سنتے رہے۔ انہوں نے آواز پہچانی، یہ ان کے بیٹے کی آواز تھی۔ منورنجن اور وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا، وہ جس نے کلکتہ یونیورسٹی کے فلسفے اور منطق کے امتحانات میں سارے ریکارڈ توڑے تھے، جو اگلے ہفتے کیننگ کالج کا پروفیسر ہو کر پردیس جانے والا تھا۔

نیلمبر دت مسکرائے۔ مبارک ہیں وہ لوگ، انہوں نے اپنے آپ سے کہا، جو محبت کر سکے۔ خواہ اس میں انہیں ناکامی ہی ہوئی ہو، پھر انہوں نے چاند کو دیکھا جو

تیرتا تیرتا دت ہاؤس کے عین مقابل میں آ چکا تھا۔اس کی کرنیں حوض کے پانی میں منعکس تھیں۔چاند نے ان کو بہت سی کہانیاں سنائیں، وہ پورن ماشی کی رات تھی۔

اس رات چیت پور روڈ سے واپس جانے کے بعد نواب ابوالمنصور کمال رضا بہادر جب گارڈن ریچ پہنچے، جہاں میٹا برج میں ان کا مکان تھا، تو اپنے پلنگ پر لیٹتے ہوئے ان کو خیال آیا: کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ دنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔زندگی صرف ایک ہی دفعہ زندہ رہنے کے لیے ملتی ہے۔انسان مر جاتا ہے، پھر کبھی اس دنیا کو نہیں دیکھ پاتا جیسے شاہ زمن غازی الدین حیدر مرے تھے اور نصیر الدین حیدر اور محمد علی اور امجد علی، ان سب کو مرتے نواب کمن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔یہ لوگ، جو اودھ پوری کے راجہ تھے، یہ سب موت آئی تو پٹ سے ختم ہو گئے اور بے چارے سلطان عالم واجد علی۔پڑوس کی رادھا منزل میں اندر سبھا منعقد کروا کے خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ابھی قیصر باغ ہی میں موجود ہیں، ایک روز وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔تخت شاہی ہو یا غریب الوطنی، انتہائی مسرت ہو یا شدید رنج وغم، موت آ کر سارا قصہ ہی چکا دیتی ہے، جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہوتا ہو گا۔فشار قبر اور منکر نکیر اور ۔۔۔اور۔۔۔ یہ سب سوچتے سوچتے نواب کمن کو بے حد ڈر معلوم ہوا۔انہوں نے تکیے پر سے سر اٹھا کر اپنے گھر والوں کو آواز دینا چاہی۔انہوں نے پلنگ سے اٹھنا چاہا مگر پیچھے کو گر گئے۔

کیونکہ کربلائے معلی کا سفر کرنے کے بجائے نواب کمال رضا سفر آخرت

اختیار کر چکے تھے۔

۳۴

نواب صفدر جنگ سے لے کر سلطان عالم تک نوحکمرانوں نے اودھ پوری پر راج کیا۔ سلطان عالم کے زمانے میں سلیمن صاحب آیا۔ صفدر جنگ نے اپنی طاقت کے بل پر اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، جو دلی کے زوال کے بعد ہندوستان کی سب سے شاندار سلطنت تھی، جس کے بادشاہ فرانس کے لوئی چہاردہم سے زیادہ جاہ وجلال والے تھے۔ سلیمن صاحب چونکہ ان سب سے طاقتور تھا اس نے پل کی پل میں ایک اتنی بڑی پھونک ماری کہ یہ ساری دیپ مالا چشم زدن میں بجھ گئی۔ ہیولاک جیتا۔ سلطان عالم ہارا۔ لکھنؤ کی اندرا پوری اجڑ گئی۔ نوٹنکی ختم ہو چکی۔ قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں سبز پری کا ناچ، عیش باغ کے میلے، محرم اور رام لیلا کے ہنگامے۔ دل کشا محل اب سنسان پڑا ہے۔ ہیلی گارڈ کو توپوں نے اڑا دیا۔ حضرت گنج میں انگریزی دکانیں ہیں۔ امین آباد میں کالج اور اسکول۔ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ٹیلیگراف کے تار جھنجھناتے ہیں۔ ایودھیا کے رام چندر کی گدی لٹ چکی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب عمرو عیار کا طلسم تھا، آخری ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی راجہ اندر کو مع اس کے اکھاڑے کے دیولوک سے شہر بدر کر دیا گیا۔

کلکتے کے پروفیسر نیلمبر دت اپنے بیٹے سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے

تھے۔ ریل گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچی اور وہ فٹن پر بیٹھ کر باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، وہ آج سے اڑتالیس سال قبل ۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آئے تھے، وہ شاہی کا لکھنؤ تھا۔ یہ انگریزی کا لکھنؤ ہے۔ یہاں دھومی بیگ کوتوال کے بجائے انگریز ڈپٹی کمشنر کا راج ہے جو سعادت علی خاں کی نور بخش کوٹھی میں براجتا ہے، بیچارے سعادت علی خاں کی حیات بخش کوٹھی اب چینکس ہاؤس کہلاتی ہے، اس میں کمشنر رہتا ہے۔ قیصر باغ میں کیننگ کالج ہے۔ جس میں کلکتہ کا منورنجن دت قانون پر لیکچر دیتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور محلے وہی ہیں لیکن زمانہ بدل گیا۔ نخاس چوک، معالی خاں کی سرائے، پاٹا نالہ، چوپٹیاں، چوکھی، گولہ گنج، بارود خانہ، سعادت گنج، ڈالی گنج، حسین گنج۔ ساری جگہیں وہیں ہیں۔ مکان، انسان مگر وقت دوسرا ہے۔ تاریک محلوں، شکستہ مکانوں میں انقلاب کے مارے ہوئے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ دولت مند لٹ گئے، غریب امیر ہو گئے۔ باغیوں کو پھانسیاں اور وفاداروں کو تعلقے ملے۔ اختر پیا جب سے پردیس سدھارے اب تو ان کے لیے روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے، یہ اودھ پوری ہے۔ یہاں سے رام کو بھی اسی طرح بن باس ملا تھا۔

فٹن اسٹیشن سے شہر کی طرف چلی۔ کوچبان نے سر پر انگوچھا لپیٹ کر نیلمبر دت کو دیکھا: ''بابو صاحب، پیچھے سائیس بیٹھا ہے، اسے اوپر بلا لوں۔ بڑھو ہے گر کر مر جائے گا۔''

''ہاں بلا لو۔'' انہوں نے جواب دیا۔ پیچھے سے ایک بوڑھا کود کر کوچ بکس پر آ گیا۔ فٹن پھر روانہ ہوئی۔

''بابو صاحب کلکتے سے تشریف لاوت ہیں۔''

''ہاں''

''ہم بھی سوچتے ہیں کلکتے چلے جائیں، یہاں اب جی نہیں لگتا۔'' نوجوان نے کہا۔

''کوہے'' بوڑھے سائیس نے نوجوان کے کان کے قریب منہ لے جا کر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''کلکتے کے بابو۔۔۔'' نوجوان نے، جس کا نام شمبھو تھا، چلا کر کہا۔

''کلکتہ۔۔۔؟'' بوڑھے نے، جس کا نام گنگا دین تھا اور جو اونچا سنتا تھا، غیر یقینی انداز میں دہرایا اور پھر مڑ کر دھندلی آنکھوں سے بنگالی بوڑھے کو دیکھا۔

''ہاں ہاں۔ سمجھ میں نہیں آوا؟'' شمبھو نے کہا۔

''بابو صاحب'' گنگا دین نے مڑ کر بڑی لجاجت سے نیلمبر دت سے کہا۔ ''ہمکا بھی کلکتے پٹھائے دیو۔''

نیلمبر دت کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ نوجوان نے ہنس کر بوڑھے سے کہا: ''بابو صاحب تمہری بولی نہیں سمجھتے، اردو میں اپنا مطبل بیان کرو۔''

بوڑھے نے بہت سنبھل کر کہا: ''کھداوند، ہم کو کلکتے پٹھا دیجیے، وہاں ہمرے بادشاہ رہت ہن۔''

نوجوان ہنس پڑا: ''حضور بابا کی بات پر دھیان مت دیجیے۔ یہ جو مسافر ریل سے اترتا ہے اس سے یہی بات کہتے ہیں، میاں مسافر تم کلکتے سے آئے ہو۔ ہم کو بھی وہیں پہنچا دو۔ پوچھو، ہمرے بادشاہ خود جوکھم میں ہیں، اوپر سے یہ بھی پہنچ

جائیں۔جیسے بس ان ہی کی کسر ہے۔''

نیلمبر دت خاموش رہے۔فٹن اب امین آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''سرکار پہلے بھی نکھلؤ تشریف لائے ہیں۔''نوجوان نے پوچھا۔

''ہیں؟''نیلمبر دت نے چونک کر پوچھا،''ہاں''

''کب۔؟''

''بہت زمانہ گزرا جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔غازی الدین حیدر کے وقت میں۔''

''بابا۔''کوچوان نے پھر چلا کر بوڑھے سائیس کے کان میں کہا،''بابو صاحب تمرے گاجی الدین حیدر کے زمانے میں آئے رہے۔''

پھر کوچوان نیلمبر دت سے مخاطب ہوا:''بابا کہا کرت ہیں کہ گاجی الدین حیدر کے چوبدار تھے۔اس سے پہلے شکرم ہانکتے تھے مگر کہتے ہیں کہ محل میں پہنچ کر انہوں نے بڑے اچھے دن دیکھے۔سارے بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر نوکری کی ہے، سلطان عالم ان کو بہت مانتے تھے۔''

''کھداوند'' گنگا دین نے کہا،''سلطان عالم کو آپ نے دیکھا ہے؟ کیسے ہیں؟خیریت سے ہیں؟''پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

نیلمبر دت بہت متاثر ہوئے،ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتے ہیں۔مدتوں وہ محض عقل کے پجاری رہے تھے،اب آن کر انہوں نے دل کی عظمت کو سراہا۔فٹن اب امین آباد کے چوراہے پر پہنچ چکی تھی۔

دفعتاً کوچوان نے پکارا:''ارے سامنے سے ہٹتی نہیں بوڑھیا،کاہے اپنی جان

کی لاگوہوت۔'' اس نے باگیں کھینچ کر فٹن روک لی۔ ایک ضعیفہ دلائی میں لپٹی ہوئی سامنے آ گئی اور اس نے ہاتھ پھیلا کر میکانکی انداز میں اپنے فقرے دہرانے شروع کر دیے: جناب امیرؑ کا صدقہ، خدا تمہیں سوا غم حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔

نیلمبر دت فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگائے بیٹھے سوچ رہے تھے: لکھنؤ کیا بوڑھوں کا شہر ہے؟ یہاں کے جوان کہاں چلے گئے؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہاں کے جوان ملکہ حضرت محل کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور جو باقی تھے قبل از وقت عمر رسیدہ ہو چکے تھے، مگر زندگی کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ امین آباد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پھول بیچنے والے صدائیں لگا رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر چاروں طرف موجود ہوتا تھا۔ شام اودھ بدستور بزم آرا تھی۔ فقیرنی اسی طرح آنکھیں بند کیے کھڑی دہراتی رہی: خدا سوا غم حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔ ایک ٹکا۔ خالی ایک ٹکا۔

نیلمبر دت چونک پڑے۔

یہ آواز جانی پہچانی تھی، یہ آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا سفر طے کرتی۔ ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ راگ سنائے تھے قہقہے لگائے تھے۔

انہوں نے ہڑبڑا کر عینک درست کی اور فٹن سے باہر جھانکا مگر سڑک کے کنارے تو وہی فقیرنی کھڑی تھی جس نے اودے رنگ کی بوسیدہ دلائی اوڑھ رکھی تھی۔

''اسے کچھ مت دیجئے گا خداوند۔'' شمبھو نے کوچ بکس پر سے جھک کر آہستہ سے مودبانہ انداز میں کہا، ''اسے کوکین کی لت ہے، جو ملتا ہے اس کی کوکین کھا جاتی ہے نیک بخت۔''

نیلمبر دت نے اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر فقیرنی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

فقیرنی نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے اس بنگالی بوڑھے کو دیکھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سفید براق دھوتی پہنے اگرئی شال میں لپٹا ٹانگ پہ ٹانگ رکھے فٹن میں بیٹھا تھا۔

بڑھیا کو نیلمبر دت نے پہچانا۔۔۔

بڑھیا چمپا تھی۔

روپیہ مٹھی میں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایک لحظہ کے لیے اسے بڑی حیرت ہوئی، یہ کیسا دیالو رئیس ہے جو ٹکا مانگو تو چاندی کا روپیہ دیتا ہے۔ سکے کو اپنی گرفت میں لے کر فقیرنی نے پھر رٹے ہوئے انداز میں دہرانا شروع کر دیا: سرکار، غریب پرور۔۔۔ آپ کو پوتوں، نواسوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ میں غدر کی ماری ہوں، بندہ نواز۔ شاہی میں میرے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب کوئی دو روٹی کا سہارا دینے والا نہیں۔ اللہ آپ کو۔۔۔ شمبھو نے گھوڑے کو چابک لگایا۔ فٹن آگے بڑھ گئی۔ شمبھو، جس کی دنیا کے واقعات پر رائے زنی کرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی، ہنس کر کہنے لگا:

''بڑھیا کی باتیں۔ دروجے پر ہاتھی جھومتا تھا، یہ گردی کا یار لوگوں کو اچھا بہانہ

مل گیا ہے جس سے سنو یہی کہتا ہے میں غدر سے پہلے یوں طرم جنگ تھا، فلانا تھا، ڈھمکا تھا۔ بابا ہی کو دیکھ لیجیے، بابو صاحب، گردی سے پہلے بادشاہ کے خاص چوبدار تھے۔ اب سائیسی کرتے ہیں۔'' وہ طنز سے ہنسا اور اسی طرح اظہار خیال کرتا ہوا موتی محل برج کی سمت رواں رہا۔

چمپا نے روپے کو شام کے اندھیرے میں کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ایک تاریک گلی میں مڑ گئی جہاں ایک زمین دوز دکان میں کوکین فروخت ہوتی تھی اور جہاں بھنگڑ یے اور رند کیے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

اندھیرے نے سارے شہر کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ جس وقت فٹن امین آباد کے چوراہے سے آگے بڑھی، نیلمبر دت نے ایک بار پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ چمپا سڑک کے کنارے دلائی میں لپٹی کھڑی ان کا دیا ہوا روپیہ لیمپ کی روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔ اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں تھیں، اس کی دلائی میں جابجا پیوند لگے تھے۔ کہیں کہیں پر گوکھرو اور بنت ٹکی رہ گئی تھی جس کے تار نکلے ہوئے تھے۔

انھوں نے فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیونکہ گوتم نیلمبر نے ویشالی کی امباپالی کو دیکھ لیا تھا۔

گومتی کے اس پار شاہ نجف کے مقابل میں سنگھاڑے والی کوٹھی تھی جس کو بابو منورنجن دت نے اپنے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔ فٹن موتی محل کے پل پر سے گزر کر دریا کے کنارے والی کچی سڑک پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد سنگھاڑے

والی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔

اس رات جب منورنجن اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور مالک مکان کے کمروں میں لیمپ گل کر دیے گئے تب نیلمبر دت برآمدے میں آ کر، جس کی سیڑھیاں ندی میں اترتی تھیں، بہت دیر تک ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ رات اب بھیگ چکی تھی، لیکن کمرے میں جا کر سونے کے بجائے وہ باہر نکل آئے اور گومتی کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگے۔ چاروں اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا، ان کے پیچھے پیچھے بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آگے آگے پچھل پیریاں رقصاں تھیں۔ سامنے کچھ دور پر پل کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں اور چنڈی کا مندر نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر سرخ آنکھوں والے بندر سو رہے تھے، یہ بہت جانے پہچانے بھوت تھے جو ان کے پیچھے دانت نکوستے، لنگڑاتے اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔

سارے شاہان اودھ، سعادت علی خاں اور جان بیلی، نصیر الدین حیدر اور ان کا یورپین حجام اور قدسیہ محل اور بوڑھے محمد علی شاہ۔ سرل ہاورڈ ایشلے اور شنیلا۔ لارڈ میکالے اور بشپ ہیبر۔ ان انگریز بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا، جب زندہ تھے اور مر کر اب جانے کس جہنم میں گئے ہوں گے، مگر وہ تو بدستور سر پر سوار تھے۔ دنیا کا عروج و زوال گوتم نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے کون سا تماشہ دیکھنا باقی تھا۔ ندی رواں تھی۔ کنارے پر مکان بنے تھے۔ ان مکانوں کے نام تھے۔ ان مکانوں میں انسان سو رہے تھے۔ ان انسانوں کے بھی نام تھے۔ مکان پتھر کے بنے تھے۔ ساحل پر پتھر بکھرے تھے۔ وقت رواں تھا۔ وقت پتھر میں منجمد تھا۔ مرگھٹ میں

شعلے بلند ہو رہے تھے، آج کی رات جانے کون کون مرا ہو گا۔

نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔

سامنے مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے، صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔

مرگھٹ۔۔۔ یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتیں ہیں۔۔۔ اور کالی۔۔۔ جو ذہن اور گویائی سے ماوراء ساری جاندار کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے، وہ۔۔۔۔ جو سونیا کو پورن بناتی ہے۔ پورن۔۔۔ جو روشنی اور سکون ہے۔

کالی۔۔۔۔۔ جس کا لباس ساوی ہے، وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔

مرگھٹ میں کالی شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔

شیو۔۔۔۔ جو سفید ہے کیونکہ سروپ ہے۔ روشنی بخشتا ہے اور مایا اور خود پرستی کے عفریتوں کو تباہ کرتا ہے، وہ ساکت ہے کیونکہ تبدیلی سے ماورا ہے۔ کالی اس کی تبدیلی کی مظہر ہے۔

شیو۔۔۔ جو تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہر تغیر میں موجود ہے۔ شعلوں کے دھوئیں میں کالی رقصاں ہے، وہ کالی ہے۔ تارا۔۔۔۔ دھوم وتی، وہ شانت رس کا ناچ ناچ رہی ہے اور کائنات جے جے کے نعرے لگا رہی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی کو تی اور گوری اور جوگ مایا کے روپ میں دیکھا تھا،

انہوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔

کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

وہ کچھ دیر پل پر کھڑے مدھم شعلوں کو دیکھتے رہے، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

صبح کے چار بجے تو گھر کی بی بی بستر سے اٹھیں اور انہوں نے جا کر مہری کو جگایا جو ایک طرف کو فرش پر چٹائی بچھائے سو رہی تھی۔ ''چاء کا پانی رکھ دیو۔ چھٹکی کا اسکول آج چھ بجے سے لگیہے۔'' مہری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بالوں کا جوڑا لپیٹتی پانی کے نل کی سمت چلی۔ اب وہ غسل خانوں میں جگمگاتی پیتل کی بالٹیاں پانی سے بھر کر رکھے گی۔ بڑے صاحب اور بھین صاحب کے شیو کا پانی پیالیوں میں لگائے گی، پھر چاء کا انتظام کرے گی۔

نیچے باغ میں مولسری کے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ دور کچی سڑک پر سے ایک بیل گاڑی چرخ چوں کرتی گزر رہی تھی۔ دودھ والا المونیم کی بالٹیاں سائیکل کے ہینڈل سے لٹکائے لپکا ہوا بستی کی اور چلا جاتا تھا۔ گھر کی بی بی پوجا کے لیے ٹھاکر دوارے میں چلی گئیں۔ ٹھاکر دوارہ دوسری منزل پر مشرق کے رخ کی برجی میں تھا۔ کمرے میں حبس تھا اور برسات کی گرمی۔ دروازہ کھلا تو اندر کے اندھیرے میں گوپی ناتھ ٹھاکر حسب معمول اپنی خالی خالی آنکھوں سے سامنے خلا میں دیکھتے نظر آئے، ان کی کیسری پوشاک پر جھوٹا گوٹا لگا تھا اور ان کے مکٹ میں مور کا ایک پر تھا جو ذرا ٹیڑھا ہو رہا تھا اور وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے بانسری اٹھائے پیتل کے چھوٹے سے مندر میں

کھڑے تھے۔ ساکت، منجمد، لاتعلق، ان کے چہرے پر بڑی بھیانک سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اس برجی کے مقابل میں برآمدے کے سرے پر دوسری برجی تھی۔ برآمدے میں دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ برآمدے کی چھت میں سیاہ رنگ کے شہتیر تھے۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔

پرانی وضع کی مسہریاں اور تخت چاروں طرف بچھے تھے۔ تلسی کا منقش گملہ عین وسط میں رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کسی موٹے سرمنڈے مہنت کی تصویر آویزاں تھی۔ برآمدے کے سرے پر دوسری برجی، جو چھتر منزل کے رخ پر تھی، اس میں لڑکیوں کا بھائی سوتا تھا، وہ مزے سے ہلکی ولائی تانے کھڑکی کے قریب سنا رہا تھا۔ قریب ٹیبل فین گھوں گھوں کر رہا تھا۔ برجی کے آٹھوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور بڑی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرہ کافی وسیع تھا۔ الماریوں میں ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں۔ پلنگ کے نزدیک والی میز پر دیوان غالب رکھا تھا اور کبیر کی گرنتھاولی اور رایلیٹ کا ویسٹ لینڈ۔ ایک طرف کو اردو کے نئے ترقی پسند رسالوں کے انبار لگے تھے اور پانیر اور لیڈر کے پرچے اور انگریزی کے ادبی رسالے جو کلکتے اور بمبئی سے نکلتے تھے اور روشوا بھارتی میگزین دیواروں پر نندلال بوس اور اور انیندر ناتھ ٹیگور اور چغتائی اور ایل ایم سین اور روی ورما کے واٹر کلرز کے پرنٹ تھے۔ کمرے میں سخت بے ترتیبی تھی۔ ٹینس کے ریکٹ پرانا یاں پڑی تھیں۔ گیند کے ڈبوں میں موزے ٹھنسے تھے۔ مسہری کے سرہانے دیوار پر جواہر لال نہرو کی تصویر تھی جس میں وہ نینی جیل سے باہر نکل رہے

تھے، ایک تصویر کملا نہرو کی تھی۔ آٹھوں دروازوں کے درمیان جو جگہ خالی بچی تھی اس پر یونیورسٹی کے گروپ فریم آویزاں تھے۔ ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۳۹ء۔ آل انڈیا مباحثوں میں جو ٹرافیاں جیتی گئی تھیں ان کے گروپ۔ یونین کے عہدیداروں کی تصویریں، ہسٹری سوسائٹی اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے گروہ جس میں لڑکے اپنے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پروفیسر سدھانت، ڈاکٹر راؤ، مسٹر سی۔ جی۔ رائے ایک کونے میں آتشدان کے اوپر ایک گروپ تھا جو اب بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ اس تصویر پر ۱۸۹۷ء لکھا تھا، یہ گروپ بھی کیننگ کالج کا تھا۔ یہ تصویر اس لڑکے کے باپ کے زمانہ طالب علمی کی تھی، اس میں اس لڑکے کا باپ گول کالی ٹوپی اور بند کالر کا کوٹ پہنے بڑی مستعدی سے فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین ڈاکٹر منورنجن دت مرحوم کے پیچھے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر دت کی ٹیگور کی ایسی یہ لمبی سفید داڑھی تھی (یہ دوسری بات ہے کہ ہر داڑھی والا بنگالی ٹیگور کا ایسا نظر آتا ہے جس طرح ہر داڑھی والا انگریز کنگ جارج پنجم معلوم ہوتا ہے) اور وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھے کیمرے کو بہت گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اسی طرح گھر کے سارے کمروں میں ان گنت تصویریں آویزاں تھیں۔ کانگریس کے اجلاس میوزک کانفرنسوں کے گروپ جس میں پٹنے، مہاراشٹر، گوالیار اور الور کے استاد لوگ بڑے بڑے پگڑ باندھے بیٹھے تھے۔ چیمبر اوف پرنسز کے گروپ۔ نچلی منزل میں ڈرانگ روم کے آتشدان کے اوپر ایک روغنی تصویر لگی تھی جس میں ایک دقیانوسی بوڑھا سبز گوٹ کا جامہ اور چنا ہوا پائجامہ پہنے، سر پر مندیل اوڑھے منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ تصویر شاہی کے زمانے میں انگریز

مصور نے بنائی تھی اور اس کے نیچے اردو میں لکھا تھا: "رائے زادہ بخشی مہتاب چند"
چند تصویریں پرانے وقتوں کی دلہنوں کی تھیں اور ایسی بیبیاں جو اونچی ساڑھیاں باندھے، انگریزی جوتے پہنے، ایک ہاتھ میز پر ٹکائے کھڑی تھیں۔ میز پر موٹی موٹی کتابیں یا گلدان رکھے تھے۔ اس کوٹھی میں تین برجیاں تھیں۔ تیسری برجی میں لکڑی کا فرش تھا۔ یہاں ساز رکھے تھے اور لڑکیاں شام کو جب سورج بخش صاحب آتے تھے تو ان سے گانا اور ناچ سیکھتی تھیں۔

یہ کوٹھی اس کے مکینوں کے لئے مرکز کائنات تھی۔ (ہر گھر اپنے مکینوں کے لئے مرکز کائنات ہوتا ہے)

یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں، دلہنوں کے ڈولے آئے، براتیں چڑھیں، بیٹیاں وداع ہوئیں، بڑے بڑے تہوار منائے گئے۔ رام نومی اور جنم اشٹمی اور دیوالی اور شوراتری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے۔ لڑائیاں جھگڑے ہوئے، لوگ ہنسے اور روئے، ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک کرتے رہو گے۔ وقت کہتا ہے۔ گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے ہیں۔ صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے، کبھی کبھی لہریں اسے بہالے جاتی ہیں، پھر اس کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ان کے مقرب خاص اور اودھ کے

وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے بنوائی تھی، اس وقت ان کے پڑپوتے اس میں براجمان تھے جو اوسط درجے کے بیرسٹر تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں، تینوں ابھی طالب علم تھے۔

بیرسٹر صاحب کا سارا وقت کانگریس کے چکر میں نکل جاتا یا وہ بیٹھ کر زمانہ فراغت میں اردو شاعری پر مضمون لکھتے، پھر پریکٹس کی طرف توجہ کون دے، مگر گھر کی زمینداری تھی اس لیے آسائش سے بسر ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں کے جہیز تیار تھے۔ لڑکے کو وہ کیمبرج بھیجنے کی سوچ میں تھے، جہاں انہوں نے خود پڑھا تھا۔ اس سے وہ برساتی کے اوپر جو کھلی چھت تھی اس پر مچھر دانی لگائے پڑے سوتے تھے۔ بی بی کی کھٹر پٹر کی آواز نے ان کو جگا دیا۔ بی بی میں یہی تو ایک بری عادت تھی کہ صبح صبح اپنی کھڑاوں کی آواز سے سارے گھر کو جگا دیتی تھیں، کبھی گودام کا دروازہ کھول رہی ہیں، کبھی نعمت خانے کی الماری بند کر رہی ہیں، کبھی اس کمرے میں جا رہی ہیں کبھی اس کمرے میں۔ اس کے بعد وہ پوجا کرنے بیٹھ جاتی تھیں اور زور زور سے رامائن پڑھتی تھیں۔

بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے ندی پر ابھی دھند کا چھایا تھا، مکمل سکون سارے میں طاری تھا۔ مقابل میں ندی کے دوسرے کنارے پر چھتر منزل اور شاہ نجف اور موتی محل کے گنبد اودے رنگ کے کہرے میں چھپے تھے۔ موتی محل برج پر ابھی سناٹا تھا، پل کے نیچے مندر میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر نیچے کی منزل کے دروازے کھلے۔ ترلوچن نے جھاڑو لگانے پر کمر باندھی۔ بستر لپیٹے گئے۔ صراحیاں اٹھا کر اندر رکھی گئیں۔ ”اٹھو بیٹا جلدی کرو۔

تمہر اسکول آج سے سبیرے کا ہوئے گوا۔۔۔'' جمنامہری نے آن کر چھوٹی لڑکی سے کہا، لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی سے اس نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی، پانچ بج گئے۔ ارے رام رے۔ آج سے اسکول کھل رہا تھا، وہ پلنگ پر سے کود کر تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

بڑی لڑکی نے کاہلی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں اور ندی کی اور دیکھتی رہی، وہ سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہو گی۔۔۔ کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا کالج چودہ جولائی کو کھلتا تھا۔ جلد اس کی شادی ہونے والی تھی اور اسے کالج والج کی چنداں پرواہ نہیں تھی، وہ اطمینان سے لیٹی ندی کو دیکھتی رہی۔

برجی والے کمرے میں سے نکل کر اس کا بھائی چپل گھسیٹتا قینچیوں کی طرح باہر آیا اور وہ بھی برآمدے کے ایک ستون کے پاس ٹک کر کاہلی سے ندی کو دیکھنے لگا، جدھر پل تھا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تولیہ کاندھے پر ڈال کر بےسری آواز میں گاتا غسل خانے میں گھس گیا۔

''اسکول میں اپنی گوئیاں سے کہہ دینا شام کو آ کر بڑی کے لہنگے کی گوٹ ختم کر ڈالیں۔'' گھر کی بی بی نے ٹھاکردوارے سے باہر نکل کر چھوٹی لڑکی کو آواز دی جو بالوں کی دو چوٹیاں گوندھے ہلکا نیلا ٹیونک پہنے، جس کی پیٹی سرخ رنگ کی تھی، کتابیں اٹھائے زینے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ نیچے برساتی میں لا مارٹینئر کی بس نے ہارن بجایا۔ ''اچھا۔ اچھا کہہ دوں گی۔'' اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے مڑ کر جواب دیا۔

گھر کی بی بی خالص پوربی تھیں۔ شادی ہو کر لکھنؤ آئے ان کو پچیس سال گزر

چکے تھے مگر اپنے لب و لہجے پر انہوں نے لکھنؤ کی اور اپنی سسرال کی ٹکسالی اردو کا ذرا اثر نہیں ہونے دیا تھا، وہ بڑی بیٹی کو بڑکی کہتی تھیں، چھوٹی کو چھٹکی، جیٹھ بڑکو کہلاتے تھے۔ ماں مہتاری، متیاں منٹی۔ بیرسٹر صاحب ان کو بمبئی، کلکتہ، کشمیر سب جگہ گھما لائے تھے، ہر سال نینی تال اور مسوری جاتی تھیں مگر کیا مجال جوان کی وضع میں فرق آیا ہو۔

اتنے میں بڑی لڑکی نے برآمدے سے نیچے جھانکا، نیچے باغ کی سڑک پر اسکول کی بس کھڑی تھی جس میں چند ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ سب انگریز لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں میں سے ایک نے کھڑکی میں سے سر نکال کر ہاتھ ہلایا: ''ہم لوگ شام کو آئیں گے۔ میرس کالج سے لوٹ کر۔''

''اچھا'' بڑی لڑکی جواب دیا۔

بس پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد لڑکا سیٹی بجاتا نیچے اترا، برساتی میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک بڑے اسٹائل سے سائیکل کے ہینڈل میں اٹکائی اور بے فکری سے پیڈل چلاتا کچی سڑک پر آ کر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا جس کی سنگ سرخ کی برجیاں دور دھندلکے میں نظر آ رہی تھیں۔

سورج نکل آیا، اب دنیا اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی۔ عدالتیں، دکانیں، کالج، سرکاری دفاتر، اخبار کے پریس، ریڈیو اسٹیشن، کونسل چیمبر، کارخانے، جیل۔۔۔ خلقت زندہ رہنے میں مصروف رہی۔

پھر شام ہوئی، روشنیاں جگمگائیں۔ بازار، محلے، کوٹھیاں، سینما ہاؤس، کلب،

بال روم محل سرائیں، جھونپڑیاں۔

ندی کے کنارے اس کوٹھی کے برآمدے میں سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں، یہ چار پانچ نوعمر لڑکیاں برآمدے کے جنگلے پر بیٹھی اس طرح ہنستی تھیں جیسے رنج سے نا آشنا ہیں۔شاید وہ رنج سے نا آشنا تھیں۔

چھتر منزل کے پیچھے سورج ڈوبا۔ندی کے کنارے کنارے ڈونگیوں میں چراغ جلے۔ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

۳۵

سورج جس سے جامنوں کے پیچھے پہنچا تب فٹن میرس کالج سے لوٹ کر اپنی تلی رفتار سے چلتی ندی کے پل پر آجاتی تھی، یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا بعد کا ہوتا تھا۔ندی کے پل سے اتر کر ایک سیدھی شفاف سڑک یونیورسٹی روڈ کہلاتی تھی اور اس کے دونوں طرف دریا کے کنارے کنارے دو کچے راستے جاتے تھے، ایک راستہ پل سے اتر کر یونیورسٹی بوٹ کلب، آرٹ اسکول اور ندوۃ العلماء کی طرف جاتا تھا، دوسرا کچا راستہ کاٹھ کے پل کی سمت۔۔۔یہاں سے ندی کے کنارے کنارے چاند باغ تک نئی کوٹھیاں بنی تھیں۔یہ علاقہ ٹرانس گومتی سول لائنز اور حیدر آباد کہلاتا تھا، یہاں بے شار نئے سیمنٹ کے مکان تھے۔بم بہادر شاہ کا دو منزلہ محل، چند پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جیسے کالا کنکر ہاؤس اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور آگے بڑھ کر نشاط گنج کی بستی تھی۔رائے بہاری لال روڈ،

جس کا ایک سرا یونیورسٹی روڈ پر تھا۔ بل کھاتی اس علاقے سے گزرتی فیض آباد روڈ پر جا پہنچتی تھی جہاں ازابلا تھوبرن کالج تھا۔ یہ بڑا خاموش اور پرسکون علاقہ تھا، کبھی کبھار کوئی موٹر نکل جاتی یا سائیکل سوار کالج کا لڑکا یا لڑکی۔ مضافات یا ڈالی گنج کی طرف جانے والے اکّے فیض آباد روڈ پر سے گزرتے رہتے اور آگے مسلم گرلز کالج تھا۔ اس کے آگے ارہر اور گنے کے کھیت تھے اور ریلوے لائن اور ماہ نگر اور بادشاہ نگر کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن اور شفاف تالاب اور امرودوں کے جھنڈ۔ اس کے بعد انگریزوں کا قبرستان تھا اور پیپر مل جس کی آواز وقت کی یکسانیت کو متواتر منتشر کرتی رہتی تھی۔ اسی طرف کاٹھ کا پل بھی تھا۔ ادھر سے راستہ چڑیا جھیل اور بھینسا کنڈ جاتا تھا۔ ادھر سے اور آگے سکندر باغ اور بنارسی باغ اور وہ سارا علاقہ تھا جہاں گورنمنٹ ہاؤس تھا، جس کے پیچھے غازی الدین حیدر کی نہر تھی اور حضرت گنج اور لا مارٹینر کالج اور لا مارٹینر روڈ ہرے بھرے کنجوں سے نکلتی دل کشا پیلس کی طرف جاتی تھی جس کے آگے جس کے آگے وسیع سرسبز چھاؤنی تھی۔

موتی محل برج سے آگے بڑھ کر میرس کالج تھا اور قیصر باغ کی بارہ دری اور قیصر باغ۔ اس کے آگے امین آباد پارک تھا اور امیر الدولہ پارک، اور شہر۔۔۔ اور جھاؤ لال کا پل اور پھر سڑکیں نخاس اور چوک کی طرف جاتی تھیں جہاں میڈیکل کالج تھا اور ہسپتال، شاہ مینا کی درگاہ اور امام باڑہ آصف الدولہ، مچھی بھون اور امام باڑہ حسین آباد، وہیں اکبری دروازہ تھا اور گول دروازہ۔ یہ سارا علاقہ پرانا لکھنؤ تھا۔۔۔ یہ نئے لکھنؤ سے بہت دور تھا مگر نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود تھا۔ شاہی کی ایک کوٹھی کی جگہ گورنمنٹ ہاؤس کھڑا تھا۔ ندی کے

کنارے موتی محل میں امپیریل بنک تھا۔ حضرت گنج کے عین وسط میں بیگم کوٹھی تھی۔ چھتر منزل میں کلب تھا، یہ بڑا وضع دار شہر تھا۔ یہاں کی چیزیں نئی ہو کر بھی قدیم تھیں، نو دو لتے پن کا اظہار یہاں کی کسی عمارت سے نہیں ہوتا تھا۔ اس شہر میں وقت نے بڑی گمبھیرتا اور ٹھیراؤ کے ساتھ گزرنا سیکھا تھا۔

اس اطمینان اور آسائش کے ساتھ فٹن شام کی کاسنی گلابی نارنجی روشنی میں خراماں خراماں چلتی موتی محل برج تک پہنچتی۔ یونیورسٹی روڈ پر اس وقت کاروں اور سائیکلوں کا ہجوم ہوتا۔ پل سے اتر کر اس سڑک پر جانے کے بجائے اکثر ایسا ہوتا کہ فٹن بائیں ہاتھ والی کچی سڑک پر اتر آتی، جہاں راستہ بڑے بڑے سفید پھولوں کی جھاڑیوں سے گھر گیا تھا اور جدھر پرانے وقتوں کی چند کوٹھیاں تھیں۔

گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھا مزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ ''بیٹا سنگھاڑے والی کوٹھی نہیں چلئے گا۔؟'' وہ جھک کر دریافت کرتا۔

یہ کہانی اب یہاں سے میں سنا رہی ہوں۔ (طلعت نے کہا) داستان گوئی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آ رہا، کون کردار زیادہ اہم ہیں، قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ جی ہاں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا، کلائمیکس کہاں تھی۔ ہیروئن کون تھی اور اس کا انجام کیسا ہونا چاہیے تھا۔ ہیرو کون تھا۔ اس داستان کو سننے والا کون ہے اور سنانے والا کون۔ میرا بڑا بھائی کمال ایک زمانے میں کہا کرتا تھا کہ ایک دن بیٹھ کر وہ یہ سب طے کرے گا۔ کمال اب تک کچھ بھی طے نہیں کر پایا، پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ 'ہاں چلیں گے' میں گنگا دین کو جواب دیتی۔ فٹن آہستہ آہستہ کچی سڑک پر رواں رہتی، یہاں ہو کا

عالم تھا، مکمل ابدی سناٹا۔ اسی راستے پر بہت آگے جا کر شمشان گھاٹ تھا۔ ندی کے پانی میں موتی محل کی روپہلی عمارت کے سائے لرزاں رہتے اور چھتر منزل کا سنہرا گنبد اور نجف اشرف کا امام باڑہ۔ ندی ان عمارتوں کی سیڑھیوں کے نیچے مودبانہ انداز میں بہتی رہتی۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں پانی کی موجیں گہری سبز دکھلائی پڑتیں، کبھی کبھی اس ہریالی میں سے تیرتی ہوئی کوئی ڈونگی نکل جاتی۔ سنگ سرخ کے شاندار موتی محل برج کے نیچے مندر کے چبوترے پر بندروں کا اکھاڑہ جمع رہتا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیاں بھی پانی میں اترتی تھیں۔ یہ دومنزلہ عمارت تھی اور اپنی تین ہشت گوشہ برجیوں کی مناسبت سے سنگھاڑے والی کوٹھی کہلاتی تھی، یہ برجیاں کائی کی وجہ سے گہرے ہرے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ برسات کے مہینوں میں یہ کائی اور ندی کا پانی اور آسمان، درختوں اور گھاس کا سبزہ، یہ سب مل کر ایک معلوم ہوتا۔ جاڑوں میں یہاں ہلکے پیلے رنگ کی روشنی پھیلی رہتی۔ کہر آلود درختوں کے پیچھے سے سورج نکلتا اور اس کی زرد لکیریں سارے میں تیرتی پھرتیں، جن میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو رنگ برنگے ذرے اڑتے نظر آتے۔ چاند باغ جاتے ہوئے اوورکوٹوں میں ناکیں چھپائے لڑکیاں جلدی جلدی صنوبر کے جھنڈ کی اور بڑھتیں اور گھاس پر شبنم کے بڑے بڑے قطرے پیروں میں آ کر ادھر ادھر لڑھک جاتے۔ جاڑوں میں شام کو سورج بہت جلد غروب ہو جاتا۔ چنانچہ فٹن بڑھتی ہوئی مدھم خنکی میں چھ سات بجے پل پر آ جاتی۔

”بیٹا۔۔۔۔ نرملا بٹیا کے یہاں نہیں چلئے گا؟“ گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے

بیٹھے کاہلی سے پوچھتا۔

اور پھر فٹن سڑک کے نشیب میں اتر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو جاتی۔

''یہ لو بھین تمہارا آمدنامہ دے گئے ہیں۔''لاج برساتی کی چھت پر سے آواز لگاتی۔۔بھین یعنی شنکر سویا ستوا یونیورسٹی میں تھا اور فارسی میں ایم۔اے کر رہا تھا۔

نرملا برجی میں کتھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی۔''اے۔۔ذرا آ کر جھپ تال تو بجا دینا۔''

وہ برجی کے کسی دوارے میں منہ نکال کر کہتی۔

ان کی اماں ٹھاکر دوارے میں چراغ جلانے کے بعد دوسری برجی میں سے آواز دیتیں:

''اری باؤلیو۔۔۔پہلے کھانا تو بھتر لیو۔۔۔''

نرملا کی بڑی بہن لاج اطمینان سے آلتی پالتی مار کر برآمدے میں ندی کے رخ بیٹھ جاتی۔''اب یہ بتلاؤ کہ گیان نے کسم کو کیا جواب دیا؟''

میرس کالج کی سیاست شروع ہو جاتی، لاج وہاں سے فقتھ ایر پاس کر چکی تھی اور اب بی۔اے کے بعد اس کا بیاہ ہو جائے گا۔

''راجکماری شو پوری لاہور جا رہی ہیں۔''

''لاہور۔۔۔؟ ارے باپ رے باپ۔''

لاہور بہت دور تھا، بالکل دوسرا کرہ کہئے۔ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیتے راجکماری

سنگاپور جا رہی ہیں۔

''افوہ۔'' گھنگرو باندھے باندھے باہر آ کر نرملا اظہارِ خیال کرتی، پہلے وہ بھی میرے ساتھ میرس کالج میں تھی لیکن پچھلے سال جب وہ بیمار پڑی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکول اور میرس کالج کی دہری محنت اس سے نہ کروائی جائے۔ اب ہماری دوست مالتی کے بڑے بھائی سورج بخش سو یا ستوا، جو نابینا تھے اور میرس کالج کے اسٹاف پر تھے، شام کو آ کر اسے ایک گھنٹہ ریاض کرا دیتے تھے اور شمبھو مہاراج کے گھرانے کے ایک کتھک سے وہ ناچ سیکھ رہی تھی۔ لا مارٹینئر میں نرملا میری ہم جماعت تھی۔ ہم دونوں دو سال بعد سینئر کیمبرج کریں گے۔

''کتنی عجیب بات۔ یعنی ہم میں سے ایک لاہور جا رہا ہے۔ ارے واہ۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی بڑا جی چاہتا ہے کہ انوکھی جگہیں دیکھوں'' اس نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کیا۔

''پنجاب ہے نا۔۔۔ وہاں ان کی یونیورسٹی بھی ہے، اس میں وہ ہونے والا ہے، وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھئی اس میں سنا ہے میوزک کی کلاسیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں راجکماری اپنے پڑھایا کریں گی مگر ابھی تو وہ اندر جیت کی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہیں۔''

اندر جیت کور دہرہ دون کی ایک سکھ لڑکی تھی اور کچھ دنوں کے لیے اس نے میرس کالج میں پڑھا تھا۔

ویسے یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھکنڈے یونیورسٹی۔ باقی کہ جو انورسٹی یعنی کیننگ کالج تھا، جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھتے تھے، وہ تو

ایک قسم کا اندرلوک تھا جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجبرے پر سے سر اٹھا کر اکثر ہم لوگ حساب لگاتے: ایک دو تین چار پانچ ۔۔۔ پورے پانچ سال بعد ہم اس اندرلوک میں پہنچ سکیں گے، ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔

"بڑے آغا صاحب نے آج گاتری نگم کو پھر ڈانٹ پلائی۔"

"تھیوری کی کلاس کے لیے لیلا وید ی آئی تھیں؟"

"سنا ہے اب کے سے تھرڈ ایر کے ایکسٹرنل ایگزامنر وناٹک راؤ پٹوردھن ہوں گے۔"

"ارے ہائے ۔۔۔ وہ بڑے سخت آدمی ہیں۔ وائیوا میں انہوں نے میرا پٹرا کر دیا تھا۔"

لاج کہتی۔

سارے ہندوستان میں میرس کالج کی طرح کا کوئی اور ادارہ نہ تھا۔ پانچ سال کا اس کا کورس تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی طرح سخت۔ اس کے بعد کہیں جا کر بیچلر آف میوزک کی ڈگری ملتی تھی۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا اور بھکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک کہلاتا تھا۔ گیان، راج، لیلا، راجکماری، یہ سب لڑکیاں اب اسٹاف پر تھیں۔ تین سال قبل ریڈیو اسٹیشن کھلا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے۔ کلاسیکل موسیقی اور ڈراموں کے لیے ریڈیو اسٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصباتی لڑکی تھی جو کوئل کی ایسی آواز میں گاتی، پھر نیاز فتح پوری کے داماد مجد نیازی تھے۔ طلعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ ارچنا لہری تھی اور بہت سی بنگالی

لڑکیاں۔سورج بخش سریواستوا تھے۔ پرنسپل رتن جھنکر۔الیاس خانے اور جانے کون کون۔۔۔۔ایک سے پائے کا کلاکار پڑا تھا۔

''پر راجکماری ہم سے الگ اتنی دور جا کر بور نہیں ہو جائیں گی۔؟''نرملا نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''جب بھین اسٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے جلسے کے لیے کراچی گئے تھے تو مجھے بھی سنگ لے گئے تھے۔۔یاد ہے۔؟لاہور تو اتنا دور بھی نہیں ہے۔''لاج کہتی۔

''مجھے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے۔''میں فوراً اپنے سمندری سفروں کا حوالہ دیتی، مگر کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ لاج کو دیکھتی۔ ''تم کو کیا پتا اونٹ گاڑی کیسی ہوتی ہے۔میں نے دیکھا ہے۔''لاج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ برنگی لہروں پر چم چم کرتیں۔ ساری دنیا، کائنات، زندگی پیش منظر کا جو دھندلا سا اٹکل پچو خاکہ ہمارے ذہنوں میں تھا وہ ہمارے سامنے ان لہروں پر ناچتا رہتا۔شاہی کے زمانے کی عمارتیں (ہم خود شاہی کے زمانے کی ایک عمارت میں موجود تھے)، دور سنگ سرخ کا پل، بوٹ کلب کی ڈونگیاں، سنگھاڑے والی کوٹھی کی محفوظ کائی آلود سیڑھیاں ۔جغرافیے کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے۔اس کے آگے کیا ہے۔۔اور کیا کیا ہوتا ہے۔

''آپی بڑا ہو کر کہاں جائیں گی؟''اکثر نرملا کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر بیٹھتی۔

''وہیں جائیں گی جہاں بھیا صاحب لے جائیں گے اور کہاں جائیں گی۔''

میں جھنجھلا کر جواب دیتی۔

''بھیا صاحب کہاں جائیں گے۔''

''کیا معلوم۔''میں سٹ پٹا جاتی۔

(اب کمال اپنے کونے میں سے اٹھ کر باہر آیا اور بالکنی کے ایک ستون سے ٹک گیا۔ گویا طاعت کی بات ختم کرنے کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے بعد اس نے گویا کیو لے کر کہنا شروع کیا):

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیرو تھے میرے لیے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی ٹائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

کی طرف کوئی نہ جائے، وہ عموماً ان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، سیمل کے درخت کے نیچے۔

بھیا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ہمارے یہاں، ان کے یہاں، سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جب چچا ابا کا سوئٹزرلینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا وہ بھیا صاحب سے ملنے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیا صاحب لوزان کے ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو سوئٹزرلینڈ سے واپس بلا لیا گیا۔ بھیا بمبئی سے سیدھے ہمارے یہاں الموڑے پہنچے تھے۔ ابا میاں ان دنوں الموڑے میں تعینات تھے۔ برساتی میں وہ فل بوٹ پہنے کھڑے تھے۔ اپنے سوئس اسکول کے سبز اور سیاہ دھاریوں والے مفلر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے روتے روتے سوج گئے تھے اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انہوں نے مجھے اور راپی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ طلعت اس وقت بہت چھوٹی تھی اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ الائچی کے درخت پر چڑھی ہوم ورک کر رہی تھی۔

الائچی کا درخت ہم لوگوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ پہلو کے برآمدے کے قریب تھا۔ اس کے سامنے لان تھا۔ اس درخت پر بیٹھ کر ہم اسکول کا کام کرتے۔ اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے۔ جاڑوں میں اسی کے نیچے اسنو مین بنایا جاتا۔

اس کے بعد سے بھیا صاحب مستقلاً ہمارے یہاں رہنے لگے۔ بابا ان کو دیکھ

کر جیتے تھے۔ ممی ان پر عاشق تھیں۔ ان کی امی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ سارا کنبہ، ساری برادری، سارا قصبہ ان کے نام کی مالا جپتا۔

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگھرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آ کر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بھیا صاحب لامارٹینر کالج میں داخل کر دیے گئے جو ڈیڑھ سو سال قبل نواب آصف الدولہ کے مقرب خاص جنرل کلاڈ مارٹن فرانسیسی کے روپے سے یورپین لڑکوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کیا بھیا صاحب ہیں؟ میں کہانی سنانے بیٹھا ہوں تو کرداروں کے متعلق بھی تو طے کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں، بھیا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا ہے تم سمجھ دار ہو، خود ہی تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ایسا رومانی پس منظر ہیرو کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ چارلس بوائیر ہوتے ہیں، اگر تم قدامت پسند تماشائی نہیں ہو تو تم کو یہ جان کر بڑی جھنجھلاہٹ ہو گی کہ بھیا صاحب بھی بہت خوبصورت تھے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس

کے ساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ بھیا صاحب عین مین چارلس بوائیر تھے۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب و لہجہ بھی بالکل فرانسیسی تھا جب وہ 'ٹ' اور 'ڈ' کے تلفظ کے ساتھ رک رک کر انگریزی بولتے تو مت پوچھو کہ کس طرح ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔

رہیں اپی۔ تو وہ اس افسانوی قسم کی عم زاد بہن قطعی نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن لوگوں کے لیے پکوان بناتیں یا پل اوور بنتیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے مشغلے میں نے اردو افسانوں میں پڑھا ہے کہ مسلمان عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں۔ اپی لا مارٹینئر گرلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ جو نجف اشرف کے قریب ندی کے دوسرے کنارے پر خورشید منزل میں تھا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر خورشید منزل کی اونچی عمارت، جو نواب سعادت علی خاں نے ڈیڑھ سو سال گزرے اپنی بیگم خورشید زادی کے لیے بنوائی تھی، اس کے چاروں اور خندق تھی اور یورپین وضع کے کنگورے۔ سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپی رہتی۔ گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے اونچے کنگورے اور برجیاں دور سے بڑی واضح نظر آتیں اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی لینڈ اسکیپ مصور کی مدھم خوشگوار شفاف رنگوں والی بڑی سی پینٹنگ منقش چوکھٹے میں جڑی سامنے دھری ہے۔ اکثر جب بنارسی باغ جاتے ہوئے پل سے اتر کر اس اسکول کے سامنے کی خاموش سایہ دار سڑک پر سے گزرتا تو اپی مجھے قلعے کے کسی دریچے میں کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کرتی نظر آتیں۔ اس منظر میں بڑا ناقابل بیان

سکون رچا تھا۔

بھیا صاحب ہرے بھرے کنجوں، طویل بل کھاتی شفاف سڑکوں اور باغات کے اس سلسلے کے دوسری طرف لڑکوں کے لا مارٹینئر کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے وسیع تالاب کے کنارے وہ اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ فرانسیسی لہجے میں باتیں کرتے یا ٹہلتے یا کبھی کبھی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ان کی طبیعت میں جو دھیما پن، جو کھوئی کھوئی اداسی تھی اس نے ان کو اور زیادہ رومینٹک بنا دیا تھا۔

دیکھیے، میں عرض کروں، مجھے اس لفظ رومینٹک سے دلی نفرت ہے۔ یہ کوئی میں خواتین کے رسالے کے لیے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا ہوں جس میں سوا چاندنی رات اور گلاب کے شگوفوں اور والٹس کی موسیقی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جن کا ہیرو اچھا خاصا ہسپانوی بل فائٹر نظر آتا ہے۔ اسے حسن اتفاق کہیے اور بحیثیت قصہ گو میری بدقسمتی کہ بھیا صاحب فرانسیسی لہجے میں بات کرتے تھے اور لا مارٹینئر میں پڑھتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز میں ہنستے تھے۔

سینئر کیمبرج کے بعد بھیا صاحب انٹرمیڈیٹ کے لیے کالون تعلق دار کالج میں آگئے جو ہمارا خاندانی کالج تھا اور جہاں ہمارے گھرانے کے افراد کئی پشتوں سے پڑھتے چلے آرہے تھے۔ میرے اور ہری شنکر کے باپ دادا سب نے یہیں پڑھا تھا۔ یہاں بھیا صاحب دوسرے ڈیکیڈنٹ رئیس زادوں کے ہمراہ شہسواری کرتے اور ستار بجاتے۔ سال بھر بعد وہ سڑک عبور کر کے کیننگ کالج میں داخل ہو گئے اور کئی برس تک یونیورسٹی کے ورندا بن کے کنہیا بنے رہے۔

اپی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ اپی بھیا صاحب کے دوستوں میں کیڑے ڈالتیں، یہ اپی کی سہیلیوں کی نقلیں اتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ تلے اوپر کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ لاج وتی سریواستوا اپی کی سب سے پیاری گوئیاں تھیں۔ یہ میرے چہیتے جان کے ٹکڑے دوست ہری شنکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں، پر اکثر ایسا ہوا کہ چمپا باجی کا ذکر سنتے ہی لاج ایک دم چپ ہو جاتی۔ اپی بے پرواہی سے بیٹھی ہنستی رہتیں۔ ہری شنکر بے وقوفوں کی طرح سگریٹ سلگانا شروع کر دیتا۔ چمپا باجی ہم میں سے کسی ٹیم میں شامل نہ تھیں۔ یہ سب سے الگ تھیں۔ ہمارے لیے کافی اجنبی تھیں۔ ہم سب جنم جنم سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ایک ہی پس منظر اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چمپا باجی کے پس منظر سے ہمیں واقفیت نہیں تھی۔ مجھے اکثر یہ قوی شبہ ہوا کہ چمپا باجی مڈل کلاس ہیں۔

جب بھیا صاحب لاء کر رہے تھے اس وقت چمپا باجی نے بنارس سے آ کر ازابلا تھوبرن کالج میں داخلہ لیا۔

یہ سن انیس سو اکتالیس عیسوی تھا۔

اپی لا مارٹینیر اسکول سے ازابلا تھوبرن کالج آ چکی تھیں۔ بھیا صاحب ایک کے بعد معرکے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی محفلیں، سوسائٹی کے ڈرائنگ روم، ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ان کے اے ڈی سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ نہایت عقیدت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

جس سال اپی نے تعلیم ختم کی اسی سال بھیا صاحب اور اپی کی شادی کی بات ٹوٹی۔

اب میں من میں ایک بات سوچ رہا ہوں، وہ بات یہ ہے کہ جس طرح، جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہرانا چاہتا ہوں اس میں کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بادشاہ باغ کا شاہی کے وقت کا پھاٹک جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ پھولوں کے تختے۔ سڑک پر سے گزرنے والی کہارنیں، وہ بوڑھیا جو سرخ لہنگا پہنے دوپہر کو سنسان سڑک پر املیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی۔

ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی۔ جبھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔ پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی غیر ضروری جزویات سے احتراز۔ یہی سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے۔ میں آرٹسٹ نہیں ہوں، کمیونی کیٹ نہیں کرسکتا۔ طاعت شاید ایسا کر سکے۔

بہر حال تفصیلات ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھیے۔ یہ بینٹ ہال ہے۔ میں اس کی ایک اونچی شہ نشین میں بیٹھا ہوں اور

ریڈیو کے لیے کانووکیشن کی کومنٹری سنا رہا ہوں۔ نیچے وسیع و عریض کواڈرینگل میں سیاہ کیپ اور سیاہ گاؤن میں ملبوس مخلوق ادھر ادھر چل پھر رہی ہے۔ سرسبز گھاس کے قطعے اور سرخ اور زرد کینا اور لالہ کے تختے۔ سنگ سرخ کی عمارات کے سائے ساریوں اور سیاہ چغوں اور فیکلٹی کے زرتار منقش لبادوں کے سارے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کی سنسناہٹ میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ نیچے گھاس پر بہت سارے لوگ جمع ہیں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ بھیا صاحب نیچے سرخ قالینوں والے طویل راستے کے کنارے کنارے چمپا باجی کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے کواڈرینگل کی طرف جا رہے ہیں جدھر ایٹ ہوم کے لیے سفید میزیں بچھی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر یکلخت نیو تھیٹرز کا نیا ریکارڈ لگا دیا گیا ہے:

''یہ کوچ کے وقت کی آواز'' پہاڑی سانیال کی آواز سارے میں گونجتی جا رہی ہے۔۔۔ پہاڑی سانیال بادامی ریشمیں کرتا پہنے، دھوتی کا لمبا پلو ہاتھ میں سنبھالے میرس کالج والوں کے ساتھ کرسیوں کی ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر کسی بنگالی لڑکے سے باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کا پرا اپنے امریکن اسٹاف کے ساتھ گھاس پر سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے وائس چانسلر حبیب اللہ آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے جغادری پروفیسر اپنی اپنی قبائیں پہنے راستے پر رواں ہیں۔ ایک دن ایسا ہوگا جب ان انسانوں میں سے ایک باقی نہ بچے گا۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوجیے متر ہری شنکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔

ہلو۔۔۔میری آواز آ رہی ہے۔۔ہلو۔۔۔

ہلو۔۔۔ہاں۔۔۔

(ہری شنکر نے، جو لیمپ کے پیچھے اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا، جواب دیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اسٹیج کے باہر سے اس کی آواز مائیک پر گونجتی ہوئی آ رہی ہو، وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا۔)

ہلو۔۔۔ہلو۔۔۔ میں، ہری شنکر، اب آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں ہری شنکر سریواستوا، کمال کا ہمزاد۔ لاج اور نرملا کا اکلوتا بڑا بھائی۔ چمپا باجی کا رفیق۔ میرا کردار بھی خاصا اہم ہے۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں کہانی میں اتنے سارے مختلف رول ادا کر رہا ہوں۔ میں بات کس طرح شروع کروں؟ اسٹیج پر کیسے داخل ہوں؟ یہ بڑا گھپلا ہے۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے۔ ہزاروں لاکھوں پھول گھاس پر کھلے ہیں۔ گلاب، لالہ، سویٹ پی۔ درختوں کی ہری نارنجی پتیاں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جھلملا رہی ہیں۔ اپنی گاؤن پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جا بیٹھی ہیں۔ بھیا صاحب اور چمپا باجی آم کے درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں۔ کیننگ کالج کے وسیع کواڈرینگل میں چاروں اور قالین بچھے ہیں اور صوفے اور سرخ قالینوں والے راستے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جا رہے ہیں۔ اب مجمع کم ہوگا۔ شام کو لڑکیوں کے غول اپنی تصویریں کھنچوانے حضرت گنج جائیں گے۔ لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے، پھر ان موقعوں کے

گروپ فریم کر کے دیواروں سے لٹکا دیے جاتے ہیں اور وقت گزرتا ہے اور ان کے کاغذ پیلے پڑ جاتے ہیں۔

کمال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس کا بڑا چہیتا دوست ہوں۔ اس کی بہن تہمینہ ہے، جسے گھر میں اپی کہا جاتا ہے، مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی لاج اور نرمل سے، لیکن میرا اور کمال کا اپی کے لیے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ ''اللہ، ہری شنکر ہمرے لیے باٹا سے یہ جوتوں کی جوڑی بدلواتے لانا۔'' اے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہمری ساری کب تلک رنگ کر دیں گے؟'' ''اے جناب! حضرت گنج جاتے ہیں؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لیے ماری والوسکا کے دو ٹکٹ خرید لائیے گا۔''

''خدا کے لیے اپی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہلی بھی کس کام کی'' میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا، ''اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موٹر جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے، وہ کس دن کام آئے گی۔ اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو۔''

''اے بھیّن۔۔۔ میرس کالج جا کر گیان سے ملنا اور اس سے کہنا کہ نیڈل ورک کا وہ والا نمبر بھجوا دے جس میں۔۔۔'' لاج کھڑی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' غصے کے مارے دل چاہتا کہ ان دونوں چڑیلوں کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ندی تک لے جاؤں اور پانی میں ڈبو دوں۔

اگر مر گئیں تب بھی دونوں کے بھوت آ کر نیڈل ورک کے رسالوں اور سینما

کے ٹکٹوں کی فرمائش کیا کریں گے۔

میں ایک پیر سائیکل پر رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پر ٹکا کر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا رہتا۔

''میرا لائبریری کارڈ ہی کہیں گم ہو گیا۔ شنکر میاں، ٹیگور لائبریری تک جا کر۔'' اپی اطمینان سے گھاس پر بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔ اب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھیں اور ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''بھین، آج شام کو پکچر نہیں دکھلاؤ گے۔'' لاج اپی کی شہ پا کر بولتی۔

''چپ رہ چڑیل۔'' میں غراتا۔

''اچھا ہے۔ ڈانٹ لو غریب کو۔ بچاری چار دن کے لیے نہر میں مہمان ہے۔'' اپی بڑی رقت خیز آواز میں کہتیں۔

''اور کیا۔ کرلو کمینہ پن۔'' لاج حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پیر ہلاتے ہوئے سوں سوں کرتی۔

''ہم کوئی چمپا باجی ہیں جو ہم کو کافی ہاوس لے جا کر آئس کریم کھلاؤ۔ ہم تو بچاری لاج اور اپی ہیں۔''

''چمپا باجی۔۔۔ ان کا کیا ذکر ہے۔'' میں ہڑبڑا کر کہتا اور پیڈل پر زور سے پیر مار کر زناٹے کے ساتھ برساتی کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپی اور کمال کی چھوٹی بہن طلعت میرس کالج سے لوٹتے میں میرے گھر میں رک جاتیں۔ میں اپنی برجی کی کھڑکی میں سے فٹن کو اپنی کوٹھی کی طرف بڑھتے دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سناٹا طاری ہوتا اور اداسی اور موسم کے سارے

پھولوں کی مہک۔ ندی کے پانی کی پرسکون لرزہ خیز موسیقی میرے کانوں میں پہنچتی اور جانے کاہے سے میرا دل دھڑک اٹھتا۔ میرا ہمزاد کمال کہتا تھا کبھی کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے۔ اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے دماغوں کی ایک ایک چول ذرا ڈھیلی تھی۔

جب ہم دونوں کسی سفر سے لوٹتے تو صبح صبح ہلکے خنک دھندلکے میں سندیلے کا چھوٹا سا اسٹیشن آتا تھا۔ (کمال نے کہنا شروع کیا) 'یہاں لڈو ہوتے ہیں۔' شنکر نے خیال ظاہر کیا۔ عین اسی وقت ''لڈو سندیلے والے'' کی صدا سنائی دی۔ سرخ بجری کے پلیٹ فارم پر نستعلیق قصباتی شرفاء انگر کھے، دوپلی ٹوپیاں، سفید ڈھیلے ڈھالے پاجامے، اجلی دھوتیاں پہنے، دوسری ٹرین کے انتظار میں اطمینان سے ٹہلتے تھے۔ پلیٹ فارم کے کنارے چند پالکیاں رکھی تھیں۔

سفید پھولوں سے گھرا ہوا اسٹیشن جس کے عقب میں آم کے باغات تھے۔ باریک سرخ کاغذ میں لپٹی ہانڈیوں میں رکھے ہوئے لڈو بیچنے والوں کی صدائیں۔ دور سرخ چادر اوڑھے کوئی لڑکی بدا ہو کر جھکو پھکو روتی اسٹیشن کے پھاٹک کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے آگے آگے تین چار دیہاتی چل رہے تھے۔ دولہا نے ہلدی کے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا، پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اوپر کی برتھ پر سے شنکر نے آواز لگائی:

''میں ذرا بھیرو کا ریاض کرنا چاہتا ہوں، اگر تم برا نہ مانو۔''

''میاں تم کو کون منع کر سکتا ہے۔ تم بھیرو چھوڑ......''

''آ۔۔۔آ۔۔۔رے۔۔۔رے۔۔۔دھاپا۔۔۔گا۔۔۔اوہو۔۔ہو۔۔جاگو.
ارے۔۔بھائی جاگو موہن''۔۔۔اس نے دہاڑنا شروع کیا۔

''لاحول ولا۔۔کس قدر ایلی منٹری بھیرو۔۔۔یہ والا بھجن تو فرسٹ ایر میں سکھلایا جاتا ہے۔''

میں نے کروٹ بدل لی۔''اور دوسری بات یہ کہ میں ذرا چند لڈو کھانا چاہتا ہوں۔''میں نے اظہار خیال کیا۔

''اے میاں۔اے بھائی۔جہنم میں جائے تمہارا ریاض۔تم خود کسی دن مجھ سے یہی چیز درت میں سننا۔اے بھائی۔''میں نے آدھی بات شنکر سے کہنے کے بعد پھر لڈو والے کو آواز دی۔

''کہیے مہربان۔''لڈو والے نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

''جاگو۔۔۔ہی ہی۔۔اے کیا مرکیاں لیتا ہوں۔''شنکر چنگھاڑتا رہا۔

''ذرا دماغ پر زور ڈالو اور تصور کرو کہ برابر والے ڈبے سے ایک مدھر تان بلند ہو۔۔۔گوال بال سب گیین چراوت۔''

اس نے انترہ اٹھایا۔

''تمہارے درس کو بھوکے ٹھاڑے۔''میں نے غصے کے ساتھ گرج کر آواز ملائی۔''میاں شنکر یہ باتیں محض افسانوں میں ہوتی ہیں۔تم نے کانن کا وہ نیا فلم دیکھا ہے۔''جوانی کی ریت۔۔۔''کہ:

موہے ان بن یہ جلسہ سہائے نہ۔۔''

’’کہاں دیکھا۔ ہم تو مرزا پور میں بیٹھے جھینک رہے تھے۔‘‘

’’کیوں گپ مارتا ہے بے۔ مرزاپور میں جھینک رہے تھے۔ تم مجھے نہ بھیجو وہاں جھینکنے کے لیے‘‘ میں نے غصے سے کہا۔

’’چلا جا بھائی اللہ تو ہی چلا جا۔ اور میری جان بخشی کر۔‘‘ اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ گپ ہانکتا ہے نامعقول۔ خود ہی خود بر دکھوے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ میں ساری چھٹیاں اکیلا مسوری میں بور ہوتا رہا اور ہری شنکر سریواستو تھے کہ مرزا پور میں بیٹھے کجریاں الاپ رہے تھے۔ اب پچھلے ہفتے اماں بیگم کا خط پہنچا کہ فوراً لوٹو۔ کلیان پور سے اپی بھی لوٹ کر آ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا مگر گھر میں ایک کرائسس درپیش تھا۔ اماں بیگم نے لکھا تھا کہ خدا خدا کر کے بھیا نے بیاہ کے لیے ہاں کر دی تھی۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ بھیا نے ہاں کی تو لڑکی ندارد۔ اطلاع ملی کہ اپی نے انکار کر دیا ہے۔ اب گھر پر ہائی کمانڈ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ شنکر بھی مرزا پور سے لوٹ آیا تھا اور راج کے میاں سے ملنے کے لیے دلی پہنچا ہوا تھا۔ میں نے مسوری سے اس کو تار دیا۔ مراد آباد کے اسٹیشن پر وہ مجھ سے آن ملا۔

’’بھیا کی شادی کا کیا ہوگا۔‘‘

’’بھیا نہیں۔ لاج ہزمل سے پوچھنا کوئی لونڈیا ہے ان کی نظر میں۔ یہ اس قدر لڑکیاں دنیا بھر میں بھری ہوئی ہیں مگر وقت پر کوئی نہیں ملتی۔‘‘

’’چمپا باجی بھی لکھنؤ پہنچ گئی ہوں گی۔ کیلاش ہوسٹل ہی میں رہیں گی نا۔‘‘ شنکر

نے یکلخت بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''پتا نہیں۔'' میں چپ ہو گیا۔ ''لاؤ ایک بیڑی دیو۔'' میں نے کچھ دیر بعد خالص یکے والوں کے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کیس اوپر سے پھینک دیا۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہم تیزی سے شہر کی اور آ رہے تھے۔ عالم باغ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دماغ دراصل ایک قسم کا بھان متی کا پٹارا تھا۔ میں بہت سی باتوں کو الگ الگ کر کے ان پر غور کرنا چاہتا تھا مگر وہ پھر گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔

چمپا باجی اس میں ایک ڈسٹرب کرنے والے عنصر کی حیثیت سے آ شامل ہوتی تھیں۔ میں ان کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ بجز ایک سندیلے کے لڈو کے۔ میں نے شنکر سے کہا: ''لڈو پھینکو۔''

''ساپت ہوئے۔'' اس نے اطمینان سے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا چمپا باجی نے منگوائے تھے؟''

''وہ مجھ سے کون سی چیزیں منگواتی ہیں۔ میں کوئی بھیا صاحب ہوں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔'' شنکر نے عقلمندی سے کہا۔ ''تم بھیا صاحب نہیں ہو، میں کمال رضا نہیں ہوں۔ اپی چمپا باجی نہیں ہیں۔ ہم سب الگ الگ ہستیاں ہیں۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں زندہ رہیں گے۔''

''یہ ویدانت کا ریکٹ مت چلاؤ سویرے سویرے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اچھا۔ لڈو لیو۔''

''تمہاری تو بڑی خاطریں ہوئی ہوں گی مرجاپور میں۔'' میں نے کروٹ

بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں آں۔ہوئی تھیں۔''اس نے بے تعلقی سے جواب دیا۔''مگر خاطریں تو ہماری گورکھپور میں ہوئی تھیں پچھلے سال۔''

یہ شنکر کا باقاعدہ کریز بنتا جا رہا تھا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں بر دکھوے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ٹھاٹھ تھے بھائی کے۔

''اب تو لاج کو بدا کر کے بندہ چین کی بنسی بجائے گا۔''اس نے آرام سے لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

''کمینے۔۔بہن کو بدا کرتے سے بجائے اس کے کہ روؤ، بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کہ اب فرصت ہے لونڈیوں میں گھومنے کی۔ یہ تمہارا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ریکٹ فراڈ ہے سارے کا سارا۔اس ہیراوتی پانڈے کا کیا ہوا۔''

''اور میں تم سے سوال کر سکتا ہوں کہ لاہور میں جو آپ وہاں کی ترقی پسند لڑکیوں سے بھائی چارہ کر رہے تھے پچھلے سال اور وہ الہ آباد میں جو تھی شو لیلا بہادری۔۔۔اور۔۔۔۔''

''میاں کیوں دل کو جلاتے ہو صبح صبح۔۔''

''اور کلکتے میں جو ہے وہ۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔مدھر لیکھا موجومودور۔'' ۔۔۔شنکر نے ہونٹوں کی مخروطی شکل بنا کر بنگالی لہجے میں کہا۔

''جبھی تو لاج اور راپی کہتی ہیں کہ ہم لوگ سخت چھچھڑ قناتی ہیں۔''

میں نے اعتراف کیا۔

شنکر دفعتاً بڑا اداس ہو گیا: ''دیکھو بہنیں ہیں۔''اس نے کہا۔''اور وہ بدا ہو جاتی

ہیں۔''

ہاں۔میں چپ ہوگیا۔

لاج نے مجھ سے کہا تھا۔''کمال بھیا: چمپا باجی ایسی لڑکی ہیں مجھے لگتا ہے جیسے ان کی وجہ سے بہت سے لوگ بہت دکھی ہوں گے۔'' لاج میں یہ چھٹا حس جانے کہاں سے آ گیا تھا۔لڑکیوں کی تھاہ کون پا سکتا ہے بھلا۔

''شنکر۔''

''ہاں یار۔''

''تزئین دریافت کریں گی اسکرپٹ مکمل کیا یا نہیں۔''

''اسکرپٹ چمپا باجی کے پاس ہے۔ چلے جانا کیلاش ہوسٹل۔کیا رکھا ہے۔''

جو بات میں ختم کرنا چاہتا تھا شنکر معاً اسی نقطے پر پہنچ گیا۔

''ہاں۔۔نہیں۔۔۔پتا نہیں۔''

یہ چار الفاظ ہم سب کی زندگیوں کا گویا مکمل عنوان تھے۔

ہاں۔۔نہیں۔۔پتا نہیں۔۔

ضرور جاؤں گا کیلاش ہوسٹل۔واقعی اس میں رکھا کیا ہے آخر، وہ میرا کر ہی کیا سکتی ہیں؟ وہ پیلی رنگت والی دبلی پتلی لڑکی۔متوحش آنکھوں والی۔یونین میں تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔ابھی تک یہی طے نہیں کر پائیں کہ مسلم لیگی رہیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ہر قسم کی عقل سے معذور۔ایک ہزار بار سمجھایا ہوائی جہاز ایسے اڑتا ہے، ریڈیو ایسے بجتا ہے، گراموفون میں آواز اس طرح بھری جاتی ہے مگر ہر دفعہ مرغے کی وہی ایک ٹانگ کہ میرے پلے تمہارا

سائنس نہیں پڑتا۔ واہ کیا ادا ہے۔ جی ہاں میں ان سے کوئی ڈرتا ہوں۔۔۔ مطلق نہیں ڈرتا ہوں ان سے مجھ سے عمر میں ایک ہی آدھ سال بڑی ہوں گی مگر بزرگی پر اس قدر اصرار ہے کہ اگر بھولے سے باجی نہ کہا تو خفا ہو جاتی ہیں۔ میں بہت معمولی ہوں۔ انہوں نے بھیا سے کہا تھا۔ بھیا کون آئن سٹائن تھے۔ میں کون مارشل فوش ہوں پر بھیا صاحب چمپا باجی سے عشق فرما رہے تھے تو لگتا تھا ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے یا ہاؤس اوف لارڈز میں بحث کی جا رہی ہے یا سدھانت صاحب اٹھارہویں صدی کی نثر پر لیکچر دے رہے ہیں۔

اپی نے ایسا کیوں کیا۔۔ میرا مطلب ہے۔۔ شادی سے انکار۔۔۔ شنکر نے دفعتاً سوال کیا۔ میں نے غصے سے دانت پیسے۔ میں اس شنکر سریواستوا سے عاجز تھا۔ جو بات میں سوچتا تھا وہ بے تار برقی کی لہر کی طرح سے اس کے دماغ میں پہنچ جاتی تھی۔ یا پہلے سے ہوتی تھی۔۔ ہمزاد کی طرح کہیں اس سے مفر نہ تھی، اگر میں اس سے باتیں نہ بھی کرتا تھا تو بیکار تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ ایسا پہنچا ہوا پرم ہنس بن چکا ہے کہ اسے زبانی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھگوان کرشن اور ارجن کا درجہ رکھتے تھے۔ اکثر یہ درجے ادلتے بدلتے رہتے تھے۔ جب سے چمپا باجی نے بنارس سے آن کر لکھنؤ میں داخلہ لیا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ان کے عشق حقیقی میں مبتلا ہوں۔ نہایت ڈھٹائی سے وہ بھیا صاحب سے کہتا: ''چمپا باجی آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔۔۔ ویسے آپ ہیں ہی پسند کے لائق۔۔ مگر یہ کہ۔۔''

اور چونکہ اپی سے بھیا کی منگنی ہو چکی تھی اور اپی بھیا صاحب کو عام ہندوستانی

لڑکیوں کی طرح اپنا دیوتا تصور کرتی تھیں اور بھیا صاحب چمپا باجی پر دم دیے دے رہے تھے لہٰذا یہ پچویشن بے انتہا گنجلک ہو گئی تھی اور یہ شنکر کا بچہ نہایت خوبصورتی سے بھیا صاحب کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں اور چمپا باجی کی ایسی لڑکیاں تو ہر سال یونیورسٹی میں آتی ہیں، اپی کا اور ان کا کیا مقابلہ، پھر اسے بھیا صاحب کے اس چپڑ قناتی پن پر غصہ آتا کیونکہ لاج کی مانند اپی کو بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

دراصل ہم لوگوں کی اوریجنل غلطی یہی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور زندگی کے متعلق نہایت سنجیدہ اور بھاری بھرکم تصورات لیے بیٹھے تھے۔

''اپی کیا کریں گی؟ ابھی تو وہ ولایت بھی نہیں جا سکتیں۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''ولایت جانا ہی تو سارے دکھوں کا علاج نہیں ہے۔۔'' میں نے کہا، پھر مجھے ایک وحشت خیز خیال آیا۔۔اپی۔۔کیا لاج کی طرح میں ان کو وداع نہیں کر سکوں گا۔اپی کی شادی کس سے ہو گی؟ ان کی زندگی میں خوشی کس طرح داخل ہو گی؟ بھیا صاحب کس قدر کمینے، ذلیل انسان ہیں۔میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر بھیا صاحب تو شادی کرنا چاہتے تھے۔اپی ہی نے انکار کر دیا تھا مجھے معلوم تھا وہ کس قدر خوفزدہ ہیں۔عزت نفس۔۔۔خودداری۔۔۔وغیرہ یہ الفاظ اس عمر میں مجھے، ہم سب کو بے حد اہم اور زوردار لگتے۔ان کے الفاظ معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔نہ مجھے نہ اپی کو۔۔۔نہ غالباً چمپا باجی کو۔۔۔

کیونکہ ہم ابھی بہت کم عمر تھے۔

ٹرین اب مضافات میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا جھونکا کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس میں آم کے پتوں کی مہک تھی۔ اب میلوں دور تک عالم باغ کا سلسلہ پھیلتا آ رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ان گنت ریل کی پٹڑیاں۔ ریلوے ورکشاپ۔ کنارے کنارے پر پھولوں میں چھپے ہوئے بنگلے جن کے سامنے اینگلو انڈین بچے کھیل رہے تھے، پھر ٹرین آہستہ آہستہ عالم باغ کو چھوڑتی ہوئی چار باغ جنکشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کی سنگ سرخ کی راجپوت، مغل طرز کی سینکڑوں فلک بوس برجیوں، گنبدوں، میناروں اور شہ نشینوں والی طویل و عریض عمارات کا سلسلہ جب ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گیا تو دل ڈوب سا گیا۔ ہم لکھنؤ پہنچ گئے۔۔۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔۔گھر آ گیا۔۔۔گھر۔۔۔

پلیٹ فارم کے شفاف سرمئی فرش پر لوگ نرم روی سے ادھر ادھر چلتے پھرتے تھے۔ چیخ پکار تھی لیکن اس شور و شغب میں تیرتے ہوئے جو جملے اور فقرے کانوں میں آتے تھے وہ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھے تھے۔

ہم لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

اسٹیشن کی برساتی میں موٹر داخل ہوئی۔ جسے قدیر چلا رہے تھے۔

موٹر میں بیٹھ کر ہم نے ٹرانس گومتی سول لائنز کا رخ کیا۔ شنکر کو سنگھاڑے والی کوٹھی اتارتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا۔

(اب خاموشی چھا گئی اور مکمل اندھیرا۔ جیسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوں اور یاد نہ آتا ہو، پھر یہ ذہنی بلیک آؤٹ ختم ہوا اور کمال نے دوبارہ کہنا شروع کیا):

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے جب میں گھر پہنچا اپی اپنے کمرے میں بیٹھی اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔ اماں بیگم اور خالہ تختوں والے کمرے میں بیٹھیں تھیں۔ قدیر کی بی بی بڑی مصروفیت سے پان بنا رہی تھیں۔ میں کوٹھی کے خاموش کمروں میں ادھر ادھر گھومتا رہا، پھر میں نے اکتا کر شنکر کو فون کیا۔ معلوم ہوا اسٹیشن سے لوٹ کر نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد فوراً پھر باہر چلا گیا ہے۔

آخر میں نے سائیکل اٹھائی اور کیلاش ہوسٹل پہنچا، وہاں مسز وانچو سے معلوم ہوا کہ چمپا باجی ابھی نہیں آئی ہیں، وہ اپنے ماموں میاں کے یہاں وزیر حسن روڈ ہی پر ہیں۔ میں بھینسا کنڈ کی طرف روانہ ہوا۔

چمپا باجی کے ماموں میاں کے مکان میں لان پر ہمیشہ دھوپ کی سرخ اور سفید دھاریوں والی چھتریاں لگی رہتی تھیں۔ میں اندر گیا، وہ ایک چھتری کے نیچے بیٹھی تھیں، وہ بھی بڑی مصروفیت سے اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔

دوسری کرسی پر بھیا صاحب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اے لیجئے، وہ تو یہاں موجود تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اٹھے اور ''ہلو کمال، مسوری سے لوٹ آئے۔'' کہتے ہوئے برساتی کی طرف بڑھے جدھر ان کی سائیکل کھڑی تھی اور دوسرے لمحے وہ پھاٹک سے باہر جا چکے تھے۔

مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

آخر میں ایک ڈیک چیئر سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''بڑی گھام ہے۔'' چمپا باجی نے بے دھیانی میں درختوں کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھیا اتنی جلدی اٹھ کر کیوں چلے گئے۔'' میں نے کوشش کر کے ریڈیو کے اسکرپٹ پر دھیان دیتے ہوئے کہا جو میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہوا پور یونیورسٹی کا کانووکیشن۔۔ میں نے بیدلی سے دیکھا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔۔ یا تم۔۔ تم ان کے کزن ہو۔۔''

''بجیا۔۔۔ یہ اپنا پارٹ لیجئے۔۔۔۔''

''تمہارے گھر میں۔۔۔'' انہوں نے کاغذات اٹھا کر کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ایک کرائسس آ گئی ہے۔''

''بجیا۔۔ یہ دوسرا اسکرپٹ کملا کو دے دیجئے گا۔''

''تمہارا ہمزاد ہری شنکر۔۔۔ تم نے اسے کہاں روانہ کر دیا۔۔۔ آیا نہیں تمہارے ساتھ۔''

''پتا نہیں کہاں ہے اس وقت۔۔۔ دن بھر تو وہ بھیا صاحب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔''

''تم لوگ۔۔۔ کس قدر ڈریمیٹک ہو'' ۔۔۔ چمپا نے کہا۔

میں نے ان کو غور سے دیکھا، وہ میز کے کنارے انگلیاں رکھے یوں بیٹھی تھیں جیسے وہ ان کا ہاتھ نہیں تھا کہیں اور سے وہاں آ گیا تھا۔

''کہاں گئے ہیں تمہارے بھیا صاحب۔۔۔''

دیدی۔۔ کیا اداس تھی۔ ہم سے خفا تھی۔

اندر ریڈیو سے گیان وتی بھٹنا گر کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ دنیا میں حفاظت کا احساس تھا اور سکون اور شدید اضطراب اور جولائی کی دھوپ۔

(پھر طلعت نے کہنا شروع کیا): فٹن موڑ پر سے اترتی ہوئی سڑک کے گڑھوں پر سے گزر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔

یہ اس سال کی بات ہے جب اپی

۔۔۔۔۔۔اختتام صفحہ نمبر ۲۲۴۔۔۔۔۔۔۔از۔۔شہزاد رضا

دریا۔۔۔صفحہ نمبر ۲۲۵ سے۔۔۔علی رضا صاحب۔۔۔۔۔

کی منگنی ٹوٹی۔

لاج اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے زعفرانی ساری باندھی ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں بچھوے ہیں۔ اپی اس کے ساتھ ساتھ برساتی میں آ گئیں۔ اپی نے ابھی بچھوے نہیں پہنے۔ خالی وہ لڑکیاں' جن کا بیاہ ہو جاتا ہے' یہ زیور پہن سکتی ہیں۔ جب اپی کا بیاہ ہو گا اور یہ بچھوے پہنیں گی تو ان کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ساری کا پلو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا کمر میں اڑسائے وہ مصروفیت' تمکنت اور گمبھیرتا کے ساتھ ادھر ادھر کام میں مشغول نظر آئیں گی۔

مگر بیاہ کی تو آج قدیر کی بی بی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے منا ہی کر دی ہے

میں گاڑی سے کود کر اندر بھاگی۔

''اپی آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن سے آ کر کمال بھیا آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی جب میں شکیلہ کو اتارنے کے لیے بھینسا کنڈ کی طرح سے گزری تو وہاں چمپا باجی کے لان پر دونوں کو میں نے بیٹھا دیکھا_''

''کون دونوں ـــــ''

''بھیا صاحب اور کمن بھیا ـــــ چھتریوں کے نیچے' وہ املتاس کا درخت نہیں ہے چمپا باجی کے ماموں کے گھر میں' وہیں۔ ہماری فٹن سڑک پر سے گزرتی دیکھ کر انہوں نے بڑے زور سے ہاتھ ہلایا اور مسکرائیں ـــــ بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔'' میں نے مستعدی سے ایک سانس میں سب بتا دیا۔

اپی اور لاج خاموشی سے روش پر سے گزرتی برساتی اور بڑھ گئیں جیسے انہوں نے مری بات ہی نہیں سنی۔

میں چنبیلی کی جھاڑی پھلانگ کے نرملا کی اور چل دی' وہ اور مالتی رائے زادہ اوپر میوزک روم کی برجی میں بیٹھی تھیں۔

''بھین تو مرزاپور اور دلی گئے تھے نا۔'' مالتی نے پوچھا۔

''ہاں صبح ہی آئے ہیں مگر آتے کے ساتھ ہی سیدھے پہنچے چمپا باجی کے یہاں۔اس سمے وہیں ڈٹے ہوں گے۔''

''چمپا باجی کو اس روز میں نے گلبتری کے گھر پر دیکھا تھا۔لال ہری لہریے کی ساری پہنے اتنی سندر لگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں۔'' مالتی نے کہا۔

''بھین تو ہمارے لیے بھی اس قدر پیاری جے پوری چنری لائے تھے کہ بس۔ جب کمال بھیا کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے۔تب' نرملا نے لاج اور اپی کی لہجے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا سندر لہنگا بنوایا ہے دیوالی کے لیے۔سیر بھر تو اس پر گوکھرو ہی ہوگی۔للولال جگل کشور کے یہاں سے۔'' نرملا نے اطلاع دی۔

یہ گوکھرو اور بنت والے جوڑے سال کے سال ہی نصیب ہوتے تھے۔ دوالی، عید، بقر عید اور بس۔ اپی وغیرہ کے ٹھاٹھ تھے کہ روز پارٹیوں کے لیے ایک سے ایک بڑیا ساریاں اور ڈھیلے پائجامے اپنی الماریوں میں سے نکالتی تھیں۔ اپنی حالت تو یہ تھی کہ صبح کو نیلا یونیفارم لادا اور پڑھنے چلے گئے۔ شام کو واپس آ کر دوسرا کوئی منحوس فراک پہنا اور تان پورہ سنبھالے میرس کالج چلے جا رہے ہیں کتوں کی طرح۔ جب سے جنگ چھڑی تھی اور پٹرل راشننگ ہوئی تھی فٹن ہی اپنی قسمت میں لکھی تھی۔ موٹر صرف والدین کی سواری کے لیے مخصوص تھی۔ عید، بقر عید اس زبوں حالی پر ترس کھا کر جوڑا بنوا دیا جاتا۔ اب اسے لادے، ہاتھوں میں ڈھیروں چھما چھم کرتی بنارس کی نگوں والی چوڑیاں پہنے بیگمات کی طرح ٹھسے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یہ کیا فینسی ڈریس کیا ہے۔ کمال دہاڑتا _____سنا ہے آج بریلی کی ساری کاجل کی دکانوں میں ڈاکا پڑ گیا _____بھیا صاحب فرماتے _____یہ کاجل کی لکیر کے ایکسٹنشن کا کیا مقصد ہے _____اگر ڈھیلا پائجامہ پہنا ہے تو قرینے سے بیٹھو، درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو، نیک بختو۔ خالہ بیگم کہتیں۔ تیج تہوار کا دن یوں فضیحتے میں کٹتا، پھر نرملا کی اجار (ازار یو۔ پی کی غیر شادی شدہ کائستھ لڑکیوں کا پائجامہ جو غرارے کی وضع کا ہوتا تھا) اور ہمارا ڈھیلا پائجامہ اگلے تہوار کے لیے اٹھا کر رکھ دیے جاتے۔ دوسرے دن سے پھر وہی موچی کے موچی۔

نرملا اور رمالتی جب چیزیوں کا ذکر ختم کر چکیں تو اب نرملا نے گہنوں کا قصہ نکالا۔ اس بھات پہ تبصرہ کیا گیا جو دبے ماما لاج کے لیے لانے والے تھے۔ اس میں

زمرد کا جگنو کس قدر خوبصورت تھا۔ ہمارے مماں بھی جو بھات لے کر آئیں گے اس میں زمرد کا جگنو ہوگا' پھر اپی کو زبردستی سارے گہنے پہننے ہوں گے۔ بھیا صاحب ہاتھی پر بیٹھ کر آئیں گے' جیسے نرملا کی کزن رامیشوری کا دولہا آیا تھا۔ اپی کے چہرے پر وہ سفید سفید بندکیوں والے نقش و نگار کتنے خوبصورت لگیں گے اور افشاں اور سیندور' پھر چھاج میں سات قسم کا اناج رکھ اس میں دیا جلایا جائے گا اور اپی کے ہاتھوں میں چاندی کا کنگنا باندھا جائے گا اور رامام باندھی منگل گائے گی اور بھیا صاحب دولہا بن کر کیسے لگیں گے ______

مگر اسی وقت مجھے قدیر کی بی بی کی بات یاد آئی۔ جب میں کالج سے وٹ کر چاء کی میز پر بیٹھی تھی تو قدیر کی بی بی نے مکھن دانی سامنے رکھتے ہوئے بڑے پراسرار انداز سے منہ لٹکا کر کہا تھا ___ بڑی بٹیا نے بیاہ کے لیے مناہی کرا دی ______

''اپی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا ساری بنواؤں گی ______ کارچوبی ____'' نرملا کہہ رہی تھی۔

پھر دفعتاً طاعت خاموش ہوگئی۔ دیکھو' اس نے کمال سے کہا' میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے' دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔

''میرا ماضی محض میرا ہے۔'' کمال نے طاعت کی بات دہرائی۔

''اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔'' ہری شنکر کی آواز گونجی۔

''لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت

کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔‘‘طلعت نے اداسی سے کہا۔

’’میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کرتا۔‘‘

’’تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن سٹائن بھی نہیں کر سکتا۔‘‘ہری شنکر نے کہا۔

’’میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔‘‘کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔

’’وقت برابر موجود ہے۔وقت مسلسل حال ہے۔‘‘طلعت نے کہا۔

یہ لوگ‘ جولندن کے ایک فلیٹ میں بیٹھے ۱۹۵۴ء میں یہ باتیں کر رہے تھے‘ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر منعکس رہے۔باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔موٹریں آ جا رہی تھیں۔ریڈیو میں بی بی سی وی آنا کے کسی کانسرٹ کی آواز آ رہی تھی۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۰ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور رماتی سے باتیں کر رہی تھی۔اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔مہاتما بدھ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔پہاڑوں پر گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ہوائیں۔اندھیرا۔وقت جو سیال تھا۔وقت جو برف میں منجمد تھا۔

’’ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ہری شنکر نے کہا’’کیونکہ ہم بہت خوفزدہ ہیں۔‘‘

''ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔'' طلعت نے کہا۔

''اور گوتم نیلمبر کا ذکر یہاں نہ کرنا۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ رہے ہو۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے یہ اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پگ ہیں تب یہ تینوں مر جائیں گے اور ان کے علاوہ اور سب بھی جن کا اس کہانی میں ذکر ہے۔''

ہری شنکر نے کہا۔

(وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اس پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے اور آگے۔ پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔ جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔)

۳۲

لکھنؤ۔ ۱۹۴۰۔

اب چراغ سارے میں روشن ہو چکے تھے ۔ندی کے کنارے ڈونگیوں میں دیے جلے ۔ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ برآمدے میں لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے ۔شیڈ پر برساتی پروانے کے چکر کاٹ رہے تھے ۔

لڑکیاں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔

سیتل پاٹی پر اودے رنگ کا کم خواب کا لہنگا پھیلا دیا گیا جس کی گوٹ بڑے اہتمام سے طاعت تراش رہی تھی۔ گوٹ کاٹنے میں طاعت بڑی ماہرفن سمجھی جاتی تھی ۔لاج ایک طرف کو ذرا بے نیازی سے بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہیں ۔قریب ہی مالتی رائے زادہ بیٹھی تھی ۔

پھر جب رات زیادہ ہوگئی تو خیشے سے گنگا دین نے' جواب تک حوض کی منڈیر پر بیٹھا جمنا مہری سے باتیں کر رہا تھا' آواز لگائی ______ بیٹا چلئے ______

مالتی کو شہر جانا تھا' وہ بارودخانے میں رہتی تھی ۔

''بھیین آجائیں تو موٹر سے تم کو پہنچا آئیں گے ۔'' لاج نے اس سے کہا۔

طاعت ان سب کو شب بخیر کہہ کر نیچے اتری اور اب فٹن نے رائے بہاری لال روڈ کی طرف چلنا شروع کیا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد فٹن ایک بڑی سیمنٹ کی کوٹھی میں داخل ہوئی جس کے پائیں باغ میں رات کی رانی مہک رہی تھی ۔گھر کے سب لوگ پچھلے چبوترے پر بیٹھے تھے ۔کرسیاں بچھی تھیں ۔ پلنگ کے قریب ٹیبل فین رکھا تھا صراحیاں گھڑونچی پر دھری تھیں جن پر چنبیلی کے گجرے لپٹے ہوئے تھے ۔چبوترے کے سرے پر چھت والا راستہ تھا جو کھانے کے کمرے سے سیدھا باورچی خانے کی طرف

جاتا تھا۔ ادھر بگھاری کی خوشبو آ رہی تھی۔ برآمدے میں نماز کی چوکی بچھی تھی نیچے بہت سے بڑے لوٹے ایک قطار میں رکھے جگمگاتے تھے۔

''کہو ـــــ گوٹ تراش آئیں ـــــ'' اماں بیگم نے نماز کی چوکی پر سے پائینچے سمیٹ کر چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اللہ رحم کرے ـــــ لاج بے چاری کے جہیز کے کپڑے ہیں۔ ان کو اپنا تختۂ مشق نہ بناؤ بے چارے رائے زادہ صاحب کے یہاں اتنے اللے تللے نہیں ہیں کہ تم لاج کے کپڑے کاٹ پیٹ کر برابر کر دو تو نئے بنوا دیے جائیں گے۔

''کمال نے کتاب پر سے سر اٹھا کر آواز لگائی' وہ برآمدے میں در کے قریب ٹیبل لیمپ لگائے پڑھ رہا تھا۔ اپی کھانے کے کمرے میں کچھ سڑ پڑ کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک ڈش لیے جب وہ باورچی خانے کی طرف جاتی نظر آئیں تو طاعت نے ان کو آواز دی ـــــ

''اپی! کل لاج نے تم کو بلایا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

''لاج باہر نکلتی ـــــ کیا ابھی سے مائیوں بیٹھ گئی ہے۔'' خالہ بیگم نے پوچھا۔

''جانے ابھی سے اس کا بیاہ کر دینے کی کیا تک ہے۔'' کمال بڑبڑایا۔

''گونا تو اس کا بی۔اے کے بعد ہو گا۔ کیا حرج ہے۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بٹیا کا بھی اسی طرح بیاہ کر دینا چاہیے۔ نکاح ہو جائے۔ رخصتی اپنے جب دل میں آئے ہوتی رہے گی۔'' خالہ بیگم نے کہا۔

اپی کے بیاہ کا مسئلہ پھر سے چھڑ گیا۔ طلعت گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ مکان ''گلفشاں'' کہلاتا تھا۔ سامنے رائے بہاری لال روڈ بڑی خاموش سڑک تھی۔ دونوں طرف جو کوٹھیاں تھیں ان کے پھاٹکوں پر ناموں کی تختیاں خاموشی سے اپنی واقفیت کا اعلان کرتی رہتیں۔ نام' لوگ' خاندان' وجود کے تانے بانے' جھمیلے' گلفشاں کے پھاٹک کے اندر ایک حوض تھا اور سیمنٹ کی ایک نالی' جو ستونوں پر بنی تھی' باغ کی سڑک کے ساتھ ساتھ پیچھے کے بڑے حوض تک جاتی تھی جس پر امرود کا ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس حوض کے اوپر پانی کی موٹر لگی تھی۔ نالی کے ساتھ ساتھ چلو تو راستے میں کھانے کے کمرے کی فرنچ کھڑکی پڑتی تھی جس میں اسٹینڈ پر آفتابہ رکھا رہتا تھا۔ اس میں روز تازہ پتے ڈالے جاتے تھے۔ اس فرنچ دریچے میں سے جھانکو تو اندر کھانا کمرہ نظر آتا اور اس کے آگے گول کمرہ جس میں شیشے کے لمبے لمبے دریچے تھے۔ گول کمرے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ اس میں بھی شیشے کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس میں بید کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بھیا صاحب کا کمرہ تھا۔ برآمدہ ساری کوٹھی کا چکر لگا کر پہلو کے چبوترے پر ختم ہوتا تھا جہاں برساتی تھی۔ اس کے آگے موٹر خانے کی طرف سڑک جاتی تھی۔ پھر عقبی حصے میں دوالان تھے۔ ان کے بعد شہتوت کے درخت اور اس کے پیچھے سیمنٹ کا شاگرد پیشہ جو بڑی سی کاٹج کی وضع کا تھا۔ یہاں سرکنڈے لگا کر ملازموں نے اپنے اپنے لیے آنگن بنا لیے تھے۔ گلفشاں کے ایک طرف کھلا میدان تھا جس کے اختتام پر دھوبیوں کی جھونپڑیاں تھیں اور پان والے کی گمٹی

ایک مرتبہ گلابی جاڑوں میں کیا ہوا کہ نشاط گنج کی بستی کے لوگوں نے اس میدان میں آ کر والی بال کے دو کھمبے نصب کر لیے اور ایک شکستہ جالی ان کھمبوں سے باندھ دی۔ اب شام پڑے وہ غریبا غربا آ کر والی بال کھیلا کرتے اور جھٹ پٹے میں ان کی آوازیں گونجا کرتیں۔ طاعت پیچھے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ان کی آوازیں سنا کرتی اور ہوم ورک کرتی جاتی عقبی لان کے وسط چوڑی سی روش تھی۔ رام اوتار مالی گھنٹوں کھرپی لیے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا۔ کبھی کسی درخت کے تنے میں کھرپی گھونس کر آسمان کو دیکھتا رہتا اور طوطوں کو آم کے درخت سے اڑانے کے لیے عجیب و غریب آوازیں حلق سے نکالتا۔

نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہوگا کہ کوٹھیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی۔ ان کی وجہ سے ماحول میں فرق آتا ہے۔ اس کے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہو گیا اور میدان میں پھر سناٹا چھا گیا۔

احاطے کے پیچھے ایک مندر بھی تھا صبح کو جس کے گھنٹے ٹن ٹن بجا کرتے۔ مندر کے کنارے دھوبیوں کے چوہدری کا پختہ دو منزل مکان تھا۔ اتوار کے روز صبح صبح ازابلا تھوبرن کالج کی عیسائی لڑکیاں دھوبیوں کی بستی میں تبلیغ کے لیے آتیں۔ اردو بھجن گائے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔

برابر کی کوٹھی میں چکروتی صاحب تھے جو سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ ان کے لڑکے کے نام اونیل تھا۔ لڑکی کا ریکھا جو سونے کے بنگالی وضع کے ٹوپ پہنتی تھی جس میں جھالر لگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھاکے کے رہنے والے تھے۔

اونیل کالج میں اپنے حسن کے لیے بہت مشہور تھا اور سنا گیا تھا کہ سجاتا سے اس کا بیاہ ہو گا۔ سجاتا اور رنند بالا دو بہنیں تھیں جن کے لیے یونیورسٹی کے کسی اہم شعبے کے صدر اور بہت مشہور سائنس دان تھے۔ سجاتا گلفشاں سے چوتھی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اس کے آگے ارچنا اور پرناتی رہتی تھیں۔ یہ تو ام بہنیں تھیں اور ان کے باپ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ ان کے گھر میں پلنگوں کے بجائے تخت بچھے تھے اور ہر کمرے میں رام کوشنا پدم ہنس کی تصویریں تھیں جو بنگال کے بڑے بھاری سنت گزرے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر جسپا لڑکی کوٹھی تھی جب کی لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور حسن و ذہانت کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اسی طرح اور بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں ایک ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے یہاں موٹریں تھیں اور ٹیلیفون لگے تھے اور صبح ہوتی تو ان کی لڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے پھاٹکوں سے نکل کر ازابلا تھوبرن کالج یا یونیورسٹی کا رخ کرتی تھیں۔ یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے۔ باوضع اور خوشحال اور باعزت۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔ رنج اور خوشیاں، مسائل یکساں تھے۔ ان کے فرنیچر۔ ان کے باغوں کے پودے۔ ان کی کتابیں۔ لباس سب چیزیں ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم، ان کے نام، ان کی دلچسپیاں۔

طلعت کے یہاں کا خانساماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اور سب کوٹھیوں کے خانساماں تھے۔ اس کا نام حسینی تھا۔

سارے باورچیوں کے نام حسینی، حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے

دھوبی نھو کہلاتے ہیں۔ سب کوچوان گنگادین ہیں۔ ساری نوکرانیوں کے نام بلاقن' رسولیا اور حمیدن کی ماں اور منجو رالنساء ہوتے ہیں۔ سارے بیرے عبدل کہلاتے ہیں۔ جس طرح طعام خانوں میں واٹلن نواز ادبدا کرٹونی ہوتا ہے سارے باپوں کا نام خان بہادر تقی رضا بہادر ہوتا ہے۔

ناولوں والے باپوں کا نام بھی یہی ہوتا ہے' اصلیت والے باپوں کا بھی۔ جبھی تو کہا جاتا ہے کہ ناول حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے ادھر ادھر کی ہانکنے کی دوسری بات ہے۔

حسینی کو اماں بیگم نے طلعت کا ایک پرانا اوورکوٹ دے دیا تھا جس کے کالر پر فرنگی تھی۔ اب فرکا فیشن ختم ہو چکا تھا لہذا طلعت اسے کہاں پہنتی اور حسینی صبح صبح باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے چھت والے راستے میں سوں سوں کرتا گزرتا اور سودے کے پیسے لینے کے لیے کمرے میں آتا ______ اب وہ فاختئی رنگ کا فرکوٹ پہنے کام کرتا اس قدر مسخرہ معلوم ہوتا کہ جس کی حد نہیں۔ قدیر اس پر خوشدلی سے ہنستا۔ میم صاحب آوت ہیں۔ ہٹ جاؤ راستے سے۔

قدیر موٹر ڈرائیور' جب طلعت چار سال کی تھی' کمال آٹھ سال کا اور بھیا صاحب ابھی سوئٹزرلینڈ میں تھے' تب آن کران کے یہاں نوکر ہوا تھا۔ قدیر مرزا پور کا رہنے والا تھا اور بے حد دلچسپ۔ اس کی بیوی کا نام قمر النساء تھا اور بچے کا پھدن۔ جب طلعت کے بڑے ابا اناوے میں تعینات تھے تو ایک مرتبہ پھدن کو ضلع کے بی شو میں لے جایا گیا اور اسے پہلا انعام ملا۔ اب پوچھیے کیا انعام ملا، ایک گاڑھے کی چھپی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کے پہننے کی ساری اور ایک جھنجھنا۔

قدیر کے یہاں اس روز عید ہو گی' پھر ایک روز قدیر کو کیا سوجھی کہ کیمرہ لوں گا۔ انگریزی رسالے گھر میں سب کو دکھاتے پھرے۔ اے بیٹا ـــــــ اے بیگم صاحب ـــــــ یہ کیمرہ کتنے کا ہے۔ پوچھو' میاں قدیر تم کیمرہ کیا کرو گے؟ بیگم صاحب' پھوٹو کھینچا کروں گا ـــــ خدائے سے مجھے پھوٹو گرافی کا بہوتے شوق ہے ـــــ پھر قدیر نے اپنی تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر ڈیڑھ سو روپے کا کیمرہ منگوایا اور تین ٹانگوں والا اسٹینڈ اور مور اور محل والے پردے۔ اب دونوں میاں بی بی نے شرگر دپیشے کے آگے سرکنڈے کھڑے کر کے باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا اور گھر بھر کی تصویریں کھینچی شروع کریں۔ ہائی پور اور یہ اور وہ جانے کون کون لوازمات منگوائے گئے۔ انہوں نے اپنی اور اور بھیا صاحب اور طلعت' کمال اور سب کی سینکڑوں تصویریں کھینچ ڈالیں۔ تصیروں کے لیے قدیر کا بڑا زوردار تخیل تھا۔ اپی بیٹھی ستار بجا رہی ہیں۔ پیچھے پردے پر مور ناچ رہا ہے۔ محل کے اوپر چاند نکلا ہے۔ حوض پر پریاں کھڑی ہیں۔ اپی قلم ہاتھ میں لیے متفکرانہ انداز میں بیٹھی ہیں۔ کمال اپنے سارے کپ اور ٹرافیاں سنبھالے کھڑے ہیں۔ بھیا صاحب ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لیے مسکراتے ہیں۔ خالہ بیگم اور اماں بیگم انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی سامنے کی اور دیکھ رہی ہیں۔ نرمل اور لاج' رادھا اور کرشنا کے لباس میں کھڑی ہیں۔ نرملا کے ہاتھ میں بانسری ہے اور وہ سخت پٹکل والا کرشنا کا پوز۔ ہری شنکر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تصویروں کے پوز کے متعلق قدیر کی اپنی اٹل تھیوریز تھیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی من مانی کرتے تھے لہٰذا ان کے موڈلز کو بلا چون و چرا کیے ان کا حکم

ماننا پڑتا تھا۔ اب فرصت کے وقت میں میاں بی بی بیٹھے تصویریں دھو رہے ہیں، سکھا رہے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے کی لاگت میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویریں بنتی بنتی تھی۔

اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو نوکروں کے کاٹج سے قدیر کے آلہا گانے کی آواز بلند ہوتی۔ کبھی جا کر دیکھو تو میاں قدیر دہلیز پر اکڑوں بیٹھے پڑول کا خالی ٹین بجا رہے ہیں۔ قمرن ایک طرف کو بیٹھی کروشیا سے جالی بنا رہی ہیں۔ آپ کو آتے دیکھا، فوراً پیتل کی پن دبیا کھینچ کر پان بنانا شروع کر دیا۔ قمرن پور کی ساری عورتوں کی طرح بے حد سانولی، سلونی اور سبک بی بی تھیں۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے لاج اور نرملا کی والدہ سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ اکثر سنگھاڑے والی کوٹھی بلوائی جاتیں یا جب مسز رائے زادہ گلفشاں آتیں تو فوراً قمرن کی طلبی ہوتی۔ رنگین کنارے والی گاڑھے کی دھوتی باندھے، جس کا پلو سامنے پڑا ہوتا، گھونگھٹ نکالے وہ روش پر سے گزرتی چبوترے پر پہنچتیں اور ان کے پیروں کے جھانجھن اطلاع دیتے کہ بہن قمر النساء آن پہنچیں۔

ایک ریشمی ساری بھی تھی بہن قمرن کے پاس جو پورے اٹھارہ روپے میں خریدی ت تھی اور وہ بھی کلکتے میں۔ جس روز کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی وہ ریشمی ساری اور اپنے سارے چاندی زیور پہن کر گھونگھٹ نکالے آن کر خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مہمان بیبیوں کا استقبال کرتیں، ان کو سلیقے سے بٹھاتیں۔

قمر اور قدیر دونوں کسانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے ضلع کی کسان سبھا میں شامل تھے اور چرخے کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پلٹ بیٹا زمینداری کی بیخ کنی کرنے کے درپے تھا، گاؤں گاؤں گھومتا تھا، کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے کسانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقہ داری سسٹم نے کسانوں کی جو درگت بنا رکھی تھی اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہوسکتا تھا؟ اسی لیے جب گلفشاں کے لان پر کمال کے دوست احباب سوشلزم پر لمبی چوڑی بحثیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی بہانے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی تو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار، ٹھاکر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے تو قدیر کو کلکتے جا کر کلرکی کرنی پڑی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روٹیوں کے لالے پڑے تھے۔ ان دنوں، یعنی ۳۱ء کے لگ بھگ، کانگریس نے تحریک چلا رکھی تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو۔ گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور زمیندار ایک طرف تھے، کسان اور کانگریس دوسری طرف۔ قدیر کے گھر ایک زمانے میں قالین بھی بنے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی وجہ سے گھریلو صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھ گیا تھا اور زمیندار کو لگان ادا کرنا برحق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی، مگر اب جو کچھ لکھنؤ شہر میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا بے اطمینانی اور انتشار کی اصل وجہ اقتصادی تھی۔ زمیندار اور کسان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو

فرقہ وارانہ رنگ دے رہی تھی تا کہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔

شہر میں رہ کر قمرن کو اپنے مرجاپور کے گاؤں کی یاد بہت ستاتی اور سال دو سال بعد چھٹی لے کر دونوں اپنے گاؤں ہو آتے۔ دونوں میاں بی بی میں بہت محبت تھی۔رام سیتا کی جوڑی ایسی۔

قمرا بھی دس برس ہی کی تھیں کہ ان کا بیاہ' گونا سب ہو گیا تھا۔ یہ شاردا ایکٹ کے زمانے میں بھی غریب غربا گورنمنٹ کی آنکھ میں کس طرح خاک جھونکتے ہیں! بی قمرن اب مربھر کر پچیس سال کی ہوئی تھیں۔ قدیر ان سے دس بارہ سال بڑے تھے۔ ان دنوں کی محبت کو مثال کے طور پر دوسرے ملازموں بلکہ رشتے داروں تک کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ویسے بی قمرن دوسرے ملازموں کی بیبیوں سے میل جول نہیں رکھتی تھیں کیونکہ موٹر ڈرائیور کی اہلیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سماجی رتبہ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں بہت اونچا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ دوپہر کو کھانا پکانے، جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر پھدن کو گود میں لیے کوٹھی میں آجاتیں اور اماں بیگم کے بیڈروم میں محفل جمتی۔ اماں بیگم تخت پر لیٹی رسالہ نیرنگ خیال یا عصمت پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بیگم نماز کی چوکی ہی آڑی آڑی لیٹی ہیں۔کوئی مہمان بی بی آئی ہوئی ہیں تو وہ بھی کسی مسہری پر نیم دراز ہیں۔ پاندان سامنے رکھا ہے۔

"آ گئیں قدیر کی بی بی_____ آؤ_____ بیٹھو"

قمر بڑی نزاکت سے سب کو آداب تسلیم کر کے قالین پر بیٹھ گئیں۔ پھدن کو ایک طرف سلا دیا۔ باجی اماں نے پان بنا کر بڑھایا۔

''کہو بی، آج کیا پکایا تھا۔'' خالہ بیگم پوچھتیں۔

''ارہر کی دال بھات اور منگوچیاں بیگم صاحب____''

اس کے بعد کھانوں پر تبصرہ ہوتا۔ ترکاریوں کے بھاؤ اور بھی کے نرخ پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد گفتگو اپنے محبوب موضوع پر آجاتی۔ شادی بیاہ کے قصے، کنبے کی سیاسیات' کس کی شادی کس سے ہو رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ قمرن ساری گفتگو میں پورا پورا حصہ لیتیں اور ان کی رائے کی قدر بھی کی جاتی۔ کبھی خالہ بیگم تخت پر لیٹے لیٹے کجریاں گنگنانا شروع کر دیتیں۔ بھری گگری موری ڈھرکائی شام ____ تو بی قمرن ان کے ساتھ ساتھ نیچی آواز میں گاتیں۔ ان کی آواز زیادہ اچھی نہ تھی پر سنگین میں گالیتیں۔

گانے میں میاں قدیر استاد تھے۔ نوٹنکی کے گانے، تھیٹر کی غزلیں (میں فیشن سے پوزیشن سے کھاؤ مٹن چاپ) کجریاں' بارہ ماسے' دادرے' ٹھمریاں' برہا' آلہا اودل____ ہر چیز کے بادشاہ تھے۔ ان کی پسندیدہ غزلیں مندرجہ ذیل تھیں:

اٹھاؤ نہ کھجر مڑے گی کلائی
گلا کاٹو ناجک بدن دھیرے دھیرے

اور

شب غم کی آہیں بشر ہو رہی ہیں
مناتے مناتے سحر ہو رہی ہے

گانے میں قدیر اشعار کی صحت کا خیال رکھنے کا قائل نہ تھے۔ ان کے پٹرول کے ٹین پر آکر سارے اشعار اور الفاظ ایک نیا روپ اختیار کر لیتے تھے جو صرف

ان کا فن تھا۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے کی ادبی محفلوں میں پڑھا کرتے ____ ایک تھا:

عطر غلاب خوبو لونڈر نے چھین لی

جنتری کی تمام کھسریں کلنڈر نے چھین لی

قدیر کلکتہ پلٹ تھے لہذا ان کا درجہ ویسے بھی بہت بلند تھا۔ جس نے کلکتہ دیکھا جانو لندن' پیرس' ساری دنیا دیکھ لی۔ کمال اور طاعت وغیر کے بچپن میں وہ اکثر اپنی وسیع معلومات سے ان لوگوں کو مستفید کیا کرتے اور بچے نہایت عقیدت سے ان کی باتیں گرہ میں باندھتے جاتے۔ مثلاً ایک روز بنارس کی ایک تارکوں کی سڑک پر قدیر بچوں کو موٹر میں بٹھائے کہیں لیے جاتے تھے۔ طاعت نے نہایت متفکرانہ انداز میں ناخن کترتے ہوئے کہا: ''یہ پالش کی ہوئی سڑکیں تو بہت مہنگی بنتی ہوں گی۔ ہیں نا قدیر ____''

''جی ہاں۔ بیٹا ____ ''قدیر نے گلا صاف کر کے اسی متفکرانہ انداز میں پیچھے مڑتے ہوئے جواب دیا تھا: ''ایک روپیہ بھر جگہ مطلب سوا انچ سڑک پر پالش کرنے کا ایک ہی روپیہ خرچ بیٹھتا ہے۔''

افواہ۔ پچھلی سیٹ پر سے حیرت واستعجاب کا کورس ہوا۔

وہ کیسے قدیر ____ طلعت نے پوچھا' وہ ہمیشہ کی بیوقوف تھی۔

''اب یہ دیکھ لیجیے۔'' قدیر نے بڑی متانت سے جواب دیا'' جیسے ایک ایک روپیہ کر کے سڑک پر بھاتی چلی جائیے' اتنے ہی روپے خرچ ہوتے ہیں۔'' اور وہ کھنکار کر غور وفکر میں ڈوبے موٹر چلاتے رہے۔

ایک بار انہوں نے بتلایا کہ کلکتے میں صاحب لوگوں نے یہ ڈونڈیا پیٹی کہ جو در یبر موٹر سے مرغی مار دے اسے پچیس روپیہ انعام ۔ بڑے بڑے دریبر آئے ۔ مہاراجہ بھروان کا دریبر اور بنگال کے لاٹ صاحب کا دریبر مرغی سڑک پر چھوڑی گئی ۔کوئی نہ مار پایا۔

تم نے ماردی ہوگی۔طاعت نے اشتیاق اور عقیدت سے پوچھا۔

''جی ہاں ۔بیٹا'' انہوں نے جواب دیا۔

''انعام کا کیا کیا'' کمال نے پوچھا۔

''دریبر کی بی بی کے لیے سونے (اس زمانے میں سونا پچیس روپے تولہ تھا) کے بندے بنوا دیے''

قمرن چونکہ سارے میں ڈرائیور کی بی بی کہلاتی تھیں قدیر بھی اسی نام سے مخاطب کرتے ۔

تیسرے پہر کو کمال اور اپی اور طاعت اور بھیا صاحب اپنے اپنے کالجوں سے لوٹتے ۔گھر میں ایک دم چہل پہل شروع ہو جاتی۔ کھانے کے کمرے میں برتن کھنکھناتے ۔چاء کی کشتیاں تیار ہو کر مختلف کمروں میں بھیجی جاتیں یا سب اماں بیگم کے کمرے میں جمع ہو جاتے ۔ایک پیارلی چاء قمرن کو بنا کر دی جاتی۔ اپی اور طاعت ان سے کچھ تبادلہ خیالات کرتیں ۔اتنے میں موٹر برساتی میں داخل ہوتی۔ قدیر' خان بہادر صاحب کو عدالت سے واپس لاتے ۔موٹر کی آواز سن کر قمرن گھونگٹ کاڑھ لیتیں اور پھدن کو گود میں اٹھا کر پھر اپنے کاٹج کی طرف روانہ ہو جاتیں۔

وہ بے حد وضع دار آدمی تھیں۔ برسوں اودھ میں رہ لیں لیکن اپنی خو بو نہ چھوڑی ۔ ایک مرتبہ حسینی خانساماں کی بی بی نے ان سے کہا ـــــ اے بہنی ـــــ کبھی کھڑے پائچے بھی تو پہن کر دیکھو۔ اور قمرن نے ہونٹ پچکا کر جواب دیا تھا۔ ـــــ ہم کوئی پتریاں ہوں ـــــ جو ای پہناوا پہنی ـــــ لہٰذا بہن قمر النساء اپنی گاڑھے کی سفید دھوتی ہی پہنا کیں اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے گھومتی رہیں جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ نہ کبھی شہر کی مہریوں کی طرح انہوں نے آتی ہوں' جاتی ہوں والی زبان سیکھی۔ جب انہوں نے پہلی مرتبہ لکھنو کی لڑکیوں کی گفتگو سنی ـــــ بڑی بٹیا اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں ـــــ "اللہ آپ کہاں جاتی ہیں حضور' جائے آپ کا دین ایمان ـــــ یہ اپنی گھن ادائیں تو رکھیے چھپر پر۔ میں کہے دیتی ہوں۔ ذری میرے دماغ میں بھی خناس ہے۔" ـــــ اور کوٹھی کی صاحبزادیوں ہی پر کیا موقوف تھا' مہربان اور ماما ئیں تک ایک سے ایک فقرے باز پڑی تھیں ـــــ تو قمرن حیران پریشان کھڑی سنا کیں۔ شاگرد پیشے میں واپس آ کر قمرن خوب ہنسیں۔ قدیر جب باہر سے کام نمٹا کر آئے تو ان سے ماجرا بیان کیا۔ شہرن کی بیبیاں پترین ایسی ہوت ہیں۔ سارا پہناوا بھی پترین ایسا باٹے۔ قدیر ان کے اس بھولپن پر بہت ہنسے اور ان کو دنیا کے حالات سے آگاہ کیا کہ یہ پترین کی بولی نہیں' یہ ٹکسالی اور بیگماتی زبان کہلاتی ہے۔ تم بھی اب اسی طرح بولا کرو: آتی ہوں، جاتی ہوں۔ اب تو خیر ان کو لکھنو میں رہتے دس سال ہوتے آئے تھے مگر اس کے باوجود حسینی کی بی بی کو اپنے خاص الخاص لکھنوا ہونے پر ناز تھا۔ ان کے دادا پردادا نوابی عہد میں شاہی رکاب دار تھے۔ قمرن بے

چاری تو قصباتی بھی نہیں خالص دیہاتن تھیں لیکن قمرن کی سماجی حیثیت (جس کا ذکر پچھلے صفحے پر ہو چکا ہے) حسینی کی بی بی سے بلند تھی۔ انہوں نے بھی موخر الذکر خاتون کا کبھی نوٹس نہ لیا۔ ان کی تو نرملا اور راج کی والدہ مسز رائے زادہ کے علاوہ ایک گوئیاں اور تھیں۔ اس کا نام رم دیا تھا۔ ہم وطنی کا ناطہ بری چیز ہوتا ہے۔ کہاں رم دیا ذات کی اہیرن رام اوتار مالی کی بی بی۔ صبح شام اس کا آدمی اس کو پیٹے۔ نہ وہ طلعت کی آپا سوسن کی طرح فلمی گانے گا سکے نہ حسینی کی بی بی کی طرح گھر سواں پائجامہ پہن کر ٹھمک ٹھمک چلنا اسے آئے' مگر وہی ہم وطنی۔ پردیس کی اس اجنبی دنیا میں رم دیا ہی قمرن کا دکھ سکھ سمجھ سکتی تھی۔ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں مالی کا رتبہ بہت نیچے پہنچتا تھا مگر بہن قمرن النساء کی ہمجولی تھی۔ تو رم دیا۔ رم دیا گورکھپور کی رہنے والی تھی۔ قمرن کی طرح نو دس برس کی عمر میں اس کا بھی بیاہ' گونا سب ہو گیا تھا۔ رام اوتار اس سے صرف تیس سال بڑا تھا۔ آج سے کئی سال قبل قمرن کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز رام اوتار اسے اکیلے پر بٹھلا اسٹیشن سے لائے تھے' وہ رام باس کی سرخ ساری پہنے چھکو پھکو روتی اتریں۔ پہلے انہیں کوٹھی میں سلام کروانے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاگرد پیشے میں وہ دوسرے ملازمین کی بیبیوں کے لیے موضوع گفتگو اور لڑکے بالوں کے لیے تماشا بنیں۔ چھوٹی سی دس سالہ دلہن۔ سب سے آخر میں قمرن نے ان کے قریب جا کر ان سے باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا یہ تو اپنے دیس کی ہیں۔ ان کی بڑی بہن مسماۃ ہردیا مرزا پوری میں قمرن کے گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ اے لیجئے یہ تو بی رم دیا سے سمدھیانے کا رشتہ نکل آیا۔ بس اس دن سے رم دیا اور قمرن گوئیاں تھیں۔

چھوت چھات کے باوجود آپس میں لین دین بھی رہتا۔قمرن رم دیا کی ہتھیلی پر چاء کی پتیاں اوپر سے رکھ دیتیں ۔لیو ____ کوٹھریا ما جائے کے چاء بنا کے پی لیو ____ اسی طرح پھل پھلاری امرود گنے سنگھاڑے سے ایک دوسرے کی تواضع ہوتی ۔جاڑوں میں گھنٹوں شاگرد پیشے کے پچھواڑے پھلواری میں قمرن اور رم دیا کھاٹ پر بیٹھی باتیں کیا کرتیں۔

سارا ہر سنگھار میں رنگ کر منڈیر پر سکھائی جاتیں ۔چاول بینے جاتے ۔قمر رم دیا کو کروشیا سکھلاتیں ۔کبھی کبھی حسینی کی بی بی جو ہی خانم ادھر آنکلتیں اور دیکھتیں کہ دونوں پور بنیں بیٹھی چاول صاف کر رہی ہیں یا چادر پر منگوچیاں سکھا رہی ہیں تو حسینی کی بی بی ناک بھوں چڑھا کر سوسن یا زمرد سے کہتیں ____ دریبر کی بی بی نے بھی کیا! اہیرن سے پہنا پا گانٹھ رکھا ہے۔

پھر جب پکار فلم نئی نئی آئی اور اس کا ریکارڈ کوٹھی میں پہنچے تو ایک گانا قمرن کو بے حد پسند آیا ____ دھوبیوں کا گانا جس میں مرزا پور کا نام آتا تھا۔مرجا پور میں اورن ٹھورن کاشی ہمارو گھاٹ ____ قمرن طاعت کے کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور فرمائش کرتیں بیٹا وہ دھوبن والا تو اپھر بجایئے ____ اس کے علاوہ کنگن فلم میں قمرن کو ایک اور گیت پسند آیا تھا ____ ارے ارے کبیر سن رے کبیر ۔رمیا کی جورو نے لوٹا بجار ____ اس میں رمیا کی بی بی کے بجائے قمرن ،حسینی کی بی بی گاتیں ارو بہت خوش ہوتیں ۔جوابا حسینی کی بی بی کسی دوہے میں قمرن کا نام چپکا دیتیں اور اسی طرح مزے مزے نوک جھونک چلاتی۔

گنگا دین سائیس ابھی بیچلر تھا لہذا کوٹھی سے لے کر شاگرد پیشے تک ساری

خواتین کو اس کے رشتے کی بڑی فکر تھی۔ خالہ بیگم نے ان گنت کہاریوں سے اس کی بات لگائی۔ رام اوتار تو اسے اپنا ہم زلف بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک چھ سالہ سالی گورکھپور میں موجود تھی۔ رم دیا بھی اس کی بہت خاطریں کرتی۔ رم دیا کی بہن چھ سال کی تھی تو کیا ہوا' دو تین برس میں بڑی ہو جائے گی' مگر مصیبت یہ ہوئی کہ گنگادین ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور شادی پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

اس کے پڑھ لکھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ گلفشاں میں میں اکثر مختلف النوع مشغلوں کی ہوا چلا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں فی شخص نے میوزک سیکھنا شروع کی۔ بھیا صاحب برآمدے میں بیٹھے سورج بخش سریو استوا سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ صبح صبح بھیروں اڑ رہی ہے: دھن دھن مورت کرشن مراری۔ تیسرے پہر کو چاء کی میز پر گانا ہو رہا ہے۔ سب آوازیں ملا رہے ہیں۔ طلعت تو باقاعدہ میری کالج میں داخل تھی لیکن کمال اور اپی سارے کزن لوگ پانچوں سواروں میں شامل تھے۔ خالہ بیگم ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی تھیں امام باندی میراسن مع اپنے خاندان کے تقریبوں کے موقعے پر آ کر ہفتوں گلفشاں میں رہتی تھی۔ سوسن اور زمرد دوارے گاتی تھیں۔ قصہ مختصر بچہ بچہ رتن جھنکر بنا ہوا تھا' پھر جب قدیر نے فوٹوگرافی شروع کی تو فی کس ہر طرح کے کیمرے ہاتھ میں لیے گھوم رہا ہے۔ بلی کتوں کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اس کا شوق بھی جلد ختم ہو گیا۔ اسی طرح گرم سدھار کا سلسلہ کچھ عرصہ چلا۔ تعلیم بالغاں کی تحریک از ابلا تھو برن میں شروع کی گئی تھی۔ ہر لڑکی پر ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کم از کم دو ان پڑھ لوگوں کو

زیورعلم سے آراستہ کرے۔ خالی گھنٹوں میں لڑکیاں کیمپس پر کالج کے ملازموں کو پڑھاتی نظر آتیں۔ شام کو آس پاس س غریب غرباء آکر گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ برساتی کے بلب اور باغ کے لیمپ کی روشنی میں الفاظ کے ہجے کرتے۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے ان کو اردو اور ہندی سے فیض یاب کرتے۔ برساتی کا بلب اور باغ کا لیمپ بہت مدھم تھا مگر غریب غرباء نہایت ذوق وشوق سے رات گئے تک پڑھتے۔ قدیر سخت کندن ذہن ثابت ہوئے۔ ویسے بھی وہ بہت سپیریر تھے' ان خرافات میں کیا پڑتے۔ گنگا دین البتہ انگو چھا سر پر لپیٹتا سب سے پہلے تعلیم بالغاں کی طرف لپکا۔ امین آباد کے پستک بھنڈارے سے ہندی کا قاعدہ خرید لایا اور سب سے زیادہ ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب تو خیر وہ بہت پڑھ گیا تھا۔ فرفر ہندی ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ ہندی مڈل کا امتحان پاس کر ڈالے۔

چنانچہ گنگا دین چھ سالہ بچی سے بیاہ کرنے کی دقیانوسی تجویزیں سنی ان سنی کر دیتا اوروں کی طرح اس نے بھی بھیا صاحب کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ جب بھیا صاحب ابھی بیاہ نہیں کرت ہیں تو ہم کاہے کری۔ اسے طاعت نے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ انگریزوں کے کوی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی کے کوی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی میں بن چکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گنگا دین نہایت روشن دماغ ہستی تھی اور بھیا صاحب کا اصل جاں نثار خادم۔ لڑکپن میں وہ سائیس کی حیثیت سے آیا تھا۔ شمبھو کے مرنے کے بعد اسے کوچمین کا عہدہ مل گیا تھا۔ اسے اپنی فٹن سے

بے حد محبت تھی اور اس کے مقابلے میں وہ قدیر کی شیور لے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

یہ فٹن بڑے ابا مرحوم کی تھی یعنی بھیا صاحب کے والد کی۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھیا صاحب **گلفشاں** میں رہنے کے لیے آئے اور سارے ساز سامون کے ساتھ فٹن مع گنگا دین یہاں منتقل کر دی گئی۔ پٹرول راشننگ شروع ہوئی تو دفعتاً گنگا دین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ قدیر کو طعنے دیا کرتے' چلاؤ نا اپنی موٹر یا۔ ہمیں دیکھو۔ ہٹلر کا کھٹکا نہ کچھ نہ کچھ۔ مزے سے دندناتے ہیں۔

گنگا دین بھیا صاحب کا رفیق خاص تھا۔ ان سے اس کی وفاداری اس لیے زیادہ تھی کیونکہ وہ بہر حال ان کے مرحوم والد کا ملازم تھا اور ان کے گھر سے یہاں آیا تھا۔ اکثر بڑے سرکار کو یاد کر کے روتا۔ اپی اور بھیا صاحب کے بیاہ کے سلسلے میں بھی وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا کیونکہ گو دنیا کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ ضرور ہونا چاہئے لیکن بھیا صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔

بیر کا نام امیر خاں تھا۔ یہ بے حد نیک اور مرنجان مرنج فلسفی قسم کے انسان تھے۔ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ انتہائی **مفصل** سوالات کا صرف جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دیتے۔ یہ بھی نہایت وضع دار آدمی تھے۔ بگلی تک کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ آ گئیں۔ چلی گئیں۔ جی ہاں بیگم صاحب' دودھ ابھی انہوں نے پیا ہے۔ ابھی کھڑکی میں سے کود کر بھاگ گئیں۔

سنہ چالیس کے دسمبر میں طلعت کو جونیر کیمبرج کا امتحان دینا تھا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ روتے روتے اس نے برا حال کر لیا ہمارا ایک سال برباد گیا' ہمارا ایک سال برباد گیا کی رٹ لگائے رکھتی۔ سارا گھر اس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ کمال اس کے لئے کہیں سے ایک پروجیکٹر اٹھا لایا' وہ نوابوں کی طرح تکیے کے سہارے بیٹھ جاتی اور دس سال پہلے کی خاموش فلمیں ملاحظہ کرتی جو جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھیں۔ دیوار پر گزرے ہوئے وقتوں کے سائے ڈولتے بڑے عجیب سے لگتے۔ روڈولف ویلینو' ڈگلس فیئر بنکس' گلوریا سوانسن۔ وہ دس سال پرانی ہندوستانی فلمیں بھی تھیں جن میں سلوچنا گھوڑے کی سواری کرتی اور رائی بلی موریہ تلوار چلاتا۔ اتوار کے دن اپی کی سہیلیاں ٹہلتی ہوئی آجاتیں اور اس کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتیں۔ یہ بڑی اسمارٹ' باوقار اور سنجیدہ لڑکیاں تھیں۔

دن بھر طلعت پلنگ پر لیٹی رہتی یا گنگادین کو مزید ہندی پڑھاتی۔ اس نے کمال' ہری شنکر' بھیا صاحب اور اپی کی مہیا کی ہوئی ساری دلچسپ کتابیں پڑھ ڈالیں مگر اس غم کا مداوا کس کے پاس تھا کہ نومبر میں سالانہ امتحان تھے اور وہ بیمار پڑی تھی۔

ایک دن صبح صبح ہری شنکر اس کے کمرے میں آیا ''طلعت ______ اتییت مورکھ کنیا استی'' اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں سنسکرت بولی۔

''کیوں۔''

''مت رو ہے زبدھی ______ مت رو ____''

''کیوں نہ روؤں ____''

''اس لئے نہ رو کہ تیرے کلیان کی ہم نے دیوستھا کرلی ہے ____ ہم تیرا داخلہ ٹھڑ والے اسکول میں کروا رہے ہیں۔ تو اپریل میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور مزے سے اگلے سال لا مارٹینئر کے نویں اسٹینڈرڈ میں گھس گھس کرنے کے بجائے آئی۔ٹی۔کالج میں دندنانا۔''

''رگھبیر ماما کے اسکول میں ____؟'' طلعت نے سانس روک کر پوچھا۔

''ہاں۔'' ہری شنکر نے جواب دیا اور اسی ڈرامائی انداز سے دوسرے دروازے سے غائب ہوگیا۔

نرملا کو جب معلوم ہوا کہ طلعت ہائی اسکول کا امتحان دے کر آئی۔ٹی۔ پہنچا ہی چاہتی ہے تو اس نے مہنا متھ مچادی۔ لہٰذا لا مارٹینئر چھوڑ کر طلعت کے ساتھ وہ بھی نئے اسکول میں بھیج دی گئی۔

ٹھڑ والا اسکول اپنی جگہ ایک تاریخی اہمیت کا مالک تھا۔ لال باغ میں بیرو روڈ پر ایک پرانی عمارت تھی جس میں شاہی کے وقتوں کا بڑا پھاٹک' برجیاں' شہ نشین' غلام گردشیں اب تک موجود تھیں۔ اس کے آگے بڑا لان تھا۔ عمارت کے گرداگرد چٹائی کی دیواریں کھڑی کردی گئی تھیں جن پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں، یہ رگھو ماما کا سکول تھا اور بنارس یونیورسٹی سے منسلک تھا اور گنی چنی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔ بالکل گھر کا سا ماحول تھا۔ برابر کے مکان میں رگھو ماما مع اپنے خاندان کے رہتے تھے۔ یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کائستھ۔ لڑکیاں' شہر کے چیدہ چیدہ خاندانوں کی سترّیاں موٹروں میں بیٹھ کر آتیں اور

یہاں زیورِ علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں اسٹاف اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ناطہ تھا۔ یہ رشتے خون کے نہیں بلکہ وضع داریوں کی وجہ سے قائم تھے۔ موسی' ماما' باجی' دیدی' بھیا ــــــــ اسی طرح حفظِ مراتب کا خیال رکھا جاتا۔

بعض لڑکیاں بے حد دلچسپ تھیں' مثلاً حمیدہ بانو جو وسطِ شہر کی ایک زبردست محل سرا میں رہتی تھی۔ شاعری کرتی تھی اور سخت رومینٹک روح تھی۔ بینا ماتھر کتھک کی ماہر تھی اور ہر سال آل انڈیا میوزک کانفرنسوں سے یہ بڑے بڑے کپ اٹھا لاتی تھی۔ مہر آراء ایک ایسی نواب زادی تھیں جن کی خواص ان کی خاصدان لئے ساتھ رہتی اور پیچھے کھڑے ہو کر انہیں پنکھا جھلتی رہتی۔ یہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے خاندانوں کی سوپشت سے واقف تھیں۔ سب ایک طرح کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان سب کی' اس شہر اور اس طبقے کی ساری سوسائٹی کی اس طرح جتھ بندی تھی جیسی چوروں کے یہاں ہوتی ہے۔

میوزک کلاس پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دری بچھی تھی۔ اس کے برابر کی برجی میں تنگ و تاریک زینہ تھا۔ برجی کے موکھوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آتی۔ چھٹی کے گھنٹے میں لڑکیاں ان سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں اور حمیدہ بانو' جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا' اپنا سر ہلا کو بڑے پر اسرار انداز میں کہتی: "شاہ زمن غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف النساء بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی مہری کو بادشاہ کے آدمیوں نے اس زینے پر قتل کیا تھا۔"

"کیوں گپ مارتی ہو ــــــــ" کسم بحث کرتی "اشرف النساء بیگم' وہ

جان ہاپکنز والٹرز کی لڑکی؟‘‘

’’ہاں وہی۔‘‘

’’وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔‘‘

’’اپنی ماں سے لڑکر یہاں چلی آئی تھیں ______ مجھے معلوم ہے

‘‘

حمیدہ بانو سے لکھنو کی تاریخ کے متعلق کوئی زیادہ بحث نہ کر سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال آتا کہ یہ خود سو سال پہلے کے لکھنو کا کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کر ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ ابھی زینے کا دروازہ بند ہو گا اور یہ غائب ہو جائے گی۔ طلعت کو یقین تھا کہ بڑی ہو کر حمیدہ بانو' بیگم عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کی طرز کے افسانے لکھا کرے گی۔

پھر گھنٹہ بجتا اور رگھو ماما کی بی بی اپنے رسوئی گھر سے نکل کر کمر پر ہاتھ رکھ کر چلاتیں ___ ارے لڑکیو ____ چلو بانٹی پڑھنے ___ یہ کانتی دیدی تھیں اور ان کو دیکھ کر کسی کے سان وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ بی بی الہ آباد یونیورسٹی کی ایم۔ ایس۔ سی۔ ہیں اور اوپر سے گولڈ میڈلسٹ الگ۔ بوٹنی پڑھانے کے بعد وہ لپک کے پھر رسوئی گھر میں جا گھستیں اور رگھو ماما کے لئے کھانا بنانا شروع کر دیتیں۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اردو فارسی والے مولوی صاحب' جو ایک بہت بوڑھے کشمیری پنڈت تھے' بیمار پڑ گئے۔ رگھو ماما نے نرملا سے کہا: ’’ذری ہری شنکر سے کہہ دینا آ کے اردو فارسی پڑھا جایا کریں۔‘‘ چنانچہ اگلے روز ہری شنکر بہت رعب داب

سے کھنکھارتے ہوئے کلاس میں آئے اور نہایت سنجیدگی سے اردو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ بنارس یونیورسٹی کے مولوی مہیش پرشاد کا انتخاب اور ہری شنکر جیسے سخت گیر استاد کی پڑھائی۔ لڑکیوں کی جان نکل کر رہ گئی۔ اردو کے گھنٹے میں بسنتی مہری باغ میں آ کر لڑکیوں کو مطلع کرتی ______:

"بیٹا چلئے ____ چھوٹے مولی صاحب آئے گئے۔"

لہٰذا ایک ماہ تک جب تک انہوں نے اس جامعہ میں درس دیا یہ افیشیل طور پر مولوی ہری شنکر کہلاتے رہے اور اپنی سخت گیری اور بدمزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس لوٹے۔

صورت حال یہ تھی کہ کانتی دیدی بوٹنی پڑھاتی تھیں۔ ان کی خالہ زاد بہن جو گشیوری دیدی سنسکرت کی استاد تھیں۔ مالتی رائے زادہ کے بھائی سورج بخش شعبہ موسیقی کے صدر تھے۔ ہری شنکر تو اردو فارسی پڑھا ہی رہے تھے۔ حالات قابو سے باہر اس وقت ہوئے جب مس موناداس کی شادی لال باغ کے میتھوڈسٹ چرچ کے آرگنسٹ مسٹر جان فضل مسیح سے قرار پائی اور انہوں نے مہینے کی چھٹی لی تو رگھبیر ماما نے طاعت کو حکم دیا کہ وہ جغرافیہ کی کلاس لیا کرے۔ کس واسطے کہ وہ جغرافیہ میں بے انتہا ہوشیار تھی۔ یہ کلاس اس قدر پر لطف ثابت ہوئی کہ جب مسز فضل مسیح تنگ آستینوں والا نیا گرم کوٹ اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے بندے پہنے واپس آ گئیں تو لڑکیوں کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے گھڑونچیوں کے پاس ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر طاعت کو الوداعی پارٹی دی جس کے لئے رگھو ماما کی رسوئی میں پھلکیاں تیار کی گئی تھیں۔ اس موقع پر باقاعدہ تقاریر ہوئیں جن میں

طاعت کی استادانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی۔

وہ دن بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا جب مسز فضل مسیح نے اپنے نئے گھر میں لڑکیوں کی دعوت کی اور جب طاعت اپنی اکلوتی نیلی کارچوبی ساری پہن کر مقبرہ کمپاؤنڈ گئی کیونکہ اس روز سے پہلے طاعت نے ساری کبھی نہیں پہنی تھی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بڑی ہوگئی ہے۔

حضرت گن میں انگریزی دکانوں کے درمیان ایک بڑا سا شاہی کے زمانے کا پھاٹک ہے جس کے اندر وسیع احاطے میں سامنے ہی اودھ کے دسویں حکمران امجد علی شاہ بادشاہ کا مقبرہ اور امام باڑہ نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر قیامت کی ویرانی اور نحوست برستی ہے۔ اس کے چاروں طرف احاطے کے کنارے کنارے جو کوٹھریاں بنی ہیں۔ ان میں اب نچلے متوسط طبقے کے عیسائی رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں کے آگے صاف ستھرے باغیچے لگا رکھے ہیں۔ ان کمروں میں ننھے منے ڈرائنگ روم ہیں جن میں کاٹج پیانو رکھے ہیں کھڑکیوں میں جالی کے پردے پڑے ہیں۔ عیسائی عورتیں نیچے نیچے فراک یا ٹنگی ساریاں پہنے اپنے باغیچوں میں کھڑی ہو کر اپنی اولاد کو کھیلتا کودتا دیکھتی ہیں۔ یہ بڑے خاموش طبیعت اور شریف لوگ تھے اور ان کا اس قسم کی زندگی سے واسطہ نہیں تھا جس کے ساتھ عام طور پر اس فرقے کے افراد کو منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نوجوان لڑکیاں آوارہ نہیں تھیں اور ان کے لڑکے جینز پہن کر ناچتے نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ لاکھوں میل دور تھا۔

مقبرہ سال بھر اجاڑ پڑا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ خالی محرم کے زمانے میں

اس میں چہل پہل ہوتی۔تب زبردست زنانی اور مردانی مجالس ہوتی تھیں۔امام باڑے کے چبوترے کے نیچے کوٹھریوں اور تہہ خانوں میں عیسائی فقیرنیاں رہتی تھیں۔بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ بے چارے امجد علی شاہ بادشاہ خود بھی ہندوستانی عیسائی تھے۔۱۸۵۷ء کے بعد جب جنرل اوٹرم نے لکھنو پر قبضہ کیا تو اس امام باڑے میں انگریزی چرچ بنالیا گیا تھا اور لارڈ کیننگ اس میں عبادت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

یہاں سابق مس موناداس اور موجودہ مسز فضل مسیح نے اپنے چھوٹے سے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں اپنی طالبات کو چاء پلائی اور لڑکیوں نے ان کی شادی کا تحفہ' جو وہ راستے میں امین آباد سے خریدتی لائی تھیں' ان کو پیش کیا اور سب نے مل کر انگریزی گانے گائے۔

لا مارٹینیر کے خالص یورپین ماحول کے بعد ٹھ والا اسکول بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔طاعت اور نرملا اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دو رنگی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یورپین تہذیب کہا جاسکتا ہے۔ اس طبقے میں بچے bilingual پیدا ہوتے تھے۔انگریز گورنسوں کے ساتھ ساتھ قصباتی کھلائیاں اور انائیں ان کی پرورش کرتی تھیں۔لڑکیوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی ہوتی تھی تو وہ ہفتوں مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی دلہنوں کی طرح شرماتی تھیں۔اکثر ان کی شادیاں ان کی خلاف مرضی بھی کردی جاتی تھیں۔یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن الٹرا موڈرن نہیں بنے تھے۔اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے اور اپنی نیٹو روایات کے بھی بڑی

شدومد سے پابند۔ ظاہری طور پر انہوں نے مغربیت کا رنگ قبول کر لیا تھا لیکن اصلیت میں بڑے سخت ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑے دوراہے پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ یہ برطانوی نوآبادیاتی سماج تھا جو جاگیردارانہ نظام کے تعاون سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس طرح کا معاشرہ مصر اور ترکی کے پاشاؤں کے یہاں بھی موجود تھا۔ رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد ان ممالک میں سماج بالکل مغربیت زدہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح کا دوغلا ماحول ملایا اور انڈونیزیا کے اوپری طبقے میں موجود تھا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ اور کلکتہ اور بمبئی ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں مگر ہندوستان کے معاشرے میں یہ خصوصیت ابھی باقی تھی کہ یہاں کی اپنی دیسی تہذیب کی اقدار اس قدر پائیدار تھیں اور ان کی کشش اتنی شدید تھی کہ یہ لوگ ترکوں یا مصریوں یا ایرانیوں کی مانند یورپ کی مکمل نقالی کرنے لئے تیار نہیں تھے انیسویں صدی میں جو سیاسی شعور یہاں پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہندوستان تہذیب کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی معاشرے پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ اب مغرب زدہ کالے صاحب لوگ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ کانگریس کی تحریک نے اس تجدید کی رو کو زیادہ تقویت پہنچائی تھی لیکن فرقہ پرست عناصر ہندو پراچین سنسکرتی اور اسلامی عہد زریں کا ذکر کر رہے تھے۔ متحدہ قومیت اور خالص ہندوستانی تہذیب کے تصور میں رخنہ پڑ چکا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آ رہا تھا کہ ہندوستانیت دراصل ہے کیا چیز؟ ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان

علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈنڈے مشرق وسطیٰ سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصل قوم ہندو ہیں، مسلمان غیر ملکی ہیں۔ ''گلفشاں'' کے شاگرد پیشے میں رہنے والی مرزاپور کی قمر النساء اور رم دیا سے اس مسئلے پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصل باشندے تو تم لوگ ہو، تمہاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

بہر حال طاعت اور رزملا اسی اوپری طبقے کی پروردہ لڑکیاں تھیں جن کو مغرب اور مشرق کے ملے جلے ماحول نے پروان چڑھایا تھا چنانچہ جب یہ دونوں لامار ٹینئر سے نکل کر رگھو ماما کے یہاں گئیں تو وہاں بھی اسی طرح گھل مل گئیں جس طرح وہ لامار ٹینئر کی یورپین فضاؤں میں گھلی ملی ہوئی تھیں۔

ہر تہوار کے روز رگھو ماما کے آنگن میں ساری لڑکی جمع ہوتیں۔ کڑاہی چڑھائی جاتی۔ چٹائیوں پر بیٹھ کر چھپی ہوئی ساریوں میں لپکا ٹانکا جاتا۔ ڈھولک پر جے امبے گوری میا گایا جاتا۔ کیرتن اور قوالی ہوتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ دروازے پر بارات آنے والی ہے اس خوش باش خاندان میں بیس پچیس ہندو لڑکیاں تھیں، اتنی ہی مسلمان اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک لال باغ کے پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹہ اوڑھ کر آتی تھی۔ اس بشاش گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ رگھبیر ماما کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے نظریے میں یقین رکھتے تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کٹر تھے اور خود ان کو مکتب میں مولوی صاحب نے قمچیاں مار مار کر پڑھایا تھا لہٰذا وہ بھی پڑھاتے پڑھاتے لڑکیوں کو ادھ موا کر دیتے۔ بہت سخت قوم پرست تھے۔ ترک موالات کے زمانے میں جیل کاٹ چکے

تھے۔ اب منتظر بیٹھے تھے کہ کب مہاتما گاندھی حکم دیں اور کب وہ ستیہ گرہ شروع کریں۔ جنگ چھڑے ایک سال ہو چکا تھا۔ کانگرس کی حکومت مستعفی ہو چکی تھی۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ آیا اور لڑکیاں امتحان کے لئے بنارس جانے کو تیار ہوئیں۔ کمال اور ہری شنکر، نرملا اور طلعت کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے آئے۔ تم چلو۔ ہمارے پرچے ختم ہو جائیں تو ہم بھی آتے ہیں پیچھے پیچھے بہت دنوں سے رام نگر کے آم نہیں کھائے۔ کمال نے کہا۔ یہ ان دونوں کا پرانا وطیرہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئی نہیں اور دونوں نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی سارے ملک کی خاک چھانتے پھرتے تھے جانے کہاں کہاں جاتے۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ ہے، حیدر آباد دکن جا رہے ہیں۔ اندرا نہرو نے میٹنگ بلائی ہے، الہ آباد کا قصد ہے۔ فلاں دوست کلکتے میں اکیلا بور ہو رہا ہے ذرا وہاں تک ہو آئیں۔

''بنارس سے کہاں جاؤ گے؟'' نرملا نے پوچھا۔

''ارے ہم سنیاسی آدمی۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو۔ جدھر منہ اٹھایا نکل گئے۔ ''کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔ لڑکیاں پلیٹ فارم پر اپنے سوٹ کیسوں کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ رگھو ماسفر کا انتظام کرتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

''ایسے بڑے سنیاسی ہی تو ہو۔ گلہ بھگت کہیں کے۔'' نرملا نے ہنس کر کہا۔

''کاشی کی پاٹ شالاؤں میں بڑی منوہر کنیائیں پڑھتی ہیں۔'' شنکر نے آنکھ بند کر کے کہا۔

''شرم کرو بھیّن۔'' طلعت نے کہا۔ ''یہ سامنے تمہاری اسٹوڈنٹ لوگ کھڑی

ہیں' کیا کہیں گی کہ مولوی صاحب ایسی افسوسناک باتیں کرتے ہیں۔''

ہری شنکر فوراً پلٹ کر بڑی سنجیدگی سے حمیدہ بانو کے پاس گیا اور نہایت رعب اور وقار کے ساتھ اس کو سمجھانے لگا امتحان کے لئے غالب کی کون کون سی غزلیں پڑھے۔ ٹرین آئی اور یہ دلچسپ قافلہ بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

۳۸

چمپا احمد نے بیسنٹ کالج کے کلس روم کے دریچے میں آ کر نیچے نظر ڈالی۔ لو چل رہی تھی۔ دور سڑک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سارے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع' بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہو گی' چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر سے مسز اینی بیسنٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئی۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بسنت کالج' یونیورسٹی' گھر

،جاڑے، گرمیاں، برسات، پھر جاڑے۔ بنارس کا شہر، اپنا مکان، محلّہ، رشتے دار، کتابیں وہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن بوڑھوں کی طرح سوچتی شاعروں کی طرح محسوس کرتی تھی، بچوں کی طرح ہنستی یا رنجیدہ ہوتی تھی۔کائنات کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔اس کے والد متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی تھے۔ ماں بھی متوسط طبقے کی ایک شریف خاتون تھیں۔ ان کے یہاں کوئی گلیمر نہ تھا، کوئی افسانے نہیں تھے، نہ کوئی روائتیں۔ سیدھے سادے لوگ تھے جس طرح کے سیدھے سادے لوگ ہندوستان کے شہروں میں بستے ہیں۔ چمپا کے والد وکالت کرتے تھے۔مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ چمپا کی ننہیال بنارس میں تھی، وہیں چمپا کے والد پریکٹس کرتے تھے اوسط درجے کی آمدنی تھی۔ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں تھا، نہ موٹر کار، نہ فریجڈیر اور وہ لوگ کوٹھی میں نہیں رہتے تھے۔ چمپا اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کا سارا جہیز تیار رکھا تھا۔ دھڑا دھڑ پیغام آرہے تھے۔گھر والوں کا خیال تھا کہ چمپا بی۔اے پاس کرلے تو اس کا بیاہ کردیں گے۔ چمپا نے کسی کانونٹ اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ نہ وہ گرمیوں میں مسوری جاکر رولر سکیٹنگ کرتی تھی۔ اس کی ننہیال زیادہ خوشحال تھی، گو وہ بھی مڈل کلاس ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ چمپا کے ایک ماموں بہت زیادہ خوشحال تھے اور لکھنو میں رہتے تھے جہاں وزیر حسن روڈ پر ان کی کوٹھی تھی۔ چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی دلچسپی رکھتے تھے۔اس کے ایک چچا مرادآباد سٹی مسلم لیگ کے صدر رہتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنو میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور چچا دونوں شرکت کے لئے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد جب بھی بنارس آتے

کے والدان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور پاکستان کے مطالبے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ پاکستان بنا تو مراد آباد تک کا علاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا' کیا وجہ کہ مغربی اضلاع میں مسلمان زیادہ طاقت ور ہیں۔ چمپا کے والد اظہار خیال کرتے۔

''اے واہ۔ مراد آباد پاکستان میں شامل ہو جائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں۔'' چمپا کی والدہ چمک کر کہتیں۔

''اجی تم پوربیوں کا کیا ہے۔ چلو تم کو بھی بلا لیں گے۔'' ان کے والد حقے کا کش لگا ندا قاً جواب دیتے۔ ان مبہم اور جذباتی بنیادوں پر یہ لوگ سیاست سے کھیل رہے تھے۔

ویسے بھی بنارس میں روز کوئی نہ کوئی آل انڈیا قسم کا ہنگامہ رہتا۔ یہ شہر ہندو مہا سبھا کا گڑھ تھا اور ہندی اتھوا ہندوستانی کی تحریک کا صدر مقام۔

اسی بنارس میں پنچ گنگا گھاٹ تھا جہاں کبیر رہے تھے اور یہیں سارناتھ تھا۔ جہاں شاکیہ منہ گوتم نے دھرم کا چکر چلایا تھا اور یہیں وشویشور کا مندر تھا۔ یہ شو پوری تھی۔ شو ______ خدائے مسرت کا شہر۔

چمپا بیسنٹ کالج میں' جو بسنت کالج کہلاتا تھا' سیکنڈ ایر میں تھی۔ اس سال اس نے انٹر کا امتحان دیا تھا اور اب اسے ازابلا تھوبرن کالج جانا تھا کیونکہ اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے لڑکیوں کی سماجی حیثیت یکلخت بے انتہا بلند ہو جاتی تھی۔ چمپا کے والد والد ایک اچھے مسلم لیگی کی حیثیت سے اسے علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا نہ۔ یہ ہرگز نہیں ہونے کا۔ بیٹا تو آئی۔ ٹی۔ میں پڑھیں

گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب بلاری کی بیٹیاں آئی ۔ ٹی میں پڑھت ہیں ۔ چمپا کی اماں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئی ۔ ٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں سے آئی ۔ سی ۔ ایس لوگ شادی کرتے ہیں اور پھر ان کے بڑے بھائی لکھنو میں رہتے تھے اور وہاں کے سارے بڑے بڑے لوگوں سے واقف تھے ۔

چمپا کالج سے لوٹ کر آتی تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر ' جو چھت پر تھا ' افق تک پھیلے ہوئے شوالوں کے کلسوں کو دیکھا کرتی یا انگریزی ناول پڑھتی ' وہ جین آسٹن پر عاشق تھی اور قرون وسطیٰ پر اور انیسویں صدی کے کیٹس اور روزٹی وغیرہ ۔ جب وہ یونیورسٹی لائبریری میں امیندر ناتھ ٹیگور اور نندلال بوس کی تصاویر دیکھتی تو اسے بے حد اچھا لگتا ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چمپا احمد بھی ایک رومینٹک روح تھی ۔

لیلا بھارگوا کے ساتھ وہ یونیورسٹی پہنچی ۔ یہاں بھی امتحان امتحان کا ماحول ہر طرف طاری تھا گہما گہمی ' چہل پہل ۔ کچھ چہروں پر پریشانی تھی کچھ پر اطمینان ۔ یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے ۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں سب اسی کی دنیا کے باسی تھے ۔ مجمعے میں چمپا کو تقویت محسوس ہوتی ۔ ہجوم اس کے ساتھ ہے ۔ ہجوم اس کی حفاظت کرے گا ۔ یہ لوگ سارے اس کے بھائی بند تھے ۔ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کی طالبات ' لیکچرار لڑکیاں ' مدراسی اور بنگالی بوڑھے پروفیسر ' مہاراشٹر کی سائنس دان خواتین ' سنسکرت اور اردو فارسی کے عالم فاضل ۔ یہ سب جو تیزی سے اور مصروفیت سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے ۔ یونیورسٹی علم کا گھر ہے ۔ علم میں تعصب کس طرح داخل ہوتا ہے ' یہ اسے معلوم نہ تھا ۔ تعصب اور نفرت اور تنگ نظری '

شکوک اور ہٹ دھرمی، ان بھوتوں سے وہ ابھی روشناس نہ ہوئی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دنیا میں بڑا زبردست شور مچ رہا ہے اور یہ شور اس کے دل کی اندرونی خاموشی میں مخل ہوتا ہے تو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

سامنے ایک بڑے چبوترے پر شامیانے کے نیچے ہائی سکول کا میوزک کا پرچہ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہیں لڑکیوں میں تیز وطرار اور بشاش لڑکیوں کا وہ گروہ شامل تھا جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ چمپا اور لیلا مسز چنتامنی دیگر سے باتیں کرنے مصروف رہیں جو ان کی ہسٹری کی استاد تھیں سامنے سرسوتی کا مرمریں مندر تھا۔ ہندو لڑکے اور لڑکیاں فاؤنٹین پن اور کتابیں سنبھالے آتے، دیوی کے سامنے سر جھکا کر دعا مانگتے اور اپنی اپنی امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اتنے میں گھنٹہ بجا۔ شامیانے کے نیچے سے لڑکیوں نے نکلنا شروع کیا۔ دو لڑکیاں بچوں کی طرح اچھلتی کودتی سیڑھیوں پر سے اتریں اور بھاگ کے ایک اور گروہ سے جا ملیں جس کے وسط میں ایک سورداس جی کھڑے تھے اور سب لڑکیاں جلدی جلدی ان کو بتلا رہی تھیں کہ تھیوری کے پرچے میں انہوں نے کیا لکھا۔ یہ دونوں لڑکیاں فراک پہنے تھیں اور باقی کی ساری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھیں۔

اتنے دو نوجوان لڑکے، جو شکل وصورت سے ان دونوں بچیوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے، مجمعے میں کہیں سے نمودار ہوئے۔ رام نگر اسٹیٹ کی ایک کار آن کر رکی اور یہ چاروں اس میں جا بیٹھے۔ دوسرے لمحے کار دھول اڑاتی ہوئی نظروں سے

اوجھل ہوگئی۔

لکھنو سے آئی ہوئی لڑکیوں میں ایک لیلا بھارگو کو پہچانتی تھی۔اس نے قریب آن کر کہا: 'نمستے' لیلا دیدی۔ہم لوگ امتحان کے بعد اپنے یہاں ایک پارٹی کر رہے ہیں۔آپ ضرور آیئے گا۔''

''نمستے بینا۔یہ چمپا ہیں۔''

اس نے دوبارہ نمستے کیا۔''آپ بھی آیئے گا چمپا دیدی۔''

''ضرور''

''تم لوگ تو میرس کالج والے ہو۔تم سب کے ناچ گانے کی اتنی دھوم سنی ہے۔خالی پارٹی دے رہی ہو۔تمہارا ناچ نہیں دیکھیں گے ________؟''چمپا نے پوچھا۔

''چمپا دیدی کاشی اور لکھنو کا مقابلہ کروانا چاہتی ہیں ______؟''ایک اور لڑکی نے قریب آ کر کہا۔

''اچھا' یہ بات ہے۔''بینا ماتھر نے جواب دیا۔''تو پھر ہو جائے فیصلہ۔کہا کی بھیرویں بہتر ہے' کہاں کا دادرا' کہاں کا کتھک چلئے آیئے میدان میں۔''

''رہی۔؟''

''رہی۔''

اب ان کے آس پاس لڑکیوں کا ہجوم لگ گیا۔بنارس کی لڑکیاں لکھنو والیوں پر چوٹیں کر رہی تھیں' مگر لکھنو والوں سے باتوں میں کون جیت سکتا تھا؟ وہیں طے کیا گیا کہ بسنت کالج میں ان لوگوں کو بنارس کا کتھک دکھایا جائے گا مگر اس سے

پہلے وہ سب لکھنو کی لڑکیوں کے ہوسٹل پر دھاوا کریں گی۔

ان سب خوشدلی کی باتوں کے بعد چمپا اور ریلیا پھر تانگے پر بیٹھیں اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوگئیں۔

۳۹

بنارس پہنچ کر طلعت اور رز ملا اور ساری لڑکیاں جس جگہ پر ٹھہری تھیں وہ ایسی عجیب وغریب جگہ تھی جس کا ذکر آج سے دس سال بعد حمید بانو اپنے افسانوں میں کیا کرے گی (اگر اس نے افسانے لکھے)۔ یہاں پر یقیناً اس کی ہیروئن رہے گی یا ہیرو اس کی چھت پر سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوگا' وغیرہ ــــــ اور اس جگہ پر ایک ایسی نا قابل بیان دنیا آباد ہوگئی تھی جس کی طرح نا قابل بیان دنیا وسیع سیاہ سمندر میں گھرے ہوئے جہاز پر متضاد راستوں کی سمت جانے والے مسافروں کے اکٹھے ہونے سے آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع احاطے کے وسط میں بنا ہوا ایک بہت بڑا سنگ سرخ کا سہ منزلہ محل تھا جس کی مالکہ ایک لاولد برہمن رئیس زادی تھیں جو کانگرس ورکر تھیں اور مستقل یاتراؤں پر جاتی رہتی تھیں۔ محل اسی طرز کا تھا جس طرز کے عام ہندوستانی محل ہوتے ہیں۔ وسط میں ایک زبردست آنگن تھا جس کے چاروں طرف دالان در دالان اور کمرے تھے اور بے شمار گلیارے اور کوٹھریاں اور صحنچیاں اور تہ خانے اور شہ نشین اور ان گنت طاق اور طاقچے ــــــــــ مالکہ مکان نے' جن کو سب پنڈ

تائن صاحب کہتے تھے، فخر یہ بتلایا کہ جب سلطان عالم قید فرنگ کے عالم میں لکھنو سے کلکتے لے جائے جارہے تھے تو مہاراجہ بنارس نے ان کو اسی مکان میں بصد تکریم ٹھہرایا تھا۔ یہ بات سن کر حمید بانو بہت متاثر ہوئی اور اس نے پنڈ تائن کو سلطان عالم کے عہد سے تعلق رکھنے والی چند مستند حکایات سے مستفید کیا۔ پنڈ تائن سے حمید بانو کی خوب گٹھی، وہ خود بھی بزبان ہندی افسانے لکھتی تھی مگر لڑکیوں کی آمد کے تیسرے روز ہی وہ ایک اور یاترا کے لیے جگن ناتھ پوری چل دیں اور جاتے جاتے اپنی رہائش کے کمروں کی کنجیاں بھی لڑکیوں بھی لڑکیوں کے حوالے کرتی گئیں۔ اپنی قیمتی بنارسی ساریاں انہوں نے لڑکیوں کو زبردستی تحفے میں دیں ۔صبح شام تک اس قدر خاطر داری میں لگی رہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو لڑکیوں کی طرف سے پرچے بھی خود ہی کر آتیں پنڈ تائن اگر ایسی عجیب وغریب نہ ہوتیں تو بات نہ بنتی ۔اس افسانوی محل کی مالکہ کو بھی اتنا ہی غیر حقیقی ہونا چاہیے تھا۔

دن بھر محل میں ایسا ہنگامہ رہتا گویا بہت سی باراتیں ٹھہری ہوئی ہیں (محل کا نام _____ ''چندرن نوا'' تھا) ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آتیں آنگن میں ٹہل ٹہل کر پڑھا جارہا ہے، کسی شہ نشین میں الٹا لیٹ کر مطالعہ کیا جارہا ہے۔ باغ کے ایک کونے میں ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر امتحان کی تیاری ہورہی ہے۔ موسیقی کے پرچوں کے زمانے میں ہر کونے کھدرے سے گنگانے کی آوازیں آتیں ۔ رگھو ماما ذمے داری کے شدید احساس کے ساتھ ادھر ادھر انتظامات کرتے پھرتے یا لڑکیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے پھر ہڑونگے پن میں لگ گئیں، جایئے پڑھیئے۔ کھانے کے لیے دسترخوان بچھتا تو برہمن رسویا، جو بے انتہا

موٹا تھا' ہنکارا بھرتا اندر آتا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا اسسٹنٹ رسوئیا دہی کی بالٹی اٹھائے ہوتا۔ پتیل کی ایک بڑی سی ڈوئی میں وہی بھر بھر کر چیف رسوئیا لڑکیوں کی پلیٹوں پر بہت بلندی سے دہی ٹپکاتا' پھر تھالیوں اور کٹوریوں میں کھانا پروسا جاتا۔ رات کو آنگن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے محفل جمتی۔ جب امتحان شروع ہوئے تو ہر روز پرچے کرنے جاتے وقت جب لڑکیاں محل کے صدر دروازے سے نکلتیں وہاں کانتی دیدی دہی اور ماش تیل لیے کھڑی ملتیں اور وہ ہر لڑکی کو باری باری دہی مچھلی کا شگون کرواتیں۔

موسیقی کا امتحان بہت کڑا تھا۔ اس سے لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالانکہ میرس کالج کا سیکنڈ ایر کا نصاب یہاں بھی تھا مگر بہر حال یہ دوسری یونیورسٹی تھی اور ممتحن حضرات میں نارائن راؤ دیا شامل تھے جن کا نام سن کر ہی ڈر کے مارے جان نکلتی تھی۔

(جس روز امتحان تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کی اداس عمارت کی چھت پر دو کمرے بنے تھے۔ ایک میں نارائن راؤ دیاس بیٹھے تھے۔ لڑکیاں چھت کی منڈیروں کے سائے میں کھڑی جلدی جلدی مشکل راگوں کو نیچی آواز میں دہرا رہی تھیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک ممتحن اس قدر خفا معلوم ہوتے تھے۔ گویا ابھی سب کچھ چبا جائیں گے۔ کسم سکسینہ گھبرا گھبرا کر بٹول کے سنترے کھا رہی تھی کہ حلق خشک نہ ہو۔ منڈیر پر ایک چیل آنکھیں نیم وا کیے غنودگی کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی جیسے سوچتی ہو ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر وہ چیل سارناتھ کی طرف اڑ گئی)

تھیوری آف میوزک کے پرچے کے روز کمال اور ہری شنکر آن دھمکے۔ طلعت اور رزملا پرچہ کرکے شامیانے سے باہر نکلیں تو انھوں نے سرسوتی کے مندر کے نیچے دو لڑکیوں کو مسز ولیسکر سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان لڑکیوں کے قریب ہی سے کہیں سے کمال اور ہری شنکر نمودار ہوئے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کی بہت پیاری شکل تھی اور اس کا رنگ دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں لڑکے رام نگر کے دیوان صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے جو طلعت اور کمال کے قرابت دار تھے۔ پھر تیز دھوپ میں دریا پار کرکے وہ چاروں رام نگر پہنچے اور ''پالش کی ہوئی سڑکوں'' پر سے گزرتے ہوئے طلعت کو ایک دم قدیر کا خیال آیا جو بچپن میں ان کو مختلف قسم کی معلومات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

''مجھے قمرن کے لیے ساری اور چوڑیاں خریدنی ہیں۔'' طلعت نے با آواز بلند کہا۔

''ابھی تمہاری خریداری کی مہم شروع نہیں ہوئی۔'' کمال نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

''نہیں۔ پیسے لاؤ۔''

اب دونوں لڑکوں نے غرا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔

''تمہارا خیال ہے ہم مہاجن ہیں۔ کوٹھی چلتی ہے ہماری؟'' کمال نے غصے سے کہا۔

''ہم تو دو مفلس قلاش برہمچاری ودیارتھی ہیں۔ خود دان پن پر گزر کرتے ہیں۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''لیکن اس کے باوجود ہم دل بادشاہوں کا رکھتے ہیں۔'' کمال نے کہا۔

''صحیح کہتے ہو۔'' ہری شنکر نے گلا صاف کر کے صاد کیا۔

''اور اگر تم ہم کو بتلا دو کہ وہ مہا سندر روپ وتی کون ہے جو سرسوتی کے مندر کے سائے میں کھڑی تھی تو بنارس کی ساری چوڑیاں تم کو خرید دیں گے۔'' کمال نے کہا۔

''کون مہا سندر روپ وی۔'' طاعت اور نرملا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''تم نہیں جانتیں اس دیوی کو جو دیوی کے استھان کے پاس کھڑی مسکراتی تھی؟'' کمال نے مایوسی سے پوچھا۔

''بالکل نہیں، مگر پیسے لاؤ۔''

''اگر تم اس کا پتا چلا دو۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''بھیّن تمہارے لیے تو لڑکیوں کے پتے چلاتے چلاتے ناک میں دم آ گیا ہے۔'' نرملا نے جو عمر میں بڑی اور نسبتاً سمجھ دار تھی چڑ کر جواب دیا۔

اسی طرح جھگڑا کرتے وہ رام نگر پہنچے اور دن بھر خس کی ٹٹوں کے پیچھے بیٹھ کر انہوں نے دن گزارا اور آم کھائے اور رشتے داروں سے گپیں ہانکیں اور دیوان صاحب کی بیگم صاحب نے فوراً کاشی کی بہت سی رئیس زادیوں سے ہری شنکر کی بات طے کر دی اور سب بہت بشاش ہوئے۔

جب امتحان ختم ہوئے تو لڑکیوں نے گھومنے پر کمر باندھی۔ ماما اور کانتی دیدی کی قیادت میں ان کے غول کے غول گلی کوچوں میں گھستے پھرے۔ چوڑیوں کی دکانوں کی دکانوں کے سامنے یہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھ رہیں۔ انہوں نے ان

گنت چوڑیاں خرید ڈالیں۔ شام پڑے کشتیوں میں بیٹھ کر جب وہ گنگا کے دھارے پر دنیا بھر کے گانے گاتیں حمید بانو موقع و محل کی مناسبت سے پاٹ دار آواز میں۔ اے آب رود گنگا ______ والی نظم شروع کر دیتی۔ سب لڑکیاں مل کر اسے اٹھاتیں۔ انہوں نے شہر میں جا کر تازہ ترین فلم دیکھا جس کا نام ''خزانچی'' تھا' پھر ایک روز بھری دوپہریا میں وہ سب سارناتھ پہنچے۔ جہاں کے ایک معبد کے مرمریں فرش پر دیووں کی روشنی رقصاں تھی اور ایوان میں چھوٹے بڑے سنہری مجسمے پرنس گوتم سدھارتھ کے رکھے تھے اور ماحول کے تقدس سے مرعوب ہو کر سب لڑکیوں نے دوپٹوں اور ساری کے آنچلوں سے سر ڈھانپ لیے اور سب نے بدھ کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے انتہا پاکیزہ محسوس کیا۔

''یہاں کس قدر سکون ہے۔'' طلعت نے کہا' وہ سب ہال میں دیوار سے ٹک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

''ہاں آں۔'' حمید بانو نے سر ہلایا' پھر وہ بڑے پر اسرار طریقے سے مسکرائی۔ گویا اب کسی زبردست حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔

''بات یہ ہے۔'' اس نے کہا'' کہ ہم سب اتنی گھام میں مارے مارے پھرنے کے بعد یہاں آ کر بیٹھے ہیں اس لیے خواہ مخواہ سکون محسوس ہو رہا ہے۔'' طلعت کو حمید بانو کی یہ حقیقت پسندی بہت کھلی۔

''مگر یہ واقعہ ہے کہ مہاتما بدھ کے چہرے کو دیکھ کر سکون ملتا ہے۔'' طلعت نے سوچ کر کہا۔

''اجی تم کی اجانو یہ باتیں۔'' حمید بانو نے بزرگی سے کہا'' دراصل ہم

مسلمانوں کو یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔'' پھر وہ سر جھکا کر غور و خوض میں محو ہو گئی' وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بڑ رومان پرست تھی مگر اس ذہنی کش مکش کا حل تلاش کرنے کی اس کی عمر نہ تھی کہ جب وہ کلمہ گو ہے تو اسے بتوں سے بھی الفت کس واسطے ہے۔ دیر و حرم کے مسئلے پر وہ کچھ دیر اور غور کرتی مگر اتنے میں معاً طلعت اٹھی اور اس نے بڑے مجسمے کے سامنے جا کر رقص کرنا شروع کیا' پھر بینا ماتھر بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سب لڑکیاں گھیرا باندھے ناچ رہی تھیں اور ان سب میں حمید بانو پیش پیش تھی۔ دو جاپانی بھکشو جو ایک ستون کے پاس وزیٹرز رجسٹر کھولے بیٹھے تھے ذرا جھینپ سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

باہر عمارت کے سائے میں کھڑے کھڑے ہری شنکر مہایان بدھ ازم کی تاریخ پر کمال کو ایک لیکچر دے رہا تھا اور کمال نے قریب کے ایک ستوپ کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر سوچا میں اس لمس کے ذریعے اس دوسرے وقت میں موجود ہوں وہ وقت جو گزر چکا لیکن اب بھی ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لحظے کے لیے چکر سا آ گیا' پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی اہمیت کے ساتھ ایک جاپانی بھکشو سے کچھ انٹ سنٹ اڑا رہا تھا اور جاپانی بھکشو ہری شنکر کی علمیت سے بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سرخ ریت پھیلی ہوئی تھی اور دھوپ میں ستوپ کھڑے تپ رہے تھے اور ایک راستہ چکر کاٹتا نیچے سے اوپر جاتا تھا اور ستوپ کے چاروں طرف گھوم کر وہ راستہ پھر نیچے لوٹ آتا تھا۔ کمال نے ہری شنکر کے ساتھ ساتھ اس پر چلنا شروع کیا۔ اب لڑکیاں باہر آ چکی تھیں اور حمید بانو قریب سے کانتی دیدی سے کہتی ہوئی گزر رہی تھی: میں خواب میں یہاں کئی بار آ چکی ہوں۔

مجھے لگتا ہے میں اس جگہ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں میں نے یہ سرخ ریت والا تپتا ہوا راستہ پہلے بھی دیکھا ہے۔

گڈ اولڈ حمید بانو ______ کمال نے مسکرا کر دل میں کہا۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ضرور افسانہ نگاہ بن جائے گی اور روحانیات میں دلچسپی لے گی اور شاید تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شامل ہو جائے۔

''حمید بانو ______ ظہر کا وقت ہے' چلو نماز پڑھ لیں۔'' رفیعہ باجی نے ستوپ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے آواز دی اور حمید بانو ہڑ بڑا کر سرخ ریت والے راستے پر سے اتری اور ایک آم کے درخت کی طرف چلی گئی جہاں چند لڑکیاں پہلے سے ستانے کے لیے جا بیٹھی تھیں۔

کمال نے اس منظر کو دیکھا۔

ستوپ اور میوزیم کی عمارت اور بڑا مندر جس کا عظیم الشان سنہرا گھنٹہ دور سے نظر آ رہا تھا اور لوگ چاروں اور پھر رہے تھے اور ان کے سائے زمین پر لرزاں تھے۔

سائے قائم رہتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ سائے میں بڑی طاقت ہے۔ ہم عمر بھر مختلف سایوں کا تعاقب کرتے ہیں مگر سایہ ہاتھ نہیں آتا' وہ اپنی جگہ امٹ ہے۔ سائے کی اور وقت کی آپس میں سازش ہے۔

''چار بج رہے ہوں گے ______ '' گھبیر ماما نے پھاٹک کے سائے کو زمین پر دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ''اب واپس چلنا چاہیے۔''

''چلولڑکیو'' کانتی دیدی نے آواز لگائی۔

لکھنو واپس جانے کے دن قریب آئے اور روانگی سے ایک روز قبل چندن نواس کے آنگن میں صدر دالان کے نزدیک اسٹیج بنا اور اسے کیلے کے پتوں سے سجایا گیا۔محل کے وسیع لق ودق اینٹوں کے فرش والے صحن میں چھڑکاؤ ہوا تھا اور بڑی سی چاندنی بچھائی گئی تھی اور پچھلے دالان میں گرین روم تھا اور اگلے دالان میں جاجم ٹانگ کر پردہ بنایا گیا تھا جس کے پیچھے ساز رکھے تھے اور ربینا ماتھر میوزک ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سریواستوا جلدی جلدی سب رکھے تھے اور ربینا ماتھر میوزک ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سریواستوا جلدی جلدی سب باجوں کے سر ٹھیک کروا رہے تھے۔باقاعدہ ڈراما کرنے کی کسے فرصت تھی۔وقت کے وقت طے کیا گیا تھا کہ راج رانی میرا ہوگا۔یہ اس لیے کہ اس میں زیادہ ڈائمیلاگ وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔سارا کام میرا کے بھجنوں کے ذریعے چل سکتا تھا اور لڑکیاں ایسی ماہر فن تھیں کہ اسٹیج پر ادھر سے ادھر چلتی رہی۔طلعت جنرل رول ادا کر رہی تھی۔جہاں ایکٹروں کی کمی پڑی وہاں یہ جھٹ سے موجود۔ایک سین میں وہ اکبر اعظم کی وزیر بنی۔دوسرے میں میرا کی سہیلی۔تیسرے میں جہاں میرا سے رانا کی شادی ہوتی ہے وہاں جلدی سے اکبر اعظم کی مونچھیں مستعار لے کر وہ پنڈت بن گئی اور منڈپ میں جا کر اڑنگ بڑنگ اوم سواہا کہہ کر اس نے میرا بائی کی شادی کرادی۔

پھر بہت سی لڑکیاں راس لیلا کے ناچ کے لیے چھن چھن کرتی آئیں۔انہوں نے دنیا بھر کے زیور پہن رکھے تھے۔حد یہ کہ رفیعہ باجی جیسی موٹی خاتون بھی ماتھے

پر لفتری بور سجا کر متھرا کی گوالن بنی تھیں۔ حمید بانو نقلی موتیوں اور پنیوں کا مکٹ پہنے بڑے اسٹائل سے بانسری اٹھائے کھڑی رہی۔ نرملا ستار سنبھالے والان کے پیچھے سے گویا بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی تھیں۔

سامنے آڈئینس تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جانے کون کون۔ بسنت کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں، لیکچرر اور پروفیسر صاحبان، بہت سے لڑکے، ان ہی میں اگلی قطار کے سرے پر چمپا احمد اور لیلا بھارگو ابیٹھی تھیں۔ ہری شنکر اور رکمال چاندنی کے فرش پر براجمان تھے۔ رگھو ماما ٹک کر ڈراما دیکھنے کے بجائے خوش خوش گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔

چمپا اور رکمال اور ہری شنکر تینوں اس سے الگ الگ آنکھوں سے سامنے کا تماشا دیکھا کیے۔

لڑکیاں اس سے دنیا مافیہا سے خبر صرف اس اسٹیج پہ موجود تھیں اور بے حد خوش تھیں۔

لڑکیاں سوانگ رچنے کے بے حد شوقین ہوتی ہیں۔ بچپن میں وہ پلنگ کھڑے کر کے ان پر پلنگ پوش کے پردے لگا کر گھر گھر، کھیلتی ہیں۔ گھروندا سجا کر تصور کرتی ہیں یہ سچ مچ کا مکان ہے۔ ہنڈ کلیا ان کے نزدیک بڑا اہم دعوتی کھانا ہوتا ہے۔ گڑیاں گڈے ان کے لیے جاندار انسان ہیں۔ جب ذرا بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنا بناؤ سنگھار کر کے کس قدر مسرور ہوتی ہیں۔ باہر جانے سے پہلے گھنٹہ بھر آئینے کے سامنے صرف کریں گی۔ جوتوں اور کپڑوں کا انتخاب ان کے لیے آفاقی اہمیت کا حامل ہے۔ سجنا، بہروپ بھرنا ان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ رادھا اور کرشن کا

ناچ ناچتی ہیں تو تصور کرتی ہیں کہ واقع ورندابن میں موجود ہیں۔ ساری عمران کی اپنی ایک نازک سی دنیا بسانے میں گزرتی ہے اور یہ دنیا بسا کر وہ بڑے اطمینان سے اس میں اپنے آپ کو پجارن یا کنیز کا درجہ تفویض کر دیتی ہیں۔ اول دن سے ان کے بہت سے چھوٹے بڑے دیوتا ہوتے ہیں جو ان کی رنگ بھوم کے سنگھاسن پر اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ باپ' بھائی' شوہر' خدا' بھگوان' کرشن' بیٹے' پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ جب رنگ بھوم کا ڈائریکٹر ان سے کہتا ہے کہ تم مہارانی ہو دل کی ملکہ ہو' دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو' روپ وتی ہو تو یہ بےچاریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

لڑکیاں بے حد مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ ڈرامے کرتی ہیں۔

یہ کس مسخرے نے کہا ہے کہ عورت کا کام دلوں کو توڑنا اور دنیا پر حکومت کرنا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ گپ۔ بکواس۔ یہ تو کہیں سے کہیں پہنچ جائیں۔ کتنی ہی وِدوان بن جائیں' کتنی ہی وِدوان بن جائیں' کتنی ہی بڑی سلطنت کا تاج ان کے سر پر ہو' ان کی اوقات وہی رہے گی۔ پجارن۔ کنیز۔

لاحول ولا قوۃ

کمال راس لیلا دیکھتا رہا۔ سامنے گوپیاں اب کرشن کی آرتی اتار رہی تھیں۔ دالان میں نرملا اور بینا ماتھر زور زور سے گاتی رہیں:

''موہن سنا دے میٹھی تان۔ مدھر' رس بھری' رسیلی' پیاری پریم کی تان۔''

واہ ____ کیا بات ہے۔

اری مورکھ لڑکیو تم کو خبر بھی ہے پریم کی تان کتنی بڑی مصیبت کا گھر ہے۔ کبیر

یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہہ ______ کمال کو کبیر داس کا ایک دوہا یاد آیا۔ اس نے پہلو بدل کر سگریٹ سلگا لیا۔

۴۰

بیساکھ کا مہینہ گزرا، جیٹھ کا، اساڑھ میں رزلٹ نکلا۔ چمپا احمد پاس ہو گئی تھیں اور حسب توقع فرسٹ ڈویژن انہوں نے حاصل کیا تھا۔ اب ان کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ساریاں خریدی گئیں۔ ہاؤس کوٹ تیار ہوئے۔ لکھنو ماموں میاں کو خط لکھا گیا۔ جولائی میں چمپا بیگم آ رہی ہیں۔

ایک روز شام کو وہ لیلا بھارگوا کے ہمراہ بازار سے گھر جاتے ہوئے چندن نواس کے سامنے سے گزری۔ اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ باغ پر ہولناک سناٹا طاری تھا۔ محل سنسنان پڑا تھا۔ تیسری کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ شاید پنڈتائن اپنی یاترا سے لوٹ آئی ہوں گی۔ باقی ساری عمارت اندھیر اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں سے آگے بڑھی تو سے لگا جیسے بہت سی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے قہقہے، گھنگروؤں کی جھنکار، تان پورے کی گونج اور سب سے بڑی سناٹے کی آواز۔

اسے وقت کے بھوت نے ستانا شروع کر دیا تھا۔

لیلا کو اس کے گھر پر اتارنے کے بعد وہ حسب معمول اپنے مکان کی سمت بڑھی۔ مہری نے تانگے سے اتر کو چھوٹا سا پھاٹک کھولا، وہ اندر داخل ہوئی اور آنگن

میں جا بیٹھی ۔ باہر گلی بی سنسان پڑی تھی ۔ برابر کے تین چار مکانوں میں کئی ریڈیو اکٹھے بج رہے تھے ۔لکھنو سے خبریں سنائی جارہی تھیں ۔ چمپا کے والد بیٹھک میں کسی موکل کے ساتھ مصروف گفتگو تھے ۔

''ڈاک میں تمہرا یہ لفافہ آوا رہا۔'' اس کی ماں نے ایک نیلے رنگ کا چپٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہااور باورچی خانے کی سمت چلی گئیں ۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس نے خط کھولا' پھر برآمدے کی بتی جلا کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ اجنبی زنانہ لکھائی تھی اور کسی اجنبی کا خط تھا۔مسوری سے آیا تھااور انگریزی میں تھااور مائی ڈیر چپا کہہ کر اسے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا مجھے یہ معلوم کر کے بےحد خوشی ہوئی کہ تم اس سال ہمارے کالج آرہی ہو۔ اس کے بعد اس کالج کے متعلق مختلف تفصیلات سے اسے مطلع کیا گیا تھا' اگر وہ فلاں فلاں چیزوں میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے فلاں فلاں کلب خوش آمدید کہیں گے' اگر وہ آوٹ ڈور لڑکی ہے تو اسپورٹس کی ڈائریکٹر جے مالا اپا سوامی سے اسے ملنا چاہیے۔ ٹینس کی سیکرٹری لیلا اشری ناگیش بھی اس کی مدد کر کے بےحد خوش ہوگی' اگر وہ مغربی موسیقی کی شوقین ہے تو میوزک ورکشاپ اس کی منتظر ہے ۔ ڈراما گلڈ اس کی اداکارنہ صلاحیتوں سےبہرہ ورہونے کی ۹ خواہش مند ہے (اگر اسے اسٹیج سے دلچسپی ہے)' وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے سارے ہوسٹلوں کے متعلق انفارمیشن دی گئی تھی اور فیکلٹی کے متعلق ۔ اخیر میں لکھا تھا کہ نئی لڑکی کی حیثیت سے مکتوب الیہ کو اس کے چارج میں دیا گیا ہے اور مکتوب الیہ کی وہ آفیشیل ایڈوائزر ہے۔لہٰذا سولہ تاریخ کو جب وہ کالج پہنچے تو اسے راقم

الحروف فلورنس نکلسن ہال کی سیڑھیوں پر ملے گی اور اس کے سارے پرابلمز کا حل تلاش کرے گی۔

نیچے راقم الحروف کا نام لکھا تھا تہمینہ رضا' تاراہال' مسوری۔

چمپا ہکا بکا کھڑی سوچتی رہی کہ یہ تہمینہ رضا کون ہے اور اسے میرا پتا کس طرح معلوم ہوا اور اس قدر دوستی کا خط اس نے کیوں لکھا ہے۔ یہ خط اسے بڑا افسانوی معلوم ہوا' یعنی اس طرح کی باتیں محض ناولوں میں ہوتی تھیں۔ اسے لگا وہ اب بڑی انوکھی فضاؤں اور بڑی عجیب وغریب دنیا کی طرح سفر کرنے والی ہے۔

اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔

۴۱

بنارس سے لوٹ کر ساری لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں اور ایک ہفتے بعد سب آ کری بار ملنے کے لئے اسکول میں جمع ہوئیں۔ بڑا کلاس روم کھلوایا گیا۔ لارڈ مہری سب کی خاطریں کرتی آگے پیچھے دوڑتی رہی۔ لڑکیاں ڈیسکوں پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور دفعتاً سب خاموش ہوگئیں' جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہوں۔ ان میں سے بڑلڑکیاں سوچ رہیں تھیں' اب جانے ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ان میں سے اکثر کی شادی ہونے والی تھی۔ چند کو ابھی کالج میں پڑھنا تھا۔ دفعتاً حمید بانو نے' جو بے حد ڈریمٹیک واقع ہوئی تھی' مس پردھان کی نئی فلم کا گانا شروع کردیا: ہنس لے جی بھر بھر کر ہنس لے۔ جانے کون کہاں پھر جائے۔ اس کے بعد دوسرا تازہ فلمی گانا

گایا گیا: رک نہ سکو تو جاؤ تم جاؤ ______ اور اس کے بعد تیسرا ______ اور جینے والے ہنستے ہنستے جینا۔ سورج کبھی نہ ڈوبے تیرا ______ وغیرہ۔ یہ سب گانے کی وجہ سے خوب رقت طاری ہوئی اور سب کی سب خوب پھکو پھکو روئیں۔

واقعی لڑکیوں کی کس قدر بیوقوف قوم ہے۔

مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ان میں سے دو تین لڑکیوں کے علاوہ ساری لڑکیوں کو طاعت نے عمر بھر نہ دیکھا' وہ سب جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جو اتنی اچھی ہجولیاں تھیں۔

یہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ الگ الگ ہو جائیں گے' اور جب بچھڑ جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے۔

۴۲

ہندوستان کا بہترین گرلز کالج ______ !

ازابلا تھوبرن ______ !!

''چاند باغ۔''!!!

لکھنو کی فیض آباد روڈ پر ایک بہت بڑا پھاٹک ہے اور بہت دور ہی سے ایک بے حد طویل و عریض دو منزلہ عمارت نظر آ جاتی ہے جس کے یونانی طرز کے بلند و بالا پورٹیکو کے ستون دور سے دکھلائی پڑتے ہیں۔ اس پورٹیکو کا فرش مرمریں ہے۔

سامنے لان پر پام کے درخت لگے ہیں۔ اس عمارت میں چمکتے ہوئے شفاف شیشوں والے طویل اور بڑے بڑے دریچے ہیں اور جھلملاتے ہوئے فرش اور چوڑے مرمریں زینے۔ اونچی چھتوں میں جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ اس کا ''براوزنگ روم'' جہاں لڑکیاں بیٹھ کر فرصت کے وقت میں علم چرتی چگتی ہیں' اپنی آرائش کی وجہ سے کسی برطانوی لارڈ کا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بیش قیمت نوادر سجے ہیں اور نایاب کتابیں رکھی ہیں اور مشہور پینٹنگز سے اس کی دیواریں مزین ہیں۔ ساری عمارت میں جگہ جگہ ایرانی قالین بچھے ہیں۔ یہ عمارت ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس کے عقب میں وسیع کیمپس پر دور دور فاصلے پر اتنی ہی بڑی چار عمارتیں اور بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے شفاف فرش والے کوریڈورز سے ملحق ہیں جن کے اوپر پھولوں کی خوبصورت بیلیں پھیلی ہیں۔ یہ کوریڈور کئی فرلانگ لمبے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے تین میں ہوسٹل ہیں جو نشاط محل' نونہال منزل اور میلٹری بھون کہلاتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر شاندار ہیں گویا کسی بڑی ہندوستانی ریاست کے گیسٹ ہاؤس ہوں۔ چوتھی عمارت فیکلٹی کی ہے جنہوں نے اپنے کمرے اور سیٹنگ روم دلہن کی طرح سجا رکھے ہیں۔ کیمپس کے وسط میں ڈائننگ ہال کی عمارات ہیں اور ایک سرے پر ہسپتال ہے جس کی انچارج ایک نیگرو نرس ہے۔ پہلو میں کالج کا مشہور عبادت خانہ ہے جو موڈرن طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس طرح کے عبادت خانے سویڈن اور کیلیفورنیا میں بنائے گئے ہیں۔ یہ بے انتہا اسٹریم لائنڈ جگہ ہے اور اس میں بیٹھ کر خدا سے لو لگاتے وقت خواہ مخواہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یسوع مسیح بھی کسی امریکن یونیورسٹی

کے پریذیڈنٹ یانیو انگلینڈ کے رحمدل اور خلیق پروفیسر ہیں۔اس کالج کی عمارات کا طرزِ تعمیر اسی قسم کا ہے جیسا امریکن یونیورسٹیوں کا ہوتا ہے۔بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بعد یہ مشرق میں امریکنوں کی بنائی ہوئی سب سے عظیم الشان درس گاہ ہے۔

چاند باغ ______ !!

پورنماشی کی راتوں میں جب چاندنی کیمپس پر برستی ہے تو لگتا ہے یہ سارا سماں بے حد غیر حقیقی ہے۔ ہرے سبزہ زار۔ پھولوں کے کنج سفید کے جھنڈ۔ عمارتوں کے روشن دریچے۔ اس وقت کیمپ کے مختلف گوشوں سے موسیقی کے سر بلند ہوتے ہیں۔بیتھووَن۔شوپاں۔ویبر۔جارج گریشون۔یا کسی کوریڈور میں سے کوئی لڑکی سائے کی طرح گزر جاتی ہے۔نیگروزس ہسپتال کے شیشوں والے برآمدے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھتی ہے جس پر بیت لحم کا اکیلا ستارہ کہرے میں چھپا جھلملا رہا ہے۔چیپل میں سے برقی آرگن کی گہری گونجتی ہوئی آواز اوپر اٹھتی ہے۔اندر قربان گاہ یک اوپر منقش لیمپ جلتا رہتا ہے۔سناٹے کے سارے پرتو قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح سارے میں پھیل جاتے ہیں۔سواسو سال ادھر یہاں رمنا تھا۔ یہاں کے باغات میں ہرن کلیلیں بھرتے پھرتے تھے اور بارہ سنگھے اور نیل گائیں اور اودھ پوری کے حکمرانوں کے بجرے ندی کے اس کنارے پر آن کر لگتے تھے اور شہر کی اونچی سوسائٹی یہاں آن کر مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کا نظارہ کرتی تھی' وہ پرانا برگد کا درخت' جو کیمپس کے اس کونے میں کھڑا ہے' اس کی پتیاں اس سے بھی پچھلے پہر کی ہوا میں اسی طرح سرسراتی ہوں گی۔

اسی سال سے یہ درس گاہ قائم ہے۔۱۸۶۲ء میں جو خوش بارش نوجوان لڑکیاں لمبی آستینوں کے بلاوز پہنے اور گاؤن کی وضع سے ساریاں باندھے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلی تھیں ان کی قبروں پر نئے قبرستان بن چکے۔ جو لڑکیاں کل یہاں آنکھوں میں خواب لے کر گاتی گنگناتی آئی تھیں آج وہ نانیاں دادیاں ہیں یا دنیا کے بہت سے دکھ انہوں نے اٹھائے ہیں یا بڑی معمولی' عام زندگیاں گزار رہی ہیں۔

اس لئے بے چاری لڑکیو' تم جو ہال میں گ ھس یوجین اونیل کی ریہرسل کر رہی ہو خوش ہو لو کیونکہ کل تم بھی مر چکی ہو گی۔ چونکہ زندگی کی جس جنگ میں حصہ لینے کے لیے تم یہاں سے نکلو گی اس کے محاذ پر کام آنے والوں کے لئے کوئی پیتل کی تختیاں دیواروں پر نہیں لگائی جاتیں۔

اس چیپل کی سفید سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سوچوں کون کہتا ہے کہ سامی مذاہب کا نظریہ کائنات غلط ہے۔ صراط مستقیم صرف ایک ہے۔ سیدھی اور تنگ۔ ایک پیدائش سے ایک موت کی طرح جانے والی' جس کے بعد کوئی واپسی نہیں۔ اس لیے بے چاری لڑکیو' تم جو پھولوں کے کنج میں گرباناچ رہی ہو' چاہے تم کسی خدا کی عبادت کرتی رہو (اور چونکہ تم عورت ہو لہذا ملحد مشکل ہی سے بنو گی) یاد رکھو کے جب تم چاندنی کی اس دنیا سے باہر چلی جاؤ گی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤ گی۔ دوسرے تمہارے جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہو گا جو تمہارے وقت میں ہوتا تھا لیکن دنیا بدل چکی ہو گی۔ دنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔

تم بدل جاؤ گی۔

کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ تمہاری سوشیولوجی کی چہیتی پروفیسر' بگلے کے ایسے سفید بالوں والی کمر خمیدہ بڑھیا' جو کھٹ کھٹ کرتی مسکراتی گیلری میں سے گزر رہی ہے' ۱۹۰۲ء میں تم سے زیادہ حسین تھی اور فلاڈلفیا کا گلاب کہلاتی تھی؟

یہ سارے جشن' یہ ساری تقریبات' رسوم' تہوار' کارنیول' مورس ڈانسنگ کے مقابلے' اسپورٹس کے ہنگامے' یہ سب تم سے پہلے ہو چکا ہے اور تمہارے بعد بھی ہوتا رہے گا۔

یہ کیمپس اس کارگہ شیشہ گری' جسے دنیا کہتے ہیں' ایک بے حد چھوٹا سا ماڈل ہے۔

نشاط محل کے پیچھے ڈچ وضع کے باغ کے برابر سے ایک سایہ دار راستہ سوئمنگ پول کی طرف جاتا ہے جو آم کے جھنڈ میں گھرا ہوا ہے۔ یہ جولائی کا مہینہ ہے اور بھانت بھانت کی لڑکیاں سارے میں پھیلی ہوئی ہیں: مرہٹی' گجراتی' بنگالی' مدراسی' اڑیہ' نیپالی' پنجابی' پٹھان' یورپین' امریکن' برمی' سنگھالی' ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ مذہباً یہ لڑکیاں ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بودھ اور یہودی۔ دنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیرو یہاں موجود نہ ہو۔

اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں ان کی نقل کی جاتی ہے۔

اس ارسٹو کریٹک کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں

گریس فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔

''ہم دینے کے لیے لیے ہیں۔'' یہاں کا موٹو ہے۔

پہلے یہاں مغربیت کا بہت زور تھا لیکن قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر وہ زور اب کم ہوتا جارہا ہے۔ اب یہاں ٹیگور رجینتی سنائی جاتی ہے اور عید اور دیوالی کا مشترکہ تہوار بہت دھوم سے منعقد ہوتا ہے جب مسلمان لڑکیاں سارے میں چراغاں کرتی ہیں اور ہندو لڑکیاں غرارے پہن کر اتراتی پھرتی ہیں۔

اس کالج کی بہت قدیم روایات ہیں اور رسوم اور ان کے اپنے گانے ہیں۔ ان کی ایک ایسی پراسرار دنیا ہے جس میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہوسکتا۔

۴۳

حسب وعدہ سولہ تاریخ کو تہمینہ رضا' چمپا احمد فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر ملی۔ چمپا ذرا پریشانی سے چاروں اور دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''تم چمپا احمد ہو______؟''

''ہاں''

''آؤ' میرے ساتھ چلو۔''

اور دوسرے لمحے چمپا چاند باغ کی دنیا میں شامل ہوگئی۔ اس رات ہال میں نئی لڑکیوں کو کالج کی روایات کے متعلق ایک لیکچر دیا گیا۔ انہیں یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا گیا۔ شروع کے چند ہفتے چمپا کو بریک ان

ہونے میں لگے۔ جبھی اس کو اس قاعدے کا علم ہوا کہ ہر سال کالج کے دفتر کی طرف سے نئی لڑکیوں کے پتے سینئر طالبات کو بھیج دیے جاتے ہیں اور موخر الذکر ان کی ایڈوائزر مقرر کی جاتی ہیں۔ کالج میں داخل ہونے والی ساری لڑکیوں کو چندن خاص سینئر طالبات کی طرف سے اس طرح کے خط ملے ہوں گے جیسا چمپا کو ملا تھا۔

تہمینہ کی بہن طاعت آرا، جو فرسٹ ایر میں داخل ہوئی تھی، بڑی بے تکلفی سے اس سے کہنے لگی: "ارے چمپا باجی، ہم نے تو آپ کو بنارس میں بھی دیکھا تھا۔"

اور نرملا سریواستوا نے سوچا کہ اب کمن بھیا اور بھین صاحب کی تو پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ان کی دیبی تو یہیں آن پہنچی۔

چمپا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گلفشاں، بھی گئی۔

یہاں سب اس سے بڑی اپنائیت سے ملے۔ تہمینہ کے بھائی کمال رضا نے، جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، بے حد اخلاق اور مودبانہ طریقے سے اس سے گفتگو کی اور طاعت کی تقلید میں اسے چمپا باجی کہہ کر مخاطب کیا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ شنکر سریواستوا اس کے لیے خود چاء کی کشتی اٹھا کر لایا۔

ایک کو تیسرے پہر وہ گلفشاں پہنچی۔ تہمینہ اور طاعت پچھلے برآمدے کے سائڈ روم میں کھڑکی کے پاس تخت پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ پیاز ارمرچوں کا ٹوکرا نیچے رکھا تھا۔ نرملا آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً شام کو ان کے ہاں کوئی دعوت تھی۔

چمپا بھی تخت کے کنارے بیٹھ کر آلو چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

اسی وقت بھیا صاحب اندر آئے، وہ بھی روایتی ہیرووں والی شان سے۔ ٹینس

ریکٹ ہاتھ میں لیے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھیا صاحب عموماً گھر میں نہیں آتے تھے' خصوصاً جب تہمینہ کی سہیلیاں موجود ہوں کیونکہ تہمینہ کے کراؤڈ سے ان کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی۔ تہمینہ کے اصل کامریڈ تو کمال اور ہری شنکر تھے۔

مگر بھیا صاحب بہر حال بھیا صاحب تھے۔

چمپا بیٹھی آلو چھلت رہی۔ اس نے اپنی انگلیاں نہیں کاٹیں۔

بھیا صاحب شام کے ڈنر کے متعلق تہمینہ سے کچھ پوچھنے آئے تھے۔ اس سے بات کرکے وہ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

مگر اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے گنگا دین کو بلایا۔ ''یہ نئی بٹیا کون ہیں جو اندر بیٹھی ہیں۔''

''پتا نہیں سرکار۔'' گنگا دین ہڑ بڑا گیا۔ بھیا صاحب نے آج تک لڑکیوں کے متعلق کوئی استفسار اس سے نہیں کیا تھا۔ آخری بڑی بٹیا سے ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ ''بڑی بٹیا کے پاس چاند باگ کی سبے بابا لوگ آوت ہیں۔''

''اچھا جاؤ۔''

کمال آیا۔ اس سے کیا پوچھتے۔ طلعت کی طبیعت کی تیزی سے وہ ذرا خائف رہتے تھے' اگر اس سے اشارتاً بھی معلوم کرنا چاہا تو وہ سارے میں ڈھنڈورہ پیٹتی پھرے گی۔ کیا مصیبت تھی کہ چونکہ وہ تہمینہ سے آفیشیل طور پر منسوب تھے لہٰذا دنیا جہان کی کسی اور لڑکی کو نظر بھر کر دیکھنا ان پر حرام تھا۔ یہ کیسی قید تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بے حد تنہا تھے۔

بھیا صاحب اپنی ذات کے رومانس میں آپ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

چمپا کو سجاتا نے بتایا: ''یہ مہاشے تہمینہ کے فیانسے ہیں مگر تہمینہ ان کو مستقل نو لفٹ کیے رکھتی ہے۔''

اوہ۔ کس قدر ٹپکل صورت حال تھی۔ دو کزن جو ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ گلفشاں کی قسم کے ناموں والی کوٹھیوں کے باسیوں کے متعلق جتنے افسانے اس نے پڑھے تھے ان میں یہی ہوتا تھا۔

مگر یہ افسانے قریب سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ جو دوسروں کی زندگی کو افسانہ سمجھتا ہے وہ دراصل خود بھی تو ایک کہانی ہے جسے دوسرے پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات چمپا کو اس وقت معلوم نہ تھی۔

۴۴

برسات نکلی۔ کاتک پورنمائش آئی' پھر ماگھ پوس کی ہوائیں چلیں' کمروں میں آتش دان جلے' باغوں پر کہرہ چھایا' رات کے پھولوں پر شبنم کے قطرے جمے' چاند باغ میں کرسمس کے تہوار کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ امیروں نے اس سال کے فیشن کے اوور کوٹ سلوائے۔ غریب غربا پالے میں ٹھٹھر کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ بڑے لوگوں نے شکار کے لیے کالپی اور ترائی کا رخ کیا۔ کلکتے کی رونق دوبالا ہوئی۔ جاڑے نکلے۔ بسنت آئی۔ سرسوں پھولی۔ کونپلیں پھوٹیں۔ بہار کی خوشبوؤں کسے فضائیں مہکیں۔ انڈر گریجویٹ شعراء نے انگریزی میں جدید طرز کی نظمیں لکھیں۔ گرمیاں آئیں۔ تہ خانے آباد ہوئے۔ خس کی ٹٹیاں لگیں۔

اضلاع کے کمپنی باغ چنبیلی کے پھولوں سے مہکے۔ لچیوں کی کھانچیاں اتریں۔ لو چلی۔ گومتی کی ریت میں خربوزے پکے۔ ساون آیا۔ امریوں میں جھولے پڑے۔ اے لیجئے ایک سال نکل گیا۔ عمر عزیز کا ایک سال ختم ہوا۔ اب دیوالی آرہی ہے۔ کھانڈ کے کھلونوں کی ٹوکریں برآمدے میں لاکر رکھی گئی ہیں۔ نرملا اپنے گھر کے آنگن میں رنگوں سے نقش و نگار بنانے میں جٹی ہے۔

طاعت پچھلے برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر لوٹ لگاتی رہی۔ یہاں سے باغ کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان کی تیز نیلاہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ نیلاہٹ، جو دور نیچے جا کر درختوں کی ہریالی میں کھو گئی تھی اور شفاف سناٹا سارے میں پھیلا تھا۔ برابر کی کوٹھی میں مسز ٹیگور کے یہاں طبلہ بج رہا تھا۔ اندر شاید بھیا صاحب وائلن بجا رہے تھے۔ اس نے زمین پر کان رکھ دیا۔ یا جوج ماجوج کی طرح میں زمین پر کان بچھائے لیٹی ہوں۔ ٹھنڈک۔ سکون (جو سارا ناتھ کے مندر میں بھی ملا تھا) یا جوج ماجوج تھے۔ یا کون تھے؟ بہر حال۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کھٹ میٹھی تیتیا گھاس توڑی اور آرام سے اسے چباتی رہی۔ گملے، جو سیندوری رنگ میں رنگے گئے تھے، ان میں صبح پانی پڑا تھا اور اس کی وجہ سے ان کا رنگ بہہ کر نیچے آگیا تھا۔

ایک سال نکل گیا۔ بھیا صاحب یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور اب مقابلوں کی تیاری کر رہے تھے۔ کمال اور ہری شنکر ایم۔ اے۔ فائنل میں آگئے تھے۔ اپی نے بی۔ اے کر لیا تھا۔ طاعت اور نرملا خود اب سیکنڈ ایر میں تھیں۔ بھیا صاحب کچھ سڑی ہو گئے تھے کیا۔ یہ چمپا باجی سے عشق کر رہے تھے اور وہ بھی ان کو پسند کرتی

تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتی تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتے منہ نہ تھکتا' وہ لوگ طلعت سے کہتے: جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تم کو احساس ہوگا کہ چمپا کیسی عجیب و غریب ہستی ہیں۔ اچھا بھائی ہوں گی۔

اپی کی ان سے اب بھی ویسی ہی ملاقات تھی۔ اپی بڑی وضعدار آدمی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملتیں۔ ان کا بہت بڑا دل تھا۔ زیادہ عجیب و غریب اور قابل قدر ہستی کون تھا۔ اپی یا چمپا' جی ______؟ مگر یہ ان لوگوں کو کون بتانے جائے۔ میں نے یہ حساب لگایا ہے' طلعت نے سوچا کہ زیادہ یہ بس ہے ساری بات یہ سوچ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ گویا حسن کی اتنی بھارت قیمت لوگوں نے لگا رکھی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس نے اور کھٹ مٹھیا گھاس توڑی اور اسے چبانے میں مصروف رہی۔

کمال وو ہیرہ دون کی ایک سڑک پر منہ لٹکائے چلا گیا' وہ حسب معمول دیوالی کی چھٹیوں میں چکر پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے پرانے لا مارٹینئر کالج کا ایک جواں سال انگریز پروفیسر' جو چند سال قبل اوکسفرڈ سے آیا تھا' سادھو ہو کر گھر سے نکل بھاگا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے کمال کو بھیجا گیا تھا' کیونکہ کمال اس کا پسندیدہ شاگرد رہ شکا تھا۔ اس نے ہری شنکر کے ساتھ ہردوار کی ساری گپھائیں چھان ماریں' چکراتا اور رشی کیش اور ہری کی پوڑی کے مندر' ہمالیہ کی پہاڑیوں کو خوب کھوجا۔ تب ایک روز جوگ مایا کے ایک مندر کے پاس پروفیسر صاحب اسے مل گئے اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ بھائی' اب کہ میں جنجال سے نکل

آیا ہوں‘ مجھے واپس مت لے جاؤ‘ مجھ پر رحم کرو میاں۔ میں بہت مزے میں ہوں اور کمال نے کہا: ’’لکھنو میں افواہ ہے کہ یہ پبلسٹی حاصل کرنے کا ایک ریکٹ چلایا ہے آپ نے ـــــــ‘‘

’’بھائی‘‘ وہ ہاتھ جوڑے مصر رہے ’’خدا کے لیے چلے جاؤ بھائی۔‘‘ اور اس کے بعد برہمنوں کی طرح زور سے کھنکھارتے ہوئے‘ اپنا گیروا لباس سنبھالتے ‘ایک چشمے کو پھلانگ کر جنگل غائب ہو گئے تھے۔ اب کمال منہ لٹکائے موہنی روڈ پر چل رہا تھا۔ ہری شنکر حسب معمول اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

’’یار! ہری شنکر۔‘‘ کملا نے کہا۔

’’ہاں یار۔‘‘

’’یار یہ پروفیسر ـــــــ ہملٹن ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں‘ خدا کی قسم‘ اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہا۔

’’آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے‘‘ چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

’’ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے۔ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔‘‘ کمال نے کہا۔

’’ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوای کس قدر افسوسناک طور پر sloppy ہے۔

ذرا یہ نام پڑھنا ——— ''

''خوابستان' ——— لاحول ولاقوۃ''

''مگر تم خود بھی 'گلفشاں' اور 'خیابان' میں رہتے ہو۔''

''جانتا ہوں۔''

''یار کمال۔''

''ہاں یار۔''

''ذرا سوچو۔ لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔''

''ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔''

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ایک صحیح الدماغ انسان' سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔

''اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔''

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے۔ ''بستر ن'' ''دولت خانہ'' ''شیم روک'' ''آشیانہ'' ''راج محل۔'' کمال کے والد کا مکان خیابان بھی سامنے موجود تھا۔

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کے درختوں کی مہک سارے میں اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے

رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا بہتا چلا جا رہا تھا۔

چمپا احمد نے نشاط محل ہوسٹل کے سیج ڈرائنگ روم میں آ کر روشنی جلائی اور کتاب کھول کر اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تہمینہ رضا گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھی رہام اوتار کو ہندی پڑھاتی رہی۔

انگریز سادھو اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے ہماوت کے جنگل میں ایک چٹان پر پڑا سو رہا تھا۔

۴۵

دو سال اور نکل گئے۔ اگست ۴۲ء کا اندولن بھی پرانی بات ہو چکی۔ پنڈت جی اور مولانا اور سارے نیتا قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ سارے میں برطانوی اور امریکن سپاہی گھومتے نظر آتے تھے۔ حضرت گنج میں اینگلو انڈین و یک آئی لڑکیوں کے پرے ٹہلتے۔ دنیا کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا۔ دیواروں پر سے 'کوئٹ انڈیا' کے الفاظ مٹتے جا رہے تھے۔ سوسائٹی میں ہر طرف فوجی نظر آتے۔

گلفشاں کے سید عامر رضا نے بھی امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام ہونے کے بعد نیوی میں کمیشن لے لیا۔ تہمینہ ایم۔ اے۔ فائنل میں آ چکی تھی۔ چمپا ایم۔ اے۔ پریویس میں تھی اور کیلاش ہوسٹل میں رہتی تھی۔ طلعت اور نرملا بڑے دھوم

دھام کی انڈر گریجویٹ طالبات تھیں۔ چمپا بھی اب عرصے سے اس ہجوم میں موجود تھی جو شہر کا فیشن ایبل اسمارٹ انٹلکچول سٹ کہلاتا تھا۔ اس ہجوم میں غفران منزل کی رخشندہ اور کنور پی چو اور گنی کول اور کرن بہادر کا تجو

اور اکرم دملیشور اور فیض آباد روڈ کی میر انالنی راجونش اور ارون راجونش اور فواد اور راحل بلگرامی اور علی اور ایلمر ریکسٹن سبھی شامل تھے۔ پھر گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کے افراد۔ چاند باغ اور یونیورسٹی۔ اتنے بہت سے نام' اتنے بہت سے چہرے۔ ان سب لوگوں کی بہت بڑی جتھے بندی تھی۔ چوروں کا ذہنی باورچی خانہ۔ بلیک' سفید چہروں کا سمندر چاروں اور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ان سب کے درمیان ان سب سے گھری ہوئی وہ تنہا کھڑی تھی' کیونکہ آخری تجربے میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالکل' قطعاً تنہا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاروں طرف انسانوں سے مختلف قسم کے ایکویشن قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

جب یہ ایکویشن غلط ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہم بے حد معمولی ہیں۔ یہی بات چمپا نے دفعتاً سید عامر رضا سے' جو بھیا صاحب کہلاتے تھے' کہی۔

اس روز بھیا صاحب مدراس کے لئے روانہ ہونے والے تھے' وہ اس سے ملنے کیلاش آئے' وہ اس وقت لائبریری جا رہی تھی۔ اپنی سائیکل ہاتھ میں لے کر وہ ان کے ساتھ ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا: ''میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں اور شکر ہے کہ مجھے فرار کا موقع مل گیا۔ میرا تبادلہ مدارس کا ہو گیا ہے ـــــ تم ـــــ تم مجھ سے شادی کر کے میرے ہمراہ چلنے کو تیار

ہو۔؟‘‘

بھیا صاحب ایک تو یوں بے حد حسین وجمیل تھے‘نیوی میں شمولیت نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔گویا چارلس بوائیر کو یونیفارم پہنا دیجیے۔

چمپا کا چہرہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت سرخ ہو گیا۔یہ ایک بہت اہم بات تھی جو اس نے سنی۔ایک آدمی اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے لیے مدعو کر رہا تھا اور وہ اس آدمی کو بے حد پسند کرتی تھی۔

مگر اس نے کہا:’’کمال ہے____ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم تو نہ آئی ہو گی۔‘‘

’’پھر تم نے مجھے باغ کے راستے پر کیوں چلایا تھا۔‘‘انہوں نے غصے سے کہا۔

’’میں نے آپ کو کسی باغ باغ کے راستے پر نہیں چلایا۔‘‘

’’تم ایمانداری سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ میں دلچسپی نہیں لی۔یہ جانتے ہوئے کہ تمہاری دوست تہمینہ سے میری شادی ہونے والی ہے۔‘‘

وہ خاموش ہو گئی۔یہ بالکل صحیح تھا۔تب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا اس میں بڑی خامیاں ہیں۔اصول اور بلند خیالات اور فلسفے علیحدہ چیز ہیں اور ہم اصل زندگی میں اپنے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔خالص فلسفے اور اخلاق کے اصولوں کا جذبات اور امپلسز سے کوئی ایکولیشن نہیں۔ہم درحقیقت بے حد کمزور ہیں۔

بھیا صاحب نے گویا اس کے خیالات پڑھ لیے۔’’تم بھی بے حد معمولی نکلیں۔‘‘انہوں نے کہا۔

''میں نے غیر معمولی ہونے کا کس روز دعویٰ کیا تھا۔'' اب وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک تک پہنچ چکے تھے جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ ''ٹھہریے آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چلے آ رہے ہیں۔ مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیے۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

''گھر تو ہم میں کسی کا بھی کہیں نہیں ہے۔'' چمپا نے اکتا کر کہا۔ ''اب میں اس سے آپ سے فلسفہ نہیں چھانٹنا چاہتی۔ آپ کا مکان موجود ہے' جو گلفشاں کہلاتا ہے۔ لاحول ولا۔ کس قدر بوگس بوگس نام ہے ____ اور وہاں تہمینہ موجود ہے۔ واپس جائیے۔''

''تم بے حد معمولی ہو اور عام عورتوں کی طرح مجھ سے لڑ رہی ہو۔ تمہارے سارے ردعمل بہت معمولی ہیں۔ تم بھی بالآخر ٹائپ پر لوٹ گئیں ____ تمہارے جیسی ہزاروں لڑکیاں دنیا میں موجود ہیں۔ تم نے پہلے مجھ سے فلرٹ کیا اور اب آگے ساتھ دینے کی ہمت نہیں۔ حد ہے۔ ____''

''عام مردوں کی طرح آپ بھی مجھ سے جھگڑ رہے ہیں!'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لہٰذا یہ نظریہ ثابت ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی دیوی دیوتا کا درجہ نہیں رکھتا۔ خدا حافظ' وہ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے ٹگور لائبریری کی سمت روانہ ہو گئی۔

''گلفشاں پہنچ کر بھیا صاحب تندہی سے پیکنگ میں مصروف ہو گئے۔ اسی روز تہمینہ ایم اے کا آخری پرچہ کر کے یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سارے دن گھر میں کھچڑیاں پکتی رہی تھیں۔ بڑی بٹیا نے تعلیم ختم کر لی۔ بھیا صاحب نیوی کے افسر

بن گئے' اب پوسٹنگ پر جا رہے ہیں' اب آخر بیاہ میں کیا دیر ہے۔ لوگو یہ بڑا اندھیر ہے' خالہ بیگم نے کہا' کہ لڑکی اور لڑکا گھر میں موجود' ٹھیکرے کی مانگ' اور شادی کا کوئی نام نہیں لیتا۔ اسی کو کل جگ کہت ہیں۔''

رات کو بھیا صاحب خاموشی سے موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گنگا دین بھی نظروں سے اتر گیا۔ نوکر چاکر اسے غصے سے دیکھتے۔ بے مروت تھے دنوں جنے ____ حسینی کی بی بی نے زردہ چھانکتے ہوئے سوسن سے کہا اور اپنی لڑکی کی چٹیاں گوندھنے لگیں۔ (ارے کمبخت نچلی بیٹھ۔ انہوں نے لڑکی کو ایک چانٹا رسید کیا۔ لڑکی زور زور سے رونے لگی۔)

سارے گھر پر بدمزاجی کا دورہ پڑ گیا۔ نواب تقی رضا بہادر نے اپنی بی بی سے کہا ____ اور بناؤ صاحبزادے کو اپنا بیٹا اور کرو لاڈ۔ زمانے کا خون سفید ہو گیا ہے۔ دنیا یہی کہے گی کہ لڑکی ہی میں کوئی خامی رہی ہو گی جب بچپنے کے منگیتر نے چھوڑ دیا۔

کمال اور ہری شنکر' تہمینہ کے سامنے جاتے ہوئے کتراتے۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا بنارس لوٹ گئی۔ اب حسب معمول پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنا۔ سارے گھر والے نینی تال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہری شنکر کو اپنے بردکھوے کے لیے مرزا پور جانا تھا۔ اس کے آج دھڑا دھڑ پیغام آ رہے تھے۔ کمال اپنی پھوپھی کی دعوت پر مسوری چلا گیا۔

جولائی میں پھر سب لوگ پہاڑوں سے اترنا شروع ہوئے۔ گلفشاں' کے دروازے کھلے۔ پروائی میں باغ کے پودے سرسرائے کہ ایک روز اچانک بھیا

صاحب آن پہنچے۔ تین دن وہ گلفشاں میں ٹھہرے اور تینوں دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ اماں بیگم کے کمرے میں گئے۔

''مبارک ہو۔ آپ کی بیٹا ایم۔ اے پاس ہو گئیں۔'' انہوں نے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

اماں بیگم خاموش رہیں۔

''میرا خیال ہے اب آپ کو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔''

''کس سے؟'' اماں بیگم نے زرا تلخی سے پوچھا۔

''مجھ سے' اور کس سے؟'' انہوں نے بھی اسی تلخی سے جواب دیا۔

''تم کو میاں شرم تو نہ آتی ہوگی اب یہ کہتے۔ چچا کی بیٹی کو چھوڑ کر غیر لڑکی کے چکر میں پڑ گئے۔ ہم جدھر جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔''

''یہ آپ نے کس طرح طے کر لیا کہ میں اپنے فرض سے غافل ہوں۔ میں پال پوس کر اس گھر میں اسی لیے پروان چڑھایا گیا ہوں کہ تہمینہ بیگم کا شوہر کہلاؤں۔ اب میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں کہ آپ کی بیٹا کو جل دے جاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

سوسن نے جا کر تہمینہ سے کہا: ''بیٹا ـــــــ ہم تو امام باندی کو بلانے جا رہے ہیں' گانے کے لیے۔ کچھ سنا نہیں آپ نے' آپ کا بیاہ ہو رہا ہے۔''

''سوسن ـــــــ تم جا کر سب لوگوں سے کہہ دو کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں ہرگز ہرگز بھیا صاحب سے بیاہ نہ کروں گی۔''

اتنا کہہ کر تہمینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سوسن ہکا بکا رہ گئی۔

گھر میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف فون اور ٹرنک کال ہوئے۔ کمال کو مسوری تار دیا گیا کہ وہ بہن کو آ کر سمجھائے۔ ہر شخص نے اپنے بھر تہمینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تم لڑکی ہو۔ ایم اے۔ پاس ہو تو کیا ہوا؟ اور بڑے گھر کی بٹیا ہو تو کیا ہوا؟ ہو تو لڑکی۔ شادی کر لو۔ اس کے بغیر گزر نہیں۔ رشتے ناطے کے معاملات میں ایسی اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر تہمینہ نے ایک نہ کے بعد ہاں کر کے ہی نہ دی' گو خالص لڑکیوں والے انداز میں وہ رات رات بھر رویا کرتی۔

چمپا بھی واپس آ چکی تھی۔ یہ اس کا کیتھگ کالج میں آخری سال تھا۔

کمال نے مسوری سے آ کر گھر کا یہ نقشہ دیکھا' پھر وہ چمپا سے ملنے کیلاش گیا' وہاں معلوم ہوا کہ چمپا ابھی اپنے ماموں کے یہاں ہیں' اگلے ہفتے ہوسٹل آئیں گی۔ چمپا کے یہاں پہنچا تو وہاں بھیا صاحب سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ پتا نہیں وہ چمپا سے اب کیا کہنے گئے تھے' وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اسی روز وہ مدارس کے لیے روانہ ہوئے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر نارمل پر آ گئے۔ تہمینہ کے سامنے بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے وقت کا کیا کرے؟ لڑکیوں کے لیے ملازمت کی کوئی راہیں نہیں تھیں سوائے ایک محکمہ تعلیم کے۔ تنگ آ کر اس نے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور قانون پڑھنے لگی۔ چمپا اسی طرح اس کے گروہ میں شامل رہی۔ ان دونوں لڑکیوں نے نہایت رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنی دوستی نبھائی۔ کبھی بھولے سے بھی بھیا صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتی رہیں کہ بہت سنجیدہ اور

باوقار خواتین ہیں۔ کوئی کل کی لونڈیاں ہیں کہ جذبات کے چھچھورے پن میں مبتلا ہوں!

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وقتی طور پر جو باتیں ہم کو قیامت معلوم ہوتی ہیں وقت گزر جانے کے بعد خیال آتا ہے ہم کس قدر بیوقوف تھے کہ یوں مضطرب ہوئے۔

۴۶

قحط کی ریلیف ورک کے سلسلے میں کمال کلکتے جانے والا تھا کہ اسے جیجا جی کا خط ملا۔ لاج کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا' وہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی دلی میں تھی جہاں جیجا جی گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی محکمے میں انڈر سیکرٹری تھے۔ اب نرملا کی شادی کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ جیجا جی نے لکھا تھا: تم کلکتے جا رہے ہو۔ سردیپ نرائن کا لڑکا گوتم بھی آج کل وہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ارادہ ہے کہ نرمل کی بات بھیجی جائے' وہ بھی تمہارے بنگال ریلیف اور اپٹا وپٹا کے چکر ہی میں وہاں گیا ہوا ہے یا شاید وشوا بھاریت میں کچھ کر رہا ہے۔ بہر حال تم ذرا اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا کہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ کچھ سنجیدگی بھی ہے مزاج میں یا تم سب کی طرف خالی بوہیمین ہی ہے۔

کمال نے خط جیب میں رکھ لیا۔ کمال کے آدمی ہیں جیجا جی بھی۔ انسان دیس میں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں' ملک تباہی کی اور جا رہا ہے' یہ شادی بیاہ کے قصے

لے کر بیٹھے ہیں۔ (وہ بڑا جوشیلا اسٹوڈنٹ ورکر تھا اور تہمینہ اور بھیا صاحب کے قصے کے بعد سے شادی کے مسئلے سے شدت سے بور ہو چکا تھا) میں کلکتے میں قحط زدہ انسانوں کی لاشیں اٹھاؤں گا یا نرمل صاحبہ کے لیے دولہا تلاش کرتا پھروں گا' اس نے جھنجھلا کر طاعت سے کہا' مگر بہر حال فرض کے طور پر اس نے ان صاحبزادے کا پتا نوٹ کرلیا جو چیاجی نے خط میں لکھا تھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے۔ راستہ بھر یہ لوگ ٹیگور اور نذرالاسلام کے دلولہ انگیز گانے گاتے گئے۔ ٹرین کی کھڑکی میں سے وہ وطن کے لہلہاتے کھیت دیکھتا رہا اور سوچا کیا۔ یہ میرا **ملک** ہے ____ یہ میرا **ملک** ہے ____ وطنیت اور انقلابیت اور قومی جوش اور برطانوی حکومت کے خلاف غم و غصے کے جذبات نے اس کے دل میں ایک عجیب وغریب کیفیت پیدا کر دی۔ اسی روز کے اخبار میں ایک بنگالی آرٹسٹ زین العابدین کے بنائے ہوئے قحط کے مناظر کے اسکیچ چھپے تھے۔ رکھا نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ کمال نے نظریں اٹھا کر ریکھا کو دیکھا' وہ رو رہی تھی۔

سب نے مل کر پھر گانا شروع کر دیا: یہ جنگ ہے جنگ آزادی ____ آزادی کے پرچم کے تلے ____ ہم ہند کے رہنے والوں کی ____ ریل کی چھک چھک گیت کی ہم آہنگ معلوم ہوئی۔ دوسرے کونے میں چند لڑکے زور زور سے بحث کر رہے تھے۔

کمال نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کی۔ اس کے رفقاء اسی طرح بحثیں کرتے رہے ____ ٹرین بہار کے سرسبز علاقوں سے گزرتی بنگال میں

داخل ہوگئی۔

گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت ضلعے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ لڑکوں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔ چاروں اور تالاب تھے' اور سبزہ زار' اور بانس کے جھنڈ۔ دور سورج گنگا کی لہروں میں غروب ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر دو پالکیاں کھڑی تھیں۔ پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کا مجمع تھا جو چاول کی تلاش میں کلکتے جانے کے لیے ٹرین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف مقابل میں فوجیوں کی ٹرین کھڑی تھی۔ سکھ اور پنجابی سپاہی' جو برما جا رہے تھے' اردو کے فلمی رسالے ہاتھ میں لیے ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

ایک ہندوستانی میجر صاحب اپنی بیگم صاحب اور دو بل ٹیریر کتوں کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے کھڑے ایک انگریز کرنل سے مصروف گفتگو تھے۔

''جب تک یہ فوجی ٹرین نہ چلی جائے آپ کی گاڑ روانہ نہیں ہوگی۔'' ایک گارڈ نے کمال کو بتایا۔

''اس کا مطلب ہے۔''

''جی ہاں۔ کوئی چار پانچ گھنٹے لیٹ ہوگی آپ کی یہ ٹرین۔ یہ وار ٹائم ہے جناب۔''

لڑکے اور لڑکیاں پلیٹ فارم پر اتر آئے۔

اردھو گوگو نے بوجے مادول۔ انہوں نے نذرالسلام کا ایک اور گیت شروع کر دیا ـــــ میجر صاحب کی بیگم صاحبہ دلچسپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگیں۔

''یہ کون لوگ ہیں۔ کتنی پیاری آواز ہے سب کی ــــــ''

''کمیونسٹ ہیں سالے ــــــ''میجر صاحب نے منہ پھیر کر جواب دیا۔''چلو۔ کرنل ہمیں ریسٹوران کار میں مدعو کر گیا ہے۔''

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ریستوراں کار کی سمت چلے گئے۔

کمال اور اس کے ساتھ اب گاتے گاتے بھی تھک گئے۔ ٹرین چلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

یکا یک ریکھا چیخ کر ایک طرف دوڑی۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ پلیٹ فارم کے سرے پر کسانوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ سہا اور سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان، جس کی چھوٹی سی چھدری سیاہ داڑھی تھی، مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی بیوی ایک سانولی سلونی دبلی پتلی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کے دنوں بچے، جن میں سے لڑکے کی عمر نو سال کی تھی، ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔

''کمال ــــــ''نریندر نے آواز دی ــــــ''ادھر آؤ ــــــ ہمارا لاشیں اٹھانے کا کام تو میاں یہیں سے شروع ہو گیا۔''

سسکیوں کے درمیاں اس نے بنگالی میں بتایا کہ وہ اور اس کا میاں ابو المونشور رزق ڈھونڈنے کلکتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آمنہ بی بی نے بھی ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوجیوں کے ٹرین میں سے پھینکے ہوئے دو بسکٹ اور توس کے چند ٹکڑے جو اس نے جمع کیے تھے وہ اپنے بچوں کو کھلا چکی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ بھی پلیٹ فارم پر لیٹ گئی اور ان سب کے سامنے اس نے بھی دم توڑ دیا۔

اینگلوانڈین اسٹیشن ماسٹر ان کی طرف آیا: ''آپ لوگ ادھر کیا گڑ بڑ مچاتا ہے۔ آج کل روز سو پچاس آدمی پلیٹ فارم پر مرتا ہے۔ ہم کس کس کا فکر کرے۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہے اسپتال نہیں۔ یہ بنگالی ہمیشہ کا بھوکا ہے۔ بھوکا بنگالی! آپ کیوں فکر کرتا ہے۔''

''یہاں قبرستان کدھر ہے؟'' نریندر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

''ہم کو معلوم نہیں _____ کیوں کیا آپ ان لوگ کا کبر کھودے گا۔ دیٹ از ویری فنی ___ !!!''

لڑکیوں نے دھاڑیں مارتے ہوئے بچوں کو ساتھ لیا اور بازاری کی طرف چل دیں _____ لڑکے قبرستان اور کسی مسلمان مولوی کی تلاش میں آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں فوجیوں کی ٹرین مہیب آوازیں نکالتی، دھواں چھوڑتی روانہ ہوئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ پاس سے گزرا جس میں سکھ میجر اور اس کی دلہن بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو لاشیں نظر نہیں آئیں کیونکہ انہوں نے کھڑکیوں کی جھلملیاں چڑھا دی تھیں۔ فوجی ٹرین کے جانے کے چند منٹ بعد اس ٹرین کو بھی جنبش ہوئی جس میں کمال اور اس کے ساتھی سفر کر رہے تھے۔ گارڈ کمال کے پاس آیا: ''ٹرین جاتا ہے۔ آپ لوگ ادھر کیا کرنے لگا۔ آپ کا فرینڈ لوگ کدھر گیا۔''

''ہم اب کل صبح ہی جا سکیں گے۔'' کمال نے جواب دیا اور تھرڈ کلاس کے

ڈبے میں جا کر سارا سامان نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنے کے بعد لاشوں کے پاس آن بیٹھا۔ یہ ٹرین بھی چلی گئی اسٹیشن دفعتاً سنسان ہو گیا۔

پلیٹ فارم کے سر پر اندھیرا تھا۔ گارڈ بہت نیک دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لالٹین لا کر کمال کے پاس رکھ دی اور پھر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ہوائیں بانسو کے جھنڈ میں سائیں سائیں کرتی رہیں۔ کمال نے اپنے ہولڈ ال میں سے ایک چادر نکال کر لاشوں پر اڑھا دی۔ آمنہ بی بی، جس نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ابو المونشور، جس کی نیلی چارخانہ دار تہمد میں بہت سے پیوند لگے تھے، دونوں اس چادر میں چھپ گئے۔

کمال اسٹیٹس مین اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں زین العابدین کے اسکیچ دیکھنے لگا۔ اس دیس کے مصور نے کیا اسی جوڑے کی تصویر بنائی تھی؟ چند قدم پر گنگا بہہ رہی تھی۔ اس کی لہروں پر ایک اکیلا نوکا چل رہا تھا جس میں چراغ جلتا تھا اور کوئی بڑی دلدوز آواز میں بھٹیالی گاتا جا رہا تھا جس کے الفاظ کمال کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئے۔ درختوں کے پرے لارڈ کارنوالس کے عہد کی بنی ہوئی اونچے پیل پایوں اور جھلملیوں کے برآمدے والی ضلع کے کلکٹر کی عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ضلع کے سب سے بڑے ہندو زمیندار کا محل تھا جہاں ریڈیو بج رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں ہواؤں پر تیرتی ہوئی بی بی سی کے لائٹ پروگرام کی آواز یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمال کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ رابندر ناتھ اور سروجنی دیوی اور سرت چندر کا دیس تھا ناول نگاروں اور شاعروں کا محبوب موضوع۔

ہم سب مختلف قسم کی کتابوں کا موضوع ہیں۔تاریخ کے ابواب' الفاظ' اعداد و شمار' رپورٹیں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تقاریر۔کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو۔پچھلے ہفتے ڈاکٹر اشرف کہہ رہے تھے کہ قوموں کی خود مختاری کا مطالبہ دین لینن کے نظریوں کے مطابق ہے۔پاکستان_____ تو کیا جو مسلمان ہے وہ آٹو میٹک طور پر پاکستان ہو جائے گا _____یا کیا ہوگا_____ لینن' اسٹالین 'گورکی' ڈاکٹر اشرف' سجاد ظہیر' جناح صاحب' مہاتما گاندھی' پنڈت جی_____۔

کمال کے دماغ میں واقعات اور ناموں اور شخصیتوں کا جلوس منڈلایا کیا لیکن ساری دنیا کا مرکز اس وقت یہ دو لاشیں تھیں۔سارے واقعات اور نظریوں کے سلسلے کی کڑی آ کر اس مرکز پر ٹوٹ جاتی تھی۔ آمنہ بی بی اور ابوالمونشور_____ دو لاشیں۔

دوسرے روز صبح وہ سب پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔شام کو ٹرین ہوڑہ پہنچی۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔پرمود کمار کا گھر ان سب کا مستقر تھا جہاں ان سب کو دوسرے روز جمع ہونا تھا۔کمال چیت پور روڈ کی طرف چلا جہاں اس کے ایک ماموں ''مٹیا برج والے نواب'' رہتے تھے۔

٤٧

چیت پور روڈ کے ایک مکان کے پھاٹک کے سامنے ایک بند گاڑی آن کر رکی۔اس مکان کا طرز تعمیر کمپنی کے عہد کا تھا جس طرح کے مکان جا بجا کلکتے میں

نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پیل پائے۔ چوڑا برآمدہ۔ برآمدے اور دروازوں پر وینشین جھلملیاں۔ اندر کمروں میں مرصع سنہری فریموں میں انگریزی مناظر لگے تھے۔ کشمیری کڑھت کے پردے دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے گملوں میں چینی پام سجا تھا۔ باہر باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بیلا مہک رہا تھا۔

اوپر کی منزل سے لڑکیوں نے آواز لگائی: ''ارے کمن بھیا آگئے لکھنو سے۔'' سارے گھر میں شور مچ گیا۔ نوکرانیاں اور نوکر باہر دوڑے۔ نیچے برآمدے میں فرن کے پتے جھوم رہے تھے۔ نواب صاحب بھانجے کے استقبال کے لیے آرام کرسی سے اٹھے۔

یہ مکان پچاس پچپن سال قبل دت خاندان سے مٹیا برج والے نواب کمال رضا بہادر کے چھوٹے بہنوئی نے خرید لیا تھا۔ اس مکان میں ایک زمانے میں بڑی دھوم دھام سے برہمو سماج کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اب تک دت خاندان کے افراد کی دھندلی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ گروپ فوٹو گراف جس میں مہارشی ہارمونیم پر بھجن گاتے تھے۔ مالک مکان بابو منورنجن دت کے انتقال کے بعد، جو کیننگ کالج لکھنو میں پروفیسر تھے، ان کی اولاد نے یہ مکان فروخت کر کے بالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنوالی تھی۔ ان کی اولاد میں اب کئی آئی سی ایس افسر تھے۔ کئی کمیونسٹ لیڈر۔ ان کی لڑکیاں زیادہ تر یورپ میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بابو منورنجن دت کی ایک پوتی کی شادی اڑیسہ ایک مہاراجہ سے ہوئی تھی۔ موجودہ مالک مکان اور دت خاندان کی کئی پشتوں کی دوستی تھی۔

موجودہ مالک مکان لکھنو کے اجڑے ہوئے نواب تھے۔ وثیقہ پاتے تھے اور

کلکتے میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کا مشغلہ زندہ رہنا تھا۔

نواب کمال رضا بہادر سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمراہ مٹیا برج آئے تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب علی رضا بہادر ان کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں اور چچا زاد بھائی تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر کا کلکتہ بے حد موڈرن شہر تھا جس میں ان گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اور پریس اور اخبار۔ نئے بنگالی ناولوں میں ہندو تہذیب کی تجدید کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ راجہ سریندر موہن ٹیگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ سوامی وویکانند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں ویدانت فلسفے کا پرچار کر رہے تھے۔ ملک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس بدرالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی مگر نواب علی رضا بہادر کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کھل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سوشل تعلقات مرشد آباد اور ڈھاکے اور عظیم آباد کے نواب خاندانوں تک محدود رہے۔ ان کی اولاد اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنو اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں میں ہوا کیں۔ لکھنو میں یہ لوگ کلکتے والے نوب کہلاتے تھے۔ کلکتے میں انہیں لکھنو والے کہاں جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے: کلکتہ، پٹنہ (عظیم آباد) اور لکھنو۔ اس سے آگے کی دنیا کی انہیں خبر نہیں تھی۔ ان کا سارا وقت لکھنو، دلی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھونک میں صرف ہوتا تھا۔ وثیقے کی آمدنی کا درجہ سے بے فکری سے گزر رہوتی تھی۔ سر پر

برطانیہ کا سایہ سلامت تھا راوی چین لکھتا تھا۔

تب ان کے خاندان میں پہلی مرتبہ ایک عجیب بات ہوئی۔ نواب علی رضا کے داماد، جو لکھنو میں رہتے تھے، سر سید کی نیچری فوج میں جا شامل ہوئے اور انہوں نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڑھ بھیج دیا۔

نواب علی رضا کے دوسرے داماد پٹنے کے رہنے والے تھے، وہ بھی بے حد روشن خیال نکلے۔ پٹنے میں قانون کا بہت چرچا تھا۔ ان گنت ہندو مسلمان قانون پڑھ پڑھ کر بیرسٹر بن رہے تھے اور بڑا نام اس پیشے میں انہوں نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی رضا کے پٹنے والے نواسے کو بھی اتنا پڑھایا گیا کہ وہ بہت زیادہ پڑھ گئے اور بیرسٹری کے لیے ولایت چلے گئے۔ یہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو انیسویں صدی کے آخر میں ولایت گئے۔

نواب علی رضا کے لکھنو والے داماد انگریزی تعلیم کے تو قائل ہوئے ہی تھے، اب وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ سر سید مسلمانوں کو علیحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے انگریزوں کا وفادار رکھنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر ان کا سر سید سے اختلاف ہو گیا، وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ اب ان کے یہاں لکھنو کے گولہ گنج والے مکان میں لالہ بھائیوں کا مجمع رہتا۔ یہ سب لوگ ابھی گورنمنٹ کے وفادار بھی تھے اور صرف سیاسی مراعات اور سوشل ریفارم چاہتے تھے۔ ان گنت مسلمان اس تحریک میں شامل تھے۔

ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا بنتا جا رہا تھا۔ ہندو، جو سوا سو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا، اپنے گنجلک مابعد

الطبیعیاتی ذہن اور خالص تجریدی فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں فارسی پڑھ کر حکومت کے نظم ونسق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکمران اور صوبے دار صرف فرمانوں پر دستخط کر دیتے تھے۔ وہی ایڈمنسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آئی' تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور مغلوں کا کاستھ منشی پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلے سو سال سے ہندو اپنی ذات پات کے بندھنوں اور اپنے پراچین فلسفے کے باوجود مغربی تعلیم اور سائنٹیفک نظریہ فکر کے قریب تر ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے مغرب کے فلسفے کا اثر کانہوں نے قبول کیا۔ جب قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی' اس کا تدارک کرنے کے لئے انگریزی حکومت نے فوراً ملک کے پس ماندہ طبقوں کو' جنہیں ۵۷ء کے بعد ہر طرح سے کچلا گیا تھا' اب اپنی عنایات سے نوازنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے یہاں ایک بورژوازی بھی پیدا ہو چکی تھی جو لیڈر شپ اور لبرل سیاست کے لیے تیار تھی۔ مسلمان ابھی فیوڈل اسٹیج سے آگے نہ نکلے تھے۔ ان کے ذہن میں اب تک شہنشاہیت کے تصور موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی اپنی بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس کا جذباتی نعم البدل انہوں نے سلطان ترکی سے محبت میں ڈھونڈا' وہ ان کا خلیفہ تھا جو قسطنطنیہ میں رہتا تھا' پھر حیدر آباد دکن کے نظام سے ان کو عقیدت تھی کیونکہ اس گئے گزرے زمانے میں ایک اتنی بڑی ریاست کا مسلمان فرمانروا تھا۔ ان کی لیڈر شپ کے لیے جب ہز ہائی نس آغا خاں اور دوسرے نوابین آئے تو مسلمان عوام کو بہت اچھا معلوم ہوا کیونکہ نام اور خطابات بہر کیف عہد رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔

انگریز اور فیوڈل طبقے کا گٹھ جوڑ بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کے عہد میں معافی کی زمینوں کی آمدنی سے مدرسے قائم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ کرلیا تھا۔ مدرسے بند ہو گئے اور مسلمان پس ماندہ رہ گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندو انگریزی پڑھ رہے تھے۔ مسلمان جاگیردار ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان صنعت کار تباہ کردیا گیا۔ اس کی جگہ دوامی بندوبست کے نئے ہندو زمینداروں اور ہندو مڈل کلاس نے لی تھی۔ طبقاتی الٹ پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورژوازی قیادت کے لیے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی ہندو مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقعے پر انگریز نے ہوا دی۔

وفادار انگریزی خواں مسلمانوں کا مڈل کلاس بننا شروع ہوا۔ مسلمان جولاہا اور کسان، جو ملک کی دھرتی پر محنت کر کے زندہ رہتا تھا، اس کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ سب کو یہی فکر تھی اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کرلی جائیں۔

پھر جنگ چھڑی اور ڈاکٹر انصاری آئے اور علی برادران اور خلافت تحریک چلی اور گاندھی آئے اور کانگریس نے علی الاعلان سوراج کا مطالبہ کیا۔ اب حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے کھادی کی تحریک اور قوم پرستی۔ ایک عجیب جوش سارے ملک پر طاری ہو گیا۔

نواب علی رضا بہادر کے داماد تقی رضا بہادر' جو تعلقے دار تھے' کھلے بندوں قومی تحریکوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لیے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جاں نثار ثابت ہوئے کیونکہ ان کے اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ کے ذریعے کسانوں پر ان کا تسلط قائم رہ سکتا تھا۔ یہ لکھنو میں نواب سر ہارکورٹ ٹیلر کا زمانہ تھا۔ اس نے تعلقہ داروں والی عادتیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ لکھنو کے تعلقہ داروں کا سنہرا دور تھا۔ ایک طرف آزادی کی آندھی چل رہی تھی دوسری طرف قیصر باغ کی بارہ دری میں دھوم کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جان عالم کے عہد کی تجدید ہوئی تھی۔ یہ مہاراجہ محمود آباد اور ٹھاکر نواب علی اور رائے راجیشور بالی کا لکھنو تھا۔

اسی زمانے میں ان کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ بیٹے نواب ابو المکارم تقی رضا بہادر کے یہاں بڑی اللہ آمین سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اپنی دادی اماں کے ماموں نواب کمال الدین علی رضا بہادر کے نام پر کمال رکھا گیا۔

کمال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا جب وہ گھر میں بڑوں سے سیاست کے تذکرے سنتا۔ نواب ابو المکارم کا خاندان اب اگلے وقتوں کا جیسا نہیں تھا۔ اب اس گھرانے کے افراد سرکاری ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑے چچا میاں یعنی بھیا صاحب کے والد بیرسٹر تھے اور کانگریسی لیڈر، مگر ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ پٹنے والے ماموں بھی کانگریسی تھے اور آئے دن جیل جاتے رہتے تھے۔ کمال کو ترک موالات کا زمانہ یاد تھا جب پٹنے والے ماموں اسے اپنے

ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور وہ بڑے جوش و خروش سے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی توتلی زبان میں قومی نظمیں پڑھتا اور پولیس آ کر لاٹھی چارج سے جلسے کو منتشر کر دیتی۔ سیاست اب محض اخباروں تک محدود نہیں تھی' روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سا محسوس ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کرنے کا عنصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے۔ ہم وہ تھے۔ اسی قسم کی تقریریں لیڈر کر رہے تھے۔ سیلرز سوٹ کے بجائے پٹنے والی ممانی نے اس کے لیے کھادی کی شیروانی بنوائی۔ اس کے کزن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے۔ اس نے بھی ضد کی کہ اسے دلی بھیج دیا جائے مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔ بہر حال کرنل براونز ڈیرہ دون اور لا مارٹینیر لکھنؤ کے برطانوی لڑکوں کے مقابلے میں وہ ہندوستانی تھا اور ہندوستان اس کا بہت پیارا وطن تھا۔

یہ ہندوستان کیا تھا؟ اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا' جہاں اس کے پرکھ پچھلے سات آٹھ سو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں سرسوں کے کھیت تھے اور رہٹ اور سیتلا دیوی کے مندر۔ ہندوستان بستی ضلع کا وہ مٹھ تھا جہاں وہ اپنے بابا کے ہمراہ گیا تھا۔ جہاں برآمدے میں تخت پر ایک موٹا بی۔ اے پاس مہنت بیٹھا تھا اور جس کو ممی نے دس کا نوٹ چڑھایا تھا اور جس نے آشیرباد دی تھی۔ ہندوستان اناوے کی وہ کائی آلود درگاہ تھی جس کی منڈیروں پر بہت سے قلندر اکڑوں بیٹھے رہتے تھے جن میں سے ایک نے کمال کو بوڑل کے سنترے کھلائے

تھے۔ ہندوستان قدیر ڈرائیور کی بوڑھی ماں تھی جو پیلے رنگ کی دھوتی پہنے مرزاپور کے اسٹیشن پر کمال کے لیے مٹی کے کھلونے لے کر آئی تھی۔ ہندوستان سول لائنز کی وہ سڑکیں تھیں جن پر صاحب لوگوں کے ڈوگ بوائیز شام کو کتوں کو ہوا کھلانے کے لیے نکلتے تھے۔ ہندوستان بوڑھا حاجی بشارت حسین خانساماں تھا جو جب کمال کو سیتلا نکلی تھی تو' اپنی دوپلی ٹوپی اتار کر ایک ٹانگ پر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور گڑ گڑا کر بولا تھا۔

''ماتا ــــ اب معاف کرو ــــ بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ ــــ ماتا تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

یہ ــــ سوتیلا کے سامنے ہاتھ جوڑنے والا مسلمان بوڑھا ــــ ہندوستان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اماں اور خالائیں اور گھر کی دوسری بیبیاں بھی ہندوستان تھیں۔ ان کی آپس کی بول چال' محاورے' گیت' رسمیں اور پھر پرانی کہانیاں' جو مغلانیاں سناتی تھیں: جودھیا کے راجہ دسرتھ کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا کیکی' دوسری کا کوشیلیا ــــ ہندو پرانوں اور دیو مالا کے قصے' مسلمان اولیا کے قصے' مغل بادشاہوں کے قصے۔ یہ سب کمال کی ذہنی بیک گراؤنڈ تھی۔ ایک غرور اپنے ماضی پر' ایک تاسف اپنے حال پر' ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق ــــ ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ گاندھی' جو دھوتی باندھے گھومتے تھے اور ملک کے سنتوں' کبیر اور تلسی داس اور تکارام کی روایت پر پورے اترتے تھے' اس کسان کے لیے سمبل تھے جو خود بھی دھوتی

باندھے ننگا گھومتا تھا۔ نہرو اس ہندوستان کے نئی نسل کے سمبل تھے جس کی دل میں یہ سارے دریا امنڈ رہے تھے۔

اس ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے ـــــ مذہب' فلسفہ' آرٹ' رمزیت' تصوف' ادب' موسیقی ـــــ کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک طرف یہ زبردست عظیم الشان ورثہ تھا' دوسری طرف انگریزی تمدن تھا۔ صاحب لوگوں کا راج تھا۔ اسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔ انگریز لڑکے' جو کرنل براؤنز اور لامارٹینر میں اس کے ساتھ شہسواری کرتے تھے۔ انگریز افسر' جو گلفشاں میں ڈنر کھانے آتے تھے' اس کی گولہ گنج والی حویلی کی شہ نشین میں بیٹھ کر محرم کے جلوس کا نظارہ کرتے تھے۔ یہ انگریز' ہیلی بری کے افسروں کے جانشین' جن کو سکھایا گیا تھا کہ کن ہندوستانیوں کو' جب وہ تمہاری کوٹھی پر سلام کے لیے حاضر ہوں تو' برآمدے ہی میں بٹھاؤ' کن کو ڈرائنگ روم میں بلانے کی عزت بخشو' کن کو صرف کھڑے کھڑے ہی ڈالی لے کر واپس کر دو، کن کے گھر خود بھی' جب وہ مدعو کریں' تو چلے جاؤ۔ کمال اس خوش قسمت طبقے میں پیدا ہوا تھا جسے انگریزوں سے برابری سے ملنے کا فخر حاصل تھا ـــــ ہندوستان کا فیوڈل طبقہ۔

۴۴ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آئند امید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیوڈل عنصر چھایا ہوا ہے' ان کا نچلا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پس ماندہ ہے لیکن چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے اس لیے یہ لوگ ہندو لوئر مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔ پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایا دار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل

مالک شدت سے رجعت پسند ہیں' وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورت حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیوڈل عنصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں لہٰذا انہوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے۔ مڈل کلاس کی اَپَر جنیسا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سوشلسٹ تھے ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا کھلتا تھا۔ کمال اور اس کے ساتھ کی نوجوان نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجمانی کر رہے تھے۔

اس نئے باشعور ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے علاوہ ایک اور الف لیلوی دیس اسی ملک میں رہتا تھا جس کی جھلک کمال نے حیدر آباد دکن اور ریاست کشمیر اور بھوپال اور رام پور میں دیکھی تھی۔ یہ ریاستی ہندوستان تھا۔ یہاں سیاسی آزادی کے تصور کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ راجے مہاراجے برطانیہ کے فرزندان دلبند کہلاتے تھے اور کمپنی سے انیسویں صدی میں جو معاہدے انہوں نے کیے تھے ان کی بناء پر مطلق العنانی سے حکومت کرتے تھے۔ ان ریاستوں میں خصوصاً حیدر آباد دکن مسلمانوں کے لیے خاص جذباتی اہمیت کا مالک تھا۔ ہزاگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی مملکت' تہذیب' شعر و شاعری نفاست' آداب محفل وغیرہ کا

سلسلہ چونکہ ایک خاص درباری اور جاگیردارانہ ماحول میں پھلتا پھولتا ہے لہذا یہاں پر مسلمانوں کی کلچر ابھی اپنی خالص حالت میں موجود تھی۔

جاگیرداروں مڈل کلاس لیڈروں ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چاء کے باغات اور کانپور، بمبئی، کلکتے، احمد آباد اور ٹاٹا نگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے عرصے سے زرعی اصلاحات کے لیے ایجی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں، جہاں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔ پنجاب انہوں نے سکھوں کے ہاتھوں سے لیا تھا لہذا یہاں مسلمانوں کی انہوں نے ہمت افزائی کی۔ جو صوبے سب سے زیادہ عرصے سے انگریزوں کے زیرنگین تھے وہ سب سے زیادہ تباہ حال تھے ـــــ بنگال، بہار، اڑیسہ، مدارس۔ بنگال میں مستقل قحط پڑتے تھے۔ پنجاب انگریزوں کے ہاتھ میں سب سے آخری میں آیا تھا لہذا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ یہی تھا۔ یو۔ پی، جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرون اولیٰ، قرون وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ، وہیں کا کسان سب سے زیادہ مفلوک الحال تھا۔ کسان، جو کانگریس تحریک کی طرف آ رہا تھا، سمجھتا تھا کہ سوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے۔ جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی۔

شہروں میں ٹریڈ یونین قائم ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۹ئمیں حکومت نے بنگال، بمبئی، پنجاب اور یو۔ پی کے مزدور لیڈروں کو پکڑ لیا جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ میرٹھ ٹرائل شروع ہوا۔ کمیونسٹ ــــــــ یہ ایک نیا عنصر اب سیاسی منظر پر ظاہر ہوا۔ یہ زیادہ تر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے انٹلکچول تھے۔ ساری دنیا اقتصادی ڈپریشن چھایا ہوا تھا۔ ایک نئی جدوجہد بڑے پیانے پر شروع ہو چکی تھی۔ اس طبقاتی جدوجہد میں امریکہ پیش تھا۔

پھر ۳۷ء میں، جب کمال ابھی لا مارٹینر ہی میں تھا، لکھنؤ میں دو اہم واقعات ہوئے مسلم لیگ کا آل انڈیا سیشن اور کانگریس حکومت کا قیام۔

اسے اب تک یاد تھا کہ اسے بیگم شاہنواز کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا جو بہت چوڑے نقرئی بارڈر کی ساری اور لمبے لمبے بندے پہنے ڈائس پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں۔

اسی سال کانگریس نے ۳۵ء کے آئین کے نکات منظور کر کے اپنی وزارت قائم کی۔ یہ ایک نیا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی مرتبہ ملک میں قومی لیڈر حکومت کے نظم و نسق میں شامل ہوئے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ سفید ساڑی اور چینی وضع کا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے موٹر میں بیٹھی وہ کونسل چیمبر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اگلے سال جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انہوں نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔ اسی زمانے میں گومتی کے کنارے صنعتی نمائش منعقد ہوئی۔ کمال اندھیرا پڑے گلفشاں کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوتا۔ شام کے سناٹے میں ہواؤں کے ساتھ بہتی ریکارڈوں کی آوازیں اس کے کان میں پہنچتیں۔

ان میں سے ایک فلمی ریکارڈ اکثر بجتا ______

کایا ایک گھروندا ہے۔ کایا ایک گھروندا ہے ______

اسی زمانے میں کانگریس نے نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی۔ زراعت، صنعت، تعلیم، بے روزگاری وغیرہ کے لیے دس دس سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ تبھی کانگریس نے چین میڈیکل مشن بھیجا، پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان کی رائے لیے بغیر برطانیہ نے اس ملک کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ انگریزوں کی خاطر پچھلے ستر سال سے ہندوستانی فوج دوسرے ایشیائیوں سے لڑتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی افغانوں سے اور چینیوں کو مارنے کے لیے بھیجے گئے۔ عراق میں ترکوں اور عربوں سے لڑے اور اب ان کو پھر یورپین امپیریلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کانگریس حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ اب پھر گورنر کا راج شروع ہوا۔ کانگریس نے عدم تعاون کو تحریک شروع کی۔ زوال فرانس کے بعد جب اتحادیوں کی حالت بے حد خستہ ہو گئی تب کانگریس نے ایک بار پھر پیش کش کی کہ اگر مرکز میں مکمل آزاد قومی حکومت قائم کر دی جائے۔ تو وہ جنگ میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ پیش کش برطانیہ نے مسترد کی تب مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ تیس ہزار مرد اور عورتیں جیلوں میں بند کیے گئے۔ ہری شنکر اور کمال بھی جیل گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کو دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

۷/ اگست ۴۲ء کو کوئٹ انڈیا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی۔ احمد نگر فورٹ پھر آباد ہوا۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس میں پیش پیش تھے۔

دس ہزار ہندوستانی پولیس فائرنگ سے مارے گئے۔

اب بنگال میں قیادت کا سامنا تھا۔ چونتیس لاکھ انسان اب تک فاقے سے مر چکے تھے۔ چونتیس لاکھ ______ انسان __________

چونتیس لاکھ آمنہ اور ابوالمنصور ______

کمال دوسری صبح جلدی جلدی ناشتہ کرنے کے بعد چیت پور روڈ سے نکلا اور پرمودا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

۴۸

پارک سرکس میں پرمودا کے گھر پر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم، اپنا کارکن پارٹی کے افراد لکھنو والے بھی سب پہنچ چکے تھے۔

پرمودا کلکتے کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے مکان کے بڑے ہال میں بڑی سخت گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ریلیف ورک کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جو پروگرام اسٹیج کیا جانے والا تھا اس کی ریہرسل جاری تھی کونے میں ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف دو لڑکیاں ٹیگور کی چتر نگدا کے گانوں کی مشق کر رہی تھیں۔ ہال کے سرے پر شیشوں والا برآمدہ تھا۔ اس میں پرمودا کی بہن کا اسٹوڈیو تھا جو شانتی نکیتن کی آرٹسٹ تھیں۔ اسٹوڈیو میں ایک لڑکا سفید شال اوڑھے ایزل کے سامنے کھڑا ایک پورٹریٹ پر آخری ٹچ لگا رہا تھا۔ ڈرامے کے

بعد یہ تصویر بھی ریلیف فنڈ کے لیے نیلا کی جانے والی تھی۔

پرمودوا کی بہن ارونا دیدی ایک اور کینوس پر جھکی ہوئی تھیں۔

سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

برش صاف کر کے ایک طرف کو رکھنے کے بعد ماتھے پر سے بال ہٹاتا ہوا یہ مصور لڑکا ہال کے دروازے میں آ کھڑا ہوا اور ہال کے منظر پر نگاہ ڈالی ان سب کو اس تندہی سے کام میں جٹے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''دادا ادھر آؤ ______'' ایک لڑکی نے اسے آواز دی۔ ''دیکھو اب میرے قدم ٹھیک ہیں نا ______''

''تمہارے قدم تو کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔'' اس نے لڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''تم بنگالیوں کی رومان پرستی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تم خالص کلاسیکل ڈانس کی آخر کیوں اہل نہیں۔''

''دادا یہ تو خالص بھرت ناٹیم کر رہی ہوں میں۔''

وہ اسے اسی اداسی سے کھڑا دیکھتا رہا۔

یہ لڑکا بھی یو۔ پی کا رئیس زادہ تھا۔ فی الحال وشوا بھارتی آیا ہوا تھا۔ ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی الہ آباد سے کر چکا تھا۔ ابھی اس کے دماغ میں واضح طور پر نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت سے پروگرام تھے: جرنلزم' سیاست' کتابیں لکھا کروں گا نہایت عالمانہ' ایسی ایسی تھیوریز پیش کروں گا کہ دنیا عش عش کر اٹھے گی' آرٹ کا نقاد بنوں گا۔ سیاسی طور پر آپ بہت سخت اشترا کی واقع ہوئے تھے۔ باپ کا کہنا

تھا (اور سارے باپوں کی طرح) کہ آئی۔ سی۔ ایس میں بیٹھو وہ خود حکومت برطانیہ کے نائٹ تھے اور بڑی چوٹی کے بیرسٹر۔ بچپن میں اسے نینی تال پڑھنے کے لیے بھیجا گیا' پھر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے اور ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کے بعد اس کے جی میں آئی کہ شانتی نکیتن چلو۔ اس نے باپ سے تجویز ا: بابا ______ ہمیں وشوا بھارتی بھیج دیجیے۔ باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ کیوں میاں صاحبزادے' آرٹسٹ بنوگے۔ دماغ تو نہیں خراب ہوگیا؟ دنیا کے سارے باپ یہی بات کہتے مگر چونکہ اکلوتا لڑکا تھا اس لیے باپ نے ضدی پوری کردی۔ اب وہ دو سال سے بولپور میں تھا اور وشوا بھارتی کے دوسرے طالب علموں کے ہمراہ ریلیف کے کام کے سلسلے میں کلکتے آیا ہوا تھا۔

''یہ لکھنو سے لوگ آئے ہیں۔ ان سے نہیں ملے۔'' کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے کہا' وہ ہال عبور کرکے اس کونے کی طرف چلا جدھر کمال دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا اور گانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف زور زور سے بنگالی بولی جارہی تھی۔

کمال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا: ''نومشکار''

کمال نے گانا ختم کرنے کے بعد ہارمونیم بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''آداب عرض۔!'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمال کی جان میں جان آئی۔ بنگالی بولتے بولتے اس کی حالت تباہ ہوچکی تھی۔

''گوتم نیلمبر ـــــــ لڑکے نے اپنا تعارف کرایا۔''

''کمال رضا۔'' اسے اطلاع ملی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

دونوں کا ایک ہی حلیہ تھا۔ تنگ پائجامہ' کرتا' تھرو واسکٹ اوپر سے کشمیری شال۔ یہ حلیہ اس گروہ کے تقریباً سبھی نوجوانوں کا تھا۔

''میاں کہاں آ پھنسے۔ ان بنگالی بول بول کر ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آؤ باہر چلیں۔''

دونوں نے باہر ایک ریسٹوران میں جا کر قہوہ پیا اور پھر واپس آ گئے۔

''آؤ تم کو اپنی تصویر دکھاؤں۔'' گوتم نے ارونا دیدی کے نگار خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''یار تم ہری شنکر سے نہیں ملے'' کمال نے کہا۔

''ہری شنکر کون ہے۔'' گوتم نے بے خیالی سے پوچھا اور بڑے آرٹسٹوں والے انداز میں سگریٹ ہونٹ میں دبا کر تصویر مکمل کرتا رہا۔

''ہری شنکر ـــــــ یار ہے میرا۔ بڑا باغ و بہار آدمی ہے۔''

''کہاں ہے بلاؤ۔'' گوتم نے نوابوں کی طرح کہا۔

''گھاس کھا گئے ہو' وہ یہاں نہیں ہے۔ لکھنو میں ہے۔ بیمار پڑا ہے بے چارہ۔''

''تم سب لکھنو میں کیوں رہتے ہو۔'' گوتم نے برش ایک طرف رکھ کر مڑتے ہوئے پوچھا۔

''اور پھر کہاں رہیں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔''

''تم نے اس کی ناک غلب بنائی ہے۔''

''ہونٹ بنانے بہت مشکل ہوتے ہیں۔''

''ماشاءاللہ کیا جواب دیا ہے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ''

''سگریٹ لو۔''

''کیا تم آرٹسٹ ہو۔''

''اور کیا تمہیں گر اس کٹ نظر آتا ہوں۔''

''ارے رے۔ تمہارا ہی ذکر جیجا جی نے کیا ہے خط میں''

''جیجا جی ______ وہ کون بزرگ ہیں۔''

''ہماری لاج کے میاں۔''

''تمہاری لاج کون ہے۔''

''حد ہے۔ جیجا جی تو تم کو جانتے ہیں۔''

''مجھ کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔''

''مغالطہ فائیڈ بھی ہو۔؟''

''ہاں۔ تم نہیں ہو؟''

''ہوں تو سہی۔''

''ٹھیک ہے۔'' گوتم تصویر میں لگا رہا۔

''اگر رہ لیے شانتی نکتین میں چار پانچ سال تو شاید لوٹ پیٹ کر آرٹسٹ بن جاؤ۔ فی الحال تو اس کی کوئی امید ہے نہیں۔'' کمال نے تصویر کو غور سے دیکھتے

ہوئے اظہار خیال کیا۔

''خالی آرٹسٹ۔ ارے میرا ارادہ تو ہے کہ مدارس جا کر رام گوپال سے بھرت ناٹیم بھی سیکھوں گا'' گوتم نے الٹی میٹم دیا۔

''یہ ارادہ تو ایک زمانے میں اس خاکسار کا بھی تھا مگر جب میں نے اس کا اظہار کیا تو میری بہنیں ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور انہوں نے بے انتہا میری ہوٹنگ کی۔ اصل میں لڑکیاں بے حد بوگس ہوتی ہیں ـــــــ آرٹ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔''

تمہاری بہنیں بھی ہیں۔''

''ہاں ـــــ تمہاری نہیں ہیں۔''

''نہ''

''یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہنیں ہوں تو زندگی میں بڑے سکون اور نرمی کا احساس رہتا ہے۔''

''ہوں' پھر کیا ہوا۔''

''کیا ـــــــ؟''

''تم کہہ رہے تھے کہ ـــــ''

''یار گوتم تم کو معلوم ہے میں بدھسٹ بھی ہو گیا تھا ایک زمانے میں۔''

''واقعی۔''

''چند سال گزرے میں سارناتھ گیا تو وہاں مجھے بڑا سخت سکون ملا تو میں نے سوچا کہ یار یہ بدھ ازم میں کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔''

''ہوں۔''

''تم پارٹی میں ہو۔''

''پارٹی؟____ نہیں۔ابھی میں اس قابل نہیں بنا۔اس کے لیے بڑا پتہ مارنے کی ضرورت ہے''

''ہاں ٹھیک کہتے ہو_____ ویسے تم کوئی ایسے ریوولیوشنری دکھلائی بھی نہیں پڑتے۔''کمال نے کہا۔

گوتم نے غصے سے اسے دیکھا۔

''معلوم ہے مہاتما گاندھی نے تمہارے گرودیو سے کیا کہا تھا۔کہ گھر میں آگ لگی ہےاور آپ بیٹھے چڑیوں کا گانا سنتے ہیں۔''کمال نے کہا۔

گوتم نے برش جھٹک کر رکھا:''بے وقوفی کی باتیں مت کرو جی۔کیا تمہارے ہری شنکر میں بھی تمہارا ہی جتنا بچپنا ہے_____؟''

''تم بھیا صاحب سے بھی ملنا۔''کمال نے اس کی بات کی سنی ان سنی کر کے کہا۔

''وہ کون ہیں۔''

''میرے چچا زاد بھائی۔''

''وہ بھی بہت قابل ہیں۔''

''ہاں''

''لکھنو ہی میں رہتے ہیں؟''

''ہاں،مگر آج کل محاذ پر گئے ہوئے ہیں۔''

”لکھنو بڑا برا اہل کمال پڑا ہوا ہے۔اس کا مطلب ہے۔“

”اور کیا“

”چلو فرپو چل کر چاء پئیں۔“ گوتم نے اٹھ کر تصویر پر کپڑا ڈالتے ہوئے کہا۔

”فرپو ـــــ تم سخت بورژوا معلوم ہوتے ہو۔“

”بکو مت۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں ہر بات کے متعلق بہت واضح تصورات رکھنے کا قائل ہوں۔“ کمال نے کہا۔

”شوٹ۔“

”کلاس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ـــــ تم پرولتاریہ کے مستقبل میں یقین رکھتے ہو۔؟“

”ہاں“

”ہاتھ ملاؤ۔“ انہوں نے ہاتھ ملایا۔

”تم سمجھتے ہو فیوڈل سماج اپنی موت آپ مر جائے گا؟“

”ہاں۔“

انہوں نے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

”تم کو وشواس ہے کہ تم کو فیوڈل سماج سے سچی دلی نفرت ہے اور تم اس کی بیخ کنی ہی کر کے دم لوگے۔“

”مجھے تو خیر وشواس ہے لیکن تم تو خود فیوڈل سماج سے تعلق رکھتے ہو۔“

”تم کو کیسے معلوم۔“ کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ گویا اس کی کوئی بہت بڑی

چوری پکڑی گئی۔

''مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ابھی ابھی ہال میں کوئی ذکر کر رہا تھا کہ تمہاری مٹیا برج والوں سے رشتے داری ہے اور تم چیت پور روڈ والے نواب صاحب۔''

''ہاں ـــــ ہاں ـــــ خیر ـــــ'' کمال شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ''وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ تاریخ پر میرا کیا بس ہے' مگر اب میں پوری کوشش میں لگا ہوں کہ خود کو مکمل طور پر ڈی کلاس کر لوں۔''

''تمہارا ہری شنکر بھی فیوڈل ہے؟''

''ہے تو سہی' مگر وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا ہے۔''

''خوب'' گوتم مسکرایا۔ ''میں بڑا سخت مڈل کلاس ہوں۔'' اس نے اطلاع دی۔

''رنج نہ کرو'' کمال نے اسے دلاسا دیا۔ ''ہم لوگ تو دراصل اس نئے سماج سے تعلق رکھتے ہیں جو اب جنم لے رہا ہے۔ جنتا کا سماج۔''

اس طرح کی خالص طالب علمانہ گفتگو کے بعد دونوں باہر آئے۔ کمال پر گوتم کا رعب پڑ گیا۔ گوتم میں بڑی گہرائی تھی اور وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ بہر حال سینئر لڑکا تھا اور کمال ابھی متاثر ہونے والی اسٹیج سے نہیں نکلا تھا۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر کمال نے چچا جی کو جو خط لکھا اس میں گوتم نیلمبر کی تعریفوں کے دریا بہا دیے۔

اسی سال گرمیوں میں گوتم لکھنؤ آیا۔ اپنی جائے قیام سے اس نے گلفشاں فون کیا' وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریڈیو اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ ابھی ابھی سب لوگ کملا جسپال کے ہاں فیض آباد روڈ گئے ہیں۔ فیض

آبادرو ڈسوے پتا چلا وہ سب تو سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے۔

سنگھاڑے والی کوٹھی۔ کیا بے تکا نام تھا۔ اب مکانوں کے ایسے نام ہونے لگے۔ جیسے خربوزے والی حویلی اور تربوز والا قلعہ یا گاجر منزل اور مولی ہاؤس ـــــ اسے بے حد ہنسی آئی۔ شاید لوگ سنگھاڑے بہت کھاتے ہوں گے یا کیا ہوتا ہوگا۔

اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی فون کیا تو وہاں چمپا نے ریسیوا ٹھایا۔

''ہلو ـــــ چمپا نے کہا''

''ہلو ـــ آداب عرض۔ دیکھیے میرا نام گوتم ہے ـــ گوتم نیلمبر ـــ اگر آپ لوگ ابھی وہاں سے کہیں اور تشریف نہ لے جاتے ہوں تو میں حاضر ہوں۔''

''آپ ضرور تشریف لائیے۔''چمپا نے جواب دیا۔''اور اگر آپ سوشلسٹ ہیں تو ذرا تیار ہو کر آیئے گا۔ آج ہم سب تلے بیٹھے ہیں کہ کوئی سوشلسٹ ملے تو اسے کچا چبا جائیں۔''

گوتم نے اس روز کا اخبار ابھی تک نہیں پڑھا تھا مگر اس نے فوراً جواب دیا

''بہت خوب ـــ حاضر ہوتا ہوں ـــــ آپ لوگ بھی تیار رہیے گا۔''

سنگھاڑے والی کوٹھی میں جب وہ سب لوگ جا کرندی کے رخ برآمدے میں بیٹھ گئے تو گوتم نے سوال کیا''طلعت آراء بیگم آپ سب میں سے کون سی خاتون ہیں؟''

''جی میں ہوں۔فرمائیے۔''

''دیکھیے مس صاحب کوئی لکھنے بیٹھ۔جائے تو اس کا قلم تھوڑا ہی پکڑا جا سکتا

ہے مگر یہ کہ آپ اگر ایسا نہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔''

''آپ نے IPTA کی طرف سے جس قدر بوگس ڈرامے کلکتے میں پروڈیوس کیے ہیں ان کا احوال میں بھی کمال کی زبانی سن چکی ہوں۔ میں آپ کو مارجن دیتی ہوں کہ پندرہ منٹ تک ہم سب پر اپنا عرب ڈالیے ___ اتنا ہی وقفہ ہم آپ کو مرعوب کرنے میں صرف کریں گے۔ اس کے بعد نارمل ہو جائیے کہ نارمل رہنا ہی بہت مستحسن ہے۔ اچھا اب ڈالیے رعب۔ شروع کیجیے۔ سنا ہے آپ وشوار بھارتی کو نواز رہے ہیں ____ یہاں بھی ایک سے ایک بڑا آرٹسٹ پڑا ہے۔ ہر قسم کا اور یہ سب باری باری فرداً فرداً اور مجموعی طور پر آپ کو امپریس کرنا چاہیں گے۔ پہلے آپ اپنے پولیٹیکل خیالات سے مطلع کیجیے ___ ری ایکشنری تو نہیں ہیں؟ یا مہا سبھائی ___''

''آپ چیلے بناتے ہیں؟'' نرملا نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ کبھی کبھی بنا لیتا ہوں''

''گوتم ___ آپ کا تخلص ہے؟'' طاعت نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔ ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا۔ طاعت بیگم۔ میں پھر کہوں گا۔ آپ ابھی اور پڑھیے اس کے بعد لکھنا شروع کیجیے گا۔ آپ کے علم میں افسوسناک کمی ہے۔''

''بھیا صاحب نہیں پہنچے۔'' کمال نے کہا ''انہوں نے فون کیا تھا کہ چائے یہیں پئیں گے۔''

''بھیا صاحب اس وقت۔'' طاعت نے گھڑی دیکھ کر تندہی سے اعلان کیا۔

''رائیڈنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اب سوئمنگ سے واپس آتے ہوں گے۔'' مجمع اپنی جگہ پر ذرا نادم ہوا۔

''خدا کی پناہ۔ یہ کون صاحب ہیں۔ کوئی فلم اسٹار ہیں۔ اشوک کمار وغیرہ۔؟'' گوتم نے سوال کیا۔

''بھیا صاحب ______ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان سے ضرور ملنا۔'' کمال بولا۔

''تعلق داران اودھ کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کیا آپ سب یہی رائیڈنگ اور سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں۔ میں دراصل سارے مڈل کلاس لوگوں کی طرح طبقہ امراء پر عاشق ہوں۔ جنگ سے پہلے ولایت گیا تھا' اپنے بابا کے ہمراہ۔ تو برٹش لارڈوں کو دیکھنے کی تمنا میں گھوما گھوما پھرتا تھا۔ جہاں دور سے کوئی لارڈ نظر آیا اور میں لپکا اس کی طرف بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے انڈرٹیکر بھی وہی لارڈوں والا لباس پہنتے ہیں۔''

''ہم لوگ بھی انڈرٹیکرز ہیں۔'' کمال نے کہا۔

''اور ماضی کی قبروں کے مجاور۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''لیکن تمہیں ہم کو پسند کرنا پڑے گا۔'' کمال نے دوبارہ کہا ''کیونکہ ہم لوگ اپنی دلکشی کے سہارے ہی پر زندہ ہیں۔''

''میں تم کو ضرور پسند کروں گا۔ میرے دل میں بڑی وسعت ہے۔'' اس نے بڑی تمکنت سے جواب دیا۔

چمپا اب گروہ میں شامل تھی۔ اس نے گروہ کے قوانین سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ گروہ بہر حال ہمدرد تھا' کیونکہ خود تنہا تھا۔ ہم کتنے قابل رحم طریقے سے سہارے کے متلاشی رہتے ہیں۔ گروہ محض ایک اور کردار تھا۔ جس طرح ماحول ایک کردار تھا۔ تصورات کی مجسم شکل انسانی رشتے بڑے نازک' بڑی گنجلک بنیادوں پر قائم ہیں۔ برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں' اسی لیے میرا انیس نے کہا تھا: خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم۔ ہر طرف آبگینے تھے جو شیشے کے گھروں میں رکھے تھے۔ یہ ساری کارگہ شیشہ گری تھی۔ کمال نے اس سے کہا ____ چمپا باجی چوروں کے ذہنی باورچی خانے میں اپنی اٹھک بیٹھک رکھیے۔ آپ ہمارا گھر رکھائیے' ہم آپ کا گھر رکھاتے رہیں گے۔ ہم کبھی آپ کو اکیلا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے ذہن کو ذرا سا ڈسپلن کیجیے۔ یہی اصل چیز ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ آپ رومینٹک ہیں۔

مگر ڈسپلن کی زندگی میں گنجائش کہاں تھی؟ یہاں ہر طرف اس قدر انتشار تھا۔ کمال نے کہا ''اگر آپ آرٹسٹ ہوتیں تو ٹھیک تھا۔ آپ اس افراتفری کو اظہار میں ڈھال لیتیں' مگر آپ نہ لکھتی ہیں نہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لیے ڈسپلن آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔''

''یہ لیکھک لوگ بڑے متوازن ہوتے ہیں؟'' چمپا نے پوچھا۔

''متوازن نہ ہوں مگر تخلیق کی Process کے دوران میں وہ اپنا آہنگ

تلاش کر لیتے ہیں۔''

چمپا باجی آپ تصویریں ہی بنایا کیجیے۔

''تم نے تو مجھے بالکل وکٹورین رومان پرست سمجھ لیا ہے۔نہیں کمال' ٹھیک ہے' میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ میں ت۔ ہمینہ کے ساتھ رہوں گی۔''

''مگر ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیجیے کہ جذبات اور ذہن کا آپس میں کیا ایکویشن ہونا چاہیے اگر یہ طے کر لیا تو بس سمجھے کہ بیڑا پار ہے۔''

''پھر وہی نظریے!''

''اچھا تو آپ تجربے کرنا چاہتی ہیں۔ چمپا باجی از خود تجربے نہ کیجیے گا۔ دنیا آپ کو خود ہی اتنے سبق دے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔''

اسی طرح لان پر بیٹھ کر سڑک پر ٹہلتے ہوئے یہ لوگ لمبی لمبی بحثیں کرتے۔ چمپا اس یونیورسٹی ماحول میں بے حد خوش تھی۔ کیلاش ہوسٹل' جہاں وہ ایم۔ اے کے لیے رہ رہی تھی' ایک الگ مخصوص دنیا تھی۔ یہاں ایک بہت بڑے احاطے میں' جہاں یوکلپٹس اور مولری اور سیمل کے پروقار درخت کھڑے تھے' ایک پرانی وضع کی پیلے رنگ کی وسیع کوٹھی تھی جس میں مسز وانچو رہتی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک جدید طرز کی سیمنٹ کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لڑکیاں رہتی تھیں' یہ جگہ چاند باغ سے بہت مختلف تھی۔ یہاں لڑکیاں' جو زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھیں' بہت ہوشمند اور سینئر ہونے کے احساس کے ساتھ رہتی تھیں۔ چاند باغ میں سیاست کا دخل نہ تھا۔ یہ جگہ دھارے میں شامل تھی۔ چاند

باغ میں بتھوون اور رابسن کا راج تھا۔ یہاں ہر طرف مہاتما گاندھی اور نہرو اور قائداعظم جناح اور کارل مارکس کا چرچا تھا۔ امریکہ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے مخصوص برائن ماراور راسمتھ کالج کی وضع پر چاند باغ کے ماحول کی تشکیل کی گئی تھی' وہاں سے نکل کر لڑکیاں جب یونیورسٹی میں آتیں تو کیلاش میں رہتے ہوئے خود کو ملک کی فضاؤں سے قریب تر محسوس کرتیں۔

اب چمپا اور تہمینہ اور نرملا اور طلعت عموماً اکٹھی وقت گزرتیں۔ ایک روز تہمینہ نے چمپا سے کہا: ''سنو۔ آؤ adult سطح پر اس مسئلے کو دیکھیں۔ بھیا صاحب دسمبر میں مدارس سے آرہے ہیں۔ اس سال تم ایم۔ اے کرلوگی۔ روحانی طور پر اس قدر مہم پسند اور رولا اور بننے کا ارادہ ترک کرکے ان سے شادی کرلو۔''

''بکومت۔''

''بکنے کا اس میں کیا سوال ہے۔''

''تم خود ہی نہ کرلو ان سے شادی۔''

''میں تمہاری پرچھائیں بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

''بکواس۔'' تہمینہ نے جواب دیا' پھر کچھ دیر بعد بولی: ''علاوہ ازیں بھیا صاحب ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہونا چاہئیں۔ مرد اس لائق ہی نہیں کہ ان کو اتنا آسمان پر چڑھایا جائے۔''

''ظاہر ہے۔''

''زندگی کا نصب العین پارٹی ہے۔ کہو ہاں۔''

''ہاں ______ '' چمپا نے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

طلعت دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ یہ مکالمہ اس کے کانوں میں پڑا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ''خدائی کا شکر ہے ان دونوں کی سمجھ میں بات آ گئی۔'' اس نے نرملا سے فون پر کہا۔ نرملا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن بھیا صاحب دسمبر میں لکھنؤ آئے اور چمپا کے سارے نئے نظریے پھر ہوا ہو گئے' وہ دن بھر خوش خوش پھرتی رہی۔

''وہ گلفشاں والے گلفام آئے ہوئے ہیں آج کل۔'' ہوسٹل میں لڑکیوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

اسی اثنا میں گوتم نیلمبر بھی آن پہنچا۔ اس کو زراعت کے محکمے میں ایک بہت عمدہ ملازمت مل گئی۔ (اور لوگوں نے کہا: اپنے باپ کو بڑی حیثیت کی وجہ سے دیکھو کیسے ترنت ہی اسے نوکری مل گئی۔ بڑا کمیونسٹ بنا پھرتا تھا)

یہ زمانہ' جوان لوگوں نے اکٹھا گزارا' ان سب کی زندگیوں کا بہترین دور تھا۔ ایسا دور جو ایک بار چلا جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

۵۰

شانتا یہ بڑی پرسکون جگہ ہے۔ جھاڑوں پر کوئلیں بیٹھی ہیں۔ آموں کے باغ ہیں جن کے درمیان سے ایک مالینی کڑا بجاتی جا رہی ہے۔ بڑے شائستہ ریٹائرڈ کلکٹروں' اوسط درجے کے زمینداروں اور بیرسٹروں کی کوٹھیاں ہیں۔ گھاٹ پر ڈونگیاں کھڑی رہتی ہیں۔ سایہ دار راستوں پر سے لمبے لمبے زرد پھول درختوں سے

نیچے برستے ہیں۔ باریک نازک ٹہنیوں والے درختوں پر بڑے سبک پھول پتے کھلے ہیں جن کو دیکھ کر چینی پینٹنگز یاد آتی ہیں۔اتوار کی صبح کو لڑکیاں بر می چھتریاں سنبھالے ایک دوسرے کے گھروں پر جاتی ہیں اور گھاس پر بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں اور شدید انجلکچول گفتگو ان لوگوں کا دستور ہے۔ زندگی میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ ہے اور نفاست برآمدے کے سبز جنگلے پر پھیلی ہوئی بیل' ٹھنڈے فرش پر ستیل پاٹیاں ایک دیوار کے سہارے سے غلاف میں ملفوف طنبورہ رکھا ہے۔کمروں کے اونچے اونچے دہرے دروازے ہیں جن پر جھلملیاں ہیں۔چوڑی سیڑھیاں اونچی کرسی' بڑے سے گھاس کے سمندر میں یہ مکان ڈوبے ہوئے ہیں۔چھتیں ڈاٹ کی ہیں۔چھت کے اوپر چھوٹے چھوٹے اطالوی وضع کے ستونوں کے جنگلے ہیں۔ ایسے مکان سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کس قدر استحکام ان کی بنیادوں میں ہوگا۔ برآمدوں کی سیڑھیوں پر کسی زمانے میں پنکھا قلی اونگھتے ہوں گے۔ بہرائچ میں' جہاں میں پیدا ہوا میرا مکان بھی عین مین ایسا ہی تھا۔ میں مکانوں کی کتھا لے کر بیٹھ گیا۔شانتا میں تفصیلات سے متاثر ہونے اور ان پر دھیان دینے کی عادت سے عاجز آچکا ہوں مگر بتاؤ تو بھلا لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں اور ذرا ان کے نام تو سنو۔

نام بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر چمپا بیگم۔اچھا نام ہے' ہے نا۔ کہو شانتا میری رائے سے اتفاق کرو' دیکھو تم اتنی دور ہو' تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر چیز میری آنکھوں سے دیکھو' میری ساتھ ساتھ رہو۔جب نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں شانتا ہوتی تو فلاں کے لیے یہ کہتی' فلاں کو پسند کرتی' فلاں کا مذاق

اڑاتی۔ شانتا تم نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں بہت دنوں سے' اب کیا میں تمہارے جذبہ مادری کو اپیل نہیں کرتا۔ بقول تمہارے بڑا ہو گیا ہوں۔؟ شانتا کاش تم یہاں ہوتیں اور ان سب سے ملتیں۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں یہاں ایک قسم کے ان افیشیل بر دکھوے کے لیے بلایا گیا تھا۔ نرمل رانی جو بی۔ اے فرما رہی ہیں بجائے اس کے کہ روایتی لڑکیوں کی طرح کچھ شرماتیں ہارمونیم پر ان سے گانا سنوایا جاتا' انہوں نے مطلق شرما کر نہیں دیا نہ شاید انہیں علم ہے کہ خاندان والے ان سے میرا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال' انہوں نے مجھ میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کو باتوں ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے بہت زبردست پروگرام ہیں' ڈاکٹریٹ کریں گی۔ نرملا اور طلعت دونوں انتہائی تیز ذہین لڑکیاں ہیں۔ خدا محفوظ رکھے' ہر وقت ٹرالی رہتی ہیں۔

''لکھ لی تقریر''

''نرملا نے برآمدے کے جنگلے کے نیچے سے اچک کر پوچھا۔''

''لکھ رہا ہوں۔''

''دکھلایئے۔''

''افواہ ______ بھئی اصل میں تقریر نہیں لکھی ایک ضروری خط لکھنا تھا وہ شروع کر دیا۔''

''یہ خط و کتابت کا کون وقت ہے۔ میں کہتی ہوں۔''

نہ وہ چین سے نکلے نہ جاپان سے نکلے

نہ ایران سے نکلے نہ انگلستان سے نکلے
محمد مصطفیٰ نکلے تو عربستان نکلے

محمد مصطفیٰ

کمرے میں سب نے مل کر اپنی پسندیدہ قوالی شروع کر رکھی تھی۔

''چلیے چل کر قوالی گایئے۔'' نرملا نے دوسرا حکم لگایا۔

گویا سنگھاڑے والی کوٹھی میں آ کر ''نہ وہ چین سے نکلے'' گانا اس قدر اہم اور ضرور چیز تھی۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین ہی صرف یہ تھا کہ وہ نہ چین سے نکلے' گائے۔ اس نے نرملا کو اداسی سے دیکھا۔ بیوقوف لڑکی کس قدر خوش ہے۔

''چلو نرمل میں آتا ہوں' مگر ایک شرط پر۔''

''وہ کیا ____''

''اپنے بھیا صاحب سے ملواؤ''

عین اسی وقت اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ برساتی سیڑھیوں پر بھیا صاحب کھڑے تھے، گھبرائے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سب برآمدے میں آ گئے۔

''بڑے نروس طبعیت کے آدمی جان پڑتے ہیں'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔

''لڑکیوں سے گھبرا جاتے ہیں بے چارے۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔'' نرملا نے جواب دیا۔

''شریف آدمی ہیں تو ہم سب کیا لفنگے ہیں ____ واہ واہ۔'' ہری شنکر نے احتجاج کیا۔

''ان کے لاشعور میں کوئی پیچیدہ گی ہے۔'' گوتم نے دوسرا اعلان کیا۔ ہری شنکر نے اسے مکا دکھایا۔

بھیا صاحب مجمعے پر نظر ڈال کر چمپا کی طرف چلے گئے۔ چمپا نے کرسی چھوڑ دی اور فرش پر بیٹھ کر ان کے لیے چاء بنانے لگیں۔

''یہ سلسلہ بھی ہے۔'' گوتم نے دفعتاً بور ہو کر پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔

''بھیا صاحب ناچتے بہت اچھا ہیں۔'' نرملا نے موقعے کو سنبھالنا چاہا' یہ تینوں باقی مجمعے سے الگ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے تھے۔

''لاک ناچ یا کلاسیکل۔'' گوتم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اولڈ والز کے استاد ہیں۔'' نرملا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''تب میں ان کو معاف کر سکتا ہوں۔'' گوتم نے سر ہلا کر کہا، میں بہت کچھ معاف کر دیتا ہوں' میرا بہت بڑا دل ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اندر کوئی اور بحث چھڑ گئی تھی۔ ہری شنکر زور زور سے غل مچا رہا تھا۔

''افوہ تم لوگ کس قدر کی ٹر لگاتے ہو۔'' گوتم نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔

''زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔'' کمال نے گوہر افشانی کی۔

''خوب یعنی؟''

''یہ محض باتوں کا دور ہے۔''

''پھر عمل اور تخلیق کا دور کب آئے گا؟''

''میاں جب سے دنیا بنی ہے اگر پیغمبروں اور فلسفیوں اور سوچنے والوں نے باتیں نہ کی ہوتیں تو آج دنیا کی لائبریریوں میں گدھے لوٹ رہے

ہوتے ______ شکر کرو کہ ہم باتیں کرتے ہیں تم سنتے ہو۔ایک سمے ایسا آنے والا ہے۔ جب تمہارے کان ہماری آواز سننے کو ترس جائیں گے۔'' کمال نے کہا۔

''تم وقت کی ہلاکت خیز کے قائل ہو؟''

''ہاں''

سورج ندی میں ڈوب رہا تھا اور چھتر منزل کے سنہری گنبد کرنوں میں نارنجی نظر آرہے تھے۔سامنے لہروں پر سے ایک کشتی سکون سے گزر گئی۔

''تم علامتوں کی رمزیت کے قائل ہو۔'' معا گوتم نے کمال سے پوچھا۔

''ہاں''

''یہ سامنے جو ناؤ جارہی ہے یہ بڑی رمزیت کی حامل ہے۔'' گوتم معمولی سی بات کو بے حد ڈرامائی اور فلسفیانہ رنگ میں ادا کرتا تھا اور اس کا یہ انداز لوگوں کو بہت اچھا لگتا۔ ہری شنکر بھی اس کے پاس آن بیٹھا۔

وہ سیڑھیوں پر جا کر کھڑے ہوئے جو ندی میں اترتی تھیں۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے۔ پتھر Timeless become کی علامت ہے۔پتھر وقت کی منجمد شکل ہیں اور کائنات کا خاتمہ چوہے کی موت کی طرح یقینی ہے اور اتنا ہی غیر اہم ______ دیدانت لکھا ہے کہ۔

''یہ ندی ہماری زندگیوں کا سمبل ہے۔'' ہری شنکر نے آپنے آپ سے کہا۔

''مجھے دریاؤں سے عشق ہے' تم کو دریاؤں سے عشق ہے؟'' اس نے مڑ کر کمال سے بے حد سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں۔''

''میں ندی کے پانی میں ڈوب کر مروں گا۔'' گوتم نے دوسرا اناؤ نسمنٹ کیا۔

''گوتم! تم کیا چیپ بورژوا اور رومان پرست ہوتے جا رہے ہو۔'' ان کے نزدیک آ کر اکڑوں بیٹھتے ہوئے طلعت نے تشویش سے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' وہ چونک اٹھا۔ ''یہ وقت کا سحر ہے طلعت آرا بیگم۔'' اس نے انگلی ہوا میں لہرا کر جواب دیا ـــــــ ''تم وقت کی طاقت نہیں جانتیں۔''

پل کے پار بہت دور سے نوبت بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ شام کے سناٹے میں وہ چپ چاپ یہ آواز سنتے رہے۔

''آؤ بھوتوں کو ڈھونڈیں''

''آؤ۔''

وہ چاروں لان پر واپس آئے۔

''چمپا بیگم' بھیا صاحب' اپی۔'' گوتم نے بڑے اخلاق سے جھک کر ان کو مخاطب کیا ـــــــ آئیے ہم سب چل کر بھوتوں کو ڈھونڈیں۔

وہ خاموشی سے موٹر کی طرف بڑھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ موٹر اب کاٹھ کے پل پر سے گزر رہی تھی۔

''ایک موڑ ہوتا ہے جہاں سے انسان کبھی واپس نہیں آتا۔'' عامر رضا نے اپنے آپ سے کہا۔

کمال نے موٹر روک لی۔ ''آئیے ذرا لہروں کو گنیں۔'' وہ پل کے اونچے جنگلے

پر جھک گئے۔

ان کے نیچے ندی کی لہروں پر رنگ برنگے بجروں کا ایک جلوس گزر رہا تھا۔ ان میں جو لوگ بیٹھے تھے انہوں نے عجیب لباس پہن رکھے تھے: مند یلیں، جواہرات، مالائیں، آب رواں کے دوپٹے، تلواں پاجامے۔ جواہرات کی چھوٹ سے ندی کا پانی جگمگا اٹھا۔

ان لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو بلانا شروع کیا۔ ان کی آوازیں ان کی سمجھ میں نہ آئیں۔ چڑیوں کی چہکار کی طرح سریلی، مبہم، سارنگی کی چیخ کی مانند تیز، سریلی، ڈراؤنی۔ ساحل پر کتے اور گیدڑ چلا رہے تھے۔ شمشان گھاٹ کی لکڑیاں چر چرا رہی تھیں۔ قبروں کے تابوت کے تختے چیرے جا رہے تھے۔

''یہاں سے بھاگو ______ چلو آگے چلیں۔'' چمپا نے کہا، اسے لگا جیسے اس کی اپنی آواز گہرے پانیوں میں سے آرہی ہے۔

''ان آوازوں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ یہ آخری آوازیں ہیں۔'' گوتم نے جواب دیا لکڑیاں چر چرایا کیں۔

''میرا سر چکرا رہا ہے، مجھے بھوتوں سے بچاؤ۔'' عامر رضا نے پل کے جنگلے پر سر رکھ دیا۔ چمپا اس کے پاس کھڑی تھی۔

''خوبصورت آدمی، اگر میں تمہارے دل کو جان سکتی۔''

''تم نہیں جانو گی۔ مجھے کوئی نہیں جانے گا۔'' عامر رضا نے جواب دیا۔

موٹر پھر ایک دھچکے سے اسٹارٹ ہوئی۔ کمال نے گانا شروع کر دیا تھا۔ چاندنی کی روشنی ایک دم بہت تیز ہوئی۔ اس میں ان سب کے چہرے دھلے

ہوئے سفید نظر آ رہے تھے۔

''ہل ______ ہر طرف پل بنا رکھے ہیں۔'' گوتم غصے سے بڑبڑایا۔

''وہ سکندر باغ کی سڑک پر آ گئے۔ قریب سے ایک مغرق ہاتھی جھومتا ہوا گزرا۔ اس پر شاہ زمن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔ ''ان سے ہاؤ ڈو یو ڈو ہی کرلو کم از کم۔''

''یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا ولایتی بادشاہوں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔'' کمال نے کہا۔

شاہ زمن ہودے میں سر جھکائے بیٹھے بیٹھے رہے۔ موٹر پھر آگے نکل گئی۔ سب چپ چاپ تھے۔ گوتم اپنے پائپ کو ٹھونکتا بجاتا رہا۔ اگر مجھے کوئی یہ بتالادے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں اس کو یہ بڑا انعام دوں۔ چمپا نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ گھنٹوں میں نے ان سے دلیلیں چھانٹیں پر مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں ______ گروہ کی سنگت بیکار ہے۔ تنہائی اصل حقیقت ہے۔

کمال نے دفعتاً کار روک لی۔ سامنے لا مارٹینیر کالج تھا۔

''یہاں انہوں نے مجھے کیا کیا نہیں پڑھایا۔''

مال اور عامر رضا اور ہری شنکر نے انگلیاں اٹھا کر یک زبان ہو کر کہا۔ ''تم اتنا پڑھتے کیوں ہو؟'' انہوں نے پلٹ کر گوتم سے سوال کیا۔

''یہ عجیب بگڑے دل ہیں۔ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔'' طاعت نے کہا۔ گوتم چپکا رہا۔

وہ سب اتر کر عمارت کے قریب گئے اور کھڑکیوں میں سے اندر جھانکنے لگے۔ اندر کمرے اندھیرے اور سنسان پڑے تھے۔ صبح کوان میں پھر پڑھائی ہو گی۔ چھتوں پر بنے ہوئے اطالوی Bas-relief کے گلابی' سبز اور نیلے رنگ نیم تاریکی میں جھلملا رہے تھے۔ دیوار پر زوفنی کا بنایا ہوا جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ طاعت کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے کھڑی رہی۔ باقی لوگ سر جھکائے جھیل کی اور چلے گئے۔

''آؤ____ادھر آؤ_____میرے قریب'' طاعت نے مڑ کر دیکھا۔ جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم جھیل کے کنارے کھڑی تھی' اس نے اشارہ کر کے ان کو پھر بلایا۔

''مجھ سے باتیں کرو'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے کوئی باتیں نہیں کرتا۔ دن بھر یہاں اتنا بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکچر ہوتے ہیں۔ میری طرف کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔'' وہ سوں سوں کر کے رونے لگی۔ طاعت بڑی گھبرائی کہ اس کو کس طرح چپ کرایا جائے۔ ''سنو میری بات'' طاعت نے سمجھانے کی سعی کی۔ ''تم ابدیت کے نقطے پر دھیان دیا کرو___ وقت کے مختلف ٹکڑے دراصل_____''

''وعدہ کرو کہ کبھی نہیں پڑھو گے؟______'' کمال اونچی آواز میں گوتم سے کہہ رہا تھا۔

''یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمالیہ نکل بھاگا تھا' وہ اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے کسی شیر نے کھالیا یا چڑیوں نے اسے کی داڑھی میں

گھونسلے بنا لیے ہوں اور وہ کسی کھوہ میں بیٹھا رومنی کی موسیقی سنتا ہوگا۔" ہری شنکر نے کہا۔

"اوم۔اوم۔اوم" یہ آواز اب سارے میں گونج رہی تھی۔فضائیں اس آواز سے لرز اٹھیں۔ہری۔ہری۔ہری۔وہ جھیل کو پیچھے چھوڑ کر سرخ بجری والے راستے پر چلنے لگے۔چمپا نے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کی ایک ٹہنی کو چھوا' ایک پتا ٹوٹ کر راستے پر آن گرا۔

"شنو' جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔ہری۔ہری۔" چمپا نے دہرایا۔

تہ خانے میں جنرل مارٹن پڑا سوتا ہے' اس کے اوپر سے دنیا گزرتی جارہی ہے۔

لائبریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چنڈول اڑتا ہوا نکل گیا۔کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور پھیل گئے۔لاطینی' فرانسیسی' انگریزی۔ بے معنی الفاظ۔ان کے معنی اگیا بھتال کی مانند منہ چڑا رہے تھے۔بہت سے الفاظ ٹیرس پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی پتلی پتلی' کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔توپ نے گرج کر اطلاع دی' میرا نام' لارڈ کارنوالس' رکھا گیا تھا اور میں سرنگا پٹم میں استعمال کی گئی تھی۔" ٹیرس پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کی منڈیر پر ایستادہ مجسمے زور زور سے قہقہے لگانے لگے' پھر طلعت کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔آؤ دلکشا چل کر پدمنی اچاریہ کے یہاں کافی پئیں۔سوتی ہوئی معطر سڑکوں پر سے گزر کر وہ دلکشا کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد کمال' جو راستے میں سے کہیں غائب ہوگیا تھا' ان سے آن ملا' وہ

سب دلکشا کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

''تم کہاں چلے گئے تھے۔'' گوتم نے غصے سے پوچھا۔

''میں نے سنا تھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں بسنت کا تہوار بہت دھوم سے منایا جاتا ہے' اسی کی سیر دیکھنے چلا گیا تھا۔ فرح بخش میں عجب منظر تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر مکلوڈ بیٹھے فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک انگریز تپائی پر بیٹھا بیگ پائپ بجا رہا تھا۔ پھر رجب علی فضل علی قوال نے بسنت کا خیال چھیڑا۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا تھا' پھر لندن کے بادشاہ کا جام صحت پیا گیا۔ بادشاہ کو انجینئرنگ کی دھت ہے۔ دنیا بھر کی مشینیں الم غلم جمع کر رکھی ہیں۔ ایک وہ طامس ڈینئم ان کو فٹی چڑھاتا رہتا ہے۔ لیکھے ایک اسٹیمر گومتی میں چھوڑ دیا۔ رابرٹ ہوم آرٹسٹ ایک صحنچی میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ بشپ ہیبر بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی تبلیغ کرنے لگے۔ زینے کے سرے پر کھڑے بادشاہ انگریز مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے' پھر وہ سب کو اپنی پکچر گیلری میں لے گئے۔ کھانا میز پر خالص انگریزی فیشن کا پیش کیا گیا۔ دربار میں بڑی انگریزیت ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا ____ پھر جب میں فرح بخش سے واپس آرہا تھا تو راہ میں صاحب ریذیڈنٹ ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا ____ پھر جب میں فرح بخش سے واپس آرہا تھا تو رراہ میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر جوڑی دار پگڑی سرپیچ گوشوارے پہنے' ہندوستانی جامے میں ملبوس' جھالردار پالکی میں بیٹھے چلے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟ کہاں: بادشاہ کا جلوس ہے۔ کورونیشن ____ میں نے پوچھا: کون سے بادشاہ

کا؟ ایک کے دربار سے تو میں ابھی آ رہا ہوں' بولے: وہ تو مر گئے ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر اب تخت پر بیٹھے ہیں' عجب تماشا ہے۔ یار ہری شنکر یہ بادشاہ لوگ مر بھی جاتے ہیں ____ ''وہ خاموش ہو گیا۔

اب وہ سب دلکشا کے باغات میں داخل ہو چکے تھے۔ سارے میں پورنماشی کا اجالا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور درختوں میں چھپی ایک پیلے رنگ کی کوٹھی تھی جس میں اندھیرا پڑا تھا۔ لان پر ایک مور سو رہا تھا۔ سامنے بڑے گھنے درخت کے نیچے بہت سے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آج یہاں چاند باغ کی بابا لوگ پکنک منانے آئی تھیں۔ مالی نے کہا۔ انہوں نے کوٹھی کے برآمدے میں جا کر پدمنی آ جا زدی' وہ اور اس کا میاں باہر آئے۔ ہلو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''کافی بناؤ۔'' کمال نے حکم چلایا۔

کوٹھی کے پیچھے انگریز فوجیوں کی قبریں تھیں جو سنہ ستاون میں یہاں کھیت رہے' وہاں جھاڑیوں میں گھس کر انہوں نے پچیسویں مرتبہ ان کے کتبے پڑھے۔ لفٹنٹ پال' فورتھ پنجاب رائفلز۔ نوجوں کپتین مک ڈانلڈ' ۹۳ ہائی لینڈرز۔ لفٹنٹ چارلی' ڈیش ووڈ۔

''ہلو ___ ہاؤ ڈو یو ڈو ______ ''ان تینوں نے سامنے آ کر بشاشت سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''ہلو چارلی۔ لو پائپ پیو۔'' گوتم نے ان کو تمبا کو پیش کیا۔

پھر نواب قسیہ محل نے چنبیلی کی جھاڑ میں سے نکل کر کہا: ''اگر کوئی مجھے دل کا چین دلا دے تو میں اسے اپنی پوری سلطنت بخش دوں۔''

''میں نے اکثر سوچا کہ تم نے زہر کیوں کھایا تھا۔'' چمپا نے نواب قدسیہ محل سے اس طرح بے تکلفی سے بات کی گویا وہ بھی کالج کی ہم جماعت لڑکی تھی۔ لڑکیاں سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ چوبیس سالہ اور خوبصورت ملکہ اودھ نزاکت سے اپنے پائنچے سمیٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ ٹہلتے ہوئے دلکشا محل کے عظیم الشان کھنڈر کی طرح چلے گئے۔

''ایک روز یہاں ایک فرانسیسی اپنا غبارہ اڑانے لایا تھا۔ بڑی خلقت جمع ہوئی۔ میرے سسرے شاہ زمن بھی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ دیکھو اتنا مزا آیا کہ یہ فرانسیسی غبارے میں اڑی ہو؟'' ملکہ نے چمپا سے پوچھا۔

''نہیں مگر تم نے زہر کیوں کھایا تھا؟'' چمپا نے مصر رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ ملکہ بات ٹال رہی تھی، وہ اپنی آرسی کو غور سے دیکھا کی۔

''تم تو بڑی سخی مشہور تھیں، تم سے زیادہ فیاض اور نیک دل بیگم لکھنو کے تخت پر نہیں بیٹھی۔ لاکھوں روپے تم نے غریبوں کو بخش دیے۔ تم مجھے بتاؤ۔ کہ اس سخاوت اور محبت کے بدلے میں دنیا نے تم کو کیا دیا ____ اللہ بتاؤ نا بھئی۔''

''جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔'' ملکہ بے دھیانی سے گنگنا رہی تھی۔ ''یہ میرے بادشاہ کا مصرع ہے۔'' اس نے چمپا کو مخاطب کیا۔ ''تم کو شعر پسند ہیں؟''

باغ بسنت کے سارے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا جیسے گندھیوں نے عطر کی ہزاروں شیشیاں انڈیل دی ہوں۔

''برکھا رت تھی اور تم دلکشا محل میں تفریح کے لیے آئیں، اور چونکہ بادشاہ تم سے ناراض تھے، تم نے لے کے سنکھیا پھانک لی ____ ذرا بتاؤ تو اس کا کیا مطلب

ہے ـــــ کیا مرد اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کے لیے انسان جان پر کھیل جائے۔ ان کی تو اتی سی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیے ـــــ اتی سی بھی ـــــ" چمپا نے انگلی پر انگلی رکھ کے بتایا۔

قدسیہ محل نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اے لو ـــــ وہ راجہ غالب جنگ چلے آتے ہیں۔ آج پورنماشی ہے نا۔ بادشاہ یہاں تفریح کے لیے آتے ہوں گے۔ مجھے دیکھا تو پھر خفا ہو جائیں گے۔ میں اب چل دوں۔"

"کہاں جاتی ہو ـــــ؟" چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہیں نہیں۔ ہم سب یہیں موجود ہیں۔ ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں؟ بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔ تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو بلاتے ہیں۔"

"چمپا ـــــ باجی چمپا باجی ـــــ" رات کے سناٹے میں کمال کی آواز سنائی دی، وہ پتھر سے اٹھ کر دل کشا محل کی طرف چل پڑی۔ کھنڈر کی سب سے اونچی سیڑھی پر کرنل اچاریہ بیٹھے گٹار بجا رہے تھے، سب لوگ آس پاس بیٹھے تھے۔

"لڑکیو، چلو کافی تیار ہے۔" پدمنی نے پکار کر کہا۔ اندر کھنڈر کے ایوانوں میں نصیر الدین حیدر کے حرم کی انگیز بیگمات، بڑے بڑے جھالر دار سائے پہنے، کہنیوں کے بل بیٹھی بڑی محویت سے گٹار سن رہی تھیں۔ پھر ان بیگمات نے مل کر پولکا شروع کر دیا، وہ سب سیڑھیاں اتر کر پدمنی کی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

چمپا پھر تنہا رہ گئی۔

"مادموزیل ـــــ وزیت تری شارماں ـــــ مادموزیل۔" اس نے

مڑ کر دیکھا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کا فرنچ حجام سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑے شولرس انداز میں اس نے اپنا جھالردار رومال نکال کر پتھر پر بچھایا اور دو زانو جھک کر اس سے کہا: ''تشریف رکھیے۔''

چمپا ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔

''مادموزیل ____ اپنے حسن پر جی بھر کے نازاں ہو لیجئے۔ جی بھر کر خوش رہیے۔ غم بیکار ہیں۔ آیئے میں آپ کو مردہ عورتوں کا گیت سناتا ہوں۔'' اس نے ایک جھنکار کے ساتھ گٹار بجانا شروع کر دیا جو کرنل اچاریہ وہیں بھول گئے تھے۔

مردہ عورتوں کا بیلڈ:

''مجھے بتاؤ کہ لیڈی فلورا اور خوبصورت ہائی پلیشیا''

اور تائیس کہاں چھپ گئیں؟

جون کہاں گئی جسے انگریزوں نے جلایا تھا؟

مادر خداوند ____ ان سب کا کیا ہوا؟

''لیکن ____ پچھلے برسوں کی برف کس نے دیکھی ہے!!''

''مادموزیل' یاد رکھیے' خوبصورت عورتیں دو مرتبہ مرتی ہیں۔ حسن پر نازاں ہو جیئے دولت اور شہرت اور عزت پر نازاں ہو جیے۔ وقت بہت کم ہے' بہت جلد یہ سب آپ کے پاس سے چلا جائیگا۔ میری سنئے۔ میں پیرس کا حجام۔ میں نے بادشاہ کی ایسی حجامت بنائی کہ پورے چوبیس لاکھ روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ سارے لکھنو پر میری حکومت تھی۔ بادشاہ میرے تابع تھے۔ ملک کا اصل حاکم میں تھا اور اب کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں۔'' اس نے اپنے ساٹن کے جوتوں کو اداسی سے

دیکھا اس کے خوبصورت چہرے سے پاؤڈر کی خوشبو آ رہی تھی۔

چمپا سیڑھیاں اترنے لگی۔ ''یہ گٹار لیتی جائے ____ کرنل اسے یہیں چھوڑ گئے۔ اب میں جا کر کہیں اور منڈلاؤں گا۔ بون نوئی مادموزیل۔'' اس نے جھک کر بڑے اسٹائل سے کہا۔

پدمنی کے لان پر بیٹھ کر کافی پینے کے بعد وہ موٹر کی طرف بڑھے۔ دور کھنڈر پر چمگادڑیں اپنے پر پھیلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر گومتی بہہ رہی تھی جس کے نزدیک مرگھٹ تھا۔ میلوں پھیلے ہوئے باغ کے چاروں طرف چھاؤنی کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ ذرا دور پر دل کشا کلب میں ناچ ہو رہا تھا۔ ''آؤ چھتر منزل چل کر ناچیں۔'' کمال نے تجویز کیا۔

''آج تم لوگ کیا رت جگا منانے نکلے ہو۔'' پدمنی نے ہنس کر کہا۔

''ہاں۔ ایسی خوبصورت رات کو سو کر برباد کیا جائے؟'' ہری شنکر نے جواب دیا۔ ''تم بھی چلو۔''

وہ پھاٹک سے نکل کر کاسلز روڈ پر آ گئے۔ کنگ غازی الدین حیدر کی نہر پر سے گزرتے وہ حضرت گنج میں داخل ہوئے، پھر قیصر باغ کی طرف مڑ گئے۔

سامنے چاندی والی بارہ دری روشنی سے جھک جھک کر رہی تھی۔

''ارے آج تو یہاں بسنت کا میلہ ہے۔'' طلعت نے خوش ہو کر کہا۔

''آج معلوم ہوتا ہے سلطان عالم اوپیرا بھی کر رہے ہیں۔'' نرملا نے کہا۔ ''چلیں اندر ____؟''

''کیسے چلیں۔ ہمیں مدعو تو کیا نہیں گیا ہے۔'' کمال نے تذبذب کے ساتھ

کہا۔

"چلے چلو۔ چوبداروں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جائیں گے۔" شنکر نے جواب دیا۔

وہ چپکے سے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر بارہ دری کا چاندی کا فرش جھل جھل کر رہا۔ اسٹیج پر راجہ اندر کے دربار کے ستونوں پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف آئینے جھلملا رہے تھے ___ پکھراج پری گا رہی تھی:

رت آئی بسنت بہار
کھلے جرد پھولون کے ہار
ہر کے دوار مالی کا چھورا
گر اڈارت گیندن کے ہار

وہ سب پنجوں کے بل چلتے اسٹیج کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ طلعت نے چپکے چپکے ساتھ ساتھ گنگنانا شروع کر دیا۔

پھر دھن بدلی۔ اب پکھراج پری نے اپنی غزل شروع کی:

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سر بازار بسنتی

ہال میں واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگے' یہ سب چپکے سے ادھر سے نکل کر ایک دروازے میں آ گئے۔ سامنے علی نقی وزیر اعظم بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان

سب کو دیکھا نہیں۔

پکھراج پری گائے جا رہی تھی:

موتی کانوں میں نہیں یار کی زلفوں کے قریں

جھالے بھادوں کے وہ ہیں اور یہ گھٹا ساون کی

اوپیرا ہوتا رہا۔ یہ لوگ مجمع میں رل مل کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان سب کو روشندان میں سے جھانکتا دیکھ کر سبز پری نے' جو سنگھار کمرے میں کھڑی اسٹیج پر جانے کی تیاری کر رہی تھی' گھبرا کر کالے دیو سے کہا: ''ادھر نظر ڈالو ____ آنے والے وقتوں کے بھوت ہمیں گھور رہے ہیں۔''

کمال نے ایک چوبدار سے پوچھا: ''سبز پری کون ہے۔''

''ارے اس کو نہیں جانتے خداوند ____ چمپا بائی۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے زمانے سے ان کی کمان چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کے پیٹے میں آ گئیں مگر وہی آن بان' وہی شان ہے۔ کیا قیامت کی چھب ہے کہ صلی علی۔ ان سے بہتر سبزی پری کا سوانگ اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ اللہ نے گلے میں نور اتار دیا ہے۔ کیا گاتی ہیں۔ کیا آپ لکھنو کے باشندے نہیں؟'' کمال جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

اتنے میں کالے دیو کی گرجدار آواز آئی:

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان

تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان

تو اپنے معشوق کو۔۔

اب شہزادہ گلفام اسٹیج پر آ چکا تھا۔ اس نے لہک کر گایا:

محلوں میں رہتا ہوں میں، عیش ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا، نام مرا گلفام

پھر اس نے بڑی دلدوز آواز میں کہا:

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

وہ لوگ بارہ دری سے باہر آ گئے۔ اندر سے شاہزادے کی آواز آ رہی تھی:

اڑ کے تو جائے گی اک پل میں پرستان کے بیچ
ہاتھ پھیلا کے میں رہ جاؤں گا ارمان کے بیچ

باہر جل پریوں کا پھاٹک، چینی باغ، جلو خانہ ______ سب جگہیں روشنی سے بقعہ نور بنی ہوئی تھیں۔ کنج میں سری کرشن کا رہس ہو رہا تھا۔ جان عالم گیروا کپڑے پہنے، دھونی رمائے، ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میلے والے، شہر کے باشندے سب گیروا جوڑے پہنے تھے۔ درگا پرشاد کتھک مولسری کے سائے میں پھول کی تھالی کے کنارے پر ناچ ناچ کر بھاؤ بتا رہا تھا۔ فواروں سے معطر پانی ابل رہا تھا۔ باغ کی نشستیں سنہرے اور نقرئی روغن سے چمک رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔

بارہ دری سے جوگن کی بھیرویں کی تانیں بلند ہو رہی تھیں:

تارکشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانک کے
ہو شب ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی

آئی، بہار ساقیا! جام شراب دے پلا
پھول کھلے، پھلے شجر، ابر اٹھا، ہوا چلی
بہکے زمین شعر میں پاؤں امانت اپنا کیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا، نکلا زبان سے یاعلی

جوگن کی آواز رفتہ رفتہ چاندی میں ڈوبتی گئی۔

یہ لوگ میلے والے کے ہجوم سے نکل کر پھر سڑک پر آ گئے۔ موٹر میں بیٹھ کر نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے آگے نکلے۔ جدھر روشن الدولہ کی سرخ رنگ کی عمارات تھیں سڑک کے اس پار چھتر منزل کے محلات نیم تاریکی میں استادہ تھے۔ اندر والتس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پھاٹک کے اندر جا کر انہوں نے کار روکی۔ لکھنو کا اعلیٰ فیشن ایبل طبقہ سیٹر ڈے نائٹ منا رہا تھا۔

''آج شاید گورنر بھی آیا ہوا ہے۔ ابھی ایک اے۔ ڈی۔ سی کو میں نے اندر جاتے دیکھا'' ہری شنکر نے اظہار خیال کیا۔

''کون والا اے۔ ڈی۔ سی، وہی سی جو اطالوی چغلو معلوم ہوتا ہے'' طلعت نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''بکومت ـــــــ تم ہر ایک پر اعتراض کرنے کو تیار ـــــــ سی ہے تو ہوا کرے، تم سے مطلب؟'' کمال نے ڈانٹا۔

وہ اندر جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ عامر رضا نے مشروبات کا آرڈر دیا۔ مس ایڈن نے لکھا تھا: ''الف لیلٰے کی زبیدہ نے اپنے نشاط باغ کو خلیفہ کے تصویر

خانے سے ہارنے کی شرط بدی تھی' وہ نشاط باغ مجھے یقین ہے یہی رہا ہوگا۔'' کمال اکتاہٹ کے ساتھ ستونوں کے نارنجی نقش و نگار دیکھتا رہا۔

فلور پر مشہور نام تیر رہے تھے جو 'اون لکر' میں چھپتے تھے اور گرمیوں میں مسوری' نینی تال' شملے اور دارجلنگ میں جگمگاتے تھے۔

''ان کا بھی ایک زمانہ ہے۔'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔

باہر سیڑھیوں کے نیچے گومتی آہستہ خرامی سے رواں تھی' وہ سب اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹیرس سنسان تھا۔ سیڑھیوں پر نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ ننگے پاؤں بیٹھے تھے' انہوں نے اپنا ایک جوتا لہروں میں پھینک دیا تھا' جب وہ ذرا بہتا ہوا دور نکل جاتا تو یہ تالی بجاتے تا کہ چوبدار آئے۔ جب کوئی چوبدار نہ آتا اور محض ہال روم کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی رہتی تو خود اٹھ کر پانی پر جھکتے اور جوتا نکال لیتے' تھوڑی دیر بعد دوسرا جوتا پانی میں پھینک دیتے' اسی طرح وہ بیٹھے اپنا دل بہلاتا رہے تھے۔ دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر گوتم نے آگے بڑھ کر ان کو بھی سگریٹ پیش کیا۔

''نہیں۔ ہم مشکبو گڑگڑی پیتے ہیں۔ کوئی ہے۔''

''معاف کیجئے گا۔ ہم لوگ ہیں۔'' گوتم گھبرا کر کہا۔

''تم لوگ کون۔'' انہوں نے بے دماغ ہو کر پوچھا۔

''بس ہم ہی لوگ۔'' وہ خاموش ہو گئے۔

''ان کو یہیں چھوڑ دو____ کیا کریں گے ہم ان کا۔ آؤ چلو۔ یہاں سے۔'' کمال نے چپکے سے گوتم سے کہا۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کو پانی کے کنارے تنہا اپنے جوتوں سے کھیلتا چھوڑ کر وہ پھر سڑک پر آئے اور پرانے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں کہارنیں اور پالکی برادر اور مہریاں اور یکے والے گھوم رہے تھے۔ سبزی فروش، بساطی، کمہار، شہر کی اصل آبادی، اصل اہل زبان، وہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزرے جس کے اندر انسان مر رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے آگے گنجان پراسرار شہر تھا۔ حویلیاں، پھاٹک، احاطے، چھتے، پیچ در پیچ تنگ و تاریک گلیاں جن کے اندر ایک دنیا آباد تھی، آصف الدولہ کا چوک، نخاس، اکبری دروازہ، سبزی منڈی، حسین آباد، گول دروازہ، کٹوریہ پارک، بڑا امام باڑہ، مچھی بھون، رومی دروازہ۔

آصف الدولہ کا لکھنو لکھنو کا دل، سڑکیں اور گلیاں اب سنسان پڑی تھیں۔ یکلخت بارش کی پھوار شروع ہوگئی۔ بہار کی بارش جو چند منٹ برس کر کھل گئی۔ آسمان پر سے اندر کے ایراوت ہاتھی کی طرح ایک بادل جھومتا ہوا نکل گیا۔ سامنے ایک بالا خانے پر روشنی ہو رہی تھی۔

''میرا ہمیشہ جی چاہا کہ اوپر جا کر کمرہ دیکھوں'' طلعت نے کہا۔

''ارے یہ تو تنویر کا مکان ہے جو ریڈیو اسٹیشن آتی ہے۔'' نرملا نے کہا، نیچے اس کی اسٹوڈی بیکر کھڑی تھی۔ '' اس کے پاس چلیں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے بے چاری۔ سرمایہ دارانہ نظام کی شکار۔ چلو اس کے پاس چلیں۔'' طلعت نے مصر رہی۔

''بکو مت۔'' چمپا نے ڈانٹا۔

''ارے بجیا، آپ کو تو اس طبقے کو سوشیولوجیکل نقطہ نظر سے۔''

''بحث مت کرو۔ خاموش رہنا سیکھو۔'' گوتم اور کمال موٹر سے باہر اترے کھڑے تھے اور رات کی تازہ ہوا ناک میں داخل کر رہے تھے۔

دکانوں کے برآمدے میں سے ایک بوڑھا ہندو جامدانی کا انگرکھا پہنے لکڑی ٹیکتا گزرا۔ ان نوجوان لڑکوں کو ایک بالاخانے کے نیچے موٹر روکے کھڑا دیکھ کر اس نے آہستہ سے لاحول ولاقوۃ کہا اور آگے بڑھ گیا' پھر وہ لوہے کے پل پر سے گزرتے ڈالی گنج ہوتے فیض آباد روڈ پہنچے۔ سامنے چاند باغ تھا' دوسری طرف بادشاہ باغ۔

''آؤ پروفیسر بنرجی کے پاس چلیں۔'' انہوں نے نعرہ لگایا۔

وہ بادشاہ باغ کے شاہی پھاٹک میں داخل ہوئے جو کیلاش ہوسٹل کے پہلو میں کھلتا تھا۔ باغات یہاں بھی معطر تھے۔ نہر کے سرے پر سرخ بارہ دری چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ ٹیگور لائبریری کی عظیم الشان جدید وضع کی عمارت پر سکوت' پر جلال نظر آرہی تھی۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے _____ عمارت نے کہا_____ میرے اندر آؤ' میں تمہارے دکھ بھلا دوں گی۔

''الفاظ دکھ بھلاتے نہیں' دکھ اور گہرا کرتے ہیں۔'' گوتم نے جواب دیا۔

''خاموشی سب سے افضل ہے۔ اسی لیے لوگ منی ہو جاتے ہیں۔ خاموش رہے ہیں' ہری شنکر نے کہا۔''

''وہ نہر کے پل پر جا کر بیٹھ گئے۔ یونیورسٹی کی عمارات پر چاندنی برسا کی۔ نصیر الدین حیدر کا بادشاہ باغ۔

بے چارے نصیر الدین حیدر۔

پھر انہوں نے پروفیسروں کی کوٹھیوں کی طرف چلنا شروع کیا' دور درختوں میں چھپے ہوئے اپنے لان پر پروفیسر بنرجی خاموشی سے ٹہل رہے تھے۔

''یہ جانے مسائل کا حل کس طرح سوچ لیتے ہیں؟'' کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

''شب بخیر ــــــ پروفیسر ــــــ'' انہوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا اور واپس آ گئے۔ یونیورسٹی کا سارا فاصلہ طے کرتے کواڈرینگل میں سے گزرتے وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو یونیورسٹی روڈ کے متوازن شلتی ہوئی موتی محل برج پر جا نکلتی تھی۔ اس کے سرے پر رجسٹرارز آفس تھا۔ سامنے کبوتر والی کوٹھی تھی جس میں وائس چانسلر رہتا تھا۔ برج پر آن کر انہوں نے ایک بار چاروں اور نظر ڈالی اور پھر کچے راستے پر اتر گئے جو سنگھاڑے والی کوٹھی طرف جاتا تھا۔

آدھی رات کا گجر بجا۔ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر ندی کے بہتے پانی کو دیکھا' وہ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیوں پر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' چمپا' طاعت' نرملا اور تہمینہ دوسری سیڑھی پر موجود تھیں۔ کمال اور ہری شنکر اور عامر رضا پانی میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے سامنے دوسرے کنارے پر امام باڑہ نجف اشرف اور موتی محل اور چھتر منزل خاموش کھڑے تھے۔ کشتی سامنے سے گزر گئی۔

وقت کا سحر زائل ہو چکا تھا۔

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

گوتم نے آہستہ سے دہرایا۔

''افوہ ـــــــ گوتم بھائی ـــــــ تم تو اندر سبھا کے شعروں پر اتر آئے۔ کس قدر ڈیکیڈنٹ ہو!'' طلعت کہہ رہی تھی۔

وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو یار اب محفل برخاست کی جائے۔ ساری رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزر دی ـــــــ'' کمال کی آواز آئی۔

وہ سب منتشر ہو کر اپنی اپنی نیندوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں شانتا کا خط بھی مکمل نہ کر سکا۔ گوتم نے اپنے جائے قیام کی طرف جاتے ہوئے اداسی سے سوچا۔

۵۱

پروفیسر بنرجی بین الاقوامی شہر کے مالک ماہر اقتصادیات تھے' ان کی کوٹھی پر بھی بڑی اداسی چھائی رہتی اور مکمل سکون۔ ان کا گھر سچ مچ علم کا مسکن تھا۔ پر امن' خوبصورت اور خاموش۔ سہ پہر کو اکثر لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں لیے ان کے گھر پہنچتے۔ پروفیسر ان کو سیمل کے درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھے نظر آ جاتے یا اندر چاء کی میز پر بیٹھے ہوتے اور کھانے کے کمرے کے خنک اندھیرے میں سائیڈ بورڈ پر رکھے چاندی کے برتن جھلملایا کرتے' اس وقت وہ اپنے شاگردوں سے بڑ اداس آواز میں باتیں کرتے۔ پروفیسر کے یہاں کی مجلسوں میں گوتم نیلمبر خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا' اس کے بغیر اب محفل مکمل نہ سمجھی جاتی۔

جاڑوں میں لان پر دھوپ میں اور گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں مذہب' فلسفہ' سیاست' عمرانیات' آرٹ' ادب۔ ذہن کی دنیا وسیع تھی بڑی پرکشش' بڑی تکلیف دہ اور انتہائی پرخطر۔

''پروفیسر ______'' ایک روز چمپا نے پوچھا'' ذہن اور جذبات کی کش مکش سے کس طرح نجات ملے گی؟ چاروں اور یہ سائے پھیلے ہیں۔ جس طرح جنگل میں جھکڑ چلتا ہے تو درختوں کے سائے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ یہ کش مکش ہر سطح پر جاری ہے قومیں' حکومتیں' انسان' فرقے۔ ہر طرف یہ سب ایک دوسری سے الجھے ہوئے ہیں۔ میرے آس پاس چاروں کھونٹ خوف کی عملداری ہے اور بے اطمینانی' نفرت' کھنچاؤ' دہشت' وفاداریوں کی کش مکش' اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے اگیا بھتال اپنے چراغ دکھاتے ہیں اور جب ان کی طرف دوڑو تو پلک جھپکتے میں غائب۔ مجھے بڑا شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

''جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیلا بھارگوا کے' پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیونکہ میں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرتی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں لہٰذا میری تہذیب دوسری ہے' میری وفاداریاں دوسری ہیں۔ میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گایا ہے لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے۔ میں تو اسی ملک کی باسی ہوں' اپنے لیے دوسرا

ملک کہاں سے لاؤں؟ ہجرت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہودیوں کو دیکھو کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ وفاداریوں کی کش مکش کا سامنا کرتے ان کو ہزاروں سال بیت گئے' وہ جرمن ہوں تب بھی یہودی ہیں' امریکن ہوں تب بھی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی ایک نیا مسئلہ میرے سامنے آیا۔ غاصب قومیں ایک ملک کے باشندوں کو نکال باہر کرتی ہیں اور وہ لوگ سیاسی پناہ گزینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان پر ترس کھایا جاتا ہے' چندے جمع ہوتے ہیں' ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں۔ دو طرح کے پناہ گزین تھے: ایک وہ جنہوں نے اپنی مرضی سے ترک وطن کیا' دوسرے وہ جن کو مجبوراً نکلنا پڑا تب مسلم سیاست میں ایک نئی آواز سنائی دی' میں نے دیکھا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بخوشی اور بڑے ارمان کے ساتھ ترک وطن پر آمادہ ہیں اور ایک نیا ملک بسانا چاہ رہے ہیں' مجھے اکثر یہ تصور بہت بھایا کیونکہ رومان اور عینیت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں کسی نئے خیال پر عمل نہ کیا جاتا' نہ خواب دیکھے جاتے مگر اس خواب کا دوسروں کے خوابوں سے تصادم ہو گیا۔ کش مکش اور تصادم کا مجھے پھر سامنا کرنا پڑا۔

''امن اور جنگ کا مسئلہ بہت کٹھن ہے' میں نے ٹالسٹائی پڑھا اور گاندھی اور وڈ رو ولسن' لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے؟ سیاست میں مہاتما گاندھی کی روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیے اور قائد اعظم جناحؒ کے اسلام کا کہاں تک؟ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاکت خیز ہے۔ ایک دفعہ بچھڑے تو کبھی نہ مل سکیں گے' مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی

ایک نہ تھے' یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی ایک نہ تھے' یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی ہے۔''

''تم نے کبھی غور کیا۔'' پروفیسر نے اوپر درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی ایک گوریا کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا' ''تم ہسٹری کی طالب علم ہو____ کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تھے۔ جنگیں ہوتی تھیں مگر وہ سیاسی تھیں۔ ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جنرل اور سپاہی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے۔ سیاسی گروہ بندیاں تھیں' پھر انگریزوں نے دنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں' ہزاروں قومیں بستی ہیں' ہندو مسلمان ایک دوسرے سے منفر ہیں' یہ ملک ایک ملک نہیں ہے محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخ راجستھان' ہی دیکھ لو یا انیسویں صدی کے سفرنامے' لیکن تم کو ۵۷ء یاد ہے جب اسی لکھنو میں ہندو امراء اور رعایا نے برجیس قدر کی حکومت کو' جو بہر حال مسلمان حکومت تھی' بچانے کے لیے اپنی جانیں لڑائیں' مگر ہمارا موجودہ مذہبی جنون۔''

''مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے؟ آپ تو خود بڑے پکے ویشنو ہیں۔''

ویشنو بھگتی کا مذہب ہے' اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔

پروفیسر ہر مذہب کی بنیاد خالص محبت ہے' یہ کوئی بات نہ ہوئی۔

ہاں' لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حقیر نہ سمجھوں۔

''اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہوسکتا۔''

تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو‘ ایسا نہ کرو۔‘‘

’’پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت‘ میں کیا کر سکتی ہوں‘ کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں جو لوگ شامل تھے ان کو مذہبی دیوانے کہا جاتا ہے مگر اپنے نقطہ نظر سے وہ حق بجانب تھے‘ وہ اسلام کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا دو فرقوں میں بٹی تھی: کفر اور اسلام انہوں نے کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آخر کون یہ بتانے جائے گا کہ دوسرا انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے نقطہ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے پروفیسر کل رات ہم لوگ نرملا کے یہاں رات گئے تک بیٹھے رہے تھے‘ وہاں ہم ماضی کے متعلق سوچ رہے تھے اور وقت کے گورکھ دھندے کے متعلق۔ گھر واپس جا کر میں دیر تک جاگی‘ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا‘ اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا واپس جا کر میں دیر تک جاگی‘ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا‘ اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا تاریخ کا آخر آپس میں کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہیے‘ ہم مسلسل جرم و سزا کے مسئلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی پراشچت ہم کو کرنا پڑتی ہے‘ میری قوم نے جو جرم کیے ہیں یا کر رہی ہے بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہو گا کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپیگنڈے کی مشینری کے ذریعے اپنے خیالات کا پرچار کر کے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ آج‘ اس لمحے تک‘ ہوا اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے۔ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا کفارہ آنے والی نسلیں ادا کریں گی۔ میری وجہ سے یا دنیا تباہ ہو گی یا پر مسرت۔ تاریخ میں نفرت اور تعصب کے مسائل پر میں جتنا غور کرتی ہوں اتنی ہی

مجھے وحشت ہوتی ہے' مجھے آپ سے ذاتی طور پر نفرت نہیں مگر کمیونٹی کا اسٹیریو ٹائپ کے نفرت اور تعصب کے تصورات کا بھی بہت تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے' میں تاریخ کی بات کر رہی تھی۔ پروفیسر کل میں نے نرملا کے گھر سے لوٹ کر کتابوں کی الماری کھولی اور ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ میں آ گئی جس میں انیسویں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اس میں ایک نظم بھی درج ہے۔ فیض آباد کا ماجرا ہے جو اجودھیا کہلاتا ہے۔ لکھا ہے۔ مغل بادشاہوں اور ان کے صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجدیں بنائیں' جب مندر گرے تب بھی ایک ہندو جوگی املی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑھے بیٹھا رہا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھاکر دوار بنانے کی کوشش کی۔ بڑا فساد رہا' فوج کشی ہوئی۔ فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔ بڑا خون خرابا ہوا۔ مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطان عالم کو عرضی بھیجی جو نظم کی صورت میں تھی' میں نے وہ نظم نقل کر لی تھی۔ آپ کو سناتی ہوں۔''

اس نے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے پروفیسر کو سنانا شروع کیا:

مجاہدین کی عرضداشت بادشاہ اودھ کی خدمت میں

قریب دیر مہابیر واجب التعزیر

بنا تھی مسجد اسلام ہم چو بدر منیر

لگے بنانے بڑھا کر یہ کافر مقہور

سوار مسجد اقدس میں خانہ لنگور امید ہے کہ شہنشاہ قبلہ عالم

ابوالمظفر و منصور و خسرو اعظم

شہپر رفعت و قدسی صفات' والا جاہ

خدیو کشور ہندوستاں' فلک درگاہ

زبان فیض مبارک سے یوں کریں ارشاد

کہ کافران اودھ پر شتاب ہوئے جہاد

روانہ ہوگا شتابی کو لشکر اسلام

برائے غارت وتاراج شہر لچھمن و رام

"یہ مذہب کا تعصب ہے اپنی خالص ہیئت میں گویہ ایک علیحدہ بات ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کہ وہ عرضداشت پر کان دھرتے انہوں نے الٹی مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاہدین لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور رایودھیا میں امن قائم ہوا۔ یہ واقعہ انتزاع سلطنت سے صرف ایک سال قبل ۱۸۵۵ء کا ہے۔ یہ بھی ایک علیحدہ بات ہے کہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر' بتاؤ' میں کس کس سے نفرت کروں؟ انگریزوں سے' جنہوں نے میرے بے قصور بادشاہ کو معزول کیا یا اس کلمہ گو بادشاہ سے نفرت کروں' جو ہندو دیومالا کا عاشق تھا' کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کا قتل کرواتا تھا؟ ان مجاہدین سے متنفر ہوں جو لچھمن اور رام کے پرامن خوبصورت شہر کو تاراج کرنے جارہے تھے؟ یا ان ہندو جوگیوں کو موردالزم ٹھہراؤں جو رام گھاٹ پر

دوبارہ ہنومان کا مندر بنانا چاہ رہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراؤں؟''

''اب کمال قریب آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور چمپا کے ہاتھ سے نظم لے کر پڑھنے لگا۔ لان پر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔''

''اور پھر تم متوقع ہو۔'' کمال نے کہنا شروع کیا'' تم جو فخریہ اپنے آپ کو بت شکن کہتے ہو اور سومنات سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے' اس کے باوجود ہندو تم سے محبت کریں گے۔ یہ اچھی دھاندلی ہے۔''

''کمال! تم تو بالکل مہا سبھائی ہو۔ اچھے خاصے۔ تم سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ تم نفرتوں سے آزاد بڑی وسیع النظری کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمہاری اس شدت کی قوم پرستی بذات خود ایک اور تعصب ہے۔'' چمپا نے کہا۔

''اس منطق کا میں جواب نہیں دے سکتا۔'' کمال نے کہا' وہ دونوں اٹھ کر سرو کے درختوں کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔

''اصل قصہ یہ ہے چمپا باجی کے مسلمان قوم کی سائیکولوجی عجیب وغریب ہے' تم کو کبھی اس سرزمین سے محبت نہیں ہوئی۔ چھوٹتے ہی 'میرے مولا بدلے مدینے مجھے' کا نعرہ تم نے لگایا۔ رہیں ایک ہزار برس یہاں' تہذیبی اور روحانی ناطہ جوڑ رکھا عجم اور عرب سے' پھر مجھے مہا سبھائی بنا رہی ہو۔ واہ بھئی ______ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قومی جدوجہد میں ہر جگہ مسلمانوں نے بھانجی ماری اور فوراً غیر ملکی عناصر سے جا ملے۔'' اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جوش سے کہنا شروع کیا۔ ''کیا واقعہ نہیں ہے کہ ۳۷ء میں جب کانگریس گورنمنٹ نے صوبے میں شراب پر پابندی لگائی تو مسلمانوں نے فوراً اس کے خلاف ایجی ٹیشن کیا کہ ان کے مہذب

میں شراب پہلے ہی حرام ہے لہٰذا ان کے اوپر یہ قانون حائد نہیں ہوتا' انہیں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا تم اس کی تردید کرو گی کہ جب لیگ نے یوم نجات منایا تو راجندر بابو نے کہا لیگ نے جو الزامات۔''

''کیا کانگریس حکومت نے مسلمانوں پر ظلم نہیں توڑے ______؟'' چمپا نے بات کاٹی۔

''یہی عرض کر رہا ہوں ______ راجند بابو نے کہا کہ لیگ نے جو الزامات کانگریس حکومت پر لگائے وہ فیڈرل کورٹ کے سامنے انکوائری اور فیصلے کے لیے رکھے جائیں۔ لیگ نے یہ بھی منظور کر دیا اور رکہا کہ یہ معاملہ رائل کمیشن کے سامنے البتہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس پر برطانوی حکومت تیار نہ ہوئی ______''

''ہاں' کیونکہ برطانوی گورنروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی اپنی طرف ملا لیا تھا ___''

''تمہارا خیال ہے کہ طرطانوی گورنر وفادار مسلمانوں کو چھوڑ کر کانگریس کا طرفدار ہو گیا تھا۔ ہوش کے ناخن لو چمپا باجی۔ ۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعے ان کو اقلیتوں کے تحفظ کے مخصوص اختیارات دے دیے گئے تھے۔''

''چنانچہ یہ تم مانتے ہو کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں موجود ہے۔''

''یقیناً ______'' کمال نے گلا صاف کیا' ''لیکن یہاں روس کی طرح ملٹی نیشنل اسٹیٹ بن سکتی ہے۔''

''یہی تو مصیبت ہے کہ تمہارے ساتھ جو بات کرو تان جا کر ماسکو پر ٹوٹے گی۔'' چمپا نے کہا۔

''اور آپ کی تان جا کر مکے مدینے پر ٹوٹتی ہے ______ ایٹم کے عہد میں قرون وسطیٰ کے مذہبی تصورات لیے پھر رہی ہیں۔''

''دیکھو۔ تم پنڈت نہرو کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرایا کرو۔''

''کیوں نہ دہراؤں؟ دیکھیے چمپا باجی ساری بات یہ ہے کہ مسلمان سماجی طور پر پسماندہ ہے اور مذہب اس کے لیے ایک بہت واضح تصور ہے ______ انتہائی شخصی اور ذاتی۔ ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔ ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں وہ جن کو چاہے مانے جن کو چاہے رد کر دے۔ ایک مخصوص قسم کی تنگ نظری ہے' ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی' پھر اس کی انٹلجنسیا نے سائنٹیفک ہونا سب سے پہلے سیکھا' وہ مہذب کے بارے میں جذباتی نہیں۔ اس کا ذہن انتہائی ریشہ دوانی اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ حساب کتاب' جمع تفریق۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا رسول کا عاشق۔ بات بات پر ہجرت پر تیار ترکی میں کسی کو چھینک آئی' آپ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کانٹا چبھا' یہ بیکل ہو گئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کا نہ ہوا' مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں اجمیری پیا بھی ہیں محبوب الٰہی بھی۔ یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں نے بنایا تھا مگر اس اسلامی بین الاقوامیت کے چکر نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔''

کمال نے چلتے چلتے ایک میز پر سے اٹھا کر پانی کا گلاس پیا۔ ''مسلمانوں کی ساری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو ______ '' اس نے تھوڑی دیر بعد کہنا شروع کیا ''ہمیشہ ملک گیری اور ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑ کے۔ شان و شوکت امپیر

یلزم کی جس قدر شائق یہ قوم ہے میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ بنوامیہ‘ بنو عباس‘ ایران کی حکومتیں‘ عثمانی ترک‘ ہندوستانی مغل‘ افغان‘ عرب‘ مصری سب نے آپس میں کیا کیا خونریز جنگیں کی ہیں۔ اس وقت ان کا اسلام کہاں گیا تھا؟ مار اسلام اسلام کی رٹ لگا رکھی ہے۔‘‘

’’لیکن خلفائے راشد کا زمانہ ــــــــ‘‘

’’چمپا باجی ــــــــ کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو؟ رسول خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی تو تمہاری ملت بیضا نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ جنگ جمل بھول گئیں ــــــــ آج تک وہ زخم ہرے ہیں۔ تعصب اور نفرت۔ تعصب کے مسئلے کو تو تمہارا اسلام بھی حل نہ کر سکا۔ میں لکھنو کا شیعہ ہوں‘ مجھ سے پوچھو‘ شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے کس قدر متنفر ہیں۔ نہیں چمپا باجی ــــــــ مجھے مذہب نہیں چاہیے۔ فقہ اور حدیث اور امام غزالی اور ابن خلدون سب ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے سامنے دوسرے مسائل ہیں۔ انسان کو امن چاہیے اور روٹی۔ اس کے بعد وہ یقیناً افکار غزالی پر غور کر سکتا ہے۔‘‘ اب وہ پھر پارٹی لائن چلا رہا تھا۔

کمال موجودہ نسل کا نمائندہ لڑکا تھا: ذہن پرست‘ باصول‘ ایماندار شدید طور پر پرخلوص‘ تصور پرست۔ چمپا اسے غور سے دیکھتی رہی۔ عامر رضا‘ جنہوں نے اس سے صرف فرانسیسی پروشل شاعری اور وی آنا کی موسیقی کی باتیں کی تھیں کسی دوسرے دنیا میں بستے تھے۔ کمال اور گوتم اور ہری شنکر ــــــــ یہ لوگ ان سے کس قدر مختلف کتنے بلند تھے۔

مگر وہ تو گلابوں کی دنیا میں جانا چاہتی تھی‘ جہاں دیوار کے درختوں میں چھپے

ہوئے کالج میں اور جن میں شوپال کی موسیقی بجتی ہے۔

"ہماری لڑکیوں اور عورتوں کو ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں جیلوں میں کوڑے لگائے گئے۔"

اس کے کانوں میں کمال کی آواز آئی' وہ جوش کے ساتھ بولے جارہا تھا:

"ہمارے لیڈروں نے پندرہ پندرہ برس کی قید تنہائی کاٹی۔ تم' جو جیل جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہو' ذرا سوچو' زندگی اور آزادی کسے عزیز نہیں؟ عمر عزیز کے ان گنت سال جیل میں کاٹ دینا کسے پسند ہے؟ محض ایک اصول' ایک نظریے کی خاطر ہزاروں لوگوں نے جا کر قید خانے میں چکیاں پیسیں اور برطانوی سپاہیوں کے ظلم سہے۔ کیا یہ لوگ محض شہرت اور نام و نمود کے بھوکے تھے؟ کیا خالی جذباتیت کی بناء پر انہوں نے یہ قربانیاں دیں؟ انسان کو زندگی صرف ایک مرتبہ زندہ رہنے کے ملتی ہے اور اس زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے جیلوں میں گزار دیا۔ ہنستی خوشی جا کر کال کوٹھڑیوں بند ہو گئے۔ سیاسی جدوجہد بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا مذاق نہ اڑانا۔ اس آگ میں تپ کر جو لوگ نکلتے ہیں وہ کندن کی مانند ہیں۔ جو لوگ آپ کی طرح آرام کرسیوں پر بیٹھ کر ان پر ہنستے ہیں اور پھر بھی قوم کی ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔ گھٹیا لوگ اور بڑے انسان سب آپ ہی الگ الگ راستوں پر چلے جائیں گے' تم کو معلوم ہے دہرہ دون جیل میں پنڈت جی کی کوٹھڑی میں سانپ اور بچھو تھے۔ کن کن مصایب کا ان سب نے سامنا کیا' مگر اب بجائے اس کے کہ متحد ہو کر ہم ایک عظیم طاقت بنتے ہم انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔" کمال کا

چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

''تم بڑے پکے نیشنلسٹ ہو کمال؟'' چمپا نے خائف ہو کر پوچھا۔

''ہاں ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنلسٹ ہوگا۔ کیا وجہ ہے کہ ملک کے اکثر مسلمان اخلکچول قوم پرست ہیں؟ کیا وہ سب ضمیر فروش ہیں؟ کانگریس نے ان کی رشوت دے رکھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈور چمپا باجی اور ایک اور بات۔'' اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا'' تمہارے نزدیک سیاست صرف شہروں کی سیاست ہے' تم دیہات سے واقف نہیں۔ شہروں میں رجعت پسند سرمایہ دار ہیں جو اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کا اچھار رہے ہیں۔ تم کبھی کسی گاؤں میں گئی ہو؟ اگر مادھو پور کی ہندو لڑکی بیاہ کر کرن گنج جائے تو مادھو پور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پیے گا کیونکہ وہ اس کی بیٹی کی سسرال ہے' یہ انسانیت کی اقدار چمپا جی جو مذہب اور سیاست سے بلند تر ہیں۔''

اب شام کا اندھیرا اچھا رہا تھا۔ لان پر درخت کے نیچے طلعت بیٹھی گوتم اور چند لڑکوں سے باتیں کر رہی تھی' وہ اٹھ کر ان کی طرف آ گئی۔ کمال کہتا رہا'' ہماری ساری سیاست کی اصل بنیاد مراعات حاصل کرنے کا مقابلہ تھا۔ مسلمانوں کو اتنی ملازمتیں ملنا چاہیں' سکھوں کو اتنی' ہندوؤں کو اتنی۔ مڈل کلاس سیاست۔ مجھے بتاؤ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں مڈل کلاس اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور کسان اور کاریگروں کا تناسب کیا ہے اور ہنر ہائی نس دی آغا خان کیا ان کسانوں اور کاریگروں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ان میں اور احمد آباد یا بمبئی کے کسی دوسرے سیٹھ میں کیا فرق ہے؟ وہ برلا اور ڈالمیا۔''

''افواہ ______ '' چمپا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے'' وہی کمیونسٹ پارٹی کے گھسے پٹے دلائل۔''

''تم سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے چمپا باجی۔'' کمال نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

طلعت اب ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھی۔ ''تم نے آج کا اخبار پڑھا؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' کمال نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

''کیا ہوا۔'' چمپا نے پوچھا۔

''میرے بابا' خان بہادر نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور' لیگ میں شامل ہو گئے ______ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہ ٹاپ پر لوٹ گئے۔''

''ماما سے مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ ______ '' طلعت نے کہا۔

''تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات ______ '' کمال نے کہنا شروع کیا۔

''بابا سمجھتے ہیں کانگریس تعلقداروں کو ختم کرنے کے در پے ہے۔ کانگریس حکومت بنتے ہی پھر وہی کھڑاگ شروع ہو جائے گا: زرعی اصلاحات اور یہ اور وہ۔ انہیں نیشنلزم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ فیوڈل اقدار کے آخری رکھوالے ہیں' مجھے ان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ میں اپنے والد کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا ہوں' میں گھر جا کر ان سے بحث نہیں کروں گا مگر مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ اس سرزمین میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ترک وطن کر کے سندھ اور بلوچستان کو اپنا ملک کیسے سمجھیں گے۔ بابا بوڑھے آدمی ہیں' میں ان کو اس وقت دل شکستہ نہیں دیکھنا چاہتا مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہوگا۔''

''کمال وطنیت اتنی بڑی چیز نہیں۔ تصور اصل چیز ہے' اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہی میں مسلمانوں کی بقا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون؟ کیا تم آزادیٔ افکار کے قائل نہیں؟'' چمپا نے جواب دیا۔

''وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں پھینکا جا سکتا۔'' طلعت نے غصے سے کہا۔

''کیا وطن ہے یار! بکواس۔ مسلمان کا وطن سارا جہاں ہے۔'' چمپا نے کہا۔

طلعت اسے غور سے دیکھتی رہی۔ ''بجیا آیئے۔'' اس نے کہا'' پروفیسر چاء کے لیے بلا رہے ہیں۔''

پروفیسر کے قریب ہی گھاس پر گوتم بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر چمپا کو نمستے کیا۔

''چمپا باجی مسلم لیگی ہوگئی ہیں بڑ بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے ایک بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے لہٰذا کل سے وہ ہماری محفلوں میں نہیں آئیں گی۔'' کمال نے تلخی سے کہا۔

شام کی نیلگوں روشنی میں وہ درختوں کے قمقموں کے نیچے بیٹھے رہے۔ فضا کا غم گہرا ہوتا گیا۔

چمپا چلو' نو بجے سے ریہرسل شروع ہے'' پھولوں کے پرے سے کسی لڑکی نے پکارا۔

''اچھا۔'' وہ سائیکل سنبھال کر پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے روش پر سے گزرتا دیکھتے رہے۔

کیلاش ہوسٹل میں سالانہ ڈراما تھا۔لڑکیاں ہفتوں سے تیاری میں جتی تھیں شام کو ہال میں یا گھاس پر ریہرسلیں کی جاتیں۔موسیقی کمپوز ہوتی۔ناچ کی مشق کی جاتی۔کوسٹیومز کے ڈیزائن تیار ہوتے۔اسٹیج کے ڈیکور پر بحث ہوتی۔فیروز جبیں نہایت تندہی سے سب کو پارٹ یاد کروا رہی تھی۔کملا انارکلی تھی۔طاعت دلارام‘ای نڈ سلیم‘ ایک اور سوانگ‘ پھر کواڈرینگل میں اسٹیج تیار ہوا۔وائس چانسلر اور اسٹاف اگلی قطاروں میں آن کر بیٹھے۔ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹرا نے اسٹیج کے پیچھے برآمدے میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔اب کسم محل سرا میں کنزوں کے ساتھ بیٹھی گا رہی تھی۔

لب جو ہو فرش آب ہو‘ شب ماہ ہو‘ بادۂ ناب ہو

ای نڈ دریچے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ راوی کے نوجوان ملاح ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ انارکلی کہہ رہی تھی۔ ہندوستان کا شہزادہ اور کنیز سے محبت ــــــ کیسی ہنسی کی بات یہ ــــــ سب خواب کی طرح گزرتا گیا‘ پھر پردہ گرا اور لوگ باتیں کرتے باہر نکلے۔

عامر رضا نے چمپا سے کہا: ’’ڈائریکٹر صاحب آپ نے کمال کر دیا۔‘‘

کمال نے کہا: ’’چمپا باجی بس سوانگ رچتی رہیے ــــــ انارکلی سے بہتر کوئی موضوع نہ مل سکا آپ کو؟ رومان پرستی کی بھی حد ہونی چاہیے۔‘‘ پھر وہ مجمعے میں غائب ہو گیا۔

گوتم نے قریب آ کر کہا: "شمپا باجی کیا آپ کمال سے خفا ہیں۔ اس روز پروفیسر کے یہاں کمال نے آپ سے کافی ست سخت باتیں کہیں، میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ زندگی میں اتنی اداسی ہے، اس اداسی میں اضافہ نہ کیجئے۔"

"نہیں۔" اس نے گوتم کو جواب دیا، "میں دراصل آج کل جینے کے مختلف رویے اسٹڈی کر رہی ہوں۔"

"میں اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالوں۔" طاعت نے بشاشت سے قریب آ کر کہا، وہ ابھی تک ولارام کا لباس پہنے تھی۔

"آج میری اس قدر تعریفیں ہوئی ہیں تو میں نے سوچا کہ میں کس طرح کا ایکسپریشن اپنے چہرے پر قائم رکھوں: وقار، بشاشت، سنجید گی ______ مصیبت یہ ہے کہ اگر انکسار برتو تو سمجھا جاتا ہے یہ احساس کمتری ہے ______ اور اگر انکسار نہ برتا جائے تو اسے غرور پر محمول کیا جاتا ہے ______ ہر ایک سے اچھی طرح باتیں کرو تو لوگ کہتے ہیں عجب چبلی لڑکی ہے ______ رکھ رکھاؤ سے رہو تو بوریا بد دماغ سمجھا جاتا ہے یا یہ کہ بے چاری چار آدمیوں سے بات کرنے میں گھبرا جاتی ہے، کونے گھوس ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان جیسا ہے اس کو ویسا ہی رہنا چاہیے۔ کبھی ایسی چیزوں کی تمنا نہ کرو جو بس سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر بھائی گوتم کو دیکھیے۔ ان سے باتیں کیجئے تو لگتا ہے افلاطون کے ساتھ مکالمہ ادا کیا جا رہا ہے۔ یا خلیل جبران کا المصطفیٰ دیواروں کے باغ میں مصروف گفتگو ہے۔ نہیں چمپا باجی۔ جینے کے رویے کے

متعلق نہ سوچئے۔''پھر وہ بھی چھلاوے کی طرح مجمعے میں غائب ہو گئی۔

گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا۔''کس قدر رٹراتی ہے یہ لڑکی ______''

''مجھے اس پر رشک آتا ہے۔اس کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں۔''چمپا نے کہا۔

''الجھنوں سے ہم سب خود کو بچا سکتے ہیں۔''

''واقعی؟''

''ہاں چمپا باجی۔''

''تم کبھی الجھنوں سے دوچار نہیں ہوئے۔''

''شاید ______ نہیں۔''

سڑک پر مورلی کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ہواؤں کے راگ بہر سریلے تھے'وہ دفعتاً پھاٹک کی پلیا کے پاس ٹھٹھک گئی۔''نہیں گوتم 'میں کمال سے خفا نہیں ہوں'مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔''

''آپ درجہ شہادت حاصل کرنے والی ہیں!یہ مظلوموں والا لہجہ کیوں؟''

''تم ______ تم لوگ بڑے کمینے ہو''اس نے تلخی سے کہا۔

''ہم لوگ محض بے حد پر خلوص ہیں'مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے اور وہ بھیا صاحب کے پاس موجود ہے ______''

''تم ______ تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو ______ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طویل شفاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک کے بعد ایک فراٹے سے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں ______ وہ پردے جن

پر خوبصورت تصویریں بنی ہیں اور مناظر۔اب آخر صرف ایک سیاہ پردہ باقی رہ گیا ہے۔''

''چمپا باجی' آپ کا پرابلم بے حد ذاتی ہے۔آپ کو بھیا صاحب سے بہت محبت ہے'بس ساری بات یہ ہے' باقی سب فروعات ہے ــــــــ اور آپ کا دوسرا پرابلم الفاظ ہیں۔'' گوتم نے حسب معمول پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح انکشاف کیا۔

نفرت سے چمپا نے اسے دیکھا: ''الفاظ''

''ہاں۔صریحاً۔میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔''

''اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟''

''کوئی چیز بے معنی نہیں۔خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔''

''طاعت ٹھیک کہتی تھی' تم بھی پوز کرتے ہو۔تم سے باتیں کرو تو لگتا ہے خلیل جبران کے المصطفیٰ سے گفتگو کی جا رہی ہے۔''

''چمپا باجی۔'' وہ گھبرا گیا۔''اللہ خفا نہ ہو جیئے ــــــ چلئے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلایئے' وہاں ہم ان مسائل پر مزید روشنی ڈالیں گے ــــــــ اور اللہ افسردہ نہ ہو جیئے۔انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔اگلے جنم کی کسے خبر ہے ــــــ آیئے ــــــــ''

چمپا چاند باغ کی ایک پہاڑی لیکچرر ریتا ڈکشٹ کے ساتھ کالج کے پیچھے ایک چھوٹی سی کاٹج میں رہتی تھی' وہاں پہنچ کر وہ دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے۔سامنے امرودوں کے اندھیرے باغ میں رکھوالا سگوں کو اڑانے کے لیے آوازیں لگا رہا تھا

جو رات کا بسیرا لینے کے لیے ٹہنیوں پر آن بیٹھے تھے۔

قریب ایک اور پروفیسر کوٹھی میں پیانو بج رہا تھا۔ چاند سوئمنگ پول کی لہروں میں تیرا کیا۔

گوتم بید کی کرسی پر بیٹھا کیلے کے جھنڈ کو دیکھتا رہا۔ چمپا کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''چمپا باجی۔ آپ بہت گریٹ آدمی ہیں خدا کی قسم۔''

''واقعی؟''

''چمپا باجی۔ ایک بات بتلایئے۔''

''پوچھو۔''

''آپ بھیا صاحب کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں۔''

''کئی سال سے۔''

''اور اتنے عرصے آپ نے کیا کیا؟''

''پڑھا اور کیا کیا!''

''اس کے بعد؟''

''اور پڑھا۔''

''اس کے بعد؟''

''بس پڑھتی چلی گئی۔'' چمپا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''اور بھیا صاحب کو اتنے عرصے سے برداشت کر رہی ہیں؟ جب پہلے ملی ہوں گی تو سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوں گی۔ ان کا خیال آپ کے لیے ایک بڑی

رئیسانہ عادت میں شامل ہو چکا ہے گو آپ خود رئیس نہیں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتلاؤں۔ آپ ذرا غور کرتیں تو معلوم ہوتا کہ آپ کا عشق ______''

''واہیات باتیں مت کرو۔''

''واہیات۔ غضب خدا کا آپ تو بڑی سخت بلواسٹوکنگ نکلیں۔ ارے عشق میں کیا خرابی ہے؟ بڑی عمدہ چیز ہے' میں خود اس میں اکثر مبتلا ہو جایا کرتا ہوں مگر متوسط طبقے کی لڑکیوں کا قاعدہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کو بہت برا سمجھتی ہیں۔ چمپا باجی' سوری۔ اتنا سہانا سماں ہے' مجھے چاہیے تھا کہ آپ سے بجوا کر سنتا ستار پر گت باگی شری' تین تال اور یہاں میں نے آپ کے پرابلمز کا تجزیہ شروع کر دیا۔''

''یہ دوسروں کے پروبلمز کا تجزیہ کرنا بھی بڑا زبردست ریکٹ ہے اور آپ بھولتے ہیں کہ آپ کے جیسے طالب علموں کو روز کالج میں پڑھاتی ہوں۔''

''میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔ ہماری ساری زندگی ایک سے پٹے پٹائے جملے دہراتے گزر جاتی ہے۔'' وہ منہ لٹکا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔ ''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رومینٹک ہونے کے لیے آپ کے بیا صاحب کون سے میز ازم استعمال کرتے ہوں گے' کون سے جملے دہراتے ہوں گے۔ سنا ہے' فرنچ بہت فرسٹ کلاس بولتے ہیں۔''

''لیکن آخر تم بھیا صاحب سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟'' چمپا نے کہا وہ دفعتاً جھینپ گیا۔ اس قدر جھنیا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''مجھے چڑنے دیجیے' آپ سے مطلب؟'' وہ اپنے جارحانہ حربوں پر اتر آیا۔

اتنا مضبوط انسان اور اس قدر کمزور لگا! چمپا نے حیرت سے سوچا۔

''مطلب یہ۔'' چمپا نے کہا'' کہ ہمارے گروپ کے سب لوگ بھیا صاحب کو بڑا بھائی سمجھ کر ان کی عزت کرتے ہیں۔ کم از کم تمہیں اس کا خیال تو کرنا چاہیے۔ تمیز بھی کوئی چیز ہے' یہاں آئے ہو تو ذرا تمیز بھی سیکھو۔ یہ کیا ہر سمے بلڑ' دنگا' فوجداری۔ یہ چنڈو خانہ ہی کیا کم تھا کہ اوپر سے تم بھی نازل ہو گئے۔''

''بھیا صاحب سے اگر آپ بیاہ فرما رہی ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو آسمان پر چڑھا دیں' ہر ہندوستانی لڑکی یہی کرتی ہے۔''

''میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں امریکن لڑکی ہوں؟ اور دوسری بات یہ کہ۔''

''دوسری بات یہ ہے چمپا باجی کہ آپ ان سے بیاہ کرتی عجب مسخری لگیں گی۔ اپی کی اور بات تھی' وہ تو پیدا ہی اسی لیے ہوئی تھیں' مگر آپ ______ حد ہے۔''

اب چمپا جھینپی۔ ''میں آپ سے رائے نہیں لے رہی ہوں۔'' اس نے فی الفور بزرگی طاری کر لی۔

''میں رائے کب دے رہا ہوں؟ اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی کہ مجھ سے رائے لیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی' مگر آپ ہیں کہ ______ آہ ______ اس بظاہر سمجھدار تعلیم یافتہ لڑکی کو دیکھو۔'' اس نے ٹہل ٹہل کر تھیٹریکل انداز میں کہنا شروع کیا: ''یہ معاشیات کی استاد' ڈائیلکٹکس کی طالب علم، برس سے کس مصیبت میں گرفتار ہے ______ اے رومانیت کی شکار نادان کنیا۔'' کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر وہ دہاڑا۔

''گوتم تم بالکل دیوانے ہو۔'' چمپا نے محظوظ ہو کر کہا۔

''اب یعنی آپ مجھے میری دیدی یا موسی کی طرح پچکارا بھی کریں گی۔ میں کہتا ہوں' یہ تک کیا ہے؟ یعنی غضب خدا کا' جو شخص پابندی کے ساتھ کلب جا کر اولڈ والٹس ناچے' پکنکوں اور پارٹیوں میں کالج کی لونڈیوں کی مووی کھینچتا پھرے' خود لونڈیوں کی طرح حسین ہو اور قیامت یہ کہ اپنے حسن پر نازاں بھی ہو______ اس کی آپ پسند فرماتی ہیں' اگر آپ کو عشق ہی کرنا منظور ہے تو مجھ سے ہی کر ڈالیے یا کمال اور ہری شنکر ہی میں کیا برائی تھی۔ ویسے ان کے علاوہ ہزاروں ہیں گو یہ علیحدہ بات ہے کہ میں بے حد منفرد ہستی ہوں۔'' اس نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا' پھر دوسرے لمحے اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''نہیں' چمپا باجی مصیبت یہ ہے کہ آپ لوگ روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایت' بھیا صاحب کے گلیمر کی روایت' گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کی روایت' دلکشی' کشش' جذب دل ______ مگر خالی دلکشی کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی تخلیقی کام ہی نہیں کرتیں۔''

''پڑھاتی جو ہوں۔'' چمپا نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ ایسا غیر متوقع، ایسا بے رحم حملہ اچانک اس پر کیا گیا تھا۔ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' وہ جو برسوں سے اپنے آپ کو' اپنے جذبات اور احساسات کو بے حد اہم سمجھتی آئی تھی' پل کی پل میں وہ خود کو بے حد قابل افسوس معلوم ہوئی۔ ''اب ہر ایک تو کلاکار نہیں بن سکتا'' اس نے با آواز بلند کہا۔

''کلاکار نہ بنئے۔ آج کل کلاکاروں کی تو فوج ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ کوئی بنیادی کام کیجئے۔ اتنا کچھ کرنے کو پڑا ہے۔'' اس نے چاروں اور نظر ڈال کر تھکی ہوئی سانس لی۔ ''آپ کو نظر نہیں آتا؟''

''نظر آتا ہے'' چمپا نے کہا'' لیکن زندہ بھی تو رہنا ہے۔ ملازمت کرتی ہوں مسلم اسکول میں ت و تین سو روپے مہینے کے ملتے ہیں' میرے ابا بہت معمولی حیثیت کے وکیل ہیں' میں تم رئیس زادوں کی طرح خالی غربت کی تھیوری سے واقف نہیں' مجھے تنگ دستی کی حقیقت معلوم ہے۔''

کسی اور موقعے پر اسے یہ گفتگو کرتے شرم آتی کیونکہ وہ خالص سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن گوتم اس کے سامنے فادر کنفیر کی طرح بیٹھا تھا۔ اس سے کون بات چھپائی جا سکتی تھی!

''اور بھیا صاحب سے بیاہ ہو گیا تو آپ بھی کلب جا کر اولڈ والٹس ناچیں گی اور رائڈ نگ کے لیے جائیں گی؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیا میں سرخ جھنڈا لے کر سڑک پر دوڑ پڑوں' کس قدر ایلی منٹری باتیں کرتے ہو' جس طرح کی بحث تم مجھ سے کر رہے ہو۔ ایسی ہی بحثیں کرتے اسی لکھنو میں مجھے زمانہ گزر گیا ہے۔''

''تو گویا شادی آپ کے اقتصادی مسائل کا حل ہے۔ شادی ہندوستان کی ہر لڑکی کے ذاتی اور عمرانی پرابلم کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ چمپا بیگم میں تم کو اوروں سے مختلف سمجھتا تھا۔''

''انڈر گریجویٹ باتیں مت کرو۔'' چمپا نے غصے سے کہا۔

''انڈر گریجویٹ آپ کے یہاں بڑا بھاری طعنہ ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھیا صاحب سے لو گائے بیٹھی رہیں۔ بتایئے تو آپ کو یہ صاحبزادے اس قدر پسند کیوں ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے کم عمر لڑکیوں کی طرح جھینپ کر کہا اور اسے سخت کوفت ہوئی۔ اسے اپنی زندگی میں آج تک اتنی شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔

''اچھا، آپ کو اچھی شکلیں پسند آتی ہیں؟ شاعرانہ طبیعت ہے آپ کی!'' پھر وہ ٹہلتا ہوا ہیٹ ریک کے آئینے کے پاس چلا گیا اور بھنویں اٹھا کر غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگے۔ ''مجھ سے بھی کوئی لڑکی اتنا ہی اتم عشق کر سکے گی؟ اگر دیکھا جائے تو میں ایسا بدصورت نہیں۔''

''شانتا تم سے اتم عشق نہیں کرتی؟''

اب گوتم اپنی جگہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ چمپا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ رہا ہے۔

''گوتم بہادر، تم بھی شیشے کے گھروں میں رہتے ہو، دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے یہ یاد رکھا کرو۔''

''تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟''

''تم اس کو چاہتے نہیں ہو؟ جو کوئی بھی وہ ہے، جو تمہارے کزن کی بیوی ہے اور تم سے پانچ سال بڑی۔ ہم کس کو ناصح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں؟ اور اب تم اس اپنی شانتا نیلمبر کو بھولتے بھی جا رہے ہو۔ بہت دنوں سے تم نے اس کو خط لکھ کر یہاں کی رپورٹ نہیں بھیجی، وہ تمہاری ذہنی رفیق ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کر

سکتے۔تم کسی سے بھی شادی نہیں کرسکو گے۔نرملا سے بھی نہیں۔گوتم بہادر یہ بڑے ادق معاملات ہیں۔یہاں تمہارے نظریے نہیں چل سکتے۔میں بھیا صاحب کو پسند کرتی ہوں۔ان سے میری کوئی ذہنی رفاقت نہیں مگر گوتم بہادر مجھے تو تم بھی پسند ہو۔بتاؤ اس کا کیا کیا جائے؟ انسانی رشتے بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔مجھے رفتہ رفتہ تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔کیا میں فطرتاً فلرٹ ہوں؟ ہرگز نہیں۔ذرا باہر جا کر پوچھو میری کس قدر عمدہ ریپوٹیشن ہے۔مجھے دیبی کہا جاتا ہے۔یقیناً میری طبیعت میں آوارگی نہیں مگر انسانوں کو پسند کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔اب جو میں نے اتنا بڑا کنفیشن کیا تو اس لیے کہ تمہارا شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے۔اسے تم نے افسوس خود ہی مسمار کردیا۔کچھ دن اور ثابت رہ لینے دیتے اسے۔بڑا خوبصورت تھا۔بلور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی موتی براجمان تھی۔سارناتھ سے واقفیت ہے؟ سارناتھ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔میں کاشی میں پیدا ہوئی تھی۔''اس نے اداسی سے بات ختم کی۔

اندھیرے میں وہ جس کشتی پر سوار تھا وہ کشتی طوفانی ریلے کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی'وہ دریچے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا۔کیسا پیارا لڑکا تھا'اس میں ہری شنکر اور رمال کی کس قدر مشابہت تھی'ان ہی کا جیسا سنجیدہ اور شیطان۔یہ دونوں بھی کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اپنے جیسے کروک دستیاب کراتے تھے۔اسی کو دیکھو۔جنے کہاں سے بہتا بہاتا آ نکلا۔یا تھا کسی دیس سے اک ہنس بے چارہ ____ سلسلہ روز وشب نقش گر حادثات ____ نقش گر حادثات ____ نقش گر ____ وہ اپنے

ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تا کہ اس جذباتی لینڈ سلائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔

''تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟'' گوتم نے دریچے میں کھڑے کھڑے غرا کر پوچھا' وہ اس سے لڑ رہا تھا' یعنی اتنا نزدیک آ چکا تھا کہ اسے ڈانٹے' اسے برا بھلا کہے اور اس سے لڑے' اس پر تنقید کرے۔ یگانگت کے اس احساس نے چمپا کو اور اداس کر دیا۔

''گوتم!'' اس نے کہا'' اس خوفناک' پٹے ہوئے جملے کو معاف کرنا مگر یہ کہ ہم سب کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ ہم میں سے کسی میں کوئی اسرار نہیں۔ تم مجھ سے کس قدر واقف ہو چکے ہو۔ ہر انسان بے حد exposed ہے۔ تیز روشنی میں ہے' وہ نیم تاریکی' وہ دھندلکا تم کو کہیں نہ ملے گا۔ جس میں جا کر بالآخر تم خود کو چھپا سکو۔ جب میں تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں بھی اسی تیز روشنی میں کھڑی ہوں اور تم مجھ کو آر پار دیکھ رہے ہو لیکن میں تم کو خود آر پار دیکھ رہی ہوں' اسی لیے مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے۔''

''_____ آر پار دیکھ رہا ہوں_____ چمپا الفاظ کو ختم کر دو_____ الفاظ ہمیں کھا جائیں گے۔''

''الفاظ کو ختم کرو مگر معنی کے معنی موجود رہیں گے۔ بتلاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' چمپا نے بڑے بے بسی سے کہا۔

بھیا صاحب کے لاشعور کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہوگا' البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وہ اپنی رخصت کے زمانے میں لکھنو میں رہے انہوں نے بالکل مون برت رکھ لیا۔ پہلے ہی وہ کون سی بات کر کے دیتے تھے مگر اب ان کی خاموشی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔

''بھیا صاحب کو خاموشی میں بڑے افسانے چھپے ہوئے ہیں۔'' حمید بانو نے ایک روز انکشاف کیا۔

''واہ کیا بات ہے۔ افسانے نہیں جوتا چھپا ہوا ہے۔ لاحول ولا قوۃ' طاعت نے غصے سے جواب دیا۔ اس بورژوا رومانیت نے ہر طرف اودھم مچا رکھا تھا' خود حمید بانو ان دنوں بڑے زوروں پر شاعری کر رہی تھی۔ موضوع سخن ایک مبہم سا اور اس قدر مثالی کردار تھا جو شاید یونانی دیو مالا کے لیے بھی تخلیق نہ کیا ہوگا۔

''ہمیں اس بورژوا ذہنیت کے خلاف سب سے پہلے جہاد کرنا ہے۔ جاگیردارانہ سماج نے جس طرح ذہنوں کی تشکیل کی۔'' طاعت نے نرملا سے کہنا شروع کیا۔

''اور ذرا سننا۔ قسم خدا کی۔ دل چاہتا ہے ان سب سے ایک پندرہ دن سڑکیں کٹوائی جائیں تو یہ ساری افسانویت تشریف لے جائے ______ سنا تم نے یہ بھیا صاحب جو ہیں ہمارے مشہور و معروف۔ ی گوتم سے جلتے ہیں۔'' طاعت نے ایک روز نرملا کو خبر دی۔

''گوتم سے ____؟ ہائے رے۔ یہ تو بڑا لطیفہ ہے۔ کون جلے گا اس بے چارے سے۔ اس قدر تو وہ Defenceless ہے۔''

''اسے اپنے بچاؤ کی ضرورت ہی نہیں۔'' طلعت نے کہا' ''ہاں ہاں اور کیا ____ مطلب یہ کہ وہ تو ____ حد ہے بھئی۔''

ٹھگوں کی منڈلی کی مانند ان سب کو اپنی منڈلی سے شدکت کی وفاداری تھی۔ جو اس میں شامل ہوا باقی سب اس پر جان چھڑکنے کو تیار۔

''مگر کیا چمپا باجی تو کہیں۔'' نرملا نے دفعتاً سوچ کر کہا۔

''ہشت' ایسی بچپنے کی باتیں مت کرو۔''

''اس میں بچپنا کیا ہے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔'' نرملا نے بے حد بزرگی سے کہا۔

''غلط۔'' طلعت نے پرزور احتجاج کیا' ''چمپا باجی اب ایسی بھی ام میچور نہیں ____ اچھا تم گوتم سے کر سکتی ہو عشق؟'' اس نے خوفناک طریقے سے پوچھا۔

''گوتم سے؟ حد ہو گئی' اتنی جان پہچان کے بعد اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی عشق کرنے کے لئے میری جان تھوڑا سا اسرار چاہیے۔''

''اور اسی اسرار اور دھند لکے کے خلاف ہم لوگ جہاد کرنے والے ہیں۔'' طلعت نے کہا۔ ''اور کیا۔'' نرملا نے صاد کیا۔

''دراصل چمپا باجی کے اس **مسلسل** عشق نے ہم سب کی سائیکولوجی خراب کر دی ہے۔ غضب خدا کا۔ جب سے وہ یہاں آئی ہیں ____ یاد ہے ہم لوگ فرسٹ ایر میں تھے ____ تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ کس قدر تھرڈ کلاس بات۔''

''بے حد تھرڈ کلاس۔'' نرملا نے دوبارہ صاد کیا۔

''اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھیا صاحب اتنے مصر ہیں تو یہ ان سے کر کیوں نہیں لیتیں شادی۔''

شام کا اندھیرا بہت جلد چھا گیا۔ ندی کے کنارے مندر میں چراغ جل اٹھے تھے۔ کشتی میں بیٹھا کوئی آرزو کی غزل گاتا جا رہا تھا۔ طاعت نے غور سے سننا چاہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات سمجھ میں آ گئی۔ دور گیت گایا جا رہا ہو اور فاصلے کی وجہ سے اس گیت کے الفاظ سمجھ میں نہ آئیں تو کیسا لگتا ہے' وہ سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اندر آ گئی۔ ''آؤ ترپ چال کھیلیں۔'' اس نے ہری شنکر سے کہا۔

''بھیا صاحب ابھی کلب میں ملے تھے۔'' اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بتایا۔ ''پھر وہی قصہ۔'' طاعت نے بور ہو کر سوچا۔

''وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے گوتم کو اتنا لفٹ کیوں دے رکھا ہے' ہر سمے یہاں گھسا رہتا ہے۔''

''ماشاءاللہ سے۔'' طاعت نے کہا'' کیا یہ ہمارے گارجین ہیں۔''

''اب بہر حال _____ بڑے بھائی تو ہیں۔'' ہری شنکر نے طرف داری کرنا چاہی۔ وفاداریوں کی کش مکش اس کے سامنے تھی۔ بھیا سے وفاداری' گوتم نیلمبر سے وفاداری۔ غریب شنکر سریواستوا کرے تو کیا کرے۔

''اور چمپا باجی کہاں ہیں۔''

''وہ تو کل سے ہسٹری کانگریس کے لیے الہ آباد گئی ہوئی ہیں۔''

اتنے میں سائیکل آن کرر کی اور گوتم نیلمبر آموجود ہوا۔

''چمپا نہیں ہیں؟'' اس نے آتے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

''نہیں، مگر ہم لوگ تو موجود ہیں ____ آؤ بیٹھو۔''

''یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ خاکسار کا آب ودانہ یہاں سے اٹھ گیا۔''

''اب کہاں جاتے ہو''طاعت نے پوچھا۔

''یہی ذرا ولایت تک۔ اخبار بھیج رہا ہے۔ یہ سوچتا ہوں دو تین سال اگر وہاں تک گیا تو ساتھ کچھ پڑھ بھی لوں۔ بہت وقت برباد کیا ہے۔''

''یہی ذرا ولایت تک۔''طاعت نے نقل اتاری۔''کس قدر کا رعب ڈال رہے ہیں جیسے ہم لوگ تو ولایت کبھی جا ہی نہیں سکتے۔ چلو تم، ہم سب آتے ہیں پیچھے پیچھے ____''

''کیا وہاں بھی منڈلی سے چھٹکارا نہیں ملے گا؟ اگر یہ بات ہے تو ولایت کا سفر منسوخ، بندہ جاپان کا رخ کرے گا۔''

''ہم جاپان بھی آئیں گے۔''

''قصہ مختصر یہ کہ اب فرار حاصل کرنا مشکل ہے!''

''ظاہر ہے پہلے ہی تمہاری شامت آئی تھی تو شہر کا رخ تم نے کیا، اب بھگتو۔''

''ذرا چمپا کو بھی خدا حافظ کہہ لیتا مگر وہ حضرت چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی ہیں۔''

''ارے تم پیرس ہی تو جا رہے ہو، تمہارا دیہانت تو نہیں ہو رہا پھر مل لینا ____ شنکر نے کہا۔''

''ہسٹری کانگریس کب ختم ہو رہی ہے۔''

''ہو جائے گی ختم ہفتے بھر میں، مگر اس کے بعد دسہرہ ہے، وہ سیدھی بنارس چلی

جائیں گی۔''

''یہ ہسٹری کانگریسوں میں جانے لگی ہیں؟''

''اور کیا۔ اتنی قابل جو ہیں۔''

''یار بڑا افسوس ہو رہا ہے واقعی کہ تم جا رہے ہو۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''ہاں۔ یار افسوس تو ہونا ہی چاہیے' میں اس قدر باغ و بہار آدمی تھا۔''

''طاعت ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر اندر نرملا کے پاس چلی گئی۔

''گرو جا رہا ہے۔'''' اس نے کہا۔

''میں نے سنا ابھی۔'' وہ رو رہی تھی۔ طاعت حیران رہ گئی۔

''اری کس قدر مہا بیوقوف لڑکی ہے۔ روتی کیوں ہے؟ شادی کر کے تو بھی ساتھ چلی جا۔ تیرا تو اس کے لیے جانے کب کا پیغام جا چکا ہے۔''

''وہ بھلا مجھ سے کرے گا شادی۔ چمپا باجی کا دم بھرتا ہے۔ عمر بھر میرا مقابلہ ان سے کرتا رہے گا۔ میں چمپا باجی کی پرچھائیں بن کر جیوں گی؟''

''چمپا باجی ______ چمپا باجی تم سے زیادہ برا کون ہوگا؟ اب جانے تم اور کس کس کی قسمت برباد کرو گی۔'' طاعت دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ ''مت روائے مہا بیوقوف۔'' اس نے روندھی آواز سے کہنا چاہا۔ برآمدے میں سے گوتم اور شنکر کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

طاعت چمپا سے اس روز سے زیادہ متنفر کبھی نہیں ہوئی۔

یہ گوکل بے حد خوبصورت جگہ ہے مدھو مالتی ہوا میں جھولتی ہے پروائی کے جھونکے بچوں کی طرح کنج میں کلکاریاں بھرتے پھرتے ہیں۔ پھول ماں کی سوچ کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ گوکل' یہ منظر کس کے جلوے کا عکس ہے؟ تمہارے ماتھے کا تلک آسمان میں ڈوبتے سورج کے مانند جگمگاتا ہے۔ کل اس نے کہا تھا اور میں' کمزور عورت' مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ زمین خاموش ہے۔ ساری کائنات جیسے دل ہی دل میں آہستہ آہستہ دعا مانگ رہی ہے۔ لڑکیاں گھاٹ پر پانی پھینک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی چلا اٹھتی ہے: ہری _____! ہری _____!! ایک لڑکی رو رہی ہے: گوپالا _____ وہ کہتی ہے۔ زندگی میں اس کی وجہ سے راحت ہے' زندگی میں اس کی وجہ سے اتھاہ دکھ ہے۔

ورندابن میرے انگ انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سویرے منڈیر پر رکھی ہوئی گاگریں دھندلکے میں جھلملاتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز۔ سبز گھاس کی گرم گرم مہک۔ دودھ کے سفید جھاگ۔ جنگل کی ہریالی۔ میری آتما چین سے بھر گئی ہے۔ رات کو ستارے ورندابن پر جھک کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز اوم اوم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون لہریں مار رہا ہے' جیسے چاندنی کی لہریں جمنا پر پھیل جاتی ہیں۔ رنگ _____ روشنی _____ موسیقی' کرشنا! کرشنا' موہن' ہری' نند لالہ' کانہا _____ اس کا ہر نام اس الوہی راگ کے نئے سر کی طرح بجتا چلا جا رہا ہے' وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔

اور یکایک سنہری موسیقی کی بوچھاڑ میرے کانوں پر آن گری جیسے ہر سر کے

کنارے ایک ستارہ جل رہا ہو اور پھر یہ پھوار تیز رنگوں والی دھنک میں تبدیل ہو گئی اور اس کی تیز جگمگاہٹ کی تاب نہ لا کر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے' مجھے پتا نہ چلا کہ میں موسیقی کو سن رہی ہوں یا دیکھ رہی ہوں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ سادھی کا مطلب کیا ہے' وہ لمحہ جب روح پرم آتما کے روبرو کھڑی ہو کر کہتی ہے ____ یہ میں ہوں۔

لڑکیاں گھاس پر راس ناچ رہی ہیں۔ ایک دو تین چار ____ ایک دو تین چار

ما __ آ ___ دھا ____ دا ____ مادھو ______ مادھو _____ مادھو _______ ۔

بادلوں میں چھپی ہوئی دیبی کی طرح وہ گاگر اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔

کامنی شری رادھے۔ کرشن کی سب سے بڑی بھگت اور گرو ______ رادھا کرشنا!

تخلیق کائنات سے لے کر آج تک اس سے زیادہ خوبصورت موسیقی کسی نے سنی تھی؟ ورندابن پر بسنت کا سورج چمک رہا ہے۔ ہرن موسیقی کی تانوں کی طرح کلیلیں بھرتے پھر رہے ہیں۔ مرلی کی آواز بلند ہوئی۔ موسیقی اس کی آواز ہے' پھول اس کی مسکراہٹ' سمندر اس کے خیال کی وسعت' طلوع آفتاب سے پہلے کا آسمان اس کی سادھی کا سایہ۔ میں شرمیلا میں بھی گاؤں گی۔

کائنات گہری نیلی روشنی میں تیر رہی ہے۔ زمین' آسمان' خلاء اوم کی سنسناہٹ سے گونج رہا ہے شرمیلا؟

میرا نام اب شرمیلا نہیں۔ میں بھی کرشنا ہوں۔ ہر شے کرشنا ہے۔

میرے سامنے ایک نیلا سورج طلوع ہوا اور ساری فضا جگمگا گئی _____ اور

اس نے کہا ___ او بیوقوف گوپیو ____ تم جو پانچوں حواسوں کے جھمیلے میں گرفتار ہو۔ سنو اور جانو کے ہر شے فریب نظر ہے' ایک مکمل ورندابن جس میں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہوں۔ درخت کے پھول نارنجی قمقموں کی مانند جگمگا رہے تھے اور رادھا کلی کا گچھا اس کی کالی لٹوں کے پاس جھکا تھا اور اس کی آنکھیں بھٹکی روح کو راستہ دکھانے والے ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں' وہ سادھی میں کھو گیا اور اس کے جگتے ہی شاخیں دوبارہ سرسرائیں' ستارے چمکے' ہوائیں بہنے لگیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ کائنات بھی سادھی میں کھو گئی تھی۔

اور کائنات سنگیت سے بھر گئی:

مراری ___ تینوں دنیاؤں کے نور ____ جے جے کرشنا

کچھ کو تو اپنے حسن سے اپنی اور کھینچتا ہے

کچھ کو بانسری کی آواز سے

کچھ کو تو اپنے خداوندی جلال کے ذریعے اپنا بندہ بناتا ہے[

کچھ کو اپنے قہر و غضب سے متاثر کرتا ہے۔ گوپیوں نے کہا

کچھ کو تو میدان جنگ میں نیست و نابود کرتا ہے۔

کچھ کو اپنی آواز کے جادو سے سرشار کرتا ہے۔ گوپیوں نے کہا۔

مگر تیرا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔

جے کرشنا۔ جے جے کرشنا

اوم شانتی! شانتی! شانتی!!!

____ موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ چمپا چونک اٹھی۔ اندھیرے

کمرے میں صرف ریڈیو کا ڈائل روشن تھا۔ ''ریحانہ طیب جی کی انگریزی تصنیف 'گوپی کے دل' کا ترجمہ آپ نے سنا۔ اب آپ کماری گیان وتی بھٹنا گر سے چندر کونس کا۔'' طلعت کی آواز آ رہی تھی۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو سیٹ بند کر دیا۔

پھر وہ دریچے میں جا کر شام کے آسمان کو دیکھنے لگی ______ کرشنا ___ کرشنا __ کرشنا ____ اس نے دل میں دہرایا۔ برابر کی کوٹھی میں کیرتن ہو رہا تھا' وہ کان لگا کر آواز سنتی رہی۔ وجدان کیا شے ہوتا ہے اور محبت ____ اور جنون خیز عشق _____ اور پرسکون احساس رفاقت _______ یہ سب کیا ہے؟ اور بھگتی _______ ریحانہ طیب جی' اس مسلمان لڑکی نے بھگتی کے جس جذبے سے سرشار ہو کر یہ کتاب لکھی ہے اسے بڑے بڑے پنڈت بھی نہ سمجھ پائیں گے۔

یہ کیا شے ہے؟ میں ڈائیلکٹکس میں اس کا حل ڈھونڈوں گی۔

اور محبت ______

''خداوند _____!''

جے جے کرشنا۔ بنت بناؤں بن نا ہیں آوے ہری کے بنا ______ ہری کے بنا ____ برابر کے کمرے میں کوئی لڑکی پوروی کا خیال گا رہی تھی۔

دفعتاً اس کی سمجھ میں اس کا مطلب آ گیا _____ محبت دراصل فراق کو کہتے ہیں۔

گھاس پر لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ سوشل روم میں پیانو بجایا جا رہا تھا' ہر طرف

گوپی کا دل نظر آ رہا تھا۔

''بجیا ــــــــ کیا کر رہی ہیں۔'' حمید بانو نے کھڑکی میں سے ڈال کر اندر جھانکا ــــــ ''پروفیسر بنرجی کے یہاں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔''

''ارے۔'' اس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ سارے میں جنم اشٹمی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ ہوا میں طوفان لرزاں تھے۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے جن میں کنہیا کو جھلایا جا رہا تھا۔ دور سڑک پر ایک ٹولی کیرتن کرتی جا رہی تھی۔ اوم جے جگدیش ہرے ــــــ بھگت جنو کے سنکٹ ــــــ چھن میں دور کرے ــــــــ

وہ اتر کر نیچے آئی اور سائیکل اٹھا کر حمید بانو کے ساتھ بادشاہ باغ روانہ ہوگئی ــــــــ پروفیسر کے یہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ شاید جنم اشٹمی کی تقریب منائی جائے گی۔ اس نے سوچا۔ وہ ابھی تک ورندا بن میں گھوم رہی تھی _ _ _ _ _ ڈائریکٹ ایکشن _ _ _ _ _ کلکتہ ــــــ کلکتہ ــــــــ دو ہزار موتیں۔

''یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' خواب سے اس کو کسی نے جھنجوڑ دیا' سامنے دیکھا گوتم بھی موجود تھا اور چند کاغذات پر جھکا جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا۔'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

طلعت نے غصے سے اسے دیکھا۔ ریڈیو اسٹیشن سے وہ بھی سیدھی وہیں پہنچی تھی اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ''جو کچھ ہو گیا چمپا باجی وہ آپ کو خود ہی معلوم ہوا جاتا ہے۔''

''ہم امن چاہتے تھے' ہم امن چاہتے ہیں' ہم لڑنا نہیں چاہتے' ہم ہرگز نہیں

لڑیں گے۔" گوتم آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر چمپا کو دیکھا بھی نہیں، وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

"لیکن ڈائریکٹ ایکشن۔" کسی نے جوش سے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ذرا اپنے لیڈروں سے جا کر پوچھو چمپا بیگم، اب یہ کیا ہو رہا ہے۔" کسی اور نے اس کے قریب آ کر کہا۔

چمپا نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ میرے لیڈر ______ اس کا حلق سوکھ گیا۔

"ہاں ہاں۔ تمہارے لیڈر ______ بڑے زوروں سے لیگ کو ووٹ دینے گئی تھیں۔ نریندر نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا، اس نے گوتم کی طرف دیکھا لیکن گوتم نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اگر غلط ہے تو کل اخبار میں بیان دو گی؟ بتاؤ۔" نریندر نے گرج کر کہا۔

"چلو یہاں سے چلیں۔ ہمارے گھر چلو ______ وہاں بیٹھ کر طے کریں گے۔"

"طے کریں گے کہ چمپا بیگم کو پھانسی پر چڑھایا جائے یا نہ چڑھایا جائے۔" چمپا نے تلخی سے کہا۔

مجمعے نے اسے گھور کر دیکھا۔

"رشیدہ آپا کے یہاں چلو۔"

''رشیدہ آپا کیا کر لیں گی اور تم۔'' ایک اور شخص (یہ سب پھر سفید بلینک چہرے تھے) ہری شنکر کی طرف مڑا۔ ''بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے تھے بے چارے ____ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے۔'' وہ پھر اخبار پر جھک گئے۔

''اب خالی امن کی اپیلیں پر آج تک دنیا میں کسی نے عمل کیا ہے؟''

''ہم نہیں لڑیں گے۔'' گوتم نے دہرایا۔

''ہونہہ۔ گاندھی وادیوں سے زیادہ بڑا افراڈ کہیں نہیں دیکھا۔'' تیسرے نے کہا۔

وہ پھر واپس لوٹی۔ کیلاش ہوسٹل میں یونین کا ہنگامی سیشن ہو رہا تھا' وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ چاند باغ کے چیپل سے آرگن کی آواز بلند ہو رہی تھی اور ہال میں ''جنگلی ہنس'' کی ریہرسل کی جا رہی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ پر سے گزرتے ہوئے اس نے مکانوں پر نظر ڈالی۔ اس کو خوش آمدید کہنے والا دروازہ کہیں موجود نہ تھا۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر اس نے گوتم کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ ''کون ہے؟'' گوتم کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی' وہ شاید ابھی ابھی اپنے گھر لوٹا تھا۔

''ہلو۔ میں نے سوچا تم سے بات کر لوں۔''

''کیا بات ____'' گوتم نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

''تم ____ تم بھی سمجھتے ہو کہ میں ری ایکشنری ہوں۔''

''میں کچھ نہیں سمجھتا چمپا رانی ____ یہ وقت ذاتی مسائل اور الجھنیں حل کرنے کا نہیں ہے' اگر تم اپنے مسائل کے باوجود دھارے کے ساتھ رہنا چاہتی ہو

تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اگر نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

ہم ـــــ گوتم گروہ کی طرف سے بول رہا تھا' وہ پھر تنہا تھی۔

''لیکن میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔''

''میرے ساتھ؟''

''ہاں''

وہ بڑا متعجب ہوا۔ ''چمپا میں پیرس نہیں جا رہا ہوں۔''

چمپا کو بڑا سخت صدمہ ہوا' وہ اسے کس قدر غلط سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔

''گوتم نیلمبر تمہارے ساتھ پیرس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں کہہ رہی ہوں تم لوگ ریلیف ورک کے لیے کلکتے جا رہے ہو کل' میں بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔''

''کہاں ماری ماری پھرو گی؟ جان کا خطرہ الگ ہے! اور تمہارے ابا بنارس سٹی مسلم لیگ کے صدر ہیں' کیوں ان کا نام ڈبوتی ہو۔''

''تم بھی مجھے طعنے دینے شروع کیے۔''

''میں نے بھی!! کیوں' مجھ میں کوئی خصوصیت ہے؟ میں اور سب کی طرح ہوں' ان کے ساتھ ہوں۔ چمپا رانی یہ سمجھ لو ـــــ سنگھ بڑی چیز ہے اور آخری حقیقت ہے۔ تنہا' فرد واحد کی حیثیت سے تم اپنے خول میں جا گھسو تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔''

''تم نے پھر نظریاتی بحث شروع کر دی۔ اچھا' شب بخیر گوتم ـــــ'' چمپا نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا۔

دوسری صبح اسے معلوم ہوا کہ گروہ سر پر کفن باندھ کر کلکتے روانہ ہوگیا۔

نرملا، طاعت، تہمینہ سب چلی گئیں، صرف وہ اکیلی رہ گئی۔

مہینے گزر گئے۔

گروہ کلکتے کے بعد اب بنگال اور بہار کے سارے علاقے میں امن امن کی رٹ لگاتا پھر رہا تھا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ کر وہ رگھوپتی راگھو راجہ رام الاپتے، دن میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ لڑکیاں واپس آ چکی تھیں۔ لکھنو کی زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ مزید ڈرامے، مزید پارٹیاں، مزید کانفرنسیں۔

ایک روز چمپا نے اخبار میں پڑھا کہ بہار میں پھلگو ندی کے کنارے بلوائیوں نے چند ورکرز پر حملہ کر دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے ان میں کمال اور شنکر اور گوتم بھی شامل تھے۔ چمپا نے گھبرا کر سائیکل اٹھائی اور گلفشاں روانہ ہو گئی۔ پھاٹک پر سے اس نے دیکھا کہ اسٹیشن ویگن میں سامان لد رہا ہے۔ تہمینہ اور طاعت اور نرملا سفر کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ میاں قدیر گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں۔ اخبار کی اطلاع دو تین روز پرانی تھی۔ تہمینہ نے اسے بتایا کہ خوش قسمتی سے شنکر کے چاچا اس وقت گیا میں موجود تھے۔ اور ان تینوں کو موٹر پر لاد کر گورکھپور لے گئے جہاں کے وہ سول سرجن تھے اور اب وہ تینوں بھی گورکھپور جا رہی تھیں۔

''خیریت سے ہیں وہ لوگ۔'' چمپا نے تشویش سے پوچھا۔

''گوتم کی آواز تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی میں نے ٹرنک کال کیا تھا۔''

''حالانکہ چوٹ سب سے زیادہ اسی کو آئی ہے' چاچا کہہ رہے تھے فون پر۔'' نرملا نے اضافہ کیا۔

''چمپا تم بھی چلو۔'' تہمینہ نے کہا' وہ مصروفیت سے جھکی اور اٹیچی کیس بند کر رہی تھی۔

''تم پچھلے دنوں اتنی الگ تھلگ رہیں کہ ہم سمجھے بہت مصروف ہو۔''

''میں نہ تم سب کی طرح کتابیں لکھتی ہوں نہ گاتی بجاتی ہوں' سوائے پڑھانے کے میری مصروفیت کیا ہو سکتی ہے۔''

''کالج تو بند ہے تمہارا' چلو ہمارے ساتھ چلو' ہم واپسی میں تم کو بنارس چھوڑتے آئیں گے۔'' تہمینہ نے کہا

چنانچہ چمپا کو گروہ نے پھر واپس بلا لیا۔

تینوں لڑکے سول سرجن صاحب کے بنگلے کے پچھلے چوڑے برآمدے میں لیٹے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے _____لو چلو ہے نا گوری _______جول پائے گوری دھامے _____تینوں بہت زخمی ہوئے تھے لیکن بے حد ہشاش بشاش تھے۔ دن بھر وہ پڑے دنیا بھر کے گانے گایا کرتے: اپٹا کے گیت' بنگالی کورس' راجستھانی اور گجراتی لوک گیت' فلمی گانے۔ لڑکیاں پہنچ گئیں تو اب دن بھر رمی کھیلی جاتی۔ شنکر کے چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ اخبار ان لوگوں کے نزدیک نہ آنے پائے' ریڈیو کی خبریں ان کے کان میں نہ پڑیں۔ بڑے اہتمام سے کوئی لڑکی رات کو اخبار اسمگل کرلاتی۔ گوتم روز خبروں کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے پروگرام بدلتا رہتا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ ''پتا نہیں میں اپنی یہ تین انگلیاں استعمال کرسکوں گا یا نہیں۔'' وہ بعض دفعہ اداسی سے کہتا۔ ''چمپا'' ایک روز اس نے چلا کر کہا'' ذرا سوچ سکتی ہو کہ اب

میں پیانو کبھی نہیں بجاسکوں گا''

''کیوں نہیں بجاسکو گے؟یار موربڈ نہ بنو۔کیا ڈریامہ کھیل رہے ہو۔'' کمال نے کہا'اس کی اپنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

''اب بہر حال' کیا ہوسکتا ہے۔''

جب وہ تینوں چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔

''چلو پہلے ذرا آوارہ گردی کریں' جانے ادھر پھر کب آنا ہو۔'' کمال نے کہا کمال کو اب چپ لگ گئی تھی' وہ بیٹھے بیٹھے بالکل مراقبے میں چلا جاتا مگر گوتم کو موربڈ نہ بننے کی نصیحت کرتا۔

''ہم کو یہاں کے دیہات کے حالات دیکھنے چاہئیں' ہم مرزاپور بھی جائیں گے جو ہماری کمرن کا گھر ہے۔''

''مرجاپور میں اورن ٹھون رن کاشی ہمارو گھاٹ ____ '' گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا' وہ اداسی سے مسکرائی۔

یہ علاقہ بڑا دلفریب تھا۔سر سبز اور پرسکون۔ یہاں کے لوگ بے حد دلکش تھے۔معصوم اور پر امن۔ رام دیا اور رام اوتار اور کدیر اور کمرن کا دیس۔ یہاں چاروں طرف جولاہوں اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں اور قصبات میں زمینداروں کی حویلیاں اور شہروں میں پیلے رنگ کی اداس کوٹھیاں جن میں مرنجاں مرنج ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔

وہ چھوٹی لائن کی ایک ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برج مان گن اسٹیشن پر گاڑی رکی' یہاں ہری شنکر کی موسی ڈھیروں پھل پھلاری اور ناشرے کے انبار لے کر

پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔

''یہاں سے ذرا آگے کپل وستو ہے۔ چلو وہاں ہوتے آئیں۔''چمپا نے تجویز کیا۔

''میں ایک زمانے میں بدھسٹ تھا بڑا بھاری''کمال نے اداسی سے کہا۔

''کہاں جنگلوں میں ماری ماری پھرو گی چمپا بیگم ______''گوتم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

بہت لمبا سفر باٹے ______''شنکری موسی نے کہا۔''یہاں موٹر و نہیں ملت ہے۔''

وہ خود بہلی پر آئی تھیں۔ یہاں صرف ہاتھی سواری کے لیے ملتے تھے ______ ترائی کے ہاتھی' وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر کپل سوتو پہنچے' گاؤں والے ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دور ہماوت کی گلابی چوٹیاں دھوپ میں جھلملا رہی تھیں۔ چاروں اور سرخ چھتوں والے مکان تھے اور آم کے باغ اور بانس کے جھنڈ۔

کپل وستو کے کھنڈروں میں پہنچ کر چمپا نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمال بڑ تندہی سے ایک پتھر کو رومال سے صاف کرنے لگا' اس پر لکھا تھا:

''مہاراجہ پیاداس نے اپنے جلوس کے اکیسویں سال بہ نفس نفیس یہاں آ کر عبادت کی کیونکہ اس جگہ بدھ شاکیہ منی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں بدھ نے جنم لیا اس وجہ سے اس گاؤں کی مالگزاری معاف کی جاتی ہے۔''

اب یہاں وہ کنول کے تالاب اور سنہرے ہرنوں کی ڈاریں اور درختوں کے

کنج اور چنبیلی کے پھولوں سے گھری ہوئی بارہ دریاں کہاں ہیں؟ چمپا نے اپنے آپ سے پوچھا' وہ ان سب سے ذرا الگ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ یہاں تو ویرانہ ہے اور یہاں گیدڑ راتوں کو چلاتے ہیں۔ یہاں فصیل کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں اور مٹی کے ٹیلے اور شکستہ چوکور تالاب۔ مہارانی ماما دیوی کے محلات سرخ اینٹوں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی شکل میں چاندنی میں نظر آرہے تھے۔قریب روہنی ندی اس سکون سے گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہیں۔

''یار بڑا سناٹا ہے۔'' کمال نے یکلخت گھبرا کر کہا۔

''بڑا شدید سناٹا ہے۔'' ہری شنکر نے جواب دیا۔ ''چلو اب واپس چلیں۔ ہاتھی ہمارے منتظر ہیں۔''

گوتم نے کیمرہ اتر کر ہاتھ میں لے لیا۔ ''دن کا وقت تو تصویریں ہی کھینچتا۔'' اس نے اور زیادہ بور ہو کر کہا۔

کمال منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔

''شنکر یار تاریخ بڑا زبردست فراڈ ہے۔ تاریخ ہمیں برابر دھوکہ دیتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ٹھیک کہتے ہو۔'' شنکر نے حسب معمول اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہاتھیوں کی طرف آئے' ان کے سائے چاندنی میں مہارانی مایا دیوی کے محل کے کھنڈروں پر سے گزرتے بڑے عجیب لگے۔

واپسی میں چمپا بنارس اتر گئی۔ کینٹونمنٹ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور تانگے میں بیٹھ کر گھر کی سمت روانہ ہوئی۔ درگا پوجا اور رام لیلا کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا اس نے اپنے شہر پر نظر ڈالی: تپلیشور ______ اس نے کہا۔ ابدی کاشی ______ کاشی مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اسے دور سے اپنے گھر کا چھوٹا سا پھاٹک دکھائی دیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ اس کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی، جس طرح اندھیرے سمندر میں جہاز روشن ہوتا ہے، وہ اندر پہنچی۔ ایک رشتے کی بہن کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ چوطرفہ غل مچ رہا تھا۔ دالان میں روئی کے پردے چھٹے تھے۔ اندر تخت پر میراسنیں چڑھی بیٹھی تھیں، وہ جا کر ایک نیم تاریک صحنچی میں کھرے پلنگ پر لیٹ گئی جس کی پائنتی کسی مہمان بی بی کا بچہ دلائی میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ دالان میں سے بوا حسین باندی کی پاٹ دار آواز بلند ہو رہی تھی:

اس نے کہا: تو کون ہے؟
میں نے کہا: شیدا ترا
اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟
میں نے کہا: سودا ترا

آنگن کی دیوار پہ عورتوں کے چلتے پھرتے سائے لرزاں رہے، کسی نے زور سے آفتاب چوکی پر رکھا۔ صحنچی میں کوئی بچی سوتے میں روئی۔

میراسنوں نے گانا گایا:

اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟

میں نے کہا: سودا ترا

ان کی آواز بہت سے بے معنی الفاظ دہراتی رہی' پھر ایک نوجوان میراسن نے گانا شروع کیا: اٹریا پر چور' بھوجی دیا تو جلاؤ' پھر سمندر ھنوں کی گالیاں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد سہاگ گایا گیا' وہ آنکھیں بند کیے یہ ساری آوازیں سنتی رہی۔ باورچی خانے میں تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ چاروں طرف دھوئیں کی کالونچ تھی اور بھگار کی مہک۔

گھر ___ گھر ___ اپنا گھر ___

پھر رات کا سناٹا چھایا اور ایک بیل گاڑھی کھڑکی کے نیچے سڑک پر چرخ چوں کرتی گزری۔ اس کے پہیوں سے وہ عجیب وغریب سمع خراش آواز نکل رہی تھی' اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ گنگا پار اپنے نانا کے گاؤں شیخم پور جایا کرتی تھی تو ایک مرتبہ رسولن مہری نے کہا تھا: جانو جیئے ای گاڑی ماسے اسی آواز نکلی جانو بھوانی خفا ہوئیں ___ براشگون ہو ___ بہتے براشگون ___

دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ہوگا؟ کیا ہونے والے ہے؟ اور اس کے منطقی وجود نے اسے سمجھایا: کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہے کہ ___ مگر کمال کی انالس تو یہ ہے ___ اونہہ کمال کو مارو گولی ___ کیا اس کی انالس صحیح ترین ہے اور یہ کیمونسٹ کیا کہتے ہیں ___ ہونہہ' ان کی بھلی چلائی ___ سوچتے سوچتے گوتم نیلمبر کا فلسفہ کمال کا جوش وخروش' طاعت کی تیز گفتاری' تہمینہ کی پرسکون شخصیت ___ سب ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آئیں اور وہ خود کون تھی؟ کیا

تھی؟ اس کو لوگ کیا سمجھتے تھے؟ گوتم اس کو کیا سمجھتا تھا؟ گوتم کی رائے اس قدر عزیز کیوں ہے؟ جہنم میں گیا وہ ____ اور عامر رضا ____ عامر رضا ____

صبح کو وہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ سروپ نکھا کی ناک کٹی۔ راون جلا۔ بھرت ملاپ ہوا۔ دبلے پتلے لڑکے منہ پر سیروں غازہ اور سفید پوتے' پنّی کے نقلی تاج پہنے' رام اور لچھمن بنے بڑی تمکنت کے ساتھ تختِ رواں پر سوار ہوئے۔ انسانوں کو ان میں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لکھنو واپس آ گئی۔ زندگی جاری رہی' پھر کوار کے مہینے میں اماوس کی کالی راتوں کو دیپ مالیکا نے روشن کر دیا چھوٹی اور بڑی دیوالی منائی گئی۔ گھر گھر لکشمی کی تقدیس کی گئی۔ آج لوقا چماری کی عملداری ہے۔ گلفشاں کے برآمدے میں خالہ بیگم نے اظہار خیال کیا۔ بچو' باہر مارے مارے مت پھرو۔ آج کی رات جانے کتنے جادو ٹونے ہوں گے؟ سامنے چورا ہے پر ایک دونے میں مٹھائی رکھی تھی اور چراغ جل رہا تھا۔ جانے کون وہاں رکھ گیا تھا۔ یاد ہے ایک مرتبہ جادو کی ہنڈیا اڑتی ہوئی آئی تھی اور ہماری احاطے میں گری تھی۔ طلعت نے کہا' وہ گھاس پر آ کر آسمان کو دیکھنے لگے۔ آج کی رات لکشمی اپنی سواری کے الو پر بیٹھی ساری دنیا پر پرواز کرتی پھر رہی ہے۔ جانے وہ کس کس کے دروازے میں داخلہ ہو گی۔

''باہر گھاس پر مت جانا بچو۔'' خالہ بیگم نے پھر آواز لگائی۔ ''برسات کا سانپ دیوالی کا دیا چاٹ کر بلوں میں جاتا ہے۔''

جگہ جگہ چوراہوں اور گلیوں میں جوا ہوا۔ رام اوتار اور قدیر جوا کھیلنے گئے۔

(ارے اگر آج جوا نہ کھیلا تو اگلے جنم میں چھچھوندر کی جون ملے گی رام اوتار نے کہا) پھر بھیا دوج کا تہوار آیا۔ ہری شنکر قالین پر چڑھایا بیٹھا تھا اور نرملا اس کے ماتھے پر تلک لگا کر اس کے سامنے مٹھائی پروس رہی تھی۔ گنگا کے بھائی یم کی طرح میرا بھیا امر رہے۔ اس نے منتر دہرایا پھر اگہن اور پوس کے پالے نے درختوں پر چاندی کے پتر چڑھا دیے۔ گاؤں میں ٹوٹنکیوں کے گیت گونجے۔ چوپالوں میں مہابھارت کے قصے دہرائے گئے۔ سفید اٹنگی ساریاں پہنے عیسائی عورتیں گاتی پھریں: او ہو مسیح آیا سر آسمان ـــــــ سر آسمان سر آسمان ـــــــ کھچڑی کا تہوار آیا تو لوگ ماگھ میلا نہانے تربینی چلے۔ بسنت پنچمی میں گھر گھر سرسوتی پوجا کی گئی ـــــــ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیکھا کہ گورے رنگ کی دیبی سفید ساری پہنے سفید کنول پر بیٹھی شفاف الوہی پانیوں پر تیر رہی ہے۔ کمہاروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹی کی مورت میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا' پھر پھاگن کی رت آئی۔ شوراتری کی تیاریاں کی گئیں۔ نرملا نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے ٹھاکر دوارے میں بلوا کی پتیاں' دھتورہ اور چاول تھالی میں رکھ کر شو کی آرتی اتاری۔ محرم کا ہنگامہ ہوا۔ گھر گھر گھاس اور موم اور کاغذ کے تعزیے تیار کیے گئے۔ انسانوں نے اپنی ساری صناعی ان پر ختم کر دی۔ ان کاغذ اور پنی اور ریشم کے گہواروں' تابوتوں اور تعزیوں میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ امام باڑوں میں چراغاں ہوا۔ گلی کوچوں سے پیلو اور سوہنی اور درگا نوحہ خوانی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساری فضا نے غم کا لبادہ اوڑھ لیا ہر شخص حسین کا سوگوار بنا۔ (سبطین اباد کے امام باڑے میں آٹھویں کی مجلس کے بعد ایک عیسائی فقیرنی نے چمپا کا دامن پکڑ کر کہا: مولا کے نام

پر ایک ڈبل دیتی جایئے۔) شاہ نجف کے امام باڑے میں چراغاں کے روز حسب معمولی برقی قمقموں سے بنے ہوئے حروف میں ''ہز میجسٹی کنگ غازی الدین حیدر'' کا نام جگمگایا۔ مارچ کے مہینے میں ساری فضا گلال اور عبیر سے سرخ ہوگئی۔ کرشنا کی مورتی کو جھولوں میں بٹھالایا گیا۔ صبح صبح یون فائز میں راکھشی ہولکا جلی۔ ہاہیارے سڑکوں پر کبیر گاتے پھرے۔

یہ سب دماغ کا دھوکا تھا' ذہن کا فریب' نظر کا بہالوا۔ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں تھے صرف ذاتی مسرت اصل چیز تھی۔ جہاں ملے' جس قیمت پر ملے ذاتی مسرت حاصل کرو۔ تمہارے اصول' تمہاری جیل یاترائیں' تمہاری کانگریس' تمہاری مسلم لیگ ______ سب بکواس ہے تم لوگ جو انسانیت کی قسمت کا فیصلہ کروانے چلے ہو۔ مارا ماری میں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ نہیں مجھے صرف ذاتی مسرت چاہیے۔ گھر' سکون' بچے' شوہر کی محبت۔

تم کیا افسوسناک باتیں سوچ رہی ہو چمپا بیگم۔ شرم کرو____ اس کی منطقی وجود نے جو کھڑکی میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا' پلٹ کر اس سے کہا____ شرم کرو______ شرم کرو فضاؤں میں آواز بازگشت گونجی۔ بھادوں کے جھالے اسے یہی سناتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سیاہ بادلوں نے چاروں اور سے بڑھ کر اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔ اس قدر زبردست ریلا آیا کہ زمین آسمان ایک ہوئے' ندی نالے جل سے بھر گئے' گوڑ ملہار کی تانوں میں دنیا بھر کا درد سمٹ آیا' پروائی کے جھونکوں نے دل کو کاٹ کاٹ ڈالا۔

وہ درختوں کی ٹہنیاں سامنے سے ہٹاتی سڑک پر آگئی۔ سامنے پروفیسر بنرجی

کی کوٹھی تھی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بہت بڑا مجمع تھا۔ آج کے دن دنیا میں بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے۔ (یہ لوگ فیصلے کرتے وقت میرے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟ میں چمپا احمد جو یہاں تنہا کھڑی ہوں)۔ ڈرائنگ روم کے پردوں کے پیچھے وہ سب موجود تھے‘ وہ آہستہ آہستہ چنبیلی کی بھیگی جھاڑیوں میں سے گزرتی دریچے کے نیچے آ کر کھڑی ہوگئی اور اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس سیٹی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گوتم بھی تھا اور کمال بھی۔ گوتم نئے ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو جا رہا تھا۔ کمال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے نظریے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے لندن بھیجا جا رہا تھا کہ آج معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ ملازمت پیشہ لوگ اب اس فکر میں غلطاں پیچاں بیٹھے ہیں کہ اپنی نوکریاں کہاں منتقل کروائیں۔ یہاں رہے تو نقصان ہے۔

’’ان کا خیال ٹھیک بھی ہے۔‘‘ گوتم کہہ رہا تھا۔ ’’پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے ـــــــــ تمہارے بابا کا کیا ارادہ ہے؟‘‘

’’بابا کیسے جا سکتے ہیں؟ زمینداری نہیں چلی جائے گی ساتھ۔ بھیا صاحب نے البتہ اوپٹ کر دیا ہے۔‘‘ کمال نے جواب دیا۔

دلی‘ شملہ‘ نمبر ۱۰۔ اورنگ زیب روڈ‘ وائسر یگل لاج‘ بھنگی کولونی ـــــــــ یہ الفاظ اس کے کانوں میں آتے رہے‘ وہ دریچے سے ہٹ آئی اور چلتی ہوئی پھر سڑک پر آ گئی۔

اب اس کے سامنے دو دنیائیں تھیں۔

ایک طرف یہ لوگ تھے' ان کے دل و دماغ' ان کے تصورات' ان کی جدوجہد ______ مگر یہاں مستقبل بے حد مبہم تھا۔ دوسری طرف سکون تھا اور حفاظت۔ ذاتی مسرت ______ عامر رضا پاکستان جا رہے تھے۔ کیوں نہ جائیں' آخر وہ کمال کی طرح سرپھرے تھوڑا ہی ہیں۔ یہاں ان کا مستقبل کیا ہے؟ نئے ملک میں وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے۔ ذاتی مسرت ذاتی ترقی' ذاتی مقاصد' آخر کیوں نہیں۔ سیاست ہی تو ساری زندگی نہیں۔ دوسروں کے لیے میں کیوں سوچوں؟ دوسروں نے مجھے اب تک کیا دیا۔ چنانچہ اس نے تفصیل سے سوچنا شروع کیا ______ میں عامر رضا سے شادی کر کے پاکستان چلی جاؤں گی' کتنی آسان بات ہے۔ یکلخت ایسا لگا جیسے بلز ختم ہو گیا' سکون سارے میں چھا گیا۔ اس نے تصور میں اپنا نام پڑھا۔ بیگم عامر رضا۔ کراچی ______ واہ بھئی' مگر یہ لوگ کمبخت بہت یاد آئیں گے۔ پر اب انسان کو دنیا میں ہر چیز تو حاصل نہیں ہو سکتی تم کیک لو بھی اور اسے کھاؤ بھی۔ ناممکن ہے' وہ شاہی پھاٹک تک پہنچ گئی' اس کے پیچھے پیچھے گوتم آ رہا تھا۔

''چمپا باجی خدا حافظ'' اس نے کہا۔

''جاتے ہو ماسکو۔''

''ہاں۔''

''کمال کا کیا ہوا؟''

''وہ جا تو رہا ہے جولائی میں چلا جائے گا۔ طاعت اور نرملا بھی جا رہی ہیں' ان

سب کو کیمبرج میں داخلہ مل گیا ہے۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘

’’آپ بھی کیوں نہیں باہر چلی جاتیں‘ چمپا باجی۔ یہاں بیکار اپنا وقت گنوا رہی ہیں یا اگر شادی کر رہی ہوں تو دوسری بات ہے‘ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان چلی جائیں گی۔‘‘

وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک کے پرانے گموں سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ گوتم اس کے سامنے موجود تھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔ ’’آخر تم بتاتے کیوں نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔‘‘ اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

’’آپ کس سلسلے میں مجھ سے رائے لے رہی ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کون کس کو رائے دیگا‘ کون کس کا ناصح بن سکتا ہے۔ میں کمینہ نہیں ہوں چمپا باجی‘ محض حقیقت پرست ہوں۔‘‘

’’تمہارے پاس میرے لیے صرف یہی الفاظ ہیں؟‘‘

’’آپ تو الفاظ میں معنی نہیں دیکھنا چاہتیں‘ اس لیے کیا فرق پڑتا ہے‘ میں جو بھی کہوں وہ بے معنی ہوگا۔ خدا حافظ۔ گلفشاں جایئے تو اپی کو بتا دیجیے گا میں صبح دلی روانہ ہو رہا ہوں۔‘‘ وہ آگے طلا گیا۔

طلعت اور نرملا باتیں کرتی قریب سے گزریں۔

’’دل نہیں مانتا‘ ملک کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم انگلستان بھاگ جائیں‘ حالانکہ تعلیم بھی بڑی سخت ضروری ہے ________ گو یہ بہت سخت بورژوا موقع پرستی ہوئی نا۔‘‘ طلعت کہہ رہی تھی۔

''بالکل۔ حالانکہ کیمبرج میں اتنی مشکل سے داخلہ ملتا ہے' اگر اب نہ گئے تو سمجھو کئی سال برباد گئے۔'' نرملا نے جواب دیا۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ دونوں بھی اسے ہلو کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

اب کمال قریب سے گزرا۔

''چمپا باجی' مبارک ہو' تمہارا پاکستان بن گیا۔'' اس کے لہجے میں جس قدر تلخی' نفرت اور شکستہ دلی چھپی تھی اس کا احساس کر کے چمپا لرز اٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کمال ایک اور تقریر کرے گا' اسے برا بھلا کہے گا مگر یہ کیا ہوا کہ کمال اب بالکل خاموش تھا۔ گویا اب مزید کچھ کہنے' سننے' خفا ہونے' بحث کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ باتوں کا دور ختم ہوا۔ اب ایک حقیقی دنیا سامنے تھی' فیصلے اور عمل کی منتظر کمال ایک لمحے کے لیے خاموش کھڑا پھاٹک کو دیکھتا رہا۔ جس کے ایک اندھیرے طاقچے میں چوکیداری کی لالٹین جل رہی تھی' اس کے بعد وہ بھی چپ چاپ آگے چلا گیا۔

وہ اکیلی وہاں پھولوں کی نیم تاریکی میں کھڑی رہی۔ یہ سب اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے راستے پر چلے گئے' وہ پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ سارے میں سناٹا چھایا تھا۔ مکانوں اور درختوں کے پرے گلفشاں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ گلفشاں' جو اس کے لیے اجنبی تھی مگر اس میں وہ موجود تھا ——— وہ جو اس کا ہاتھ تھامے گا' وہ اس کے راستے پر چلے گی۔ آخر زندگی میں رومان اور محبت اور گلاب کے شگوفوں کا وجود ہے کہ نہیں! انسان کہاں تک محض سایوں کا تعاقب کرے' وہ اس سے کہے گی: لو بھئی میں یہاں ہوں ——— ہنگامے ختم ہوئے۔ اب سکون اور آرام کا وقت ہے۔ ان لوگوں کو جدوجہد اور مصائب کی

وادی میں دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے اور خاک چھاننے دو۔ایک وقت آئے گا جب یہ بھی تھک جائیں گے اور منہ لٹکا کر اپنی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ لو میں آن پہنچی۔خالص رومان کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھ پائی جس کے تم سمبل ہو۔(یہاں ہر چوز کا سمبل موجود ہے۔ان لوگوں نے سمبلز میں ساری زندگی کو تقسیم کر دیا تھا)۔مگر اب میں تمہاری اور آتی ہوں۔

پھاٹک پر اسے رام اوتار ملا۔

''بھیا صاحب ہیں؟''اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے'وہ چوروں کی مانند خوفزدہ ہے'وہ گلفشاں میں سیندلگانے آئی ہے۔

''بھیا صاحب تو ابھی چلے گئے۔''

''کہاں۔''

اب اندھیرے میں سے نکل کر گنگا دین بھی سامنے آ گیا۔

''کہاں چلے گئے بھیا صاحب؟''چمپا نے دہرایا

''وہیں ـــــــــ''رام اوتار نے تلخی سے جواب دیا''مسلمانوں کے پاکستان۔اب آپ بھی چلی جایئے گا۔سب جنے چلے جائیں گے۔ہم اکیلے رہ جئیہیں ـــــــ''

گنگا دین'رام اوتار کے قریب آ گیا'وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی تھا اور روز ہندی اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔بھیا صاحب بڑے بے وپھا نکلے۔چمپا بٹیا کو چھوڑ کر چلے گئے چپے سے۔انہوں نے ہمیں بھی چھوڑ دیا۔بھیا صاحب نے گنگا دین سے دغا کی۔بڑی بے وپھا بے مروت قوم ہے ـــــــ اسے صبح کا ہندی اخبار کا

اڈیٹوریل یاد آیا جس میں مسلمانوں کو غدار بتایا گیا تھا۔

بھیا صاحب بمبئی گئے ہیں ______ ہواں جہاجن کا بٹوارہ ہوت ہے۔ اپنے مسلمانی جہاج لے کر کراچی چلے جیہیں۔ کدیر بتاوت رہے۔'' رام اوتار نے اطلاع دی، ''ہو ______ لا ______ لا ______ لا ______ لا ______'' اس نے طوطوں کو اڑانے کے لیے پھلوں کے درختوں پر ایک پتھر پھینکا۔

گنگا دین اور رام اوتار کو اپنی اپنی سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ واپس لوٹی۔ بھیا صاحب چلے گئے کیونکہ گھوڑوں اور تیز رفتار موٹروں اور لڑکیوں کے علاوہ اب ان کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی: نیا ملک' نیا عہدہ' ترقی' نئے مسائل۔ مردوں کی دنیائیں بالکل علیحدہ ہوتی ہیں۔

''اس آدمی کے لیے میں نے اتنا وقت برباد کیا؟ ارے میں کتنی مورکھ تھی۔''

پھر اسے احساس ہوا' ساری بات یہ تھی کہ بھیا صاحب بے حد خوبصورت تھے اور اس نے بھیا صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یادوں کے خزانے میں ایسے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہرگز نہیں ______ سامنے ان کی سابقہ کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ گلفشاں کا لان جس کے سرے پر یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے۔ ان کے مصاحبین: کمال' گنگا دین' ان کا خاندان۔ ان کی کزن تہمینہ جو اندر بیٹھی ہو گی۔ وہ بھی ان پر جان دیتی تھی۔ بھیا صاحب خوبصورت تھے۔ اور مغرور۔ ان کو غرور جانے کا ہے کا تھا۔ چمپا کو سوچ کر ہنسی آ گئی۔ اس کا جی چاہا خوب ذوروں کا قہقہہ لگائے۔ انسانوں کو آخر غرور ہوتا کس بات پر ہے؟ اپنی شخصیت پر؟ شخصیت؟ گوتم نیلمبر اپنے ذہن پر نازاں ہے۔

کمال کو اپنی اصول پرستی کا زعم ہے۔ تہمینہ اپنے انکسار اور مزاج کی نرمی پر فخر کرتی ہے۔ لوگ اس قدر خود پرست کیوں ہیں؟ چمپا نے چلتے چلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آرہی ہے۔ ہواؤں میں آزادی تھی۔ پتیوں کی سرسراہٹ میں عجیب قسم کی طمانیت پنہاں تھی۔ محض میں ہی محسوس کر رہی ہوں یا اور لوگ بھی اس آزادی کا احساس کر سکتے ہیں۔ مثلاً تہمینہ ــــــ اور ــــــ گوتم جو اپنے کزن کی بیوشانتا پر عاشق ہے۔

"ہا ــــــ ہا ــــــ ہاؤ فنی ــــــ اس نے دل میں کہا۔"

پھر اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ وسیع، بھیگی خوشبودار زمین چاروں طرف پھیلی تھی۔ باغوں کے گیلے راستے جن کے دونوں طرف اونچی باڑیں تھیں، روشیں ــــــ گھاس جس پر سرخ بیر بہوٹیاں چل رہی تھیں۔ آم کے درختوں پر اودے گہرے بادل جھکے تھے۔ زمین میں سے نمی اور خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ شفاف پانی کے برساتی نالے کے برابر جو پگڈنڈی ایسی بن گئی تھی اسے الانگ کر وہ برسوں دوسری لڑکیوں کے ساتھ یونیورسٹی جاتی رہی تھی۔ سامنے مولسری والی سڑک پر سیگ زرتے اب بھی لڑکیوں کے پرے ہوسٹل کی طرف جا رہے تھے۔ گلفشاں کے احاطے کا چکر کاٹ کر وہ پچھواڑے والی سڑک پر آ گئی جدھر اسے ایک کچا راستہ سنگھاڑے والی کوٹھی اور ندی کی سمت جاتا تھا۔ سامنے سرکنڈے کی ٹٹ لگی تھی۔ چاروں اور پھولوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہرے طوطے شور مچا رہے تھے، ہر چیز وہی تھی۔ سامنے لوکی کی بیل میں سے اسے قمرن کا آنچل نظر آیا۔

''کا بات ہے بیٹا ____ ''قمرن نے دفعتاً سامنے آکر پوچھا۔

''کچھ نہیں دریبر کی بی بی۔'' اس نے کہا۔

قمرن چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

''ہم یہاں بیٹھ جائیں دریبر کی بی بی۔''

''جی ہاں۔ آیئے۔ ضرور بیٹھیے ____ بارش آ رہی ہے بیٹا ____ اوسارے میں آجایئے۔''

وہ شاگرد پیشے کے برآمدے میں آ گئی۔ برآمدے کا فرش خنک تھا۔ منڈیر پر برتن رکھے جگر جگر کر رہے تھے۔ دیوار پر قدیر کی گول کالی ٹوپی کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ چادر پر پاپڑ پھیلے تھے۔

''پاپڑ سکھائے خاطر تنکو گھام اونہیں ملت ہے۔'' قمرن نے بات شروع کی۔ اسے معلوم تھا کوئی بات ضرور ہے۔ اندر کوٹھی میں بھی سناٹا تھا۔ ''بیٹا آپ لوگ منئی کی طبیعت نہیں جانت ہیں ہم نیچ تو ای جانت ہن کی منئی جیسے خوش رہت ہے جب برابر اوکی ٹہل کیے جاؤ اوکے لیے اپنی زندگی تج ڈالو۔ ویسے ای لوگ کے خوش ناہیں ہووت ہیں۔ ہم تہمانہ بیٹا کو کیسے سمجھائی کہ لڑکین کا اپنی اوکات پہچانے کا چاہی' وہ بھیا صاحب سے بگڑ گئی رہن' وہ ان سے ایک ٹھو بات کیے بغیر ہی پاکستان چلے گئے۔ اب بیٹا صاحب رووت ہیں۔

چمپا خاموش رہی۔

''لڑکی کا اوکات ہے۔'' قمرن اداسی سے کہتی رہی۔ ''مہرارو بن جائے تب بھی منئی کی نوکر۔ مہتاری بن جائے تب بھی اور جب بڑھوتی کے جمانے میں بہو

بیاہ کرلائے اوکی دھونس الگ سہے ___ کا آپ ہو بلایت جارہی ہیں؟''

''ہاشاید۔''

''اچھا ہے۔بیٹا۔مل اگر ان کو چاہت ہیں جی کا چین ان کا چھوڑ کر بھی نہ ملیے گے''

''بھیا صاحب نہ ہی کوئی اور سہی۔سب منئی ایک سیت تھوڑا ہی ہوت ہیں دریبر کی بی بی۔''چمپا نے ذرا گھبرا کر کہا۔ پروائی کا ایک جھونکا آیا۔بارش کے قطرے ٹپ ٹپ۔چھپر پر برس گئے۔

''سب منئی ایک سے ہوت ہیں بیٹا ______ قمرن نے کہا۔''پان بنائی؟

''نہیں قمرن رہے دیو ______ اب ہم ہو چلیا۔''چمپا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چھتری سنبھال کی پگڈنڈی پر سے گزرتی درختوں میں غائب ہوگئی۔

قمرن چھپر میں سے باہر آ کے اداسی سے اسے دیکھتی رہی۔''ای بٹیاون بات کاہے نہیں سمجھ پاوت ہیں۔''اس نے چھتکی رم دیا سے کہا

''بٹیاون میں ہمت نہیں۔ڈرت ہیں۔سمجھت ہیں تھوڑا سا انگریجی پڑھ لیہین تو دنیا جان گئیں۔بٹیاون میں ہمت نہیں۔'' چھتکی نے سر ہلا کہا۔

۵۶

طاعت طنبورہ اٹھا کر برآمدے میں آن بیٹھی۔اس نے 'اب کے ساون گھر آجا' الاپنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔تہمینہ کمرے میں بیٹھی مشین پر بلاؤ

رہی تھی۔ بارش بند ہو جانے سے ایک دم حبس طاری ہو گیا۔ طلعت اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

بھیا صاحب کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اب وہ کراچی میں ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ اس ہماری دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی' وہ پاکستان نہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ______ طلعت نے سوچا۔ ان کا جانا بالکل لوجیکل تھا۔ ان کے جانے سے گویا پہلا ایکٹ اپنی تکمیل کو پہنچا' وہ بھلا کیا کھا کر ہمارے ساتھ ہمارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ______ بھگوڑے کہیں کے ______ وہ تہمینہ کی مدد کے لیے مشین کا ہینڈل گھمانے لگی۔ ''چمپا باجی نے بڑے خوبصورت کھن پیس خریدے ہیں۔'' اس نے محض کچھ بات کرنے کی خاطر کہا۔

تہمینہ نے سر اٹھا کر اسے اس طرح دیکھا گویا وہ بڑی پراسرار ہستی تھی۔ پنکھا گھوں گھوں کرتا چلتا رہا۔ باہر درختوں میں ایک کوئل مستقل کواو' کواو کیے جا رہی تھی' بہت دور سے رام اوتار کی آواز آ رہی تھی۔ طلعت میں یکلخت خود اعتمادی واپس آ گئی۔

''دراصل آپی یہ سب جذبات کی بات ہے۔ جذبات اور ذہنی ہمدردی اور ایکو یشن'' اس نے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اتنا عرصہ گوتم وغیرہ کی سنگت میں گزار کر اسے ان الفاظ پر یقین آ گیا تھا۔

''اب تم نے بھی یہ چار سو بیس شروع کی۔'' تہمینہ نے اکتا کر کہا۔

''چار سو بیس؟'' طلعت نے دہشت زدہ ہو کر کہا'' آپی یہ اصلیت ہے۔

پرابلمز کا مثلث بن جاتا ہے۔تمہارا پرابلم ــــــ بھیا صاحب یا چمپا باجی کا پرابلم ــــــ اوران سب کا انٹرایکشن ــــــ یعنی کہ ــــــــ''

تہمینہ نے اسے غور سے دیکھا۔''تم ڈاکٹریٹ کے لیے کیمبرج جارہی ہونا؟''

طاعت برامان گئی'مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں'قسم خدا کی اپی مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔

''آپ کے نزدیک میں چغد ہوں؟''اس نے دکھ سے پوچھا۔

''نہیں۔تم بے حد عقلمند ہو ــــــ مگر عورت بھی ہو۔''

''اپی ــــــ ''طاعت دہاڑی ــــــ ''اپی تم نے حد کردی'تم اس قدر بورژوا ہوگئیں'تم نے پڑھ لکھ کر گدھے پرلادد یا۔''اس کا جی چاہا اپی کی ذہنیت پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔''ہائے اپی۔''اس نے تہمینہ کو الماری میں سے رنگین دھاگے کی ریلیں نکالتے ہوئے دیکھ کر کہا''ارے تم تو موومنٹ میں شامل تھیں'تم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے'وہ ۴۲ء کا واقعہ یاد نہیں جب دلی یونیورسٹی کا مارس گائیر آیا تھا اور تم نے کالی جھنڈیوں کے جلوس کی قیادت کی تھی۔رشیدہ آپا کی تم لفٹنٹ رہیں۔کیا کیا تقریریں تم نے یونین میں کر ڈالیں۔چمپا باجی جیسی ری ایکشنری کو تم نے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی اوراب تم عورت کا لیبل چپکا کر قانع ہوگئیں۔ارے لڑو ــــــ کام کرو ــــــ بھیا صاحب چلے گئے تو کیا ہوا؟ جہاں مرغا نہیں ہوتا وہاں سویرا نہ ہوگا؟بھیا صاحب کی قوم کے سینکڑوں موجود ہیں اور یہ اسرار میرے پلے نہیں پڑتے کہ ان سے بیاہ کرنے سے شدت سے انکار بھی ہے اوراب بیٹھی روتی ہیں۔جہنم میں جائیں بھیا صاحب۔ارے ان کا دماغ بھی

تم ہی نے خراب کیا تھا۔ نرملا بالکل ٹھیک کہتی ہے، مردوں کو اتنا منہ ہی نہ لگانا چاہیے ورنہ ان کا دماغ خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ ارے پوچھو' آپ ہیں کون چیز؟ نہ شکل نہ صورت۔ گورا رنگ' مولی کا ایسا۔ ہر اٹیلین لوفر اسی شکل کا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے سی تین سو ساٹھ ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پورے چھ سال تک عین تمہاری ناک کے نیچے چمپا باجی سے فلرٹ کیا کیے اور اب تشریف لے گئے تو بیٹھی چپکو پہکو روتی ہیں۔ ارے لگا تیں ایک جوتا بھیا صاحب کی ناک پر ________"

"طاعت ______ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں' بدتمیزی مت کرو۔"

"ہاں اور کیا' اب اسی کی کسر رہ گئی ہے کہ تم ان کی طرفداری بھی کرو۔ پرانوں میں یہی لکھا ہے' ہر پتی ورتا استری کا یہی دھرم ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں کہتی ہوں تم میں اور چھٹکی میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی رام اوتار کے ہاتھ سے روز پٹتی ہے۔ حسینی کی بی بی نے کل اس کی ہمدردی میں رام اوتار کو برا بھلا کہا تو اے لو وہ تو حسینی کی بی بی کی جان کو آ گئی کہ خبردار جو میرے آدمی کو کچھ کہا۔"

اتنا کہتے کہتے غم و غصے سے طاعت روہانسی ہو گئی۔ بھیا صاحب کے بجائے اسے اپی پر غصہ تھا' اگر عمر میں بڑی نہ ہوتیں تو ان کی اتنی ٹھکائی کرتی کہ ساری وفاداری اور محبت اور ربورژوا رومانیت ہوا ہو جاتی۔ ہائے ہائے۔ اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانا شروع کیا۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ سائیکل اٹھا کر وہ نرملا کے گھر پہنچی' وہاں جا کر اس نے چقندر کی بھجیا کھا کر پیا اور نرملا اور مالتی اور ہری شنکر کے ساتھ بیٹھ کر ترپ چال کھیلتے جا کر اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا

ہوا۔

طلعت کے جانے کے بعد تہمینہ مشین پر سے اٹھی اور دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ پہلا ایکٹ ختم ہوا' اس نے دل میں کہا۔ ہوا میں طوفان لرز رہے ہیں اور گلفشاں کی بنیادیں ہل چکی ہیں' ہم سب کے ذاتی طوفان۔ اگر ڈراما لکھا جائے تو کردار کی تشریح یوں ہوگی:

نواب زادی تہمینہ بیگم 'عمر پچیس سال۔ فرسٹ کلاس ایم اے سانولی' دبلی' حساس' اندر ہی اندر غم کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں اپی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ خلیق اور منکسرالمزاج 'مغرور۔ اس حقیر وضاحت کے بعد اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں ہوگا:

دس سالہ کا وقفہ۔ تہمینہ' جواب ذرا موٹی ہوگئی ہے۔ بچے کو گود میں لیے گنگنا رہی ہے: میں کھاؤں' مور بالا کھائے' بالے کا جھنجھا کو دنہ کھائے۔ بالے کا ــ ــ ــ ــ چہرے پر معصومیت اور اشتیاق کی جگہ صبر اور سکون آ گیا ہے ــــــ صبر اور سکون ــــــ لاحول ولاقوۃ ــــــ وہ برآمدے میں آ گئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ چبوترے پر بہت سے رشتے دار بچے ''کوڑا جمال چاہی'' کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پرے سوسن' طلعت کی چیزیاں رنگ کر پھیلا رہی تھی۔ کمال نے چبوترے کی منڈیر پر سے جھانکا' واہ کیا سہانا منظر ہے۔ دوپٹے رنگے جا رہے ہیں۔ اپی مشین چلا رہی ہیں۔ برآمدے میں تخت پر تین چار خالائیں مصروف گفتگو ہیں' وہ بھی اندر آ کر نہایت ذہانت سے ان کی باتوں میں حصہ لینے لگا۔ جی ہاں' چھوٹی خالہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ضرور پاکستان جائیے' وہاں

بڑے ٹھاٹھ رہیں گے‘ وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا۔ تہمینہ نے اسے دریچے میں سے دیکھا‘ یہ سب ڈرامے کے کردار تھے جو خواب میں چل پھر رہے تھے۔ اسٹیج پر دھندلکا چھا گیا تھا۔ وہ بھی باہر آ گئی۔

کمال نے بچوں کو کوڑا جمال شاہی کھلانا شروع کیا۔

”کوڑا جما شائی۔ پیچھے دیکھا مار کھائی ــ ــ ــ ــ پیچھے دیکھا ـــــ ہلو ـــــ اپی ـــــ“ اس نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ ”سل گئے بلاوز ـــــ کوڑا جمال شائی ـــــ“

تہمینہ برآمدے کے ستون سے ٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کوڑا جمال شائی۔ اپی چمپا باجی تشریف لے جا رہی ہیں‘ بلکہ لے گئیں تشریف ـــــ پیچھے دیکھا مار کھائی ـــــ“

”کیا ہوا؟ کہاں؟“ تہمینہ نے چونک کر پوچھا۔

”فرانس ـــــ کوڑا جمال شائی ـــــ اس نے زور سے ایک چھوٹی سی بچی کو چنے ہوئے دوپٹے سے مارا‘ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے پیچھے دوڑی۔“

”کیسے؟“ تہمینہ نے آواز دی۔

”یونیورسٹی اسکالرشپ ـــــ“ کمال نے کہا۔ بچوں نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا ـــــ یہاں تک کہ کمال دوپٹے کی کنڈلی گھاس پر پھینک کر باہر بھاگ گیا۔

سڑک پر آ کر کمال نے گلفشاں پر ایک نظر ڈالی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر

سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔

اگست کی بارشیں اب کے ایسی ٹوٹ کر برسیں کہ زمین آسمان ان میں ڈوب گئے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔ سٹیل پائپ بچھا کر وہ سب بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے۔ موقعے کی مناسبت کے لحاظ سے طلعت نے دوبارہ تان پورے کو ٹیون کر کے ملہار شروع کرنا چاہا مگر ساری آوازیں ڈوب چکی تھیں۔

بارش کا پانی جو شفاف تھا' شروِن کی الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی' اس میں خون ملا تھا۔ خون کی برکھا رت' خون کی کیچڑ' خون برسانے والے بادل۔ خون کی اس فراوانی سے طلعت عاجز آ گئی۔ نرملا کی نئی کینوس کے قرمزی رنگوں میں اسے خون نظر آیا۔ گومتی خونی ندی تھی جو بہہ رہی تھی۔ (حالانکہ یہ صرف ڈوبتے سورج کا عکس تھا)۔ پھولوں پر خون تھا۔ انسانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے سہم کر نرملا اور ہری شنکر کو دیکھا۔

۵۷

اور اب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجن نے اپنی کمان اٹھا کر کرشنا سے کہا:

او جنار دھن! میرا رتھ دونوں فوجوں کے درمیاں کھڑا کر دو تاکہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونو فوجوں

کے درمیان کھڑا کر دو تا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھا باپ دادا' چچا' بھائی' بھتیجے' بیٹے' دوست' استاد' رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کیے کھڑے تھے۔

تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا: اور کرشنا! یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھر تھر کانپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ او کیشو! میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے برے شگون دکھلائی دے رہے ہیں۔

او مادھو! میں اپنے ہی کنبے' اپنے دوستوں اور اپنے استادوں کو مارنا نہیں چاہتا کیونکہ کنبے کی تباہی سے قدیم روایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور روحانیت کے خاتمے کے ساتھ کنبہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ عورتیں نیک نہ رہیں گی اور پرکھوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ پرکھوں کی تقدیس کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

او مدھوسودن! میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ میں یا میرے دشمن۔ ہمیں ان کو زیر کرنا چاہئے یا نہیں ہمیں۔ او گوندا! میں نہیں لڑوں گا۔

۵۹

سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے نے پھر وقت پر نظر ڈالی اور پکیڈلی کے ٹیوب اسٹیشن میں گھڑی کے نیچے، جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہو جاتا تھا، ٹہلنا شروع کر دیا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس قسم کے راں دے دو سے اسے ہمیشہ سے نفرت تھی مگر وہ چمپا احمد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے تھیٹر لے جائے گا اور وعدہ نبھانا بہر حال ضروری تھا۔ تنگ آ کر اس نے نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں گوتم نیلمبر کا جو خط تقسیم ہند اور جنگ اور امن کے مسئلے کے متعلق چھپا تھا سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے گھر پہنچ کر اس پر پر دوستوں سے بحث کرے۔

سرل دوسرے لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے دادا پہلے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون ایشلے نے اس ارسٹو کریٹ خاندان کی بنیاد رکھی تھی جو اب سٹی میں ربر اور جوٹ کی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ سرل کے پردادا سر سرل ہاورڈ ایشلے ایک مفلوک الحال پادری کے بیٹے تھے جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کلرک کی حیثیت سے بنگال گئے تھے جہاں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دوران نیل کی تجارت سے لاکھوں روپے کمائے۔ روایت تھی کہ شاہ اودھ کے دربار میں انہوں نے خوب ہاتھ رنگے اور جو لاکھوں پاؤنڈ کی مالیت کے ہیرے

جواہرات شاہ اودھ نے ان کے تحفے میں دیئے وہ علیحدہ، وہ کسی صوبے کے گورنر بن چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور ان کے اکلوتے لڑکے نے جوان ہو کر انگلستان میں ربر کی تجارت شروع کی' گاؤں اور محلات خریدے' لارڈ کا خطاب حاصل کیا' پارلیمنٹ میں بیٹھا اور باقاعدہ ارسٹوکریسی میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا لارڈ بارن فیلڈ تھا۔ اس کی تجارت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنت برطانیہ کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں پھیل گئی۔ اس کا بیٹا دوسرا لارڈ بارن فیلڈ ایمپائر کا اور بھی زیادہ قابل فخر فرزند ثابت ہوا اس نے برطانیہ کی فارن سروس میں بڑے بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ ترکوں اور افغانوں کا قلع قمع کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون وضع کیے۔ کلکتے سے ایک کنزرویٹو اخبار نکالا۔ ایک صحیح النسب ٹوری کی حیثیت سے اسے کالوں خصوصاً نیم وحشی ہندوستانیوں سے دلی نفرت تھی۔ چند اعلیٰ خاندان محمد نز کو البتہ وہ گوارا کر لیتا تھا جن کے ساتھ جب کبھی وہ ہندوستان جاتا تو گریٹ ایسٹرن کلکتہ یا امپیریل ہوٹل دلی کی لاؤنج میں بیٹھ کر اپنے دادا ''نباب'' سرل ایشلے کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔ اس کے دادا نباب سرل ایشلے فی الواقع بڑی رومینٹک ہستی رہے ہوں گے جو اردو میں شعر کہتے تھے اور مرغے لڑاتے تھے' کتھک ناچ دیکھتے اور حقہ پیتے تھے۔ ان کی ایک تصویر رائل اکیڈمی کے مصور زوفنی نے بنائی تھی۔ جس میں وہ ایک بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں اور کالا بھجنگ نیٹو ملازم پیچھے کھڑا مورچھل جھل رہا ہے۔ پس منظر میں تاڑ کے پتے ہیں۔ یہ تصویر میز کے وسطی ہال میں لگی تھی۔

دوسرے لارڈ بارن فیلڈ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بنے۔ ان کے دو لڑکے تھے: بڑا لڑکا تیسرا لارڈ بارن فیلڈ خاندانی کاروبار اور ریاست کا مالک تھا۔ سرل چھوٹا لڑکا تھا۔

بارن فیلڈ خاندان کا ستارہ اب گردش میں تھا۔ ملایا میں ان کے ربر کے جنگلات میں کمیونسٹ چھپے بیٹھے تھے۔ کینیا میں ماؤ ماؤ نے اودھم مچا رکھی تھی۔ ہندوستان کو جب سے آزادی ملی تھی کلکتہ کی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لارڈ بارن فیلڈ اب مشرق پاکستان میں روپیہ لگا رہے تھے اور اتوار کے روز اپنے خاندانی محل بارن فیلڈ پر ٹکٹ لگا کر پبلک کو اس کی سیر کراتے تھے۔ محل بیش قیمت نوادر سے پٹا پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں ایکڑ پر پارک پھیلا ہوا تھا۔ لارڈ بارن فیلڈ کو تجارت اور زمینداری کی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

لیکن سرل ان سب مادی جھگڑوں سے بے نیاز کیمبرج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ چھوٹا بیٹا تھا لہٰذا اسے ہر صورت میں اپنی روزی خود ہی کمانا تھی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ جب سے اس نے روز ماری سے شادی کی تھی بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈی سنتھیا سے اس کا بیاہ رچائیں گے۔ چاہی خاندان کے افراد اس میں شریک ہوں گے۔ ایک ڈیوک کا سرل داماد بنے گا۔ انگلستان کی ارسٹوکریسی کے بچے کھچے افراد کو چاہئے کہ اس نازک دور میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر سرل' اس سرپھرے لڑکے نے تو لٹیا ڈبو دی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ لونڈا کمیونسٹ ہو گیا ہے لیکن ان کا شبہ غلط نکلا۔ اس لڑکے کو

سیاست سے چنداں دلچسپی نہیں تھی، وہ بت وخدا کے فضل سے فلسفی تھا۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم ادھوری چھوڑ کا اس کو پائلٹ بننا پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا کا پرستار تھا اور برلن اور کولون پر جا کر بم گراتا تھا۔ جنگ کے بعد وہ کیمبرج واپس لوٹا۔ روزمیری، جس سے اس نے شادی کی، متوسط طبقے کی ایک لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات آرٹسٹوں کی ایک پارٹی میں ہوئی جہاں آرٹسٹ لوگ رت جگا منا رہے تھے۔ یہ لڑکی خوبصورت نہ تھی۔ مجسمے بناتی تھی۔ بیت چاری کامیاب سنگتراش بھی نہیں تھی اس لیے سرل کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ مکمل، ماہر فن لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ یہ لڑکی بالکل نامکمل تھی۔ اس کی تکمیل ضروری تھی، سرل نے سوچا۔ لہٰذا اس سے شادی کر لی اور لندن سے فون پر اپنے بھائی اور بھاوج کو مطلع کیا۔ لارڈ بارن فیلڈ نے فی الفور اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ ایک تو روزمیری گمنام اور مفلس، اوپر سے رومن کیتھولک۔ لارڈ بارن فیلڈ آگ بگولا ہو گئے، لیکن سرل نے پرواہ نہیں کی، وہ ہیگل کے مطالعے میں جٹا رہا۔ سرل کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی اسٹیفرڈ شائر کے چینی کے کھلونے اور برتن بنانے کے ایک کارخانے میں نوکر ہو گئی۔ سرل کو بعض دفعہ اپنی انگلی پر شادی کی انگوٹھی دیکھ کر بڑا تعجب سا لگتا، پھر اسے دفعتاً یاد آتا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیوی بھی ہے جو بڑی پیاری لڑکی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ بار اس کی روزمیری سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک روز اسے بے حد لطف آیا جب وہ چند ساتھیوں کے ساتھ ایک شلنگ کا ٹکٹ خرید کر خود اپنے ''اسٹیٹلی ہوم'' کی سیر کرنے کے لیے جا پہنچا۔ اس کے بھائی

اور بھاوج جنوبی فرانس گئے ہوئے تھے۔ ہاؤس کیپر اور اسٹاف کے لوگ محل کی سیر کرا رہے تھے' وہ نئے لوگ تھے' کسی نے سرل کو نہیں پہچانا' وہ سارے میں پھرا اور سوچتا رہا' کیسی عجیب بات ہے' میں یہاں پیدا ہوا تھا۔

سرل کا محل قصبے کے اختتام پر تھا۔ چار پانچ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اصل blown-glass کی تھیں۔ ان گنت کمرے اور ہال اور غلام گردشیں۔ سرے پر لیڈی چیپل تھا۔ مارننگ روم میں ہمیشہ دھوپ آتی تھی۔ باغ میں حوض تھے اور روک گارڈن اور ڈچ وضع کی چمن بندیاں اور اطالوی سنگ مرمر کے مجسمے پھولوں میں ایستادہ تھے۔ ایک زمانے میں وہ ان باغات میں خالص کنٹری اسکوائر کی مانند ٹویڈ کا سوٹ پہنے چہل قدمی کیا کرتا اور ٹہلتے ٹہلتے محل کے مغربی حصے کی سمت چلا جاتا جہاں بارہویں صدی کی دو راہبات کی قبریں تھیں۔ قبریں اب خالی پڑی تھیں۔ ان کے تابوت کی جگہ جو پختہ گڑھا سا بنا ہوا تھا اس میں اکثر بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا۔ ان قبروں کے پاس بیٹھ کر سرل نے لڑکپن میں گھنٹوں زندگی اور موت کے گورکھ دھندے کے متعلق سوچا تھا۔

باہر والوں کے لیے اس محل کے چپے چپے میں افسانویت کی افراط تھی۔ سرل کو یہاں کوئی خاص بات نظر نہ آتی' سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا' کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پردادا نباب سرل ہاورڈ ایشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی' وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا

تھا۔ڈبلیو ای۔ییٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشائیوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلکچولز کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔خود وجودیت کے پرستاروں کی اس اصطلاح آزادی کو بڑے زبردست معنی پہنائے جا سکتے تھے۔یہاں پہنچ کر اپنشدوں کے معنی بھی سمجھ آجاتے تھے۔

خاص بات نظر نہ آتی‘ سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا‘ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔اسے تو اپنے پردادا نباب سرل ہاورڈ ایشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی‘ وہ سوچتا۔اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا تھا۔ڈبلیو۔ای۔ییٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشائیوں کی طرح داخ ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلکچولز کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔خود وجودیت کے پرستاروں کی اس

اصطلاح ' آزادی ' کو بڑے زبردست معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اپنشدوں کے معنی بھی سمجھ آجاتے تھے۔

سرل ایشلے صحیح معنوں میں جدید انسان تھا۔ اس عہد کی ساری ذہنی الجھنوں ' روحانی ناآسودگیوں اور جذباتی بے اطمینانیوں اور شبہوں کا شکار۔

رورنگ ٹوئنٹیز کا زمانہ اس کا بچپن تھا۔ ۳۰ء سے ۳۹ء کے دور میں اس نے ہوش سنبھالا۔ لندن میں اس کے ٹاؤن ہاؤس میں اکثر آرٹسٹوں وغیرہ کا مجمع رہتا جو اس کی سوتیلی ماں لیڈی ایلن سے ملنے آتے جو اس قدامت پرست خاندان میں شادی کرنے کے باوجود ساری جدید تحریکوں کی زبردست حامی تھیں۔ یہ بڑا عجیب وغریب دور تھا۔ ڈیلی ورکر اور بائیں بازو والوں کا دور۔ بلومز بری والے اینٹی فاشسٹ تھے۔ اوڈن اور ڈے لوئیس اور اسپنڈر ترقی پسندوں کے گرو بنے ہوئے تھے۔ لندن کے یونٹی تھیٹر میں کمیونسٹوں کے ڈرامے ہوتے تھے۔ ویسٹ منسٹر تھیٹر والے مک نیس اور اوڈن اور اشروڈ کی تمثیلیں اسٹیج کر رہے تھے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنا ذہنی فیشن میں داخل تھا۔ یہ کرسٹفر ووڈ اور سیڈرک موریس اور بن نکلسن کی پینٹنگز کا زمانہ تھا۔ آرٹ ' ادب ' ڈراما ' موسیقی ' بیلے انٹیریر ڈیکوریشن ______ ہر چیز میں جدیدیت کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ مشرق کے فلسفے میں اے سنز بیسنٹ اور ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس اور کرشنا مورتی اور اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رادھا کرشنن کے مطالعے کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے بار بار چینی اور سنسکرت حوالے دیے۔ شانتی شانتی شانتی کے الفاظ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ سرل ونچسٹر سے (نہیں۔ میں ایٹن کبھی نہیں گیا۔

ونچسٹر بھی اتنا ہی خوفناک تھا)۔ کیمبرج بھیجا گیا (میں کیمبرج نہ جاتا تو کیا گروکل کانگڑی جاتا؟) وہاں پیٹر ہاؤس میں اس کا داخلہ ہوا اور پھر مسلسل تفریح، مسلسل تفریح، مسلسل ذہنی ڈسی پیشن اور خیال پرستی کا دور شروع ہوا، لیکن فوراً ہی جنگ چھڑ گئی اور بمبار پائلٹ بن کر چند خوبصورت جرمن شہروں کو جہاں اس کے محبوب فلسفی اور شاعر اور موسیقار پیدا ہوئے تھے، اس نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اس کے بعد وہ پھر کالج واپس آیا اور ہیگل کا مطالعہ پھر اسی صفحے پر سے شروع کر دیا جہاں سے ادھورا چھوڑ کر وہ ایئر فورس میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا تھا۔ یہ جنگ کے بعد کی دنیا تھی۔ کل کے دشمن آج کے ساتھی تھے اور کل کے ساتھی آج خطرناک ترین دشمن تصور کیے جا رہے تھے۔ ایشیا کا نقشہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ امن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کل کے ترقی پسند آج شدت کے رجعت پسند بن چکے تھے۔ کسی ویلیو میں کوئی استحکام باقی نہ رہا تھا۔ وقت غیر حقیقی ہے۔ سارا وقت غیر حقیقی ہے۔ کیم کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے وہ آلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی طرح سوچتا۔ اب ذہنی ڈی پیشن کا دور از سر نو شروع ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسان کی ریا کاری دیکھنے کے بعد اس میں زیادہ تلخی آ گئی تھی۔ مائیکل اور ڈینس اس کے ساتھی تھے۔ مائیکل یہودی تھا ڈینس بھی مائیکل کی طرح مڈل کلاس تھا۔ ان دونوں سے سرل نے بہت امید کی کہ ذرا ان میں اسنوبری کی جھلک دکھائی دے جائے مگر اس ضمن میں دونوں نے اسے بہت مایوس کیا۔ ڈینس کو شاعری کی سودا تھا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لڑکے تھے۔ کالے لڑکے، یورپین لڑکے۔

اور لڑکیاں۔

سرل کو اس کی اپنی ہم قوم لڑکیوں نے کبھی زیادہ متوجہ نہ کیا' بوجہ ان کی یکسانیت کے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا ایک ایسا عظیم عہد تھی جس میں دنیا بین الاقوامی دوستی اور بھائی چارے اور کلچر مفاہمت (یہ سب بہت عظیم الشان فراڈ تھا) کے دور میں داخل ہو رہی تھی اور کیسی کیسی لڑکیاں دنیا کے سارے کونوں سے انگلستان تعلیم کے لیے آ رہی تھیں۔ کالی لڑکیاں' پیلی یعنی مشرق بعید کی لڑکیاں (یاد کرو پرل بک کے ناول)' نیگرو لڑکیاں جن کو دیکھ کر جدید سنگتراشی اور پیرس کی نئی تحریکوں اور نئی موسیقی کا خیال آتا۔

اپنی ہم قوم لڑکیوں میں جون کارٹر تھی۔ جدید ناولوں میں برطانوی یونیورسٹی وومن کا جو حلیہ درج ہوتا ہے اس پر وہ پوری اترتی تھی۔ سیاہ فریم کی بیلر ینا عینک لگائے' سر پر جھوا ایسے بال' انتہائی انٹلکشول۔ یہ ٹائپ اب پچیس تیس سال پرانا ہو چکا تھا اور اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہ تھی۔

روز میری تھی ـــــــ لیکن اس سے سرل نے شادی کر لی۔

اب مختلف قوموں کلچرل ایوننگز کا دور شروع ہوا جب مختلف ایشیائی قوموں کے طلباء جمع ہو کر بڑی شدید کوشش کرتے کہ سفید فام طالب علموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ ''اورئینٹل ناچ'' ہوتے (جو زیادہ تر بکواس تھے سوائے سریکھا کے ناچ کے) نظمیں پڑھی جاتیں' بے سرے ساز بجائے جاتے۔ سنا تھا امریکہ میں یہ ریکٹ نہایت اعلیٰ پیانے پر چلایا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس فار ایسٹرن اور مڈل ایسٹرن تماشے سے اس کا جی اکتا گیا۔ اب وہ

اپنے کمرے پر لوٹتا اور کوئی اس سے کہتا کہ تھائی لینڈ والے انڈونیشیا والے کلچرل ایوننگ کر رہے ہیں تو اس کا جی چاہتا کہ کھڑکی میں سے کود کو باہر بھاگ جائے۔

"جانتے ہو سرل ایشیا سے اپنی مدافعت کر رہا ہے۔" ڈینس نے ایک روز بڑے خوفناک طریقے سے انکشاف کیا۔

ایک روز ایک نیا گروپ کالج میں داخل ہوا۔ یہ لوگ ہندوستانی تھے اور دور دراز لکھنو سے آئے تھے۔ (بڑی اداسی کی بات یہ تھی کہ لوگوں کے گروہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک روز یہ گروہ بھی چلا جائے گا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی پشیمانی ہوتی) ۔ نئے لوگوں سے وہ بہت کوشش کر کے چھپاتا کہ لارڈ فلاں کا بیٹا ہے۔ کسی نے اسے ڈی کیڈنٹ کہا تو وہ جھٹ لڑ کے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تازہ وارد کالوں سے اس کی کافی دن ملاقات نہ ہوئی گو اسے معلوم تھا کہ یہ بڑے انگارے نگلنے والے لوگ ہیں۔ کیمبرج میں وہ صرف ایک کالی لڑکی کو جانتا تھا جس سے وہ دیر تک ہندوستان کی تعریفیں کرتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی ہے۔ اس لڑکی کا نام روشن آرا تھا۔ اس ہندوستانی پاکستانی جھگڑے نے اس کا الگ ناک میں دم کر رکھا تھا گو وہ اس ٹنٹے کا زیادہ نوٹس نہ لیتا تھا۔

وہ ویک اینڈ پر شہر گیا ہوا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ ایک جگہ گیا جہاں ایک اور کلچرل ایوننگ ہو رہی تھی۔ یہ 'ایوننگ' انڈیا والوں نے منعقد کی تھی، وہ جوتے اتار کر بڑے ادب اور احترام سے فرش پر بیٹھ گئے۔ شاید ٹیگور جینتی منائی جا رہی تھی۔ ڈینس فوراً مراقبے میں چلا گیا۔ مجمعے پر بہت سخت روحانی کیفیت طاری تھی۔ سرل اپنی پتلون کی کریز کی فکر میں غلطاں رہا۔ اس سے آلتی پالتی مار کر ہرگز نہیں بیٹھا جا

رہا تھا۔ اس نے اداسی سے ان انگریزوں کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے فرش پر سادھوؤں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ بکرز ہوں گے شاید' اس نے کاہلی سے سوچا ڈینس ان سب کو جانتا تھا۔ ابھی پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈینس ان سب سے بچھڑ ملے گا اور اس کا ان سب سے تعارف کرائے گا۔ یہ سوچ کر اسے پھریری آ گئی۔

اتنے میں ایک بلی پتلی لڑکی اسٹیج پر آئی اور کچھ اناؤنس کیا۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا کیونکہ بڑے زور سے تالیاں بجیں۔ سرل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سارا ہال' جو چھوٹا اور گھریلو سا تھا اور جو دراصل ہندوستانی طالب علموں کا تہذیبی سنٹر وغیرہ تھا' اسی طرح کی لڑکیوں سے پٹا پڑا تھا اور فتم فتم کے لڑکے۔ سب بڑے کامریڈانہ اور کنبے برادری کے سے انداز میں فرش پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

لندن کی ہندوستانی کمیونٹی۔

اس لڑکی کو سرل نے غور سے دیکھا۔ روشن کی طرح ایک اور لڑکی۔ باقی اور ہندوستانی لڑکیوں کی طرح موٹے ریشم کی ساری باندھے بالوں میں پھول لگائے۔

اب ان لڑکیوں میں سرل کے لیے کوئی انوکھا پن نہ رہا تھا' اگر یہ لوگ روم وغیرہ چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اٹلی اور فرانس میں ان کے لیے زیادہ مواقع ہیں' اس نے یونہی سوچا کیونکہ کوئی اور خیال اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اور ٹیگور کے متعلق وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ رومان پرست مڈل کلاس' جذبات زدہ یوگی _______ اس نے بڑی عیاشی سے سوچا۔ (ان دنوں وہ مغربی عیسائیت اور

یورپین تہذیب کا حامی بنا ہوا تھا)۔

اتنے میں سیاہ ساری پہنے ایک گدازسی بی بی اسٹیج پر آئیں۔ یہ بی بی پینتیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوں گی اور پندرہ سال قبل حسینان کلکتہ میں ان کا شمار ہوتا ہوگا۔ ان کی بنگالی شکل تھی۔ بڑی بڑی سرگیں آنکھیں' پھولے پھولے گال' کانوں میں سونے کے پھول' بڑا سا جوڑا ـــــــ سیاہ ساڑی کے نیچے سفید پیٹی کوٹ پہنے تھیں' جو البتہ بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

ان بی بی نے بڑی جادو بھری آواز میں گانا شروع کیا اور بعد گانے کے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنایا۔

پھر ایک عدد تقریر میں انہوں نے بتایا کہ ٹیگور دنیا کا عظیم ترین شاعر تھا۔

''جانتے ہو یہ کون ہیں؟'' ڈینس نے بڑے رعب سے سرل کو مطلع کیا۔ ڈینس ساری ہندوستانی کمیونٹی کا شہر خبرو تھا۔

''اگر نہ جانتا ہوں تو کیا حرج ہے۔ یہ تھیا سوفسٹ ہوں گی یا ہندوستانی کلچرل کی علمبردار جو بتلائیں گی کہ atomic تھیوری کو سب سے پہلے شنکر اچاریہ نے پیش کیا تھا۔'' سرل نے بور ہو کر کہا۔

''یہ مسز شیلا مکرجی ہیں۔'' ڈینس نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔

''یعنی؟''

''ان سے ملتے رہنا۔ اس میں بڑے فوائد ہیں۔ ان کا یہاں صحافی حلقوں میں بہت اثر ہے' اگر تم او بزرور کے نمائندے بن کر ہندوستان جانا چاہتے ہو تو ان کو کلٹی ویٹ کرو۔''

سرل کے سامنے جو گونا گوں مسائل تھے ان میں سے ایک روزی کا بھی تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ بی بی سی؟ وہ پہلے ہی اس کی طرح کے انٹلکچولز سے اٹا ٹوٹ بھری ہوئی تھی۔ کسی فلم کمپنی میں اسکرپٹ رائٹنگ؟ اس کی بھی گنجائش کم تھی کیونکہ برطانوی پروڈیوسر امریکن اشتراک سے فلمیں بنا رہے تھے اور سرل کو ہر صحیح النسب انگریز کی مانند امریکنوں سے دلی نفرت تھی۔ محکمہ تعلیم؟ وہ کبھی کالج کے لونڈوں کو نہ پڑھائے گا۔ کولونیل سروس؟ یعنی میں سرل ایشلے انسانیت پرست کینیا یا ملایا یا ویسٹ انڈیز میں نوکری کروں گا سولا ہیٹ پہن کر دوروں پر جاؤں گا شام کو کلب جا کر گوف کھیلوں گا؟ ہرگز نہیں۔ صرف صحافت ہی آخری جائے پناہ تھی لیکن یہاں بھی سخت مقابلہ تھا۔

پروگرام کے خاتمے پر مجمع تتر بتر ہوا اور لڑکے لڑکیاں ٹکڑیوں میں منتشر ہو کر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ڈینس اٹھ کر شریمتی شیلا دیبی کے پاس گیا جو اوبزرور کے کالم نگار بل کریگ سے باتیں کر رہی تھیں۔ ''ہیلو ڈینس'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''مسز مکرجی ہمیں اپنے گھر لے جا کر کافی نہیں پلائیں گی؟'' ڈینس نے اپنی بچوں والی ادا سے ذرا مچل کر کہا۔

''ضرور۔ سب لوگ چلو۔''

ایک خاصا بڑا گروہ ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ یہ سب لوگ قاضی نذر الاسلام کی جینتی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سرل کو یہ مجمع بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی مخصوص دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ان کی اپنی گوسپ تھی،

اپنی مصروفیات۔ ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ اکثر یہ شادیاں بڑی سنسنی خیز ہوتی تھیں یعنی اس لندن میں ایک اور ہندوستانی لندن آباد تھا۔

''چلو۔ چلو۔'' وہ سب شور مچاتے باہر آ گئے۔ گلی نیم تاریک تھی۔ لڑکے سگریٹ خریدنے کے لیے ایک پب میں چلے گئے۔ لڑکیاں کہنے لگیں: ''شیلا دیدی تھوڑی سی ترکاری خرید لیں۔ آپ کے یہاں چل کر کھانا بنائیں گے۔''

مسز مکرجی کا فلیٹ چیلسی کی ایک بہت شاندار رہائشی عمارت میں تھا۔ جس میں لفٹ لگے تھے اور گیلریوں میں دبیز قالین بچھے تھے اور وردی پوش پورٹر تھے، وہ سب فلیٹ میں داخل ہوئے لڑکیوں نے سرل سے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ روشن کی طرح tense نہیں تھیں۔ بڑے گھریلو اور سیدھے سادے انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام طلعت تھا اور دوسری کا نرملا۔ لڑکوں کے نام اسے یاد نہیں رہے۔ یہ لڑکیاں، اسے معلوم ہوا، اسی سال کیمبرج میں داخل ہوئی تھیں۔

مسز شیلا مکرجی فرید پور مشرق بنگال کی رہنے والی تھیں۔ ایک مشہور زمیندار خاندان کی چشم و چراغ، کلچر جن کے یہاں پانی بھرتی تھی۔ انہوں نے خود و شور بھارتی میں پڑھا تھا مگر شادی کے بعد اپنے میاں سے ان کی نہ بنی۔ (شادی، مائی ڈیئر، ایک جوا ہوتا ہے۔ گرو دیو نے کہیں پر لکھا ہے کہ۔۔۔) ان کا ایک لڑکا فلائنگ آفیسر پرنلا مکرجی ہندوستانی فضائیہ میں ہوا باز تھا۔ خوبصورت لڑکا تھا۔ مسز مکرجی اب مدتوں سے یورپ اور لندن میں رہ رہی تھیں۔ ان کے میاں کے متعلق کسی کو علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

''لیکن اب وہ ایسی بھی قیامت خیز نہیں کہ تم ان پر لٹو ہو جاؤ۔'' دوسرے روز ڈینس نے برا مان کر کہا' وہ لوگ کالج کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ دو رویہ سیاہ عباؤں کی قطاریں۔ چھری کانٹوں کا شور۔ ہال کے سرے کی میز پر پروفیسروں کی دھیمی دھیمی آوازوں کی بھنبھناہٹ۔ اونچے دریچے میں سے باغ کا منظر ٹرنر کی کسی پینٹنگ کی مانند دکھلائی دے رہا تھا۔

''ایں؟'' سرل نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

''لیکن وقتاً وقتاً ان سے ملتے ضرور رہا کرو' وہ اوبزرور کی کورسپونڈنٹ شپ۔۔۔'' ڈینس نے کانٹا ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔

سرل اگلی بار جب لندن گیا تو ان کے فلیٹ کے پورٹر نے اسے بتایا کہ وہ جنیوا جا چکی ہیں' وہ باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک اور لڑکی زینے پر ملی اور اسے پہچان کر ذرا سا مسکرائی۔ ''ہلو۔'' اس نے کہا۔

سرل نے شائستگی سے جھک کر اسے سلام کیا۔ اسے یاد آیا' یہ وہی لڑکی ہے جو اس روز ٹیگور جینتی میں اسٹیج پر اناؤنسمنٹ کر رہی تھی۔

یہ وہی لڑکا ہے جو ڈینس نے بتایا تھا کہ کسی لارڈ کا بیٹا ہے' چمپا نے یاد کیا۔ ''میں بھی مسز مکرجی سے ملنے آئی تھی۔'' اس نے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آتے ہوئے کہا'' مگر وہ جنیوا گئی ہوئی ہیں۔''

''آپ یہیں پڑھتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سریواستوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟''

''جی ہاں۔ میں مس سریواستوا سے یہیں ملا تھا۔''

''اور کمال رضا؟''

''سریکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آراء کو جانتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سریواستوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟''

''جی ہاں۔ میں مس سریوااستوا سے یہیں ملا تھا۔''

''اور کمال رضا؟''

''سریکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آراء کو جانتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں نے بھی سیکھا اور ڈینس ہی سے ان کا ذکر سنا ہے۔''

شروع کے پندرہ بیس منٹ ہمیشہ اس طرح صرف ہوتے ہیں کہ آپ فلاں کو جانتی ہیں اور آپ فلاں سے واقف ہیں اور جی ہاں فلاں بھی میرا کلاس فلیو رہ چکا ہے۔

''آپ نرگیش کاؤس جی کو جانتے ہیں؟'' چمپا نے بآواز بلند استفسار کیا۔

''جی نہیں، میں کسی کو بھی نہیں جانتا ______ میرا مطلب ہے ______ میرا حلقہ احباب ڈینس کی مانند وسیع نہیں ہے۔''

چمپا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''میرا خیال تھا آپ شاید یگ اشوتوش سے مل چکے ہوں۔''

''میں ینگ اشوتوش سے نہیں ملا' وہ کون ہے؟''

''مسز مکرجی کا چھوٹا لڑکا' وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے۔ پیرس میں رہتا ہے۔''

چیلسی کا انڈر گراؤنڈ آ گیا۔

''اچھا اب آپ سے شاید کبھی کیمبرج میں ملاقات ہو' اگر آپ کبھی وہاں آئیں۔''

''یا شاید نہ ہو!''

''بہرحال اس موہوم امید پر کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔''

''خدا حافظ!'' وہ ایک اخبار خرید نے کے بعد تیز تیز قدم رکھتی سرعت سے ایکسلریٹر پر اتر گئی۔ ایک مکمل' پُر اعتماد' جدید ہندوستانی لڑکی۔

اور اب آدھ گھنٹے سے وہ پکیڈلی کے انڈر میں چمپا کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پچھلے دو سال میں چمپا سے کئی بار اس کی ملاقات ہوئی تھی اور آج چمپا نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ پیرس سے لندن آئی ہوئی ہے اور سریکھا کے یہاں سب جمع ہو کھانا کھائیں گے۔ سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے یہاں پہنچ کر گلشن سے بحث کرے۔ خط کے مصنف گوتم نیلمبر نے تقسیم ہند کا سارا الزام انگریزوں اور مسلمانوں پر ڈالا تھا اور لکھا تھا کہ سرد جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا جو رویہ اس کے ملک نے اختیار کیا ہے اینگلو امریکن بلاک' ظاہر ہے' اس کو پسند نہیں کر سکتا' وغیرہ وغیرہ۔ سریکھا نے بتایا تھا کہ یہ گوتم نیلمبر بڑا ا نگارے اگلنے والا انسان ہے۔ حال ہی میں ماسکو سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ سرل کو افسوس تھا کہ آج شام کو وہ اس

شخص سے نہیں مل سکے گا کیونکہ سریکھا کی اطلاع کے مطابق وہ لندن سے باہر گیا ہوا تھا۔

سرل بین الاقوامی وقت کے نیچے ٹہلتا رہا۔

٦٠

کیمبرج میں ایک دکان سے نکل کر نرملا لائبریری کی طرف جا رہی تھی کہ اسے گوتم نیلمبر دکھلائی پڑ گیا۔

''نرمل ______ میں تو تم کو سارے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔'' گوتم نے لپک کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''ایک انگریز مجرد خاتون تمہارے کالج میں ملیں جو شاید عربی فارسی پڑھاتی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا' پھر کمال نے کہا شاید اس وقت تم لائبریری میں ہو ______ کیسی ہو ______ کیا حال چال ہیں؟''

نرملا نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ گوتم تھا جو اس کے سامنے کھڑا اس سے جلدی جلدی باتیں کر رہا تھا۔

''تم یہاں کیسے آ گئے؟''

''لندن سے آیا ہوں' تم لوگوں سے ملنے۔''

''سنا ہے تم اب باقاعدہ فارن سروس میں ہو۔''

''ٹھیک سنا ہے۔''

''مزے میں ہو؟''

''ہاں۔''

باتیں ختم ہوگئیں۔ گوتم نے دیکھا کہ نرملا بڑی ہوگئی تھی: سنجیدہ، باوقار، کم گو۔

''لائبریری گول کرو۔ کمال اور طلعت نے کہا ہے کہ وہ نور میں ملیں گے۔ چلو۔''

نرملا خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔ برابر سے سیاہ عبائیں پہنے طالب علموں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔ نرملا، گوتم کو بتاتی جارہی تھی۔ یہ ڈینس ہے، وہ روشن جارہی ہے، وہ سرل اسٹلے ہے، ادھر والا، بلونڈ لڑکا۔ یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے ہیں۔ ان کا جواب نہیں۔ یہ بھی چمپا باجی کے چیلے بن چکے ہیں۔''

''اچ______چھا______چمپا سے تم لوگوں کا ملنا ہوتا رہتا ہے۔''

''اکثر۔''

''خوش ہیں؟''

''کیا پتا______خوشی تو بڑی اضافی چیز ہے۔''

گوتم خاموش رہا، وہ کنگز کالج کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوچکی تھی۔

''مجھے لگتا ہے'' نرملا کہہ رہی تھی'' کہ چمپا باجی چند سال بعد مسز مکرجی کی ایسی بن جائیں گی ____ کتنے دکھ کی بات ہے۔ تم جانتے ہو مسز مکرجی کو ______''

''ہاں۔''

''وقت چوٹ دے کر چپکے سے آگے نکل جاتا ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔

''نرملا نے دہرایا۔ گوتم اب بھی خاموش رہا۔

''شیلا دیبی پندرہ بیس سال پہلے کیا چیز ہوں گی۔ لوگ ان سے دو باتیں کر لینا بھی فخر سمجھتے تھے۔ اب بے چاری اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو گھیر گھیر کر لے جاتی ہیں اپنے یہاں کافی پلانے۔ کتابیں لکھتی ہیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں مشہور رہیں' مگر کیا ان کی کتابیں اور ان کی شہرت زندگی کی ذاتی مسرت کا بہتر معاوضہ ہے؟ چمپا باجی بھی ایسی ہی بن جائیں گی حالانکہ قصور ان کا نہیں تھا۔ وقت نے ان کو چوٹ دی۔ انہوں نے دوسروں کو چوٹ دینے کی کوشش کی تھی۔''

گوتم چونک اٹھا۔ اس نے نرملا کو غور سے دیکھا۔

نرملا کی آنکھوں پر بارش کی ایک بوند آن پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف اور کہتی رہی:

''یہ سرل کا دور ہے کیونکہ وہ لارڈ ایشلے کا بیٹا ہے جس طرح تم سردیپ نرائن اور بھیا صاحب سر ذکی رضا بہادر کے فرزند تھے۔''

''نرمل تم چمپا کے ساتھ بہت بے انصافی برت رہی ہو۔'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں گوتم' یہ واقعہ ہے۔ چمپا باجی نے علاوہ اس کے کہ وہ خود مایوس ہوئی ہیں ہمیں بھی مایوس کر دیا ہے۔ کل کمال کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے چمپا باجی کا سحر رفتہ رفتہ بالکل زائل ہو گیا۔ اس پر طلعت نے بھی ٹھیک بات ہی کہی تھی۔ اس نے کہا کہ چمپا باجی وہی ہیں' ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں۔''

گوتم نے اداسی سے دیکھا۔ نرمل نے بات جاری رکھی۔

''پیرس میں تھیں مگر کام ادھورا چھوڑ کر انگلستان آ گئیں۔ اب سنا ہے لندن میں کہیں نوکری مل گئی ہے اور اب یہاں بھی داخلہ لینے والی ہیں۔ اپنے متعلق کوئی فیصلہ بھی تو نہیں کرسکتیں۔ حد ہے۔ گوتم' چمپا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔''

جیٹرس لین میں سے ٹرمپیٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ گوتم ٹھٹھک گیا۔

''جانے کون ہے۔ اکثر بڑی غمگین دھنیں بجاتا ہے۔'' نرملا نے کہا۔ بارش کی پھوار میں اس کے بال بلکل بھیگ گئے۔ ''بھیا صاحب بھی لندن میں تشریف رکھتے ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں ڈپلومیٹ ہیں۔ آج کل وہ بہن روشن کو اپنی چینٹنگر دکھاتے رہتے ہیں۔''

اب وہ کوہ نور تک پہنچ چکے تھے۔

''گوتم'' نرملا نے سوچتے ہوئے پوچھا' ''لوگ اتنے پھٹیچر کیوں ہوتے ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ قریب سے طلباء کا ایک غول گزر گیا۔ سڑک کے کنارے لا تعداد زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ بارش کی بوندیں کیم کی سطح پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔

''نرملا۔'' گوتم نے رک کر کہا۔

''فرمائیے۔''

''تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

''ہرگز نہیں۔''

''کیوں ______ نرمل ______ '' آواز اس کے حلق میں اٹکی۔

''اس لیے'' نرملا نے بڑی صاف اور گہری آواز میں کہا'' کہ تم بھی پھٹیچر ہو۔ آؤ اندر چلیں۔ بارش میں مت بھیگو۔''

نرملا واقعی بڑی ہو چکی تھی۔

وہ طعام خانے کے اندر داخل ہو گئے۔

۶۱

صبح چھ بجے چمپا اٹھ بیٹھی۔ سورج کی ایک تیز اور گرم کرن عین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی' وہ دو بجے تک سریکھا کے یہاں گپیں ہانکتے رہے تھے۔ آخر لوگ اتنی باتیں کیوں رکھتے ہیں؟ غسل خانے میں سے جون نے سر نکال کر جھانکا۔ ''آج تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔'' چمپا نے بستر سے اتر کر الماری کھولی اور بڑی کوفت سے ساریوں کو دیکھا' پھر اس نے جون کو آواز دی: ''میں ورکنگ کلاس لڑکی ہوں۔ بتاؤ کون سی ساری پہنوں۔'' پھر ناشتہ کر کے وہ بس میں بیٹھی اور سینٹ جانز ووڈ پہنچی۔ بل کے فلیٹ پر جا کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ''کم آن ان ______ '' کسی نے اندر سے بشاش آواز میں کہا' وہ مزید ہمت کر کے اندر پہنچی۔ کمرے میں آتش دان کے سامنے صوفہ بچھا تھا۔ نیچی تپائیوں اور الٹرا ماڈرن آرٹسٹک طرز سے کمرہ سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں ٹنگی تھیں۔ ہندوستانی مجسمے رکھے تھے۔ ایک الیشن کتا بے نیازی کی شان

سے آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ بل صوفے پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ''ہلو مائی ڈیئر ـــــ کیا پیوگی؟'' ''کچھ نہیں۔ شکریہ'' چمپا نے کہا۔ پیرس میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بوہیمیا کے افراد کس اپنائیت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔

''پروف ریڈ کرنا آتا ہے؟'' بل نے بے پروائی سے ایک پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا اور باورچی خانے میں جا کر کھڑ پڑ کرنے لگا۔

شانتا کشمیری ریشم کی سیاہ سبز اور سرخ پھولوں والی ساری اور سیاہ کارڈیگن پہنے زینے پر سے اتری جو کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ شانتا' چمپا نے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ بڑے بزنس انداز میں وہ ٹائپ رائٹر پر جا کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اپنے میاں سے طلاق لینے کے بعد گوتم سے شادی کرنے کے بجائے اس نے بل سے شادی کیوں کی۔ عجب گھپلا ہے زندگی۔ چمپا نے تعجب سے سوچا۔ ''گڈ مارننگ مسز کریگ۔'' اس نے اخلاق سے کہا۔ سنا ہے مرہٹی میں بڑی عمدہ کہانیاں لکھتی ہے۔ اب میں اس کی کہانیاں پڑھنے کے لیے مرہٹی سیکھنے سے تو رہی۔ اس نے سرل سے کہا تھا۔ ہاں۔ مرہٹی مت سیکھنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سرل نے جواب دیا تھا۔

''میں گوتم سے تمہارا بہت تذکرہ سن چکی ہوں۔ یہ بڑی مختصر دنیا ہے۔'' شانتا نے ٹائپ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

بل کافی کی کشتی اٹھا لایا۔ چمپا نے محسوس کیا کہ شانتا خاصی مغرور ہے۔ بل اتنا ہی خلیق تھا۔

فرینک وہ کاغذات کا پلندہ اٹھا کر پریس جانے کے لیے تیار ہوئے۔ چمپا کو بل کے پبلشنگ ہاؤس میں پروف ریڈر کی ملازمت کرنے کا یہ پہلا دن تھا۔

''تمہارا کیا پروگرام ہے زندگی کا۔'' بل نے اس سے لنچ کے وقفے میں پوچھا' وہ انسانوں کو بھی پروف ریڈ کرتا تھا۔

''یہ تو بڑا زبردست سوال ہے۔''

''کیا تم بہت کنفیوزڈ ہو؟''

''ہاں۔''

''تم بھی جال میں گرفتار ہو؟''

''ہاں۔''

بل منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔ سب جال میں گرفتار تھے' وہ خود اور اس کی بیوی شانتا جو پہلے شریمتی شانتا نیلمبر تھی اور انگریزی اور مرہٹی میں ناول لکھتی تھی اور رسل اسٹیلے اور سارے مصنف اور ادیب اور ذہن پرست' سارے مغربی انسان' اور مغربی یورپین تہذیب' اور نیا ایشیا' جس کے نمائندے یہاں موجود تھے' مختلف جہنموں کے درمیان معلق تھے۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ پل صراط پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی مسلمان اور ہندو اور بدھ روحوں کو بہت سی تکالیف لاحق تھیں۔ یہ لوگ جن کے متعلق ٹولبی نے دس کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور اب تک کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

اور نیا ہندوستانی اپنی روحانی بلندی اور اپنی تہذیب کی برتری کے سلسلے میں جارحانہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ پبلسٹی کی دنیا تھی۔ رسالوں اور کلچرل پروپیگنڈے کے

پمفلٹوں اور کتابوں میں چھپنے والے کروڑوں الفاظ کی دنیا اور بل الفاظ کا تاجر تھا اور الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھوکھلے پن میں یقین رکھتا تھا اسی لیے وہ شام کو اپنے اسٹوڈیو فلیٹ لوٹ کر شانتا کو تلقین کرتا کہ وہ گیتا کا دوسرا ادھیائے پڑھے اور شانتا ہنستی تھی، وہ بھی جال میں گرفتاری تھی۔ ان سب کی پرائیویٹ جہنمیں، ذاتی تہ خانے اور نجی کائناتیں زیادہ تکلیف وہ اس لیے تھیں کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایک راستہ تھا مگر وہ بے حد ہولناک تھا۔ بل نے چمپا کو دیکھا۔ ''کمیونسٹ کبھی نہیں بنیں؟''

وہ چپ چاپ بیٹھی آلو کھاتی رہی۔

''تم افسانے لکھا کرو۔ میں تم کو لڈاپ کروں گا۔ ہندوستان کے متعلق ناولوں کا اس وقت انتہائی زبردست اسکوپ ہے۔ آر۔ کے نرائن اور ملک کو دیکھو۔ تم بھی لکھو، سمجھیں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''افسوس کہ میں تمہارا مطالبہ پورا نہیں کرسکتی۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔''

''اچھا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہارے گروپ میں تو ایک سے ایک لیکھک موجود ہیں۔''

''مجھے گروپ سے مماثل مت کرو۔''

''اچھا۔ تو آپ کا fad یہ ہے کہ آپ انفرادیت پسند ہیں۔ اچھا ہے یہ بھی۔'' بل نے جواب دیا، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دفتر کی طرف چلا گیا۔ چمپا طعام خانے کی میز پر بیٹھی رہی۔

یہ چوزے کی سرائے تھی جہاں بہت سے جاننے والے دوپہر کے کھانے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ قریب ہی بی بی سی کے اسٹوڈیو تھے' وہ ویٹرس کا انتظار کرتی رہی تاکہ پیسے چکائے۔ چند لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کو دیکھے بغیر کاؤنٹر کی طرف چلی گئیں۔ ''یہ چمپا احد ہیں۔ دوسروں کے منگیتر پھانسنا ان کا کریز ہے' اگر تم سمجھو کہ میں اکینڈل مونگرنگ کر رہی ہوں تو نرملا سریواستوا سے پوچھو جسے ٹی بی ہوگئی ہے۔'' ایک لڑکی نے کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نرملا کو ٹی بی ہوگئی؟'' دوسری نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں' اور وہ مڈ ہرسٹ سینی ٹوریم جانے والی ہے۔'' پہلی لڑکی نے جواب دیا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی اپنی اپنی ٹرے اٹھا کر کمرے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں۔

تب چمپا نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور ان سے پوچھے: نرملا کیسی ہے؟ اسے ٹی بی کس طرح ہوئی؟ مگر وہ سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ دریچے کے باہر سڑک پر سے رنگا رنگ ہجوم گزر رہا تھا' پھر اسے بہت سی جانی پہچانی شکلیں اپنی اور آتی نظر آئیں۔ بہت سے سفید ماسک جن کے اوپر ان کے نام لکھے تھے: زرینہ' سریکھا' طلعت' نرگیش' کملا' فیروز۔ یہ سب دوسرے دروازے سے طعام خانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اسے ہلو ہلو کہا اور دوسری طرف چلے گئے' وہ سب نرملا کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے اور بے حد پریشان نظر آتے تھے۔

پھر تیسرے دروازے سے عامر رضا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ سرل کی ہم جماعت روشن آرا تھی۔ عامر رضا کو چمپا نے آج اتنے برسوں بعد دیکھا۔ ان میں

کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی سوا اس کے کہ پہلے سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے تھے اور زیادہ اعتماد سے قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے چمپا کو دیکھا۔ ذرا ٹھٹھک کر بڑے اخلاق سے آداب عرض کیا اور دور کونے کی میز پر جا بیٹھے۔

''یہ دونوں ہم سب سے دور رہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔'' طاعت کی میز پر کسی نے ہنس کر کہا۔

''اچھا ہی ہے۔ ہماری سنگت میں ان کے خیالات خراب ہو جائیں گے۔'' کسی اور لڑکی نے جواب دیا۔

''اور ایمان جو خراب ہو گا وہ الگ۔''

''وہ الگ ________''

چمپا نے خلاف ارادہ سر اٹھا کر ان کو دیکھا: سید حامد رضا' گل فشاں والے' لا مارٹینیئر کالج والے' بھیا صاحب۔ انسان جن لوازمات اور ایسوسی ایشنز کا مرکب ہوتا ہے وہ پل کی پل میں کیسے بدل جاتے ہیں! اور یہ روشن نہ جانے کون تھی۔ بے چاری لڑکی۔ جو ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں۔

چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بیگ اٹھا کر طاعت کی میز کی طرف گئی اور ان لوگوں سے نرملا کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

سامنے دیودار کا جنگل ہے۔ سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔ وادی میں ٹرینیں مکانون کے پیچھے الگنیوں پر پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اتر کی اور جا رہی ہیں۔

پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔ جھیل میں ایک اکیلی کشتی ڈولتی ہے۔ آرام کرسیوں پر عسرت زدہ پنشن یافتہ بوڑھے اپنی بے یار و مددگار آنکھوں سے سامنے کا دھندلکا دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر کھا رہے ہیں۔

آج کا دن ایک اور دن ہے۔ پل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی' لاء کورٹس سٹی کی اور جا رہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے سے انکار کروں۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ چوزے کی سرائے میں وہ سب سرخ میزوں کے گرد جمع باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ zero-hour ہے۔ مجھ سے بہت فاصلے پر لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں اور سال ختم ہوا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک کرائسس آ کر گزر گیا؟ میں کیوں فکر کروں جبکہ آج کی تہلکہ خیز خبریں کل ردی میں بکتی ہیں۔

گوسینٹ سیستیاں اپنے تیر کے انتظار میں کھڑا ہے۔

روشن نے سوچا۔

دیودار کا جنگل شفق کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔ اس جنگل سے میں بھی گزری ہوں۔ ہم سب گزرے ہیں۔ میں نے اس میں بیدر کے چھوٹے چھوٹے شگوفے جمع کیے تھے۔ (طاعت نے کہا۔)

کالج میں چھٹیاں ہیں۔ صولت روم سے آئی ہوئی ہے اور شکنتلا کے یہاں ٹھہری ہے۔ ہم سب کملا کے گھر میں محفوظ بیٹھے ہیں۔ گھر ______ نیچے صوفے' فرش پر بکھری ہوئی کتابیں' کھڑکی میں رکھی ہوئی اناس کی ٹوکری' ٹیوٹن اور سرل کی بنائی ہوئی کیوبسٹ تصاویر' پرانے ملبوسات۔ تم چولہا سلگاؤ' میں پورٹر کو فون کرتی ہوں' دودھ کی بوتلیں کہاں رکھ گیا؟ مسٹر جنکنز _ _ _ _ _لیس مس ______ ٹومس۔ ایک کمرہ ساری کائنات کا مرکز ہے۔

اوفوہ روشن ڈیئر' آج اتنا کام تھا۔ کملا کہہ رہی ہے' چند روز بعد دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہے اور پھر سارا انفرمیشن ڈویژن۔ کشمیر کا مسئلہ' کوریا کا امن' کمیونٹی پروجیکٹس' آسام کے لوک ناچ' پبلسٹی ______ پبلسٹی۔

گیلری میں اوپر کی پانچویں منزل سے لفٹ آن کر رکا۔ نرگیش اندر آئی' وہ سب مل کر شکنتلا کے یہاں پہنچے جہاں ڈرائنگ روم میں شانتا اور بل موجود تھے اور سیکھا' رام گوپال کی پارٹنر' سیدھی سادی' دلچسپ' خلیق اور ذہین پنجابی لڑکی جو دیکھنے میں مرہٹی نظر آتی تھی اور زرینہ' بلونڈ شفت زبان' آرٹسٹ جو فراٹے سے روسی بول رہی تھی' وہیں ڈلن طامس بھی بیٹھے تھے۔ ان سب کا روشن سے تعارف کرایا گیا۔ ایک دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں' اس نے سوچا۔

پیرس میں ایک روز عامر رضا نے اسے مادموزیل دوپاری گا کر سنایا تھا اور اس سے کہا تھا: متیس کی تصویروں کے پیچھے گھوما گھوما پھرتا ہوں۔ میں صریحاً متیس پر عاشق ہوں۔ آپ کی شکل بھی متیس کی پینٹنگ کی ایسی ہے اور اس نے کہا تھا: ''حسین خاتون' میں سکون کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتا ہوں۔ جہاں سایہ ملا

وہاں بیٹھ گیا۔ کسی روز میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔'' وہ کہانی کیا ہوگی' کہانی لکھنے والا کون ہے اور سننے والا کون؟ جی ہاں' میں نے پروفیسر رادھا کرشنن کے لیکچر اٹنڈ کیے ہیں۔ جی نہیں ____ میں ہیگل پر مونوگراف لکھ رہی ہوں۔ اس نے مڑ کر بل سے کہا۔ جی نہیں مجھے دیانت سے دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفہ میرا موضوع ہے' وہ باتیں کرتی بالکنی کی طرف چلی گئی جہاں چاند مکانوں کی چمنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیچے شفاف سڑک پر سے بسیں گزر رہی تھیں۔ تھیٹروں میں تمثیلیں اسٹیج کی جا رہی تھیں۔ دریا پر سے جہاز گزر رہے تھے۔ نیم تاریک اسٹوڈیوز کے دریچوں میں سے بھی یہ چاند اندر جھانک رہا تھا جہاں ناکام مصور اور گمنام ادیب اور دولتمند مصور اور مشہور ادیب اپنی اپنی کائنات میں گھرے بیٹھے تھے۔ حد نظر تک مکان تھے جن میں لوگ رہتے تھے۔ ان کو روشن نہیں جانتی تھی۔ عالیشان مکان اور رڈل کلاس مکان اور غریبوں کے مکان اور قلعے اور محل اور کاٹج۔ ان سب جگہوں میں دکھ اور سکھ اور محبت اور نفرت اور امید اور نا امید اور کامرانی اور شکستہ دلی کے ڈرامے ہو رہے تھے۔ بالکنی سے شہر ڈی نیرو کی ایک پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا تھا: سرخ اور زرد اور سیاہ دھبوں اور لکیروں کا ہیبت ناک مجموعہ۔

۶۳

جون کارٹر کا مکان ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا جس میں وکٹورین عہد میں اصطبل تھا۔ اصطبل کے اوپر کوچبین کے کمروں میں جون اور نیل اور او جیت رہتے

تھے۔ نیل انجینئر ہونے کے علاوہ اس محلے کی اشتمالی جماعت کا سیکرٹری تھا۔ اوجیت قانون پڑھ رہا تھا۔ جون کیمبرج میں سرل سے دو سال سینئر رہ چکی تھی اور یہاں یونیورسٹی میں ہنگرین زبان پڑھاتی تھی۔ کوچمین کے کمرے بہت خستہ حالت میں تھے۔ باورچی خانے میں کتابوں کی الماریاں تھیں اور نیل کی ورکشاپ جس میں وہ گھڑیاں اور بچوں کی موٹریں بنایا کرتا۔ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے کر کسی مشہور ایکٹر سے شادی کر لی تھی بوجہ نیل کی سیاسی مصروفیات کے۔ اس کے دو بچے تھے جو گاؤں میں اپنی دادی کے پاس رہتے تھے۔ فرصت کے وقت میں بے حد انہماک اور تندہی سے کوئی میکینکل کھلونا تیار کرتا اور مہینے کے آخر میں اسے اپنے بچوں کو دے آتا وہ بے حد کم گو انسان تھا۔ باورچی خانے میں ایک ٹوٹا صوفہ بھی پڑا تھا۔ ایک شکستہ اسٹوو کے اوپر ریڈیو رکھا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ نیل اسے ہمیشہ اوورہال کرتا رہتا تھا۔ نعمت خانہ عموماً خالی رہتا۔ برتن دھونے کا حوض برتنوں سے بھرا رہتا کیونکہ اس مکان کے تینوں مکین بے حد کاہل تھے۔ الماری میں سے کبھی کبھار ایک آدھ پنیر کا ٹکڑا یا باسی ڈبل روٹی نکل آتی کیونکہ اس گھر کے مکین بے حد مفلس تھے۔ اوجیت غریب طالب علم تھا اور نیل اور جون اپنی تنخواہوں کا بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیتے تھے۔ اوجیت کے کمرے میں ایک نیچا سا پلنگ پڑا تھا جو بیک وقت اس کی سنگھار میز' ڈیسک' کپڑوں کی کھونٹی اور بک شیلف کا کام دیتا۔ بہت سے خیر خواہوں نے کمر ہمت باندھ کر اوجیت کے کمرے میں تھوڑی سی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ان سب کوششوں کو کامیابی سے رائیگاں کرتا رہا۔ غسل خانے کی چھت کے باہر ٹیرس تھا جس پر تمام چینی کے ٹوٹے برتن اور لکڑی کا

صندوق پڑا تھا جس کے پیچھے محلے بھر کی بلیاں رات کو آ کر لڑتی تھیں۔ نیچے گلی میں صبح صبح لمبی ایالوں والے گھوڑوں کی گاڑی آ کر رکتی اور دودھ والا دودھ کی بوتلیں دروازے کی دہلیز پر رکھتا۔ اسی گلی کے نکڑ پر چارلس ڈکنز کا مکان تھا۔

جون کارٹر کا کمرہ اس فلیٹ میں گویا ہر میجسٹی کوئین ایلزبتھ کے کمرے کا درجہ رکھتا تھا۔ الماریوں میں ان گنت کتابیں ٹھنسی تھیں کیونکہ بہن جون کارٹر اللہ کے فضل سے چھ سات یورپین زبانوں کی ماہر تھیں۔ آتشدان پر رنگ برنگی گڑیاں اور مشرقی یورپین ممالک کے نوادر سجے تھے کیونکہ جون ہر سال مشرقی یورپ میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے میلوں میں جایا کرتی تھیں اور وہاں سے تحفوں کے انبار ساتھ لاتی تھیں۔ اس کمرے کے دریچے میں سرخ جرنیم کے پودے تک موجود تھے۔ پلنگ کے برابر ٹیلیفون لگا تھا۔

چمپا احمد چند ہفتے قبل پیرس سے آ کر جون کے یہاں ٹھہری تھی جس سے اس کی ملاقات سرل نے کرائی تھی، وہ پبلشنگ ہاؤس سے لوٹ کر یہاں پہنچی تو اسے جون دروازے میں کھڑی ملیں۔ میں ذرا ایک امن کانگریس کے لیے وارسا تک جا رہی ہوں۔ میرے آنے تک تم یہیں رہو۔ راشنکے کوپن آتشدان پر رکھے ہیں اور اوجیت سے کہے جا رہی ہے کہ وہ ہسٹری آف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی تم کو باقاعدگی سے پڑھاتا رہے۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔

صبح سویرے دودھ کی بوتلیں گیلری میں سے اٹھا کر وہ باورچی خانے میں گئی اور ناشتہ کیا اس کا خیال تھا کہ دونوں لڑکے ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے اپنے کمروں میں سے نکل کر گڈ مارننگ کہتے چاء پینے کے لیے آجائیں گے مگر وہاں کا باوا آدم

ہی نرالا تھا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد اس نے ان کے دروازوں پر جا کر آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ نو بجے او جیت سو کر اٹھے۔ معلوم ہوا کلاس گول کر دی ہے، ارادہ ہے پلنگ پر لیٹ کر ہی مطالعہ کریں گے۔ نیل تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے۔ ٹھنڈی چاء پی کر بڑے اطمینان سے کوٹ کندھے پر جھلاتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے زینے پر سے اتر گئے۔

فرانسیسی انداز میں کندھے اچکا کر چمپا مسکرائی اور برساتی اوڑھ کر اس نے بھی اپنے دفتر کا رخ کیا۔ یہ دستور العمل اسے ناپسند نہ ہوا۔ جس کی موڈ ہوئی دوسرے سے بات کر لی ورنہ اپنے اپنے کام میں مگن رہے۔ ویک انڈ پر فیروزیا سیکھا کے یہاں محفل جمتی اور رات گئے تک ہنگامہ رہتا۔ چمپا بنارس اور لکھنو اور پیرس کے بعد زندگی کے اس پیٹرن کی بھی عادی ہو گئی۔

گوتم، چمپا سے کہیں نہیں ملا۔ سنا تھا کہ اب وہ بے حد اہم آدمی بن گیا ہے، بے انتہا مصروف رہتا ہے، انڈیا ہاؤس کا سب سے زیادہ کارپرداز افسر ہے۔ کمال کیمبرج میں تھا۔ ہری شنکر امریکہ میں۔

ایک روز وہ اور اس کے ساتھ ہندوستانی طالب علموں کی کانفرنس میں گئی جو ایسیکس کے سبزہ زاروں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہاں وہ سب دن بھر ناچتے اور گاتے اور سمپوزیم اور مشاعرے منعقد کرتے۔ ایک رات جب وہ ایک چیری کے درخت کے نیچے کھڑی نوجوانوں کے اس ہنگامے کو دیکھ رہی تھی جو چاند کے تلے سبزے پر بپا تھا، اسے محسوس ہوا کہ وقت پانی کی طرح سرسراتا اب بہت تیزی سے بہہ رہا ہے، جس طرح سنگرام ندی پر خطر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پہنچ کر تندرو

ہو جاتی ہے اور وہ ایک چٹان پر علیحدہ اور تنہا کھڑی ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا بہت بڑا گروہ انٹرنیشنل گا رہا تھا' بیک وقت اس کے الفاظ انگریزی' اردو اور فرانسیسی میں ادا کیے جا رہے تھے' وہ کان لگا کر سنتی رہی: دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہمان لیے۔

One great vision unites us, tho} remote be the lands of our
birth.
Foes may threaten and smite us, still we live to bring peace
to the earth.
Ev’ry country and nation stirs with youth’s aspiration.
Young folks are singing, happiness bringing, Friendship to
all the world.
Ev’ry where the youth is singing freedom’s song, freedoms
song, freedom’song.

یہ سب یہاں سے جا کر کیا کریں گے' ان کے ساتھ کیا ہوگا' باہر کی دنیا کے

ساتھ ان کو کیسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے؟ برابر سے برطانوی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی ویلش لوک گیت گاتی گزری۔ دور فارم ہاؤس کے ہال میں ڈرامے کی مشق کی جا رہی تھی۔

میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ایلیٹ کے کردار کی طرح دہرایا۔ اس کے قریب سے دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی باتیں کرتے گزرے۔ اس نے چاندنی کے دھندلکے میں غور سے دیکھا۔ لڑکیاں فیروز اور طلعت تھیں جو پروفیسر لیوی سے باتیں کرتی سبزے کی طرف جا رہی تھیں اور اس ماحول اور ان فضاؤں میں مکمل چھوروں سے گھلی ملی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ہمیشہ 'ہر جگہ علیحدہ رہوں گی' اس نے اپنے آپ سے کہا' حالانکہ اوجیت مجھے ساری ہسٹری آف سویوٹ کمیونسٹ پارٹی پڑھا چکا ہے۔ آخر میں وہ سب کیوں نہیں کر سکتی جو دوسرے کرتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا کر گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے گربا میں شامل ہو گئی جو باغ کے ایک حصے میں جاری تھا:

ہے گووند راگھو چرن اب تو جیون ہارے
سندھ کے کنارے' سندھ کے کنارے

لڑکیوں نے دہرایا۔

الاؤ سرد ہو چلا تھا' وہ سب گھاس پر بیٹھے رہے۔ چاند فارم ہاؤس کی چمنی پر پہنچ گیا۔ بارن میں سے اکارڈین کی آواز آ رہی تھی۔

پروفیسر لیوی باتیں کیا کیے۔ ان کی کتاب 'لٹریچر ان دی آف سائنس' ایک گھنٹے سے زیر بحث تھی۔ ان کے برف کے ایسے بال چاندی کی روشنی میں چاندی کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔

''مجھے کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اپنے متعلق؟'' طلعت نے جواب دیا' ہم لوگ ______ ہم لوگوں میں کوئی خاص بات نہیں ______ بالکل ذرا سا بھی کوئی اسرار نہیں۔ قطعاً ___''

پروفیسر لیوی کے اور ان لڑکیوں کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ پروفیسر کی اور ان کی عقلوں اور عمروں میں نصف صدی سے زیادہ کا تفاوت تھا لیکن اس کے باوجود ان کی فرشتوں کی ایسی شفقت کی وجہ سے' گرما کی اس خنک رات کو دفعتاً کیسی یگانگت محسوس ہوئی وہ اتنے بڑے مل آمی تھے' دنیا کے چوٹی کے دماغوں میں سے ایک' اور کتنے خلوص سے وہ کہہ رہے تھے: ''جب تم لوگوں نے مجھے بلایا تو' حالانکہ میرے پاس وقت نہ تھا' پر میں نے سوچا' میری قوم نے اتنی صدیوں یک جو برتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہے ذاتی طور پر ایک اکیلے فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ اس کا کفارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ تم لوگف جب بھی کہو میں تمہاری محفل میں آ شمل ہوں۔'' بلعت نے ایک خشک ٹہنی آگ میں پھینکی اور راس نے ہائی مین لیوی سے کہا: ''ہم تو اتنے ہونہی سے لوگ ہیں اور غالباً سخت خوف زدہ جو طامس

بیکٹ کے کورس کی پجاری عورتوں کی طرح چلا رہے ہیں:

''فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے۔ پانی ناپاک ہے۔ ہمارے جانوروں کے گلے' ہم خود' خون میں لت پت ہیں۔ خون کی بارش نے میری آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ میں خشک پتھروں کی سر زمین پر گھومتی ہوں اور اگر میں ان پتھروں کو چھولوں تو ان میں سے بھی خوب بہنے لگتا ہے۔ میں ٹھنڈے موسم بہاراں کی طرف کس طرح لوٹوں؟

''فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ ہڈیوں کو دھوؤ۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ ____''

بارن میں یکلخت گٹار کی آواز بلند ہوئی۔ ایوان مک کال کی صاف' گہری آواز سارے میں چھا گئی۔

''اب رات زیادہ آ گئی ہے۔ میں اگر تیز تیز چلوں تو قریب کے کسی اسٹیشن سے شہر کے لیے ٹرین پکڑ لوں گا۔'' پروفیسر لیوی نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ ____ آپ پیدل جائیے گا؟'' فیروز نے گھبرا کر کہا۔

''کیا حرج ہے؟'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''پیدل چلنا کوئی بری بات ہے۔ ابھی تو شاید بس بھی یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر مل جائے گی۔''

لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں مختلف یورپین زبانوں کے کورس گاتے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔

سامنے سیب کے جھنڈ میں آ کے کار آن کر رکی۔

''الو ____'' عامر رضا نے آواز دی۔

''الو______'' اوجیت نے خالص فرانسیسی لہجے میں نعرہ بلند کیا۔

''آیئے آیئے بھیا صاحب۔'' طلعت نے کہا۔

وہ سب بارن میں داخل ہو گئے۔

''میں جلدی میں ہوں۔ دوسرے گانوں کی آوازیں سنیں تو ٹھٹک گیا۔'' انہوں نے طلعت سے کہا' پھر وہ ایک اطالوی لڑکی سے نہایت گیلنٹ انداز میں جھک کر مخاطب ہوئے: ''مجھے اپنا سیسکوفون دو۔''

''بھیا صاحب' آپ ایوان سے ملے ہیں؟'' فیروز نے لکھنو کے ناطے سے ان سے اخلاق برتنے کی سعی کی۔ ''یہ اس ملک کے سب سے بڑے بیلڈ گانے والے ہیں______اور بہترین ڈراماٹسٹ۔''

''مجھے اپنا سیسکوفون دو______میں تمہیں وینس کی نہروں کا ایک گیت سناؤں گا۔'' عامر رضا نے فرانسیسی انداز میں اطالوی لڑکی سے کہا۔

''لاحول ولاقوۃ______'' فیروز نے جھنجھلا کر ان سے سوشل گفتگو کی سعی ترک کر دی۔

''آیئے یہاں بیٹھیے عامر بھائی۔'' ونو نے ان کے لیے پرال پر جگہ بنائی۔ سب لوگ ان سے طلعت اور کمال کے کزن کی حیثیت سے واقف تھے۔ اطالوی لڑکی بھی اپنا باجہ سنبھال کر ان کے قریب جا بیٹھی۔ ''ترقی پسند عوامی محاذ خطرے میں ہے۔'' سریکھا نے چپکے سے زرینہ کے کان میں کہا۔

''بھائی عامر کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ ہے۔'' فیروز نے سرگوشی میں تشویش ظاہر کی۔

’’اور بہن مریا گرزولی اتنی دور روم سے ڈیلی گیٹ بن کر اس لیے آئی تھیں کہ بھیا صاحب ان کو وینس کے گیت سنائیں! یا اللہ تو ہی رحم کر۔‘‘ طلعت نے جل بھن کر کہا۔

’’یہ بھی تو اپنے وقت کے رڈولف ویلنٹینو ہیں۔‘‘ شیلا نے اظہار خیال کیا۔

لڑکوں نے پرچھتی پر چڑھ کر ایک اسپینش گیت شروع کیا۔

’’اچھا بھئی بون نوئی۔‘‘ کچھ دیر بعد عامر رضا نے پرال پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’بون نوئی۔‘‘ کورس ہوا۔

بارن سے باہر نکل کر وہ سیبوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

’’______؟‘‘ ایوان نے مجمعے کی طرف استفسارانہ نظریں اٹھائیں۔

’’یہ مک کال صاحب ____ ایک ایسی منزل مقصود ہیں جس کی طرف بہت سی لڑکیاں سفر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں۔‘‘ فیروز نے کھڑکی میں سے کہا۔

’’ماشاءاللہ سے کس قدر پروفاؤنڈ بات کہی ہے۔‘‘ طلعت نے داد دی۔

سب نے مل کر امریکن حبشیوں کا بیلڈ شروع کر دیا:

For if you are white, you're all right;

If you are brown stick around,

But if you are black,

Oh, no! Brother, get back, get back, get

back.

گیت کی آواز دیر تک کھیتوں کے وسیع سناٹے میں گونجتی رہی' پھر سب لوگ اپنے اپنے خیموں اور کیبنوں کی طرف جانے کے لیے اٹھے۔

لوگ کیبن میں ساری لڑکیاں آچکی تھیں اور سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یہ ہندوستان کے سارے صوبوں سے آئی تھیں اور بیرسٹری پڑھ رہی تھیں اور ڈاکٹر یٹ کے لیے کام کر رہی تھیں اور اخبار نویسی اور ڈاکٹری کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ سائنس دان تھیں اور آرٹسٹ تھیں اور گاتی اور ناچتی تھیں اور پچھلے ایک ہفتے سے کانفرنس میں نہایت مدلل تقریریں کر رہی تھیں اور رات کو فارم ہاؤس کے باورچی خانے میں مندوبین کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رات کا سناٹا آسمانوں سے اتر کر سارے میں پھیل گیا۔ وادی میں کچھ دور پر خانہ بدوشوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری کائنات اس برستے ہوئے احساس کے دھارے میں کہیں بہہ گئی۔

٦٥

اے ہمارے آسمانی باپ' ہمیں آج کے دن ہماری روزانہ کی خبریں عطا کر۔

طلعت نے کانفرنس سے لوٹ کر شہر کے اسٹیشن میں پہنچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی اور سرپٹ دفتر کی طرف دوڑی۔ آج کل وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔

نیوز روم میں وہی گہما گہمی تھی۔ اس نے اپنی میز پر جا کر کاغذات کو الٹا پلٹا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

''ہلو ____ ہلو ____''

''ہاں کون ہے بھائی۔''

دوسرے سرے پر فیروز دھاڑ رہی تھی۔

''ساجدہ آپا کسی بین الاقوامی کانفرنس سے لوٹی ہیں۔ چچا نے کہا ہے فوراً اسٹوڈیو پہنچ کر ان کا انٹرویو کرو ____''

وہ سہ پہر کو اسٹوڈیوز پہنچی۔

بی بی سی کی کنٹین میں حسب معمول شور قیامت مچا تھا۔ یورپین مڈل ایسٹرن اور ایسٹرن سروسز کے لوگ اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر لنچ کے لیے آ رہے تھے۔ ہسپانوی ' اسرائیلی' عرب' ایرانی 'فرانسیسی 'ہندوستانی ' پاکستانی ____ ان سب کی عجیب وغریب برادری تھی۔ بہت سی میزیں برابر برابر لگا کر ہندوستانی اور پاکستانی کراؤڈ اکٹھا بیٹھا کرتا۔ یہ تقریباً سارے یک سارے اولڈ ٹائمرز تھے: صدیق احمد صدیقی جو علی گڑھ برادری کے جگت چچا اور اپنی ذات سے انجمن تھے' یاور عباس' اعجاز بٹالوی' تقی سید' آل حسن' عطیہ' زرینہ۔

''اور وہ وفد آ گیا جس کا انٹرویو ہے۔'' طلعت نے اندر آ کر فیروز سے پوچھا۔ کنٹین میں ایک طرف کو ساجدہ آپا قناعت سے بیٹھی پیالی میں کانٹا بجا رہی تھیں۔ ''اب چلو ان کا انٹرویو کرنے۔'' زرینہ نے چپکے سے کہا۔

''ان کا ____ ان کا ____''

''اور وہ وفد کہاں گیا جو جانے کہاں سے ہو کر آ رہا ہے؟''

''یہی تو وفد ہیں'' زرینہ نے اس انداز سے کہا گویا اب دنیا کا کوئی رنج و غم اس پر مزید اثر نہیں کر سکتا۔

''______بس ہر وقت ہاتھ ہلا کر اور کندھے اچکاتے ہوئے طرح طرح کی شکلیں بناتے سڑکوں کے کنارے بیٹھے کافی پیتے رہتے ہیں______'' ساجدہ بیگم پیزری سے فیروز سے مخاطب تھیں۔

''جی ہاں______بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے' سڑک پر بیٹھ کر کافی پینے کی کون تک ہے۔'' زرینہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

''کون؟'' طاعت نے چپکے سے پوچھا۔

''اطالوی یا غالباً فرنچ______ان میں سے ایک قوم سے یہ بہت خفا ہیں۔'' زرینہ نے بتایا۔

''چچ چچ______پورڈیرز۔'' طاعت نے کہا۔

''بوش'' ساجدہ آپا نے بات ختم کی' ''مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔''

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: ''جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگ سے میں نے کہا۔''

''بوش'' ساجدہ آپا نے بات ختم کی' مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: ''جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگف سے میں نے کہا۔''

طاعت نے نڈھال ہو کر اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔

''دیکھو، ساجدہ آپا، گپ نہ ہانکو۔ مجھے معلوم ہے تم میڈرڈ کبھی نہیں گئیں۔''

''چلو میڈرڈ کے بجائے اوسلو کر دو۔ فرق کیا پڑتا ہے؟'' زرینہ نے اطمینان سے رائے دی۔

''اور اہلیہ اہرن برگ کون ہیں؟'' فیروز نے طلعت سے مطالبہ کیا۔

''یہ اہرن برگ صاحب کے گھر میں سے ہیں ــــــ'' زرینہ نے جواب دیا۔

''دوسری بات یہ کہ یہ میڈرڈ میں کر رہے تھے؟'' فیروز نے مزید جرح کی۔ ''کہاں میڈرڈ کہاں غریب اہلیہ۔''

ساجدہ بیگم نے کھسر پھسر سنی تو اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر ادھر متوجہ ہوئیں اور ایک لمحے کے لیے زرینہ کو دیکھ کر چونکیں کہ یہ سبز فراک میں ملبوس بلونڈ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر غالباً ان کو یاد آ گیا کہ یہ زرینہ ہے۔ ''کیا پوچھنا ہے آپ کو؟''

''ہاں پیاری بہن ــــــ پتہ نہ مارو۔ جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا ــــــ'' زرینہ نے طلعت سے کہا۔

ساجدہ بیگم نے، جو مانی ہوئی زمانہ لیڈر تھیں، کہنا شروع کیا: ''مجھے یہاں کا طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔''

''کتنی خوشی کی بات ہے۔'' فیروز نے کہا۔

''ہالینڈ میں، جہاں میں ابھی گئی تھی، ہر جگہ لالہ کھلا ہوتا ہے اور لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں۔'' انھوں نے مزید انکشاف کیا۔

انٹرویو ہوتا رہا۔

چند روز بعد سنا گیا کہ ساجدہ آپا نے طلباء کی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وطن کی نمائندگی کرنے کوپن ہاگن گئی تو ڈنمارک کی بی بی سی سے ایک تقریر کے دوران میں نے بتلایا کہ بائی دی گریس آف اللہ __________

اس کے چند روز بعد اطلاع ملی کہ سید عامر رضا نے ساجدہ بیگم کو استانبول کھانے پر مدعو کیا ہے۔

یہ دعوت ساجدہ آپا کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

۶۶

وقت کالے بھتنوں کی طرح آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کے لرزہ خیز سائے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں۔ وقت، جو گزر رہا ہے، آخر مجھے ختم کر دے گا۔

خداوند کی ماں مریہما۔ جس کا دل سات بار زخمی ہوا۔ مجھ پر رحم کر۔ میرے پرانے دشمن۔ روشن سیبوں کے سائے میں چلتی رہی۔ جیرس لین میں کسی نے ٹرمپٹ پر ایک پرانی دھن بجانا شروع کر دی۔ پتھروں پر سے ندی کا پانی بہتا جا رہا تھا۔ ایک کتا ہنستا ہوا اسے عبور کر رہا تھا۔ پتلی ٹہنیوں والے درخت پانی کی سطح پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں ایک بطخ تیر رہی تھی۔

وہ کواڈرینگل میں داخل ہوئی۔

''روشن۔'' کسی نے دریچے میں آ کر اسے آواز دی۔

''روشن۔۔۔۔۔۔ اندر آؤ۔۔۔۔۔۔ کیا تم بھی اس کانفرنس سے واپس آ رہی ہو جس میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں پاس کی گئی ہیں؟'' سرل نے دروازے میں آ کر کہا۔

''نہیں۔'' اس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ''نہیں۔ میں محض ہیزل میر تک گئی تھی۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''ڈینس نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔''

''ہلو ڈارلنگ۔'' سریکھا نے آتش دان کے پاس سے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم کب آئیں۔''

''میں؟ مجھے کیمبرج مجلس نے مدعو کیا تھا۔''

''میں اپنی نئی کتاب تمہارے نام معنون کروں گا۔''

ڈینس سریکھا سے کہہ رہا تھا۔ روشن دریچے میں کھڑے ہو کر ان سب کی گفتگو سنتی رہی۔ (پھر یہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے کچھ ملایا اور کوریا اور کینیا میں مارے گئے۔ کچھ کار کے حادثے میں زخمی ہو گئے یا حلق میں کینسر نکل آنے کی وجہ سے ختم ہوئے۔ چند کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ نے کتابیں لکھیں، شہرت پائی اور دنیا ان کے قدموں کے نیچے آ گئی۔ چند ایک یونہی رہ گئے)۔

''ہونہہ ______ خدا۔''ڈینس کہہ رہا تھا۔

''خدا ____ ''سریکھا نے کہا۔''جب میں ناچتی ہوں' مجھے لگتا ہے' واقعی شیو نے تلانا کے سروں پر کائنات تخلیق کی تھی۔ وہی احساس اگر مستقل منجمد کر دیا جائے تو شاید خدا ہوگا ____ تلانا کی دھن کا احساس ______ پتا نہیں۔''

''ابھی شاید دروازے میں داخل ہوگا جس کا کوئی نام نہیں۔ دیکھو باہر ایک منحوس چاند پرانی قندیل کی طرح ڈول رہا ہے۔''سرل نے کہا۔

''ویک انڈ کے لیے شہر چلو گی۔ میں رات کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں۔''سریکھا' روشن سے بات کرنے کے لیے دریچے کی طرف مڑی مگر روشن باہر جا چکی تھی۔

''چلو ہم سب روشن کے ساتھ ہیزل میر چلیں۔''سرل نے سگریٹ رول کرتے ہوئے تجویز کیا۔

''کیوں ہیزل میر کس لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں؟''مائیکل نے سوال کیا۔

''سب جگہیں ایک سی ہیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''ڈینس نے کہا۔

''لہٰذا ہیزل میر چلو''سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

''روشن۔ ہم تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے دشمن ہیں ہم تمہارے دوست ہیں۔''سرل نے کہا۔

وہ رات کی مدھم روشنی میں جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔

یہ وسط گرما کی رات ہے۔ چڑیلیں اور بھتنے اور راگیا بھتال درختوں کی چھاؤں

میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔

سندیشور؟ روشن بھاگتے بھاتے تھک کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔

تمہاری حقیقت دھند لکے میں چھپی ہے۔ عامر رضا نے انگلی اٹھا کر واضح کیا۔

میں اس کے سفر میں شامل رہوں؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب گیا۔

پہاڑیوں پر روشنیا جل رہی ہیں۔ جنگلوں میں سرخ کوٹ پہنے شکاری ویبر کی دھنیں بجا رہے ہیں۔ اتوار کے دن ہمیں ہیمپٹن کورٹ اور سرل لشلے کے محل میں داخ کیا جاتا ہے۔ مائیکل نے کہا۔

لیکن ہم بھوکے تھے لہذا اپنی کتابیں بیچ کر کھا گئے۔ اس شخص نے کہا جس کا کوئی نام نہیں۔

جنگل میں وہ سب خرگوشوں کی طرح اچھلتے پھر رہے ہیں۔ ڈینس سر کے بل کھڑا کملا کو اپنی نظم سنا رہا ہے۔ سریکھانٹ راج کے ایک انداز میں منجمد ہو گئی ہے۔ ڈلن طامس جھیل کے کنارے بیٹھے گیتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔

''سنو۔ کیا تمہیں بھی کسی دور کے فاصلے کی فون کال کا انتظار ہے؟'' سرل نے قریب آ کر عامر رضا سے دریافت کیا۔

''ہاں۔ نہیں ________'' عامر رضا پھر گھاس پر بیٹھ کر سوچ میں مبتلا ہو گیا۔

ہمارے خواب مختلف ہیں۔ خالص خیال خوفناک ہے۔ ٹھہرو _ _ _ _ _ _ _ _ تفصیلات کی دنیا میں ہمارا صیہون کہاں ہے؟ ________ جلد بتاؤ ________ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس نے ایک لخت

گھبرا کر روشن سے پوچھا۔وہ روشن کے سامنے گھاس پر جھک گیا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ چمپا ہے!

ہمیں دیر ہو رہی ہے _ _ _ _ _ _ _ _جلدی کرو _ _ _ _ _ _ _جولدی _ _ _ _ _چول _ _ _

چول____چول____چول_____پہاڑیوں پر گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔میرے دماغ کے ویرانے میں جو ہوائیں سنسنا رہی تھیں اب وہ آندھی بن کر سارے میں پھیل گئی ہیں۔ چمپا نے کہا جو دراصل روشن تھی______میں تمہارے تھکے ہوئے پاؤں دھوؤں گی۔تم گرم قالین پر آگ کے سامنے بیٹھے رہنا______جلدی____جلدی____دیر ہو رہی ہے____

شور میں اضافہ ہو گیا۔چلو ____چلو____ہیزل میئر چلو_____دلی چلو____چرچل کے گھر چلو____دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ۔ایک آدرش مہان لیے____خطرہ ہو بلیدان کا_______پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین______لائیں گے سکھ چین_______

______ان بستیوں کو جگمگانا ہے سدا_______ان کھیتوں کو لہلہانا ہے سدا _ _ _ _ہم' کیا گورے کیا کالے۔سب ایک ہیں _ _ _ _ _ _ایک ہیں _ _ _ _ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں _ _ _ _ _ _ایک ہیں______ کہہ رہے ہیں ہم ہیں شکتی مان______اور وشو مانتا یہ سب گان _ _ _ _ _خطرہ ہو بلیدان کا _ _ _ _ _ _ _خطر ہو بلیدان

دنیا بھر ــــــــ ہنسی خوشی منا رہی ــــــــ جوانیاں ہیں گا رہی ــــــــ کا
کاروائی تو ہو کو پاٹ بھگ ــــــــ نوجوان ــــــــ نوجوان ہوئے ایک سے
آزاد دلی میں ہیں۔ نہرو جنیوا ــــــــ بھنگ کو ررے لو پاٹ ــــــــ رے
میں ہیں۔ ایشیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بہاول پور میں ہے۔ روشن' عامر رضا کے
چکر میں ہے۔ مسٹر کھنہ یہ ساری سرمایہ داری کی سازشیں ہیں۔ معاشرے کی
خرابیاں۔ کل میں نے ایک نیا کوٹ خریدا۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ۔ آلو کو
دھوؤ۔ پتیلی کو دھوؤ ــــــــ

رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹی۔ خاموشی چھا گئی۔ چاند عین اوپر آ گیا۔ عامر رضا نے دفعتاً ایک چھلانگ لگائی اور پھولوں کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

وہ پگڈنڈی پر بیٹھی رہ گئی۔ سرل اور ڈینس مائیکل دلدل کے کنارے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے اور منہ لٹکا کر ادھر ادھر بیٹھ گئے۔

یہ ٹھنڈے اور اداس دن ــــــــ روشن نے سر اٹھا کر اس سے کہا۔

بھیگے' نم خوردہ' خوفناک دن ــــــــ سرل نے کہا۔

بھاری' گھسٹنے والے' لنگڑے' اپاہج دن ــــــــ ڈینس نے کہا۔

یوں ہماری زندگی بیتتی ہے۔ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ہمارے لیے کٹھن آزمائشیں ہیں۔

تکلیفیں

دل کا رنج

ندامت

پشیمانی

وہ مگن ہیں

ہم روتے ہیں ______

ہیزل میئر کا جنگل آہستہ آہستہ دھندلکے میں محو ہو گیا۔

٦٧

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔

''ساجدہ آپا نے قوم کو صحرائی چوہے دیکھنے کے لیے مدعو کیا ہے۔'' طلعت نے اطلاع دی۔

''صحرائی چوہے کیوں۔ صحرائی لومڑی کیوں نہیں؟'' سریکھا نے پوچھا۔

''دراصل ساجدہ آپا کو رچرڈ برٹن کی ذات سے بہت عقیدت ہے۔'' طلعت نے کہا۔

''تو پھر کرا دو ان کا انٹرویو رچرڈ برٹن صاحب سے۔ وہ تو اکثر براڈ کاسٹنگ ہاؤس آتے رہتے ہیں۔''

''دراصل ان کی شکل ایک اور بزرگ سے ملتی ہے جو اوریجنل ہیں۔''

''اوہو ______ یہ بات ہے۔'' فیروز نے کہا۔ پھر دفعتاً وہ چلائی۔ ''ارے یہ تو واقعی بڑی ایکٹوٹی ہو گئی۔''

اٹھا لاؤ کھنجر ، کرو قتل ہم کو

بڑی دیر سے موڑی جھکائے ہوئے ہیں

طاعت نے کہا۔ (یہ قدیر کا پسندیدہ شعر تھا)۔

''یہ بات ہے تو آؤ میدان میں۔''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ ہڑبڑا کر فیروز نے کہا: ''السلام علیکم لائیے میم کا۔''

اشعار کس کو یاد تھے لہذا پہلے غلط پڑھے گئے' پھر حسب ضرورت ان میں ترمیم کی گئی۔ نہ کر ہم نشین بے وقو ۳ فی کی باتیں۔ میں بھولا نہیں ہوں وقوفی کی باتیں۔ خود شعر گھڑے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کی فلمی گانوں کے بول نہایت بے تکلفی سے استعمال کیے جانے لگے۔ ''یاد رکھنا چاند تاروں اس سہانی رات کو۔ لاؤ واؤ کا۔'' طاعت نے کہا۔

''واہ' کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔'' کملا نے کہا۔

''یہ فاؤل ہے۔''طاعت دہاڑ۔

''ہرگز نہیں۔''

''اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔''

''طاعت نے میز پر مکہ مارا''

''آہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔'' کملا نے گرج کر جواب دیا۔

جب دوبارہ کملا کی باری آئی تو اس نے اطمینان سے جواب دیا: ''ہائے کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔''

''یہ سب ہو چکا ہے۔''طاعت چلائی۔

''یہ دوسری مرغیاں ہیں۔'' کملا نے اطمینان سے جواب دیا۔

دوسرے روز ساجدہ آپا نے طاعت کو ویمنز پریس کلب میں فون کیا۔

''سنو ساجدہ بہن۔ میں صحرائی چوہے دیکھنے سے معذور ہوں۔ میرا سارا دن تو بہت سے اصلی چوہے دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔''طلعت نے کہا۔

''نہیں۔ مجھے تم سے رائے لینا ہے۔ایک نہایت ضروری بات ہے۔''

''اچھا تم سیدھی یہیں آ جاؤ اور لنچ بھی یہیں کھاؤ۔طلعت نے زور سے ریسیو رپٹخ دیا۔شہر کی ان محبت زدہ خواتین نے اور جان آفت میں کر رکھی تھی۔''

آدھ گھنٹے بعد ساجدہ بیگم کھانے کی چھوٹی میز پر طلعت کے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ انیچیوں کی طرح ساجدہ بیگم کو دیکھا کی۔

''کل میں عامر رضا سے ملی۔''انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''یہ چوزے کی سرائے کا ذکر ہے جہاں آپ بی بی سی والوں کے ساتھ گئی تھیں؟''طلعت نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ہم دونوں استانبول میں کھانا کھا رہے تھے۔''

''اوہ۔''

''اور پھر انہوں نے بتایا۔''

انہوں نے بتایا کہ وہ مجھے سے کتنا گھبراتے ہیں؟ کہ وہ سائے کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتے ہیں۔ جہاں سایہ ملا وہیں بیٹھ گئے۔ یہ تیز دھوپ ان کی آنکھوں کو بری لگتی ہے؟

''ہاں کہا تو تھا۔بالکل یہی کہا تھا انہوں نے۔''

''خدایا______ لو یہ گوبھی کھاؤ۔''بلعت نے پلیٹ ان کی طرف سرکائی۔

''میرا خیال ہے اس ملک کے بارے میں جو میرے تاثرات ہیں ان پر ایک افسانہ لکھوں'' ساجدہ بیگم نے سوچ کر کہا۔

''ضرور ———— اس سے عمدہ بات کیا ہو سکتی ہے!'' طلعت نے ویٹرس کو بلانے کا اشارہ کیا۔'' کافی لوگی ساجدہ'' اس نے اونگھتی آواز میں پوچھا' یا آئس کریم؟

برابر کی میزوں پر برطانیہ کی مشہور اخبار نویس خواتین ٹوپیوں کے تازہ ترین فیشنوں پر تبادلہ خیالات کر رہی تھیں۔

طلعت اداسی سے ساجدہ بیگم کو دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

۶۸

چمپا نے نرگیش کے کمرے میں آ کر نظر ڈالی۔ 'مانوس کمرہ۔ صوفہ۔ تصویریں۔ نیلے پھول۔ میرے لیے ایک ساری نکال دینا۔ نرگیش نے غسل خانے میں سے آواز دی۔ دوسرے کمرے میں شاہ نتا ایک ہی ریکارڈ بار بار بجائے جا رہی تھی۔ اسی روز اس کی ایک نئی کتاب چھپ کر آئی تھی۔ بل نیچے کورٹ یارڈ میں گلشن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ چمپا نے الماری کھولی۔ ایوننگ گاؤن اور ساریاں اور جوتے اور بیگ۔ ایک تختے پر ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا مندر رکھا تھا جس میں ایک ننھا سا بت رکھا تھا۔

پارسی کس کا بت پوجتے ہیں؟ وہ سوچتی رہی یا شاید زرتشت یا جانے کیا۔ اسے پارسی مذہب سے واقفیت نہ تھی۔ اسے کسی مذہب سے واقفیت نہیں تھی۔ ہم سب کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹا سا شرائن ہے۔ جس میں ایک گمنام بت رکھا ہے۔ اس بت کا نام مجھے معلوم نہیں۔ یسوع۔ سینٹ طامس۔ کرشنا نارائن۔ زرتشت۔ یہ بت آخر وقت تک گمنام رہے گا۔ انت سے جب انسان کی آنکھیں آخری بار ہمیشہ کے لیے بند ہونے لگتی ہیں' اس وقت اسے جانے کیا نظر آتا ہے' وہ گمنام بت کون سی شکل اختیار کرتا ہے ——— یہ کسے معلوم۔

شانتا نے اندر آ کر نرگیش کے لیے ایک سرخ ساری نکالی۔ ''الماری بند کر دو۔ الماری بند کر دو۔'' چمپا نے با آواز بلند کہا۔

''ہیں؟'' شانتا نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ ''کس سے کہہ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں میں سوچ رہی تھی کہ دن میں کتنی بار نرگیش یہ الماری کھولتی ہے۔''

''ہاں؟'' شانتا بالکل نہ سمجھی۔

''اور اس میں سے رنگ برنگے کپڑے نکلتے ہیں۔''

''ہاں۔ ہاں ——— تو؟''

''اور نیلی گھاس کا عطر۔ اور پیرس کی ٹوپیاں۔'' چمپا کہتی رہی۔ ''اس کا بت شرائن میں رکھا رہتا ہے اس کونے میں۔ اس نے یہ الماری بنائی اور اب اسی میں چھپا بیٹھا ہے۔ تمہاری الماری بھی کوئی بت ہے؟''

''میری الماری میں ڈھانچے ہیں'' شانتا آتشدان کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ''تم ———'' اس نے کہا ——— تم تھوڑی

سی دیوانی ہو۔

''ہاں۔تم نہیں ہو؟''

''تمہاری باتیں معرفت کی حدوں کو چھو رہی ہیں۔اس طرف مت جانا۔بڑی افسوسناک بات ہوگی۔''شانت نے جواب دیا۔

سریکھا سفید ساری پہنے‘بال تولیے میں لپیٹے باہر آئی اور دریچے میں کھڑی ہو کر ٹیرس گارڈن کو دیکھنے لگی۔باہر‘جدھر پھول ہی پھول تھے اور بہار کا روشن آفتاب جگمگا رہا تھا۔

''زندگی ______ زندگی‘‘سریکھا نے خوشی کا گہرا سانس لے کر ہوا میں بازو پھیلائے۔

''سریکھا میرے لیے زندگی کی علامت ہے۔بشاش۔رقصاں۔تم علامتوں کی رمزیت کی قائل ہو؟''

چمپا نے مڑ کر شانتا سے پوچھا۔

شانتا آتشدان میں بجلی کے مصنوعی سرخ انگاروں کو دیکھا کی۔

زندگی میرے سامنے سہی کھڑی ہے۔ سفید ساری میں ملبوس۔ ہنستی‘ گنگناتی‘ خوفزدہ‘نڈر‘باہمت‘بزدل‘ہر لفظ کے دو مختلف متضاد معنی ہیں۔زندگی۔اس نے شانتا کو دیکھا۔میں نے ایک مرتبہ گوتم سے کہا تھا______ میں اور تم‘ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔

کئی سال قبل گلفشاں کے باورچی خانے میں ترکاری بناتے ہوئے‘طلعت نے کہا تھا۔چمپا باجی گوتم ہر وقت ہر چیز کا تجزیہ کرنے پر تلا رہتا ہے۔اس بات

سے خبر دار رہے گا۔ وہ کسی کو بخشنے والا نہیں چاہے آپ ہی کیوں نہ ہوں۔

''مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑ ہے جو بات بے بات' ہر فقرے' ہر لفظ' ہر لکھے ہوئے جملے میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے تلاش کرتے ہیں۔ لاحول ولا۔'' اس نے جواب دیا تھا۔''

''گوتم بھی یہی سب کرتا ہے؟'' نرملا نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا تھا۔

''بالکل'' طلعت نے جواب دیا تھا۔

''تب تو گوتم بہت برا آدمی ہے۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ لوگوں کی باتوں میں نفسیاتی الجھنون کے اشارے نہ تلاش کیا کرے' خصوصاً آپ کی باتوں میں۔'' نرملا نے کہا تھا۔ یہ لڑکیاں اب صریحاً بدتمیزی پر اتر آئی تھیں۔ نرملا مجھ سے جلتی ہے ــــــــ کس قدر واہیات بات ــــــــ تہمینہ کی طرح ــــــــ لا حول ولا ــــــــ میری باتوں س اسے مطلب! اس نے غصے سے سرخ ہو کر با آواز بلند کہا تین چار بار تو اس سے ملاقات ہی ہوئی ہے۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے غصے کو چھپا کر گفتگو کو مزاحی رنگ دینا چاہا: ''اور وہاں اس نے باتوں کو ایسی ٹو چھوڑ رکھی تھی کہ کسی کو بولنے ہی نہ دے۔ ہر سوال کا جواب اسے آتا ہے' ہر علم میں وہ ماہر ہے۔ توبہ۔ آدمی نہ ہوا راکھشش ہو گیا' دس سروالا۔''

''ہے ــــــــ ہے ــــــــ'' تہمینہ نے بڑی مہارت سے پیٹر کاٹتے ہوئے باورچی خانے دوسرے کونے سے کہا تھا' گوتم نے تم پر بہت رعب ڈالا ہے اور آ گئیں تم اس کے رعب میں۔''

''میں نہیں آئی اس کے رعب میں۔'' اس نے بگڑ کر کہا اور اس کی آنکھوں میں

آنسو آ گئے اور وہ جلدی سے پیازوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

''پھر اس کا اس قدر لمبا چوڑا ذکر کیوں ض کر رہی ہو؟ ہم لوگ تو بے چارے گوتم کو ایسا قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ نہ راکھشش نہ دیوتا۔ تم نے اس چکر میں چاء بھی ٹھنڈی کر دی۔ اے لو مصالحہ جلا جا رہا ہے۔ بھن گیا مصالحہ' لے اب گوشت ڈال دو بی طاعت۔''

آوازیں ماضی کے آبشار کے شور میں ڈوب گئیں۔ یہ نرگیش کا فلیٹ تھا اور سر یکھا پھولوں میں کھڑی بال سکھا رہی تھی اور شانتا صوفے پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی۔ چہرے وہی تھے' ماسک نئے تھے۔

''گوتم اب تک سرکولیشن میں ہے۔'' شانتا نے باواز بلند پوچھا۔

کیا؟ وہ چونکی

میرا مطلب ہے'' شانتا نے سگریٹ جلاتے ہوئے اس طرح پوچھا گویا چمپا ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھی تھی جسے وہ پچھلے چند منٹوں سے پڑھ رہی تھی'' وہ اب بھی سرکولیشن میں ہے یا اسے لائبریری کے بک شیلف پر واپس رکھ دیا گیا۔

''پتا نہیں۔''

''تمہاری ممبر شپ کی میعاد ختم ہو چکی؟''

شانتا کریگ علاوہ مغرور ہونے کے' کمینی بھی تھی۔

''یہی سوال غالباً میں تم سے کر سکتی ہوں۔''

شانتا اداسی سے مسکرائی ______ اس کا پر غرور تبسم' اس کا انداز' اس کا طرز لباس ______ چمپا کس دھیان سے ان دنوں اس کی تقلید میں مصروف تھی۔

خوبصورت‘ کامیاب‘ ہردلعزیز‘ کریومن ۔وہ بھی شانتا نیلمبر کی طرح کیوں نہیں بن سکتی؟ شانتا نے اطمینان سے اسے دیکھا: ”میں اس کے الوژن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔مصیبت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے۔“

”واقعی یہ مجھے معلوم نہ تھا۔“ چمپا نے طنز سے کہا۔

”تمہیں یہ معلوم نہیں ہوسکتا۔تم خود اپنے تصورات میں ضرورت سے زیادہ مبتلا ہو۔آدمی قربانی چاہتے ہیں بغیر اپنی قربانی دیئے۔تم ان کو حاصل نہیں کرسکتیں۔تم پیرس سے یہاں کیوں آگئیں‘ اپنا اکیڈیمک سال ادھورا چھوڑ کر؟ اس لیے کہ وہ یہاں ہے۔“

”بکومت ___ یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“ چمپا کو بے حد غصہ آیا۔اب وہ اپنی مزید توہین نہیں کروائے گی۔

”لیکن یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے“ شانتا اپنی سریلی آواز میں کہتی رہی۔(وہ احمد آباد اور بمبئی سے مرہٹی گانے براڈ کاسٹ کیا کرتی تھی)۔

”تم افسانہ نگار ہو نا اسی لیے میرے متعلق تم نے اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔“

”_____ اب بل تم کو بلڈاپ کرنا چاہتا ہے۔“ شانتا نے اپنی سریلی آواز میں بات ختم کی اور پھر اطمینان سے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی۔

تہمینہ رضا‘ ٹرملا سریواستوا‘ شانتا کریگ۔

”اچھا‘ یہ بات ہے۔“ چمپا نے اپنا کوٹ اور دستانے اٹھائے۔”میں قابل

نفرت ہوں ۔ میں قابل نفرت ہوں۔ اچھا بھئی اب چلا جائے۔ نرگیش ــــــــ سریکھا ــــــــ شانتا ــــــ خدا حافظ۔''

''کل دفتر آؤ تو وہ نیلی اون لیتی آنا جو ہم لوگوں نے اس دکان پر دیکھی تھی۔ ''شانتا نے اسی اطمینان سے کہا۔

''میں شاید کل دفتر نہ آؤں۔'' دروازے تک پہنچ کر اس نے دوبارہ پلٹ کر کہا۔ ''کل کیا معنیٰ، میں شاید کبھی تمہارے دفتر نہ آؤں۔ زشب بخیر ــــــــ ''

باہر چیلسی کی سڑک پر آ کر اس نے دیکھا مکانوں کے دریچے بارش کے سہانے دھندلکے میں چھپ گئے تھے۔ نکڑ کی بوڑھی عورت، جو پھول بیچتی تھی، بارش سے بچنے کے لیے برساتی اوڑھے، کرسی پر، دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ دریچوں میں سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچی جو بہت دور مضافات میں تھا۔ اپنے کمرے کی دہلیز میں اسے سرل کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا: ''نیو ہم میں تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ ستمبر میں تم یہاں آ رہی ہو۔ یہ گرمیوں کے چند مہینے کسی اداس اور رومینٹک اطالوی یا ہسپانوی شہر میں گزار آؤ۔ میں شمال جا رہا۔ روزماری بیمار ہے۔''

روزماری؟؟

۶۹

کوہ نور کی ایک میز پر، جو دریچے کے پاس بچھی تھی، گوتم، نرملا کے مقابل

بیٹھا باہر برستی ہوئی بارش کو دیکھتا رہا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں آ آ کر بیٹھ رہی تھیں یا اٹھ اٹھ کر باہر جا رہی تھیں۔ کمال معاف کرنا' کہہ کر کسی دوست سے بات کرنے کے لیے ایک دوسری میز کی طرف جا چکا تھا اور بڑے جوش و خروش سے کسی بحث میں مصروف تھا جس میں بار بار ماؤ اور پیپلز چائنا کا نام دہرایا جا رہا تھا۔ گوتم نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی۔

''کمال کتنا پیارا لڑکا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ کمن بھیا کے ہونے سے مجھے یہی لگتا ہے کہ بھین یہاں موجود ہیں۔ اگر کمن بھیا اور طلعت نہ آ رہے ہوتے تو اماں مجھے ہرگز اکیلا ولایت نہ بھیجتیں۔'' نرملا نے کہا۔

''تم نے مجھے جو باتیں چمپا کے متعلق بتائیں مجھے سن کر بڑا دکھ ہوا____'' گوتم نے کہا۔ وہ ابھی تک چمپا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نرملا نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی۔ چند منٹ قبل اس شخص نے پروپوز کیا تھا______ وہ چپ بیٹھی رہی۔

''تم سب نے' ہم سب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ ہم نے ان کو برا بر غلط سمجھا ہے____ مثال کے طور پر____'' اس نے ذرا جوش سے دہرایا اور کانٹا اٹھا کر نرملا کو سمجھانا شروع کیا'' انہوں نے کبھی بھیا صاحب کو آپ سے' یعنی کہ' چھیننا نہیں چاہا تھا۔''

''بہر حال' میرا خیال ہے اب ہم چمپا باجی پر مزید بحث نہیں کریں گے۔'' نرملا نے کہا اور مصروف نظر آنے کے لیے بیگ میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

''تمہارے نزدیک چمپا باجی مکمل ہیں مگر شاید تم بھولتے ہو کہ ہم چمپا باجی کو اپنے بچپنے سے جانتے ہیں۔''

''یہ بچپنے سے جاننے کی دھونس اچھی ہے!'' گوتم نے کہا۔ ''تمہارے یہاں ہر سے بچپنے کا راگ کیوں الاپا جاتا ہے۔ جو لوگ تم کو یا چمپا احمد کو بچپنے سے نہیں جانتے' وہ گدھے ہیں؟''

اب گوتم پر چاروں طرف سے بڑی تیز روشنی پڑ رہی تھی جس طرح وہ خود گوتم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی لیکن دیکھو کیا ہوا کہ گوتم نے ہاتھ بڑھا کر دفعتا سوئچ بند کر دیا۔

گوتم: انسانی کردار کا بے رحم نقاد' دیدانت کا گرو' چمپا جیسی فراڈ کو مکمل سمجھتا ہے۔ بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا:

''نرمل۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے چمپا سے کیا مطلب !میں بہت پھٹیچر ہوں' تم نے ٹھیک کہا' مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''نعم البدل؟ نہیں' سوری گوتم۔''

''نرمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ____ او نرمل ____ '' اب وہ پھر اندھیرے میں چلا گیا۔ وہ بہت قابل رحم تھا۔ اسکول کے لڑکوں کی مانند۔ کون کہتا ہے مرد سمجھ دار ہوتے ہیں۔ ارے ان سے زیادہ مورکھ کون ہوگا۔ میز پر بیٹھے بیٹھے نرملا کو احساس ہوا۔ وہ بیل کی طرح' درختوں کی طرح' بیرومیٹر کے پارے کی طرح اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں گیان ارہا یہ۔ اب مصنوعی روشنیا بجھا کر وہ بھی اس اندھیرے میں چلی جائے

گی جو سب کیفیتوں سے اتم ہے۔اس میں بیٹھی وہ باہر جھانکا کرے گی۔اب وہ سلیمانی ٹوپی پہن لے گی جس کی کہانی بچپن میں اسے گلفشاں کے شاگرد پیشے میں قدیر ڈرائیور نے سنائی تھی۔

یہ سلیمانی ٹوپی ہر ایک کو دستیاب تھوڑا ہی ہوتی ہے۔میں تمہاری شکرگزار رہوں شری نیلمبر، کہ تم نے میرے بڑے ہونے میں میری مدد کی اور سلیمانی ٹوپی پہننے کا راستہ دکھایا۔کاش میں تم سے بیاہ کر سکتی۔مگر مجھ میں بہت زیادہ گیان آ گیا ہے ________ چمپا احمد کی پرستش کیے جاؤ گوتم جی۔شاید تم کو بھی راہ نجات مل جائے۔

اسی رات نرملا کی ایکسرے رپورٹ میں معلوم ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کی دق ہے۔

اختتام ــــــــــــــــ حصہ دوم

۷۰

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ مڈ ہرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سرل' اب کے ویک انڈ پر ضرور مڈ ہرسٹ چلیں گے' بے چاری نرملا کو دیکھئے) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بدماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لیے تھے۔س کے علاوہ رکھ رکھاؤ' سلیقہ' نفاست' بردباری' ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیو مالا' ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی' یا وہ لڑکی

جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈپلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور کون سی لڑکی کو لے کر تھیٹر دیکھنے جائے۔

پھر ایک روز کیمبرج میں فلسفی لڑکی روشن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ

لائبریری کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک پلیا پر بیٹھی مائیکل سے باتیں کر رہی تھی جو سائیکل پر سوار ایک پاؤں پلیا سے ٹکائے یہودیوں کی جلاوطنی کی نفسیات پر روشنی ڈالنے میں مصروف تھا۔ دفعتاً اس نے نرہ لگایا____ روش____ مگر روشن سوچ میں ڈوبی سامنے سے نکل گئی۔ چمپا احمد نے کندھے اچکائے۔

ہاں ڈون اسپنوزا۔۔ مائیکل نے کہا۔ دوسرے روز روشن سیاہ فریم کی پڑھنے والی عینک لگائے بڑے غور و خوض میں ڈوب کر سگریٹ پیتی کیم کے کنارے بیٹھی نظر آئی۔ چمپا کو وہ بہت اچھی لگی۔ اب چمپا اپنی دانست میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی جب انسان خود غیر متعلق ہو کر دوسروں کا مطالعہ کرتا ہے اور فراخ دلی سے دوسروں کو معاف کرتا رہتا ہے۔

روشن نے چمپا کو بڑے شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔ کسی لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ چمپا احمد عامر کی اولڈ فیم ہے۔ چمپا اگر یہ لفظ سن لیتی تو سوچ کر ہی اسے بڑی دہشت ہوتی۔ وہ بے حد تو بہ تلا کرتی اور کہنے والے کو صلواتیں سناتی کیونکہ اس قدر جدید بن جانے کے باوجود تھوڑا سا کھرچنے کے بعد وہ وہی خالص یو۔ پی کی باعزت مڈل کلاس لڑکی تھی جس کے تصورات اس قسم کی باتوں کے سلسلے میں بڑے قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور بہر حال وہ خود کو کسی کا اولڈ فیم کہلانا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اس نے اس کے باوجود ایک گھنٹے تک روشن اسپنوزا کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ روشن حکومت پاکستان کے کسی بہت اعلیٰ افسر کی لڑکی تھی اور اسے طرح طرح

کے وظائف ملے تھے اور یہاں بھی بہت قابل اور سنجیدہ مشہور تھی۔قصہ مختصر وہ ان ہونہار طلبا میں سے تھی جو بیرونی ممالک میں وطن عزیز کے نام میں چار چاند لگاتے ہیں اور پبلسٹی کے رسالوں میں اکثر جن کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔

ایک چھٹی کے روز وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک دیہاتی چاء خانے کے باغ میں بیٹھی تھی۔ایک اطالوی طالب علم انجلو سیب کے نیچے گٹار بجا رہا تھا۔قریب کی آرام کرسی پر مائیکل نیم دراز بڑی ادا سے سیب کی کلیاں سونگھنے میں مصروف تھا۔اس روز اس نے اناؤنس کیا تھا کہ وہ ترک وطن کر کے اسرائیل جا رہا ہے۔وہ کئی گھنٹے سے وطنیت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے تھک کر اب خاموش بیٹھے چاء کا انتظار کر رہے تھے۔میں یہ پیارا' ہرا بھرا خوبصورت انگلستان چھوڑ دوں گا اور اسرائیل کے ریگ زاروں میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بناؤں گا۔اس نے کہا۔سرل اسے دیکھا کیا۔ہاں' مائیکل' تم ضرور ایسا کرو گے۔مجھے معلوم ہے۔اس نے کہا۔یونیورسٹی کے کئی پروفیسر' سائنس دان' موسیقار اس وقت اسرائیل میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بنا رہے تھے۔

''وژن میں بڑی طاقت ہے۔'' ڈینس نے کہا۔''ذرا شاعروں کی شاعری دیکھو۔''

''طاقت تباہ کن ہوتی ہے۔'' سرل نے منہ لٹکا کر کہا۔سامنے چاء خانے کے پھاٹک پر ایک کار آن کر رکی۔گوتم نیلمبر' کمال اور طلعت اور چند اور لوگ اتر کر چاء خانے کی طرف بڑھے۔انہوں نے اور چرڈ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھا۔

گوتم نیلمبر بھی بڑی تباہ کن طاقت ہے کیونکہ اس کا وژن سب سے زبردست

ہے۔نہرو کا ہندوستان۔اینجلو نے کہا۔

''جدید تصورات میں شاونزم خطرناک ترین تصور ہے۔''سرل نے مائیکل سے کہا۔''تمہاری صیہونیت'پاکستانیوں کا اسلام'ہندوستانیوں کی گپتا عہد کی تجدید ''۔

''گوتم شاونسٹ نہیں ہے۔''سریکھا بولی۔''وہ صرف امن کا خواہاں ہے'جس میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی ہو سکے۔ہم مذہب ہو سکے۔ہم مذہب کی لائنز پر نہیں سوچتے۔ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ'جن کے خیالات کی اہمیت ہے'پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی کے درپے ہیں۔ہند کا کسان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔زمینداری کے خاتمے کے بعد سے'آ کر دیکھو'اس کی حالات کتنی سدھرتی جا رہی ہے______ہمارا______''

''تم تو انڈیا ہاؤس کے کسی پمفلٹ کی زبان میں گفتگو کر رہی ہو''سرل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

''اقتصادی ترقی سے مذہب کا کیا تعلق یہ بات پاکستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی ''،گلشن نے کہا۔

''امریکہ اسلام کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔آج کل ترکی میں قرآن شریف کے نسخے چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہا ہے۔جس طرح نپولین اور مسولینی اسلام کے بڑے زبردست خیر خواہ تھے۔''ڈینس نے کہا۔

''پاکستان کا اسلام______''مائیکل نے کہا۔

''تم تو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو''روشن نے مائیکل سے کہا۔

''نفرت کی نفسیات ______ ''ڈینس نے کہنا شروع کیا'' ''آج کی دنیا نفرت کے تانے بانے پر زندہ ہے۔ جیرس نے بالکل غلط کہا تھا کہ دنیا محبت پر قائم ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم سب درندوں کی طرح ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔''

''میں درندہ ہوں؟'' مائیکل نے اداسی سے پوچھا۔ ''میں صرف حیفہ جا کر سڑکیں کوٹنی چاہتا ہوں۔''

''تم سب کو کوا کرز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گاندھی کا مطالعہ کرو'' ڈینس نے کہا۔

''ذرا گوتم کو بلا کر پوچھو جو ہر وقت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔'' روشن نے جذبے سے کہا۔

''اور پاکستان اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔'' سریکھا نے جواب دیا۔

''اگر صرف ایک روز کے لیے ساری دنیا میں پروپیگنڈے کی مشینری رک جائے تو کتنا سکون ملے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا۔

''یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم سب کو تو صبح شام گوئبلز کی تصویر پر پھول چڑھانے چاہئیں۔ تم گاندھی کی بات کرتے ہو' ہمارے عہد کا سب سے بڑا پیغمبر گوئبلز تھا۔ ڈاکٹر گوئبلز زندہ باد'' گلشن نے کہا۔

''دراصل'' ڈینس نے بات شروع کیا'' ''ہم سب غیر شعوری طور پر فاشٹ ہیں۔ ہم سب تباہی اور موت کے خواہاں ہیں۔ میں رومان پرستوں کی 'موت کی خواہش' کے معنی خوب سمجھتا ہوں۔''

''میں تو نہیں چاہتی کہ یہ خوبصورت اور چرڈ تباہ کر دیا جائے۔'' چمپا نے

دہشت کے ساتھ کہا۔

''ہم سب چھپے ہوئے فاشٹ ہیں۔ہم سب کے ہاتھ میں غیر مرئی مشین گنیں ہیں جن کا رخ ہم نے دوسروں کی سمت کر رکھا ہے۔خیالات کی مشین گنیں۔صرف بوڑھی عورتیں امن چاہتی ہیں لیکن دنیا کو بوڑھی عورتوں کی ضرورت نہیں۔''اس نے چمپا کو دیکھا۔وہ اسے ایک بوڑھی رنجیدہ ماں کی طرح نظر آئی۔

''مجھے ہمیشہ تباہ کیا گیا۔'' مائیکل نے سر اٹھا کر کہا۔''لیکن میں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انبار میں بیٹھ کر تمہارے لیے موسیقی کمپوز کی اور خیالات کی قندیلیں روشن کیں۔میں درندہ ہوں؟ میں صرف __________''

''سڑکیں کوٹنی چاہتے ہو______''ڈینس نے بات کاٹی۔''ہم تم کو اس کی اجازت دیتے ہیں مائیکل۔تم اپنے وژن کے راستے پر چلو۔''

''دوسروں کے وژن میں مخل ہو کر اس کو برباد کرنے کی خواہش سب سے بڑا گناہ ہے۔دس احکام میں اس گناہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔''سرل نے کہا۔''میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔''

انجلو نے گٹار ایک طرف رکھ دیا۔مائیکل تم یہودی ہو لیکن تم انگریزی بھی ہو۔تم نے اپنے بمبار طیارے پر آ کر میرے خوبصورت شہروں کو برباد کیا تھا لیکن میں تم کو معاف کرتا ہوں۔

''مائیکل''سریکھا نے کہا''تم یہودی ہو لیکن تم انگریز بھی ہو لہٰذا خود کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔اب تم بڑے ذوق و شوق سے ایشیائی بننے جا رہے ہو کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری جڑیں فلسطین میں ہیں۔حالانکہ تمہاری جڑیں دراصل ہمپسٹیڈ

میں ہیں۔لیکن ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔روشن! مائیکل ایشیائی بننے جارہا ہے' اسے خوش آمدید کہو۔''

''میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں مسلمان ہوں لہٰذا مجھے اسے قابل نفرت سمجھنا چاہیے۔یہ سب زبردست گھپلا ہے۔''اس نے میز پر پانا سرکا دیا اور پیالیوں کے نقش ونگار کو دیکھنے لگی۔

''تمہیں سریکھا سے نفرت کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہندو ہے۔''

''ہاں۔''

''لہٰذا روشن مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔''مائیکل نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا۔

''ہندوؤں نے تم کو ہندوستان سے نکالا۔''

''میں نے نہیں نکالا'یہ خود نکلی۔''سریکھا نے احتجاج کیا۔

مائیکل سنی ان سنی کر کے کہتا رہا:''تمہاری طرح ہم نے بھی ایک نیشنل ہوم لینڈ بنالیا تو ہم کیوں قابل گردن زنی ہو گئے؟''

''تم ______ تم نے عربوں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں سال سے رہتے آئے تھے۔''

''تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔''

پھر بڑی غمگین خاموشی چھا گئی۔درختوں کے جھنڈ میں تیتریاں اڑ رہی تھیں۔ سامنے ندی پر سے ایک کشتی گزر گئی۔انجلو نے پھر گٹار کا بجانا شروع کر دیا۔

۱۷

گوتم نیلمبر اور اس کے ساتھی کار سے اتر کر چاء خانے کے اندر چلے گئے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر انہوں نے لسٹز کی ورق گردانی کی اور چاء منگوائی اور گوتم نے چند خط ویٹرس کو پوسٹ کرنے کے لیے دیے۔ وہ لندن سے آ رہے تھے اور مڈ ہرسٹ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ بل تھا اور خوبصورت برنارڈ جو اسکول آف اکنامکس میں استاد تھا اور شانتا' طلعت اور نرگیش۔ وہ لوگ بھی کوئی آفاقی مسئلہ حل کرنے میں مصروف تھے۔ کمال نے دریچے سے باہر جھانکا جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلان پر ندی بہہ رہی تھی۔ بید مجنوں اور پرم روز کے پتوں میں سے ایک سفید لانچ نظر آ رہا تھا جس پر اس کا نام "کلا راجین" لکھا تھا۔ امن امن۔ کمال نے دہرایا۔ گوتم نے اسے دیکھا۔

"باہر چمپا باجی اور سرل وغیرہ بیٹھے ہیں۔" طلعت نے دریچے میں آ کر کہا۔

نرملا کے لیے میں اینگس ولسن کی کتاب ولسن کی کتاب لانا بھول گیا" بل نے کہا۔ شانتا پیالیوں میں چاء انڈیل رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نرملا کو دیکھنے جا رہے تھے اسے اب سینی ٹوریم میں تیسرا سال تھا۔ اس کے ایک پھیپھڑے کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کے معالج سر رونلڈ گرے کا خیال تھا کہ ممکن ہے اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے ہفتے کے روز اس کے دوست لندن سے اسے دیکھنے کے لیے آتے گوتم بھی برابر' جب اسے فرصت ملتی' کملا اور طلعت کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے جاتا اور پابندی

سے اسے رسالے اور کتابیں بھیجتا۔ اس کے آپریشن کے موقعے پر ہری شنکر بھی واشنگٹن سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ گوتم بڑی لگن سے نرملا کا خیال کرتا اکثر جب کمال ہفتے کے روز مڈہرسٹ نہ پہنچ سکتا تو گوتم کو تار دے دیتا۔ گوتم سب کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا۔ وہ اور نرملا چمپا کا ذکر کبھی نہ کرتے۔ زندگی اس قدر گنجلک، اتنی مصروف اتنی بے ریچ اور غیر منطقی تھی کہ انسان سارے شناساؤں اور جاننے والوں کے ساتھ نباہ نہ کر سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

گوتم اب بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کی فارن پالیسی، اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر دو کتابیں لکھی تھیں جن کی دھوم مچ گئی تھی۔ وہ اب بہت بڑا سے لے بریٹی تھا۔ کامیاب اور ہر دلعزیز ________ متوازن اور سلجھے ہوئے خیالات کا مالک۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ جذباتی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ''۴۷ء میں ہم نے کیا کیا۔ ہم بیمار لوگ تھے۔ اب ہم اپنے ذہنی عارضوں کا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم کو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تندرست ہو جائیں۔ پھر ہم سے مذہب اور روحانیت اور گیتا کی گفتگو کرنا۔ مجھے بھی گیتا بہت پسند ہے لیکن مجھے فی الحال پانچ سالہ پلان زیادہ پسند ہے۔ اس کی رپورٹوں کی تلاوت سے مجھے نسبتاً زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔'' وہ کہتا

ہے مارکیٹ کے رائٹرز کلب میں بیٹھے ہوئے اکثر کوئی برطانوی جرنلسٹ اس سے سوال کرتا! ''گوتم تمہاری کوئی ذاتی زندگی بھی ہے یا نہیں۔ تم تو بالکل کرشنا مینن بنتے جا رہے ہو۔''

''مجھے خطرہ ہے کہ گوتم لیڈر بن جائے گا۔'' سرل کہتا۔

"گوتم لیڈر نہیں بنے گا بہت بڑا اسٹیٹس مین بنے گا' وہ ایک بے حد صاحب نظر انسان ہے۔" کمال فخر سے کہتا۔

۴۷ء نے ذہنوں کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی۔ گوتم اور کمال بدلے ہوئے عالمگیر حالات بین الاقوامی سیاسی جرائم اور ریاکاری اور بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے اس عظیم الشان دورِ جدید سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ گوتم کے سیکولر خیالات کی وجہ سے ہندو شاونسٹ اور مہاسبھائی نظریات کے لوگ اس سے خفا تھے۔ کمال کی قوم پرستی اور صاف گوئی نے اسے کہیں کہ نہ رکھا تھا۔ اس کے بیشتر مسلمان دوست اور رشتے دار پاکستان جا چکے تھے مگر وہ مصر تھا کہ انگلستان سے ہندوستان ہی واپس جائے گا۔ لندن اور کیمبرج کے پاکستانی طلباء اسے انڈیا ہاؤس کے گوتم نیلمبر کا اسٹوج کہتے۔ یہ سب سن کر اس کے دل پر چھریاں چل کر رہ جاتیں۔

نرملا کی بیماری نے' جو اسے طاعت کی طرح عزیز تھی' زندگی کے متعلق کمال کا سارا رویہ بدل دیا تھا۔ اسے دفعتاً احساس ہوا تھا کہ زندگی اور موت میں بال سے زیادہ باریک حد فاصل قائم ہے۔ زندگی ایسی شے نہیں کہ اس سے مذاق کیا جائے۔ انسان بہت عظیم ہے۔ اس کا دل کائنات کی سب سے قابل قدر چیز ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ عیسائی یسوع مسیح کی تصاویر میں ان کے دل کو کیوں اس قدر نمایاں کرتے ہیں' دل کی تصویریں کیوں بناتے ہیں جس میں کانٹے چبھتے ہیں۔ ہاں' دوسروں کا دل دکھانا کیوں سب سے بڑا گناہ ہے!

نرملا کی بیماری نے گوتم کی ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ نجی جہنم' جو انسان کی روح ہے' اس میں کیسی کیسی دنیائیں آباد تھیں'

ان میں کون لوگ بستے ہیں؟ آفاق کے اس کے اس کونے میں، جہاں پر ''گوتم نیلمبر'' کو بورڈ لگا ہے، کیسی کیسی آندھیاں چلتی ہیں، اس گھر میں (جس طرح کا گھر ہر نوجوان کے دل میں ہوتا ہے) کون لڑکی بیٹھی ہے۔ ہر نوجون جو صرف ایک بار اس کے گھر کے دروازے وا کر کے صرف ایک لڑکی کی مانگ میں سیندور لگتا ہے۔ مگر اس نوجوان کا اسرار کون جانے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔ اس کے دل میں دراصل کون ہے، شاید اس کو بھی معلوم نہیں، یا شاید معلوم ہو۔ دوسرے جاننے والے کون!

اور اس بال سے زیادہ باریک پل پر، جسے زندگی کہتے ہیں'' نرملا کھڑی تھی۔ زندگی سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ دل جو بہت عظیم شے ہے اس سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔

گوپی کا دل جو ساری کائنات کا مرکز ہے۔

''چمپا باجی باغ میں بیٹھی ہیں۔'' طلعت نے دریچے میں جا کر دہرایا۔

''چلو ان سے ملتے چلیں۔ عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

گوتم نے گھڑی دیکھی۔ ''نہیں۔ اب سیدھے مڈ ہرسٹ چلو۔ ورنہ ہمیں واپسی پر دیر ہو جائے گی۔''

وہ سب چاۓ خانے کی لاؤنج سے نکل کر کار میں جا بیٹھے اور مڈ ہرسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

چمپا نے دیکھا کہ کارزن سے چاءخانے کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ انجلو درخت کے نیچے بیٹھا گٹار بجایا کیا۔ روشن' مائیکل' ڈینس' سریکھا اور گلشن میز سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف جا چکے تھے۔ چمپا نے آرام کرسی پر سے جھک کر گھاس کی ایک پتی توڑی۔

''کیا سوچ رہی ہو۔'' سرل نے پوچھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ایک رسالہ چہرے پر رکھے مقابل کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''وہ تمہارے دوست لوگ جارہے تھے' کار میں۔''

''ہاں۔''

''میں نے دیکھا ہے کہ تم کراؤڈ سے خود کو مماثل بھی نہیں کرنا چاہتیں مگر کراؤڈ کی چاہت بھی بہت ہے۔ ایک عجیب قسم کی وفاداری۔ اس لیے کہ تمہارا اور ان کا ماضی مشترک رہا ہے۔ تم عجب مجموعہ تضاد_______'' سرل نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ ''میں تم کو دیکھتا ہوں تو بہت اداس ہوتا ہوں۔''

''اطالویوں کی طرح باتیں مت کرو۔'' چمپا نے کہا۔

''یہ بھی تمہارے ساتھ ایک اور مصیبت ہے۔ ذاتی سطح تک پہنچتے ہی تم زور سے دروازہ بند کر دیتی ہو_____بزدل_____ تمہیں اپنی بزدلی اور کمزوریوں کا علم ہے؟'' وہ کرسی اتر کر درخت کے تنے سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''اکثر جھوٹ بولتی ہو۔ حاسد ہو۔ دوسروں کی مسرت کو رشک سے دیکھتی ہو۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ دوسروں کو خود سے بہتر نہیں

دیکھنا چاہتیں۔" وہ کہتا رہا۔ "مثال کے طور پر ________ تمہیں روشن پسند نہیں کیونکہ وہ یونیورسٹی میں تم سے زیادہ مشہور اور ہر دلعزیز ہے۔ تم لکھنؤ میں مشہور رہی ہوگی مگر وہ ۱۹۴۲ء تھا اور تم بھولتی ہو کہ اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں اور روشن تم سے دس سال چھوٹی ہے چمپا۔ وقت کا سب سے بڑا کمینہ پن یہ ہے کہ ہم ابھی اس چیز کے لیے تیار نہیں ہو پاتے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ نکل چکا۔ چمپا! خدا کرے تم شنیلا مکرجی کبھی نہ بنو۔"

"شنیلا مکرجی؟"

"ہاں۔ میں تم کو ایک انسٹی ٹیوشن میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ چمپا احمد' جو آج سے دس سال بعد چیلسی کے ایک فلیٹ میں آرٹسٹوں اور ذہن پرستوں کی سرپرست اور گرو ہوگی۔ خداوند ________ یہ بڑا وحشت ناک خیال ہے۔"

"میں اس قدر قابل رحم ہوں؟"

"نہیں۔ ہم سب قابل رحم ہیں۔ تم ان ساری باتوں کے باوجود بہت پیاری ہو۔ تم نیک دل ہو۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور شاید تم میں دوسروں کو معاف کرنے کی اہلیت بھی ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں شاید"

وہ خاموش ہوگیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر چاء خانے کے لاؤنج میں آ گئے۔ روشن اور مائیکل اوران کے ساتھ دور لانچ پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر چند ردی کاغذ اور اخبار رکھے ہوئے تھے جو گوتم نیلمبر وہاں بھول گیا تھا۔

''تم دوستی کر سکتی ہو۔'' سرل کہتا رہا۔ ''ورنہ باقی تم سارے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہو۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کی طرح۔'' اس نے بے دھیانی سے خالی لفافہ اٹھایا جس پر گوتم کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو توڑ موڑ کر آتشدان میں پھینک دیا۔

''سرل، میں اتنی تیز روشنی میں ہوں، جتنی تم نیا بھی ظاہر کی؟''

''ہم سب اسی تیز روشنی میں موجود ہیں۔'' اس نے صوفے پر سے ایک رسالہ اٹھایا۔ اس پر بھی گوتم کا نام چھپا تھا۔

''تم اسے بہت زیادہ چاہتی ہو نا؟'' اس نے رسالہ چمپا کی طرح پھینک دیا۔

ایک وقت تھا خود گوتم نے اس سے عامر رضا کے متعلق اسی قسم کے امتحانی سوالات کیے تھے۔

''لیکن وہ تم سے ملتا کیوں نہیں؟'' اس نے دوبارہ کہا۔

''پتا نہیں۔ مجھ اس سے ملنے کی فرصت کہاں ہے۔''

''تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔''

وہ ایک اونچی چوٹی پر کھڑی تھی اور ساری دنیا اس کے رتی رتی احوال سے واقف تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح کیوں بکھرنے دیا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ سارا زمانہ نکل چکا______ سارا زمانہ______

باہر بارش میں چند اور موٹریں آ کر رکیں۔ چند مشہور شیکسپیئرین اداکار لاؤنج میں داخل ہوئے وہ اپنی تمثیل لے کر کسی تہوار کے لیے برابر کے گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایکٹر سرل کو جانتا تھا۔ وہ سب آتشدان کے قریب

جا بیٹھے۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

۳ے

ڈ ہرسٹ کا عظیم الشان اور پر فضا سینی ٹوریم سینکڑوں ایکٹر پر پھیلے ہوئے معطر جنگلوں اور باغوں میں گھرا، سکون سے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے بشاش اور خوبصورت ماحول میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے اور مسکراتے ہوئے ہمدرد چہرے۔ شفاف، طویل گیلریاں۔ حسین ڈرائنگ رو۔ جھلملاتا ہوا اوڈی ٹوریم جہاں مشہور تھیٹر کمپنیاں آ کر مریضوں کے لیے تمثیلیں اسٹیج کرتیں۔ اس دل آویز جنت میں لوگ آرام سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اپنے خاتمے کا انتظار کرتے یا کسی دوسری طرح کے خاتمے تک کے وقفے کے لیے پھر باہر کی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ عمارات کے ایک ونگ میں سرے پر نرملا کا کمرہ تھا جس کے تین طرف باغ تھا۔ یہ میرا کمرہ آئی ٹی نشاط محل ہوسٹل کے کسی کمرے کا ایسا ہے نا۔ نرملا نے طلعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماضی سے منسلک کرتی جاتی تھیں۔ (سوئیٹزر لینڈ نینی تال تھا۔ لیک ڈسٹرکٹ دہرہ دون کی طرح تھی لندن میں بمبئی کی جھلک تھی)۔ ماضی محفوظ تھا کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی، کسی حادثے کا امکان نہ تھا۔

نرملا تکیوں کے سہارے نیم دراز خوشی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ ''اب مجھے لندن کی تازہ خبریں سناؤ۔''

''اچھا۔'' طاعت اچک کر دریچے میں بیٹھ گئی۔ اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

شائستا' کمال اور ربل کے ساتھ' نرملا کے پلنگ کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ گوتم پھولوں کے بڑے واز کے نزدیک کونے میں بیٹھا برنارڈ سے باتیں کر رہا تھا۔

''گوتم جی'' نرملا نے اسے مخاطب کیا'' اب ہندی سماچار ہو جائیں۔'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے دریچے میں جا بیٹھا۔

''مجلس میلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' نرملا نے طاعت سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''بڑے زوروں میں۔'' طاعت نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے لیے وہ سب خاموش ہو گئے۔ ہر سال نرملا مجلس کے سالانہ میلے کی تیاریوں میں پیش پیش رہا کرتی تھی میلے میں اس کی غیر موجودگی کا یہ تیسرا سال تھا۔

''بس صرف اس اگست میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔'' کمال نے کہا'' اگلے سال انشاء اللہ تم پھر میلے کی لیڈری کر رہی ہو گی۔''

''انشاء اللہ'' نرملا نے مسکرا کر کہا۔

''کل بھیا صاحب سے ملے تھے۔'' گوتم بولا۔ ''کہتے تھے کہ شاید آج تمہارے پاس آئیں۔''

''وہ تو مجھے کئی بار دیکھنے کے لیے آ چکے ہیں بے چارے۔'' نرملا نے کہا۔'' ان کی لڑکیوں کی صورت حال کیسی چل رہی ہے۔''

''ٹھیک چل رہی ہے۔ روشن آرا ______ '' طاعت نے کہا۔

''پھر اسکینڈل شروع ہوئے۔'' کمال نے ڈانٹا۔

''نہیں۔ میں تو اس کے بعد ابھی پروفیسر ٹوئن بی کا ذکر کرنے والی تھی۔'' طلعت نے ذرا سہم کر کہا۔

''تم نے ان کو میلے میں بلایا ہے۔'' گوتم نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''یہ اچھا ریکٹ ہے۔ برطانیہ کے ان سب جغادری انٹلکچولز کو اپنی محفلوں میں بلا بلا کر وہی بڑے کھلاتی ہوا اور اس طرح ہندوستان کے لیے ان کی موافقت حاصل کرتی ہو۔ وہی بڑا ڈپلومیسی۔'' بل نے ہنس کر کہا۔

''وہی بڑا اور بھرت ناٹیم۔ انہی حرکتوں سے پاکستان ہاؤس والے جلتے ہیں۔'' گوتم نے کہا۔

''اب رام گوپال کے مقابلے میں انہوں نے بلبل چوہدری کو کھڑا کیا ہے۔'' برنارڈ بولا۔

''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کہ بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور رام گوپال اور بلبل اس میں کشتی لڑنے کے لیے اتر رہے ہیں۔'' طلعت نے اداسی سے کہا۔

''تمہاری یہ تشبیہ'' گوتم نے کہا ''بالکل صحیح ہے۔ سب سے بڑی ٹریجڈی وہ ہے جب فن کاروں کو غیر فنی اغراض کے لیے استعمال کیا جائے''

''ہم نے میلے میں اسپنڈر کو بھی بلایا ہے۔'' طلعت نے منہ لٹکا کر کہا۔

''یہ بکے ہوئے اور خریدے ہوئے انٹلکچوئر کا دور ہے۔'' گوتم نے کہا۔ ''اس عہد میں آرٹسٹ کی بڑی بھاری قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ کون کہتا ہے کہ دنیا

آرٹسٹ کی قدر نہیں۔ دیکھو ایشیا کے فن کار لوگ کسی طرح فل برائٹ اور طرح طرح کے وظیفوں پر دھڑا دھڑ امریکہ چلے جا رہے ہیں۔''

''ایشیا کے فن کار لوگ تو دھڑا دھڑ سوویٹ یونین اور چین بھی جا رہے ہیں'' بل نے کہا۔ وہ بڑا سخت غیر جانبدار تھا۔

باہر دیودار کے جنگل پر شفق کی روشنی چھا گئی۔ عمارت کے مختلف کمروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

''اب چلیں۔'' گوتم نے کہا۔ ''لندن واپس پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی''

''تم سب جا رہے ہو'' نرملا نے یک لخت دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔''

''تم اکیلی نہیں ہو نرمل'' کمال نے اس کے پلنگ پر جھک کر کہا۔ ''ہم سب ہر سے تمہارے ساتھ ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اگلے ہفتے تک کے لیے خدا حافظ نرملا'' طلعت نے اس سے کہا۔

''نرمل' شاید میں اگلے ہفتے نہ آسکوں۔ پنڈت جی کسی کانفرنس کے لیے دلی سے آ رہے ہیں۔ بڑی سخت مصروفیت رہے گی۔'' گوتم نے نرمی سے کہا۔

''ہاں گوتم' تم میرے کارن اپنے کام میں حرج نہ کیا کرو۔'' نرملا نے رسان سے جواب دیا۔

وہ سب گیلریاں عبور کر کے باہر آ گئے۔ دور ونگ کے روشن دریچے میں سے

نرملا ان کو دیواروں کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔

۴ے

طلعت کا فلیٹ سینٹ جانز ووڈ میں تھا۔ اس کے نزدیک ہی شانتا اور بل رہتے تھے۔ آس پاس اور بہت سے مشہور مصنفوں اور اداکاروں کے مکان تھے۔ بہار کا موسم آتا تو ان مکانوں کے پائیں باغ پھولوں سے بھر جاتے۔ شفاف سڑک پر سے سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر زسکون سے گزرتی رہتیں۔ چوراہے کی گرو سر اور تمباکو فروش کی دکانوں میں خریداروں اور دکانداروں کے درمیان نپی تلی گفتگو جاری رہتی۔ آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا اطالوی ریستوران تھا۔ اس میں ایک داڑھی والا پولش یہودی آرٹسٹ اپنے کونے میں بیٹھا اسکیچ بناتا نظر آتا۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتا کہ کوئی اس سے اس کے اسکیچ خرید لے گا۔ کوئی اس سے اس کی تصاویر نہ خریدتا۔

سینٹ جانز ووڈ کے ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کی ذہنی زندگیاں بڑی طوفانی تھیں۔ محبتوں' طلاقوں' نفسیاتی الجھنوں' کشمکشوں اور سیاہ قہوے پر یہ لوگ اپنی زندگیاں بتاتے تھے۔ ان کے نشست کے کمرے انتہائی آرٹی انداز میں سجے تھے۔ لڑکیاں بالوں کی پونی ٹیل بناتی تھیں اور سیاہ رنگ کی تنگ موری والی پتلونیں پہنتی تھیں۔ اپنے والدین سے نفرت کرتی تھیں۔ اور اپنی سائیکو انالسس کرواتی تھیں۔ اکثر مرد اداکار اور ادیب 'ہومو' تھے۔ یہ کامیاب اور دولت مند

فنکاروں کا محلّہ تھا۔ یہ لوگ قدیم ایشیائی تہذیبوں، بازنطیم، رومن کیتھولک چرچ اور گپتا عہد کے آرٹ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ برطانیہ کی ذہنی ارسٹوکریسی تھی۔

چند فرلانگ پر سریکھا کا مکان تھا۔ اس کا شوہر گلشن آہوجہ اسکول آف اکنامکس میں تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی لاہور کے شرنارتھی تھے اور دلی سے یہاں تعلیم کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سریکھا رقاصہ کی حیثیت سے بہتر شہرت حاصل کر چکی تھی اور رائل اکیڈمی آف آرٹ میں کریوگرفی سیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب میاں بی بی چوپڑہ رہتے تھے۔ اشا سنگتراش تھی۔ ستیش چوپڑہ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ بدھ کے روز ان کے یہاں ہندی کے حلقہ ارباب ذوق کا اجتماع ہوتا۔ چیلسی کی ایک عالیشان موڈرن بلاک میں کملا کا الٹرا ماڈرن فلیٹ تھا۔ کملا طلعت اور نرملا کی بچپن کی ساتھی تھی۔ قیامت کی ذہین اور بڑی زبردست انٹلکچول تھی اور بے حد خوش شکل لڑکی تھی کلاسیکل رقص کی ماہر، وہ فارن سروس میں تھی۔ نرگیش بمبئی کے کسی کروڑ پتی کی لڑکی تھی۔ کیمبرج کی تعلیم یافتہ۔ دوسری پارسی لڑکیوں کی طرح مغربی لباس پہنتی۔ وہ بھی کہیں ملازم تھی اور کسی انگریز سے شادی کرنے والی تھی۔ کملا کی بڑی بہن شکنتلا کا مکان نائیٹس برج میں تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک اور بہت اونچے پائے کی انٹلکچول تھی اور بے حد دلکش اور پیاری لڑکی تھی۔ اس کے شوہر انڈیا ہاؤس میں پبلک ریلشنز آفیسر تھے۔ فیروز جبیں یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کر رہی تھی اور ریجنٹ پارک میں رہتی تھی۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں تھی اور اوسٹرلی میں اپنے والدہ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد دلی میں تھے۔ ان سب کی بڑی مصروف زندگیاں تھیں۔ یہ سب اپنے

اپنے مقاصد کی تکمیل میں جٹے تھے۔ صرف نرملا سریواستوا اس ہنگامے سے الگ مدہرسٹ میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا خیال کر کے طلعت کا دل ڈوب جاتا۔ اس کو مسرت اب کس طرح حاصل ہو گی؟ نرملا، جس کو اور سب کی طرح زندگی سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ خوشی بے حد عظیم چیز ہے لیکن بے حد اضافی۔

طلعت دوسروں کی خوشی سے خوش ہوتی تھی۔ سریکھا کے ڈانس کے بعد کئی مرتبہ آنکور، ہوتا یا گوتم کی کتاب کا نیا ایڈیشن نکلتا یا کملا کی کسی اخبار میں تعریف چھپتی تو اس روز طلعت کی عید ہو جاتی وہ دوسروں کے غم سے غمگین ہوتی تھی۔ وہ چمپا کا خیال کر کے بھی کافی ملول ہوتی۔ اکثر وہ انگریزی میں ایک زبردست ناول لکھنے کا وقتاً فوقتاً اعلان کرتی رہتی مگر کاہلی اور مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو پاتا۔ دن بھر اور اکثر رات گئے اخبار کی رپورٹنگ کے سلسلے میں دوڑنا دھوپنا پڑتا اور اس میں طرح طرح کے ایڈونچر ہوتے۔ اسے عموماً سے لے بر ٹیز کے انٹرویو کے لیے بھیجا جاتا جو قریب سے دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ بے حد معمولی انسان تھے۔ غیر معمولی انسانوں سے بے حد معمولی حالات میں ملاقات ہوتی۔

طالب علموں نے طرح طرح کی مصروفیات بنا رکھی تھی۔ ایک ایشین فلم سو سائٹی قائم کی گئی تھی جس میں ایک سے ایک بوگس ہندوستانی فلم دکھائے جاتے۔ انڈیا کلب میں نیٹو آرٹسٹوں کی نمائشیں ہوتیں۔ فیروز کے گھر کے پاس ہمراز بھائی رہتے تھے۔ ان کا مکان علی گڑھ کا ایکسٹنشن تھا۔ یہاں ہر وقت مشاعرے ہوا کرتے۔

بی بی سی والوں کی ساری زندگی باتیں کرتی گزرتی تھی۔ بعض اوقات یہ لوگ سارا سارا دن کنٹین میں بحثیں کرتے بتا دیتے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا۔ آل حسن اور اس کی بی بی کرشنا کا مکان بھی ایک اور گپ کا سنٹر تھا۔ کرشنا قانون پڑھ رہی تھی۔ آل بی بی سی کے ہندو سیکشن میں تھا۔ ترونا اور فیروز کے مکانوں پر لڑکوں اور لڑکیوں کا جھمگٹ رہتا۔ اس میں زیادہ تر بنگالی شامل تھے۔ یہی لوگ لندن مجلس کے روح ورواں تھے۔

طلعت ٹڈ ہرسٹ سے لوٹ کر اپنے فلیٹ پر پہنچی۔ اسی وقت اوجیت کا فون آیا: ''ہلو' سنو۔'' وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''دیکھو' یہ ٹیگور ٹیگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں۔ اب اقبال ایوننگ ہونا ضروری ہے۔'' (اوجیت خود بنگالی تھا۔ اسے ایک لفظ اردو کا نہ آتا تھا۔ پراگ میں اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔) طلعت نے رالف رسل کو فون کیا۔ یہ علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے۔ ''اقبال سنگھ سے کہہ دیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''ہاں'' طلعت نے جواب دیا۔ ''اور اوجیت نے تو انگریزوں کے جگر مراد آبادی کو بھی بلا یاہ ء۔''

انگریزوں کے جگر صاحب انگریزی کے غزل گو شاعر تھے۔ جگر مراد آبادی ان پر کچھ ایسا چپک گیا تھا کہ ان کا اصل نام اب کسی کو یاد ہی نہ رہا تھا۔ یہ انگریزی کے اچھے خاصے دوسرے درجے کے شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ روحانی طور پر سخت مسلمان تھے اور مشرق کے افلاس مین ان کو خدا کی قدرت اور روحانی برتری نظر آتی تھی۔

اب پھر ریہرسلیں شروع ہوئیں۔۔ ڈھاکے کا عطاء الرحمٰن' اقبال کے کلام

کے لیے موسیقی کمپوز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ فیروز اسکرپٹ تیار کرنے میں جٹ گئی۔ ترونا 'شیلا' پرمودا' او جیت اور سارے بنگالی اور کشمیری اور گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں نے گانے کے لیے صحیح تلفظ کی پریکٹس شروع کی۔

طلعت اور رمیش سنگوی مڈل ٹمپل کی لائبریری میں اقبال کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔

اقبال ایوننگ منعقد ہو چکی تو میلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

۷۵

لندن مجلس کا سالانہ میلا شروع ہوا۔ ہال کے اوپر کے زینے پر آ کر روشن نے نیچے کا منظر دیکھا۔ لڑکیوں نے دکانیں لگا رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں دہی بڑے اور کچوریاں بک رہی ہیں۔ بالکل امین الدولہ پارک کا نظارہ ہے۔ ''ہاکرز'' اپنے اخبار بیچ رہے ہیں۔ کمیونسٹ اپنا لٹریچر فروخت کرنے کے لیے آواز لگا رہے ہیں۔ سوشلسٹوں کا ایک گروہ اپنے پمفلٹ لیے کھڑا ہے۔

بل ایک ستون سے لگا چپ چاپ کھڑا تھا۔ ''ہلو روشن'' اس نے کہا۔

وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ہال میں چلے گئے جہاں مختلف ایشیائی ممالک کے اسٹال تھے۔ تصویروں کی نمائش۔ ایک طرف ڈوکومنٹری فلم دکھائے جا رہے تھے۔

دفعتاً خاموشی چھائی اور وہ سب گاتے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ پرمودا حسب معمول آرکیسٹرا کنڈکٹ کر رہے تھے۔

لائی سال چھے پیار بھرے ناواں ______

''کشمیر؟'' ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔

''کشمیر۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' روشن نے کہا۔

''یہ لوگ جو گا رہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں؟ مقبوضہ یا آزاد؟'' تماشائی نے سوال کیا۔

پوش مالہ کرناواں چھس

شالیمار گوشن چھس دوراداں ______

''دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبوضہ ہے۔'' گلشن نے کہا۔

بل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔

روشہ روشہ یزاں وچھ پوش کارواں

پوش مالہ کر ______

پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔

''یہ اتنے جوش و خروش سے گا رہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے؟'' ایک ٹوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔

''یہ؟ ہاں یہ دونوں بنگالوں کے رہنے والے ہیں۔'' طاعت نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

پون گھنٹہ گزر گیا۔ ٹوری اخبار نویس خفا بیٹھا تھا۔

''تم لوگ ہر وقت سیاسی گفتگو کیوں کرتے ہو؟'' ایک برطانوی ادیب نے

آہستہ سے کہا۔ اب تک وہ بڑی اداسی سے ان منظر کو دیکھتا رہا تھا۔

''ہم لوگ بے حد بدقسمت ہیں اس لیے۔'' طاعت نے ملول آواز میں جواب دیا اور پھر کسی کام سے اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔

اب ڈھولک بج رہی تھی۔

''پنجاب؟'' ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

''ہاں۔ پنجاب بھی وہیں۔'' قریب بیٹھے ہوئے سریکھا کے میاں گلشن آہوجہ نے اسے تلخی سے جواب دیا۔ ''اور سوال کرو، میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا۔''

____ دھرتی چی آمی ہی لے کر بھاگوان ____ دھرتی۔

شینا اور جادویا۔ سنگاتی گادویا ________ رانو پا کھر ________

یہ مرہٹی گیت تھا۔

پھر گجراتی کورس شروع ہوا:

ہے کھیتی واڑی وتی ____ جنگل تی جھاڑی وتی

ساگر تھی گرور تھی

سونی ساد آویا ____ اوہمیں سونی ساد آویا

فلیٹ اسٹریٹ کے نمائندے اسٹیج کے قریب فٹ لائٹس کے اندھیرے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سامنے کے جگمگاتے منظر کو دیکھا کیے

اسٹیج پر وہ گا رہے تھے۔

ہمیں جگ جگ کیرا اکنگال

بھانگی نرکونہ دوار

وتیاڈگ ایک تال

دھرتی پر آویا ___ او ہمیں دھرتی پر آویا ______

دیکھ دیکھا اورے اندھ

کارسین آویا

کارسین آویا- ___

پھر ہال کے وسط میں وہ سب گھیرا بنا کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے انٹرنیشنل شروع کیا۔

ہر جگہ جوانیاں ہیں گا رہی

ہنسی خوشی منا رہی

اور لا رہی وشومترتا ______

دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہان لیے

خطرہ ہو بلیدان کا ____ پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین

سکھ چین ______ سکھ چین ____

ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ روشن باہر آ گئی۔ یہ سب کیا بکواس ہے۔ ہجوم میں سے نکل کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے سوچا۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے گیتوں سے خون میں ایک لمحے کے لیے جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس قدر ہلڑ کیوں مچا رہے ہیں کیونکہ سب فنا ہے اور انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انسان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا

کر رہا ہے۔

''مس کاظمی'' کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ یہ ترونا تھی۔ پھر لڑکیوں کے ایک ریلے نے اسے آلیا جن سے بچ کر وہ اب باہر نکلی تھی۔

''روشن فیروز نے کہا'' ''نذرل دادا آ گئے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ کل صبح سے ہم ان کے لیے چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔ تم کو لینے کے لیے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ سمجھیں 'تیار رہنا؟''

طلعت اس کے نزدیک آئی۔ ''یہ کنجی لیتی جاؤ' میں شاید دیر سے آؤ۔ یا شاید سریکھا کے یہاں رہ جاؤں۔ صبح کو ضرور چلنا ساتھ۔ گڈ نائٹ۔''

وہ سب دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ وہ حسب معمول مصروف معلوم ہوتی تھیں۔ مصروفیت' تکمیل مقاصد کا ہنگامہ۔ ہجوم ندی کے پانی کی مانند چاروں طرف بہا کیا۔ کالج میں چھٹیاں تھیں اور وہ یورپ جاتے ہوئے چند روز کے لیے طلعت کے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ میڈ اویل کے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ اوپر آرہی تھی کہ اچانک اسے عامر رضا مل گئے۔ وہ کار میں اسی کی تلاش میں ادھر آرہے تھے۔

''تم کہاں تھیں؟ میں تمہارے سارے ٹھکانوں پر تمہیں ڈھونڈ آیا۔''

''میلے میں۔''

''میلہ؟ وہاں۔ میلہ ٹھیک ہے۔ آؤ۔''

وہ نکڑ کے اطالوی ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہودی آرٹسٹ انہیں دیکھ کر فوراً اپنے کاغذ پر جھک گیا۔

''روشن'' عامر نے میز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا 'تم بڑی غلطی

کر رہی ہو۔ تمہارے ابا کو تمہاری رپورٹ پہنچ جائے گی۔

''اوہ'' ـــــــ وہ ہنس پڑی۔ ''لیکن عامر ان لوگوں میں بہت سے میرے عزیز دوست ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات یا ان کی قومیت دوستی کے راستے میں تو حائل نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تمہارا نظریہ ہے۔'' عامر نے کہا ''لیکن زیادہ پریکٹیکل بنو اور اپنے نفع نقصان کا دھیان رکھو۔ تمہاری سرگرمیوں سے تمہارے والد کی ملازمت پر بھی اثر پڑسکتا ہے۔''

''اور شاید میری اور تمہاری دوستی پر بھی۔'' روشن نے معادل میں کہا۔ ''لیکن عامر ـــــــ میری کیا سرگرمیاں ہیں؟'' اس نے چڑ کر کہا۔ اس آدمی کو سمجھانا بیکار تھا۔ پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ یہ انسان' جسے وہ اتنے عرصے سے اپنا دیوتا تصور کر رہی تھی' ایک مختلف ہستی تھی ایک دوسرے جزیرے پر بیٹھا تھا' اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر وہ تیار ہوگئی کہ اس کے خیالات کی تابعداری کرے گی مرد کی تابعداری عورت کا فرض ہے۔ فلسفے یہاں بیکار تھے۔ مرد ہر حالت عورت کی مکمل اطاعت کا خواہاں ہے۔ یہ کامریڈ وامریڈ سب غلط بات ہے اور یہ عامر رضا بہر حال کامریڈ نہیں تھا۔ اب یک لخت اس کی سمجھ میں آ گیا کہ چمپا احمد سے اس کی کیوں نہ نبھ سکی۔ چمپا' اپنے خیالات میں' خواہ وہ کتنے ہی گنجلک کیوں نہ رہے ہوں' خودمختار رہنا چاہتی تھی لیکن شاید چمپا بھی مکمل طور پر خودمختار نہ تھی۔ کاش وہ چمپا سے پوچھ سکتی کہ وہ اب کس کے خیالات کی اطاعت میں مسروف ہے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ باہر ریسٹوران کے دروازے پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک

ہنگرین سازندے نے وائلن پر ''ہسپانوی باغ میں ایک رات'' بجانا شروع کر دیا تھا۔

''اسپین چلو گی؟ عامر نے پوچھا۔

''ہاں''

''جرمنی؟''

''ہاں' جہاں کہو گے چلوں گی۔ اس نے دل میں کہا۔ فلسفے اور آزادی افکار لغو بات ہے۔ اگر اس وقت طلعت یا کملا کو اس کے ان خیالات کا پتا چل جائے تو وہ فوراً اسے پھانسی پر لٹکا دیں۔ یہ سوچ کر وہ اداسی سے مسکرائی۔

عامر رضا نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔

دوسرے دن وہ لڑکیوں کے ساتھ قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کر کے طلعت کے فلیٹ واپس پہنچی تو اس نے ایک اجنبی کو موجود پایا جو اس کے انتظار میں نیچے باغ میں ٹہل رہا تھا۔

''آپ کے خلاف رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ کمیونسٹوں کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں''اجنبی نے کہا۔

''جی؟''وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''یہ غلط ہے؟''

''بالکل۔ وہ لوگ کمیونسٹ قطعی نہیں ہیں۔''

''آپ کو برابر ایک خاص گروہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہے''

''مگر یہ تو محض طالب علمانہ ہنگامے ہیں۔ ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

''جی!''

''آپ کا مطلب ہے'' وہ وہیں مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی ''کہ میں انسانی رشتوں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دوں؟ ان لوگوں میں سے بہت سے میرے عزیز ترین دوست اور ساتھی ہیں۔''

''انسانی رشتے؟'' اجنبی نے حیرے سے پوچھا۔ ''وہ کیا چیز ہے؟ رشتے صرف سیاسی ہوتے ہیں۔ انسانی رشتے کس چڑیا کا نام ہے۔ اس بے تکلفی کو معاف فرمائیے گا مس کاظمی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلسفوں اور آئیڈیلز نے آپ کو کہیں کا نہ رکھا اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فلسفے اور ادب عالیہ کی تعلیم آج کی دنیا میں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ آپ نے بزنس ایڈمنسٹریشن کیوں نہ پڑھا؟''

روشن غصے سے تلملا رہی تھی لیکن ہنس پڑی۔

''تشریف رکھیے'' اس نے دوسری سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔'' اجنبی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی قابلی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ ______''

''کہ میں غلط راستے پر پڑ گئی؟! میں آپ سے عرض کروں مسٹر ______''

''____ خان ____''

''مسٹر خان کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں؟''

''نہیں ہیں؟ اس کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟''

یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ خیالات جیسی غیر مرئی چیز کے متعلق کس طرح کوئی

ثبوت پیش کیا جا سکتا تھا۔ وہ فلسفے اور خیالات کی طالب علم‘ اس بے بسی پر بے حد تلملائی۔

اب امریکہ جانا گول سمجھو۔ اس رات پلنگ پر لیٹے ہوئے اس نے سوچا۔ (اسے آئندہ سال ہارورڈ جانے کے لیے فل برائٹ وظیفہ مل چکا تھا) دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد نیند آئی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ عدالتیں‘ سزائیں‘ جیل‘ بندوق‘ گولہ بارود‘ نعرے‘ رات بھر اس نے اس قسم کے خوفناک خواب دیکھے تھے۔

''آخر جن کو جیل بھیجا جاتا ہے وہ آسمان سے تو نہیں اترتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح ہی کے انسان ہوتے ہیں۔'' ناشتہ تیار کرتے ہوئے اس نے طاعت سے کہا۔

طاعت نے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

''تم مذاق سمجھ رہی ہو۔'' روشن نے جھنجھلا کر کہا۔

''بالکل نہیں۔'' طاعت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سوال یہ ہے'' روشن انڈے پھینٹتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی'' کہ ایک طرف روپیہ اور عزت اور شان و شوکت ہے اور سیکیورٹی اور دوسری طرف محض دھندلکا ہے‘ اور دھندلکے میں خواب نظر آتے ہیں۔''

''ہاں۔ ایک طرف سیکیورٹی ہے‘ دوسری طرف سیکیورٹی ایکٹ‘ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔'' طاعت نے کہا۔

سریکھا نے جلدی جلدی چاء پینے کے بعد گھنگرو باندھ لیے۔ وہ سب نذرالا سلام کے پروگرام کی ریہرسل کے لیے صبح صبح طلعت کے یہاں جمع ہو چکے تھے۔

''روشن'' گوتم نے اسے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر سوال کیا' تمہارا پروبلم کیا ہے؟ وہ حسب معمول پیغمبرانہ شان سے آ کر دیوان پر بیٹھ گیا۔

''ذہنی کشمکش۔'' بلعت نے مختصراً جواب دیا اور توس سینکنے میں مصروف رہی۔

''تو کیا ہوا؟ اپنے وطن واپس جاؤ۔ چند سال بعد وہاں ریوولیوشن آئے گا۔ اس میں تمہاری بڑی ضرورت ہوگی۔'' گوتم نے اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ روشن کو ہنسی آ گئی۔

''لیکن میں ریولیوشن نہیں چاہتی'' اس نے کہا۔

''وہ تو میں جانتا ہوں۔'' گوتم نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ جب ریوولیوشن آئے گا تب تم کام کرو گی۔''

''اسے غلط راستے پر مت لگاؤ۔'' طلعت نے کہا۔ ''پہلے ہی اس کی رپورٹ ہو چکی ہے۔ اسی طرح تم نے چمپا باجی کو ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیل ہو گئے اور دیکھو ان کا کیا ہوا؟''

''کچھ بھی تو نہیں ہوا' یہی افسوس ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا کچھ نہیں ہوتا۔ معلق رہتے ہیں' کہیں نہیں پہنچ پاتے' بہتے رہتے ہیں'' گوتم نے آہستہ آہستہ کہا۔

کیا اس وقت یہ چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ طلعت نے سوچا۔

''لیکن روشن تم اس سفارت خانے جا کر کہہ دو کہ تم کو ہم لوگوں سے کوئی

مطلب نہیں۔'' گوتم، روشن کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

''میں غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی ضمری پرستی پر اب تک بہت ناز رہا ہے مجھے تم لوگوں سے بہت بڑا مطلب ہے۔ تم لوگ میرے دوست ہو۔ میں دوستی کا مطلب سمجھتی ہوں' اس کی قدر وقیمت۔''

''مطالب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت دکھی ہوگی۔'' گوتم نے دفعتاً بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔ طلعت نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ یہ اس وقت چمپا کو یاد کر رہا ہے' اس نے دل میں دہرایا۔

''اجی انکار کرنے میں کیا رکھا ہے۔'' اس نے گوتم کا دھیان بٹانے کے لیے شگفتگی سے بات شروع کی۔ ''ایک سے ایک لوگ ایک زمانے میں ترقی پسند تھے۔ اعلان کر دیا کہ اب ترقی پسند نہیں ہیں اور دیکھو کیا مزے کر رہے ہیں۔'' اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ ''اور تم تو کبھی بھی ترقی پسند نہیں تھیں۔ نہ کل نہ آج ______''

''بھیا صاحب نے بھی تو مضامین لکھے تھے؟ فیروز نے سوچ کر کہا۔''

''مگر اب تو وہ بہ بانگ دہل کہتے ہیں کہ تائب ہو چکے ہیں۔'' طلعت نے جواب دیا۔

''بھیا صاحب کو لٹریچر میں بھی دخل تھا؟'' گوتم نے پوچھا۔

''جی ہاں' ایام جہالت میں۔ اب انہیں گیان حاصل ہو چکا ہے۔ ورنہ فارن سروس میں یونہی لے لیے جاتے۔'' طلعت نے کہا۔

''یہ ایام جہالب کب تھے؟'' گوتم نے سوال کیا۔

۳۹ء وغیرہ میں۔طاعت نے جواب دیا۔ ''ارے تم کو کیا معلوم۔ بہت بڑے انقلابی تھے ایک زمانے میں لکھنو کے اندر۔ چمپا باجی بھی سب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رشیدہ آپا کے یہاں بیٹھ کر یہ سب آزاد نظمیں لکھتے تھے۔''

''چمپا باجی اتنی پرانی ہیں؟'' روشن نے چونک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں ہوتیں'' ترونا نے کہا۔

''سدابہار ہیں'' فیروز نے جواب دیا۔

''دوستی محبت سے بلند تر شے ہے۔'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔ ''بہت سے لوگ یہ بات نہیں سمجھ پاتے۔''

''تم بھی اعلان کر دو جی'' طاعت نے پھر جلدی سے گفتگو کا رخ اصل موضوع کی طرف موڑا'' کہ مجھے ان موئے سرخوں سے کوئی مطلب نہیں۔''

''تم کہہ دو کہ تم سرخا سرخ فرخ آبادی کبھی نہ تھیں، نہ ہو، نہ ہو گی۔'' فیروز نے کہا۔

''دست صبا لائیے؟'' کورس ہوا۔

''جی ہاں۔'' انہوں نے کہا۔

سب آگ کے پاس جا بیٹھے اور ''دست صبا'' عقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی۔

''سمجھیں تم؟'' گوتم نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ ''بس تم جا کر کہہ دو، آئندہ ہم سب سے قطع تعلق کر لو گی۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ قطع تعلق کرنا دراصل بے حد آسان ہوتا ہے۔''

''تم سٹیون اسپنڈر کی طرح'' طاعت نے کہنا شروع کیا۔

''یہ بے بات انگریزی ادیبوں کا ذکر کیے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

'' فیروز بولی۔

''کیا کیا جائے۔ اپنی اپنی کمزوری ہے۔'' طاعت نے کہا اور بات جاری رکھی۔ ''تم ایک کتاب لکھنا کہ کس طرح تم کو ڈوپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر تم صاف بچ گئیں۔''

''تم نے فریڈم کا انتخاب کیا۔'' فیروز نے لقمہ دیا۔

''وغیرہ وغیرہ۔'' سریکھا نے کہا۔ اب تک وہ کمرے کے سرے پر کھڑی تلاانا کی پریکٹس کررہی تھی۔

''کیا بیوقوفی کی باتیں کررہی ہو تم لوگ۔'' تروتا نے پیانو پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''روشن تم جرمنی جارہی ہو کل؟''

''ہاں۔''

''تو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ہم لوگ بھی یوتھ فیسٹوں کے لیے کل جا رہے ہیں مشرقی برلین۔''

''مشرقی برلین میں کیسے جاسکتی ہوں؟'' روشن نے کہا۔

''کیوں؟'' ''تم میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ساری دنیا کے لوگ جاسکتے ہیں' تم نہیں جاسکتیں۔

''کمال یہ بھئی' فیروز نے سر ہلا کر کہا۔ ''ساری رامائن ہوگئی' آہ پوچھتی ہیں سیتا کون تھی؟ ارے یہی تو قصہ ہو رہا ہے۔''

''بکواس'' سریکھا نے کہا۔چلو روشن' یہ ایسا تجربہ ہے جو زندگی بھر کبھی حاصل نہ ہوگا۔''

''نہیں''

''ارے' کیا رکھا ہے؟ واپس آکر سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ کے خلاف تین چار مضمون لکھ دینا۔سب یہی کرتے ہیں۔''

''یہاں اتنی بے ایمانی ہے' اتنی ضمیر فروشی ہے۔روشن بیگم جس کا تم کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔'' گوتم نے کہا۔''آج کی دنیا میں تم اپنے ضمیر کو بچائے نہیں رکھ سکتیں۔''

وہ کوٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔

''ہم تم سے برلین میں ملیں گے۔'' روشن نے مسکرا کر کہا۔

''مغربی برلین میں۔'' روشن مسکرا کر کہا۔

''نہیں ہم تم سے مشرقی برلین میں ملیں گے۔''

''یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ **ملک** 'انسان' نظریے' روحیں' ایمان' ضمیر ______ ہر شے تلواروں کو سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں۔اس تقسیم شدہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے سرحدوں ہی پر مل سکتے ہیں۔روشن'' گوتم نے کہا' ''ہم تم سے مشرقی اور مغربی برلین کی سرحد پر ملیں گے۔''

''اگر اس وقت تم کو جیل نہ بھیج دیا گیا۔'' طاعت نے ہنس کر کہا۔

۷۶

بارش ختم ہونے پر چمپا اور سرل دیہاتی چاء خانے سے باہر نکلے۔ لانچ پر بیٹھ کر وہ سب کیمبرج واپس پہنچ گئے۔ راستے میں ندی ہرے بھرے کنجوں میں سے گزری جہاں گھنی شاخوں نے پانی پر چھت سی بنا رکھی تھی۔ یہ ٹرم کا آخری دن تھا۔ کل سے چھٹیاں شروع تھیں۔ چمپا نے سرل پر نظر ڈالی۔ ہر چیز کہی جا چکی تھی۔ اب کہنے کو کیا باقی تھا؟ ہر شے میں گھسا پٹا پن آ گیا تھا سرل اپنشلے میں بھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح جانتا تھا اور وہ اس سے اتنی اچھی طرح واقف تھی۔ کتنے رنج کی بات تھی۔ اب وہ کن جنگلوں میں جا کر چھپے گی۔ اپ بن اپ بن میں۔ چنچل مورے من میں کین کن پھرے شام وہ ریلنگ پر جھک کر ایک بہت پرانا گیت گنگناتی رہی۔ سریکھا نے ندی کی سطح کو دیکھا جو بہت پرسکون تھی۔ کنارے پر پہنچ کر وہ لندن کی طرف روانہ ہوگئی۔

اسے واپس پہنچ کر مجلس میلے کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے بعد وہ برلین جا رہی تھی۔ وہاں سے لوٹ کر اسے ٹی وی پر ناچنا تھا۔ پھر وہ رام گوپال کے ساتھ سارے یورپ کا دورہ کرنے والی تھی" گریٹ سریکھا دیوی ________ انڈیا اینا پاولووا۔ سرل نے تمسخر سے کہا۔ "خدا حافظ"

"خدا حافظ" سریکھا نے اپنے خلیق تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ وہ اسے رخصت کرنے کے بعد لکڑی کے بوٹ ہاؤس کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ سرل کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ چمپا کو اس قدر مانوس معلوم ہوا گویا کا شوہر تھا۔ اسے

ایک پھریری سی آئی۔ وہ اس کا نہیں کسی اور لڑکی کا شوہر تھا۔ اس لڑکی کو چمپا نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ منظر پر سائے پھر پھیل گئے۔ کشتیاں کنارے سے بندھی کھڑی تھیں اور موسم کی ساری خوشبوئیں اکٹھی ہو کر گلابوں کی چھاؤں میں پانی پر تیر رہی تھیں۔ آسمان پر سے مرغابیاں گزریں۔ گایوں نے آ کر پانی میں اپنا عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئیں۔ بوٹ ہاؤس کی بالکنی پر ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی۔ بہت سے لوگ پرم روز کی بیلوں کے کنارے کنارے چھتریاں اٹھائے پانی کی اور جا رہے تھے۔

''چمپا ـــــــ'' سرل نے ایک الٹی ڈونگی پر بیٹھ کر کہا ''مجھے اپنے پس منظر کے متعلق بتاؤ۔'' اس نے دیکھا کہ دور دیس سے آئی ہوئی یہ لڑکی اس کے سہارے وہاں بیٹھی تھی۔ وہ بے حد غیر محفوظ تھی۔ اپنے پس منظر میں شاید وہ محفوظ رہ سکے لیکن اس کی اپنی دنیا جانے کون سی تھی۔ دنیائیں برابر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ لڑکی اسے بے انتہا مانوس نظر آئی۔ روز مرہ اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ یکلخت بہت گھبرا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس لڑکی چمپا احمد سے ایک غیر مرئی بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اور اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔

''کیا تم بھی میرے متعلق ناول لکھو گے؟'' چمپا نے پوچھا۔

''نہیں اور کون لکھنے والا تھا؟''

''بل ـــــــ ولیم کریگ''

''نہیں۔ میں ناول نہیں لکھنا چاہتا۔''

''کیا میں تم کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہوں؟''

''تم عجوبہ روزگار نہیں ہو۔ تمہاری طرح کی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں۔ ذہین، حساس اور دلکش۔''

چنانچہ ان تین الفاظ سے میری وضاحت ہو جاتی ہے۔ چمپا نے دل میں کہا۔ اس نے آنکھ بند کر کے اپنا پس منظر یاد کیا۔ بنارس کا محلّہ' گھر۔ آنگن میں کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ بابا پیچوان پی رہے ہیں اور مقدموں کی مسلیں دیکھتے جاتے ہیں۔ سرل کو یہ منظر دکھانا اسے اچھا نہ لگا۔ وہ اسے پھلانگ کر آگے بڑھ گئی۔ لکھنو۔ آئی ٹی کالج۔ کیلاش۔ گلفشاں ــــــ لیکن گلفشاں اس کا گھر نہ تھا (ہو سکتا تھا)۔

''یہ دیکھو کون آ رہا ہے تمہارے پس منظر سے نکل کر۔'' سرل نے کہا۔

چمپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کنارے پر دور دور تک بکھرے ہوئے تعطیل منانے والوں کے مجمعے سے نکل کر کمال بوٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھاس پر اس کا سایہ آگے آگے چلتا رہا۔

''ہلو چمپا باجی۔ ہلو سرل۔'' اس نے قریب آ کر کہا۔

''ہلو''

''کل صبح ہم نے آپ کو ایک روڈ ہاؤس میں دیکھا تھا۔''

''ہاں۔''

''مگر ہم لوگ ذرا ــــــ جلدی میں تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔''

وہ بھی ایک الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گیا۔

''میں سرل کو لکھنو کے متعلق بتا رہی تھی۔'' چمپا نے کہا۔

''واقعی۔'' کمال نے اخلاقاً دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہیں' دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کمال نے تاسف سے سوچا۔

چمپا نے کمال کے لہجے کے رنج کا اندازہ لگایا۔ تم مجھے کبھی نہیں سمجھ سکو گے کمال۔ اس نے کہا۔ تم نے مجھ پر ہمیشہ چیزوں کی پرستش کا الزام لگایا ہے لیکن گرمی کی دوپہروں میں بھوسے کے ڈھیر کی مہک اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز اور خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی بیل گاڑ ____ مجھ میں شاید زیادہ عقل نہیں ____ لیکن میں ان سب چیزوں کو محسوس کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں' اگر میں بہت زیادہ عقلمند ہوتی تو تمہارا فلسفہ پڑھتی اور مطمئن ہو جاتی۔

اوجیت ندی میں سے نکل کر آیا اور کمال کے نزدیک بیٹھ گیا۔

''سرل کاش تم نے بارش کے بعد چاند باغ کے کنجوں پر جو رنگ بکھر جاتے تھے وہ دیکھے ہوتے۔ یا رام نگر کی وہ گرد آلود سڑک جس میں گرمیوں کی بھری دوپہر کے سناٹے میں ایک چھوٹا سا اداس ہندو بچہ لمبی سی چوٹی رکھائے ایک منڈیر پر تنہا بیٹھا سوائیوں کا پہاڑہ یاد کر رہا تھا۔ ____ نہیں سرل ______ میں تم کو اپنا پس منظر نہیں بتا سکتی۔ بہت مشکل ہے اور تم سمجھ نہیں سکو گے۔''

''میں تم کو بتاؤں گا۔'' کمال نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا' وہ معاً اس دنیا میں داخل ہو گیا جو یہاں سے بہت دور تھی' جس پر وہ عاشق تھا۔ ان مناظر کی روح کو کمال سے بہتر کون جان سکتا تھا' وہ اس کا پیارا ہندوستان تھا۔

''لو سنو: گیان وتی کندھوں پر بال چھٹکا کر ایمن کا خیال گاتی تھی

زہرا کے فرزند حسنؑ ــــــــــ پر واری واری جاؤں ــــــــ آل نبیؐ اولاد علیؑ ــــــــ

حسینؑ ـــــــ اب میں اس کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہوں ـــــــ اور مالتی گاتی

تھی ـــــــ کانہا موہے آساوری راگ سناؤ ـــــ اور شادیوں کے مقعوں پر

کلیان پور میں دالان کے پردے گرا دیے جاتے تھے اور تختوں کے چوکے پر بیٹھ

کر میراثنیں الاپتی تھیں۔ اس بنے پر سایہ علی کا۔ مورا شیام سندر بنا۔

ــــــ کون مغربی سوشیولوجسٹ اس منظر کے حسن کو سمجھ سکتا ہے ـــــــ مورا

شیام سندر بنا ـــــ ''

''اور ــ ــ ــ ــ '' چمپا نے کہا ''میرے گھر کی میراثنیں گاتی تھیں

منگل گاؤں ــ ــ ــ چوک سجاؤں ــ ــ ــ ــ گجرا چنبیلی کا لاؤ ری

چنبیلی کا گجرا تم نے دیکھا ہے سرل؟''

''اور گھاگھرا کے کنارے کنارے میرے گاؤں کے کسان کھیتوں کی منڈیر

پر بیٹھ کر چاندنی رات میں آلہا اودل کی تانیں اڑاتے تھے ــــــ علیؑ علیؑ کر

کے سید دوڑیں ـــــ آلہا کھینچ لیں تلوار ـــــ اور قدیر کا بھانجا نوٹنکی میں

چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا:

خدا کا سکر ہے لیلیٰ ترے دربار میں آیا

کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا

''چمپا باجی ـــــــ وہ نوٹنکی تم کو یاد ہے ـــــ ہم تمھیں کرسمس کے

زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کمبلوں میں لپٹ کر ہم نے لیلیٰ

مجنوں ملاحظہ کیا تھا اور گاؤں کے اکار ہم کو خوش کرنے کے لیے اپنا سارا آرٹ

صرف کیے ڈال رہے تھے۔''

''ہاں۔'' چمپا نے' جو اس وقت لکھنؤ سے پچیس میل کے فاصلے پر کلیان پور میں موجود تھی' وہیں سے جواب دیا: ''ہاں۔ اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا تھا:

تیرا چہرہ مرا قبلہ' تری جلفیں میرا ایماں
طواف کعبہ کرنے کو ترے دربار میں آیا۔''

''ہاں۔'' کمال نے کہا' وہ بھی کلیان پور میں موجود تھا' وہ سب نوٹنکی میں منڈپ کے نیچے شال اور کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ شکستہ حال اسٹیج پر صرف مدھم سا گیس کا ہنڈ' روشن تھا۔ پردے پر ایک فوارہ' بنا ہوا تھا اور چار پریاں جو کہنیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ قدیر کا بھانجا ماشٹر پھرید' جو اپنی تیز پاٹ دار آواز کی وجہ سے جھنگروا کہلاتا تھا' لیلیٰ کے سامنے کھڑا دہاڑ رہا تھا۔ گاؤں کا آرکسٹرا زور شور سے ہارمونیم اور طلبہ بجانے میں مصروف تھا۔ ماشٹر پھرید نے گایا:

زلیخا کی طرح جب ترا عاسک ہوا لیلیٰ
تو یوسف کی طرح بکنے ترے بازار میں آیا

برابر کے مونڈھے پر گوتم نیلمبر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر ہری شنکر موجود تھا اور ساتھ کی ساری لڑکیاں اور گوتم آگے جھک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ چمپا کے سامنے فوک کلچر کے مسئلے پر روشنی ڈال رہا تھا' وہ سب صبح چار بجے تک نوٹنکی کے منڈپ میں بیٹھے رہے تھے اور انہوں نے مٹی کے کورے کلہڑوں میں ادرک والی چاء پی تھی اور گنے کا رس ______ یہ کمال کے والد نواب تقی رضا بہادر کا موروثی گاؤں تھا۔ یہاں کمال کی موجودگی میں اس کی رعت میں صرف سید اور

برہمن پلنگ پر بیٹھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لیے حکم تھا کہ کھڑے ہو کر باتیں کریں۔ اب اسٹیج پر ماسٹر مراری لال' جو کلکتہ تک تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ گھوم آیا تھا' سوہنی میں گا رہا تھا:

یاس کا عالم نہ تھا' یوں بے کسی چھاتی نہ تھی
اب تو لیلیٰ تھی تماشا' خود تماشائی نہ تھی

وہ سب مونڈھوں پر بیٹھے نوٹنکی دیکھتے رہے۔ باہر آم کے جھرمٹ میں پوس کی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی گرم اور محفوظ' وہ منڈپ میں بیٹھے طبلے پر کہروا سنتے رہے۔ دفعتاً ایک موٹر لانچ ایک انگریزی ریکارڈ بجاتی ہوئی تیزی سے کیم کی لہروں پر سے گزر گئی۔ چمپا اور کمال واپس آ گئے ــــ

''ہمارے گاؤں کی نوٹنکی میں نل دمینتی اور اندر سبھا بھی بہت فرسٹ کلاس ہوتا تھا۔'' کمال کی ملوں آواز سنائی دی' وہ جھک کر سرل کا سگریٹ جلا رہا تھا۔

''اور تم کو جو تھیکا رائے یاد ہے کمال۔'' چمپا نے آہستہ آہستہ کہا۔ ''او روشنی کا وہ گیت: جوگن کھوجن نکلی ہے۔''

''ہاں'' کمال نے اس کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

''اور جاڑوں کی دھوپ میں بیٹھ کر ہری شنکر گاتا ـــــــــ اگر دینی تھی ہم کو حور و جنت تو یہاں دیتے ـــــ اور پیا ملن کو جات تھی میں' بج دھج سیس گند ھائے ـــــ لوگ کہت میں باوری ـــــ سب جگ ہنسی اڑائے ـــــ تم کو کیا پتا'' اس نے غصے سے سرل کو مخاطب کیا'' کہ پنکن ملک کون ہے' پہاڑی سانیال اور آرزو لکھنوی اور نرائن راؤ دیاس اور کانن دیوی ـــــ ان لوگوں کا

ہماری زندگیوں میں کیا مقام ہے۔''

''تمہیں کیا پتا ــــــ ''چمپا نے اس کی خفگی کا کیو لے کر کہنا شروع کیا۔ ''تم جو مجھ سے میرا پس منظر دریافت کرتے ہو ــــــ کہ پیارو قوال کی کیا ہستی ہے اور فیاض خاں اور رد۔پالی تعلق دار ــــــ اور ــــــ''

''اور تم کو کیا معلوم کہ لکھنو اور علی گڑھ کے مشاعرے کیا ہوتے تھے اور جگر صاحب کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے اور فراق صاحب کی اور آنند نرائن ملا کی۔'' کمال نے کہا۔

''اور تم کو کیا پتا'' اب چمپا کی آواز میں غصے کی جگہ اتھاہ رنج نے لے لی'' کہ کالی داس کے اس شعر کے کیا معنی ہیں ــــــ یہ شعر ــــــ''

نروندصیا اور سندھو پر سے گزرتا بگلوں اور بطخوں کی معیت میں بادل پیغام لے کر چلا ــــــ''

''اور تم کو کیا معلوم کہ ہالڈر کی بنائی ہوئی تصویر: اشوک کے جھنڈ میں سیتا' ہمیں کیوں اتنی خوبصورت لگتی ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''نہیں سر ل' یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

''اور یاد ہے کمال'' چمپا واپس جانے پر مصر رہی'' ہم سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر بیٹھ کر پندرہ پندرہ سال پرانے ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔ کملا جھریا اور جانکی بائی اور ہری متی ــــــ''

''ہاں۔'' کمال نے کہا۔ ''اور محمد حسین ساکن نگینہ کا ریکارڈ دھوئیں کی گاڑی اڑائے لیے جا ــــــ''

''ہاں۔''چمپا خوش ہوئی کہ کمال کو واپس لے جانے میں کامیاب رہی' مگر اب کمال حال میں آ کر ماضی سے پیچھا چھڑا کر نکل بھگنا چاہتا تھا لیکن چمپا اس کے سامنے وقت کے ضمیر کی طرح بیٹھی تھی۔

دفعتاً کمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وقت کی آندھی میں پتے کی طرح ادھر ادھر ڈول رہی ہے' اڑی جا رہی ہے اور وہ اس کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کمال۔''نرل نے سحر زدہ آواز میں اس سے کہا'' مجھے کچھ اور بتاؤ''

''اور کیا بتاؤں؟''اس نے رنج کے ساتھ جواب دیا اور بوٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور ندی کو دیکھتا رہا۔ندی گومتی میں تبدیل ہو گئی۔

''کمال____سنو____''چمپا نے کچھ یاد کر کے کہنا شروع کیا۔''رات کا سماں ہے۔کتے بھونک رہے ہیں۔سناٹا بازار بھر میں پڑا ہے۔چڑیاں چنگن تک سوتی ہیں۔چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچا رہے ہیں۔باغبان گوندنی کے کھٹکھٹکے کو کھٹکھٹاتے ہیں۔اب کوئی دم مین چکیاں چلیں گی۔''

''سرشار؟''

''ہاں۔''وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

''ہم لوگ عموماً ہری شنکر کے کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے جو دراصل ایک برجی تھی۔''کمال نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔''س کے نیچے دریا بہتا تھا۔اس کمرے کی دیواروں پر ان گنت پرانے فوٹو گراف تھے اور دو ٹوٹے ہوئے صوفے۔اس کمرے میں بیٹھ کر ہم نے لاتعداد کتابوں کے موضوع سوچے۔دنیا

کے مسائل حل کیے۔ یہ کمرہ اور یہ گروہ ساری دنیا میں موجود ہے۔ زندگی ابھی بہت غیر واضح تھی۔ بہت سے پردے اٹھتے تھے اور گرتے تھے۔ (کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھند لکے کا سایہ سامنے آجاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا)۔ کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھند لکے کا سایہ سامنے آجاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا۔ اب پسند ناپسند کے بجائے عجز ہمارا رویہ بنتا جارہا تھا۔ یہ رویہ احساس برتری نے پیدا نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ لگتا جیسے ساری انسانیت کے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، ہمیں اس خون کو دھونا ہے اور دیکھو کیا ہوا!'' اس نے ہاتھ آگے پھیلائے۔ ''ایک روز صبح کو ہم اٹھے اور ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاتھ واقعی خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ہمارے وہ سارے کردار، جن کا ذکر تم نے چمپا باجی سے سنا ہوگا، نوئل کارڈ کے کریکٹرز کی مانند ذہین اور پرلطف گفتگو کرنے والے نوجوان، مارگ کا مطالعہ کرنے والی منی پوری ناچنے والی لڑکیاں، ہندوستان کی قدیم کلاسیکل تہذیب کا راگ الاپنے والے پوزیٹر ــــــــــ ان سب کو ہم نے دیکھا کہ خون میں رنگے ہوئے ہیں، مگر ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس خون کا کنارہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچا کرتے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ان کرداروں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے ــــــــــ حقیقی، اصل انسان۔'' اس نے چمپا کو دیکھا۔

''قدیر ــــــــــ اور قمرن؟'' چمپا نے کہا۔

کمال نے خاموشی سے اجازت چاہی کہ ان کا ذکر کرے، وہ اسے بے حد

مقدس ہستیاں معلوم ہوئیں۔

''ہاں۔ قدیر اور قمرن اور رام اوتار اور رام دیا اور ہمارے گاؤں کے کاشتکار اور ہمارے اکے والے اور پنواڑی ____ اور ہمارے زردوز جو چکن کاڑھتے کاڑھتے اندھے ہو جاتے تھے اور ہمارے باغوں کے کنجڑے اور پالکیوں کے کہار ____ یہ سب ہمارا پس منظر ہے جسے تم کبھی نہ جانو گے۔'' اس نے بات ختم کی۔

چمپا ابھی واپس نہ آئی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا: ''وہاں اور ہمارے دریا۔ دریا بھی ایک مستقل کردار تھا اور ان کے نام۔ ذرا ان کے نام سنو: سرجو۔ شاردا۔ درگاوتی۔ مندکینی۔ مدھومتی۔ گومتی۔''

''گندھرو مالائیں جو ہماوت سے اتر کر بنوں میں بسنت رت منانے نکل آئی تھیں۔ طغیان صاحب نے کہا۔

کمال نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اب تک وہ ان کے وجود سے بے خبر بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے قبل آ کر چوتھی الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گئے تھے۔''

''ٹھیک ہے یار۔'' کمال نے آزردگی سے کہا۔ میں نے بھی ایک زمانے میں بڑی کویتا لکھی ہے۔ یہ اسٹیج سب پر آتی ہے۔

''تو دریا میرے گھر کے نزدیک تھا۔ گنگا میرے گھر کے پاس بہتی تھی۔ گومتی، ہری شنکر کے گھر کے نیچے بہتی تھی۔ ____ گوتم نے بتایا ہو گا کہ ____ ہم لوگ، ذرا سوچو، دریاؤں کے وجود سے کتنے بے نیاز رہتے ہیں۔ ارے پل دیکھو۔ کشتیاں۔ گھاٹ۔ سنگھاڑے۔ کنول کے پھول اور پھرندی پر برتی

ہوئی بارش۔ یہ سب کتنی اہم چیزیں ہیں۔ مجھے سمندر سے وحشت ہوتی ہے۔اس سے ڈر لگتا ہے۔سمندر بیکراں ہے۔ندی کو اپنا راستہ معلوم ہے۔ ''

اب دفعتاً چمپا کی آواز سے کمال بور ہونا شروع ہوا۔لڑکیوں میں یہ کیا مصیبت ہے'اس نے سوچا' کہ ایک تو ہوتی ہی بکی ہیں' اگر ان پر یہ وحی آجائے کہ کلاکار بھی ہیں تو پڑا ہو گیا۔چمپا باجی کلاکار نہیں تھیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا کون منکر ہو سکتا تھا!

وہ اس ندی کا ذکر کر رہی تھی اور کمال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ندی کا کردار؟ مجھے سے زیادہ اور کون یہ بات جان سکتا ہے' اس نے لرز کر سوچا۔ مجھے وہ مکان یاد ہیں'وہ ندی'وہ درخت ـــــــ چمپا باجی تم خود ـــــــ

''اور باغ میں املتاس کے درخت تھے۔''وہ کہہ رہی تھی۔''اور ایک بیل کا درخت بھی۔بیل تم نے کھایا ہے کبھی؟''اس نے اوجیت سے پوچھا۔''پورب کی خاص چیز ہے۔کمال' گوتم سے پوچھنا' اسے وہ ٹپ ٹپ گرتے بیل یاد ہیں؟''اس نے بے اختیار ہو کر پہلی بار گوتم کا نام لیا۔

کمال سوچتا رہا۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ گوتم ان کو تقریباً بھول چکا ہے' مگر بھولنا کیا معنی! ضرور یاد ہوں گی' جیسے اسے ندی یاد ہے اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور املتاس کا درخت۔اب بھی وہ اکثر بڑے جذبات میں ڈوب کر ان چیزوں کا ذکر کرتا۔کیا مصیبت ہے۔اس نے جھنجھلا کر چمپا کو دیکھا۔یہ لڑکیاں مری کیوں جاتی ہیں؟ اصل میں ـــــــ اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سوچنا شروع کیا ـــــــ ان کو ہزارہا برس سے اس کمپلکس میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ایک سنا

ہے وہ ستی تھیں، پھر سیتا، پھر گوپیوں کا فراڈ چلا ـــــــــ ان کو دنیا میں کوئی کام نہیں بس کسی بھلے مانس کو پکڑ کر دے اس کی پوجا۔ دے اس کی پوجاری نیک بختو، اللہ رسول سے دل لگاؤ، اگر محبت ہی کرنا ہے۔ رابعہ بصری سے سبق لو۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی پہنچی ہوئی بیبیاں گزری ہیں، لیکن یہ ساری سینٹ وینٹ خواتین بھی یہی سوچتی ہوں گی کہ اگر یسوع مسیح مل جائیں تو لے کران کے موزے رفو کردیں۔ ''میں گوتم سے ضرور پوچھوں گا۔'' اس نے باواز بلند کہا۔ ''اور مجھے اپنے موزے بھی رفو کروانے ہیں۔'' اس نے اپنے پیروں پر نظر ڈال کر اسی رو میں کہا۔ کل یوتھ فیسٹیول کے لیے جرمنی جا رہا ہوں۔ راتوں رات لندن پہنچ جاؤں تو طلعت میرا سامان سفر ٹھیک کردے گی۔

''بہنوں کے ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے۔'' طغیان صاحب نے بات کی۔

''جی؟ جی ـــــ'' کمال نے جواب دیا۔ ''اس لیے چمپا باجی اب اجازت دیجیے۔ خدا حافظ سرل۔ او جیت۔''

''چلو ہم تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' سرل نے اٹھتے ہوئے کہا، وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کمال اسٹیشن چلا گیا۔ چمپا نے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں آکر دریچہ کھولا۔ نیچے سنسان سڑک لیمپ کی نیلگوں روشنی میں خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ سینٹ جان کے گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ دور جیزس لین میں کوئی شخص ٹرمپٹ پر اپنا غمگین نغمہ چھیڑ رہا تھا۔

گھنٹی بجی تو طلعت نے دروازہ کھولا‘ وہ مشرقی برلین کے ایک جدید وضع فلیٹ میں اپنی ایک سنگتراش دوست کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ باقی کے سب لوگ ابھی ادھر ادھر سڑکوں پر گاتے بجاتے پھر رہے تھے۔ اس نے بالکنی پر سے جھانک کر دیکھا۔ پھولوں کی بیل کے نیچے نیم تاریک پورٹیکو میں دو سائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جلدی جلدی دوسرے سے کچھ کہا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

نوارد اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو طلعت نے اسے پہچانا یہ وہی نوجوان تھا جو چند روز قبل سینٹ جانز ووڈ میں روشن سے ملنے آیا تھا۔

’’میں نے سنا تھا کہ مشہور سنگتراش فراؤلین کریمر یہاں رہتی ہیں۔‘‘

’’آپ نے بالکل صحیح سنا تھا‘ لیکن ان کے بجائے میں موجود ہوں فرمائیے آپ کی کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔ آپ کو سر چاہئے؟ تانبا یا پلاسٹر آف پیرس؟‘‘ طلعت نے بڑے پروفیشنل انداز میں جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

’’جی۔ میں سر نہیں چاہتا۔‘‘ اس نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔ ’’میری ایک دوست ہیں‘ ان کو چاہئے۔‘‘ پھر دفعتاً اس نے چونک کر غور سے طلعت کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مجسمہ سازی کے لوازمات میں گھری کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی فیسٹول کی وجہ سے کامریڈ کریمر کا کام خوب چمک گیا تھا۔ بھانت بھانت کے لڑکے اور لڑکیاں ہر قوم اور ہر ملک کے اس کے پاس آرہے تھے‘ وہ بے حد جذباتی ہو کر نیگرو اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں کے سر بناتی اور ان کو تحفتاً دے دیتی۔ سخت مصروفیت کا زمانہ تھا۔ اسٹوڈیو میں برابر رت جگا رہتا۔ طلعت‘ جسے آرٹ میں بھی دخل تھا‘ اس

کی اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔

نووارد جب یہاں آرہا تھا تو دوستوں نے اس سے کہا تھا کہ فراؤلین کریمر بورژوا آرٹسٹ نہیں ہے۔ اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا، وہ لیکچر پلائے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے یا سارے مجسمے توڑ کر بھاگ کھڑی ہوگی اور تم کو دام بھرنے پڑیں گے۔

''اپنی دوست کو بلا لائیے ____ تاکہ میں ان کا مولڈ بنالوں۔ میں فراؤلین کریمر کی پارٹنر ہوں۔'' طلعت نے جھک کر بڑے اخلاق سے کہا۔ اس نے ہنگرین لڑکیوں کا رنگ برنگی کڑھت والا قومی لباس پہن رکھا تھا جو اسے اسی روز تحفے میں ملا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اجنبی اس کو پہچاننے کی بے انتہا کوشش کر رہا ہے لیکن اب تک پہچان نہیں پایا۔ اسے اس طرح ایکٹنگ کرنے میں بہت لطف آیا۔ ''اس الماری میں چاء کی پتی رکھی ہے۔ ادھر اسٹوو ہے۔ ____ آپ کافی بنائیے میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے ____ بوہیمین انداز کی بے تکلفی کی نقل کرتے ہوئے کہا اور پلاسٹیسن نکالنے کے لیے اسکرین کی دوسری طرف چلی گئی۔

دروازہ کھلا اور ساجدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

''ملی؟'' انہوں نے اجنبی سے پوچھا۔

''نہیں، یہاں بھی نہیں ہے، مگر آہستہ بولو، شاید یہ لڑکی اردو سمجھتی ہو۔''

''کون لڑکی۔''

''وہ اسکلپٹر اس وقت نہیں ہے۔ اس کی اسسٹنٹ ہے۔ ہنگیرین سی دکھلائی ہرتی ہے۔ مگر مجھے تو کچھ گھپلا نظر آتا ہے۔ ____ اس میں بھی ____''

اسکرین کی دوسری طرف سے طاعت کے اسکرٹ کی جھلک دکھلائی دی تو اس نے ذرا گھبرا کر اونچی آواز میں کہا: ''اس بدتمیزی کو معاف کیجئے گا مادموزیل کہ ہم اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔''

''کوئی بات نہیں۔''طاعت نے اسکرین کے پیچھے سے جواب دیا۔''مجھے اس کی ساؤنڈ بہت اچھی لگتی ہے' جیسے مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔''

''مکھیاں؟''

''جی ہاں۔ یہ میں نے تشبیہ استعمال کی۔ شہد کی مکھیاں۔ میں بہت عرصے ٹیونس میں رہی ہوں' وہاں عربی سنا کرتی تھی۔''

''ٹیونس میں؟''

''جی ہاں ______ حبیب بورغیبہ کے ساتھ۔''

''وہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟''

''جاسوسی۔طاعت نے اطمینان سے جواب دیا اور پلاسٹیسن کا گولہ بنانے میں مصروف رہی۔''

ساجدہ بیگم کا رنگ سفید پڑ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ مشرقی برلین نہ آنا۔ جانے کس مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔اب دیکھوں کہاں پھنس گئے انہوں نے اب تک ہالی ووڈ کی فلموں میں جو کچھ سنٹرل یورپ کے بارے میں دیکھا تھا وہ سب پل کی پل میں تصور میں کوند گیا۔آرٹسٹوں کے بھیس میں خطرناک جاسوس۔ بین الاقوامی سازشیں۔اغوا اورینٹ ایکسپریس۔وکی بام کا''گرینڈ ہوٹل''۔کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹو ڈیو میں آمد کا مطلب سمجھتی ہے۔اس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو

بدلا۔

طلعت اسکرین کے باہر آئی۔

''ارے یہ تو طلعت بہن ہیں۔'' ساجدہ بیگم چلائیں۔ ''توبہ ہے۔تم نے یہ کیا روپ بھرا ہے۔اچھا بیوقوف بنایا۔''

''ہلو' ساجدہ آپا______'' طلعت نے شگفتگی سے کہا۔ ''بیٹھیے۔ابھی آپ فرسٹ کلاس مولڈ بناتی ہوں۔آپ نے کافی تیاری کرلی؟'' اس نے ساجدہ بیگم کے ساتھی سے دریافت کیا۔

''معاف کیجیے گا میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا اس لباس میں۔لندن میں بھی آپ سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔صرف آپ کا ذکر بہت سنا ہے۔''

''جی______ آپ کی یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی؟ میں نے دیکھا تھا آج آپ پولش لڑکیوں سے بہت برادرانہ سلوک کررہے تھے۔''

''وہ_____ تو میں ذرا ان لوگوں کا جھوٹ سچ معلوم کرنے آیا ہوں۔میں ایک انگریزی اور دو اردو اخباروں کے لیے لندن لیٹر لکھتا ہوں۔یہاں سے جا کر ان لوگوں کی قلعی کھولوں گا۔''

''تم ان سے پہلے کبھی نہیں ملیں۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''بڑے مشہور جرنلسٹ ہیں۔''

''جی اور ساجدہ آپا آپ یہاں کیسے۔''

''میں____ میں ذرا ان لوگ کا____''

''____ جھوٹ سچ معلوم کرنے آئی تھیں!''

”بالکل انہوں نے جواب دیا۔“

”مگر ساجدہ آپا ____ اور آپ“

”خان۔“

”مسٹر خان ____ مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن کا تعاقب کرتے یہاں تک آئے مگر وہ نہ ملی‘ وہ یہاں کبھی نہیں آئی‘ اگر آ جاتی تو اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ اتنی شدت سے الجھی ہوئی نہ رہتی‘ مگر وہ عین اس لمحے سالز برگ میں موزارٹ کی موسیقی سن کر اپنی روح کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔“

”کیسا تعاقب بھئی۔ کیا اڑا رہی ہو۔“ ساجدہ نے خفگی سے کہا۔

”نہیں تو ع۔ اچھا ہے ساجدہ آپا یہاں ایک سے ایک تحفے آپ کو ملیں گے۔ پندرہ دن تک وہ وہ خاطر مدارات ہو گی جس کا ٹھکانہ نہیں۔ مفت کی تفریح۔ کیا حرج ہے۔ آپ لوگ نے ان ممالک کو نہ جانے کیوں ہوا بنا رکھا ہے۔“ وہ سرعت سے ان کی ناک بناتے ہوئے بولی۔

”یہ مشغلہ آپ نے کب شروع کر دیا۔“ مسٹر خان نے کہا۔ ”مجسمہ سازی۔“

”جی۔ مشغلوں مشغلوں کی بات ہے۔ بعضوں کا مشغلہ مخبری ہوتا ہے۔“

ساجدہ نے گھڑی دیکھی: ”اب چل دوں ____ جہاں ہم ٹھہرے ہیں وہاں کھانے پر انتظار ہو رہا ہو گا۔“

”بہت خوب دوسری سٹنگ کب دیجیے گا؟“

”میں فون کر دوں گی۔“

''بہت اچھا۔''

وہ بالکنی میں سے ان دونوں کا جاتے دیکھتی رہی۔ پھولوں کی بیل پھر جھک آئی جس کے سائے میں ''مسٹر خان'' ایک لمحے کے لیے گم سم کھڑا رہا' پھر ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

واپسی پر وہ لوگ فرانس کی سرحد عبور کر رہے تھے جب ٹرین میں کسی نے بتایا کہ روشن پکڑی گئی۔

''کیا چنڈو خانے کی اڑاتے ہو۔'' طلعت نے آزردہ ہو کر کہا۔ ''وہ سیاسی کبھی نہیں تھی۔ آخر اس کے پکڑے جانے کی کیا تک ہے۔ یہ ایک یار لوگوں نے اس کے لیے افواہیں پھیلا رکھی ہیں خواہ مخواہ اور پکڑے جانے کا مطلب؟ وہ اسمگلنگ کرتی تھی؟ بم بناتے تھی؟ امریکہ کے اہم راز روس کو اور پاکستان کے اہم راز ہندوستان کو بتاتی تھی؟ آخر کیا کر رہی تھی بھجائی؟ اس غریب کو اپنے فلسفے ہی سے فرصت نہیں۔ اس کو یہ تک معلوم نہیں کہ فورتھ انٹرنیشنل۔''

''اصل خیالات سے کیا ہوتا ہے۔ اصل خیالات کی تصویر تو نہیں لی جا سکتی۔'' گوتم نے اس کی بات کاٹی' وہ مغربی جرمنی کے سفارتخانے میں کسی کام سے آیا ہوا تھا اور راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ''تم افواہوں کی نفسیات کو نہیں جانتیں اور اسٹیریو ٹائپ کی طاقت' اگر میں مستقل تمہارے لیے پروپیگنڈہ کروں کہ تم طلعت رضا نہیں ہو در اصل دلائی لامہ کی جانشین ہو تو واقعی تمہیں دلائی لامہ کی جانشین سمجھا جائے گا۔ ہماری زندگیوں کا جھوٹے مفروضوں اور غلط پروپیگنڈے پر انحصار ہے۔ روشن تو بہت غیر اہم ہستی ہے۔ پوری قوموں' سموچے

ملکوں کے خلاف اسٹیریوٹائپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ آج کی دنیا ہے۔ طلعت آرا بیگم جس میں فن کاروں کے علاوہ طالب علموں کی تو سب سے بڑی قیمت مقرر ہے۔''

''اب میں نے دیکھا کہ پروپیگنڈہ کسے کہتے ہیں۔ کمال ہے بھئی۔ روشن غریب، جس کے کوئی سیاسی خیالات کسی قسم کے ایک سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کو اتنی اہمیت دی جارہی ہے کہ دو بھلے آدمی اس کے پیچھے پیچھے برلین تک آئے گو وہ ان کو تب بھی نہ ملی۔''

''مگر اس بہانے ان دونوں نے تفریح تو کرلی۔''

''سنا ہے روشن کے والد بہت بیمار ہیں۔ مجھے بون میں کوئی بتا رہا تھا۔ ممکن ہے ان افواہوں سے اس کی اسکالرشپ پر بھی اثر پڑے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کراچی کی سیاست کا اس میں کافی دخل ہے۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' طلعت نے پوچھا۔

''سنا ہے کوئی مرکزی وزیر ہیں جو روشن کے والد کے خلاف ہیں۔ یا شاید روشن کے والد مرکزی وزیر کے خلاف تھے۔ ایسا کچھ سلسلہ ہے۔ بہر حال تو وہ سول سروس کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کو ویسے ہی کسی پچھلے وزیراعظم نے کوئی بہت بڑا عہدہ دے دیا تھا۔ اب ان وزیراعظم کے جانے کے بعد روشن کے والد کے خلاف بڑا محاذ قائم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے روشن بےچاری کے خلاف جو مضحکہ خیز کارروائی کی جارہی ہے اس کا اس محاذ سے کچھ تعلق ہو۔''

''یا اللہ۔'' کمال نے گڑبڑا کر کہا۔ ''اس قسم کے حالات ہیں؟''

''ہیں تو سہی۔'' حمید نے جواب دیا، وہ سب کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے

سبزہ زاروں کو دیکھتے رہے۔

۷۸

شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجو بارہ بنکوی ان لوگوں میں سے تھے جو لندن میں برسوں سے برس سے خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رنجور صاحب دوسری جنگ عظیم سے پہلے بارہ بنکی سے اوکسفرڈ آئے تھے۔ تعلیم ختم نہ کر پائے تھے کہ جنگ چھڑ گئی اور یہ یہیں رہ پڑے۔ ایک عدد لیٹوین یا لیتھونین لڑکی سے شادی کر لی۔ سخت موڈی اور کاہل آدمی تھے۔ بی بی بڑی نیک بخت ثابت ہوئی' وہ اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ جس ہندوستانی یا پاکستان کو کہیں ٹھکانہ نہ ملتا وہ سیدھا یہیں آجاتا۔ رنجور صاحب بہت ہی شریف آدمی تھے۔ سب کی بہت خاطریں کرتے۔ اکثر مہمان ان کا بل ادا کیے بغیر ہی بھاگ جاتے مگر رنجور صاحب ان کی شکایت نہ کرتے۔ اتر پردیش سے اگر کوئی چوہا بھی آنکلتا تو اس کے لیے بچھ بچھ جاتے۔

ہمراز فیض آبادی ان کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کے کرائے دار تھے۔ رنجور بارہ بنکوری ہندو تھے اور ہندوستانی ہمراز فیض آبادی مسلمان تھے اور بڑے کٹر پاکستانی۔ تھے دونوں شاعر۔ ایک دوسرے سے مستقل بحث کرتے۔ رنجور صاحب کہتے: تم لوگوں نے ہندو شعراء کی کبھی اتنی قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ تم علی گڑھ والوں نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلایا وغیرہ یا رامائن فرحت لے کر

بیٹھ جاتے اور بیئر کے چند گلاسوں کے بعد روہانسے ہو کر کہتے تم ملیچھ مسلمسے ہو، تم نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس پر ہمراز بھائی بھارت ماتا شان میں کچھ گوہر افشانی کرتے۔ شیو پرشاد روتے روتے کہتے: یہ شعر سنو۔ کل رات ہوا ہے۔ شعر سن کر ہمراز بھائی کہتے: ہاں یار، اچھا ہے مگر ذرا بوئے کچوری و ہینگ می آید۔ اس پر دوبارہ فساد شروع ہو جاتا۔ روز رات کو کھانے کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ ایک بات میں رنجور اور ہمراز دونوں اپنے سارے اختلاف چھوڑ کر متفق تھے، وہ تھی پنجابیوں کے لیے ان کی ناپسندیدگی۔ اس موضوع پر دونوں گھنٹوں باتیں کرتے نہ تھکتے۔ گو ہمراز بھائی بڑے شعلہ بداماں پاکستانی تھے مگر بہر حال آبائی وطن اتر پردیش تھا کہتے: ارے، یہ پنجابی گھڑسوار، رسالدار اردو کیا جانیں! شیو پرشاد بڑے زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان کی پہلی ہندو بیوی سے جولڑکی ہندوستان میں تھی اس نے کسی پنجابی سے شادی کر لی تھی اور چندی گڑھ میں رہتی تھی۔ جس روز اس کی شادی کی اطلاع آئی شیو پرشاد صاحب نے خاص طور پر آ کر ہمراز بھائی کو اس سانحے کی اطلاع دی۔

''لو میاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگڑ گئی۔ آخر ہم پنجاب گردی سے کہاں تک بچے رہتے۔'' ہمراز بھائی اس صدمو میں ان کے دلی شریک رہے کیونکہ خدانخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہو سکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پردیش والے ہندو مسلمان ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے، اس عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اور شعر پڑھتے ایک روز کمال اس محفل میں گیا تو اس کو

بڑی حیرت ہوئی۔ ''کس قدر غیر منطقی ہیں آپ۔'' اس نے ہمراز بھائی سے کہا۔ ''آپ کا وطن پاکستان ہے۔ آپ کو اب یو۔پی سے مطلب؟''

''اجی وہ تو ٹھیک ہے — مگر ______'' ہمراز بھائی نے گڑبڑا کر کہنا شروع کیا۔

''ٹھیک کیا ہے؟'' کمال نے ان کی بات کاٹی۔ ''اسی لیے تو پاکستان میں یو۔پی والوں کی وفاداری پر شبہ کیا جاتا ہے۔ دل اٹکا ہوا ہے فیض آباد میں، ملازمت کرتے ہیں کوئٹے میں اور پاسپورٹ بنوا کر اماں بیگم سے ملنے فیض آباد جاتے ہیں تو وہاں خفیہ پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ ادھر پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجر لوگ سارے کے سارے ملک سے فائدہ اٹھانے کے لیے آگئے ہیں ورنہ ان کا اصل وطن تو بھارت ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ بھائی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ کس قدر دیوانی قوم ہے مسلمانوں کی۔ حد ہے واللہ!''

''میاں صاحبزادے، زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔'' ہمراز بھائی نے جواب دیا تھا۔ ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ تم ہندوستانی مسلمان ہو، یاد رکھو، جب وہاں ملازمت نہیں ملے گی اور بھوکے مرنے لگو گے تو دھکے کھا کر پاکستان ہی کا رخ کرو گے۔''

غالباً ہمراز بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اس نے لرز کر ان کی صورت دیکھی۔ اس وقت رنجور صاحب پان کی گلوریاں بنا بنا کر خاصدان میں رکھتے جا رہے تھے۔ پان ایک بڑی مقدس شے تھی جو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ہر ہفتے ہمراز بھائی کے لیے لندن آتی تھی اور بطور تبرک رنجور صاحب کو صبح شام اس کے دو بیڑے

کھلائے جاتے تھے۔ پان بنانے کے مقدس فریضے کو بڑے اہتمام سے تکمیل تک پہنچانے کے بعد رنجور بارہ بنکوری کمال کی طرف مڑے اور ملول آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

''مصیبت یہ ہے کمال میاں'' انہوں نے اپنے خوبصورت لہجے میں اداسی سے کہا' کہ تم شاعر ہو۔ ہر نوجوان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست۔ راست باز۔ تصورات پر مر مٹنے والا' وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر بدقسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست دان چلا رہے ہیں جن کو تمہارے وژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ تم حقیقت سے کس حد تک سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے ہو۔ تمہاری اصل بڑائی یا گھٹیا پن اس وقت ظاہر ہوگا کہ تم نے حقیقت سے' یعنی بے ایمانی سے' جھوٹ سے' ریاکاری اور اخلاقی جرم سے کس حد تک سمجھوتہ کیا۔''

طاعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال ایوننگ میں جا کر انہوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے۔ اس غربت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ' جیسا کہ پہلے لکھا گیا' ان کے اکثر کرائے داران کو کرایہ دیے بغیر ہی غائب ہو جاتے اور یہ اپنے مہمانوں سے بے حد واجبی پیسے لے کر انتہائی بڑھیا کھانے انہیں کھلاتے۔ سویٹ کس قدر کریک ہیں رنجور صاحب۔ طاعت نے ایک روز کہا تھا۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں جگہ کہاں ہے؟ ان کی بی بی مایا (ان کا اصل نام یہی تھا اور رنجور صاحب نے اس نام کی بنا پر اپنے ایک مضمون میں' جو ۳۹ء میں زمانہ کا

نور میں چھپا تھا' یہ ثابت کیا تھا کہ لیٹوین لوگ دراصل ہندو تھے۔ بعد میں جب جدید تحقیقوں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ غالباً آریوں کا اوریجنل وطن بالٹک کی طرف تھا اور سنسکرت اپنی اصل حالت میں انہی علاقوں میں بولی گئی تھی تو رنجور صاحب نے طے کرلیا۔ وہ خود بہت بڑے محقق ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ پچھلے پندرہ برس سے وہ اس کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے مگر وہ ابھی پہلے چند ابواب سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اس تحقیق کے لیے ان کو آئرلینڈ کا سفر درکار تھا جہاں اشومیدھ عہد عتیق میں منایا جاتا تھا اور بالٹک کے ممالک کا جہاں اندر کی پوجا ہوتی تھی' مگر اس سفر کے لیے جو روپیہ چاہیے وہ رنجور کبھی فراہم نہ کر پاتے لہٰذا وہ کتاب ابھی نامکمل تھی) بڑی خاموش طبع اور گھریلو خاتون تھیں اور چند سال قبل بے حد خوبصورت رہی ہوں گی۔ (انجور صاحب خود کافی خوش شکل تھے) ان کا سارا وقت میاں اور بچوں کی خدمت اور کھانا پکانے میں گزرتا۔ دن بھر وہ مشین کی طرح کام کرتیں۔ طلعت وغیرہ کے گروہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ رنجور صاحب کو اپنی تاریخ کی کتابوں اور شاعری ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی جو وہ مایا کی طرف توجہ کرتے' وہ ٹھیٹھ ہندوستانی پتی ورتا عورتوں کی طرح چپ چاپ باورچی خانے میں گھسی رہتی یا کپڑے دھوتیں۔

زندگی یونہی گزرتی جارہی تھی کہ شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجور بارہ بنکوی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک نوجوان پارسی طالب علم آن کرٹکا۔ لڑکیاں جرمنی سے لوٹ کر آچکی تھیں اور اب قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع ہورہی تھی۔ ان کے علاج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک ورائٹی

پروگرام ترتیب دیا جارہا تھا جس کی تیاری کئی مہینے قبل سے شروع ہو چکی تھی۔ہار لے اسٹریٹ کے ڈاکٹرں کی فیسیں بہت زیادہ تھیں‘ شاید ان کو وہی آنا بھی لے جایا جائے۔لڑکوں اورلڑکیوں نے طے کرلیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح سے کرا کررہیں گے۔ان کے ہمراہ کی بی بی کے علاوہ ایک طے کرلیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح کرا کررہیں گے۔ان کے ہمراہ ان کی بی بی کے علاوہ ایک بہت بڑی پارٹی تھی۔ٹوٹینگ میں ان کوٹھہرایا گیا تھا جہاں وہ گم سم بیٹھے بچوں کی طرح حیرت زدہ سب کو دیکھتے رہے۔ان کا دماغ ماؤف تھا۔ان کی بی بی کے اعضاء مغلوج تھے‘وہ نزدیک ایک پلنگ پرلیٹی رہتیں۔ان کا گھر بنگالی طلباء کے لیے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ٹیگور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ ہوا تھا۔ٹیگور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ عزت ہے اورنذرل کے لیے ٹرپ پرنکل کرلڑکے اورلڑکیاں مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔طاعت اور فیروز نے پہلے سوئس کاٹیج کا رخ کیا جہاں رنجور بارہ بنکوری رہتے تھے۔

مکان کے زینے پر ان کو ہمراز بھائی مل گئے۔’’ہمراز بھائی!لائیے چیپے۔‘‘طاعت نے دست سوال دراز کیا۔

’’یہ طالب علم کیوں نذرالاسلم کے لیے اتنے بے حال ہوئے جارہے ہیں۔‘‘ہمراز بھائی نے کہا۔

’’یا اللہ_____ہمراز بھائی۔‘‘طاعت نے کہنا شروع کیا۔ادھر یہ لوگ ہمراز بھائی سے بحث میں الجھ رہی تھیں عین اسی وقت علامہ رنجور بارہ بنکوی کی زندگی میں ایک قیامت بپا ہوگئی۔

دریچوں کے شیشے ڈوبتے سورج کی روشنی میں قرمزی نظر آرہے تھے۔ رنجور صاحب فکر شعر میں مبتلا مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ نیچے تہ خانے میں تیز روشنی ہو رہی تھی جہاں مایا عموماً اس وقت روزانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف دکھلائی دیتی تھیں۔ ٹھیک اس سے رنجور صاحب کو جانے کیا نظر آیا کہ سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ تیر کی طرح تہ خانے میں پہنچے۔

ہال کے زینے پر کھڑے ہو کر طاعت اور فیروز تہ خانے میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی' وہ دونوں دوڑی ہوئی نیچے گئیں۔ مایا خون میں لت پت فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور ان کی بڑی لڑکی قریب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ رنجور صاحب دروازے میں صم بکم کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟'' طاعت نے دہل کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے سکون سے جواب دیا۔ ''زینے پر سے ان کا پاؤں رپٹ گیا۔ فکر مت رکو۔'' پھر وہ خاموشی سے اوپر چلے گئے۔

دوسرے لمحے اوپر کی منزل سے اتنے ہی زوردار دھماکے کی آواز آئی۔

لڑکیاں بوکھلاہٹ میں دوڑی ہوئی اوپر پہنچیں۔ جتنی دیر میں طاعت نے ۹۹۹ کو فون کر کے ایمبولینس منگائی اتنی دیر میں رجور صاحب ہوشنگ ماچس والا کی ٹھکائی بھی اچھی طرح کر کے فراغت پا چکے تھے۔ ہمراز بھائی اور دوسرے لوگ ہاں ہاں کرتے اپنے اپنے کمروں سے بیچ بچاؤ کے لیے دوڑے مگر رنجور صاحب نے ہڑبڑاہٹ میں ایک ایک جھانپڑ ان سب کو بھی رسید کیا اور اسی سلسلے میں ہمراز

بھائی سے با قاعدہ ان کے دو دو ہاتھ ہو گئے۔ لینڈ نگ پر' جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا' اندھیرا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمراز بھائی اور رنجور صاحب دونوں ایک دوسرے کو ہوشنگ ماچس والا سمجھے۔

اب رنجور صاحب سے کہا گیا کہ وہ قریب کے پب سے اپنی بے چاری بی بی کے لیے تھوڑی سی برانڈی لے آئیں۔ یہاں برانڈی کا انتظار ہوتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پب میں شغل کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ طاعت مایا دیوی کو ہسپتال لے گئی۔ فیروز کے بچوں کو پچکارنے میں مصروف ہوئی۔ ہوشنگ ماچس والا نے اسباب باندھ کر ٹیکسی منگوائی اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا۔

اس ہڑبونگ میں نسیم بانو سے ملنے کا وقت نکل گیا۔ مایا بھٹ ناگر کی مرہم پٹی کروانے کے بعد طاعت اور فیروز نائٹس برج کے ایک بہت بڑھیا فلیٹ میں پہنچیں جہاں نسیم بانو کی والدہ سیٹ تک شادی کیوں نہیں کی؟ کب تک پڑھتی رہو گی؟ اب شادی کر ڈالو اور نسیم بانو نے پکوڑے تل کر کھلائے مگر چندے کے نام کا ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

دونوں غصے میں بڑبڑاتی نیچے اتریں۔ اب کون سے فلم اسٹار کے پاس جائیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر انہوں نے سوچا۔

یہ فلم والوں کا سلسلہ طاعت کو ہمیشہ بور کرتا تھا کیونکہ جب سے انڈین فلم انڈسٹری کی ترقی ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا فلم اسٹار لندن آ پہنچتا۔ ایشین فلم سوسائٹی میں اسے بلایا جاتا۔ ان کی پبلسٹی سے ہندوستان کی پبلسٹی ہوتی تھی۔ "اس پبلسٹی کے ریکٹ نے دماغ چکرا دیا ہے۔ طاعت کہتی۔

''چلو چل کر مایا دیوی کی خیریت معلوم کر لیں۔'' وہ الٹے پاؤں سوئس کاٹج گئیں۔ فیروز پر اس وقت ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

''حد ہے یار۔'' اس نے کہا۔

''ہاں یار حد ہے۔'' طلعت نے جواب دیا۔

ہمراز بھائی کے فلیٹ میں بہت چہل پہل تھی۔ ساری عمارت کے مکین، یعنی رنجور صاحب کے مہمان، ہاں جمع زور شور سے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کمال بھی موجود تھا، وہ طلعت کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا تھا۔

''ہیڈ کوارٹر میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئی تھیں بھئی۔'' اس نے کہا۔

''مسز بھٹ ناگر اب کیسی ہیں بھابھی؟'' طلعت نے ہمراز بھائی کی بی بی سے پوچھا۔

''مگر صاحب ____ رنجور جیسا مرنجامرنج اور بھگت آدمی، جو کبھی اونچی آواز میں بول کر نہ دے، اور کیا پہلوانی داؤ دکھائے ہیں میرے شیر نے۔ مجھے تو ایسا جھانپڑ دیا ہے کہ اب تک دماغ جھنا رہا ہے واللہ!'' ہمراز بھائی نے خوش ہو کر داد دی۔

''مگر یہ ہوا کیا؟'' ایسی پتی ورتا عورت..... ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''اور وہ خود کیسا تھا۔ مرگلا بالکل۔ پیلی چھپکلی ایسا۔ لا حول ولا ____ وہی ماچس والا ____'' ان ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے کہا۔

''مطلب یہ کہ انسان کے اندر جو طوفان چھپے ہیں ان کا اندازہ کیسے ہو سکتا

ہے۔'' کمال نے آہستہ سے کہا۔ ''رنجور صاحب کا طوفان۔ مایا دیوی کا طوفان۔ ہم سب کتنے بڑے جوالا مکھی پہاڑ پر زندہ رہتے ہیں۔ حد ہے بھئی۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور رنجور صاحب دہلیز میں کھڑے نظر آئے۔

''آیئے آیئے۔'' ہر ایک نے کہا' مگر سب اپنی اپنی جگہ بہت نادم محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اندر جھانک کر چاروں برف دیکھا۔ ''نہیں۔ میں آپ لوگوں کے تبادلہ خیالات میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ ایسے ہی ادھر آنکلا تھا۔ خدا حافظ۔'' دوسرے لمحے وہ غائب ہو گئے۔

شیو پرشاد بھٹ ناگر کئی دن تک گھر نہ لوٹے ان کی بی بی اسی طرح سر پر پٹی باندھے خاموشی سے کپڑے دھونے اور کھانا بنانے میں مصروف ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چند روز بعد شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجور بارہ بنکوی ٹیمز کے کنارے سردی میں ٹھٹھرے ہوئے پائے گئے۔

۷۹

بلبل چودھری بھی پہنچ چکے تھے اور نذ الاسلام کے پروگرام میں تعاون کر رہے تھے۔ ان کا ٹور بری طرح فیل ہوا تھا' پھر وہ بیمار پڑے۔ ان کو بے حد خراب پریس ملا۔ ہر نقاد نے 'پاکستانی' اور 'ہندوستانی' رقص کا موازنہ کر کے سوال اٹھایا کہ ان

میں کیا فرق ہے حالانکہ فنون لطیفہ اور جمالیات کے سرکاری ماہرین ان کے متعلق اپنے عجیب وغریب نظریوں سے پریس کی تواضع کرتے رہے تھے۔

کئی مہینے ڈرامے اور میلے کی تیاری میں گزر چکے تھے۔ نذرالاسلام کے لیے اتنا پیسہ اب تک اکٹھا نہ ہو سکا تھا کہ ان کا باقاعدہ علاج کروایا جاتا۔ ''نذرل ایڈ کمیٹی'' میں سرپھرے طالب علموں نے کھیر اور اصفہانی کو اکٹھا کر دیا۔ (کم از کم ان کے نام سرپرستوں کی حیثیت سے پروگرام کی کتاب پر برابر برابر چھپ گئے) کمیٹی کے صدر ہندوستان ٹائمز کی شریمتی ایلا سین تھیں۔ نائب صدر وی۔ کے۔ کرشنا مینن۔ ان کے علاوہ اس کمیٹی میں امرت بازار پتریکا کے سندر کباڑی بھی تھے اور ڈان کے نسیم احمد بھی۔ (یہ اجتماع ضدین______ نذرل دادا تمہارا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ کمال نے کہا)۔ اس مرتبہ پی ایس ایف اور لندن مجلس نے مل جل کر کام کیا۔ پچھلے سال دونوں جماعتوں نے مل کر بڑی دھوم دھام سے ایشین اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد کی تھی جس میں عرب اور اسرائیل طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ (عالمگیر امن اور بھائی چارہ سب فراڈ ہے۔ ان لوگوں کے بھرے میں مت آنا۔ عامر رضا نے ایک کاک ٹیل پارٹی کے دوران روشن سے کہا تھا)۔

اب ان لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک خیال تھا۔ ہم نذرل دادا کو اس بے کسی کے عالم میں مرنے نہ دیں گے۔

پروگرام میں پدما کے سیلاب کی داستان موسیقی اور تمثیل میں پیش کی جا رہی تھی۔ گھنٹوں رقص، گیتوں اور مکالموں کی ریہرسل کی جاتی۔ ایک ایک نکتے پر

بحث ہوتی۔ کاسٹ بے انتہا لمبی چوڑی تھی۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیاں۔ بھٹیالی گانے والے ملاح۔ سیلاب کی زد میں خزاں کے پتوں کی طرح بہتے اور ڈوبتے ہوئے کسان۔ سرکاری لنگر خانے کے سامنے کھڑے ہوئے بھوکے پناہ گزینوں کی قطاریں۔

''اُفوہ۔ کس قدر خوفناک......'' رومیں ٹک بل نے نیم تاریک آڈیٹوریم میں ایک کرسی پر نیم دراز ہوکر سامنے روشن اسٹیج پر ریہرسل دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ ٹریجڈی سے محفوظ ہوتے ہو۔''

''موت سے تو ہماری بڑی دوستی ہے بل کریگ۔'' طلعت نے اسکرپٹ کے کاغذات ایک طرف ڈال کر فرش پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہماری پوری نسل تو صریحاً عاشق ہے موت پر۔ تم باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے پر ابھی چند سال ہمارے گھر کے آنگن میں ایک خونریز جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت سارے محاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جارہی ہے۔ یہ سامنے والی ٹریجڈی ہمارے لیے گویا روزمرہ کے معمولی واقعات میں شامل ہے۔ بہت سوں کو تو اس ٹریجڈی کا احساس تک نہیں۔'' طلعت نے ترشی سے بات جاری رکھی۔ ''اور بہت ممکن ہے ابھی، جس وقت میں تم سے یہ باتیں کررہی ہوں، یہ سیلاب کا منظر مشرقی بنگال میں سچ مچ لوگوں کو نظر آرہا ہو۔''

چھن چھن کرتے بلبل کے ٹروپ کے افراد ادھر ادھر آجارہے تھے۔

''سیلاب کے منظر میں سریلزم چلاؤ تھوڑی سی۔'' اسٹیج کی پروپس کے انبار میں سے سر نکال کر زرینہ چلائی۔

سرئیلزم چلائی گئی۔ ڈراما پروڈکشن کی جدید ترین تکنیک نہایت زوروں میں ہر طرف استعمال کی جارہی تھی۔ پیچھے گیلری میں فریدہ لڑکیوں کو دھان پھٹکنے والے ایک گیت کی مشق کرارہی تھیں:

"____ بیلانائی رے جولدی جولدی ____ بیلانائی ____"

بالآخر فرسٹ نائٹ' آن پہنچی گرین روم کی گہما گہمی۔ آخری منٹ کی گھبراہٹ ۔کاسٹ کے افراد کی طرف سے فکر۔ جانے کون کہاں پر کوئی باؤلر دے۔ ویسٹ انڈ کی پروفیشنل اسٹیج کے اہم افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ پریس والے سامنے کی قطاروں میں بڑی انہماک سے بیٹھے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرامہ کرنے والے اس شہر کے پریس اور تماشائیوں کے ردعمل کے عادی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کل صبح مانچسٹر گارجین اور ڈیلی اسکیچ میں کس طرح نوٹس نکلیں گے۔

انٹرول کے دوران میں بہت سے لوگ گرین روم میں آگئے۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیوں کا گروہ بالوں میں پھول اڑسے' سنتھال طرز کے جوڑے بنائے سامنے سے گزرا۔

"یہ سب بنگالی لڑکیاں ہیں؟" ایک لبرل اخبار کے نمائندے نے کیمرہ سنبھالتے طلعت سے دریافت کیا۔

"یہ ____ ؟نہیں ____ وہ سنتھال لڑکی فیروز جبیں ہے۔ اتر پردیش کی رہنے والی۔ یہ دوسری خوبصورت کسان لڑکی عذرا وحید ہیں۔ یہ ادھر والی پنجابی خاتون ہیں۔"

"ہاؤ فے سی نٹنگ ____ "نمائندے نے بڑے صدق دل سے کہا اور اپنی

نوٹ بک پر جھک گیا۔ ''دیکھو! ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔'' اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم ہو تو ان ہی لوگوں میں سے پر آج کل میری برادری سے تعلق رکھتی ہو لہٰذا مجھے کسی اینگل سے کوئی اسٹوری نہ دینا۔ میں میں تم لوگوں کو اس برح یکجا دیکھ کر بے حد پریشان ہوں۔ صبح سے شام تک میری ساری زندگی تمہارے آپس کے سیاسی جھگڑوں اور تنازعوں اور خونریزیوں کی خبریں چھاپتے گزری جا رہی ہے اور اب یہ کیا سلسلہ ہے۔ تم ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہو۔ تم ایک سا لباس پہنے' ایک موسیقی کی آہنگ پر' ایک سے گیت گا رہے ہو۔ یہ کون سا نیا اسٹنٹ ہے۔ ایں؟''

''رابرٹ صاحب'' طلعت نے منہ لٹکا کر کہا'' اسے تو بس اسٹنٹ ہی سمجھو۔''

''اچھا اب تم باہر جاؤ۔ دیکھو اگلا ایکٹ شروع ہونے والا ہے۔''

''پتا نہیں اگلا ایکٹ کیسا ہوتا ہے؟'' اس نے غیر یقینی لہجے کے ساتھ رنجیدہ آواز میں کہا۔

''مجھے تو خود پتا نہیں۔'' طلعت نے گرین روم کے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے اگلے ایکٹ کے متعلق ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔''

دروازے میں پہنچ کر اخبار نویس پھر ٹھٹکا: ''ایک بات اور ____ صرف ایک آخری سوال۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' طلعت نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ '' _ _ خدا را ____ '' طلعت نے گرین روم کا دروازہ بند کیا اور ونگ میں جا کر اپنے کیو کے انتظار میں مصروف ہو گئی۔

دھان کے پھٹکنے اور ساون کی بارش کی صداؤں کے ساتھ ساتھ فریدہ کی حسین بنگالی آواز رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئی:

بیلا نائی رے جولدی جولدی ________

(وقت نہیں ہے جلدی کرو)

او بیلا شونار کونزا اونچل دھوئی را ________

(سنہری کنیا کا آنچل پکڑ کر دن ڈوب رہا ہے)

جادور کاٹھی ہاتھ لوئی یا آئی لورایت بوجھی

بلا نائی رے جولدی جلدی ________

بیلا نائی ________

٨٠

وقت نہیں ہے۔جلدی کرو۔جلدی کرو ________

وقت نہیں ہے ________

لوگوں کو دیکھو ان کے چہرے کتنے کریہہ ہیں ۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ان سے بھاگو ____ بھاگو ______ اب میں کس اور جاؤں۔میرے دشمن میرے دوست۔میں نے انہیں راستے کے کس موڑ پر چھوڑ دیا۔

جھیل کے پار ندی کے پار سمندر کے پار وہاں کیا ہے۔ہم نے ٹکٹ تو جنوبی ممالک کا لیا تھا پر کیا تمہیں یقین ہے کہ جہاز والوں نے گائیڈ ز نے جو بتایا وہی

ٹھیک ہے' یہ میں ہوں۔ یہ تم ہو۔ باقی سب میرا پروجیکشن ہے۔ یہ مستقل'' میں۔

''سامنے دسرخ چھت کا چلبل ہے اور اس میں گھنٹیاں بج رہی ہیں یہاں کس کی شادی ہے؟ بہار آگئی ہے۔ پگڈنڈیوں پر پھول جھک آئے ہیں۔ ابھی وہ دونوں نہیں پہنچے جن کا بیاہ ہوگا۔

چلتے چلتے میرے پاؤں بھی جل گئے۔ اس نے رنج سے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ایک سوتا ہوا چاند برخنس گاؤن کے اوپر ڈول رہا تھا' وہ سرحد عبور کر کے ہنستے ہوئے سالزبرگ میں داخل ہوئے۔ یونہی خوشی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس میں پہنچے جہاں ایک بیس سال پرانا فلم چل رہا تھا۔ بیس سال پرانا فلم دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ باہر آ کر وہ ایک اور سرائے میں جا بیٹھے، وہ اپنی ٹانگیں کرسی پر رکھ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ ایپرن سے ہاتھ پونچھتا ہوا خوش مزاج دھندلی آنکھوں والا بوڑھا ان کے سامنے آیا۔

''یہ شاہان اودھ کا خاندان ہے۔''وہ خوب ہنسا۔''تم جانتے ہو شاہان اودھ کون تھے؟''انہوں نے کاغذ کے نیپکن پر اپنے نام اکٹھے لکھے۔

وقت نہیں ہے ــــــ وقت نہیں ہے ــــــــ

''ہلو بھائی جان ــــ ''دروازہ کھلا اور زرد تنگ موری والی پتلون پہنچے ایک بے حد حسین لڑکی ان کی میز کی سمت بڑھی۔''بھائی جان آپ کا تار مجھے آج ملا۔''

''آپ کون ہیں؟''روشن نے پوچھا۔

''یہ میری کزن ہیں ــــــ شارخ سلطان پیرس میں ریڈیالوجی پڑھتی ہیں۔''

''بھائی جان یہ کون تھیں؟'' روشن کے باہر جانے کے بعد نووا رولڑکی نے دریافت کیا۔

''یہ ____ ان کو بھی میری کزن ہی سمجھو''

''ہائے اللہ ____ آپ کتنے مزاحیہ ہیں ____ پر یہ کافی مغروری معلوم ہوتی ہیں ____ ایک دم اٹھ کر باہر کیوں چلی گئیں؟''

''مغرور تو نہیں ہائی بروضرورت سے زیادہ ہیں۔ گرٹن کالج انٹرنیشنل سٹ سے ملاقات وغیرہ جانتی ہو تم یہ ٹائپ؟''

''ہائے اللہ' کس قدر دلچسپ۔'' شارہ خ سلطان نے مسرت سے کہا۔

اس نے ایک گہری تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ یہ سالزبرگ ہے اور مئی کا مہینہ۔ میں تمہیں ایک روز اپنی کہانی سناؤں گا۔

وقت نکلا جا رہا ہے ____ جلدی کرو۔

بھاگو۔ بھاگو۔ بھاگو۔

باہر ایک امریکن مشنری آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درختوں کے نیچے کرسیاں پڑی تھیں ارگلی کی محراب کے نیچے کوئی اکارڈین بجا رہا تھا۔ سڑک کی دیوار پر بیٹھے بیٹھے اس نے بڑے اخلاق سے مشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا: ''ہاؤ ڈو یو ڈو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہیں اپنی روح بچانی ہے؟'' مشنری نے بے اندازہ اہمیت اور رازداری کے لہجے میں کہا۔ گویا اگر آپ کو مضبوط جوتے بنوانے ہوں تو ہماری فرم میں تشریف لائیے۔

''امریکن؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں مجھے پیٹر کہتے ہیں۔''

''بیٹھ جاؤ پیٹر۔ کہو اچھے تو ہو۔''

''جی تھینکس ______ میں یہاں سے چھتیس گڑھ جا رہا ہوں۔ ہم نے وہاں ایک نیا مشن قائم کیا ہے۔'' پیٹر نے آسانی خوشی سے بے حال ہو کر بتایا۔ ''میں پرنسٹن میں پڑھتا تھا۔''

''ہاؤنڈرفل۔''

''میں پروفیشنل بیس بال کا کھلاڑی بننے کی ٹریننگ لے رہا تھا جب میں نے دفعتاً کال سن لی۔''

''کیا سن لی؟''

''کال۔''

''تمہیں ایک بات بتاؤں پیٹر ____ میں نے بھی کال سن لی ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ تو خداوند خدا کی بڑی مہربانی ہے۔ کب سنی؟'' پیٹر نے دلی مسرت سے پوچھا۔

''ابھی ابھی۔ چند لمحے پہلے تقریباً نو بج کر پندرہ منٹ پر۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''یا شاید نو بج کر بارہ منٹ تھے۔'' اس نے سڑک کی دوسری طرف سرائے کے جگمگاتے دریچے کی اور نظر اٹھائی' پھر اس نے ہنس کر مشنری کو دیکھا' وہ بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے اسے تکتا رہا۔

سوتا ہوا چاند تیرتا تیرتا دریچے کے عین سامنے آ کر ٹھہر گیا اور اس کی روشنی سے خاموش کمرہ دفعتاً جگمگا اٹھا۔ برابر کے اسٹوڈیو میں رنگا ناٹھن مردنگم بجا رہے تھے۔ براؤن بالوں‘ ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والے ڈچ انڈونیزین لڑکے‘ جو سریکھا کے ٹروپ میں شامل تھے‘ ناچنے کے بعد لکڑی کے فرش پر کاہلی سے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ طاعت دریچے میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوہے کو سیسہ پلا دیا ہو۔

ہاؤ اللہ آپ کتنا عمدہ گاتے ہیں۔

ہائے اللہ اسکیننگ کا لباس آپ پر کتنا بجتا ہے۔

ہائے اللہ ____________

فیروز دوسرے دریچے میں پہنچی جانے کا ہے کی نقل کر رہی تھی۔ طاعت نے اینچیوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

برج باسیوں میں شیام

برج باسیوں میں شیام بنسری بجائے جا ____ بجائے جا ________

طاعت نے یکلخت الاپنا شروع کیا۔

’’پھر بے وقت کی راگنی۔‘‘ فیروز نے غصے سے طاعت کو دیکھا۔

’’روشن آ گئی۔‘‘ نرگیش نے دریچے میں سے جھانک کر اطلاع دی۔

’’ہوا میں پھولوں کی مہک اڑ رہی ہے اور یہ مئی کا مہینہ ہے۔ ہم اس

اندھیرے کمرے میں حسب معمول الوؤں کی طرح بیٹھے بول رہے ہیں ـــــــ ٹووٹ ـــ ٹوہو ـــــ آؤ بہن روشن' تم بھی آؤ___ ''طاعت نے اسے صدق دل سے خوش آمدید کہا۔

''تم لوگ۔''اس نے شک وشبے کی نظروں سے لڑکیوں کو دیکھا۔''تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ میں سرحد کے پار تنہا رہ گئی ہوں۔سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔یہ کتنے بدصورت ہیں۔میں چاروں اور گھومتی ہوں۔سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔یہ کتنے بدصورت ہیں۔میں چاروں اور گھومتی ہوں۔کہیں جگہ تلاش کرسکوں جہاں بیٹھ کر روؤں۔''

وہ لکڑی کے فرش پر بکھرے ہوئے سازوں کے قریب بیٹھ گئی۔

''تم ابھی کون سا گانا گارہی تھیں؟''اس نے پوچھا۔

''یونہی___ بکواس تھی ____ لکھنو ریڈیو کا ایک پرانا گیت۔''طاعت نے جواب دیا۔

''مجھے وہ گیت سناؤ۔''

''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو؟''طاعت نے فرش پر چاروں طرف ناچتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''تم لوگ اتنے مغرور کیوں ہو؟''وہ زور سے چیخی۔

گلی کے نیم تاریک محراب میں سے نکل کر کملا دریچے کے پاس آگئی۔

''ٹھہرو روشن' میں تم کو ایک گیت سناؤں گی' گندھروید کا سام گیت۔رنگا تھن'' طاعت نے ناچتے ناچتے رک کر آواز دی'' مردنگم اور زور زور سے کیوں

نہیں بجاتے؟''

''تم روتی کیوں نہیں؟'' کملا نے روشن کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھا۔

''کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جب لوگ انہیں چھوڑ کر آگے چلے جاتے ہیں تو لڑکیاں روتی ہیں۔'' اس نے اداسی سے سوال کیا۔

''دیکھو'' روشن نے کملا کو مخاطب کیا'' اتنے برسوں تک میں ایک گھر بنانے میں جٹی رہی لیکن ٹھیک نو بج کر پندرہ منٹ پر وہ گھر ٹوٹ کر زمین پر آ گیا۔''

''کاہے؟ کیسے؟'' طلعت نے پوچھا۔

''میں نے اسے خود توڑ دیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور اڑا اڑا دھم' وہ ایک دم نیچے آن گرا۔ اب میں بڑی بے فکر ہوں۔ اب میں آرام سے سویا کروں گی اور کوئی گھر تعمیر نہ کروں گی۔ اللہ حافظ۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ''اب میں تمہارے بدصورت' اداس اجاڑ مکانوں میں رہا کروں گی۔''

ڈچ انڈونیزین لڑکے ایک جمائی لے کر دریچے میں جا کھڑے ہوئے۔

''میں نے اس گھر کے ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔'' چلتے چلتے اس نے دروازے میں سے سر نکال کر کہا اور زینے کی اور مڑ گئی۔

طلعت بھی دریچے میں آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ باہر بے پایاں اندھیرا ہے اور اندھیر مہربان ہے اور اندھیرا ہمارے ہر دکھ' ہر غم' ہر شکست کو اپنے میں سمیٹ لیتا ہے کیونکہ آخر میں ہم خود اس بے پایاں اندھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

گو ہمیں کبھی اس طرح نہ مرنا چاہیے۔

''ہلو ______ '' اچانک فیروز نے گلی میں آ کر دریچے میں سے اندر جھانکا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''میں دھوبن کے یہاں گئی تھی۔''

''بہت اچھا کیا تھا۔'' طلعت نے بے دلی سے کہا۔

''اب ان کا۔ تمہارے بھیا صاحب کا کیا کیا جائے؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ڈارلنگ ______ کافی میں تم نے پھر کتھا گھول دیا۔'' اسٹور کے پاس سے کملا چلائی۔

''تم سے کس نے کہا ہے کہ بکری کی طرح ہر وقت پان چبایا کرو۔'' طلعت نے گرج کر جواب دیا۔ ''سارے میں مار پان کے لوازمات بکھرے ہوئے ہیں۔''

''ڈارلنگ۔'' سریکھا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خبر سنائی۔ ''ساجدہ آپا۔''

''____ نیچے گیلری میں کھڑی پوچھ رہی ہیں کہ اپنا افسانہ کب تک لکھ کر لائیں۔ یہ کون سا نیا رکٹ تم نے چلایا ہے ______ '' کملا نے غصے سے مطالبہ کیا۔

''دراصل ______ دراصل کملا ______ برلین کے واقعے کے بعد سے میں ساجدہ آپا کی رائے گوپال بنی ہوئی ہوں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ وہ اپنے مختلف تجربات اور تاثرات پر ایک افسانہ لکھنے جا رہی ہیں تو میں نے

______ میں نے ____ ان سے کہا کہ میں اسے کسی اردو رسالے میں چھپنے کے لیے بھجوا دوں گی۔'' طلعت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''از برائے خدا ان سے کہہ دو کہ مجھ پر اپنڈی سائیٹس کا حملہ ہوا ہے اور مجھ ہسپتال لے گئے ہیں۔''

''ادھر آؤ تم سب۔'' نرگیش نے گیلری میں سے آواز دی۔

ریرسل روم میں ساجدہ بہن ایک سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم ____ پیاری بہن'' انہوں نے گرم جوشی سے کہا۔

''وعلیکم السلام پیاری بہن ______ بیٹا قیس کس حال میں ہے۔ اور شیر لوہے کے جال میں ہے ____'' طلعت نے نعرہ لگایا۔

''ہائے بس تم ہر وقت مذاخ کرتی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''اب اپنا افسانہ پڑھ کر بھی سناؤ گی' ساجدہ بہن؟'' طلعت نے لرز کر سوال کیا۔

''آہ ____ یہ کچھ یادیں ہیں میرے انگلستان کے زمانہ قیام کی۔'' انہوں نے بیگ میں سے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم تو مجھے سمجھتی ہو نا۔''

''لا ساجدہ بہن ____ کافی پیو ____'' فیروز نے مہمان نوازی شروع کی۔

''ہرگز نہ پیجئے گا۔ اس میں کتھا گھلا ہے۔'' کملا نے آگاہ کیا۔

''اجی کتھا ہو یا نہ ہو' کیا فرق پڑتا ہے' دنیا کی ہر چیز فیراڈ ہے فیراڈ۔'' فیروز نے سخت فلسفیانہ انداز سے کہا۔

طلعت کو غصہ آ گیا' وہ آتش دان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہوا میں ہاتھ ہلا

کراس نے کہنا شروع کیا:

میز ہل جائے گی اور کافی چھلک جائے گی، مجھے معلوم ہے دوست

میز میں پیر لگا۔ میز کو جھٹکا سا محسوس ہوا۔

ہل گئی میز تو کافی چھلکی، کافی چھلکی تو مگر گر نہ سکی

میز کا فعل عبث

دونوں میں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں

گھور کر دیکھ نہ یوں دوست مجھے

بدتمیزی سے بہت دور رہا کرتا ہوں

اتفاقات کے یہ گہرے نکات

میز تو میز ہے گردوں کو ہلا دیتے ہیں

اور سیارے چھلک جاتے ہیں

ایسے ہی جیسے کہ کافی چھلکے

ساجدہ بہت خوش ہوئیں۔ ''اس کا عنوان کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''فیراڈ ـــــ ہی سمجھ لو ـــــ تال جسن کی تازہ ترین تصنیف ہے۔''

''اچھا، سریکھا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ انہوں نے فون پر مجھے اسی وقت کا اپوائنٹ منٹ دیا تھا۔''

سریکھا دوسرے کمرے میں ڈچ انڈونیزین رقاصوں کو ریہرسل کرا رہی تھی۔

''تم اپنے حواس میں ہو۔'' طاعت نے اس کے پاس جا کر غصے سے کہا۔ ''یہ تم لوگوں کو ملاقات کا وقت کب سے دینے لگیں؟''

''روشن کو تم نے کہاں غائب کر دیا؟'' وہ گرجی۔

''مجھے کیا معلوم۔ میں ہر سمے اس کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔'' طاعت نے جواب دیا۔

''ہائے کس قدر دلچسپ۔'' ساجدہ بہن نے دروازے میں پہنچتے ہوئے کہا۔'' میری ہمیشہ تمنا تھی کہ بیک اسٹیج زندگی دیکھوں۔''

''کیا ذلیل تمنا تھی۔'' طاعت نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دل میں کہا۔

''نمستے جی۔'' سریکھا نے بے حد سنجیدگی سے ساجدہ آپا کے قریب آ کر کہا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔'' اس نے فوراً انٹرویو لینے والا انداز اختیار کیا۔

''تمہاری رائے نے سب کا بیڑا کر دیا۔'' ساجدہ آپا کے جانے کے بعد کملا نے طاعت سے کہا۔

''ایں؟''

''ہاں۔ مثلاً اگر تم نے ساجدہ بہن کو رائے نہ دی ہوتی کہ وہ فری ورلڈ کی لیڈری چھوڑ کر افسانہ نگاری پر اتر آئیں تو کیا ہوتا؟''

''تو وہ فری ورلڈ کی سب سے بڑی لیڈر ہوتیں۔'' طاعت نے اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن اب وہ انسپریشن کی تلاش میں رومینٹک جنگلوں میں گھومتی ہیں۔'' فیروز نے کہا۔

''جنگلوں میں؟'' کملا نے پوچھا۔

''ہاں جنگل یعنی ووڈلینڈ۔''

''سینٹ جانز ووڈلینڈ؟''طلعت نے سوال کیا۔

''کمینے پن پر مت اترو۔'' فیروز نے کہا۔

''دراصل سینٹ جانز ووڈ کے اسٹوڈیو فلیٹس میں تبدیل شدہ اصطبلوں اوران میں رہنے والے کلاکاروں کی صحبت نے ان کی نفسیات پر بہت پریشان کن اثر ڈالا ہے اور دوسری بات یہ ــــــ'' کملا نے خفگی سے کہا' ''کہ اگر تم نے روشن کو کوئی سیدھا راستہ دکھایا ہوتا تو وہ کب گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر لیتی۔''

''وہ لامحالہ گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کرلے گی' وہ فلسفی ضرور ہے مگر یہ نہ بھولنا کہ بورژوا فلسفی ہے۔''طلعت نے کہا۔ ''ارے جب میاں بجرے باگوں میں آئے ــــــ مالی بھئے اگوانی ــــــ ''اس نے ڈھول اٹھا کر الاپنا شروع کر دیا۔

''اور میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سارا اسرار ہے کیا آخر؟''سریکھا نے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔

''اتفاقات کے یہ گہرے نکات۔''سریکھا نے سیٹی بجائی۔

''میں دھوبن کے یہاں جا رہی ہوں۔'' فیروز نے دریچے میں سے باہر گلی میں کودتے ہوئے کہا۔

جاڑے آئے اور برف سے سارے راستے سفید ہو گئے۔ اسٹیٹ گارٹ' ترویز' ویزرن۔ ساری جگہوں کو برف نے ڈھانپ لیا۔ کرسمس کے پنٹو مائم شروع ہوئے۔ لوگوں نے جنوب کی طرف روانہ ہونا شروع کیا۔ اسٹرن برگ میں چار خانے دار موزے پہنے غریب جرمن لڑکیاں کرسمس کی خریداری کر رہی تھیں اور امریکن سپاہی انہیں اسگریٹ کے ڈبے تحفے میں دے رہے تھے۔ نوتر دام کی راہبات سین کے کنارے کنارے اپنی بھگیاں ہانک رہی تھیں۔ ونٹر سپورٹس کا زمانہ آیا۔ برف کے خطرناک حصوں کو جالیاں لگا کر علیحدہ کر دیا گیا۔ وکی بام نے شاید کوئی نیا ناول لکھ لیا تھا اور برف بڑی مہربان تھی۔

پھر برف پگھلی۔ درختوں میں نئی کونپلیں نکلیں۔ ساری کائنات پر شدید' خالص رنگ بکھر گئے۔

خزاں آئی۔ جنگلوں میں سرخ آگ ایسی لگ گئی۔ تیز سرخ پتوں کے انباروں نے پگڈنڈیوں اور سڑکوں کو اپنے میں چھپا لیا۔ ہوا کی نیلاہٹ میں زردی شامل ہو گئی۔

چلتے چلتے تھک کر روشن راستے میں ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سامنے ایک پرانا چرچ تھا' وہ غیر ارادی طور پر قبروں کے کتبے پڑھنے لگی' پھر وہ اندر گئی۔ چپل خالی پڑا تھا۔ گھسے ہوئے اوک کی بنچیں۔ چستمہ دینے کا سر دحوض۔ دیواروں پر ان کرنلوں اور کپتانوں کی تاریخ وفات کی پیتل کی تختیاں لگی تھیں جو اس قصبے میں پیدا ہوئے اور سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے جھانسی اور کانپور اور رزمک میں کھیت رہے۔ اس نے بے دھیانی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے چند سکے فنڈ کے ڈبے میں ڈال

دیے۔

''ہلو۔ میری بچی ____'' بہت بوڑھے پادری نے محبت سے کہا' وہ پیچھے درختوں سے نکل کر آیا تھا اور لنگڑا تھا۔

''ہلو ____ گڈ ایوننگ ____'' اسے بے حد ڈر لگا۔ اس نے مسکرا کر چند اور سکے بکس میں ڈالے اور باہر آ گئی۔ کیا فضول بات ہے۔ چرچ بنا رکھے ہیں۔ اس نے جھنجھلا کر کہا' پھر اس کا جی چاہا کہ واپس جائے اور ایک اوک کی بنچ پر سر رکھ کر پڑ سوتی رہے۔

اس کے ساتھ وہ گھنے جنگلوں اور ہرے جزیروں میں سے گزری تھی۔ طویل مرمریں گیلریوں میں چلی تھی۔ اونچی سفید سیڑھیوں پر چڑھی تھی جن کے اختتام پر رومن ستونوں میں سے تیرتا ہوا چاند یکلخت سامنے آ جاتا تھا اور چاروں اور سائپرس کے درخت تھے۔ آسٹریا۔ یونان۔ اٹلی۔ اب وہ پھر مانوس پرانے انگلستان میں موجود تھی۔

لندن میں وہ سریکھا کے مکان کی بالکنی پر جھکی رہی۔

''وہ سب ایکٹنگ تھی۔'' اس نے بڑے باوثوق طریقے سے عامر رضا سے کہا۔

''پتا ہے۔'' عامر رضا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ان کو ہمیشہ سے ہر بات کا پتا تھا۔ خود ان کو نروان ملنے والا تھا زوان کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔

''مجھ میں بہت کمال کا اسٹیج سنس ہے۔''

''معلوم ہے ____ تم نے بھی کالج میں ایلوکیشن سیکھا ہے اور اسکالا تھیٹر

میں تم ـــــــ''

''ہاں ـــــ''اس نے خوشی کے لہجے میں بات کاٹی ـــــ''اور اسی لیے اب میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے مسرت ہے کہ تم نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت سمجھ دار ہو ـــــــ دراصل غلطی سراسر میری ہی تھی۔ میں صدق دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔''

''میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔''اس نے بہت فراخ دلی سے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں بالکنی پر جھکے سیٹی بجاتے رہے۔

۸۳

سوتا ہوا چاند کاہلی سے چاروں اور تیرا کیا۔ بالکنی کے نیچے سریکھا بیٹھی تھی۔ وہ اور زرینہ نئے اسٹیج ڈیزائن بنانے میں مصروف تھیں۔

''وہ دیکھو۔ چاند مر رہا ہے۔''اس نے اچانک انگلی اٹھا کر روشن کو مخاطب کیا۔

''ہاں۔''روشن نے پہلی بار دیکھا۔ چاند مر چکا تھا اور اس کی زرد لاش رات کی ہوا کے رحم و کرم پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔

''تم نے دیکھا۔''سریکھا نے آہستہ آہستہ کہا ـــــــ''یہ سب اسٹیج کی سینری تھی۔ ڈیزائن۔ ڈیکور۔ کینوس کے رنگین پردے۔ پردیس۔''

گیلری میں لفٹ آن کر رکا۔ طاعت اور نرگیش اندر آئیں' وہ نرملا کو دیکھنے مڈہرسٹ گئی تھیں اور واپسی میں انہوں نے دیکھا کہ ہیزل میر کا جنگل وہاں نہیں

تھا۔تب طاعت کو معلوم ہوا کہ موسموں کے ساتھ ساتھ اس جنگل کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ہیزل میر کا جنگل کبھی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتا۔

کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔کملا نے روشن کو غور سے دیکھا' گویا اسے پہچاننے کی کوشش کرتی ہو' پھر وہ اپنی اور سریکھا کی بھرت ناٹیم کی ملبوسات کو الٹنے پلٹنے لگی۔

''کملا______ ''طاعت نے دفعتاً کہا۔''لوئی مک نیس کی وہ نظم سناؤ۔''

''کون نظم؟''

''وہی____ جو خزاں نامے' میں شامل ہے۔''

کملا آتش دان کے مصنوعی انگاروں کو دیکھتی رہی' پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"I loved my, with a platform Ticket"
A handbag, a pair of stockings of paris and
I love her long
I loved her between the lines and against the clock,
Not until death
But life did us part
I loved her with paacocks eyes
and the wares of carthage.
With blasphemy, camaraderie,

and bravado and lots of other stuff.

I loved her with my office hours, with flowers and

Sirens,

With my budget, my latchkey

and my daily bread;

And so to London and down the

ever-moving Stairs."

سب خاموش بیٹھے رہے۔

''کملا ____ ''طلعت چلائی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ قریب آ کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں یاد ہے۔'' کملا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جولائی یا اگست کی ایک شام' جب بارش ہو کر تھمی تھی' گل فشاں بالکل سنسان تھی۔ سب لوگ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں اور نرملا اور تم اکیلے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور شام کی نیلی روشنی سارے میں پھیل گئی تھی اور اس سے دو سنیاسنیں منتر پڑھتی پھاٹک کے اندر آ گئی تھیں اور مصر تھیں کہ ان کو دکھشنا دی جائے اور بچوں کی طرح ہمیں ایکا ایکی یہ خیال آیا تھا کہ یہ چڑیلیں ہیں' ہم اتنے بڑے گھر میں تنہا ہیں' ابھی یہ ہمیں شراپ دیں گی' ابھی کچھ ہو گا' اس سناٹے میں کوئی خوفناک انجانی بات ہو گی۔''

''پھر وہ جاپ کرتی اور راجستھانی میں بڑبڑاتی واپس چلی گئی تھیں۔ہم نے خوفزدہ ہوکرانہیں زور سے ڈانٹا تھا۔''طاعت نے آہستہ آہستہ کہا۔''اور پھر ہمیں مہوے کے سائے سے بھی ڈر لگا تھا۔ ہم سہمے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔میں نے کوشش کر کے آیتہ الکرسی پڑھی تھی اورتم نے اپنا وہ اکلوتا اشلوک دہرانا چاہا تھا جوتمہیں کبھی یاد نہ ہو سکا۔''

''وہ بڑی سنسان شام تھی۔'' کملا نے یاد کیا۔''تم نے کبھی سوچا ہے' ساری شامیں بہت سنسان ہوتی ہیں۔ان میں ایسی بے پایاں اداسی ہوتی ہے۔شام ______ جب دونوں وقت ملتے ہیں۔جب ہم جگمگاتے کمروں میں ہنستے ہیں۔ اس وقت بھی دفعتاً بڑے رنج' بڑی پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔''

''پھر ہم تینوں خاموش سڑک پر سے گزر کر سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے تھے اور وہاں لاج کے ساتھ مل کر اپنے اس طرح خوفزدہ ہو جانے پر بہت ہنسے تھے۔''طاعت بولی۔

''وہ سنیاسنیں ہمیں ہر جگہ' ہر موڑ پر ملتی ہیں' وہ ہمیں بددعائیں دیتی مہوے کے سائے میں غائب ہو جاتی ہیں۔اندھیری راتوں میں میں نے ان سنیاسنوں کو چلا چلا کر روتے سنا ہے۔'' کملا نے کہا۔

دوسرے کمرے میں زور زور سے مردنگم بجنا شروع ہوگیا۔آج رات سریکھا اور کملا کا ناچ ہے۔سارا عالم دیکھنے کے لیے آئے گا۔طاعت کو خیال آیا۔

روشن اس کے قریب آئی۔''میں واپس جا رہی ہوں۔تم لوگ مجھے کبھی کبھی خط لکھا کرو گے؟''طاعت کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز میں التجا تھی۔

''ہاں۔ ہم تمہیں ہر سال عید اور سال نو کے کارڈ بھیجیں گے۔'' طاعت نے کہا۔ (کیا انجام بس اتنا ہے۔ کچھ عرصے تک ان سب کے کرسمس کارڈ روشسن کے پاس جائیں گے مگر وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ راہ میں جب مختلف خرابوں کے وسیع ویرانے اور سیاسی حد بندیاں حائل ہوں تو کہاں تک ان خوشگوار تعلقات کو گھسیٹا جا سکتا ہے۔ ہاں۔ ہم تمہیں کبھی بھولیں گے نہیں روشن ڈیئر۔ اس نے دہرایا۔ ''ہم سب ایک شراپ کے زیر اثر ہیں۔''

مردنگ کی آواز تیز ہو گئی۔ نادر دام تا ندی رے نا ____ سریکھا چھن سے اسٹیج پر آئی۔ اب حسب معمول میں ناچوں گی۔ اس نے سوچا۔ کملا ناچے گی۔ سب ناچیں گے۔ ای رپوجتی سورم۔ شبدم۔ شو جاری رہے۔ ایسی کیا خاص بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں جاری رہے۔ کڑتک تام تت تام۔ کڑتک تئی تت تئی۔ کل مجھے ٹیلی ویژن پر ناچنا ہے۔ پرسوں ہالینڈ جا کر ملکہ جولیانہ کے لیے رقص کرنا ہے۔ دریا بہے جا رہا ہے۔ ڈلن ٹامس مر گئے۔ بلبل چودھری مر گئے۔ روشن ____ افسوس کہ وہ بھی شاید مر گئی۔

اور اب ہال خالی پڑا ہے۔ صرف راوا کی چند لڑکیاں اور لڑکے ادھر ادھر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اخباروں کے نمائندے کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے سریکھا دیوی کے قیمتی الفاظ سننے کے لیے کان لگائے کھڑے تھے۔ کارڈ بورڈ کے سیٹ افراتفری کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔

''رقص میری زندگی ہے۔'' سریکھا نے رامیشورم کے مندر کی سیڑھی پر پیر

ٹکاتے ہوئے انٹرویو والی شائستہ اور متوازن آواز میں کہنا شروع کیا۔

''خداوندا ______ سریکھا۔'' طاعت نے بے انتہا بور ہو کر جمائی لی۔

''ہش ______ میں پریس کو بیان دے رہی ہوں۔''

اخبار کے رپورٹر مسحور ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

طاعت نیم تاریک آڈیٹوریم کی ایک نشست پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا۔ یہ ننھا سور گھر پر رہا۔ اس ننھے سور نے بھنا گوشت کھایا۔ یہ ننھا سور سارے راستے روتا ہوا گھر واپس آیا۔ وی وی وی وی وی۔

وی وی وی وی وی ______ شور اب آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ چمپا نے دریچہ بند کر دیا اور ہوسٹل سے باہر نکل آئی۔ سارے میں سہ پہر کا سناٹا طاری تھا کل کالج بند ہو جائے گا۔ اب میں کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟ (زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے۔) یہ تجربہ بھی غالباً ناکام رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دور دور تک پھیلے ہوئے باغوں کو دیکھا۔ کیمبرج کی ہریالی پر نیلی گھٹائیں چھائی تھیں، وہ بیکس پر سے گزرتی لائبریری کی طرف جانے والی پلیا پر آ گئی۔ ''شولوم صلیخم۔'' ایک یہودی طالب علم دوسرے یہودی طالب علم کو، جو پلیا پر بیٹھا تھا، سلام کرتا ہوا سائیکل پر گزر گیا۔ ''تم پر خدا کی رحمت ہو۔''

''تم سب پر خدا کی ______ رحمت ہو۔''چمپا نے دل میں دہرایا۔

زندگی میں بذات خود اتنی شدت ہے۔اس کے لیے فلسفے کی فروعات کی کیا ضرورت ہے اور مسرت کی تلاش کے سلسلے میں ہم کس قدر کمینے بن جاتے ہیں۔

یہودی طالب علم، جو پلپا سے درخواست کی۔''میں تمہارا اسکیچ بناؤں گا۔''وہ بیٹھ گئی تا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔''آج آخری دن ہے۔کل تم جانے کہاں چلی جاؤ گی۔ تمہارا اسکیچ میں اپنے پاس رکھوں گا۔'اس نے تندی سے پنسل چلاتے ہوئے کہا۔

چمپا نے جھانک کر دیکھا۔اسکیچ بڑا خراب تھا' مگر وہ بڑے صبر اور اخلاق سے چپکی بیٹھی رہی۔شاید میری اصل شکل ہے۔اس نے دل میں کہا۔''یہ ناکام مصور ہی شاید میری شبیہہ اتارنے میں دراصل کامیاب رہا ہے۔''

''پسند آئی تم کو تصویر۔''یہودی لڑکے نے خوشی سے پوچھا۔''میں تم کو مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔میں تم کو کس طریقے سے خوش کروں؟''وہ بڑا پر خلوص نظر آیا۔

''تم مجھے خوش نہیں کر سکتے۔''چمپا نے دفعتاً بڑی کرختگی سے کہا۔(ہم سب کمینے ہیں۔مسرت کی تلاش میں ہماری چار سو بیس تو دیکھو۔اس نے دل میں س وچا۔

''وہ کون ہے؟''لڑکے نے یکلخت بے حد رنجیدہ ہو کر پوچھا۔''وہ کون ہے جو تم کو مسرت بخشے گا؟''

''یہ بڑا بے رحم اور کمینے پن کا سوال ہے۔''

''معاف کرنا۔''اس نے اداسی سے کہا۔

''اچھا خدا حافظ شولوم علیخم۔'' چمپا نے مسکرا کر کہا۔

''شولوم علیخم۔'' لڑکے نے جواب دیا اور اسے ندی کی سمت جاتے ہوئے دیکھتا رہا جدھر مائیکل اور ڈینس کھڑے تھے۔

''سرل اب تک نہیں ملا؟'' ڈینس نے سراسیمگی کے عالم میں چلا کر پوچھا۔

''نہیں''

''کہاں غائب ہو گیا سرل'' ڈینس نے کہا۔ ان دونوں نے غصے سے چمپا کو دیکھا۔

''میں سرل کی ذمہ دار نہیں ہوں ڈینس۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ چمپا' مجھے معاف کر دینا۔ کیا میں تم پر برس پڑا تھا؟'' مائیکل نے عجز سے کہا۔

''نہیں مائیکل۔ ٹھیک ہے۔''

''آج آخری دن ہے چمپا''

''ہاں۔''

''چلو چل کر آخری مرتبہ کو یہ نور میں کھانا کھا لیں۔''

''آج آخری۔'' سب یہی دہرا رہے تھے' وہ اس جذباتیت سے بچنا چاہتی تھی مگر یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعہ تھا آج کیمبرج میں طالب علمی کی زندگی کا آخری دن تھا۔

ریسٹوران میں بیٹھ کر انہوں نے سرل کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے تو روشن تک کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ اتنے مہربان کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دوسرے سے اتنی

ہمدردی کیوں کرتے ہیں؟ یہ لوگ میرے بھی بہت سخت بہی خواہ ہیں۔اب میں پھر کمینے پن پر اتر آئی ہوں۔

چند روز قبل اس نے برسبیل تذکرہ روزماری کی خیریت دریافت کی تھی۔

''اچھی ہے۔'' سرل نے جواب دیا تھا۔ ''وہ غریب تو بیماری کی حالت میں بھی نوکری کرتی ہے تا کہ میں کیمبرج میں تعلیم مکمل کرسکوں۔''

''اور ____ دوسری لڑکیوں سے عشق لڑا سکو۔'' چمپا نے بے دھیانی سے کہا تھا۔ یہ سن سرل چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس روز سے سرل غائب تھا۔ کالج کے کوادرینگل میں' گلیوں میں' ندی کے کنارے' قہوہ خانوں اور کتابوں کی دکانوں میں کہیں سرل کا پتا نہ تھا۔

دفعتاً وہ باہر بارش میں بھیگتا دکھائی دے گیا۔ ڈینس لپک کر اس کی طرف دوڑا' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا' پھر مائیکل اس کو بلانے کے لیے گیا' مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ طالب علم برساتیاں اوڑھے خراماں خراماں چل رہے تھے۔

''اندر چلو۔ یہ کیا بچپنا ہے۔'' چمپا اٹھ کر باہر گئی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''بکومت۔''

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیسے آؤں اندر۔'' اس نے آہستہ سے ڈینس سے کہا۔

چمپا کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی۔ ایک ہفتہ قبل اسی جگہ پر اس نے سرل سے کہا

تھا: تمہاری بی بی اس لیے ملازمت کرتی ہے کہ تم دوسری لڑکیوں سے عشق لڑاؤ۔

پھر وہ چمپا کی طرف مڑا: ''تم کو غالباً یہ معلوم کر کے دلچسپی ہو گی کہ روز ماری نے مجھے اس ہفتے چیک نہیں بھیجا کیونکہ میں نے اسے اطلاع دی تھی کہ میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تمہارا ___ تمہارا دماغ یعنی کہ ___ بالکل چل گیا ہے ___ ''چمپا نے ہڑبڑا کر کہا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ مائیکل اور ڈینس اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نفرت جو اس نے تہمینہ نرملا اور شانتا کریگ کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔

''ہاں۔'' سرل نے اطمینان سے جواب دیا اور برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ڈینس اور مائیکل خاموشی سے ریستوران میں واپس چلے گئے۔

بارش چمپا اور سرل پر برستی رہی۔

''چلو یہاں سے چلیں۔ پانی میں بھیگنے کی کون سی تک ہے۔''

''ایسے تو کس بات کی کون تک ہے۔'' سرل نے اسی انداز میں کہا' پھر وہ ہنس پڑا۔ ''دیکھو تو سہی۔ بالآخر مجھ پر بھی تمہارے اپنشدوں کا اثر ہو ہی گیا۔''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے سرل۔'' چمپا نے دوبارہ کہا۔

''ہر واقعہ منفرد ہے۔ دہرایا نہیں جائے گا۔ یہ مت سمجھنا چمپا کہ لمحے دہرائے جاسکیں گے۔ تمہاری زندگی۔ میں یہ ساری چیزیں۔ وقت کے المیے پر تم ہنس نہیں سکتیں۔''

''چلو ___ میں تمہاری طرف چلتی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ فٹ پاتھ پر اس طرح چلنے لگے گویا قبرستان کی طرف جاتے ہوں۔ جب شناسا لڑکے اور لڑکیاں راستے میں ملتے تو وہ بڑے الم سے ان کو ہلو ہلو کہتا جاتا۔

''تم کیا واقعی ___ میری وجہ سے ___ یعنی کہ ___ '' اتنی خوفناک بات اس کی زبان پر نہ آسکی۔ ''یعنی کہ'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا چاہا'' کہ تم نے آخر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔'' فیصلہ۔ اور اس کی وجہ۔ دو چیزیں جو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آسکی تھیں۔

''جی نہیں ___ مجھ کو بقول تمہارے باؤلے کتے نے کاٹا تھا۔'' سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''مجھ پر دراصل کبھی کبھی خلل دماغ کے دورے پڑتے ہیں' اسی کے زیر اثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں۔''

چمپا چوراہے پر آ کر دفعتاً اپنے ہوسٹل کی سمت مڑ گئی۔

''تم تو اپنے زریں مشوروں سے مجھ مستفید کرنے میرے ہوسٹل آ رہی تھیں!''

''میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی سرل۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''یہ تمہارا آخری' قطعی جواب ہے؟'' سرل نے زرد پڑتے ہوئے کہا۔

''آخری' قطعی' بالکل۔ تمہیں اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔''

''تم گوتم نیلمبر کا تعاقب کہاں تک کرو گی؟''

''میری توہین مت کرو سرل۔'' چمپا کے تن و بدن میں آگ لگ گئی۔

''اچھا۔اچھا۔'' سرل نے سانس روک کر کہا۔ ''سڑک پر چلاؤ مت چمپا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ غلطی میری ہی تھی۔خدا حافظ'' بارش کا ایک زوردار ریلا آیا جس سے مکانوں کے پردے لہرا گئے۔ ہوا میں خنک گلابوں کی مہک تھی۔

شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لیے سرل کے کالج گئی۔ رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔ سینور کارلوس برازیل جا رہا تھا۔اس سے اس کی کتنی تکرار رومن کیتھولک فسلفے پر ہوتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بارش سے بچنے کے لیے پھاٹک کے اندر کھڑے تھے۔ پھاٹک کا بھاری' پندر ہویں صدی کا چوبی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہوگا۔

اس کے بعد جب کبھی وہ یہاں آئیں گے تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا۔

بارش اور زور سے ہونے لگی۔ پورٹر ٹیکسیاں لے لے کر آ رہے تھے۔ لڑکوں نے برساتیوں کے کالر کان تک اٹھا لیے تھے۔لڑکیاں چھتریاں کھول رہی تھیں۔ سب خاموش تھے۔اب یہ بات کرنا کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اسٹیٹس آئی تو تم سے ملنے نارتھ ڈیکوٹا ضرور آؤں گی۔یا جینیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ تم جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آ کر ٹھہرنا۔ یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی' اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کوفت سے بچ جائے گا مگر نہیں۔کھڑے ہیں۔ بے ربط' بے تکے جملے ادا کیے جا رہے ہیں۔نظریں بچا بچا کر آنسو پیے جا رہے ہیں۔لاحول ولاقوۃ۔ٹیکسیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھ گئے۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ایک بار اس نے گھوم پھر کر سنسان کواڈرینگل کا چکر لگایا۔ چیپل

میں گئی۔ سنگ مرمر کی تختیوں پر ان لڑکوں کے ناموں کو آخری بار پھر سے پڑھ ڈالا جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ مالیوں سے بات کی۔ ایک خانساماں ڈائننگ ہال کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا گویا وہ خود میدان جنگ پر جا رہی ہے اور دنیا کا انجام ہونے والا ہے' پھر وہ صحن کی دیوار کے دروازے کی طرف جانے لگی جو جیزس لین کی طرف کھلتا تھا۔ راستے میں اسے کیٹ مل گئی۔ ''میں تم کو ڈھونڈ رہی تھی۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ''میں کل کینیڈا جا رہی ہوں۔ اب کب ملیں گے؟''

''پتا نہیں کیٹ'' چمپا نے اس لایعنی سوال سے بچنے کی کوشش کی۔ ''سرل کو دیکھا ہے؟ میں اس کو بھی خدا حافظ کہہ لوں۔ اس نے بڑی بے تعلقی کا انداز پیدا کر کے کیٹ سے پوچھا۔''

''ہاں وہ تو سینئر کومن روم میں بیٹھا ہے۔'' کیٹ نے جواب دیا۔ ''اس کے مزے ہیں۔ کہیں بھی نہیں جا رہا۔ مزے سے اپنے وطن میں رہے گا' ڈاکٹریٹ ختم کرے گا اور تم کو معلوم ہے' مجھ کتنی خوفناک جگہ جا کر رہنا ہے ______ نیو گنی اچھا ڈارلنگ۔ خدا حافظ۔''

چمپا کچھ دور تک اس کے ساتھ چلی اور اس کو پھاٹک تک پہنچا کر سینئر کومن روم کی طرف مڑ گئی۔

سارے کالج پر مکمل سناٹا طاری تھا جسے صرف برستی بارش کی آواز مخل کر رہی تھی پتوں کی سرسراہٹ سرل ایشلے کومن روم میں' دریچے کے پاس' چمڑے کے صوفے پر بیٹھا وہ معمہ دیکھ رہا تھا جو کنگز لے مارٹن ہر ہفتے اپنی انتہائی اٹکلپچول ریڈ سنگ

پبلک سے حل کرواتے ہیں چمپا کمرے میں آ گئی تب بھی وہ معمہ حل کرتا رہا پھر جب چمپا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے سر اٹھا کر ایک حل کے متعلق اس کی رائے پوچھی، چمپا نے غور کر کے اس کا جواب بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ہوسکتا ہے کہ تم غلطی پر نہ ہو۔''اس نے خالص برطانوی انداز میں کہا۔

وہ چونکی۔ اس نے دفعتاً دیکھا دیکھا کہ اس کے سامنے صوفے پر سنہرے بالوں والا ایک برطانوی لارڈ کرلڑکا تھا: قدامت پسند'مغرور خاموش طبع'باوقار۔ اس لڑکے کے ساتھ اس نے چند سال اس یونیورسٹی میں بتائے تھے اور ہم جماعت ہونے کے ناطے اب اسے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ یہ لڑکا وہ نہیں تھا جس نے صبح بارش میں بھیگتے ہوئے دیوانوں کی طرح اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ لڑکا تو لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا سرل ڈیرک ایڈن نہیں۔کون سی ٹرین سے جارہی ہو؟''

''ساڑھے چھ کی ٹرین سے۔''چما نے گھڑی دیکھ کر جواب دیہا۔''تم کب لندن آؤ گے؟''

''جب بھی آؤں'لیکن جہاں تک میرا خیال ہے'تم سے مالقات نہ ہوسکے گی۔میں تم سے عمر بھر نہیں ملنا چاہتا۔''

وہ خاموش رہی۔پانی کی شفاف پھوار دریچے پر ٹکرایا کی۔ہوا کا بھینا بھیناپن کمرے میں رچ گیا۔

یکلخت چمپا نے نہایت بشاشت سے باتیں شروع کر دیں۔ یونیورسٹی

چھوڑنے کے بعد جو پروگرام گروہ کے افراد نے بنائے تھے۔ان کا ذکر کیا۔''میں تو ابھی قانون پڑھوں گی۔''

''مبارک ہو۔اس کے بعد کیا کرو گی۔''

''علم نجوم تو مجھے آتا نہیں کہ بتا دوں کہ ۶۲ء میں کیا کروں گی اور ۶۵، میں میرا کیا ارادہ ہے۔''اس نے خورشدلی کا لہجہ برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''وہ رسالے پر جھکا رہا۔

''تم البتہ ڈاکٹریٹ لینے کے بعد یہاں کے استاد بن جاؤ گے۔تنقید پر موٹی موٹی کتابیں لکھ گے۔ٹی وی کے برین ٹرسٹ کی پینل پر بیٹھو گے۔دنیا عش عش کرے گی۔''

''ہوسکتا ہے۔''

''یا تم ڈاکٹریٹ سے بور ہو کر بنک آف انگلینڈ میں نوکری کرلو۔''

''یہ بھی ممکن ہے۔''

''اچھا اب چلنا چاہیے۔''چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اگر میں تمہاری جگہ پر ہوں تو مجھے زیادہ تاخیر نہ کرنی چاہے۔ٹرین کا وقت قریب ہے۔ ایسی سرل نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔گویا'اب تشریف لے جایئے بیگم صاحبہ۔

چمپا نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کمرے پر آخری مرتبہ ایسی جذباتی حرکتیں کرتے ہوئے وہ خود کو پکڑ لیتی تو بعد میں بہت نادم ہوتی تھی۔دروازے تک آکر اس نے سرل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔دروازہ بہت نیچا تھا۔کئی سو

سال سے اس پر عشق پیچاں کی گھنی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کئی سو سال سے ان گنت طالب علم اسی طرح دروازے سے خدا حافظ کہہ کر نکلے تھے اور باہر کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔

سرل نے جھک کر اس کو جانے کا راستہ دیا اور ہاتھ بڑھا رکھا۔ ''اتنے عرصے۔'' اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ' صاف اور گہری آواز میں ادا کیا۔ ''تم کو جان کر اور تم سے واقفیت حاصل کر کے مجھ بے حد مسرت ہوئی۔ خدا حافظ۔''

وہ عشق پیچاں کی بیل کے نیچے سے جھک کر باہر نکل آئی۔

''تم مجھے پھاٹک تک نہیں چھوڑنے آؤ گے؟'' اس نے یکلخت اپنی اٹل' ازلی اور ابدی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

''نہیں۔'' سرل نے جواب دیا۔ ''مجھے مجھے معمہ حل کرنا ہے اور خدا کرے میری تنوم سے دوبارہ ملاقات کبھی نہ ہو۔''

وہ واپس اندر چلا گیا۔

چمپا کواڈرینگل کے موڑ پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' وہ دریچے کے اندر رسالے پر جھکا معمے میں مصروف تھا۔ چمپا نے پھاٹک کھولا اور سنسان سڑک پر آ گئی۔

سرل نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اس روز کے بعد چمپا احمد کی سرل ایشلے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

بس مڈ ہرسٹ کی طرف جانے والی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ہیزل میئر کے جنگل شام کا اندھیرا اچھا گیا تھا۔ سڑک کے لیمپ لطیف سے دھند لکے میں ٹمٹما رہے تھے۔ چاروں اور اونچے درخت کھڑے تھے' انسانوں کی قسمتوں کے پاسبانوں کی مانند' خاموش اور سب کچھ دیکھتے ہوئے۔

پھر کئی گھنٹے کا سفر طے کر کے بس مڈ ہرسٹ کی طرف مڑی۔ چڑھائی پر دور سے سینی ٹوریم کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جیسے اندھیرے میں روشنی کا مینار ہو یا کسی ان دیکھے اسکاؤٹ نے کسی خطرناک پہاڑ پر سگنل کے لیے الاؤ روشن کر دیا ہو۔ دور سے تاریکی میں روشنیاں اس طرح جھلملا رہی تھیں جیسے زندگی روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے' روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے۔

گوتم نیلمبر بس سے اتر کر سینی ٹوریم کی طویل سڑک پر چڑھنے لگا۔ اندھیرے کے جنگل میں سے گزرتا ہوا جگمگاتی ہوئی عمارت کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ شفاف گیلریاں عبور کرتا نرملا کے کمرے میں داخل ہوا۔

نرملا اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی اور جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''بی بی۔'' گوتم کی آواز یکایک اس کے حلق میں رندھ گئی۔ باہر کی شور مچاتی' خودغرض' دکھی دنیا سے علیحدہ وہ اتنے سکون سے کاہے کہ انتظار میں مصروف تھی۔

اس کے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی انگلیوں سے اس نے بال درست کیے اور دل میں سخت جھنجھلا کہ کوئی آئینہ قریب نہیں جس میں وہ جلدی سے اپنا چہرہ دیکھ لیتی۔

''افوہ۔تم تو بے حد صحت مند نظر آ رہی ہو۔ بالکل سرخا سرخ فرخ آبادی ۔''عیادت کرنے والوں کی طرح یہ بشاش انداز اختیار کرتے ہوئے گوتم نے دل میں خود کو گالیاں دیں۔''کیوں گپ مارتے ہو۔ ذرا ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو پتا چلے گا بچہ جی کو۔آج بھی میرا بخار ایک سو ایک تھا۔اب تو مہینوں سے چلا آ رہا ہے۔''اس نے گویا بڑے فخر سے کہا۔

گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بیٹھ گیا مگر وہ خود بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔اب وہ اس سے حسب معمول لندن کے تازہ ترین اسکنڈلز سنانے کی فرمائش کرے گی۔دوستوں کے جم غفیر کی فردا فردا خیریت دریافت کرے گی۔بات بات میں جرح کرے گی۔

نرملا تو'جس کا میں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا'اب تو میری روح میں شامل ہے۔

مگر وہ دو لڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سکتا ہے۔یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا چمپا ــــــ اور یہ لڑکی ــــــ جس میں چمپا والی کوئی خطرناک خصوصیات موجود نہ تھیں'سیدھی سادی'خوش خلق'معصوم لڑکی۔

''چمپا جو''وومن آف دی ورلڈ بن چکی تھی'ہمیشہ سے مردوں کو اپنی خطرناک کشش سے رجھاتی آئی تھی۔تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے مگر اس کے باوجود بے بس تھی اور اس کی توجہ کی منتظر۔نرملا تھی'جو بستر مرگ پر پڑی تھی'گھریلو'ناتجربہ کار'اس کی توجہ کی منتظر'وہ چمپا کو یکسر بھول جائے گا۔کس قدر کوشش کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چمپا کو اپنے خیالوں سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ایک ملک اور دوستوں کے ایک حلقے میں رہنے کے باوجود اس نے

بڑی کامیابی سے چمپا سے ملنے سے احتراز کیا تھا' مگر اب چمپا کی پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بدس میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈ رڈ اور روم اور وی آنا بجتے ہوئے آرکیسٹراز میں سنائی دیتی' بارش کی پھوار میں' بازاروں اور طعام خانوں کی چہل میں اطلانتک کی لہروں میں نیویارک کے شور وشغف میں' ______ ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آ رہی تھی۔ آوازوں کے تلاطم سے وہ عاجز آ گیا تھا۔ شاید سناٹا اس کے مقدر میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی' نرملا سناٹا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں: لکھنو کے بادشاہ باغ کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے' کوسی نگر کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے' گل فشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور پروفیسر بنرجی کے گھر اور کیلاش ہوسٹل کے ڈرائنگ رومز میں بیٹھے ہوئے' پلنکوں میں اودھم مچاتے ہوئے۔ اسے وہ سب باتیں یاد تھیں' وہ سب شامیں' دوپہریں' لمحات۔ یہ سب سر فضا میں موجود رہتا ہے۔ نرملا خاموش تھی۔ گومتی خاموش تھی۔ برسات کی دوپہر کا سکون' جب بارش ہو کر کھلی ہو۔ کہر آلود سرسوں کے کھیتوں کا سناٹا۔ نرملا نے اس سے کبھی شخصی باتیں نہ کی تھیں چمپا کے ہر لفظ ہر انداز کے ذریعے دوسرے انسان سے ایک غیر مرئی (mystic) رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا: مدتیں گزریں جب وہ پہلی بار لکھنو گیا تھا۔ اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ گو مجھے آفیشل طور پر بر دکھوے کے لیے یہاں بلایا گیا ہے مگر میری ہونے والی منگیتر نرمل رانی کو اپنی الٹی سیدھی بحثوں ہی سے فرصت نہیں جو وہ میری طرف توجہ کریں۔ ہاں نرملا میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔ اس میں خود سپردگی کا انداز کبھی نہ

آیا، وہ علیحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش ــــــ دیبی کی طرح بلند اور اتم۔ دیبی کی طرح سکون بخشنے والی۔ اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے ــــــ اس نے نرملا پر جھک کر دل میں کہا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"گوتم!"

"ہاں بی بی"

"سریکھا کا نیا فلیٹ کیسا ہے؟"

اس نے تفصیل سے سریکھا کے مکان کا جغرافیہ سمجھایا۔ "اب اچھی ہو جاؤ تو آ کر خود ہی دیکھ لینا۔"

"ہاں۔ بالکل۔" نرملا نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

"آج کل ایک نئے بزرگ آئے ہوئے ہیں، طغیان بھاگل پوری۔"

"ہائے کتنے مزے کا نام ہے۔ کریک ہیں؟"

"بہت سخت۔"

"چندرا بھی ہے؟"

"ہاں ہاں۔"

"تمہارے نئے نئے دوستوں کا ذکر سن کر اس قدر دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں، خصوصاً رمیش سنگوی سے۔"

"ہاں۔ رمیش سنگوی بالکل آفت کا پرکالہ ہے۔" گوتم نے مزید بے معنی انداز میں کہا۔

"اب رات زیادہ آ گئی ہے گوتم ماشٹر۔" نرملا نے حسب عادت کمال اور رہری

تشکر کے لہجے میں اس سے کہا۔

''ہاں۔''وہ کرسی پر سے اٹھا۔

''ارے رے رے ایک بات تو سنو۔''دفعتاً نرملا نے بشاشت سے کہا۔

''اتنی زبردست خبر پوچھنا تو بھول ہی گئی۔''

''کیا گوتم نے آہستہ سے پوچھا۔''

کل طلعت بتا رہی تھی کہ چمپا باجی اپنا فائنل امتحان دینے کے بعد کیمبرج سے لندن آ گئی ہیں۔تم کو معلوم ہے؟

''نہیں۔گوتم نے کہا اور اپنے آپ کو دل میں پھر کئی گالیاں دیں۔''

''اچھا۔''نرملا نے سادگی سے جواب دیا۔''میرا خیال تھا شاید طلعت نے بتایا ہو۔تم ان سے مل لو ضرور' بے چاری ہے۔''اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

مجھے آج کل اتنی فرصت کہاں ہے نرمل کہ میں لوگوں سے سوشل ملاقاتیں کرتا پھروں۔ایچ۔سی (ائی کمشنر) رات کے دس دس بجے تک کام کرواتے ہیں۔اس نے نظریں بچاتے ہوئے جلدی سے کہا۔''اچھا بی بی' خدا حافظ!''وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا' گویا نرملا کے سامنے سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہو۔

نرملا' جس کا چھٹا حس بیدار ہو چکا تھا' سمجھ گئی کہ گوتم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔اس کو چمپا باجی کی آمد کی اطلاع ہے اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کو دیکھ کر نرملا کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ چمپا باجی سے ضرور ملے گا۔

نرملا نے آہستہ سے بیڈ سوئچ دبا کر روشنی بجھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ کر

کے لیٹ گئی۔

۸۶

گوتم نے نرملا سے جھوٹ بولا تھا۔ اس روز نڈ ہرسٹ آنے سے کچھ دیر قبل، اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کار کوئی دوست لے گیا تھا اور وکٹوریہ اسٹیشن جا کر وہاں سے مڈرسٹ کے لیے گرین لائن کی بس پکڑنا تھی۔ خواہ مخواہ کی دیر ہوئے جا رہی تھی اور اب یہ فون آ گیا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھایا۔

آواز ـــــــ اس کے کانوں میں پہنچی

''گوتم ـــــ ہلو ـــــــــ ارے بھئی گوتم''

وہ خاموش رہا۔

''گوتم نیلمبر۔'' دوسرے سرے پر چمپا نے زور سے کہا۔ ''کیا بات ہے؟ میری آواز سن رہے ہو۔''

''سن رہا ہوں۔''

''فون خراب ہے کیا؟''

''نہیں تو۔''

''شرم کرو۔'' چمپا بڑی نارمل آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''ڈوب مرو جی ـــــــ حد ہے۔ میں اتنے برسوں سے یہاں ہوں اور تم کو ایک روز بھی توفیق

نہ ہوئی کہ مجھ سے مل لیتے کیا میں کھا جاتی تم کو؟'' پھر وہ ہنسی وہ چہکار ہا۔

اتنا بڑا ڈپلومیٹ اور حاضر جواب' بذلہ سنج آدمی اور اس سے مطلق کوئی جواب نہ بن پڑا اور چمپا نے کہا تھا: ''میں کیمبرج سے آ گئی ہوں اور جون کارٹر کے یہاں ٹھہری ہوں۔ آؤ کسی روز ملنے تعلیم کا زمانہ بالآخر ختم ہو چکا۔ اب مجھ فرصت ہی فرصت ہے۔''

''ہاں چمپا' میں ضرور آؤں گا۔'' گوتم نے ہڑ بڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''دراصل ــــــــ وہ تم جانتی ہو لندن کی زندگی کس قدر ہنگامہ خیز ہے اور پھر فارن سروس کی مصروفیات' یہ کوئی لکھنو یونیورسٹی کا زمانہ تھوڑا ہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھے گپ کر رہے ہیں۔ اور پھر میرا کام بھی ایسا ہے کہ مستقل دورے پر رہتا ہوں۔ آج ہائی کمشنر کے ساتھ یہاں جا رہا ہوں' کل وہاں جا رہا ہوں۔ جب کبھی کشمیر کیس یو۔ این۔ میں جاتا ہے تو کرشنا مینن کے ساتھ پندرہ چکر نیویارک کے لگانے پڑتے ہیں ــــــــ ویسے میں تمہاری خیریت دوستوں سے برابر دریافت کرتا رہا۔''

اس نے کامیابی سے بات ختم کی اور بے انتہا نروس ہو کر سگریٹ جلایا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ چمپا دوسرے سرے پر اس کی آواز سن کر اس قدر مسرور ہے جیسے اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو' جیسے اسے راج سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا ہو۔

ڈیپر سٹ س واپسی میں رات کے بارہ بج گئے۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور جون کارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہلو۔کون ہے؟'' ادھر سے نیل کی سوتی سوتی آواز آئی۔

''مس احمد ہیں؟''

''نہیں۔''

''کہاں چلی گئیں؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''آپ کون صاحب ہیں۔''

''نیلمبر۔''

''ہلو ہو ــــــ ہلو مسٹر نیلمبر ـــــــــ مس احمد نے شام کو کئی بار آپ کو فون کیا تھا مگر آپ شاید باہر چلے گئے تھے' اس وقت تو وہ جون کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں۔''

''اوہ۔''

''آپ نے گینگ کے باقی افراد کے یہاں فون کر لیا؟ کوئی ضرورت ہے؟'' گوتم کی آواز کی سراسیمگی محسوس کر کے نیل نے کہا۔ ''فیروز' سریکھا' زرینا' کملا' طلعت۔ان سب کے یہاں فون کر دیکھیے۔شاید مل جائیں۔

''بہت بہت شکریہ نیل۔میرے خیال میں اب رات بہت آ گئی ہے' کل دیکھا جائے گا۔کوئی خاص بات نہیں تھی۔گڈ نائٹ۔'' اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا' اس نے ریسیور رکھ دیا اور سگریٹ جلا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

اس رات ٹیمز کی ایک لانچ پر بہت سی لڑکیوں اورلڑکوں نے ایک پارٹی کی تھی۔ جون کے ساتھ چمپا وہاں گئی اور رات گئے تک وہ لوگ عرشے پر ناچتے رہے۔ کشتی میں چمپا کو بہت سے اجنبی چہرے نظر آئے: کالے' گورے' انگریز' فرانسیسی۔ لندن مجلس کے چند لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ریلنگ پر جھکے وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

ارے یہ پروگریسو ہو گئیں! جون کارٹر کے ساتھ گھومتی ہیں' سنا ہے پہلے تو بڑی سخت لگیر تھیں انڈیا میں۔ کسی نے چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

''ممکن ہے پاکستان کی جاسوسی کرتی ہوں۔ کیا بھروسہ''

''یہ بھی ٹھیک ہیا ور پھر ہندوستانی مسلمان! ان سے زیادہ دوغلا اور خطرناک کون ہوگا؟'' ایک مراٹھی ڈاکٹر نے کہا۔

''اور سنا ہے'' پہلے نہ کہا'' رضا جو کمال اور طلعت کا کزن ہے' اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اس نے گھاس نہیں ڈالی' وہ آج کل کیمبرج والی روشن کے چکر میں ہے کیونکہ روشن کا باپ کسی منسٹری کا سکریٹری ہے۔''

''روشن کو بھی رضا نے گھاس نہیں ڈالی کیونکہ اس بے چاری کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''باپ کا انتقال اصل وجہ نہیں' دراصل اس کا جی بھر گیا۔ بور ہو گیا بچارہ۔''

''میں یہ نقطہ نظر خوب سمجھ سکتا ہوں۔ لڑکیوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت ہے کہ جہاں ذرا سی دلچسپی ان میں لی اور وہ فوراً شادی پر تیار۔ میں رضا کے نقطہ نظر کو خوب سمجھتا ہوں بھائیو۔ کیونکہ کل میں ایلین سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔''

فوراً ہلڑ شروع ہو گیا: ''یہ آندرے کی آزادی کی آخری رات ہے' اس رات کو اچھی طرح منا لو بھائیو۔'' کمال نے اسٹول پر چڑھ کر رقت انگیز آواز میں کہا۔

وہ سب بوٹ سے اتر کر شور مچاتے قریب کے ایک پب کی طرف روانہ ہو گئے۔

عرشے پر صرف لڑکیاں رہ گئیں اور وہ نوجوان جس نے سب سے پہلے یہ تذکرہ چھیڑا تھا' سیڑھیاں اترتے ہوئے کمال سے بولا:

''عامر رضا بڑا سمجھ دار آدمی ہے۔ ہم کو چاہیے اس سے ٹریننگ لیں۔ آخر یہ لڑکیوں سے شادی کرنے سے صاف کیسے بچ جاتا ہے۔''

''مگر دیکھ لینا آخر میں کرکری کھائے گا۔''

''اجی بعد کی بات دیکھی جائے گی' فی الحال تو عیش کر رہا ہے۔''

''ہاں بھائی۔''

''اور یار یہ کزن شاہ رخ سلطانہ کون ہیں' تمہاری رشتے دار ہیں؟''

''آج تک تو میں نے ان کا نام سنا نہیں تھا' شاید پاکستان میں بھیا صاحب کی کوئی عزیز پیدا ہو گئی ہوں۔''

''جرمن سنتے ہوتے آئے تھے' یہ پاکستان کزن کی قسم آج ہی معلوم ہوئی۔''

''دراصل یہ نوجوان خاتون کسی وزیر کی بھتیجی ہیں۔''

''اوہ آئی سی''

''آوازیں ڈوبتیہ چلی گئیں۔ کشتی آگے بڑھ گئی۔ چمپا اتر کر کنارے پر واپس آ گئی اور قلوپطرہ کی سوئی کے نیچے آن کر بیٹھ گئی۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ چند روز قبل عامر رضا رات بھر یہیں اسی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اس رات بھی پورنماشی کا چاند دریا کی لہروں پر بہہ رہا تھا اور عامر رضا کو بے حد ڈر لگا تھا: اپنے آپ سے' دنیا کے حس سے' مستقبل سے۔ ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے' کوئی مسائل ـــــــــ صرف ان کے ذاتی غرور کا مسئلہ تھا مگر اس کا تعلق پتھالوجی سے تھا اقتصادیات سے نہیں۔ قلوپطرہ کی سوئی کے سائے میں بیٹھے بیٹھے ان کو ان لڑکوں کا خیال آیا تھا جو تلاش معاش میں سرگرداں تھے اور لڑکیوں کا جن کو عامر رضا نے چھوڑ دیا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ روپیہ اور عزت اور ایک کوٹھی' اپنی ذاتی۔ ساٹھ ہزار کی مالیت کی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی' ڈرگ روڈ' کراچی میں۔ ایک امریکن کار۔ فریجڈیر ریڈیوگرامی زندگی کی اصل حقیقت' اتم حقیقت صرف یہ چیزیں ہیں۔ زندہ باد زندگی۔ مجھے سے کوئی شکایت نہیں۔ صبح ہوتے سیڑھیوں سے اٹھ کر وہ کار کی طرف چلے گئے۔ دوسرے روز وہ چھٹی لے کر شادی کرنے لکھنو جا رہے تھے۔''

۸۸

''میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں جس کا نام ہوگا' پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ڈون ژوان'' کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

''کیوں' کیا ہوا؟'' طلعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

''بس یونہی ـــــــــ اب جیمز جوائس اور ڈلن طامس کے بعد۔''

''کل ڈلن طامس نے بل کے یہاں بڑے مزے کی باتیں کیں۔ ترنگ میں تھے مولانا۔'' شنکر نے مڑ کر کہا۔

''اجی وہ تو تھے۔ آپ کس ترنگ میں ہیں آج کل؟'' گلشن آہوجہ نے کمال سے پوچھا۔ ''یہ کیا پڑھ رہے ہو۔''

''کچھ نہیں۔ یار خط آیا ہے گھر سے۔ یعنی لکھنو سے۔''

''کیا خبریں ہیں؟'' طاعت نے پوچھا۔

وہ سب سریکھا کے وسیع ڈرائنگ روم میں فرش پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے جس کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ بہار کا روشن دن تھا۔ سریکھا دہلیز کے پاس بیٹھی مشین پر لہنگے کی آڑھی گوٹ سی رہی تھی۔ طاعت اور فیروزہ باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ ہری شنکر بھی ان دنوں ہو ہیں موجود تھا جو واشنگٹن سے آیا ہوا تھا اور قاہرہ جارہا تھا۔ ''یہ ہری شنکر اور گوتم کے مزے ہیں۔ بالکل ابن بطوطہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کل' صبح صبح گوتم کا فون آیا تھا پھر ماسکو جارہا ہے۔'' گلشن نے اظہار خیال کیا۔

''گوتم تو ہیون سانگ بھی ہے۔ کمال نے کہا۔'' اکثر چین سے آیا کرتا ہے۔''

باغ میں چندرا ماتھر نے ایک اور گیت شروع کردیا۔ ان سب کی پرانی دوست چندرا' جو نیویارک سے دلی جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی' بہت اچھا گاتی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر طغیان صاحب سریکھا کے شوہر گلشن آہوجہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

بڑا خوشگوار اور پرسکون اتوار کا دن تھا۔ باغوں میں پھولوں کا سیلاب آیا ہوا

تھا۔ صبح صبح جب چمپا جون کارٹر کے گھر سے سیکھا کے یہاں آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھی تو بس کا بوڑھا کنڈکٹر اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا: ''مائی ڈیر' تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارے بوائے فرینڈ تمہیں دیکھ کر بہت مسرور ہوگا۔ خوب خوشی سے اتوار مناؤ۔ دنیا بڑی مہربان تھی اور خوشگوار کون کہتا ہے کہ دنیا غم خانہ ہے اور فلانا ہے اور ڈھمکانا ہے۔ دنیا تو بے حد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بے حد خوش تھی کل اس نے گوتم سے فون پر باتیں کی تھیں۔ اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سنی تھی۔

وہ سریکھا کے یہاں پہنچی' یہاں محفل جمی تھی' وہ بے حد مسرت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

''رات کی پارٹی میں بوٹ پر بڑا چنڈو خانہ رہا۔'' کمال نے اس سے کہا۔ ''آپ کے بجے تک گھر پہنچ گئی تھیں؟

''ہم جب پہنچے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹرینڈ سے گھر تک پیدل آئے۔''

''کیا خبریں ہیں بھئی۔ کس کا خط ہے؟'' طلعت نے باورچی خانے سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

''اپی کا۔'' کمال نے جواب دیا۔

''میاں ہری شنکر۔ اے بھائی ہری شنکر ہوت'' طلعت نے باورچی خانے میں آواز دی ہری شنکر' جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا' پلٹ کر اندر آیا۔ ''لو یہ گرم گرم پوریاں۔ چمپا باجی کدھر ہیں۔ یہ پلیٹ ان کو دے آؤ۔''

وہی گلفشاں کا گھریلو ماحول یہاں بھی موجود تھا۔ گھر۔ جو اسے کبھی میسر نہیں ہوگا۔ چمپا کو ایک دریچے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک پھریری سی آئی۔

ہری شنکر نے پلیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چمپا دوسرے سرے پر دریچے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔ نگار خانوں کی زندگی۔ فرن کے پتے۔ دریچے میں جھانکتا ہوا پیرس کا مدھم سورج 'بوہیمیا' برآمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کرسیاں' دھاری دار سن شیڈ' ایک کاہل الوجود ذہنی زندگی جس میں فلسفے تھے اور نیا فرانسیسی ادب' بڑے سائز کے سمفنی کے ریکارڈ' سالزبرگ یک موسیقی کے تہوار' کیمبرج کے کواڈرینگل اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزیں جن کی ایک علیحدہ دنیا نیویارک کے گرنیچ ویلیج' پیرس کے بائیں ساحل اور یہاں لندن کے چیلسی اور سینٹ جانز وڈ میں آباد تھی۔ اس دنیا کے باسیوں کے یہاں بڑے گہرے جذباتی تجربے تھے اور ادراک اور ماورائی قسم کی گفتگو۔ چمپا باجی تم تو بہت جلد ایک دوسرے سرے پر پہنچ گئیں۔ پتا نہیں اب تم کھل کر ہنستی بھی ہو یا نہیں۔ اندرونی توازن تم نے قائم رکھا یا نہیں' جس کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش تھی۔ اب سریکھا' طلعت' فیروزان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو۔ کیسی سمجھدار ہیں۔ ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل بڑا بے ڈھب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں نیا پار لگ گئی تو لگ گئی ورنہ پڑا ہوا۔ ہم تو صاحب یہ جانتے ہیں ــــــــ ''چمپا باجی' لو پوریاں کھاؤ'' اس نے باآواز بلند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا' جس طرح سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

''ان سب کو کیا ہوگ یا۔ سب چپ ہو گئے ایک دم۔''طغیان صاحب نے باتیں کرتے رکتے رک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

''ان سب پر خیالات سوار ہیں۔''گلشن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''بڑا پرسکون سے ہے۔''طغیان صاحب نے کہا۔''سریکھا دیوی کپڑے سینا بھی جانتی ہیں۔ مجھے گیان نہت حا۔ کمال جی پوریاں کھا رہے ہیں۔ چندرا دیوی پھلواری میں مرغیاں چراتی ہیں۔ طاعت جی پھلکیاں تل رہی ہیں' یہ تو بالکل گرو دیو ٹیگور کے ناولوں جیسا ماحول ہے۔ پرسکون۔ شاعرانہ مدھر۔''

''اجی دیکھے تھے ٹیگور کے ناول۔''گلشن نے چڑ کر کہا۔''طاعت تم نے ساری پوریاں جلا دیں اٹھا کر۔ چاء بجھواؤ۔''

طغیان صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔

''ہلو۔ ہری شنکر۔''چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر کہا۔''کیا بات ہے۔''

اب پوچھتی ہیں کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی دھاندلی کی حد نہیں۔''کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔ چا پیئیں گی۔''

''بنا دو۔''

اس نے پیالی اٹائی۔ چمچہ نیچے گر گیا۔

ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں گھسے زندہ ہیں اور مستقل ایک دوسرے کو مارتے جلاتے رہتے ہیں۔''چمپا باجی۔''ہری شنکر نے کہا۔''تم ہم سب میں گریٹ ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی اتھاہ بے پناہ اہلیت موجود ہے۔''اس نے دفعتاً

آہستہ سے کہا۔ ''سنو ــــــ یو ــــــ این۔ میں ایک بڑی اچھی جگہ نکلی ہے' انڈیا کے کوٹے میں۔ اس کے لیے کروں کوشش تمہارے لیے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا ــــــ میں عمر بھر اسی طرح ماری ماری پھروں گی؟''

''اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا ہے تمہیں۔'' ہری شنکر نے کہا۔ پھر معاً اسے اپنی اس فاش غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کسی چھوٹے موٹی اینٹ کے بجائے پورا پہاڑ لڑھکا دیا تھا' مگر یہ تو بڑی بہادر' فراخ دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا برا مانیں گی۔ ''میرا مطلب ہے ــــــ'' اس نے ہڑبڑا کر بات بنائی۔ ''کہ تم میں اتنی خود اعتمادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چولہا ہنڈیا لے کر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے باورچی خانے میں گھسی لڑکیوں کی طرح دیکھ کر کہا۔ اجی میں تو کہتا ہوں' تم تو ایورسٹ تک مزے سے چڑھ جاؤ گی دندناتی ہوئی۔ تم بڑی گریٹ ہو چمپا باجی ــــــ'' اب اس کی آواز میں رقت آ گئی ــــ اسے چمپا پر یکلخت بے حد ترس آ رہا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی باغ کو دیکھا کی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر اب باتیں پھر زور سے شروع ہو چکی تھیں۔

چمپا کو یکلخت ایسا لگا جیسے خاتمہ اب بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے ناچنے لگا۔ باغ میں گھومتی چندرا اسے قندیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طغیان صاحب اسے ایک بہت عظیم لطخ نظر آئے جو نیچے سروں میں قائیں قائیں کر رہی

تھی۔ میں دوانی ہو جاؤں گی۔ اس نے آہستہ سے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہری شنکر نے اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

''چمپا باجی۔'' اس نے کہا۔ ''محبت کو خدا را جذباتیت میں تبدیل نہ کرو _ _ _ _ تو ازن 'ضبط' تناسب' کلاسیک گریک آیڈیلز اصل چیز ہیں ____ یعنی کہ ______''

''کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو ____'' چمپا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''میں محبت کر رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔''

''چمپا باجی ____'' ہری شنکر نے اسی طرح احتجاجاً کہا۔ ''تمہارے خیالات تھک ہیں۔ ہمیشہ تھے۔ تمہارے جذبات میں واگز کا بوجھ ہے۔ پہلے بھی تھا اب زیادہ ہو گیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی پیورٹی کو تباہ کیے ڈال رہی ہو ____ دس سال گزر گئے مگر تم بالکل نہ بدلیں۔''

جون اور اوجیت پارٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور کمال کی طرف چلے گئے۔

''ہری شنکر ____'' چمپا نے جھک کر کہا۔ ''مجھ پر ترس نہ کھاؤ مجھے شکست کا احساس آج تک نہیں ہوا' میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔''

ڈائننگ ٹیبل پر سے طغیان صاحب کی آواز بلند ہوئی۔ ''ہم سب سائے ہیں

سائے۔'' وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

''جی ہاں درست ہے۔'' گلشن نے بور ہو کر سگریٹ جلایا اور چمپا کی طرف بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔

''کمیونسٹوں نے مارکسزم کو تباہ کر دیا۔'' طغیان صاحب نے جون کارٹر پر نظر ڈال کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔

موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔ انہوں نے ہندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا پورا نام رائے ہربنس رائے طغیان بھاگلپوری تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

''میرے حضرت نے مجھ سے کہا'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔

ان کے ایک مسلمان گرو ہیں جو سری نگر میں رہتے ہیں۔'' ہری شنکر نے چپکے سے چمپا کو بتلایا۔

''میرے حضرت نے مجھ سے کہا: بچہ تو روس جا۔''

''اور ان ملعون ملحدوں کو سچی سوشلزم کی مشعل ہدایت دکھلا کر راہ راست پر لا۔'' طلعت نے باورچی خانے میں سے لقمہ دیا۔

''انہوں نے تو کبھی اپنے حضرت کو بھیا چھا سدھایا۔'' چندرا نے باغ کے دروازے میں آ کر کہا۔

طغیان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ کون مہیلا ہیں؟'' انہوں نے سریکھا سے دریافت کیا۔

''یہ مہیلا بھی بڑے پروگریسو وچاروں کی مالک ہیں' لیکن ڈالر کمانے کی اویش سے نیویارک کی آکاش وانی سے ہندی میں سماچار سنایا کرتی ہیں' ان کا ومان ابھی ہی یہاں پہنچا ہے۔'' کمال نے جواب دیا۔

''آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟'' چندرا نے شگفتگی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' طغیان صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ ''ہوں تو سہی' پھر''

''ارے۔ میرا مطلب تھا۔ تب تو آپ شاید گوتم نیلمبر کو جانتے ہوں۔ اس نے پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔''

''جانتا ہوں ______ بیوقوف چھوکرا ہے۔'' طغیان صاحب نے مختصراً کہا۔ ''ہاں تو میں کہہ راہ تھا کہ ہم سب سائے ہیں۔ میں بھی' گوتم نیلمبر بھی تمہارا ____ میرے حضرت نے کہا تھا۔''

''کمال ____ طاعت پتیلیاں چولہے سے اتار کر جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی باہر آئی۔ ''اپی نے کیا لکھا ہے خط میں۔''

''ارے ہاں ____'' کمال نے اوجیت سے باتیں کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بھیا صاحب کی شادی ہو گئی۔''

''ہائیں ____ وہ کب؟'' کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم گپ چپ کالڈو بنے بیٹھے ہو۔'' طاعت نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ایسی کون بڑی بات ہو گئی بھئی۔ ہم سب سائے ہیں۔'' کمال نے اطمینان سے کہا۔ ''ابھی تم نے سنا ہے طغیان صاحب کے حضرات کیا کہتے ہیں۔''

''تم بکواس مت کرو۔'' ہری شنکر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا۔ ''تفصیل سے واقعہ بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اپی نے۔''

''یار۔ ہوا یہ کہ۔''

''شروع سے شروع کرو۔'' طاعت نے حکم دیا۔

''خوب نمک مرچ لگا کر سناؤ ورنہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا۔'' گلشن نے حسب معمول اپنے سوتے سوتے انداز میں کہا۔ سب کمال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصہ سننے لگے۔ کمال نے ماہر فن داستان گو کی طرح سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چمپا دریچے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

''بھائیو اور بہنو ــــــ تم کو معلوم ہی ہے۔ کہ بھیا صاحب بے چارے بڑے زبردست سوشل کلائمبر۔''

''یہ کیسے۔ لکھنو میں تو نہیں تھے۔'' نفیروز نے اعتراض کیا۔

''تم اپنا لکھنو لیے پھرتی ہو بات بے بات۔ بھیا صاحب اور ان کے وہاں کی ویلیوز ــــــ''

''پھر سیاست شروع ہوئی۔'' گلشن نے کہا۔ ''یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سنانے لگے تھے۔''

''سنانے لگے تھے نہیں یار سنانے والے تھے۔ تم پنجابی ادبدا کر غلط اردو بولتے ہو۔'' ہری شنکر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

''ارے جا۔ یو۔ پی کے بنئے۔'' گلشن نے جواب دیا۔

''لاؤ بھئی۔ اپی کا خط دو۔ ہم باہر جا کر خود پڑھ لیں۔'' نفیروز نے تنگ آ کر

کہا۔ ''تم لوگوں کو لونڈیاں ہار پارٹی کبھی سنجیدہ ہونا جاتی ہی نہیں ہو نہ ہ۔''

''ہاں تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب ایک سوشل کلائمبر ــــــ جب روشن کراچی واپس گئی یہ' اس سے بہت پہلے ہی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ بے چاری کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شاہ رخ سلطانہ منظر پر آئیں مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی۔''

''ــــ ایں ــــ اس کا کیا مطلب جو بات کی بے تکی۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''ارے۔ اس کا مطلب یہ کہ کزن شاہ رخ کے ابا منسٹر نہیں رہے۔''

''اوہ''

''اب لکھنو سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چچی کے خط پہ خط آنے شروع ہوئے کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ میاں تم گھر بسا لو۔ ایک ایک کر کے گلفشاں سے پنچھی اڑ گئے، کم از کم تم یہاں آ کر بہو کا دولا ہی لے جاؤ۔ طاعت ذرا چاء بنانا۔''

''اور بل چھوڑنے والا ہے اسے۔''

''زیادہ تر انٹلکچول لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں .... اگر چہ وہ خود بھی انٹلکچول ہوتی ہیں۔'' کمال نے لاپروائی سے کہا۔ ''تم لوگ تو یار لندن کی ایک

انسائیکلو پیڈیا اسکنڈ لیکا مرتب کرڈالو۔ ریفرنس کے لیے آسانی رہے گی۔"

"روشن کی بھی سنا ہے شادی ہوگئی کسی بڑے افسر سے۔" طاعت نے کہا۔

"مبارک ہو............" کمال نے جواب دیا۔

"بے چاری چلی گئی واپس اپنے خول میں...... "فیروز بولی۔" بیکار اس نے یہ سارا جھنجھٹ کیا۔"

"یہ لڑکیاں عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں آج تک میرے پلے نہ پڑا۔" طاعت نے کہا۔

"ارے یار خدا کے لیے آہستہ بولو......" وہ ٹہل رہی ہیں سامنے باغ میں۔ کمال نے کہا۔

"ہماری نگریا میں آئے بسو بنواری۔" طاعت نے لوفروں کی طرح گانا شروع کیا۔ لڑکیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

"آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے۔" سریکھا نے چپکے سے پوچھا۔

"میاں۔ میاؤں۔" کمال نے دور سے چڑایا۔

"یار وہ سرل ایشلے تو کل میں نے دیکھا شنیلا مکرجی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بھی سکون دل کی خاطر......" طاعت نے پوچھا۔

"واہ عین مین معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سیکنڈ آ ہیر میں پڑھنے والی لڑکیاں گفتگو کر رہی ہیں۔" کمال نے کہا۔ سریکھا اور طاعت اور نرگیش سن ان سنی کر کے کھس پھس کرتی رہیں۔

"یہ لوگ کتنی ہی افلاطون کیوں نہ بن جائیں رہیں گی وہی کشمیری محلّہ گرلز

اسکول لکھنؤ۔" کمال نے دوبارہ کہا۔

"سوال یہ ہے۔" فیروز نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کہ مڈل کلاس لڑکیاں اتنی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں۔"

"ہوتی تھیں کیا معنی۔ اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پوسٹ ریوولیوشن پیریڈ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کر رہے ہیں ہم" طاعت نے کہا۔

"مگر صاحب۔ روشن میں ممکنات تھیں، وہ برلین والا قصہ یاد ہے، وہ تو جب ہم لوگ بخارسٹ جا رہے تھے تو پیچھی ہمارے ساتھ ساتھ آسٹریا کی سرحد تک پہنچ گئی، وہ نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر۔" فیروز بولی۔

"مگر کیا یار۔ ڈرپوک تھی۔ پچانوے فیصدی بورژوا لڑکیوں کی طرح۔ بس رومانس دماغ میں ٹھنسا تھا۔ وے رومانس۔ وے بورژوا فلسفہ۔ لاحول ولا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے...... بھیا صاحب جیسے بوگس انسان سے۔" طاعت نے کہا۔

"اب وہ اس بڑے آدمی، کی بیوی بن کر جم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گزارے گی، کیا ڈاؤن فال ہوا ہے۔" سریکھا نے کہا۔

"تمہارا تخیل اس وقت زوروں پر ہے۔" طاعت نے کہا۔

"میرے تخیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے۔" سریکھا نے اداسی سے کہا۔ "میں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تھکی ہاری پروفیسرنی کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں لڑکیوں کو ہسٹری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ

وقت بھی آنے والا ہے جب میری شہرت ختم ہو جائے گی۔ رقص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیراگراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شری متی سریکھا دیوی جو دس سال قبل بہت عظیم رقاصہ تھیں۔ طاعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کملا گمنام ہو جائے گی۔ اس وقت ہم میں اور روشن میں کیا فرق رہے گا؟''

''ایسی ڈے کیڈنٹ باتیں مت کرو۔'' طاعت نے ڈانٹا۔

''میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔'' سریکھا نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔

''میں یہی سوچ رہا تھا۔'' کمرے کے دوسرے سرے پر ہی ہری شنکر نے کمال سے کہا۔ ''لڑکیوں کا معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ ذرا ان کو دیکھو تو۔ کیسی مگن ہیں اس سمے۔ ایک نے نیا بلاؤز سی لیا ہے تو خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ دوسری ادھر ادھر کی بے ضرر گپیں ہانک کر ہی مسرور ہے، مگر دراصل انہیں کتنے عظیم دکھ اٹھانے پڑتے ہیں، یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ذمے داری سنبھالتی ہیں۔ بے چاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

''طاعت، ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر پھر مبالغے سے کام لے رہا تھا، یہی مبالغہ طاعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم نیلمبر کے کردار میں چمپا میں، اپنی میں، یہ لوگ گویا انسانوں کی انلارجڈ تصاویر تھیں۔ اسی مارے فوکس سے کبھی کبھی باہر ہو جاتی تھیں۔''

''میاں، کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بھرے کسی

اورکو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا۔ یہ شاعری رکھو چھپڑ پر۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔''

''یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چمپا بیگم اس سے باغ میں چکر نہ کاٹ رہی ہوتیں۔'' شنکر نے جواب دیا۔

''اوہ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔'' طاعت نے کہا۔

''اے لیجئے۔ اتنی قابل لڑکی۔ کیمبرج میں سب پر دھاک بٹھا کر آ رہی ہے، جس سے ملتی ہے وہی فلور ہو جاتا ہے۔ آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔''

''کیوں بھئی کمیونسٹ لوگ عشق نہیں کرتے؟'' طغیان صاحب نے نہایت بھونڈے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

''لاحول والاقوۃ۔'' طاعت جل کر واپس چلی گئی۔

''بی بی۔'' ہری شنکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا، وہ نرملا کی قائم مقام تھی۔ ''ابھی تم اور پڑھو۔ اب تم لگے ہاتھوں پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔'' وہ یک لخت گھبرا گیا کہ اس نے طاعت کو خفا کر دیا ہے۔

''پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے بڑے لڈو مل جائیں گے۔ تین سو کی ملازمت، صرف تین سو کی۔'' اس نے عین ہری شنکر کی ناک کے آگے تین انگلیاں لہرائیں، وہ بالکل سننے کی موڈ میں نہیں تھی۔ دراصل بھیا صاحب کی شادی کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی

زبردست مارکیٹ ہے جس میں لڑکیاں، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں خواہ جاہل چٹ برائے فروخت دکان پر رکھی جاتی ہیں۔

''ارے تو روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ نیا ہندوستان ہے۔ ہم سب کو اس کے لیے کام کرنا ہے کملا کو دیکھو، صولت کو، کسی ٹھاٹھ دار کیریر ویمن ہیں۔''

چمپا نے ٹہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا اور ان سب باتوں میں مصروف پا کر باغ میں سے گزرتی باہر سڑک پر آ گئی۔

۸۹

برفباری شدید ہوگئی۔ شنیلا دیبی نے کھڑکیاں بند کر دیں۔

سوامی دیویکانند نے گیتا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا، یہ وہی کمال اور ہری شنکر کے انگریز پروفیسر تھے جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لا مارٹیز کالج لکھنؤ سے اچانک غائب ہو گئے تھے اور کمال اور ہری شنکر ان کے تعاقب ہیں ہردوار کی گھاٹیوں میں مارے مارے پھرے تھے۔ اب یہ زعفرانی کپڑے پہنے، داڑھی بڑھائے، یورپ اور امریکہ میں لیکچر دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلا مرکجی کے فلیٹ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو اسے یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی مشرق پسند انگریز لڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں، ایک طرف کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلا مکرجی سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ کمال نے اس کے توسط سے ہندوستان میں مختلف ملازمتوں کے لیے جو درخواستیں دے رکھی تھیں ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گوتم کی میز پر بہت سے لفافے آئے رکھے تھے۔ وہ ان کھولے بغیر خوشی سے ہڑبڑا کر کمال کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ سریکھا کے یہاں معلوم ہوا کہ کمال اور ہری شنکر اپنے پرانے پروفیسر سے ملنے شنیلا مکرجی کے یہاں گئے ہوئے ہیں مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں تھے۔ گوتم اندر آ کر ایک کونے میں مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہلو کامریڈ۔ ہوسکو واسے کب لوٹے۔'' مائیکل نے چپکے سے پوچھا۔

''آج صبح۔''

''بھئی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔'' مائیکل نے کہا۔

''ہوں گے۔ مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے کمال کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ان کو روپیہ دے رہا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے دورے پر نکلے ہیں۔''

''تم اب تک سرائیل نہیں گئے۔'' گوتم نے دریافت کیا۔

''بس اب جانے ہی والا ہوں۔''

''سب جا رہے ہیں۔'' شنیلا دیبی مائیکل کی بات سن کر ان کی طرف آئیں۔

''نومشکار مسٹر نیلومبر۔'' انہوں نے کہا۔

''نمسکار شنیلا دیوی۔''

بہت سے پھول اٹھائے نرگیش کمرے میں داخل ہوئی۔ ’’روشنی میں آ کر دیکھا تو یہ سب سرخ نکلے۔ میرا خیال تھا زرد ہوں گے۔‘‘ اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

’’نرگیش......‘‘ گوتم نے آزردگی سے نیچی آواز میں کہا۔ ’’یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو؟‘‘

’’گوتم............ کلچر کی خاطر............ یہ سب کلچر کی خاطر ہے۔‘‘ اس نے پہنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

’’کمال کہاں ہے۔‘‘

’’سریکھا کے یہاں دیکھ لیا؟ شاید وہ لوگ مڈہرسٹ سے نہ لوٹے ہوں۔‘‘

’’مڈہرسٹ............‘‘ گوتم کے ذہن پر ایک موگری سی پڑی۔ ’’مگر آج تو اتوار نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں، لیکن نرملا کے دوسرے پھیپھڑے کا آپریشن ہوا ہے۔ تم کو معلوم نہیں؟ ارے ہاں، تم آج ہی تو باہر سے لوٹے ہو۔‘‘

’’سب جا رہے ہیں۔ سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں۔‘‘ شنیلا مکرجی نے آنکھیں نیم وا کر کے گوتم سے کہا۔ ’’تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان واپس جانے والی ہے۔ نرگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔ ڈینس کو نیروبی کی یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی ہے۔‘‘

’’شنیلا دیوی یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔‘‘ گوتم نے سخت اکتا کر کہا۔ ’’لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔‘‘

''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، بلکہ چلے جاتے ہیں، آتے کبھی نہیں۔'' اب وہ بھی پھر گرو دیوٹیگور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اٹھا۔ ''نرگیس'' اس نے مڑ کر کہا۔

''مجھے کمال کی بڑی سخت تلاش ہے، اس کے نام چند بے حد ضروری خط آئے ہیں۔''

''بی بی سی کینٹین میں دیکھ لو۔ یا شاید چوزے کی سرائے میں ہوں وہ سب۔ سوامی جی سے تو ملتے جاؤ۔''

''ارے ہاں۔'' وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور ان کے پیر چھوئے۔ سوامی۔ دیویکا نند جی سابق ڈاکٹر رچرڈ ہیملٹن۔ نے اسے اشیرواد دی اور اوکسفرڈ کے لہجے میں اس سے اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آ جاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈر وغیرہ کو اپنے یہاں بلوا کر ایک محفل منعقد کریں۔'' شنیلا دیوی نے کہا۔ ''سوامی جی سے میں نے تمہارا بہت ذکر کر رکھا ہے۔''

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔

وہ اوورکوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کار کی طرف چل دیا۔ شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں سے کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

چوزے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنسان پڑی تھی صرف ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے اونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ویٹرس سے پوچھنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھا کہ بی بی سی والے تو ابھی ادھر نہیں آئے تھے۔ اسٹول والی لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا، وہ چمپا احمد تھی۔

''ہلو......تم یہاں موجود ہو۔'' گوتم نے بے ساختہ کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اتر کر برابر کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ''تم ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا بہت مختصر ہے، ہم کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے دوبارہ۔''

''اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔'' گوتم نے ذرا برا مان کر کہا۔ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کو لٹرل سمجھ لیا جائے۔''

''لٹرل تو تم مانتے ہو باتوں کو۔''

''وہ کیسے؟'' گوتم نے پھر کمال کی تلاش میں چاروں اور نظریں دوڑا کر پوچھا۔

''میں نے تم سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی مابعد الطبیعیات بات تھی۔ تم اس کو مجاز کی طرف لے گئے، یہ سب تمہارا قصور ہے۔'' اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

''مابعد الطبیعیات کا ذکر مت کرو۔'' گوتم بے انتہا چڑ کر بولا۔ ''میں ابھی شنیلا دیوی کے یہاں سوامی دیویکا نند سے مل کر آ رہا ہوں۔ تم نے کمال کو تو نہیں دیکھا۔''

''نہیں۔'' چمپا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا، یہ آدمی پل پل میں کیسے

رنگ بدلتا تھا۔ ابھی تک میں مردوں کو سمجھ نہیں پائی۔ ''تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز.......... جون کارٹر کے یہاں۔ یورپ جانے سے پہلے۔''

''ہاں۔ کیا تو تھا۔'' گوتم کو اپنا اس طرح پکڑا جانا بالکل پسند نہ آیا۔ ''کیونکہ تم نے مجھے رنگ کیا تھا کیمبرج سے لوٹ کر..........''

''گوتم، یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو، بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے، میں تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تمیز سے پیش آؤ۔''

''چمپا۔'' گوتم نے کہا۔ ''میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ کمال کے کئی ضروری خط ہیں، ممکن ہے اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لیے دلی پہنچنا ہو۔ نرملا کا دوسرا آپریشن ہوا ہے۔ تم چوبیس گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو، باقی کی دنیا ہر سمے تمہارے خوابوں کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔''

''ارے۔'' وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ ''چلو کمال کو ڈھونڈتے ہیں، مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔'' گوتم نے اسے دیکھا، یہ کسی عجیب دلکش عورت تھی۔

وہ سرائے سے باہر نکلے اور سریکھا کے یہاں فون کیا۔ گلشن نے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

''کمال کا پتا نہیں۔ شاید سر روجر کے یہاں نرملا کی رپورٹ لینے گیا ہے۔ سریکھا ابھی راڈا سے نہیں لوٹی۔ کمال نے کہا تھا کہ وہ سر روجر کے یہاں سے ہمارے گھر ہی آئے گا۔ تم آ جاؤ، میں کالج جا رہا ہوں۔ کنجی ہمسایوں کو دیے جاتا ہوں......''

''کوئی مڈہرسٹ گیا؟'' گوتم نے پوچھا۔

''طلعت اور ہری شنکر گئے ہیں اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک پارسل لیتے جانا۔ نرملا کو بھجوانے کے لئے سریکھا نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ طلعت لے جانا بھول گئی۔''

''اچھا۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

گوتم کار کی طرف لوٹا اور وہ سینٹ جانز ووڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آشا کے یہاں سے کنجی لے کر وہ سریکھا کے مکان میں داخل ہوئے۔ گیلری میں دو بڑے بڑے مجسمے رکھے تھے۔

''اوہو.......... ہماری طلعت نے بڑے زوروں سے سنگتراشی شروع کر رکھی ہے۔''

''یہ آشا کے بنائے ہوئے ہیں۔'' چمپا نے فوراً کہا۔

گوتم ٹھٹھکا۔ چمپا، طلعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا، وہ گارڈن۔ روم میں گئے اور باغ کی طرف بڑا شیشوں والا دروازہ کھولا۔ اب برف پھر مدھم سی دھوپ میں روشن تھی۔ ''کتنا آرام دہ گھر ہے سریکھا اور گلشن کا۔'' گوتم نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ فضا میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمپا نے آتش دان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کاہل اور مطمئن انداز سے نظریں دوڑاتا رہا۔ اب چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا گویا وہ بہرائچ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہے، یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس تھا۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ

اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، بیلے، کریوگرافی۔ سارے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں سجی تھیں جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلا لیکا، چین کے نوادر، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹنگز۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ اور رقاصہ کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مارگو فونٹین اور رابرٹ ہیلپ مین کی دستخط شدہ تصاویر رکھی تھیں۔ جگہ جگہ بالی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقاصوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے سجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی اور مردنگم اور ترکاری کی ٹوکری، گوتم مسکرایا، یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا مگر اس میں آرام اور بے تکلفی سے رہا بھی جاتا تھا۔ زندگی کی اسی سادگی اور بے تکلفی کا وہ ہر جگہ متلاشی تھا۔

''میں نے یہاں بڑے اچھے لمحے گزارے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ہیں نا۔'' وہ کہتا رہا۔ ''کمروں سے مکینوں کی شخصیت کس قدر عیاں ہوتی ہے......... ذرا سوچو تو۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔ ''چیلسی میں کملا کا الٹرا موڈرن فلیٹ دیکھا ہے؟ اس کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ مکین شدید انٹلکچول، شدید خوش ذوق اور انتہا کی مزاج حس کی مالک ہے اور ڈائریکٹ۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ آوسٹرلی میں زرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے لیکن ستھرا، خوبصورت اور گھریلو۔ سینٹ جانز ووڈ میں طاعت اور کمال کا گھر عین میں گلفشاں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، وہی ہنگامہ، وہی افراتفری، ہماہمی، مہمانداری۔ حد ہے محرم میں مجلسیں تک تو یہ دونوں کرتے ہیں

یہاں۔

میں نے واشنگٹن میں ہری شنکر کا فلیٹ دیکھا ہے جو بالکل سنگھاڑے والی کوٹھی کا ایکسٹنشن معلوم ہوتا ہے۔ پھر شنیلا دیبی کا کمرہ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔''

''تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو۔'' چمپا نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں چمپا'' ہم خود کو اپنے پس منظر سے، کبھی اپنے ظاہر کو اصلیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ پھر وہ رکا۔ ''مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمہارا اصل پس منظر نہیں دیکھا۔ چوزے کی سرائی اسٹول پر بیٹھی تم بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو۔ عجیب بات ہے نا۔''

''اچھی بات ہے یا بری؟''

''پتا نہیں، مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہیے جو شاید تم نہیں رہیں۔''

''یہ غلط ہے۔'' چمپا نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں بنارس واپس جانا چاہتی ہوں مگر مجھے کوئی لے جانے والا نہیں ملتا۔''

وہ خاموش ہو گیا۔

''تم کو معلوم ہے'' گوتم نے کہا ''پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا، میں ایک بے حد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا، وہاں ایک دیودار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ ان دنوں میں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے

یہ وقتاً فوقتاً اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ بہر حال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد.......... مگر شاید وہ تم کو ملا ہی نہیں۔''

''مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔''

''اب تم پھر رومانٹک ہوئیں!''

برابر کے مکان میں آشا کے یہاں کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

''گوتم.......... کمینے پن پر مت اترو..........'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تمہارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون چیز حائل ہے۔ اور تم روتی کیوں ہو بھائی۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی رونا شروع کر دو بیٹھے بٹھائے۔ ہنسا کرو۔ مثال کے طور پر بھیا صاحب کو لو۔ آج میں نے ان کو سلفرجز سے نکلتے دیکھا اپنی بیگم کے ساتھ۔ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤں۔ کھلے جا رہے تھے۔ بڑے تپاک سے انہوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا۔ میں نے بھی بہت بشاش محسوس کیا۔ دماغی طور پر صحت مند لوگ ایسے ہوتے ہیں جیسے بھیا صاحب ہیں۔''

''بکواس مت کرو۔'' چمپا نے کہا اور آتش دان کے کوئلے ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

گانے کی آوازیں اب قریب تر ہو گئیں۔ اوجیت اور ترونا کی آواز سب میں اونچی تھی۔ چمپا دریچے کے قریب جا کر سنتی رہی، پھر واپس آ گئی۔

''دریچہ بند کر دو۔'' گوتم نے معاً کہا۔

''ہاں۔'' چمپا نے جواب دیا۔ ''یہ تو رات گئے تک ہلڑ مچتا رہے گا۔ لندن مجلس والوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام معلوم نہیں ہوتا۔''

''ارے رے.......... '' گوتم نے چونک کر کہا۔ ''وہاں شاید کمال بھی پہنچ گیا ہو، یہ لوگ رت جگا کیوں کرنے والے ہیں؟''

''صبح یہ سب بوڈاپسٹ جا رہے ہیں اس لئے۔''

''بوڈاپسٹ؟''

''ہاں، وہیں۔ بالکل وہیں۔ نیلی ڈینیوب کے کنارے۔''

گوتم نے کان لگا کر آواز پہچاننے کی کوشش کی۔

''وہی سارے پرانے کورس ہیں اور اوپرا کے گیت۔'' چمپا نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ابھی تمہارا جی ان گانوں سے نہیں بھرا۔''

''ان گانوں سے میرا جی کس طرح بھر سکتا ہے چمپا بیگم؟''

''اوہ۔ میں بھول گئی تھی کامریڈ گوتم.......... مگر تم ہی نے کہا تھا کہ دریچہ بند کر دو۔''

اب وہ ''بوجھا ٹھالو ہیا ہیا'' گا رہے تھے۔ گوتم نے باہر جا کر باغ کی دیوار پر سے جھانکا۔

بہت سے لوگوں کو ہاتھ ہلا کر ویو کیا اور واپس آ گیا۔ ''نہیں کمال وہاں نہیں ہے۔''

''گوتم ماشٹر۔''

''ہاں بھائی۔''

''کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں؟''

''نہیں تو، لیکن کچھ ایسی زندگی عقلمند بھی نہیں۔''

''بس............ میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے بتلا دیا، اب مجھے اطمینان رہے گا۔''

''گرو گوتم کو بلاؤ۔ گرو گوتم کہاں ہے۔'' آشا کے گھر میں سے صدائیں بلند ہوئیں۔

''گرو گوتم سریکھا کے یہاں بیٹھا ہے۔'' کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جا کر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ''نہیں میں آ نہیں سکتا۔ ایک بے حد ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔''

مگر دوسرے لمحے وہ دیوار کود کر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چمپا پھر اکیلی رہ گئی۔

اس کی دنیا کی کشش اس کے لئے زیادہ طاقتور ہے، یہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔

بہت دیر بعد وہ سریکھا کے ڈرائنگ رم میں داخل ہوا۔ کمال کا فون تو نہیں آیا تھا؟ اس نے سوال کیا۔ چمپا آتشدان کے سامنے قالین پر لیٹی پڑھ رہی تھی۔ ''نہیں'' اس نے جواب دیا۔ گوتم نے اس طرح اسے تنہا چھوڑ کر آشا کے یہاں چلے جانے کی معذرت نہیں کی، وہیں بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ''یار چاء بنائی جائے۔'' کچھ دیر بعد اس نے تجویز کیا۔

''تم آشا کے یہاں پی کر نہیں آئے۔''

''ہاں، مگر تم نے جو نہیں پی ہو گی۔ آشا تم جو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں۔ اب تم بنالو چاء اپنے لئے۔''

بہت جلد تم کو میرا خیال آیا۔ چمپا نے کہنا چاہا مگر وہ جھگڑنا نہیں چاہتی تھی، یہ اس قدر واہیات نسوانیت ہوتی، وہ چپ چاپ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

''آتا بھی ہے چولھا سلگانا۔'' گوتم نے پیچھے سے مذاقاً آواز لگائی۔

''بنارس میں میری اماں خود کھانا بناتی ہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''مگر تم تو کیمبرج پلٹ ہو!''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''چمپا رانی.........'' گوتم آ کر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ''آخر اس قدر افسردہ کیوں نظر آ رہی ہو؟''

''اور کیا کروں ناچوں؟''

''یہ تو کوئی جوب نہ ہوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بذلہ سنج تھیں۔''

''وہ دیکھو توس جلا دیا تم نے.........''

''افسوس طلعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔''

''چمپا، ایسی واہیات باتیں مت کرو۔''

''گوتم.........'' چمپا نے کیتلی اٹھاتے ہوئے رسان سے کہا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور آئندہ تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کروں گی۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے رکھی۔''

''چمپا رانی.........'' گوتم باورچی خانے میں آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا، اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ ''چمپا رانی۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ''اصلیت جاننا چاہتی ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمہیں کیا سنانے کا متمنی ہوں۔ اتنا طویل وقفہ گزر چکا ہے اور ظاہری طور پر ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹے سے دھرا رہے ہیں۔'' اس نے سر اٹھا کر چمپا کو دیکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ چولہے کے پاس کھڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے چمپا کو آج تک اتنے گھریلو اور پرسکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چاء بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

''ادھر آ جاؤ۔'' اس نے ذرا درشتی سے کہا۔ گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا، وہ پھر آتشدان کے سامنے آن بیٹھے۔

محض کوئی بات کرنے کی خاطر گوتم نے دارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوا جو کرسی پر رکھا تھا۔ ''کتنا خوبصورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس میں میں اپنے کاغذات رکھ دوں؟''

''رکھ دو۔''

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دیے۔

اب پھر باتیں ختم ہو گئیں۔

''اس بیگ میں۔'' اس نے گلا صاف کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ ''تمہارا

سامان ہے نا چلتے وقت مجھے یہ کاغذات نکال دینا۔ ورنہ سب گڑ بڑ ہو جائے گا۔''

''زیرِ بحث بیگ'' چمپا نے تلخی سے کہا، ''میرا نہیں سریکھا کا ہے۔ اس میں تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لے جا سکتے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ نہ یہ بیگ، نہ کاغذات، نہ یہ مکان، چیزیں حتیٰ کہ یادیں۔ کچھ بھی نہیں۔ جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں۔ صرف دکھ مشترک ہے، لیکن تم اپنے دکھ بھی اپنے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔''

گوتم خاموش رہا۔

''کیا تم کو معلوم ہے گوتم نیلمبر کہ گو پچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے پتا ہے کہ تم ہر سمے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے میں جس سے بات کرتا ہوں مجھے لگتا ہے میرا مخاطب میرا کنفیس ہے۔ میرا سارا وجود میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کیے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمہارے جرم سے مختلف ہے۔ تمہارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے۔ ایک بات بتاؤ............'' اس نے رک کر کہا............ ''تصورِ گناہ تمہارے نزدیک کیا ہے۔''

''کسی کا دل دکھانا۔'' چمپا نے سوچ کر جواب دیا۔

''اور؟''

''ریاکاری۔''

''اور؟''

''اور..........اور کمینہ پن۔''اس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر جواب دیا۔

''سنڈے اسکول کے سبق۔''

''ایں؟''چمپا نے اس کی بات اچھی طرح نہیں سمجھی۔

''میں نے دل دکھایا ہے، تمہارے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے؟''

''بہت بڑا۔''

''لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چمپا رانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ آتے ہیں جب کسی دوسرے کا دل دکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے۔''

''قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ یہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے، ورنہ وہ قاتل ہی کیوں بنتا؟''

گوتم پھر خاموش ہو گیا۔

''سر اونچے نیچے ہوتے جا رہے ہیں۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے باہر کی آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔''مگر ہارمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دفعتاً رک گئے ہیں۔''اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پردوں پر انگلیاں پھیریں۔

''اس کا ایک سر کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔''چمپا نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ میرے پیانو میں، بہرائچ میں، اکثر آدھی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندر تاروں پر دوڑ دوڑ کر سمفنی بجایا کرتا تھا۔''

''تم نے مجھ سے بہرائچ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔''

''بڑی پیاری جگہ ہے۔ کیونکہ میرا وطن ہے۔''

''ہم سب ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔'' اس نے چند لمحوں بعد الجھ کر کہا۔

حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا جس میں کمرے کی ہر چیز بے حد روشن اور واضح نظر آ رہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پگھلنا شروع ہو گئی۔

''یہ جوتا دیکھو۔'' معاً گوتم نے ٹانگیں آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ''زندگی اس کی طرح فٹ نہیں بیٹھتی۔'' پھر اس نے ایک توس کا ٹکڑا اٹھا کر بلی کو پھینکا جو دریچے میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے توس سونگھ کر چھوڑ دیا۔

''یہ بھی بوہیملین بلی ہے، توس نہیں کھاتی۔ اس کے لئے لوبسٹر اور شیمپین لاؤ۔''

پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا: ''چمپا تم نے اتنے دنوں بیکار میرا انتظار کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔'' وہ آتش دان کے پاس بیٹھی اسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔ غیر ضروری اور سخت بیوقوف اب بھلا اس کی کیا تک ہے کہ اتنی گنوان ہونے کے باوجود مجھ جیسے لپاڑی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے، بے وقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم، بورژوا فلسفی بے چاری۔ اگر اس کے دماغ کو کھرچا جائے اندر سے تو اس میں سے کتنی فالتو مٹی ملے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیراکوٹا۔

''طلعت نے اتنے سارے مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔'' اس نے باآواز بلند کہا۔ ''ہم نے کبھی اس سے اپنا سر بنوا کے نہ دیا، اب بھی وقت ہے بنوا لو، تم کہیں جا تو نہیں رہیں۔'' اس نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں۔ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے مگر باہر جانے کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔''

''تمھاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔ بے کار ایک دم۔'' وہ ٹہلتا ہوا مجسموں کی طرف چلا گیا اور کی سر ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ ''کیونکہ..........'' اس نے ایک مجسمے کی ناک چھوتے ہوئے کہا۔ ''ہر دفعہ تم پکڑی جاؤ گی۔ تمہارا خیال ہے تم نے فیصلہ کرلیا اس لئے اب ہر بات آسان ہے حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں۔ ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔''

وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ گھومتا چکر کاٹتا چتا رہا۔ لمحے کا بھنور دور دور تک پھیل گیا۔ ختم ہو گیا، باقی رہا جگمگاتی ہوئی برف پر سے پھسلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ پیٹرن مکمل ترین بن گیا، وہ ساکت و صامت آتشدان کے پاس بیٹھی رہی۔ کمرے کے تجربے میں بلی بھی شریک تھی۔ ہوائیں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور سڑک کی موٹریں، راہ گیر، دکانیں..... سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا وجود ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں اور انت سمے تک کئی بار پڑھوں گی۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

''دو دنیائیں ہر سمے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں☆'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا ''دوسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک پل ہے۔ جس روز یہ ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا۔''

''پل تم خود توڑو گے۔''

''نہیں۔ لوگوں نے چاروں طرف مشین گنیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں

توپیں چھپی ہیں۔ اوپر بادل گرج رہے ہیں۔ ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا پاتال میں گر کر غائب ہو جائے گی۔ میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے۔''

''تم اپنی اسپوٹ لائٹ لئے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو، جو شامت کا مارا اسٹیج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رخ اس کی طرف کر دیتے ہو، وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے۔''

''میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں۔''

''نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو۔ اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہو گا۔ اس دن تم اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سرپٹ نکل بھاگو گے۔ کھڑکیوں میں لوگ تمہیں نظر آئیں گے۔ اسٹوو کے گرد بیٹھے بحثیں کرتے، کھاتے پکاتے، کھاتے تم کسی آوارہ گرد بلے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے ٹائلوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔ تمہارا چہرہ ہمیں کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آئے گا۔ بوگی مین!''

''اور اس سمے میں تمہارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا: اسٹوو کے گرد بحثیں کرتا، کھانا بناتا، کھاتا، اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی.......... بوگ وومن!!''

وہ خاموش ہو گئے۔

وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا، پھر دریچے کی طرف چلا گیا۔

''آج بہت برف پڑی۔'' دریچے میں کھڑے گوتم نے ایک جنرل اسٹیمنٹ دیا۔

ابھی، اس کی بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا موجود رہے گا۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

''سریکھا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔'' گوتم نے کمرے کی طرف سے پشت کیے کیے دوسرا بیان دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاً وہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا.......... سورج ڈھل چکا.......... شام آ گئی.......... میں ابھی یہیں ہوں.......... میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ اتنا انمول۔ انمول وقت.......... وہ بڑبڑایا اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر دیوانہ وار مڈہرسٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپا نے جھک کر دارجلنگ کے بیگ سے کمال کے نام کے وہ لمبے لمبے سرکاری لفافے نکالے جو گوتم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔

ایک ایک کر کے ہر ٹائپ شدہ خط میں کمال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو

نامنظور کیا گیا تھا۔

۹۱

''آے پریم لگے پروانے۔جوال مئی چھوی کے دیوانے

جڑ چلمن کے پیچھے رے بیٹھی

دیپ شیکھا لہرائے رے۔دیپ شکیھا لہرائے رے۔

دیپ شکیھا لہرائے رے''

چندرا گاتی ہوئی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آ گئی۔

''طاعت .... چاء ....''اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

طاعت نے چاء انڈیلی۔

سریکھا انہاک سے ویڈیو ٹیون کرتی رہی۔زرینہ نے باغ کے رخ دروازے میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔پڑوسن نے باڑ پر سے سر نکال کر تھوڑی سی شکر مانگی۔

دنیا کا کام سکون سے جاری رہا۔بلکہ جب سے نرملا مری تھی دنیا کا کام اور زیادہ سکون سے جاری تھا۔سب اپنی اپنی مصروفیات میں اس طرح جٹے تھے گویا اس سے پہلے انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔اسی شدید مصروفیات کے مارے وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔طاعت اخبار کی رپورٹیں

لکھتی۔ کملا ڈل ٹمپل میں ڈنر کھاتی۔ فیروز کتابیں سنبھال کر بڑی سعادت مندی سے روز یونیورسٹی کا رخ کرتی۔ کمال شکنتلا یا سریکھا کے ڈرائنگ روم میں آتش دان کے سامنے اوندھے لیٹ کر مزید درخواستیں لکھنا۔ ہری شنکر نے ایک نیا مشغلہ شروع کر دیا تھا۔

وہ چڑیوں کے پر جمع کیا کرتا۔

نرملا کو مرے آج محض دسواں روز تھا مگر معلوم ہوتا جیسے اسے ان لوگوں سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ وقت ربر کی طرح پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

جس روز ایک جھٹکے کے ساتھ ربر کا یہ تناؤ ٹوٹے گا تو کیا ہوگا۔

''اب ہمیں نرمل کے دسویں کی فکر کرنا چاہیے نا؟'' شنکر نے چڑیوں کے پروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس طرح کمال سے کہا جیسے وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا:

''اب ہمیں نرمل کے بیاہ کی فکر کرنا چاہیے نا۔''

''ہاں۔ شاید۔'' کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

''یہاں کوئی پنڈت جی بھی نہیں ہیں جن سے پوچھ لیتے کہ آج کے روز ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔'' طاعت نے بھی ہری شنکر ہی کی طرح بڑے عملی انداز میں بات کی۔ برا بھلا زندگی کا کاروبار نرملا نپٹا کر چلی گئی تھی مگر اس کی موت کے بعد کے کاروبار تو ابھی باقی تھے۔

شنیلا دیبی پوچھ رہی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دسویں کا کچھ انتظام نہ کیا ہو تو فکر نہ کرو۔ سوامی دیویکا نند جی کہہ رہے ہیں کہ ان کے سنٹر میں..........

''جی.......... جی ہاں.......... جی بہت اچھا.......... شکریہ......'' کمال

نے ریسور رکھ دیا۔

موت بھی سوامی دیویکانند کی طرح فراڈ ہے۔

اب پھر وہ سب اپنی شدید بہادری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے اپنے مورچوں پر جا بیٹھے۔ طاعت نے ایک مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ سریکھا گیلری میں جا کر ڈانس کی مشق میں مصروف ہوگئی۔ ہری شنکر نے پروں کا البم اٹھا لیا۔

وقت کا سناٹا بہت سی توپوں کی طرح گرجنے لگا۔ گھڑی نے تین بجائے۔ کمال نے بزبان خاموشی ہری شنکر سے کہا۔ ''سر روجر سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے جانا ہے۔'' کیونکہ اس لرزہ خیز جملے کو الفاظ میں تو نہیں ادا کیا جا سکتا تھا۔

''لے آؤ۔'' ہری شنکر نے اسی خاموشی سے جواب دیا۔

''مڈہرسٹ سے نرملا کا سامان بھی آنا ہے۔'' طاعت نے اپنے خاموش الفاظ بھی اسی سناٹے میں انڈیل دیے۔

''لیکن ہم مڈہرسٹ کس طرح جا سکتے ہیں؟'' کمال نے اسی طرح احتجاج کیا۔

ہرشنکر نے ان الفاظ کو ڈی کوڈ کیا۔ وہاں، مگر ہم بہت بہادر ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے۔ ہم سرٹیفکیٹ بھی لائیں گے اور اس کا سامان بھی۔ چلو اٹھو۔ اپنے اپنے زرہ بکتر پہنو۔ لفٹ رائٹ۔ مارچ کرو۔ اپنے پرانے آزمودہ ہتھیار سنبھالو۔ چلو ہم جا کر نرملا کے زرہ بکتر اور ہتھیار واپس لے آئیں جن کی اب اسے ضرورت نہیں۔

اس نپٹو مائم کے بعد، جسے کسی نے، خود انہوں نے نہیں دیکھا، وہ سب باہر نکلے، موٹر میں بیٹھے اور ایک جانے پہچانے راستے پر روانہ ہو گئے۔ چار سال تک متواتر وہ اس سڑک پر سے گزر کر سینی ٹوریم جاتے رہے تھے۔

اب وہ آخری بار مڈ ہرسٹ سے لوٹ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ خاموشی سے موٹر سے اتر کر وہ اس روڈ ہاؤس میں گئے جہاں وہ ہمیشہ نارنگیوں کے سائے میں بیٹھ کر چاء پیتے تھے۔ روڈ ہاؤس کی مالکہ موٹی سارہ نے باہر آ کر ان کے سامنے چاء رکھی، وہ بھی اس نپٹو مائم میں شامل ہو گئی۔

سینٹ جانز ووڈ میں اپنے فلیٹ پر واپس پہنچ کر کمال نے سارا سامان گیسٹ روم میں رکھ دیا جس میں ہری شنکر ٹھہرا ہوا تھا۔

جب سب لوگ اپنے مورچوں پر واپس لوٹ گئے تو طاعت نے چوری سے نظر بچا کر اپنا مورچہ چھوڑا، اپنا زرہ بکتر اتار کر گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔

ہری شنکر پروں کا البم میز پر ڈال کر کمال کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز لیمپ کی روشنی میں بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ آبنوس کا فرنیچر۔ وکٹورین وضع کا اونچا سائیڈ بورڈ جس پر الم غلم بہت سی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک موڈرن پینٹنگ لگی تھی جسے ایک مرتبہ طاعت کسی کباڑی کی دکان سے بہت سستی خرید لائی تھی۔ ایک تانبے کا سو سال پرانا مجسمہ جو ایک مرتبہ طاعت نے کیمڈن ٹاؤن میں ایک کباڑیے سے محض چند شلنگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسالے۔ تقریباً شکستہ صوفہ۔

ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے، جب کہ نرملا کا سامان اس کے

قدموں میں پڑا تھا، اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشان کباڑی کی دکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو دیکھو۔ اپنی زندگی کو ذرا اس کباڑی مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔

موت؟

دفعتاً پھر اس کے کانوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں کماری نرملا سریواستوا کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شنکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی وارث تھا۔ اس مرتبان کو گنگا میں بہانے کے لیے اپنے ساتھ واپس وطن لے جائے گا۔ جو اس وقت کمال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری انتظامات کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ گیتا کا پاٹھ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ۔

ہر شے میں بڑی واقعیت تھی، وہ مرتبان بھی اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی تھا جیسے یہ کرسی یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھٹیچر سیکنڈ ویٹ بات کیا ہوگی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجئے کہ دوسروں کی موت پر چھکو پھکو روتے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہوگیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ ردولی والی ثریا باجی کے مرنے کی خبر سن کر کتنا روئی تھیں۔ جب کمال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ ہی تو ملی تھیں ثریا باجی سے، اس قدر دہاڑیں کیوں مار رہی ہو، تو اس نے جواب دیا تھا، میں تو اصولاً رو رہی ہوں۔ جب کسی کا دیہانت ہو جائے تو کیا ہنسنا چاہئے؟

یوں بھی سب کو ثریا باجی کے انتقال کا بہت غم ہوا تھا کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا مگر ایک روز نینی تال جا کر کسی عیسائی لڑکی سے انہوں نے شادی رچالی تھی اور اس صدمے سے ثریا باجی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک ردولی کی نیم تاریک کوٹھڑی میں پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا تھا۔

اور چونکہ وہ نہ رقاصہ تھیں نہ ایکٹریس نہ ادیبہ نہ لیڈر لہذا نہ ان کی تصویریں چھپی تھیں نہ ان پر مضمون لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی حیدر آبادی چوڑیاں زنانہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوا دی گئی تھیں اور ان کے چالیسویں کے بعد، جس میں لکھنؤ سے رشتے دار آ کر شریک ہو گئے تھے، گویا اسٹیج پر پردہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے اسمبلی ہال میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انہوں نے ایف۔اے تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری ثریا باجی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصے کا بے حد غیر اہم سب پلاٹ تھا۔

ٹپکل مسلم سوشل پکچر۔

مگر نرملا تو بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔

وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہوگئی۔

اری نرملا کی بچی۔ ایڈیٹ۔ ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حقیر نکلی۔ کہاں گیا وہ تیرا سارا فلسفہ اور آئیڈیالوجی، مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ.........وغیرہ.....واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی کیا تھی۔ لمبی چوڑی۔ ساری عمر تو محنت کرتے، پروگرام بناتے گزری۔ رات رات بھر پڑھا جا رہا ہے کہ فرسٹ ڈویژن مل جائے۔ یا اللہ۔ اچھا سیکنڈ ڈویژن ہی مل جائے۔ ہائے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں۔ پھر، پھر ملک اور قوم کی فکر میں جان دے دے رہی ہیں۔ لڑتی بھڑتی پھر رہی ہیں۔ جہاں کسی نے کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ ہر بحث میں یہ کودنے کو موجود، پھر جب فرسٹ کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لیے انہوں نے مہنامتھ مچا دی۔ ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر ان کو ولایت بھیجا، وہاں یہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ یہ واقعی کیمبرج میں موجود ہیں۔ سہمی سہمی پھریں کہ یہ خواب ہے، جلد ٹوٹ جائے گا، پھر پروگرام بنے کہ جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔ بابا پر جو قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ اتاریں گی۔ بھین کے لیے بہو ڈھونڈیں گی۔ پری زاد بالکل، پھر ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسیکو کی سیر کریں گی جا کر۔ (یہ جانے میکسیکو جانے کا اتنا شوق کیوں تھا۔) یہ موہوم سی امید تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔ اس میں ایک چھوٹا موٹا سا باغ ہوگا۔ روک گارڈن۔ مکان کا نام رکھیں گی.........کسی

قسم کا کنج............ یا کچھ اور............ خیر............ کوکل جی سے پوچھ لیں گی، وہ شاعرہ ہیں۔ اتنی تو تھی مستقبل کی چنتا، پھر یہ کہ بلیاں پل رہی ہیں، کتے، کبوتر، گائیں، بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور ساریوں پر تو خیر دم نکلتا ہے۔ نیا اوور کوٹ بنانے کے لیے وہ مہابھارت مچائے ہوئے ہیں۔ ضد ہے کہ جیسے زمرد کے گہنے لاج کے بنے ہیں ایسے ہی میرے بھی بنیں۔ اپنی سہیلیوں کے لیے جان حاضر ہے۔ چند لوگوں سے سخت جلن بھی ہے۔ محبت کی اہلیت بھی ہے۔ جو ہر انسان، ہر جاندار میں ہوتی ہے۔

پھر ہوا یہ کہ کیمبرج میں ان کو بخار ٹھہر گیا۔ ان کو ہسپتال پہنچایا گیا جہاں کئی سال تک پلنگ پر لیٹے رہنے کے بعد ایک روز آپ نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد فرما دی۔

تو کیا اس موت پر اصولاً رونا چاہیے۔ قطعی نہیں۔ یہ تو بڑی سخت ہنسی کی بات ہے۔ دراصل اس سے زیادہ لطیفے کی بات تو طاعت نے بہت دنوں سے نہیں سنی تھی۔

اس نے کمرے کا چکر لگایا۔ سارے فلیٹ میں گھومی۔ باغ کے سرے پر باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ چندرا اور سریکھا کے سائے دریچے میں سے نظر آ رہے تھے، گھوم پھر کر وہ پھر ہری شنکر کے کمرے میں واپس آ گئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے نرملا کے سامان کو اکٹھا کر کے سنگوانا چاہا۔ بے دلی سے اس نے چیزیں الٹیں پلٹیں۔ کتابوں کے بکس میں گیتا پر اس کی نظر پڑی۔ اسے نکال کر وہ ڈرائنگ رم میں لے آئی۔

لیمپ جلا کر اس سے اصولاً گیتا کا صفحہ کھولا اس احساس کے ساتھ کہ گویا وہ شانتی کے حصول کے لیے اس آسمانی صحیفے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بے حد دھیان سے پڑھنا شروع کیا:

............ان کو بہادری سے جھیل.......

جسم فانی ہیں لیکن ان جسموں کے اندر رہنے والی روحیں امر ہیں۔ چنانچہ لڑ۔ او بھارت کے فرزند۔ آتما نہ قتل کرتی ہے نہ خود قتل ہوتی ہے۔ تلوار اسے زخمی نہیں کر سکتی۔ آگ اسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اسے بھگو نہیں سکتا۔ ہوا اسے خشک کرنے سے قاصر ہے۔ جو پیدا ہوا اس کی موت یقینی ہے۔ جو مرا اس کی پیدائش اٹل۔ اس میں دکھ کی کیا بات ہے؟

دکھ اور سکھ، نفع نقصان، ہار جیت کو ایک سمجھ کر تو جنگ کر۔

تب ارجن نے کہا: او کیشو، اگر خرد کی راہ عمل کی راہ سے افضل ہے تو تو مجھے جنگ کرنے کے لیے کیوں کہتا ہے؟ جنگ کا عمل خوفناک ہے۔

بھگوان نے جواب دیا: انسانوں کو کام نہ کر کے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ کرم سے بے نیاز ہو کر وہ مکمل بن سکتا ہے کیونکہ پراکرتی سے پیدا شدہ گنوں کے زیر اثر انسان متواتر مصروف عمل رہتا ہے۔

او ارجن! تو اور میں کئی بار پیدا ہوئے ہیں۔ گو میں خداوند عالم ہوں لیکن اپنی پراکرتی پر قدرت رکھتے ہوئے اپنی مایا کے ذریعے خود وجود میں آتا ہوں۔ او بھرت، جب دنیا میں نیکی کا زوال ہوتا ہے تو میں خود کو مجسم کر لیتا ہوں اور جو میری الوہی پیدائش اور میرے عمل کو پہچان لیتا ہے، اے ارجن، وہ اپنا جسم چھوڑنے کے

بعد دوبارہ پیدا ہونے کے بجائے مجھ سے آن ملتا ہے۔ بڑے بڑے گنوان گھبرا جاتے ہیں کہ کرم کیا ہے اور نہ کرم کیا، وہ جو نہ کرم میں کرم اور کرم میں نہ کرم دیکھتا ہے وہی اصل گنوان ہے۔ اوارجن، عقل کی آگ کرموں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

او جنار دھن، میری پراکرتی مٹی، پانی، ہوا، آکاش، دماغ، ذہن اور انانیت میں منقسم ہے۔ یہ ادنیٰ دتبے کی پراکرتی لیکن مضبوط بازوؤں والے شہزادے، میری اعلیٰ پراکرتی وجود اور حیات کے احساس اور شعور میں موجد ہے جس کے سارے یہ کائنات قائم ہے میں ہی ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا! او کنتی کے بیٹے، میں پانی کا سودا ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کی اجتماعی خودآگہی ہوں۔ میں زمین کی متبرک خوشبو ہوں۔ میں سارے جانداروں کی جان ہوں۔ راہبوں کا زہد ہوں۔ جو جس عقیدے سے میری عبادت کرتا ہے میں اسے بھگتی میں تبدیل کر دیتا ہوں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔

میں عبادت کے مختلف طریقے ہوں۔ میں ہی جڑی بوٹی ہوں اور پوجا کی آگ۔ میں خود ہی پوجا کا عمل بھی ہوں۔ میں کائنات کا باپ ہوں۔ میں ہی ماں۔ راستہ ہوں اور گواہ اور آخری جائے پناہ۔ ابتداء۔ انتہا۔ آرام گاہ۔ گنجینہ اور ازلی بیج۔ اوارجن! میں تپش پیدا کرتا ہوں۔ مینہ برساتا ہوں۔ میں ابدیت ہوں۔ میں موت ہوں۔ میں وجود اور عدم وجود ہوں۔ میں وشنو ہوں۔

ویدوں میں میں سام وید ہوں۔ دیوتاؤں میں اندر۔ حواس میں ذہن ہوں

اور خود آ گہی۔ روروں میں شنکر ہوں۔ پ انیوں میں مہا سا کر۔ الفاظ میں اوم۔ عبادت میں جاپ۔ نہ ہلنے والی چیزوں میں ہمالیہ ہوں۔ رشیوں میں نارو۔ میں فلسفی کپل ہوں۔ گھوڑوں اور شاندار ہاتھیوں اور انسانوں میں الگ الگ میرا بادشاہ کا رتبہ ہے۔ ناگوں میں میں انت ہوں۔ پانی کے باسیوں میں دوون۔ فرمانرواؤں میں یم۔ پیائش میں میں وقت ہوں۔ جنگلی جانوروں میں شیر ببر۔ پرندوں میں گرڑ۔ جنگجو بہادروں میں رام۔ دریاؤں میں گنگا ہوں۔

میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں عورت کی گفتار اور ذہانت، وفاداری اور رحم دلی ہوں۔ میں گالتری منتر ہوں۔ میں جیت ہوں۔ صوفیوں میں میں ویاس ہوں۔ رتوں میں بسنت ہوں۔ اناجوں میں جو۔ میں سنسار کا آد، مدھ اور انت ہوں۔ میں رازوں کا سناٹا ہوں۔ اوارجن! میرے الوہی مظاہر بیکراں ہیں۔

اوارجن۔

اوارجن کے بچے۔ ایڈیٹ۔

وہ کتاب زور سے بند کر کے پھر اٹھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والا تھا۔ ابھی ہری شنکر اور کمال لوٹتے ہوں گے۔ اس نے ابھی ہری شنکر کا کمرہ بھی ٹھیک نہیں کیا تھا، وہ دوبارہ گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر نرملا کی چیزوں کو درست کرنے کی کوشش کی: ساریاں۔ جوتے۔ چوڑیاں۔ میک اپ کے پٹارے۔ ہینڈ بیگ جس میں دنیا بھر کی الا بلا جمع تھی جو لڑکیوں ہی کے ہینڈ بیگ میں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ بس کے ٹکٹ۔ لانڈری

کے بل۔ پرانے خالی لپ اسٹک۔ کانوں کے بندے۔ پنیں۔ پیسے خریداری کی فہرستیں اور جانے کیا کیا۔ ان سب چیزوں پر چار سال قبل کی تاریخیں پڑی تھیں۔ چار سال سے نرملا دنیا سے الگ تھلگ سینی ٹوریم میں مقید تھی، پھر اس نے نرملا کی کتابوں کا بکس پیک کرنا چاہا۔ ایک کتاب میں سے ایک تصویر ٹپ سے نیچے گری۔ طلعت نے جھک کر اسے اٹھایا۔

یہ گوتم نیلمبر کی تصویر تھی جو آج سے دس سال قبل بردکھوے کے لیے بہرائچ سے سنگھاڑے والی کوٹھی بھیجی گئی تھی۔ طلعت نے خالی خالی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھا اور اسے کتاب میں واپس رکھ دیا۔

ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لڑکے واپس آ چکے تھے۔

سریکھا نے کھانے کی میز پر سے آواز لگائی۔

طعلت، ہری شنکر کا کمرہ قرینے سے ٹھیک کر کے محاذ پر واپس چلی گئی۔

برف باری شدید ہو چکی تھی۔

اس رات، جب ہری شنکر سو چکا تھا، طلعت نے اس کے کمرے میں دبے پاؤں جا کر کتاب میں سے گوتم کی تصویر نکالی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس تصویر کو جوتوں سے خوب ہی مارا جب جا کر اسے ذرا شانتی کا احساس ہوا۔ تب وہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چونکہ وہ پچھلے دس روز سے نہیں روئی تھی۔

روتے روتے وہ بیہوش ہو گئی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ایک اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ساری دنیا نے سفید برف کا کفن پہن لیا۔ سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے درخت ایسے نظر آرہے تھے جیسے کسی مصور نے کینوس پر پھیلے ہوئے چائنا وائٹ پر سیاہ رنگ سے ادھر ادھر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی ہوں جن کے عقب میں مکانوں میں سے چھنتی ہوئی اداس زرد روشنی کے دھبے سے چاروں طرف پھیلے تھے۔ بڑے زور کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اس عظیم کینوس کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دومنزلہ کاٹج تھا جیسے کاٹج عام طور پر اوسٹرلی میں جا بجا ہیں۔ ایونیو میں داخل ہو تو بائیں ہاتھ پڑتا تھا۔ سامنے چھوٹا سا روک گارڈن تھا جو بہار کے زمانے میں پھولوں سے لد جاتا۔ سامنے منا سا برآمدہ تھا جس کی سرخ اینٹوں کی دیوار پر تانبے کی لالٹین نصب تھی۔ اندر گیلری تھی جس میں سے زینہ اوپر بیڈ رمز کو جاتا تھا۔ نیچے نشست کا کمرہ تھا اور کھانا کمرہ اور گیلری کے سرے پر پارلر تھا۔ اس کے اندر جا کر باورچی خانہ۔ پیچھے لان تھا جس کے سرے پر شاہ بلوط کا درخت کھڑا تھا۔ گھر والوں کا زیادہ وقت پارلر میں گزرتا تھا جہاں وائرلیس سیٹ اور ٹیلی ویژن رکھا تھا، وہیں کھانا بنتا، برتن دھوئے جاتے، اسٹوو کے پاس بیٹھ کر گپیں ہوتیں۔ جاڑوں کے زمانے میں زرینہ سر پر اسکارف لپیٹے، پتلون پہنے باہر کوٹھری میں سے لکڑیاں نکال کر سوں سوں کرتی اندر لاتی اور ڈرائنگ روم کا آتش دان دہک اٹھتا۔ تب دنیا

ایک دم بے حد محفوظ معلوم ہونے لگتی۔ آتش دان پر ایک موڈرن مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر آشا کا بڑا سا پورٹریٹ تھا۔ جو زرینہ نے ماتیس کی طرز میں بنایا تھا بڑا سا ایرانی قالین تھا۔ بڑے بڑے اسٹینڈرڈ لیمپ۔ دریچے میں سے باہر حد نظر تک برف دکھلائی دیتی۔ ریڈیو پر لاپسند پسندیدہ نغمے بجتے۔ دوستوں کے فون آتے اب تک بڑی پرامن، سیدھے سادے پرسکون احساسات سے گھری ہوئی زندگی گزر رہی تھی۔

زرینہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی اور یونیورسٹی میں روسی ادب اور فارسی میں بی۔اے آنرز کر رہی تھی۔ سلیڈز سے آرٹ کا ڈپلوما لے چکی تھی۔ اس کے والد بیرسٹر تھے۔ اس کی جواں سال، سرخ بالوں والی ماں، جو نسلاً انگریز تھیں مگر خالص لکھنؤی زبان میں گفتگو کرتی تھیں ٹکسالی محاورے بولنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بے حد محبت والی بی بی تھیں اور بے حد خوش مزاج اور پرمذاق۔ ان کا گھر زرینہ کی دوستوں کے لیے ہمیشہ جائے پناہ کا کام دیتا اور وہ ان سے بڑی بہنوں کی طرح پیش آتیں۔

اس وقت زرینہ پارلر میں میز پر بیٹھی ایک روسی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

اتنے میں گلیری کی گھنٹی بجی۔ زرینہ نے اٹھ کر دریچے میں سے جھانکا۔ برف سے جوتے لت پت کیے، اوورکوٹ کے کالر سے منہ ڈھانپے سامنے گوتم کھڑا تھا۔ زرینہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ہاتھ میں اٹیچی کیس لیے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔

”یہ پانچواں شہر ہے۔ یہاں بھی روشنیاں جل رہی ہیں۔ میرا خیال تھا یہ

جگہ مختلف ہو گی۔‘‘

’’مگر افسوس کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اندر آ جاؤ۔‘‘ زرینہ نے جواب دیا۔

’’میرے ساتھ باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔‘‘

’’ان کو بھی بلا لو اندر۔‘‘

’’کیسے بلا لوں۔ اس روشنی میں تم ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکو گی۔‘‘

’’وہ کون لوگ ہیں۔‘‘

’’بہت سے بھوت۔ لاشیں۔ ارواح خبیثہ، وہ سب میری دوست ہیں اور باہر اندھیرے میں دانت نکوسے کھڑی ہیں۔ ان کا جلوس میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔‘‘

’’مجھے ان سے ڈر نہیں لگے گا۔‘‘

’’تمہیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہیے کیونکہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مگر۔‘‘ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ’’میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہو گی۔ یہاں اندھیرا ہو گا، لیکن تم نے یہاں بھی دیوالی منا رکھی ہے۔ روشنی میں تم کیا دیکھنے کی کوشش کرتی ہو بھائی؟‘‘

وہ اکتا کر اپنے اٹیچی کیس پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے گیلری کا دروازہ کھولا۔

’’گوتم۔ میرا مطلب ہے، کہ تم واپس آ گئے ہو، جہاں بھی گئے تھے۔ یعنی کہ۔ دراصل ہم سب بے حد پریشان تھے تمہاری وجہ سے۔‘‘

’’میں تم سب کا ممنون ہوں۔‘‘

''میرا مطلب ہے کہ..... ویلکم ہوم..... ہوم جہاں کہیں بھی ہو یعنی۔ ہر سفر کے بعد کا عارضی پڑاو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے شانِ استغنا سے ہاتھ ہلایا۔ ''میں نے تمہارا سواگت قبول کیا''، پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ''یہ مکان تو وہ والا نہیں ہے جس میں تم رہا کرتی تھیں۔ آرٹسٹ کا مکان۔''

''وہی ہے۔''

''اچھا۔'' اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ ''تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ زرینہ کیا میں خبطی ہوگیا ہوں؟''

''نہیں تو۔'' اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''محض تم تھکے ہوئے زیادہ لگ رہے ہو۔''

''متواتر بھاگتے رہنے سے انسان تھک ہی تو جاتا ہے۔ میں جانے کتنے لاکھوں کروڑوں میل چل چکا ہوں اب تک۔''

''تم کہاں تھے؟''

''میں..... یہ کیوں بتاؤں۔'' اس نے بچوں کی طرح جواب دیا۔ ''کئی راتیں میں نے کھیتوں میں گزاریں۔ بھوسے کے ڈھیروں پر سویا۔ ندیوں کی کشتیوں میں گھسا بیٹھا رہا۔ اسٹیشنوں کے ویٹنگ رومز میں چھپتا پھرا۔ سارے میں پولیس کی نظروں سے بچا بچا گھوما کیا۔ تب آج میں نے کہا کہ کیوں نہ ایک شریف بہادر انسان کی طرح سامنے آ کر اقبالِ جرم کرلوں۔''

''پولیس؟''

''ہاں ۔کیا تم کو نہیں معلوم؟''

''نہیں تو..........کیا؟''

''میں نے، زرینہ بیگم..........''اس نے بڑے ٹھاٹھ سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہنا شروع کیا۔''میں نے دو قتل کیے ہیں۔تب سے مارا مارا پھرتا ہوں کہ کہیں سر چھپانے کو ٹھکانہ مل جائے۔واپس آ کر سارے دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر سب دروازے بند تھے اور اندر تیز روشنیاں جل رہی تھیں، پھر میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا لاؤ تمہیں بھی آزمالوں۔''

''اندر آجاؤ گوتم..........یہاں ہوا بہت تیز ہے۔''

''مگر تم پولیس کو خبر تو نہ کردو گی۔''اس نے سہم کر پوچھا۔

''قطعی نہیں۔''

''نہیں میں یہیں بیٹھوں گا۔گھروں کی چھتیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔''

زرینہ نے اسکارف سر کے گرد لپیٹ کر جھکڑ کی زد سے بچنا چاہا۔برف کے گالے چاروں اور بکھر گئے۔

''سنو زرینہ بیگم۔''اس نے اٹیچی کیس پر بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اس سے کہا۔''میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے دو قتل کیے ہیں اور کمال یہ ہے..........''

وہ ہنسا.....''کہ میں اس قدر چار سو بیس ہوں کہ میرے دونوں مقتولوں کو اس کا علم تک نہ ہوا کہ میں نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے۔''اب دفعتاً اس کی آواز بالکل نارمل ہوگئی۔''اس روز جب میں سریکھا کے یہاں سے پارسل لے کر بھاگم بھاگ

ہسپتال پہنچا تو نرملا نے مجھے پہچان کرنہ دیا کیونکہ وہ مر چکی تھی اور جب میں اسی رات وہاں سے لوٹ کر شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا تو مجھے چیلسی کے ایک پب میں چمپا احمد نظر آئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا...... کیونکہ وہ بے حد ڈرنک تھی......... چنانچہ......... ''اس نے بڑے فخر سے کہا......... ''میں اس قدر کا ماہر فن کروک ہوں......... دیکھا تم نے۔''

برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت پانی اور برفیلی کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی ایک موٹر ڈرائیو پر آ کر رکی اور اس کی تیز روشنی میں برف پر ایک پیلا راستہ سا بن گیا۔

کمال اور ہری شنکر موٹر میں سے اترے۔

''زرینہ'' انہوں نے ڈرائیو پر سے آواز دی۔ ''گوتم تو یہاں نہیں آیا؟''

وہ دونوں برف پر بھاری بھاری قدم رکھتے سیڑھیوں پر آ گئے۔

''سوامی جی کے سنٹر میں ابھی ابھی معلوم ہوا کہ گوتم لندن لوٹ آیا ہے اور شاید اوسٹر لی کی طرف گیا ہے۔'' کمال کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گوتم نیلمبر کو موٹر میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے۔

''کوئی نہیں آیا۔'' شنیلا دیبی نے دروازہ میں آ کر کہا۔ ''تینوں کے تینوں

دھرےپے میں سوگ باشی نرملا کے گھر والے۔ سوامی جی نے سارا انتظام کیا تھا۔ پھول منگوائے تھے۔ مدارسیوں کی ایک کیرتن پارٹی بھی سوئس کاٹج سے آ گئی تھی، مگر یہ لوگ شانتی کا مارگ ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔"

"اور جانتی ہو اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں اپنے گھر میں، یا اس انڈین ڈانسر کے فلیٹ میں جمع ہو کر صبح سے شام تک تاش کھیلتے ہیں.......... حد ہے۔" ایک بے حد روحانی انگریز بڑھیا نے دریچے میں سے منڈیا نکال کر بات کی۔

چمپا سیڑھیوں پر سے واپس اتری۔

"تم کسی کی متلاشی معلوم ہوتی ہو۔" دوسری ویدانت پرست امریکن بڑھیا نے دریچے میں سے سر نکال کر کہا۔ "دیکھو.......... وہ یہاں موجود ہے.......... تمہیں.......... ہم سب کو بلا رہا ہے.........." انہوں نے انگلی اٹھا کر کرشن کی بڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنٹر کے ہال میں رکھی تھی۔ "اسے دیکھنے کے لیے وہ تیسری آنکھ چاہیے جسے افسوس کہ تم ہندوستانی کھو بیٹھے۔"

چمپا ہڑبڑا کر دوڑتی نیچے اتر گئی۔ سڑک پر آ کر اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سڑک پر چلنے والے سب انسانوں کے ماتھوں پر تیسری آنکھ موجود ہے جو اسے گھور رہی ہے۔

وہ دوڑ کر ایک ۳۷ نمبر کی بس میں سوار ہو گئی۔

سنٹر میں سوامی دیویکانند نے اپنا لیکچر پلانا شروع کر دیا تھا۔ یوگا پر ان کا لیکچر سننے کے بعد ان کی سامعین معرفت پسند بڑھیاں اپنے گھروں کو لوٹ کر سنک میں پڑے ہوئے صبح کے برتن دھوئیں گی اور موزے رفو کریں گی اور گیس کے بل

کی فکر کریں گی۔ اس وقت لارڈ کرشنا ان کے کتنے کام آئیں گے۔

وہ بس سے اتر کر طالب علموں کے مرکز کی طرف روانہ ہوئی۔

ہال میں طالب علموں کی ایک بالکل نئی ٹولی گپوں میں مصروف تھی۔

''میں چمپا احمد ہوں۔'' کس نے دروازے میں جا کر کہا۔

''یس؟''

ایک مدراسی طالب علم نے آگے آ کر پوچھا۔

اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کا نام کتنا غیر اہم تھا۔ اسے کوئی نہ جانتا تھا۔ کسی کو اس کی ضرورت نہ تھی۔

''کچھ نہیں............کچھ نہیں............''

''جی............آپ کو کیا چاہئے؟'' ایک بنگالی لڑکی نے پوچھا۔

''کچھ بھی تو نہیں............'' اس نے اور زیادہ ہڑبڑا کر جواب دیا۔ ''ایسے ہی آپ لوگوں کا سنٹر دیکھنے چلی آئی تھی۔''

چند لڑکوں نے اسے شک وشبے کی نظروں سے گھورا۔

وہ الٹے پاؤں پھر سڑک پر آ گئی۔

اسٹرینڈ پہنچ کر وہ انڈیا ہاؤس میں داخل ہوئی۔ لفٹ میں اوپر کی منزل تک پہنچی جہاں کینٹین میں حسب معمول خوب شور مچ رہا تھا۔

''میں چمپا احمد ہوں۔''

اس نے کاؤنٹر پر جا کر کہا۔ اسے اپنی اس احمقانہ حرکت پر مطلق تعجب نہ ہوا۔

''یس ڈیئر۔'' ادھیڑ عمر کی ہندوستانی عورت نے، جو ایڈنگ مشین پر بیٹھی تھی،

انگریز عورتوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا، ''کھانا تو ختم ہو چکا ہے۔ اسنیکس ہیں۔''

نہیں.........ٹھیک ہے۔ وہ سٹ پٹا کر پھر باہر نکلی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے سر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ ایک کونے میں سریکھا کامیاں گلشن سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا، وہ پھر باہر آ گئی۔

اب وہ چوزے کی سرائے پہنچی، وہاں سائے کمال ملا جو کاؤنٹر پر کھڑا کسی کو فون کر رہا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل گیا، وہ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی اسے بھیڑ میں شامل ہوتے دیکھتی رہی، پھر باہر آ کر اس نے بی بی سی کی کینٹین میں جھانکا۔ چچا صدیقی کوئی لطیفہ بیان کر رہے تھے۔ اعجاز بٹالوی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔ تقی سید منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یاور عباس کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں چمپا احمد ہوں۔ اس نے ان سب کو بتانا چاہا مگر پھر واپس لوٹ گئی۔

سامنے ہی انڈر گراونڈ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے بالکل غیر ارادی طور پر میڈا ویل کا ٹکٹ لے لیا۔ چند منٹ بعد میڈا ویل کی چوڑی سڑک پر برآمد ہو کر وہ ایک درخت سے ٹک گئی اور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر سریکھا اور آشا کے مکان تھے۔ باڑ کی دوسری طرف چند قدم پر طلعت اور کمال کا فلیٹ تھا۔ اسٹیشن کے مقابل کے جدید بلاک میں شانتا اور ولیم کریگ رہتے تھے۔

عین اسی وقت گروسر کی دکان سے سبزی کا تھیلا اٹھائے سریکھا باہر نکلی۔

''ارے چمپا۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''وہاں کیسی کھڑی ہو.........آؤ.........

آؤ۔''

وہ خاموشی سے سریکھا کے ساتھ ہولی۔

چند قدم چل کر وہ مکان میں داخل ہوئیں۔

''چانچہ یہی گوکل تھا.......... شارمیلا...... یہی گوکل تھا..........'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا......'' سریکھا نے پلٹ کر پوچھا۔

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''بیٹو۔ گلشن ابھی انڈیا ہاؤس سے نہیں لوٹا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے وہاں کام شروع کر دیا ہے۔''

''اچھا۔''

ڈرائنگ روم کے چوڑے دروازے کے باہر ابھی دن کا اجالا باقی تھا۔ بہت سی سرخ بتیاں آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آ کر نیچے بکھر گئیں۔ پورچ کی سیڑھیوں پر، ڈرائیو پر۔ چار پانچ پتیاں دریچے کے باہر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں کے نیچے ہوا میں لرزتی رہیں۔ دھوپ کی سنہری لکیر نے گھاس پر حلقہ سا بنا لیا۔

کیا پتا انسان دراصل کیا چاہتا ہے؟

''ارے چمپا.......... یہاں اس صوفے پر بیٹھ جاؤ آرام سے..........'' سریکھا نے ترکاریاں سینی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''اس صوفے پر بیٹھنے سے کمرہ وہی تو نہیں بنے گا جو اس روز تھا۔'' چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

''اس روز.......... کس روز؟ کیسا تھا؟'' سریکھا نے باورچی خانے میں جاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا معلوم..........؟''

خالص موسم اب باہر فضاؤں میں پھیل چکا تھا۔ شدھ سردی۔ شفاف، پاکیزہ برف۔ سارا وجود بے حد ہلکا پھلکا اور صاف محسوس ہو رہا تھا۔ سریکھا نے شال اوڑھی اور کمرے میں آ کر آتش دان جلایا۔

''کل..........'' اس نے بالٹی میں سے کوئلے الٹتے ہوئے بات کی۔ ''بہت سے لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔''

''ہاں۔ ہندوستان۔'' سریکھا نے راکھ کریدنا شروع کی۔

''کون..........کون..........'' چمپا نے بے تعلقی سے پوچھا۔ اب اسے کسی سے کیا مطلب، وہ اس خالص موسم کی طرح سارے میں پھیلی تھی۔ اسے مخصوص شخصیتوں سے کیا غرض۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سریکھا گھریلو انداز میں پلو کمر میں کھونسنے کے بعد پھر ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔

''سبھی..........'' اس نے جواب دیا۔ کمال۔ ہری۔ کملا۔ ہری فلائی کر رہا ہے۔ کمال پرسوں کیلئے دونیا سے جائے گا۔ گوتم آج صبح کرشنا مینن کے ساتھ پھر نیویارک چل دیا۔

باہر چھتوں کے پرے ایک دم سورج ڈوب گیا۔ بگ بین نے ریڈیو میں اپنا بگل بجایا۔ باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ جاڑوں کی رات کی تاریکی جو دفعتاً دنیا کو آ دبوچتی ہے، وہ سریکھا کی مدد کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں گلشن کے اور اس کے دوست داخل ہو چکے تھے، وہ باورچی خانے کے دروازے سے نکل کر سرد باغ میں سے گزرتی آشا کے گھر چلی گئی۔

سریکھا کی آواز پر وہ واپس لوٹی۔اس نے دریچے میں سے اندر جھانکا۔شام کا اثر کمرے میں ختم ہو چکا تھا۔اس کی جگہ رات نے لے لی تھی، وہ دوبارہ اس کمرے میں گئی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔سائے دوسرے تھے، رنگ، فضا کا سر۔وقت بھی کھڑکی کے راستے باہر چلا گیا۔اس کا ذرا سا ٹکڑا بھی پیچھے پڑا نہیں ملا۔

سریکھا کے گھر سے باہر نکل کر اسے کمال کے مکان کی روشنیاں نظر آئیں۔

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ.......... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ.......... مجھے چھوڑ کر مت.......... اس نے چلا چلا کر کہنا چاہا مگر خاموشی سے تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی اور جون کارٹر کی گلی میں پہنچی اور اصطبل کے دروازے میں جا کر روشنی جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مگر دفعتاً تاریکی نے سامنے آ کر اسے خوش آمدید کہا، وہ دریچے میں رکھے ہوئے جریئیم کے پودوں پر جھک گئی۔اب تک رات میری خلاف تھی۔اس نے سوچا۔اب شاید میری ساتھی بن جائے۔اونچے مکانوں پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا، گھاس کی سرسراہٹ، چھتوں پر جمی ہوئی برف۔زمین پر رات کی موجیں بہتی چلی جارہی ہیں اور اب دھارے الگ الگ ہو چکے ہیں۔اب میں واقعتاً مکمل طور پر آزاد ہوں، وہ ہنسی۔نیچے بہت ٹھوس، حقیقی زمین ہے اور اس زمین پر مجھے موت تک چلتے جانا ہے۔قدم مجھے کہاں کہاں لے جائیں گے۔(اس نے پیروں کو اس طرح دیکھا گویا آج تک وہ اسے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔) رات میرے ہاتھ

میں موجود ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی۔ رات کی رسی کو میں مضبوطی سے تھامے تھامے دن تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تو آج سے میری سکھی ہے۔ کہو سکھی کیسی ہو۔ میں تو تم کو مدتوں سے جانتی ہوں۔ برساتوں میں، پھاگن کی رت میں پورنماشی میں، امتحانوں کی پڑھائی کے زمانے میں، اجنبی دیسوں میں، ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے تمہاری ہر کیفیت کو دیکھا ہے۔ میں نے اور تم نے اکٹھے سے بتایا ہے۔ ایک روز تم ہی جیتو گی۔

اور تم، اس نے دوسری بات شروع کی، میں تم کو تمہارے خوابوں کی دوسرا تھ میں چھوڑتی ہوں۔ میں شاید ایک واقعیت تھی اور تم خواب دیکھنے سے کبھی باز نہ آؤ گے۔

رات تاریک تر ہوتی گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ جون کارٹر کے فلیٹ میں مکمل سناٹا تھا۔ نیل اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جون بھی سو چکی تھی۔ او جیت اپنی میٹنگ سے نہیں لوٹا تھا۔ خاموشی کی لہریں بوسیدہ دیواروں سے ٹکرایا کیں۔ وقت نے کہا: مجھے پہچانو۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا خیال تھا لمحے اپنے جگہ قائم رہیں گے، لیکن تمہارا یہ خیال بھی غلط تھا۔ مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل، چھن چھن۔ پردوں کے پیچھے تہ در تہ اندھیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں۔ میں حد فاصل ہوں۔ اس کے آگے تم نہیں جا سکتیں۔ اب واپس لوٹ چلو۔ سرحد پر تم پہنچ چکی ہو۔ سامنے پھاٹک ہے۔ اب دوسرا دیس شروع ہوتا ہے۔ اب تم کو دوسرے پروانہ راہداری، نئے کاغذات کا انتظام کرنا ہوگا۔ نئے سرے سے خانہ پری اور دستخط کرنے ہوں گے کیونکہ اب نئی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میں نے اب

تک بہت سے سحر توڑے ہیں۔تمہاراوالاسحر تو بہت ہی غیر اہم تھا۔

مجھے پہچانو۔ میں برابر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔تم کم از کم مجھ سے نہیں بھاگ سکتیں۔لوگ تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دیکھا تم سرحد پر کتنی جلدی پہنچ گئیں۔تم کو فیصلہ کرنے میں کتنی دقت پیش آ رہی تھی۔ میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں۔ سارے فیصلے، سارے ارادے میری وجہ سے خود بخود پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھا دوں گا۔ اب مجھ سے صلح کر لو۔ میں اب بھی موجود ہوں۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ پھڑپھڑانے لگا۔ کمرہ کہرے سے بھر گیا۔تب اسے معاً محسوس ہوا کہ وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔اس نے جلدی سے دریچہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

۹۴

''اپی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا بڑھیا ساریاں بنواؤں گی، کارچوبی۔'' نرملا کہہ رہی تھی۔

میں خاموش رہی۔

''مجھے تو یہ نئے قسم کی بارڈر والی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔'' مالتی نے

ہونٹ لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ مالتی رائے زادہ سولہ برس کی تھی۔ نرملا اس سے ایک سال چھوٹی تھی ۔ میں نرملا سے ایک سال چھوٹی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں ملبوسات کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

پھر طلعت دفعتاً خاموش ہوگئی۔ ''دیکھو'' اس نے کمال سے کہا، ''میں نے آج یہ محسوس کیا ہے میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے۔''

''میرا ماضی محض میرا ماضی ہے۔'' کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔

''اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔'' ہری شنکر کی آواز گونجی۔

''لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدے بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔'' طلعت نے کہا۔ ''میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔''

''تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن اسٹائن بھی نہیں کرسکتا۔''

''میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔'' کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔

''وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔'' طلعت نے کہا۔

یہ لوگ جو لندن کے سینٹ جانز ووڈ میں بیٹھے ۱۵ دسمبر ۵۴ء کی سہ پہر کو یہ باتیں کر رہے تھے ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر عجیب عجیب شکلیں بناتے

رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ موٹریں آجا رہی تھیں۔ وائرلیس میں سے وی آنا کے کسی کونسرٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وقت کے وسیع اندھیرے اور اونچی دیواروں اور سڑکوں اور گلیوں اور آوازوں کی بھول بھلیاں میں گھرے تینوں موجود رہے۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۱ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے جوانی میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ دور پہاڑوں میں گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ وقت جو سیال تھا، وقت جو منجمد تھا۔

''ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔'' ہری شنکر نے کہا۔ ''کیونکہ ہم خوفزدہ ہیں۔''

''اور گوتم نیلمبر تک کس قدر خوفزدہ نکلا۔'' کمال نے کہا۔

''گوتم نیلمبر کا اس وقت ذکر نہ کرو۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ جاؤ گے۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضرع کیا ہے۔'' ہری شنکر نے کہا۔ ''میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد بھی ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے ہم اپنے اوپر کرلیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پگ ہم لوگ ہیں ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔''

وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک

جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے.......... اور آگے..... پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کی مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

کمال گویا اسٹیج پر چلتا ہوا وسط کی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ مکھی کی آنکھوں سے اس نے سب کو دیکھا۔ مائیکل۔ بل کریگ۔ زرینہ، وہ سب صبح صبح گوتم نیلمبر کو ائیر پورٹ پہنچا کر واپس لوٹے تھے اور کمال کے کمرے میں ہر شنکر اور کمال کے بندھے ہوئے اسباب پر چڑھے بیٹھے تھے۔

گوتم زرینہ کے یہاں سے آکر پندرہ دن تک کمال کے گھر پر بیمار پڑا رہا تھا۔ تب وہ دن بھر تاش کھیلتے یا بیت بازی کرتے۔ مکی ماؤس کے کومک اور فلمی رسالے تک پڑھے گئے۔ گوتم ابھی پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کشمیر کے کیس کے لیے اسے پھر نیویارک جانے کا حکم آ گیا۔ لندن میں یہ کمال اور ہری شنکر کا آخری دن تھا۔ ہری رات کو ائیر انڈیا سے پرواز کرنے والا تھا۔ کمال کو کل صبح بوٹ ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ کملا بھی جا رہی تھی۔ مائیکل بھی جا رہا تھا۔

طلعت نے دوبارہ کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ ۱۵ دسمبر ۵۴ء۔ اسے پھریری سی آئی۔

''مائیکل دروازہ بند کر دو'' مائیکل نے اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ لوگ طلعت کو کلدار کھلونوں کی طرح نظر آئے۔ سپاہی جن کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں (مائیکل) سر ہلاتے ہوئے سفید چگی داڑھی والے چینی فلسفی (ہری شنکر)۔ مہاراجہ چندر گپت

کے درباری نرتکی (سریکھا)۔ دھاڑیں مار مار کر روتے، ماتم کرتے اپنی زندگی کے تعزیے کے ساتھ ساتھ ننگے پاؤں چلتے گولہ گنج والے کمر خمیدہ نواب کمن صاحب (کمال)۔ دیوالی کے گڑیوں گڈوں کی طرح وہ سب سامنے سجے تھے۔ مورتیاں جن کو لکھنؤ کے کمہاروں نے بنایا تھا۔ (ان میں سے ایک مورتی گر کر ٹوٹ چکی تھی۔) ابھی بہشتی آئے گا، چھڑکاؤ ہوگا، تخت بچھے گا۔ تخت پر راجہ بیٹھے گا۔ لونا چماری کا جادو چلے گا، پھر یہ سب جا کر اپنے طاقوں میں بیٹھ جائیں گے۔

"میں بالکل ٹھیک تھی۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مگر پھر ایک دم چیزوں نے مجھے ڈرانا شروع کر دیا۔"

کمال نے گویا اس سے کیو لے کر کہا: "یہ انکشاف ہوا کہ کائنات میں بڑی گڑبڑ ہے۔"

"اور اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو میں الفاظ کے سمندر میں سے گزرتی خیالات کے پرخطر راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔"

"الفاظ کیا تھے؟ حقیقت کیا تھی؟ کتابوں نے کہا الفاظ غلط ہیں۔ حقیقت کوئی شے نہیں سمبندھ لایعنی ہیں۔ پتارم، ماترم، پترم، پوترم..........سب.........." ہر شے فالتو ہے۔ کبھی میں نے دیکھا برہسپتی راکھشوں کو اپنا علم بڑھا رہا ہے۔ کبھی میں خود اپنے آپ کو ایک عظیم راکھشنی نظر آئی یا پریوں کی کہانیوں کی کوئی چڑیل جو اپنے علم کی جھاڑو پر سوار تاریک خلاؤں میں ناچتی پھر رہی تھی۔

ان تاریک خلاؤں میں اور بہت سی جھاڑوئیں سن سے پاس گزر جاتیں جن پر ہزاروں لڑکیاں سوار تھیں: تہمینہ، نرملا، روشن، جون کارٹر، فیروز، چمپا، زرینہ اور

جانے کون کون۔ یہ جھاڑوئیں اب اتنی اوپر اڑ گئی تھیں کہ اب ان کا نیچے اترنا محال تھا۔ دراصل ساری دنیا کے آسمان ان جھاڑوؤں سے پر تھے۔

ان سب میں چھپا ایک بڑی قابل ذکر ہستی تھی۔ اس سے غلطی یہ ہوئی خواب دیکھنے شروع کر دیے۔

اب اگر آپ ایک جھاڑو پر سوار ہوں اور سو جائیں تو لامحالہ آپ راستہ بھول جائیں گی اور آپ کی جھاڑو ٹکرا کر نیچے آ رہے گی۔

اپنی خواب کی حالت میں وہ عہد عتیق کے بھگتوں کی مانند گاتی پھری۔ گرجاؤں میں گئی۔ راہبات کو رشک سے دیکھا۔ ذاتی زندہ خدا اور اپنی زندگی کے مجازی خدا کے تصور کو یکجا کرنے سے اسے غالباً بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اس مسرت کا تم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ یہاں عقیدے اور اللہ کی ذات میں یقین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محض تھوڑی سی معرفت کی ضرورت تھی جو صبح منہ اندھیرے بھیرو گاؤ تو آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ میں رادھا ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ میں مریم مگدلین ہوں۔ میں زریں تاج طاہرہ ہوں۔ مدتیں گزریں اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ جب میں چیپل میں جاتی ہوں اور بشپ گھنٹی بجاتا ہے اور یوکراسٹ کے گلاس اٹھائے جاتے ہیں تو میں اس ساری اشاریت کے جال میں خود کو موجود پاتی ہوں۔ گوتم نیلمبر کی طرح اس ہر واقعے میں رمزیت نظر آ جاتی تھی۔

وہ سب کمرے سے نکل کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ کمال نے ناک اٹھا کر کہرے کو سونگھا۔

''چیزوں کی رمزیت کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے بہت

دکھ اٹھائے ہیں۔'' مائیکل نے ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' طاعت نے جواب دیا، وہ سب سر جھکائے زمین کو تکتے چلا کیے۔ شام کی کلرنگ روشنی میں وہ ہمپسٹیڈ ہیلتھ کی طرف بڑھتے رہے۔ مکانوں کے چھوٹے چھوٹے بیک گارڈن، کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگ، تنگ گلیارے جن کے سرے پر نیم تاریک قہوہ خانے تھے۔ لڑکیاں دفتروں سے لوٹ رہی تھیں۔

''یہ منظر میرے لیے لرزہ خیز ہے۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''ہاں۔'' طاعت نے اسی طرح جواب دیا۔

پہاڑی پر پہنچ کر وہ مصوروں کی تصویریں دیکھتے پھرے اور مزید بور ہوئے۔

''وہ دیکھو تروناوغیرہ آرہے ہیں۔''

''آہا۔''

نیچے میلہ لگا تھا۔ جپسی عورتیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتلا رہی تھیں۔ بچے مونگ پھلی اور آئس کریم کھا رہے تھے۔

''سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے خوابوں میں گھسیٹنے کی کوشش کریں۔'' مائیکل نے کہا۔

''ہاں۔'' طاعت نے دہرایا۔ ''میرا ماضی، میرا وقت، میرے خواب صرف میرے ہیں، وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے، گو خیال رکھو......'' اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ''میں شخصی سطح پر یہ بات کر رہی ہوں۔ مستقبل ہم سب کا مشترک ہے۔''

مائیکل نے ایک کنکر اٹھا کر غصے سے اسے مارا۔ ''خدا کے لیے اس نقطے پر پہنچ کر بھی پارٹی لائن مت چلاؤ۔ مستقبل مشترک نہیں ہے۔ مستقبل اس پہاڑی کے ادھر ہم سب کے لیے الگ الگ منہ پھاڑے کھڑا ہے، ہری کے دس سر والے خدا کی طرح۔''

''او مائیکل۔'' طلعت نے بچوں کی طرح کہا، ''یہ واقعہ ہے کہ میں بہت ڈرتی رہی ہوں۔''

''ہاں۔''

میرے ڈرانے کو کیا کم چیزیں تھیں۔ خوبصورت مناظر۔ آرام دہ گھر۔ بیگ کھولتی تو اس میں سے طرح طرح کے کاغذات نکلتے۔ بنکوں کے مراسلے۔ شیرز کے کاغذات۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی رپورٹیں جن پر نام ہوتے: سہنا، سربیرین مکرجی۔ شری تھاپڑ۔ ان سب ناموں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ اونچی مضبوط عمارتیں۔ شفاف غیر شخصی دفاتر۔ روپیہ۔ روپیہ۔ معاشیات کے مسائل۔ اسٹرائیک۔ بھوک۔ بے روزگاری۔ ڈائریکٹروں کے اجلاس۔ ٹریڈ یونین۔ مزدور بستیاں۔ سٹی آف لندن۔ کلائیو روکلکتہ۔ بشپ گیٹ۔ چورنگی۔ ٹاٹا نگر۔ اینڈریو یول کلکتہ۔

''میں ڈرتے ڈرتے ان کاغذات پر دستخط کرتی، جو گویا میرے تحفظ کے ضامن سماج میں میرے اونچے دولت مند درجے کے گواہ تھے۔ یہ سب کیوں ہے؟ مجھے اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میں رضا خاندان میں پیدا ہو کر اس کھڑاگ کی وارث قرار دی جاؤں۔ کاغذ کے ٹکڑے۔ روپیہ۔ روپیہ۔

روپیہ۔ دفعتاً روپے کی اہمیت کا سارا احساس میرے دل سے مکمل طور پر زائل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: پورٹروں کے رئیس ایسے ہی غنی ہوتے ہیں، وغیرہ مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آتی۔''

وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔ نیچے وادی میں جھیل کے پانی پر ڈوبتے سورج کی کرنیں رقصاں رہیں۔ سالویشن آرمی والوں کا ایک دستہ بینڈ بجاتا سامنے سے گزرا۔

کمال جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور اس بلندی پر سے بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔

معاً طلعت زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔

سب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں نے ایک مرتبہ نرملا سے پوچھا تھا: رانی بی بی! تمہیں ڈر کاہے کا ہے۔ نرملا نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے خوابوں کو اس سے بچانا چاہتی ہوں، وہ میرے خواب جانتا ہے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے کہ نرملا کے خواب اب اس کے پاس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔ گوتم بالآخر لاعلم رہا۔ ہم لاعلمی میں پیدا ہو کر لاعلمی میں زندہ رہتے ہیں اور اسی میں مر جاتے ہیں۔ یہی اصل سدھانت ہے۔''

کمال ان کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ مائیکل نے جھک کر گھاس کا پتا توڑا۔ میلے میں بجتی ہوئی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔

ایک جیٹ طیارہ ان کے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھا کیے۔

''لاعلمی کا جو شہر ہم نے بسا رکھا تھا اس کی دیواریں ہم نے فلسفے کی اینٹوں سے چنی تھیں☆''طلعت نے بات جاری رکھی۔''ایک روز سینڈھ لگا کر موت ہمارے شہر میں داخل ہوئی۔''

''ایک مرتبہ جب فارن برا کے ایئر فیسٹول کے موقعے پر بے چارہ جان ڈیری آواز کی سرحد توڑتے خود ہلاک ہو گیا تھا اس کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو کر تماشائیوں کے اوپر آن گرا تھا..........بیسیوں لوگ مرے تھے۔اس سے، جب طیارہ دہکتے ہوئے آتشیں گولے کی صورت میں آواز سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا، اس لمحے مجھے پتا تھا کہ یہ موت ہے۔آن کی آن میں میں بھی جل کر بھسم ہو جاؤں گی، مگر جانتے ہو۔زمین پر اوندھے لیٹنے کے بجائے میں طیارے کے ٹکڑوں کی بوچھاڑ میں چندرا اور زرینہ کو پکارتی پھری کہیں وہ نہ مر گئی ہوں۔ مجھے اس وقت اپنے بجائے ان دونوں کی زندگیوں کی فکر تھی۔ اپنے متعلق تو احساس بھی نہیں تھا۔''

''لہذا ازملا نے موت کا سامنا کیا تو مجھے لگا کہ اسے بھی خوف محسوس نہ ہوا ہو گا گو یہی ایک واحد تجربہ ایسا ہے جس میں انسان کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا لہذا ہم نے اسے یہ تجربہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔بے چاری ہاتھ پاؤں مارتی دریا کے تاریک کنارے میں بہہ گئی۔''

''ویدانت میں کہیں پر وجود کی چار کیفیتوں کا ذکر ہے:۔ جاگتا ہوا انسان، خواب، بغیر خواب کی نیند اور موت۔''

''جس روز میں بے ہوش ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بہت

گہری نیند سو رہی ہوں۔ خالی اس گہری نیند میں مجھے خواب نہیں دکھائی دیے۔ میری آتما جا کر اندھیرے سے مل گئی اور جب واپس آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی موت ہے اور جب یہ آئی تو آتما دوسرے غیر مرئی لیکن مادی جسم کو ساتھ لے کر اپنی راہ نکل کھڑی ہوئی۔ اب بہت سے راستے سامنے تھے۔ ان پر مارا مارا پھرنا تھا مگر واپس نہیں آنا تھا۔ یا نہ جانے کیا ہونا تھا۔ مہاراجہ جنک نے کہا تھا: متھا! جل رہا ہے مگر میں باقی ہوں۔ غالباً یہ صحیح ہے۔'' طاعت نے کہا۔

''ہم سب جلے جا رہے ہیں۔'' ہری شنکر نے مائیکل سے کہا۔ ''کیا آگ کی لپٹیں تم تک نہیں پہنچیں۔''

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

نیچے نیم تاریک گھاٹی میں کمال گاتا پھر رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا پر تیرتی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ چاند درختوں پر طلوع ہو رہا تھا۔

طاعت پھر اپنے سفر پر چل کھڑی ہوئی: ''اس سمے چاند سنگھاڑے والی کوٹھی کے باغ میں کنوئیں پر جھکا آنگن کے اندر کھڑا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مرنے کے بعد روح شعلے سے رات میں، رات سے بڑھتے چاند میں، بڑھتے چاند سے بڑھتے سال میں، دیولوک میں، وایو کی دنیا میں ہوا، سورج اور بلجی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ واپسی میں وہ فضا، دھوئیں، بادل اور بارش اور پودوں میں پہنچی۔ قربانی کا شعلہ ہوا سے دھوئیں میں دھوئیں سے کہر میں، کہر سے بادل میں، بادل سے بارش میں تبدیل ہو کر برس جاتا ہے۔ ساری روحیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔''

''خیالات کا اور روح کا سفر ایک ہے۔'' شنکر نے کہا۔

''موت مجھے ختم کردے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ ہوائیں میرے سانس کو اڑا لے جائیں گی۔ سورج میری آنکھوں کی روشنی پر پردہ ڈال دے گا۔ چاند میرے دماغ کو سلا دے گا۔ آتما فضا میں گھل جائے گی۔ خون پانی میں گھل کر پانی بن گیا۔ طلعت نے چٹان پر کھڑے ہو کر دہرایا۔''

''گہری نیند۔ گہرا خواب۔'' شنکر نے کہا۔ ''عناصر سوچ رہے ہیں۔ حواس سو چکے ہیں۔ صرف موت باقی ہے۔''

''جسم سوچتا اور محسوس کرتا ہے، وہ ختم ہوا تو سمجھو سب کچھ ختم ہوا۔ جلتی اگنی، سرد پانی، خنک ہوائیں۔ سب اپنے سبھاؤ سے آپ پیدا ہوئی ہیں۔ گوتم نے چمپا سے کہا تھا: اگر تمہارا جسم تمہارے ذہن سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو اسے علیحدہ کر دو اور صرف تم میرے پاس آ جاؤ، مگر تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' مادہ پرست گلشن نے کہا۔

''آئے پریم پگھے پروانے جوال مئی چھوی کے دیوانے
جڑ چلمن کے پیچھے رے بیٹھی دیپ شنکھا لہرائے رے......
دیپ شنکھا لہرائے رے..........''

چندرا نے گایا۔

''ابھی بہت سوں کو مرنا ہے، میں ان کے پہلے جا رہا ہوں۔ بہت سے مر رہے ہیں، میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں جو مر گئے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ آگے دیکھتا ہوں، جو میرے بعد مریں گے ان کے ساتھ کیا ہو گا؟'' ہری شنکر نے کہا۔

''چیونٹی چڑھی پہاڑ پر کانوں میں ہاتھوں لٹکائے
ایک اچنبھا ہم نے دیکھا، نیا بیچ ندیا ڈوبی جائے''

گھاٹی میں سے کمال کے گانے کی آواز آئی۔

''میری قیمت کیا ہے۔ میں نے اب تک کیا کیا ہے۔'' سریکھا نے کہا۔

''میں جو کچھ کرتا ہوں میرا ہر فعل لگتا ہے ساری کائنات کے چکر سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ اس اہمیت کو چھپانے کی غرض سے میں ہنستا ہوں۔ ویسے میں تم کو یہ بتلا دوں۔'' مائیکل نے انگلی اٹھا کر کہا ''ہمارا حشر بہت برا ہو گا۔''

''کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔'' ڈراؤنے کورس کی مانند ان کی آواز پہاڑی پر گونجی

''سامنے مستقبل کی دیوار ہے اور میں مائیکل کی مانند اس کے سامنے کھڑی کھڑی چلا چلا کر رو رہی ہوں۔ کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟'' طلعت نے کہا۔

''کسی امریکن نیگرو کو بلاؤ، کسی جرمن یہودی کو پیش کرو، کسی عرب پناہ گزین کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے، کسی پاکستانی مہاجر اور ہندو شرنارتھی کو آواز دو.........اور ان سب سے پوچھو کہ تمہارا جرم کیا ہے جس کی یہ سزا تم کو ملی؟'' گلشن نے کہا۔

''میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میری سزا تجویز کرو۔'' مائیکل نے کہا۔

''اسرائیل کے نئے نغمہ نواز! ہم تو محض ڈیبورا کا گیت تم سے سننا چاہتے تھے۔'' طلعت نے کہا۔ ''مگر تم نے ہاتھ میں بندوق اٹھا لی۔''

''ہم ہزاروں برس تک روتے رہے۔صحراؤں کی بھوک۔غصہ۔بے کسی۔ چیخ چیخ کر ہم نے یہوواہ سے فریادیں کیں۔داؤد کے گیت کاروں کا کرب۔بے چارگی۔خواب۔میں طاعت کا سوال دہراتا ہوں.........کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟روح کی تنہائی انہوں نے اپنے لحن میں انڈیل دی۔گہرائی کی تنہائی۔ اونچائی کی تنہائی۔دکھ،شک،ترغیبات اور گناہ کی تنہائی۔کسی کشش میں گرفتار ہو کر انسان خود کو کس قدر اکیلا محسوس کرتا ہے۔''مائیکل نے کہا۔

''جنگلوں میں ایک ہزار جوگی بیٹھے بھجن کرتے تھے۔میں نے ان کی آوازیں سنیں۔''ہری شنکر نے کہا۔

''بابل اور فلسطین کے سبزہ زاروں پر میں گاتا پھر رہا تھا۔''مائیکل نے کہا۔

''میں نے تمہاری آواز بھی سنی تھی۔''طاعت نے کہا۔

''یہ سارے تصورات جمع کر کے ایک قربان گاہ کا پردہ کاڑھ دو یا کھڑکیوں کے شیشے رنگ دو۔تمہارا تخیل بازنطینی مصوروں کی طرح حد سے زیادہ بھرپور ہے۔''مادہ پرست گلشن نے کہا۔

''تاریخ کا احساس میرے سر پر تلوار کی طرح معلق ہے۔میں اپنے آپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔''مائیکل نے کہا۔

''کیا کریں۔کیا کریں۔کیا کریں۔''کورس نے کہا۔

''کتابیں وہی تھیں جو اب تک ہزاروں لوگ پڑھ چکے تھے۔نئی کتابیں چھپتی تھیں۔مضمون لکھے جاتے تھے۔نئی کہانیاں بنتی تھیں۔روز صبح کو پہاڑوں پر روشنی پھیلتی تھی۔کلیساؤں میں داؤد کے نغمے دہرائے جاتے تھے۔میرے ربائی نے کہا:

انسان کو سبت کی رات پانی نہیں پینا چاہیے اگر پیے گا تو اس کا اپنا خون اس کے سر پر ہے، لیکن انسان پیاسا ہے تو اس کا کیا علاج ہو؟ اس سے کہو، انسان سے کہو داؤد کے ساتھ سات آوازوں کو دہرائے۔ خداوند خدا کی آواز پانیوں کے اوپر ہے۔ خداوند خدا کی لرزہ خیز قہرناک آواز۔ اس آواز سے لبنان کے دیودار ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اس آواز سے ویرانے لرز اُٹھتے ہیں۔ جنگل سونے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہیکل کے پجاری کہہ اُٹھتے ہیں۔ تقدیس ہو............ تقدیس ہو...... تقدیس ہو...... مگر تم پھر بھی کہتے ہو: میں پیاسا ہوں...... میں پیاسا ہوں......'' مائیکل نے کہا۔

''بھوک سے زیادہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھر اسے بھوک ستاتی ہے۔ محبت کی۔ روٹی کی۔ سکون کی۔'' مادہ پرست گلشن نے کہا۔ ''بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں ☆ میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی۔''

کمال گاتا ہوا چڑھائی پر آ گیا۔

''لوگوں کو احساس جرم اکٹھا کرتا ہے۔ یہاں احساس معصومیت نے کہیں کا نہ رکھا۔ کاش ہم نے ایک آدھ چھوٹا موٹا گناہ کر لیا ہوتا۔ اس احساس معصومیت کی رسیوں سے ہم سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن ہم میں سے ایک نے اس رسی کو توڑا ہم سب، ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو جائیں گے۔'' ہری شنکر نے کہا۔

طلعت اب ایک دوسری چٹان پر جا بیٹھی تھی اور سب کی طرف سے پشت کیے

وادی کو دیکھ رہی تھی۔ ''ایسا کبھی نہ ہوگا۔'' اس نے مڑ کر جواب دیا۔ ''ہمیشہ ہماری کلچر، ہماری بیک گراؤنڈ، ہمارا بے حد اونچا مورل کوڈ آڑے آ جائے گا۔''

''نہیں طلعت بیگم۔'' ہری شنکر نے کہا۔ ''ہماری کلچر کی رسی تو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔ جس کے ایک سرے پر تم اور دوسرے پر میں ہوا میں معلق لٹک رہے ہیں۔''

''اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ، اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ۔'' گلشن نے کہا۔

پھر شیشے کا بڑا دروازہ کھلا۔ اس میں سے جو لوگ اندر آ رہے تھے۔ ان میں چمپا بھی تھی۔ ہلو......

اس نے کہا اور میری طرف آئی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ کون جگہ ہے؟ یہ چوزے کی سرائے ہے اور میں جہاز کے دفتر فون کر رہا ہوں۔ میں فی الحال بہت محفوظ ہوں۔ میرے چاروں اور شہر کی سنگی عمارتیں کھڑی ہیں۔ میرے پیروں کے نیچے ٹھوس زمین ہے مگر مجھے بے حد ڈر لگا۔ چمپا باجی میرے سامنے موجود ہیں۔ ان کے بال بھی وہی ہیں۔ ساری بھی اسی انداز سے پہنی ہے۔ وقت کا الاؤ جو جل رہا ہے اس میں وہ بڑی نکھری ہوئی نظر آ رہی ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی کوئی رنج کوئی جھنجھلاہٹ بلکہ یہ کہ میں جلد از جلد یہاں سے چیختا ہوا بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں کہ تم چمپا ہو۔ اگر تم دوبارہ دس پندرہ سال تک بھی مجھے نظر نہ آؤ تو مجھے ہرگز فکر نہ ہوگی۔ پندرہ سال قبل میں تم کو یہی کہا کرتا تھا۔ اب تم تب سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زیادہ سمجھ دار، سنجیدہ، بردبار۔ اللہ جانے تم کیا کیا بن چکی ہو۔ ''میں نے سنا تھا کہ آپ آج کل اپنی آواز اردو میں ڈب کر رہی ہیں کسی فلم کے لیے۔ شاید آل کہہ رہا تھا۔

''میں نے اخلاقاً گفتگو شروع کی۔

مجھے لگا جیسے وہ کوئی بڑا اہم بات بتانا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور ہلکی پھلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ''چمپا باجی سامنے کون فلم ہو رہا ہے۔'' میں نے پھر اخلاقاً گفتگو کی سعی کی۔ لوگ جو سینماؤں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے چہرے اداس تھے۔ بیزاری سارے ماحول پر چھائی تھی۔ روشنیاں غمگین تھیں۔ موسیقی رو رہی تھی۔ سڑک پر موٹروں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں پژمردگی تھی۔ وقت گھٹتا جا رہا تھا، وہ شیشے کی بڑی دیوار سے ناک چپکا کر کھڑی ہو گئی اور باہر ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ میں جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

''اب میں نے اس کو بہت پیچھے کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ میں گھر کی طرف جا رہا ہوں وہ اس بیکراں اداسی، سناٹے کے اس پر شور بھنور میں اکیلی چپ چاپ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی رہ گئی ہے۔ میں کیوں اس قدر تھک گیا ہوں۔ مجھے چپکا بیٹھ جانے دو۔'' کمال نے قریب ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

''لکڑی جل کوئلہ بھی، کوئلہ جل بھئی راکھ
میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ''

چندرا نے گایا۔

''چوروں کی طرح ہم نے بھی اپنے اپنے دیوتا جگائے۔ مگر دیکھو کیا ہوا۔ دیوتا صاف چوٹ دے گئے۔'' طاعت نے کہا۔

''کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس

دوئی نینا جن کھائیو، پیا ملن کی آس''

''سبز رنگ کا کہرہ اب سارے میں پھیل گیا ہے۔ سب اس کہرے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تاریکی کے کنارے، اجالے اور خوف کے سنگم پر پاؤں ٹکائے، سونے کے رنگ والے خدا پر جاپتی کی مانند ازسرِنو چیزوں کے نام تجویز کر رہی ہوں۔'' طاعت نے کہا۔

''دیکھو۔'' اس نے چٹان پر کھڑے ہو کر افق کی طرف اشارہ کیا۔

''مائیکل.........ادھر تمہارا یروشلم ہے۔ ہم سب کا یروشلم ہے۔''

''اور یروشلم بھی تقسیم شدہ ہے۔'' ہری شنکر نے یاد دلایا۔

''اور پہاڑیوں پر داؤد کے نغمہ نواز کراہتے پھر رہے ہیں۔ لحن ختم ہو چکے۔ صلیبوں پر یسوع کے ساتھ ہمیں لٹکایا گیا ہے۔ یسوع کے بجائے ہم سولی پر چڑھتے ہیں کیونکہ ہم سب سے بڑے چور تھے۔ ہم نے خدا کے خزانوں میں سے مسرت کی چوری کرنا چاہی تھی۔'' طاعت نے کہا۔

''دیپی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی رہ گئی ہے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ گزرتے ہوئے برس بگولوں کی طرح میرے چاروں اور منڈلا رہے ہیں۔ سڑکوں پر بارش میں رات کی روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ سوتے ہوئے مکانوں کی چمنیوں پر سے چاند لڑھکتا ہوا سمندر کی اور جا رہا ہے ندی کے کنارے، گل پوش سنہرے باغوں میں۔ ایسٹ اینگلیا کے جنگلوں میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ سنسان بندرگاہوں میں سیاہ پانیوں پر رات کے پرند چکر کاٹ رہے ہیں۔

میرے سامنے سے لوگ کے ہجوم گزرتے ہیں۔ جھیل میں ڈونگیاں تیرتی

ہیں۔ میں کنارے پر ہوں۔ مجھے اب اپنے جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ ایسا جہاز جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں، جو چپکے سے سمندر کی عمیق تاریکی میں داخل ہو جائے۔ ایسا جہاز جو صرف اس سمت جاتا ہو جہاں کوئی خوش آمدید کہنے والا نہ ہوگا۔'' کمال نے کہا۔

کہرہ اب بہت گہرا ہو چکا تھا۔

''سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھی نہ ہوئے۔''

چندرا گاتی ہوئی پہاڑی کے نیچے اتر گئی۔

''روپ اور نام روپ۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''ودیا اور اودیا۔'' طلعت نے کہا۔

''کانٹ اور ویدانت۔'' مائیکل نے کہا۔

''اب ہماری سمجھ میں آ گیا ہے۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''کیونکہ جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔ تنہا، ازلی اور ابدی جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل، اور کمال رضا۔ اس کی تنہائی امٹ ہے۔''

سرد تاریک ہواؤں میں ان کی آواز ڈوب گئی سبز کہرے نے ان کو اپنے اندر ڈھانپ لیا۔

طاعت دوسرے روز صبح منہ اندھیرے ٹیوب میں بیٹھ کر چیلسی روانہ ہوئی۔ اس وقت بہت سخت سردی پڑ رہی تھی اور دھند کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انڈر گراونڈ اسٹیشن ابھی سنسان پڑے تھے۔ وہ چیلسی پہنچ کر اس مانوس سڑک پر چلنے لگی جس پر کئی سال سے چلتی آئی تھی۔ یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اس نے سوچا کملا کے بلاک پر پہنچ کر حسب عادت فرن کے پتوں کو چھوا۔ بوڑھے پورٹر نے، جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرایا۔ برسوں سے مسٹر جنکنز اور طاعت میں نے یہ مکالمہ ہوتا آیا تھا: کیسا اچھا موسم ہے یا کیسا برا موسم ہے یا اچھی ہوا چل رہی ہے یا بہار آنے والی ہے۔ مسٹر جنکنز زندگی کے اس ڈرامے کا خاموش کورس تھا۔ مسٹر جنکنز، جس کا دایاں ہاتھ برما کے محاذ پر کٹ گیا تھا، لفٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔ طاعت اوپر پہنچی۔ گیلری کے دبیز سرخ قالینوں پر سے گزر کر اس نے کملا کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ آج گویا جو کچھ ہو رہا تھا ایک اداس سے رمز کی حیثیت رکھتا تھا۔ کملا نے دروازہ کھولا۔ اس کا سامان فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ خاموشی سے، ایک لفظ کہے بغیر دونوں پیکنگ میں جٹ گئیں۔ اتنے برسوں میں کتنی گرہستی جمع ہو گئی تھی۔ برتن، کتابیں، ہلبو سات۔ یہ بھی تم لے لو، یہ بھی تم لے لو۔ کملا میکانکی انداز سے کہتی چلی گئی۔ کتابوں کو بڑے ٹرنک میں ٹھونسا گیا۔ جوتے نکال باہر پھینکے گئے۔ تصویریں دیواروں پر سے اتریں۔ سامان کے ڈھیر پر بیٹھ کر ایک اٹیچی کیس بند کرتے کرتے کملا نے یکلخت ہوا میں ہاتھ لہرا کر Ash

Wednesday پڑھنا شروع کر دی اور پھر اسی طرح چپکی ہو کر سلیپر اور ہاؤس کوٹ سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ باہر ابھی دھندلکا موجود تھا۔ ایک آدھ روشنی کسی فلیٹ میں جھلملا جاتی تھی۔ ''یہ گوتم صاحب بھول گئے یہاں پر۔'' طلعت نے ایک کتاب اٹھا کر اسے الٹا پلٹا اور صندوق میں اوپر سے گرا دیا۔ جس طرح تالاب میں پتھر گراتے ہیں۔ اب وہ تھک گئی۔ چائے بنائی گئی۔ سویرا ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد کملا کینیڈا کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب طلعت نے کمال کا سامان پیک کرنے کی غرض سے واپس گھر کی طرف رخ کیا۔ صبح دس بجے کمال کی بوٹ ٹرین چھوٹ رہی تھی۔

۹۶

جہاز کے برآمدے میں آرکیسٹرا کا رخصتی نغمہ بلند ہوا۔ کمال کا دفعتاً دل بھر آیا، وہ ریلنگ پر جھکا نیچے دیکھتا رہا۔ لندن میں اسے بوٹ ٹرین پر پہنچانے کے لیے بیسیوں لوگ آئے تھے۔ آنسو پونچھے گئے تھے۔ رومال ہلائے گئے تھے۔ اوجیت اور ترونا نے تو چول چول بھی شروع کر دیا تھا۔ قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا.......... گویا وہ سپاہی تھا اور ایک ایسی جنگ میں کودنے جا رہا تھا جس کا مقصد کسی کو معلوم نہ تھا۔

مگر پورٹ سمتھ میں وہ اکیلا تھا۔ اجنبی بندرگاہ، اجنبی مسافر، دنیا کی

اجنبیت ابھی سے اس کے لیے شروع ہوگئی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ برابر میں دو بوڑھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے شفقت سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کمال نے جذبہ تشکر میں ڈوب کر اسے دیکھا۔ بوڑھا سونی سونی آنکھوں سے بندرگاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا تو وہ اپنے کیبن میں آ گیا اور سارا دن اس نے اپنے کیبن میں گزار دیا۔ اپنے ہم سفر سے بھی بات نہ کی جو کوئی اطالوی معمار تھا۔

دوسرے روز اس نے سارے جہاز کا جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فارن سروس کے چند اعلیٰ حکام اور ان کے خاندان فوجی افسر طالب علم جو سرکاری وظیفوں پر سفر کر رہے تھے۔ چند پاکستانی، ہندوستانی اور لنکا کی لڑکیاں جو ڈاکٹری اور ایجوکیشن کی ڈگریاں لے کر لوٹ رہی تھیں۔ انگریز اور امریکن جو دولت مشترکہ اور امریکی امداد کے پروگراموں کے تحت برصغیر کو ترقی دینے کی غرض سے جا رہے تھے۔ ٹورسٹ کلاس کا مجمع زیادہ دلچسپ تھا۔ طلباء جو اپنے خرچ پر پڑھنے آئے تھے۔ ان پڑھ سکھ اور کاروباری، مشنری، کیتھولک راہبات، ایک فرانسیسی بھکشو۔ برلن کی مسجد کے قیادیانی مبلغ اور ان کا خاندان۔ پنڈت جی، جن کو کمال لندن میں بھی جانتا تھا جو چھٹی پر گھر جا رہے تھے، اور منگل سکول میں پڑھاتے تھے۔ شدھ ہندی بولتے تھے۔ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ گھنگھریالے لمبے لمبے بال، لڑکیوں کی ایسی خوبصورت شکل، دبلے پتلے نازک سے، مہاتما گاندی کے چیلے، بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق۔ چلے کے جاڑوں میں بھی لندن میں دھوتی اور چپل پہنتے۔ برج کے علاقے کے لوک گیتوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ "ری اماں

مورے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا'' خوب لہک لہک کر گاتے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کمال سے فرداً فرداً سارے دوستوں کی خیریت پوچھی اور کماری نرملا کے دیہانت پر اظہار تعزیت کیا۔ مائیکل بھی، جو جبرالٹر تک جا رہا تھا، ٹورسٹ کلاس میں تھا۔

شروع شروع میں فرسٹ کلاس کی لڑکیوں نے کمال کے بے حد دلچسپی سے دیکھا مگر جب اس نے کوئی پیش قدمی نہ کی تو وہ اکتا کر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایک روز کمال برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ریلنگ میں پیر اٹکائے واقعتاً سمندر کی لہریں گن رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی:

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ضرور اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہی بوڑھا کھڑا مسکرا رہا تھا جس نے پہلے روز کمال کو خاموشی سے دلاسا دیا تھا، وہ اس اجنبی بوڑھے کی اس چھوٹی سی مہربانی کا بے حد ممنون تھا، وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور اس کے لیے دوسری آرام کرسی کھینچ لی۔''

''فریڈ، پال، تم لوگ بھی ادھر آ جاؤ۔''

''ٹھہرو، ہم بیئر لے آئیں۔''

چند لمحوں بعد دو اور یورپین آ کر قریب بیٹھ گئے۔

''میرا نام ڈاکٹر ہینس کریمر ہے۔ میں آسٹرین ہوں۔ میں اور میرے دونوں دوست، جو تاریخ کے پروفیسر ہیں، انڈیا جا رہے ہیں۔ تم انڈین ہو؟''

''ہاں''

''اسی لیے میں نے پہلے سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کیونکہ کل میں نے اس سامنے والی لڑکی کو انڈین کہہ دیا تو وہ بھڑ گئی، وہ پاکستانی ہے۔'' تینوں کھوکھلی سی ہنسی ہنسے۔

کمال خاموش رہا۔

''تم انڈیا میں رہتے ہو۔''

''جی''

''میں بوڈا جینٹی کے لیے جا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر کریمر نے کہا۔

''اوہ؟ اوہ! بدھ جینتی!!''

''بوڈا تاریخ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔'' پال نے اظہار خیال کیا۔ ''تم ہندو ہو نا؟''

''جی نہیں۔''

''اوہ، معاف کرنا، مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ تو کیا تم محمڈن ہو؟''

''جی۔''

''تو پھر انڈیا میں کیسے رہتے ہو؟''

''یہی اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' کمال نے جواب دیا۔

''ہائی ڈوک.......... ایک امریکن نے بشاشت سے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''ہائی! اس نے بے تکلفی سے کمال کو مخاطب کیا۔

''ہائی!!'' کمال کہتے ہیں۔

''میرا نام ٹامس جیرلڈ ٹیلکنز ہے۔ مگر مجھے ٹام پکارو اور تم؟''

''مجھے کمال کہتے ہیں۔''

میں تم کو کم کہوں گا.........کپلنگ کا کم!!؟

''لو بیئر پیو اولڈ نام۔'' کمال نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

''باقی جرنلسٹ لوگ کہاں ہیں؟'' فریڈ نے پوچھا۔

وہ لوگ بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک فرانسیسی تھا، مارلیس، جو ہند چینی جا رہا تھا۔ وہ دوسرا ایک مشہور برطانوی شاعر تھا جو بی بی سی کے نمائندے کی حیثیت سے بدھ کی پچیس صد سالہ برسی میں شرکت کے لیے عازم ہند تھا۔ چند دولت مند امریکن سیاح خواتین تھیں جو امریکہ سے اسی یاترا پر نکلی تھیں۔ ایک فرانسیسی بھکشو نارنجی چادر میں ملبوس سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا رہتا، وہ بھی گیا اور بنارس جا رہا تھا، وہ ٹورسٹ مسافر تھا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ تم دوڑ دوڑ کر نیچے بہت جاتے ہو۔'' کھانے کے وقت ٹام نے مسکرا کر دوستانہ لہجے میں کمال سے کہا۔ ''کیا وہاں تمہاری گرل فرینڈ سفر کر رہی ہے؟''

''نہیں میرا پرانا دوست ہے، مائیکل گولڈ اسٹائن کیمبرج میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس سے آپ ضرور ملئے گا۔''

''مائیکل گولڈ اسٹائین، یہودی ہے؟'' پال نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اوہ۔''

خاموشی چھا گئی۔

''اور سونے پر سہاگہ یہ۔'' کمال نے گلا صاف کر کے کہا، ''کہ اسرائیل جا رہا ہے۔''

شام کو کمال نے مائیکل کو ان سب لوگوں سے ملوایا۔ پنڈت جی بھی اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ اب ان سب کی اٹھک بیٹھک ساتھ رہتی۔ ایک بیگم صاحبہ نے، جو نیو پارک سے آ رہی تھیں، کئی مرتبہ کمال کو اپنی محفلوں میں بلایا۔ ان کی لڑکی بھی ہمراہ تھی اور یونیورسٹی آف سن سناٹی سے سوشل سائنس میں ایم۔ اے کر کے آ رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر کم عقل تھی۔ بیگم صاحبہ کے گروہ میں اعلیٰ افسران اور دوسرے بڑے لوگ شریک رہتے۔ دو مسلمان لڑکیاں اور تھیں جو ہمیشہ تنگ کرتی رہتیں۔ ایک مرہٹی لڑکی گاتی بہت عمدہ تھی۔ یورپین اور امریکن لڑکیاں ہر وقت آفتابی غسل میں مصروف رہتیں۔ کمال کی شکل وصورت اور اس کی کم آمیزی سب کو بہت بھا گئی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہر وقت بلڑ مچانے والا لڑکا ہے جو ایسا فقیر منش بنا ہوا ہے۔

دن بھر اور رات گئے تک وہ سب ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھے کتابوں پر تبصرہ کرتے۔ فلسفہ تاریخ کھنگالا جاتا۔ پنڈت جی کیرتن کرتے۔ لیلا بھاسکر گاتی۔ رات کو رقص ہوتا۔ سینما دیکھا جاتا۔ ہر طرف زور شور میں فلرٹیشن چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصے تیار ہو گئے۔ شادی شدہ بیگمات مسلمان لڑکیوں کی ایک ایک بات نظر میں رکھتیں۔ جہاز پر ایک شادی بھی تقریباً طے ہو گئی۔ ایک پٹھان انجینئر صاحب تھے ایک کراچی کی ماہر تعلیم صاحبزادی تھیں۔ دونوں گھنٹوں ڈیک پر

کھڑے ہوکر سمندر کے منظر کا مطالعہ کریں تو لامحالہ بہن رشیدہ سلطانہ کے کانوں میں شادی کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔ ایک شادی شدہ بزرگ، جو تنہا سفر کر رہے تھے، بہن ایڈوینا رتن وردھن پر بہت مہربان ہو گئے جو کولمبو جا رہی تھیں۔ اس کا بڑا قصہ رہا۔ کمال یہ سب دیکھا کرتا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی محدود دنیا میں انسانوں کی ساری اچھائیاں، ساری کمزوریاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ کاش میں بھی ان عام نارمل انسانوں میں شامل ہوتا۔ وہ بعض مرتبہ جھنجلا کر سوچتا اور پھر ڈاکٹر کریمر کے پاس جا بیٹھتا۔ اپنے ساتھی بچھڑ گئے تھے مگر یہ لوگ کتنے اچھے تھے۔ سفر بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

کل صبح جہاز جبرالٹر پہنچنے والا تھا۔ کمال مختلف گروہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سن کر، تاش کھیل کر، سوئمنگ کر کے، لائبریری میں رسالے پڑھ کر اب بری طرح اکتا چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکی سے فلموں پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد وہ پھر سارے جہاز کا چکر لگاتا پھرا اور آخر سب سے اوپر کے ڈیک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

عقب سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، دور کشتیوں کے پاس ڈاکٹر ہینس کریمر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مائیکل ریلنگ کے سہارے کھڑا ان کو مخاطب کر رہا تھا۔ ایک امریکن پروفیسر لڑکی فرش پر دری بچھائے کہنیوں کے بل لیٹی تھی۔ کسی نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔

”لکھو۔“ مائیکل کی آواز آئی۔

”کیا لکھوں۔“ کمال نے کہا۔

''جو میں کہتا ہوں اس کی غلط رپورٹ کرو کیونکہ خداوند خدا کی وعدہ کی ہوئی روٹی تم اسی طرح کماتے ہو۔'' مائیکل گرجا۔

''اوہ۔'' کمال نے سوچا، مائیکل اور ٹام میں پھر جھگڑا شروع ہوا۔

''مصیبت یہ ہے مایک'' ٹام نے کہا'' کہ تم جذباتی ہو۔ آخر ہونا اصل نسل ایشیائی!''

''میں جذبات کو باعث شرم یا گالی نہیں سمجھتا۔'' مائیکل نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

''آہاہا۔'' پنڈت جی نے زلفیں جھٹکا کر کہا۔'' آیئے شری رجا جی۔ اپنا مائیکل ایک اور بھاشن دے رہا ہے۔''

''آنا، پنڈت جی! اس کی کٹوتا کاوش ناشک میرے پاس بھی نہیں۔''

کمال نے ہنس کر جواب دیا۔

برطانوی شاعر غور سے دونوں کو دیکھتا رہا۔

''مصیبت یہ ہے،'' ٹام نے کمال سے کہا، ''جو غیر ملکی تمہارے ملک کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تم اسے ای۔ ایم۔ فارسٹر کے پیمانے سے ناپتے ہو جو بے چارہ خود آئیڈیلسٹ تھا۔ بونوں کی دنیا میں رہنے والا دیو۔''

''فارسٹر نے اپنا ناول ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔'' برطانوی شاعر نے کہا۔

''آج اگر فارسٹر دوسرا ''پیسج ٹو انڈیا'' لکھے تو اسے اپنا یہ کردار بدلنا پڑے گا۔ اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔ اب ہر مسلمان لامحالہ پاکستانی ہے۔

اب ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔''

''ہاں۔'' کمال نے جواب دیا۔

''کمال تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں؟'' شاعر نے پوچھا۔

''ہاں۔مگر مظلوم کے روپ میں نظر نہیں آنا چاہتا۔ ہندوستان کی ازلی اور ابدی، دکھ سہنے والی روح۔! یہ تحمل، یہ گریس، یہ دکھ اٹھانے اور برداشت کرنے کی عادت، تم موسیو پال بلال کی طرح دھوتی پہن کر چوکے میں بیٹھ جاؤ تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔''

''سینٹ آگستائن تو بنارس میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔'' مارلیس نے پوچھا۔

''کیتھولک نظریہ حیات ایک مخصوص Cult تھا۔ ساری زندگی کو اس نے اپنے اندر نہیں سمیٹا ورنہ تم آج کیتھولک ہونے کے باوجود انڈو چائنا لڑنے کے لیے نہ جا رہے ہوتے۔'' کمال نے چڑ کر جواب دیا۔

''آبزرور اور combatant میں کیا فرق ہے؟'' مارلیس نے پوچھا۔

''یہ تم اپنے آپ سے پوچھو۔ دوسرے جنگ کریں تم اوبزرو کرتے رہو، اس سے کیا احساس جرم کم ہو جاتا ہے؟'' کمال نے کہا۔

''تم تو مجھے کوئیکرز کی طرح پروفیشنل امن پرست معلوم ہوتے ہو۔'' ٹام نے کہا۔

''بھور بھئے گین کے پاچھے مدھوبن موہی پٹھایو۔'' ڈیک کے سرے پر لیلا بھاسکر نے گانا شروع کیا۔ کمال ٹام کی بات کو نظر انداز کر کے گانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پنڈت جی نے تال دینا شروع کی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں لیلا بھاسکر کی

طرف چلے گئے۔

ہر کلچر کی ایک خفیہ زبان ہے جسے صرف وہی کلچر سمجھ سکتی ہے۔ برطانوی شاعر نے کہا۔

''مزید! سپنگار!'' ٹام نے کہا۔ ''پنڈٹ اور کم کی کلچر ایک کہاں ہے؟''

''تم تو خیر مائیکل کی بھی خفیہ زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔'' برطانوی شاعر نے مسکرا کر کہا۔ ''اسرار تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں ٹامس بے ٹیکنز !!''

مائیکل ڈرائی مارٹینی کے اثر میں مبتلا ایک کونے میں چپکا بیٹھا تھا۔ اپنا نام سن کر وہ چونکا۔ میکانکی انداز سے اس نے پلٹ کر وہیں سے بات شروع کر دی جہاں سے اس کا سلسلہ تقریر منقطع ہوا تھا۔

''لکھو.......... مائیکل پھر گرجا'' دنیا کی اقوام کی تاریخ فتوحات اور سلطنتوں کے قیام اور ملکوں کی آباد کاری سے عبارت ہے۔ میرے ہاں تاریخ کا تسلسل شدید ترین مظالم اور تکلیفوں کی داستان کی طویل کڑی ہے۔ تیرھویں صدی میں مجھے انگلستان سے نکالا گیا۔ چودھویں میں فرانس سے پندرھویں میں اسپین کا قہر شروع ہوا۔ سارا زمانہ میں نے یورپ کے شہروں میں اچھوتوں کی طرح زندہ رہ کر گزارا مگر میں خانہ بدوش، دنیا کی لعنت کا شکار، مشرق اور مغرب دونوں جگہ میں نے آنسوؤں کے چراغ جلا کر علم کی روشنی پھیلائی۔ میں نے بوعلی سینا اور ابن خلدون اور امام غزالی اور الفارابی اور خوارزمی کے نظریوں کو یورپ میں رائج کیا۔ میں نے......

''ٹھہرو.....تم بھولتے ہو کہ.........ٹام نے بخشنا شروع کیا۔''

لیا! بھا سکر گاتی رہی۔ کمال نچلے ڈیک پر اتر آیا جہاں برآمدے میں موسیقی بج رہی تھی۔ بیگمات خوبصورت ساریاں اور شلواریں پہنے ایک حلقے میں بیٹھی تھیں ایک میز پر برج ہو رہا تھا۔

دوسری طرف سینما دکھایا جا رہا تھا۔ کمال ایک کھمبے سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے اسکرین کے پیچھے عمیق بیکراں اندھیرا تھا۔ اسکرین پر ایک غنڈہ صفت لوفروں کی سی شکل والا مشرقی برلین کا کمیونسٹ جاسوس امریکن ہیروئن کو اڑا لے جانے کی فکر میں دبے پاؤں ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے، پھر ہیروئن موزہ اتار کر چھت پر چڑھ گئی۔ دوسری طرف سے ہیرو، جو شاید رابرٹ ٹیلر تھا، کود کر سامنے آیا اور کمیونسٹ ولین کو چاروں شانے چت گرا کر ہیروئن کو بچانے کے لیے لپکا۔

''آیئے، آیئے، بیٹھیے کمال صاحب۔'' مس خان نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں، اب میں چل دوں۔ میں یہ فلم پہلے دیکھ چکا ہوں دراصل۔''

لڑکیوں کو کھس پس کرتا چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں کراچی اور کلکتے کے چند ملک التجار پلیس پگال کا تذکرہ کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی بیویاں اس وقت باہر سینما دیکھنے میں محو تھیں۔ ان کے قریب سے گزرتا ہوا وہ ایک دریچے میں جا کھڑا ہوا۔

کیوں جی، اب کے سے مرسی ڈیز خرید کر خشکی کے راستے واپس آیا جائے کراچی۔ کیا خیال ہے؟ وہ فورڈ کونسل تو میں نے اپنے بھائی کو دے دی۔ دریچے کے نیچے برآمدے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ''اچھا جی میں اپریل میں یو۔ این۔

سیشن کے لیے نیویارک جارہی ہوں۔ مجھے اپنی بھابھی کا پتا ضرور دے دیجئے گا۔ شیوتو اب میں ۵۶ء کا موڈل ہی لاؤں گی۔''

''کیا کیا جائے، پاؤنڈ نہیں ملتے۔''

''میری بڑی لڑکی نے لاہور سے ایم۔ اے کرلیا ہے کہیں اس کی شادی کرائیے۔''

''کیسا لڑکا چاہیے۔''

''کم از کم سی ایس پی تو ہو۔''

''کہیں کام کررہی ہے بچی۔''

''جی ہاں۔کنڈرگارٹن اسکول میں پڑھاتی ہے۔ویسے اس کو تو امریکہ کا اسکالر شپ بھی مل گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ شادی..........''

''ہاں جی۔یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔یہ بیگ روم سے لیا؟''

''جی.........آپ.........اب کے امریکہ سے بہت جغادری فریجڈیر لے آئیں۔''

''جی کیا بتاؤں.........ضروریات زندگی بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں۔''

''یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔''

کمال دریچے سے ہٹ آیا۔سیڑھیاں اتر کر ٹورسٹ کلاس کا چکر لگانے میں مصروف ہوگیا۔ ڈیک پر سردار صاحبان دری بچھائے ہیر گانے میں محو تھے۔ دوسری طرف رقص ہو رہا تھا۔ڈرائنگ روم میں تاش کھیلے جارہے تھے۔کمال مائیکل کے کیبن کے سامنے سے گزرا اور اسے یکلخت خیال آیا کہ کل صبح مائیکل

جبرالٹر پر اتر جائے گا اور اس کے عین بعد ممکن ہے کہ ساری عمر، مرتے دم تک اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔کیسی عجیب بات تھی ۔سردار صاحبان کے گانے کی آواز مدھم پڑگئی ۔وہ مائیکل کے کیبن کے باہر ریلنگ پر جھکا کھڑا رہا۔سامنے پورنماشی کا چاند افق پرطلوع ہورہا تھا۔سمندر بے حد پرسکون تھے۔جہاز لہروں کو چیرتا ہوا وقار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ڈیک کے اس حصے میں مکمل تنہائی تھی۔صرف فرانسیسی بھکشو ایک سرے پر کمال کی طرف سے پشت کیے بیٹھا تھا۔

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔سناٹا اتنے زور سے گرجا سا محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔اسے ٹام اور برطانوی شاعر کی باتیں یاد آئیں۔اس کا جی بیٹھنے سا لگا، وہ ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں اسٹیٹ لیس ہوں، میں اسٹیٹ لیس ہوں۔'' اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے کہا۔سمندر کی لہروں کے سفید جھاگ چاندنی میں چمکتے رہے۔دور دور دنیا کے چاروں کھونٹ چاندنی کی اس وسیع نیلگوں چادر پر مسافروں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے تھے۔کانسٹی ٹیوشن اور کوئین الزبتھ۔امراء کے یاٹ۔ تجارتی اور جنگی بیڑے۔ان کشتیوں سے موسیقی کے سر بلند ہو رہے تھے۔دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔یورپ اور انگلستان کے عالم۔اٹلی کے راہب۔امریکن سیاح میکسیکو کے نقاش۔ہندوستان کے رقاص۔دنیا میں فی الحال امن قائم تھا۔دلی میں پنڈت نہرو حکومت کرتے تھے۔زندگی میں بظاہر بڑی گہما گہمی تھی۔

''خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے بھائی۔مجھے شانتی

چاہیے۔'' کمال نے آہستہ سے کہا۔

فرانسیسی بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت ایسی ہی پورنماشی کی رات، ڈھائی ہزار سال ادھر، اس سمندر کے اس پار ایک ملک میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ چودھویں کا چاند سمندر کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

''مجھے میرے خیال سے نجات دلاؤ۔'' کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ''خیال۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے۔ اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔'' اس نے فرانسیسی میں کہا۔

''مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''شونیا.......... سناٹا.......... شونیتا.......... سونا جو ذات مطلق ہے، جو صفر کا تصور ہے۔''

''مجھے اس تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔'' اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس نے مہایان مذہب کے اس فرانسیسی بھکشو کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا جو سوربون یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔

''میں اسٹیٹ لیس ہوں اور یہ تمہاری سکھ وتی نہیں ہے۔'' اس نے دل میں کہا

اور بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے ڈیک پر واپس آ گیا۔ رات گزر گئی۔
جہاز اپنا سفر طے کرتا رہا۔ منزلیں گویا قریب تر آتی گئیں۔

۹۷

ہندوستان کا ساحل! بمبئی!! گھر!!! گھر؟؟

کمال لکھنؤ پہنچا۔ گلفشاں کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ اسے دنیا بدلی ہوئی نظر آئی۔ باغ کے درخت جل چکے تھے۔ پودے سوکھ گئے تھے۔ گھاس کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ موٹر خانہ اور اصطبل گودام بنے ہوئے تھے۔ (جتنے عزیز پاکستان ہجرت کر کے جاتے ہیں اپنا اپنا سامان لا کر یہاں ڈمپ کر دیتے ہیں، خالد بیگم نے کہا) شاگرد پیشہ سنسان پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے گنگا دین کو ڈھونڈا۔ قدیر اور قمرن کی تلاش کی۔ حسینی کی بی بی اور رام اوتار اور چھٹکی کو آوازیں دی۔

آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گیا اور چپکے چپکے رونے لگا۔ دنیا وہی تھی۔ گلفشاں، لکھنؤ، عزیز رشتے دار۔ سب کچھ وہی تھا۔ کیا صرف وہ خود بدل گیا تھا؟ کیا وہ اپنے باپ کی تنگ دستی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب تھا؟ وہ جس کی ساری عمر زمینداروں کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔ زمینداری کے خاتمے کی صوبہ سے اب اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلفشاں والوں کے یہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی۔ (بہت انقلاب انقلاب کرتے تھے۔ لو بوڑھے باپ کو

اکے پر بیٹھا دیکھ کر اب تو خوش ہولو، نواب صاحب بہادر نے کہا) بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہوگئیں تم ہم کس گنتی میں ہیں، شام کو اپی نے اس سے کہا جو اس سے ملنے کی خاطر جھانسی سے آئی ہوئی تھیں۔ نانپارہ کی کراکری بک رہی ہے۔ راجہ سورج سنگھ کے پاس ایک دھیلہ نہیں رہا۔ امی نے اپنے آدھے زیور بیچ ڈالے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' کمال نے اپنے بابا سے پوچھا۔ ''کربلا ہجرت کیجئے گا پاکستان؟''

''یہیں رہوں گا۔'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔''

کمال ہکا بکا رہ گیا۔ ''مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔''

''ہاں ہاں تو پھر؟'' پاکستان بن گیا، ٹھیک ہوا۔ اب اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں جہاں سے۔

''آپ پاکستان کو اپنا جائز وطن سمجھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوچتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کہاں دربدر مارے پھریں گے یا اس لئے کہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور اس سے محبت کی بناء پر اسے نہیں چھوڑ سکتے۔''

کمال آج قطعی طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ اور اس کے باپ کی نسل کے لوگوں کی نفسیات آخر کیا تھی۔ ان کے آئیڈیلز، ان کی منطق، ان کی بہادری یا بزدلی۔

''اب تم سے جرح کون کرے۔ تمہاری کھوپڑی ہمیشہ کی الٹی ہے۔'' نواب

صاحب نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ان کو آج عدالت سے جا کر معاوضے کی قسط کے دو سو روپے لانے تھے جن سے مہینے کا خرچ چلتا تھا۔

"اب میں حامد بھیا کی دلہن کے در پر تو جا کر پڑنے سے رہی کراچی میں۔ یہاں کم از کم اپنا گھر تو نہیں چھنا ہے۔ اگر چلے گئے تو یہ بھی گیا اور معاوضہ بھی ختم، وہاں کون کلیم ولیم کرتا پھرے گا۔ ویسے میرا دل نہیں لگتا اب یہاں۔" امی بیگم نے کہا۔

"مگر یہ تو آپ کا گھر ہے، آپ کا شہر، آپ کا وطن، جنم جنم کا دیس۔"

"مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ سارا جہاں وطن ہے۔" چھوٹے پھوپھا نے کہا جو حال ہی میں ہجرت کر کے کراچی گئے تھے اور ان دنوں سامان کا تیا پانچہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

کمال نے مزید تبادلہ خیالات اس موضوع پر لاحاصل سمجھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

چند روز بعد اس نے کمر کس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔ اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ ٹرنٹی کالج، کیمبرج۔ امپریل کالج آف سائنس، لندن اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔ برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔ یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشاں تھا وہ ایک معمولی ایم۔ ایس سی کو دے دی گئی چونکہ وہ ہندو تھا۔

چھ مہینے گزر گئے، وہ دلی کے چکر لگا لگا کر دیوانہ ہو گیا۔

''میاں کسی سے سفارش کروالو۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤں گا۔کیا مجھے اپنی اہلیت پر بھروسہ نہیں جو سفارشیں کرواتا پھروں۔''

''یہی تو تمہارے دماغ میں خناس ہے۔''

اب وہ سارا سارا دن گلفشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طاعت کو خط لکھتا: انڈیا ہرگز مت آنا۔ جہاں تک ہو سکے وہیں رہے جاؤ۔ یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہو گیا جو میرا ہو رہا ہے۔

تم کو کیا ہو گیا ہے۔طاعت جواب دیتی۔''اتنے ڈی مورلائزڈ کیوں ہو گئے۔ جدوجہد کی ہمت ہار بیٹھے۔یہی تو وقت ہے آزمائش کا۔ڈٹے رہو،مزدوری کرو، ہل چلاؤ۔آخر انقلاب کا سامان کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔مگر کیا تم عیش کے خواب دیکھ رہے ہو؟''

کیا لڑکیوں میں ہمت زیادہ ہوتی ہے؟ وہ سوچتا یا وہ آئیڈیلسٹ پرلے درجے کی ہوتی ہیں۔بہرحال طاعت کے خطوط سے اس کو بڑا سہارا مل جاتا۔

گوتم نے اسے متواتر نیویارک سے خط لکھے۔اس نے کسی کا جواب نہ دیا،وہ لکھتا کیا آخر؟ ہری شنکر امریکہ سے لوٹ چکا تھا۔اور بنگلور میں تعینات تھا۔کمال نے اسے بھی کوئی خط نہ لکھا۔

بھیا صاحب نے کراچی سے ڈاک بٹھا دی: فوراً یہاں آ جاؤ۔ایک سے ایک بڑھیا عہدے یہاں موجود ہیں۔بس تمہارے آنے کی کسر ہے۔ضد چھوڑ دو۔وہ دوبارہ تبدیل ہو کر برازیل کے سفارت خانے جانے والے تھے اور برابر لکھا

کرتے: آجاؤ............آجاؤ............آجاؤ............

نوبت یہ آئی کہ اب کمال نے ان کے خط کھولنے بھی چھوڑ دیے۔ چند روز بعد اسے بارہ بنکی کے کالج میں لیکچررشپ مل گئی مگر چونکہ بھیا صاحب پاکستانی تھے اور ''گلفشاں'' اور موروثی جائیداد میں ان کا بھی حصہ تھا لہذا کسٹوڈین کا قبضہ شروع ہوگیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کسٹوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اب دن بھر کمال اس چکر میں مارا مارا پھرتا۔ اس کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی۔ وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اودھم مچانا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

''بورژوا انقلابی تھے حضرت۔ جب اصلیت کا سامنا کرنا پڑا تو بیٹا چیں بول گئے۔'' کافی ہاؤس میں کامریڈز نے کہا۔

حسینی اور ان کی بی بی بھیا صاحب کی دلہن کے ساتھ کراچی جا چکے تھے۔ قدیر اور قمرن مدتیں گزریں، موٹر بکنے کے بعد، مرزا پور واپس چل گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول دلی میں لاج کے یہاں جمنا روڈ پر ٹھہرا تھا اور ایک درخواست لکھ کر میڈنز ہوٹل کے ڈاک خانے میں پوسٹ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ٹامس ایکلنز مل گیا جو جہاز پر اس کا ہم سفر رہ چکا تھا۔

''ہلو۔ تم، یہاں کہاں۔'' کمال نے پوچھا۔

''میں سارے ملک کا چکر لگاتا پھر رہا ہوں۔ جنوب، بنگال اور آسام اور اڑیسہ۔ اب راجستھان کا قصد ہے۔''

''تم نے دلی کی سیر کر لی؟''

''ابھی نہیں۔''

''تم نے ہمارا راشٹر پتی بھون دیکھا۔'' کمال نے فخر سے کہا۔ ''اور براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور نئی دلی کی عمارات جو نئے ہندوستان کی سمبل ہیں اور پونا انسٹیٹیوٹ اور راج گھاٹ اور............ اور............ '' وہ دفعتاً پرانا کمال بن گیا۔ فکر معاش سے آزاد۔ ہندوستان کا جوشیلا فرزند۔ وہ دلی کی ایک ایک چیز ٹام کو دکھاتا پھرا۔ شام کو اس نے سپر دہال میں کونسرٹ سنانے کا پروگرام بنایا۔

''آج کل تم کیا کر رہے ہو؟'' الپس میں بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے ٹام نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ نوکری ڈھونڈھ رہا ہوں۔'' اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

''بے روزگاری بڑا زبردست پرابلم ہے۔'' ٹام نے کہا۔

''سب کے لیے ہے۔ اس میں میری کیا تخصیص ہے۔ جب خوشحالی آئے گی تو سارے ملک کے لئے آئے گی۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتی پھرے گی کہ یہ ہندو کا دوار ہے یہ مسلمان کا۔ ہم سب اکٹھے ڈوبیں گے اکٹھے ابھریں گے۔''

''لیکن تم نواب زادے ہو۔ تم مزدوری نہیں کرو گے۔'' گلشن نے کہا جسے انہوں نے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے ساتھ لے لیا تھا۔ تم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کر سکتے۔

''بالکل غلط ہے۔''

''اچھا تو آؤ میرے ساتھ چلاؤ ٹریکٹر۔''

''اگر میں نے ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ لی ہوتی تو ضرور چلاتا مگر افسوس کہ میں آٹھ سال نیوکلر فزکس میں برباد کر کے آیا ہوں۔''

''سنا ہے پاکستان میں بڑا قحط الرجال ہے، وہاں جاؤ۔ یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔'' گلن نے رائے دی۔

''تم بھی یہی کہتے ہو؟''

''بالکل''

رات کی ٹرین سے وہ لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اسے ہمراز بھائی ملے، وہ بھی لندن سے کراچی آ چکے تھے اور اب اپنی والدہ سے ملنے فیض آباد جا رہے تھے۔

کہو کمال میاں کیا حال ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

بہت اچھا حال ہے ہمراز بھائی۔

اچھا تو نہیں دکھتا مجھے۔ کیا قصہ ہے۔ ایں؟

''کچھ بھی تو نہیں ہمراز بھائی۔'' اس نے جلدی سے ان کو آداب کیا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب کمال نے دہلی جا کر ویزا کی درخواست دی۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں، وہ دنیا کی نظروں سے بچتا پھرا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی گلفشاں میں صرف سائے ڈولتے نظر آتے۔ دروازے بند ہوتے۔ ہوا سے خالی کمروں کے پردے پھڑپھڑاتے۔ اندر کی خواب گاہ سے بوڑھے نواب صاحب کے کھانسنے کی آواز آتی۔ امی بیگم پچھلے دروازے میں تخت پر بیٹھ وظیفے پر وظیفے کئے جاتیں۔ ہزاروں منتیں انہوں نے مان ڈالیں۔ جناب عباس کی درگاہ پر نذرانے چڑھائے۔ سبطین آباد کے امام

باڑ میں جا کر جمعرات کی جمعرات جناب علی اکبر کے نام کی مجلسیں کروائیں کہ یا مولا کمن بھیا کام پر لگ جائیں، یا مولا کمن بھیا کی مدد کر۔ (بارہ بنکی کی لیکچرر شپ ختم ہو چکی تھی)۔ وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ کہتی ہے۔ گھاس کھودو، ہل چلاؤ۔ لعنت ہو تم پر۔ موقع پرست، بے ایمان، ڈھلمل یقین کہیں کے۔ اب جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا آسرا رہ گیا تھا مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترک وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب ایک روز عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ گلفشاں کمال کے بڑے ابا یعنی بڑے نواب صاحب مرحوم کے نام سے رجسٹرڈ تھی۔ عامر رضا ان کا اکلوتا وارث پاکستانی تھا۔ گلفشاں متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز صبح جب کمال کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو لکھنؤ میں پایا۔ تیسرے دن پولیس کے افسر کوٹھی میں تالے ڈالنے کے لیے آ گئے۔ چوتھے روز کمال رضا نے ویزا بنوایا اور اپنے بوڑھے والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن ٹرین دلی پہنچی۔ چھٹے دن ٹرین نے بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز کمال رضا کراچی میں تھا۔

ساتویں روز یوم سبت تھا اور انسان اپنا خون پی رہا تھا

''کراچی۔ مملکت خداداد پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت۔ جہاں کے سلمز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک ''جھگیاں'' جو قائد اعظم کے آس پاس پھیلی ہیں۔ اس شہر میں سفید فام غیر ملکیوں بالخصوص امریکنوں کی بہت بڑی نو آبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوبصورت کوٹھیاں بنی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج۔ ان کے نئے اصول۔ کراچی بے حد موڈرن شہر ہے یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگا لو، کل جانے گنگا خشک ہو جائے یا اپنا رخ بدل لے۔ تیسرا عنصر شدید ترین فرسٹریشن کا احساس ہے۔ بلیک مارکیٹیے کو فرسٹریشن ہے کہ مزید بلیک مارکیٹ کیوں نہیں کر سکتا۔ بائیں بازو کا انٹلکچول روتا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی امید نہیں۔ جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والے کی جان کو ہزاروں فکریں کھا رہی ہیں۔ سفارشوں کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی

ہے۔ اوپر سے بنگالی اور پنجابی مہاجر اور مقامی آبادی کی کش مکش اعصاب پر سوار ہے۔ یہ کش مکش اتنی ہی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آخر امید اب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔''

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی میں اس کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے۔

تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارے کلچر اور تمہارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیوں سوار ہو؟ چنانچہ یہ قوم ''مہاجر'' بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی۔ دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ لہٰذا ہر مہاجر نے ادبدا کر کراچی کا رخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ٹرانس پلانٹ کر لیا۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی ''کولونیاں'' قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں۔ ادھر رسپوریوں کا جتھا ہے، وہ حیدر آباد دکن کے جانبازوں کا محلّہ ہے۔ اس طرف گڑھ والے، لکھنؤ والے، دلی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں۔ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ، الٰہی بخش کالونی، جہانگیر روڈ، مارٹن روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص، ٹھوس، مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دنیا ہے اور مہاجرین

کی سماجی زندگی کی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی لڑکیاں برقعے پہن کر بسوں میں بیٹھ کر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں، بندر روڈ پر خریداری کرتی ہیں، ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں حصہ لیتی ہیں، ویمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجام اور ڈان پڑھتے ہیں کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ای مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں جس کو اب تک یہ ''گھر'' کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مرادآباد ہے، ملک پاکستان ہے۔

انسانیت کا وہ حصہ، جو برصغیر ہندو پاکستان کی مسلمان قوم کہلاتا ہے، اس کی نفسیات سمجھنا کوئی آسان بات نہیں!

دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے۔ اور محتاج تعارف نہیں۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلوی ہے کہ اب ''قصہ سوتے جاگتے کا'' اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھو...... یعنی کل جو صاحب بالکل گمنام اور ہما شما قسم کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑ پتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فراٹے سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحدہ اور دوسرے بڑے بڑے عالمگیر اداروں میں ملک کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاولرز کرتے ہیں مگر کوئی برا نہیں مانتا۔

ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کانے راجہ بنے بیٹھے ہیں۔

اور خواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساریاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنر اور پارٹیاں، بیرونی ممالک میں ان کے سفر۔ ان کی زندگی کا عکاس اور گویا ان کا اوفیشل آرگن ماہنامہ مرر ہے جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے جس کی آدمی آبادی صرف ڈنر اور رایٹ ہوم کھاتی ہے اور سیمبا ناچی ہے۔

ہندوستان پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب نا قابل تقسیم۔ پاکستان یہ ثابت کرتا ہے تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی اور یہاں کی کلچر بے حد مختلف ہے اور اسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔

ادھر ہندوستان کہتا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کا منبع اس کا کلچر ہے۔ ادھر گپتا پیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے ادھر خلافت راشدہ اور عباسیوں اور مغلوں کے زمانے کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ ان دونوں ممالک کا پروپیگنڈہ غرضیکہ بڑے زوروں میں چالو ہے۔ اور اس چاند ماری کا نشانہ مغربی ممالک۔

ایک اور عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سے لوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔ اقتصادی مشکلات، گرانی، رشوت ستانی، اقربا پروری، بے ایمانی، چار سو بیسی، سیاسی غنڈہ گردی وغیرہ وغیرہ کا ذکر روانہ بلا ناغہ اخباروں کے اڈیٹوریل میں ہوتا ہے۔ لوگوں کے پاس بھی سوائے اس کے اور کوئی موضوع نہیں

مگر اس کے باوجود کوئی ان حالات کا مداوا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ پنسلین اور دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہوتی ہے، ان کو پتا ہے کہ ناممکن سے ناممکن کام ذاتی رسوخ یا سفارش کے ذریعے چٹکی بجاتے میں پورا کرلیا جاتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دورہ ہے مگر اس کے لئے کوئی کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ عوام جانتے ہیں کہ ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن لیڈر کو بھی چند ایسے گر یاد ہیں جن کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں اتنے پیانے پر مسلمانوں نے اتنے گرے ہوئے کردار کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ بار بار میں نے اپنے نئے دوستوں سے (جن کا تعارف میں تم سے آگے چل کر کروں گا) پوچھا کہ جب مسلمان کو آزادی اور اقتدار ملا تو اس نے من حیث القوم اتنے گھٹیاپن کا مظاہرہ کیوں کیا۔ مجھے بتلایا گیا کہ شروع کے دو تین سالوں میں جس قدر جوش وخروش یہاں طاری تھا اب اس سے چوگنی مایوسی کی عملداری ہے۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یار ہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے۔ یہی احساس کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔

کراچی میں شام کو لوگوں کو کوئی کام نہیں سوائے پارٹیوں میں جانے یا سینما دیکھنے کے۔ نہ یہاں تھیٹر ہیں نہ کانسرٹ نہ سیمنار نہ دوسری تہذیبی سرگرمیاں۔ تھوڑی بہت دلچسپی غیر ملکی سفارت خانوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ کسی روز برٹش کونسل نے ایلیٹ پر ایک لیکچر کر دیا یا تصویروں کی نمائش منعقد کر لی گئی، کسی

روز امریکن اطلاعات کے دفتر میں کوئی پروگرام ہو گیا، کبھی ایران یا انڈونیزیا فرانس والوں نے کوئی تقریب کر لی، کبھی جرمن سفارت خانے میں فلم شو منعقد کر لیا۔

ویسے بس پارٹیوں کا بڑا زور ہے جن میں یہ خم پہ خم لنڈھائے جاتے ہیں۔ پارٹیوں کے ذریعے لوگ اپنا اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ موٹروں کا لین دین ہوتا ہے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی ٹپس لڑائی جاتی ہے۔ مکانوں اور زمینوں کے الاٹمنٹ کا کاروبار ہوتا ہے۔

یہاں مجموعی طور پر جنگل کا قانون نافذ ہے۔

اعلیٰ طبقہ، جو بڑے بڑے تاجروں، اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے، اس کی علیحدہ برادری ہے۔ اتوار یہ لوگ سمندر کے کنارے گزارتے ہیں۔ چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ سوئیٹزر لینڈ کے بنکوں میں جمع کر لیا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ، جو بات بات پر دوسروں کو غدار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حب وطن کا سارا ٹھیکہ انہوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

پاکستانی انٹلکچولز کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان ذہین لوگوں کا وقت کس بھیانک خلاء میں برباد ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے، کوئی راستہ، کوئی مقاصد، یہ سب بھی جنگل کے قانون میں گرفتار ہیں۔ محض تلخی اور بیزاری اور مایوسی کا فلسفہ ہے، میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا ہوں جو ان ہی کی نسل کے

نوجوان ہیں اور پچھلے نو سال میں بالکل مختلف راہوں پر چلتے ہوئے ارتقاء کی منزلوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اکثر میرے نئے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں انڈیا میں ہر مہینے اہم ٹھوس موضوعات پر کتنی ان گنت کتابیں چھپتی ہیں، مختلف شعبوں میں کس قدر زبردست ریسرچ اختیار کی جا رہی ہے، کیسے کیسے رسالے نکل رہے ہیں، کیا کچھ سوچا اور لکھا جا رہا ہے، حکومت فنون لطیفہ اور ادب اور علم کی کتنی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک اکثر مجھ سے کہتا ہے: ''یار! قسم خدا کی، باہر کے اخبار پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بڑا فرسٹریشن ہوتا ہے۔''

فرسٹریشن...... یہ لفظ یہاں کی ساری ذہنی زندگی کا سمبل ہے۔

دوسرا لفظ ریکٹ ہے۔ سیاست، ادب، کلچر، مذہب۔ ہر چیز کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر ریکٹ چلایا جا رہا ہے۔ میرے ذہن پرست دوست جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے بے نیاز انداز میں سوال کرتے ہیں: ''کہو بھئی آج کل کون سا ریکٹ چلا رہے ہو۔''

جب میں ان لوگوں کو اپنی عمر کا بہترین حصہ اس خلاء میں ضائع کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے اپنے کام پر نکلتے ہیں، دوپہر کو ایک نیم تاریک اور غیر دلچسپ کافی ہاؤس میں جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور شام کو جا کر وہی انگریزی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ منگل کے منگل کسی ایک کے یہاں جمع ہو کر پھر وہی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے ضمیر کا بڑا احساس ہے مگر زندہ بہر حال رہنا ہے، روزی بہر حال کمانا ہے، اگر بھوکوں ہی مرنا ہوتا تو ہندوستان سے ادھر کیوں آتے (ان میں سے اکثر حضرات ''مہاجر''

ہیں)۔ جرنلسٹ ایمانداری سے رپورٹنگ نہیں کر سکتے کیونکہ اپنے اپنے اخباروں سے نکال باہر کیے جائیں گے ۔ ادیبوں کے پاس لکھنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا (گو بے شمار رسالے نکل رہے ہیں)۔ ترقی پسندی آوٹ آف فیشن ہو چکی حتیٰ کہ ادب میں جمود کا نعرہ بھی پرانا ہو گیا۔

اسلام...... اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے)۔ دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں آ کر اسی لفظ پر ٹوٹتی ہے۔ دوسرے مسلمان ملک اس بات پر خوب چڑتے ہیں۔ ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا ٹھیکہ اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب...... سب کو ''ملا'' کے نقطۂ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام، جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھارے میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں رواں ہوا تھا، اب وہ سمٹ کر ایک مٹیالے نالے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نالہ ایک وسیع بھیڑ میں کہہ رہا ہے جس میں چاروں طرف سے بند باندھے جا رہے ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کا فلسفہ مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال عیسائی اسپین پر حکومت کی، ایک ہزار سال ہندو بھارت پر۔ عثمانیوں نے صدیوں تک مشرقی یورپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء، ایرانی شعراء اور ہندوستانی صوفیائے

کرام کی وسیع القلبی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ علیؓ اور حسینؓ کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں۔ اسلام کو ایک نہایت جارحانہ مذہب اور طرز زندگی بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے ملکی اور اشد اہمیت کے مسائل نظر انداز کر کے کلچر کو غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرنے کا رجحان بھی زوروں پر ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ہماری یہ کتاب انگلستان یا امریکہ سے چھپ جائے، کوئی امریکن فلم کمپنی ہمیں اپنے مووی میں لے، ہم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بھیج دیے جائیں۔

انگریزی جرنلزم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کے پاس پہلے ہی کون سے اخبار تھے اور کون سی ان کو صحافت کی ٹریننگ ملی تھی اور ۴۷ء کے بعد سے اب تک جو کھیپ یونیورسٹیوں سے باہر نکلی اس میں اچھے لکھنے والے نمودار ہونے چاہئیں تھے۔ ان گنت خواتین و حضرات یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر لوٹے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کوئی اکا دکا خوش نصیب ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار جاتا تھا۔ جانے آج کل لوگوں کو ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ کیسے مل جاتے ہیں اور یہ لوگ پڑھ لکھ کر کہاں لا دیتے ہیں، یہ اسرار آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (کم از کم شہروں میں کیونکہ متوسط طبقہ موڈرن ہو چکا ہے)۔ ان گنت لڑکیاں ڈاکٹر، نرس اور لیکچرر بن رہی ہیں ملازمتیں کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کی ملازمت کو اب معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجموعی طور پر پاکستانی خواتین نے فی الواقعہ بہت

ترقی کی ہے اور یہ ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔

رات گزرتی جارہی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا جارہا ہے لکھتا جارہا ہوں۔ اسی وجہ سے شاید تم کو خط بے ربط معلوم ہوگا مگر اتنی بہت سے باتیں تم سے کرنا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری آنکھوں سے میرے نئے **ملک** کو دیکھ لو، میری ہمت بڑھاؤ تاکہ میں اس **ملک** کے لیے اپنے بھر برا بھلا کچھ کرسکوں۔

مغربی پاکستان کی سوسائٹی کا ڈھانچہ اب تک فیوڈل رہا ہے لہذا یہاں سیاسی شعور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام مڈل ایسٹ کے بادشاہوں کے جلوس دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ جہانگیر پارک میں جمع ہوکر وزیراعظم کی تقریر سننے کے بعد زندہ باد اور مخالف پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں کے بعد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہنستے بولتے خوش خوش گھر لوٹتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری جلے جلوسوں کے لیے کرائے کے آدمی بلوائے جاتے ہیں نعرہ بازی کے بعد ان کو پیسے دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈر شپ بڑے بڑے کاروباریوں وار سیٹھوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

عوام کی نفسیات اور ہسٹیریا کی عجیب وغریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

چند سال قبل پنڈت جی یہاں آئے تو عوام کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پولیس کورڈن توڑ دیے اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا۔ پنڈت جی خود ایک نمبر کے جذباتی آدمی، ان پر خوب رقت طاری ہوئی۔ خوش آمدید کے پھاٹک بنائے گئے۔ تقریبات ہوئیں، یہی عوام وقتاً فوقتاً مخالفین کی ارتھی کے جلوس نکالتے ہیں اور ان کے پتلے سڑکوں پر جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرکٹ میچ بھی اس ہسٹیر یا کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ انڈیا پاکستان کا میچ ہوا تو چند روز کے لے گمان ہوتا تھا پنجاب تقسیم نہیں ہوا اور لاہور اور امرتسر حسب سابق ایک ہی صوبے کے دو شہر ہیں۔ ہزاروں سکھ اور ہندو جوق در جوق سائیکلوں پر بیٹھ کر لاہور آئے۔ لاہور کے حلوائیوں نے ان کو مفت مٹھائی کھلائی۔ تانگے والوں نے ان سے کرایہ نہیں لیا۔ قیامت کی چہل پہل رہی۔ آئیڈیلسٹ قسم کے کالم نگاروں نے اخباروں میں عظمت انسان کے گن گائے، بڑے دلخراش واقعات بھی ہوئے۔ ایک بوڑھا اندھا سکھ مشرقی پنجاب سے آیا اور اپنے سابق شہر کے گلی کوچوں کے درو دیوار چھوتا پھرا۔ اس نے کہا مجھے میرے پرانے مکان لے چلو جو کہیں شاہ عالمی میں تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے گھر کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رویا۔

میں اس نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اسٹریو ٹائپ کے متعلق ہم نے سوشیولوجی میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر جب اصلیت میں اس سے دوچار ہوتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور مسئلہ ہے، یہاں ہنوز روز اول ہے۔ ۴۷ء کے ہندوستان میں جو حالت شرنارتھیوں کی تھی وہ آج اٹھ سال گزرنے کے بعد مہاجرین کی ہے اور روز بروز ہولناک تر ہوتی جارہی ہے۔

چونکہ میں ٹیکنیکل طور پر خود "مہاجر" ہوں لہذا اس پرابلم میں نے بہت غور کیا۔ دیکھو بیٹا، بات ساری یہ ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کے مسلمان کے قدم اکھڑ چکے ہیں، وہی اسٹریو ٹائپ کا حوالہ یہاں پھر دینا پڑے گا۔ سکیورٹی کی

تلاش میں یہاں کے ناگفتہ بہ حالات جانتے ہوئے بھی ہندی مسلمان یہاں آجانا چاہتا ہے۔

جب مسلمان لڑکے یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو ہند کی دفاعی افواج میں اس لیے نہیں جاتے کہ ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ سارے خاندان بٹ چکے ہیں۔ایک بھائی پاکستان آرمی میں ہے دوسرا نیوی میں، تیسرا آزاد کشمیر ریڈیو میں نوکر ہے، اس کا چوتھا بھائی، جو ابھی پٹنہ میں بی ایس سی کر رہا ہے، انڈین ایئرفورس میں درخواست بھیجنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا لہذا وہ یہاں پہنچ کر جٹ پائلٹ بن جاتا ہے، پٹنے میں شاید کلرک بھی نہ بن سکتا۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر وہ ملازمتوں کے کمپٹیشن میں بیٹھا بھی تو ہندو سے، جو زیادہ محنتی ہوتا ہے، نہیں جیت سکے گا، اگر جیت بھی گیا تو تعصب کی وجہ سے اسے سلیکٹ نہیں کیا جائے گا، ہندوستان وطن نہیں ایک قسم کا عارضی پڑاؤ کا کیمپ ہے۔

علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سڑک نئی دلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے۔ برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کی دوسری اقلیتوں کی مانند ملازمتوں میں نشستیں مخصوص تھیں، نامزدگی کا دستور تھا اور ہندوستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو تعصب برتا جا رہا ہے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کس کو ہوگا۔

مسلمان کے لاشعور میں ہجرت کا فسوں بسا ہوا ہے۔ پچھلی صدی میں ایشیاء میں سیاسی بیداری کے پھیلتے ہی یہ قوم متضاد مخالف وفاداریوں کی کش مکش کا شکار ہوگئی۔ رہا ہند میں لیکن 'میرے مولا بلا لے مدینے مجھے' اس کا محبوب نغمہ تھا۔ پان

اسلام موزم کی تحریک نے اس تصور کو اور دل آویز بنایا اور مسلمان کے یہاں نیشنلزم اور وطن پرستی کا تصور ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانیت اور اسلام ہم معنی نہیں تھے کیونکہ اول الذکر میں ہندو ازم بھی شامل تھی اور اس میں انگریزوں نے فرقہ پرست عناصر کے ذریعے الگ ہندویت کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ایرانیت اور اسلام، عربیت اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں تھا جس طرح ہر فرانسیسی لامحالہ عیسائی بھی ہے مگر ہندی مسلمان کو اس ملک میں اکثریت کی ایک بڑی رنگین تہذیب اور مضبوط معاشرے سے مقابلہ کرنا تھا لہذا وہ اس ماحول میں شامل ہو کر اس سے مدافعت کرتا رہا، مگر یہ مدافعت کب پیدا ہوئی؟ سارے غیر ملکی مبصرین کا، جو مغلوں کے زوال کے وقت ہندوستان میں آئے اور جن کو اس وقت جدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا علم نہ تھا جو انیسویں صدی میں تیار کی گئی، یہ کہنا کہ اس طوائف الملوکی کے باوجود ملک میں ہندو مسلم سوال کا وجود نہیں تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ملک کی اقتصادی تباہی کی وجہ سے یہ کھنچاؤ شدید تر ہو گیا، ہندو اکثریت کے ہاتھوں پٹ جانے کے خوف کی نفسیات کا تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پانیکر دونوں نے کیا ہے، یہ سوال تاریخ کا بہت بڑا ''اگر'' ہے کہ اس خوف کا تدارک کیا جا سکتا، جو کہ کانگریس کر سکتی تھی، تو آج حالات کیا ہوتے۔

خیر۔ تو ہندی مسلمانوں کا صیہون، حجاز تھا۔ یورپین یہودیوں اور ہندی مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور قوم نے وفاداریوں کے اس تصادم کا سامنا نہیں کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علیحدہ ملک بنائے ہیں اور دونوں اب ان مزید

مسائل سے دوچار ہورہے ہیں۔

پاکستان میں جو نفسا نفسی کا عالم اور حب وطن کی کمی نظر آتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی لگاؤ نہیں، وہ موقع اور سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیویارک میں رہنے والا پولش بوڑھا وارسا کو یاد کرکے آہیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس دھندلے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گومتی کے خربوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھٹاؤں کو یاد کرکے روتے ہیں ان کی اولاد، جو یہاں بڑی ہو رہی ہے، اس کے لیے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضحکہ خیز ہیں، یہ نسل خالص پاکستانی ہو گی اور اس طرح ان متضاد وفاداریوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی رہی ہے۔ ہندوستان سے مڈل کلاس مسلمان کے قدم اکھڑنے کی دوسری وجہ سنسکرت آمیز ہندی زبان کا تسلط ہے۔ اپنی زبان کی تباہی کسی قوم کے لیے سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ انسان اپنی دولت لٹتے دیکھ سکتا ہے مگر اپنی زبان اور تہذیب کی بیخ کنی برداشت نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں ہندی مسلمان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنی مخصوص تہذیب کی برتری کا ناز بھی رہا ہے چنانچہ یہ اس کی دوسری بڑی زبردست نفسیاتی شکست ہے۔ مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جبکہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندو انہی اسکولوں میں اردو پڑھتے تھے) یہ بچے اگر ہندوستان میں رہ گئے تو

اس نئے تمدنی سانچے میں کھپ جائیں گے، اور اسی میں ان کی عافیت ہے، اگر وہ اسے بھی resist کرنا چاہتے ہیں تو لامحالہ ان کو ادھر آنا پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ زیادہ تر شہروں کے مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ پورب کے مسلمان کسانوں کی زبان وہی ہے جس میں ملک محمد جائسی نے پدماوت، کبیر داس نے اپنے دوہے اور تلسی داس نے رمائن لکھی تھی۔

دیہاتوں میں مسلمانوں کو ایک مختلف مذہبی فرقے کی بجائے محض ایک اور جات سمجھا جاتا رہا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اتر پردیش کا وہ مسلمان، جو مسلمانوں کی مڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا علمبردار تھا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا، اس کی حالت قابل رحم ہے۔

اب میں پھر یہاں کے حالات کی طرف واپس آتا ہوں۔

کل میں بھیا صاحب کے دفتر میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے پبلسٹی کے لٹریچر کی ورق گردانی شروع کی اور بہت سی کتابیں گھر اٹھا لایا۔ رات کو میں نے پچھلے برسوں کے وزرائے اعظم کی اہم ترین تقاریر نکال کر پڑھیں۔ طاعت! وعدوں کا ایک سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اسکیموں کا ایک ریلہ ہے جو آٹھ سال سے اب تک بہتا چلا آ رہا ہے۔

مسلمان سیاست ہمیشہ سے مڈل کلاس، شہروں کی سیاست رہی ہے لہذا دیہاتوں کی طرف کوئی بھولے سے بھی توجہ نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے پروگرام میں تقسیم سے پہلے زرعی اصلاحات وغیرہ کا دور دور کہیں ذکر نہ تھا، وہی روایت اب بھی باقی ہے۔ زمینداری کے خاتمے کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی

طبقے کی حکومت ہے۔

آج جمعہ کی رات ہے اور میں ایک انٹلکچول محفل سے لوٹ کر آ رہا ہوں۔ وہاں گھاس پر، قالینوں پر، صوفوں پر بیٹھے گروپ بنا ہے مغربی ادب اور عالمگیر سیاست کی موشگافیاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر میں سوچا کیا کہ کاش تم ان سب کی باتیں سنتیں۔ (اس محفل میں دیسی لڑکیاں صرف دو تین ہی ہوتی ہیں، میں نے یہاں کی مسلمان لڑکیوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود بنیادی سنجیدہ مسائل کے متعلق سوچنے کی طرف سے حیرت انگیز بے اعتنائی دیکھی)۔

اس محفل کے غیر ملکی اراکین بھی بہت دلچسپ ہیں۔ الفریڈ ایک انگریز لڑکا ہے جو لندن اسٹیج پر رہ چکا ہے۔ جولین ایک اور انگریز لڑکا ہے، رومن کیتھولک انٹلکچول، اس کا ساتھی رونلڈ ہے، یہ بھی اوکسفرڈ سے آیا ہے۔

اس محفل میں دنیا جہاں کے مسائل پر زور شور سے بحثیں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کا ہائیڈ پارک کورنر ہے جہاں لوگ باگ آ کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

آج شام وہاں ایک طرف کیتھولک عقیدے پر بحث ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مغرب کے رجعت پسند ادیبوں پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ ایک فرانسیسی پر الجیریا کے سلسلے میں لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ امریکن امداد کے بارے میں میری رچرڈز کی لوگ جان کھا رہے تھے۔ میں دوسری طرف مڑا۔ قالین کے ایک سرے پر اجلا کا گروپ فرانسیسی انٹلکچول سے الجھ رہا تھا۔ کانگریس آف کلچرل فریڈم کا تذکرہ

تھا۔

''فرانس کی موجودہ دگرگوں حالت سے مغربی دانشوروں کی حالت غیر ہے۔ فرانس، جو یورپ کی کلچر اور ذہن کا سمبل تھا، اس کے موجودہ رویے نے مغربی انٹلکچولز کو ہڑبڑا دیا ہے۔ مغرب کا اب واقعی زوال ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس اپنے جواز میں کوئی دلیل نہیں۔'' تنویر گرج رہا تھا۔ ''اب اگر کل کو سارتر دوبارہ تائب ہو جائے تو میں متعجب نہ ہوں گا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔''

''برطانوی دانشوروں کی کیا مضحکہ خیز حالت ہے۔ امریکہ سے روپیہ کھاتے ہیں..........''

یوجین دوسری طرف گوہر افشانی کرنے میں مصروف تھا۔ میں ٹہلتا ہوا جا کر امریکنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ''میری.......... ذرا امریکن ایڈ دینا۔'' رونلڈ نے سگریٹ لینے کے لیے میری رچرڈز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ قہقہہ لگا کر ہنسی، بری خوش اخلاق لڑکی ہے۔

دوسرے گروپ میں چند بین الاقوامی شہرت کے مورخ بیٹھے تھے جو چند روز کے لیے کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

''اگر امریکہ خانہ جنگی کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو ہم لوگوں کا آج تک جانے کیا حشر ہوا ہوتا۔'' امریکن مورخ نے کہا۔ ''تم اپنی تھیوری مت دہرانا کہ تقسیم کی وجہ اقتصادی تھی۔'' اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ملایا۔ ''اس کے علاوہ کیا تھا، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ مشرق کے ڈاؤن فال کی اصل وجہ کیا ہے؟''
فرنی نے کہا۔

''میں نے ٹوئینبی سے بھی یہ پوچھا، وہ حیران ہیں ہندوستان کا اٹھارہویں صدی میں کیوں زوال ہوا۔''

''ہندوستان کی نہری آبپاشی کا انتظام ناقص تھا۔'' جیکب موریسن نے کہا۔

''یہ مسئلہ خالص زرعی ہے۔'' اب رونلڈ اور یوجین اور میری رچرڈز ایک اور بحث کرر ہے تھے۔

''مشرق کے ڈاؤن فال کی وجہ اسلام ہے۔''

''ایں؟''

ریفرمیشن کے بعد عیسائی یورپ نے انتقادی اسپرٹ پیدا کی، وہ اسلام میں آج تک موجود نہیں۔ تم اعلانیہ اپنے مذہب پر اعتراض کر سکتی ہو؟ تمہارا جینا دوبھر کر دیا جائے گا۔

''واہ، اسلام میں بھی بدعتی اور باغی پیدا ہوتے رہے ہیں۔'' فرنی نے کہا۔

''ہاں، مگر اپنے رسولؐ یا خدا کے تصور یا قرآن .... کسی چیز پر بھی تنقید کر سکتی ہو؟ عیسائیوں کے یہاں ان گنت چرچ ہیں اور ملحدوں کی فوج کی فوج موجود ہے۔ عیسائی بڑے اطمینان سے تثلیث اور ورجن میری کے تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ مسلمان سائنٹیفک طریقے سے سوچنے کا اہل نہیں۔''

''جبھی ٹوئینبی نے کہا ہے کہ ہنڈک سوسائٹی اسلامک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ رواداری ہے۔''

"بدھ ازم اور........."

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے اٹھے۔ ائیر پورٹ جا کر قہوہ پیا۔ جب میں واپس گھر پہنچا اس وقت میں تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔

سامنے ثام کی کوٹھی ہے۔ اس میں روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ ثام بھی کسی پارٹی سے لوٹ کر سونے جا چکا ہے، یہ لڑکا میرے ہمراہ جہاز پر بمبئی آیا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس ہے، کچھ عرصے ہندوستان میں گھومتا پھرا۔ اب محکمہ فشریز یعنی مچھلیوں کا ایڈوائزر ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ فشریز کے علاوہ براڈ کاسٹنگ کو بھی ایڈوائز کرتا ہے۔

ایڈوائزرز کی ہر طرف ریل پیل ہے۔ ہر محکمے میں ان گنت ایڈوائزر منسلک ہیں جو جانے کیا جادو سکھاتے ہیں مگر اب تک کوئی ترقی کہیں نظر نہیں آئی۔

چہار سو اسکنڈلز کا بازار گرم ہے۔ رشوت کے اسکنڈل، دھاندلی اور سیاسی غنڈہ گردی کے اسکنڈل۔

آج سب سے بڑا واقعہ، طلعت میری چہیتی بہن، یہ ہے کہ میں لکھنؤ کا انقلابی، کانگریس کا سرگرم کارکن، متحدہ ہندوستان کی عظمت کا جوشیلا نقیب، آج صبح میں بارہ سو روپے ماہوار کے ایک عہدے پر لے لیا گیا۔ ایک پوری لیبارٹری مجھے سٹ اپ کرنا ہے۔ اس کے لیے ساز و سامان خریدنے میں شاید جلد امریکہ بھیج دیا جاؤں۔ فی الحال اسی کام کے سلسلے میں اگلے ہفتے مشرقی پاکستان جا رہا ہوں۔ اگلا خط تم کو ڈھاکے سے لکھوں گا۔

اب صبح ہو رہی ہے۔ ساری رات میں نے تم کو خط لکھنے میں گزار دی، حد

ہے۔ میں نے جانے کتنے صفحے سیاہ کردیے ہوں گے۔ ابھی میں نے دریچوں کے پردے ہٹائے اور باہر جھانکا۔ کراچی جگ اٹھا ہے۔ کراچی اپنے کام پر جا رہا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں، چھکڑا ایسی بسوں، سائیکل رکشاؤں پر سوار کارخانوں اور دفتروں کی طرف رواں ہیں، یہ وہی لوگ ہیں بٹیا جن کو عرف عام میں جنتا کہا جاتا ہے۔ طلعت! ان لوگوں نے تو کوہی قصور نہیں کیا، کوئی جرم۔ ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ ان کو بھوکا رکھا گیا۔ ان کو جس لاٹھی سے ہانک دو ہنک جائیں گے، یہ سب امن سے زندہ رہنے، پیٹ بھر روٹی کھانے، آرام سے سونے کے مستحق ہیں۔ طلعت جس وقت صبح سویرے ہزاروں انسانوں کا ریلا پی آئی ڈی سی کے نئے ڈاک یارڈ کی طرف بڑھتا ہے اس وقت، قسم خدا کی، وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان کے مستقبل سے امیدیں سی بندھ جاتی ہیں، یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں، یہ لوگ جو اس جید، بے ہودہ، بدشکل بوم ٹاؤن کی پندرہ لاکھ آبادی ہیں، یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیاواڑی مزدورنیں، سعود آباد کولونی میں رہنے والے بنارس کے جولاہے (جن کے پرکھ کبیر کے ساتھ پنچ گنگا گھاٹ پر دوتارہ بجاتے پھرتے ہوں گے، لالوکھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی، مغربی یو۔ پی۔ کے کاری گر، دلی کے بساطی، بمبئی کے ٹیکسی ڈرائیور اور چاۓ خانے والے، فٹ پاتھ پر دکانیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاروباری، انجام کولونی اور آگرہ تاج کولونی کے باشندے جو ہاکس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاٹ کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی اپنی جھگیوں پر چاؤ سے چاند تارے

کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔ اپوا کی بیگمات آ کر امریکن دودھ کے ڈبے اور کمبل ان کو تقسیم کرتی ہیں اور ان کی جھونپڑیاں اگلی برسات تک کے لئے پھر آباد ہو جاتی ہیں۔ رات میری رچرڈ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ بحیثیت سوشیولوجسٹ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس قدر ناقابل یقین تکالیف کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے باوجود کراچی کی یہ مخلوق اس قدر امن پسند کس طرح ہے، یہ انقلاب کیوں نہیں بپا کرتی۔ تشدد پہ کیوں نہیں اتر آتی کمال ہے کہ اس کا جواب میری رچرڈز کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔

نہیں طاعت! یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان سے اس لیے متنفر نہ ہو کہ انہوں نے ہلہ کر کے تمہاری دنیا تقسیم کروا دی، یہ بڑے معصوم انسان ہیں۔ ان کو ان مباحثوں، تاریخ کی ان موشگافیوں اور تجزیوں سے کوئی غرض نہیں جو کل رات میں نے اس محفل میں سنیں۔ جو کچھ رونلڈ کہہ رہا تھا، جو کچھ تنویر کہہ رہا تھا، میری رچرڈ کہہ رہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں کارخانے کھل گئے ہیں اور ان کی مشینیں یہ انسان چلا رہے ہیں اور جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں اس کا نام پاکستان ہے۔ اب ماضی پر رونے اور ماضی کی غلطیوں پر پچھتانا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے، یہ سوچنا حماقت ہے کہ دونوں ملک پھر متحد ہو جائیں۔ دنیا کا نقشہ ہر جنگ عظیم کے بعد بدلتا ہے۔ ۴۵ء کے بعد بھی بدل گیا۔ جب میں ماضی کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل کٹتا ہے مگر دل کہاں تک کٹے گا۔ زندگی آدھی گزر گئی، تھوڑی سی باقی ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم اس

بچے کچے وقت کو سوارت کر لیں۔

اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اس کا بنانا یا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں کیا تمہارا خیال ہے یہاں کے ذہن پرستوں کے خلاء میں داخل ہو کر میں آپنے آپ کو کھودوں گا؟ نہیں طاعت میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

میں تعمیر کروں گا۔

پی۔ ایس:

تعمیر پر یاد آیا کہ بھیا صاحب کی کوٹھی، جس میں میں مقیم ہوں، بے حد شاندار ہے۔ ایک اطالوی آرکیٹیکٹ نے بنائی ہے خالص جدید ترین کیلی فورنین وضع کی۔

بھیا صاحب کی دلہن خاصی بدذات ہیں۔ میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہا ہوں کہ تم ان کو کس قدر ناپسند کرو گی، وہ اپوا کی بڑی سرگرم کارکن ہیں اور کراچی کی مشہور میزبان خواتین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دلہن بھابھی میری آبادکاری کے بے حد کوشاں ہیں۔ ابھی انہوں نے میرے لیے ایک ہزار گز زمین خریدوائی اور اپنے ایک بااثر چچا کے ذریعے مکان کی تعمیر کی غرض سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ دلوا دیا۔ کل جب ان کا اطالوی آرکیٹیکٹ مکان کا نقشہ لے کر میرے پاس آیا تو میرا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ (دلہن بھابھی کی چھوٹی بہن نینی تال کانونٹ میں پڑھ رہی ہے۔) عنقریب بھیا صاحب اور دلہن بھابھی برازیل جانے والے ہیں۔ کوٹھی غیر ملکیوں کو پندرہ سو روپے ماہوار کرائے پر اٹھادی جائے گی۔ بابا اور

امی اس کاٹج میں رہیں گے جو بھیا صاحب نے احاطے میں بنوائی ہے۔ بابا سارا دن اخبار پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ امی کسی سے ملتی جلتی نہیں حالانکہ کراچی میں لکھنؤ کے بہت سے خاندان براج رہے ہیں۔ بابا اور امی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ غم سے پھٹتا ہے۔

اب میں پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ لہٰذا خدا حافظ

تمہارا

کمن

مزید پی۔ ایس:

پچھلے ہفتے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں روشن آراء سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصی موٹی ہوگئی ہے۔ اس کے شوہر کو میں نے نہیں دیکھا، وہ کسی مشن پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ روشن نے تم لوگوں میں سے کسی کی بھی خیریت نہیں پوچھی۔ مجھ سے دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد دوسرے گروہ میں شامل ہوگئی۔

۹۹

ازمنہ وسطیٰ کا ہندوستان گھاس پھونس جس کی دیواروں سے اگ رہا ہے۔ پرانی دلی کی عمارتیں، اجمیر، خاندیش، بنگال اور مالوہ کی مسجدیں۔ گوڑ کا داخل دروازہ، تانتی پاڑا، فیروز مینار، گن منت مسجد، احمد آباد اور گجرات، چندیری اور

جودھ پور کی مساجد، رانی سپاری کی مسجد، چمپانیز، دھروار، مانڈ ز کا ہنڈولا محل، باز بہادر کا محل، کالپی کا چوراسی گنبد، جونپور کی اتالا دیوی کی مسجد، دولت آباد کے قلعے، بہمنی بادشاہوں کی عمارتیں، سری نگر کی پگوڈا ایسی چوبی مساجد، چندیری کا بادل محل، بیدار اور گلبرگہ، دکھن، دکھن۔

اتر پردیش میں للت پور تھا اور کالپی اور شکوہ آباد اور بدایوں اور جونپور۔ مغلوں سے پہلے کا ہندوستان۔

اڑیسہ، مدراس، کرناٹک آندھرا پردیش، حیدرآباد دکا دلفریب، پرشکوہ، شاندار شہر، اجنتا، ایلورا، نیلگری کے پہاڑ، بنگلور، کیرالا، ٹراونکور، سرل گھوم پھر کر دوبارہ ازمنہ وسطی کی عمارتوں میں پہنچ جاتا۔ ان گنت نام، ان گنت زمانے، وقت کے پیٹرن، وہ، جو یورپ کے قدیم کیتھڈرلوں کی محرابوں کے نیچے گھومتا تھا اب خانہ بدوشوں کی طرح سارے ملک میں چکر لگاتا پھرا۔ ان عمارتوں کے پتھروں پر وہ ہاتھ رکھتا۔ کنول کے پھول، ہاتھی، گندھرو، حوض۔ سیڑھیاں، مینار، طاق، کسی تاریک اجاڑ محراب کے نیچے سے کوئی دیہاتی لڑکی بکریاں چراتی نکل جاتی۔ کوئی لڑکا پیپل کی شاخ پر سے باؤلی میں کود جاتا۔ کوئی فقیر راستہ ٹٹولتا محل کے ایک شکستہ کونے میں بیٹھ کر چلم سلگانے میں مصروف ہو جاتا۔ اوپر ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور وسیع صحنوں پر جھکا ہوا نیلا آسمان سنسناتا رہتا۔ بادل کی مغربی گھاٹ سے جھوم کر اٹھتے اور دھروار اور چتوڑ پر چھا جاتے۔ خلیج بنگال سے گھٹائیں بڑھتیں اور راج شاہی اور گوڑ پر پھیل جاتیں ازمنہ وسطی کا اداس، خاموش، اجاڑ ہندوستان بارش میں نہاتا، گھاس کے پودے ہوا میں لہراتے۔

یہ پتھر ماضی اور حال دنوں میں شامل تھے اور اس کے ذہن پر اس طرح برستے تھے کہ اسے لگتا تھا کہ اب اس کا دماغ قطعاً معاؤف ہو جائے گی، وہ بھاگ کر حال میں پناہ لیتا۔

سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد (وہ کس کا متلاشی تھا؟ اس نے کئی مرتبہ جھنجھلا کر خود سے سوال کیا)، وہ پھر کلکتہ پہنچتا، پھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اترتا۔ ڈھاکہ کلب کی بار میں متواتر بیئر پیتے رہنے کے بعد پھر سلہٹ جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا۔

منزلِ مقصود بالآخر یہ تھی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دھچکے سے ٹرین رکی۔ طرح طرح کی آوازیں نیند میں ترتی ہوی اس تک پہنچیں۔ ڈیم (انڈے) بوائلڈ ڈیم .... سا (چاء) گرم .... گرم .... سا گرم .... سا گرم۔ ڈیم بوائلڈ۔ اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا کر پھر باہر دیکھا۔ اس منظر میں کس قدر بے پناہ اداسی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا، باہر فضا میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو وسیع ہرے ترو تازہ کھیتوں پر سے بہتی ہوئی آئی تھی ایک بوڑھا پھوس ہندو بے شمار گٹھڑیاں اور اسباب اٹھائے جھکا جھکا، تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا، وہ دیر تک بوڑھے کی دیکھا کیا حتیٰ کہ وہ اسٹیشن کے مجمع میں نظروں سے اوجھل ہو گیا افواہ، یہاں کسی قدر آبادی تھی۔ عورتیں جن کے ماتھوں پر بڑی بڑی سرخ بندیاں اور مانگ میں گہرا سرخ سیندور رچا تھا۔ رنگ برنگی سوتی ساریاں پہنے، بچیاں، دھوتیوں کے کنارے سنبھالے

ہندو۔ چارخانہ تہمد باندھے مسلمان جن کی زیادہ تر داڑھیاں تھیں فاقہ کش کالے کالے لڑکے۔ حکام، اینگلو انڈین گارڈ، پالکی برادر (یہاں اب تک پالکیاں چل رہی تھیں)۔ پھر ٹرین چلی، بنگالی آوازیں اندھیرے میں معدوم ہوگئیں۔ ٹرین دوبارہ تالابوں کے کنارے کنارے دوڑنے لگی جن میں کنول کے پھول کھلے تھے۔ کسی پھولوں کی بیل سے ڈھکے جھونپڑے کے دروازے پر کوئی عورت اودی ساری پہنے کھڑی نظر آجاتی۔ چند عورتیں گھونگھٹ نکالے بانسوں کے جھنڈ کے نیچے نیچے چل رہی تھیں۔ ان کے نام کیا ہوں گے؟ آمنہ، سکینہ، ریا، رادھا۔ ان کی زندگیوں کی کہانیاں کیا ہوں گی بھلا! ان کا نظریہ کائنات، ان کا فلسفہ!! زندہ رہنے سے مرجانے تک کی داستان: تکالیف، افلاس، قحط، قحط، قحط۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

اللہ کو پڑ دے۔ پانی دے بھات دے دے..........

اللہ بھات دے.......... اس کے کانوں میں اس کورس کے الفاظ گونجے جو اس نے کئی بار ڈھاکہ کی محفلوں میں طالب علموں سے سنا تھا۔ اللہ بھات دے.......... اللہ بھات دے، یہ یہاں کا قومی ترانہ ہونا چاہیے، اس نے سوچا اور بنگال کے متعلق اس نے ہمیشہ سے کتنے رومانی تصورات باندھ رکھے تھے۔ شنیلا دیبی نے اسے ٹیگور پر کیا کیا لیکچر پلائے تھے اور ساری کتابیں جو اس نے پڑھی تھیں: ڈی۔ سی۔ سین اور جسیم الدین اور لیلا رائے۔ لوک گیت جمع کرنے والوں کی ٹولیاں، ادبی کانفرنسیں، کلکتہ کے تھیٹر اور تہذیبی سرگرمیوں اور یونیورسٹی لائبریری اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا پس منظر اور کمپنی کے زمانے کی بنی

ہوئی کوٹھیاں، کلائیو روڈ جواب سبھاش چندر بوس روڈ تھی اور علی پور اور دھرم تلہ، مگر وہ سرحد عبور کر چکا تھا۔ کلکتہ اور اس کی طلسماتی فضائیں دوسری طرف رہ گئیں۔

ٹرین ایک اور اسٹیشن پر رکی۔ اللہ بھات دے۔ بھات دے...... بھات دے۔

چند پوربنیں گٹھڑیاں اور بچے اٹھائے دھکا پیل میں لڑھکتی پڑھکتی تھرڈ کلاس کے ڈبوں کے طرف بڑھ گئیں۔ اس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ڈائننگ کار کے بیرے کا سفید براق صافہ اندر داخل ہوا۔

''ڈنر صاحب؟''

''ہاں۔''

اس نے کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا اور دوبارہ آرام سے لیٹ گیا۔

سلہٹ میں چاء کے باغات میں سینکڑوں پوربی مزدور کام کرتے تھے۔ رام دائی، رام اوتار، لچھمن اور سیتا۔ ترلوچن اور چنبیلیا۔ پوربیوں کے یہاں یہ دو نام مقبول تھے: رام اور سیتا۔ ہند کا عہد عتیق زریں زمانہ، پاٹلی پتر، اندر پرستھ، ایودھیا، لکشن وتی، ڈگ وجے رام چندر اور متھلا کی جنک کماری سیتا۔ ارے واہ رے تاریخ دانو۔

''ڈنر صاحب......... کافی لاؤں.........'' بیرے نے ٹرے لاکر سامنے رکھ دی اور سرگوشی کے لہجے میں اس طرح سے مخاطب کیا گویا وہ دیوتا تھا۔

وہ پھر ہال میں واپس آگیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی سری منگل پہنچنا ہے اور رنگاماٹی اور بندربن۔ اسے مزید روپیہ کمانا ہے۔

دوسرے روز ٹرین سلہٹ پہنچی۔ اسٹیشن پر اس کا منیجر پیٹر جیکسن حسب معمول

کار لیے اس کے استقبال کو موجود تھا، وہ شہر سے نکل کر سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔

سرماندی کے کنارے پہنچ کر اس نے کار روکی۔ اب شام کی تاریکی چھا رہی تھی۔ لالٹین لیے بوڑھے اور عورتیں کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے۔ یا اتر رہے تھے۔ بوٹ گھڑ گھڑ کرتی دوسرے کنارے سے لوٹ آئی تھی۔ ساحل پر شکستہ لاریوں میں لوگ مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے۔ ایک اندھا فقیر قرآن کی آیتیں پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا، اندھیرے میں اس کی آواز بڑی ہولناک لگی۔ دو اندھے ایک نوکے میں جا بیٹھے تھے، ایک اندھی عورت درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔

یہاں کتنے اندھے تھے۔ کتنے بے شمار اندھے۔

بوٹ سے تختے جوڑ کر اس کی کار کشتی پر چڑھائی گئی۔ کشتی مسافروں سے لد گئی۔

''بڑا گندا مجمع ہے، چلو ہم لوگ نوکے میں چلے چلیں۔'' پیٹر نے کہا اس نے مزاحمت نہیں کی، وہ تو خودکشی کی طرح سطح پر بہے جا رہا تھا۔

وہ دونوں کود کر ایک نوکے میں سوار ہو گئے۔ نوکا بوٹ کے پیچھے چلنے لگا۔ ساحل دور رہ گیا جس پر مٹی کے تیل کے چراغ ٹمٹمارہے تھے اور جس کے عقب میں جھونپڑوں پر پان کی بیلیں چڑھی تھیں۔ ایک چاءخانے کے آگے لوگ لالٹین کے سامنے جھکے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریا پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ افق پر سپاری کے درخت ہوا میں جھومتے تھے۔ کس قدر سکون تھا، امٹ سکون۔

دفعتاً زور کی ہوا چلی۔ نوکا ہچکولے کھانے لگا۔

بہت بوڑھا مانجھی اپنا زور لگا کر نوکا کھیتا رہا اور پھر گانے میں مصروف ہو گیا۔

اور اس نے دیکھا کہ اس کے بوڑھے ملاح کا نوکا لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب ناکے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر اس فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے میں عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ''پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے؟'' اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشان مت ہو۔'' پیٹر نے جواب دیا۔ ''مگر ذرا اس کالے سوڑ سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا الاپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔''

''بے چارہ بوڑھا۔'' سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔

''یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ چستی ان میں نام کو نہیں۔'' پیٹر نے کہا۔

سرل نے چھت پر جھکے جھکے آواز دی: ''او آدمی.......... کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابو المونشور.......... صاحب۔''

''ابوالمونشور..........''سرل نے دہرایا۔

''جب صاحب..........''وہ پھر پتیوار پر جھک گیا۔ نوکا اب سرعت سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر دونوں طرف اناس اور کیلے کے جھنڈ تھے اور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کے اندر جھانکا جہاں ابوالمونشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جانماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو دریا کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ دفعتاً سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے، یہ صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھایا ہے۔ اس عجیب وغریب، حسین ملک میں جسے مشرقی بنگال کہتے ہیں، جسے مشرقی پاکستان کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے دوبارہ چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔ برابر سے ایک شمپان گزر گیا۔ چاند بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ انتہائی کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

یہاں گنگھور گھٹائیں امنڈ کر آتی ہیں۔ پر بارش نہیں ہوتی۔

یہاں بیٹا باپ کی، بی بی شوہر کی عزت نہیں کرتی۔

لوگ سبھاؤں میں جمع نہیں ہوتے۔

خوبصورت باغ اور عبادت خانے تعمیر نہیں کیے جاتے۔

یہاں امیروں کی دولت محفوظ ہے لیکن چرواہے اور کسان دروازوں کی چٹخنی چڑھا کر سوتے ہیں۔

بغیر پانی کی ندی۔ بغیر گھاس کا جنگل۔ بغیر چرواہے کا گلہ۔

پڑھتے پڑھتے کمال نے رامائن بند کر دی۔

''یہ کہاں کا ذکر ہے۔'' سرل نے پوچھا۔

''کہیں کا بھی نہیں۔ میں تو رامائن دیکھ رہا تھا۔ یہاں الماری میں پڑی مل گئی۔ مدتوں پرانی۔ اس پر ۱۹۶۷ء کی تاریخ پڑی ہے۔'' وہ اداسی سے کتاب کے سرورق پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس کی سیاہی دھندلی ہو چکی تھی۔

''تم تو اس عقیدت سے پڑھ رہے ہو گویا تلسی داس جی کمیونسٹ تھے۔'' سرل نے کہا۔

''ہاں۔ بھگت ویاس بھی پارٹی ممبر تھے۔'' کمال نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''انہوں نے لکھا ہے مہابھارت میں کہ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کے خلاف بغاوت کرو۔ ایسا بادشاہ بادشاہ نہیں۔ اسے پاگل کتے کی موت مارنا چاہئے۔''

''واہ پنڈت جی۔'' سرل نے ہنس کر کہا۔ ''کیا بات ہے، مگر یہ بتا دوں کہ اب تم یہ رامائن مہابھارت بھول جاؤ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔''

''ہاں۔ یہ میں نے بڑی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔'' کمال نے کہا۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ گزرے ہوئے برس بیئر کے گلاسوں میں بلبلوں کی طرح تیرا کیے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سرل چپ چاپ بیٹھا نیلی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا جن کے اس پار برما تھا۔

''کیوں بھائی، کیا سوچتے ہو؟'' کمال نے اسی الم سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ....سوچ رہا تھا کہ برما اگر یہاں سے پاؤں پاؤں جایا جائے تو کتنی دور ہو گا۔''

''بس ....یہی سوچ رہے تھے؟''

ایک آوارہ فاقہ زدہ کتا نیچے سے کود کر برآمدے میں آ گیا۔

''دیکھو یہ بھی برما سے آ رہا ہے۔''

''یا برما جانا چاہتا ہے۔'' کمال نے کمینے پن سے کہا۔

کتا دم ہلاتا رہا۔

''ہلو......ہلو......لو بسکٹ کھاؤ۔'' سرل نے کتے کی خاطر کی۔

''یار، یہ تو ریڈ چائنا سے بھاگ کر آیا ہے۔'' کمال نے اسے غور سے دیکھ کر بڑی متانت سے کہا۔ ''اینٹی کمیونسٹ کتا ہے۔ آزادی کی تلاش میں یہاں پہنچا ہے۔''

سرل نے منہ لٹکا کر کمال کو دیکھا۔ ''تم اب بھی کالج کے زمانے کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''اب بھی......کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔''

میز پر چاء کا سامان رکھا تھا۔ کمال نے ایک سینڈوچ کتے کے سامنے پھینکا اور

بولا: ”نہیں سرل..... میں اب مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں۔ دیکھو میرا پاسپورٹ۔“ اس نے جیب سے سبز رنگ کا نیا نویلا پاسپورٹ نکالا۔

”ریلے برادرز میں تو میں تم کو اس سے اچھی نوکری دلوا دیتا۔“ سرل نے کہا۔

”کیا کرنا فلی مل کی پلاننگ کرنے آئے ہو تم؟ یہاں اکثر لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں۔“

”میں جھک مارنے آیا ہوں۔ تم سے مطلب؟ تم بنگالی مزدوروں کا خون چوسنے کے لیے نہیں آن موجود ہوئے۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں باون چھید۔ میں تو ہوں ہی زمانے بھر کا نمبر ایک کا بھگوڑا رجعت پسند۔“

اب اس پر پھر اپنے ضمیر کا دورہ پڑنے والا ہے۔ سرل نے بڑے دکھ سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

سرل ہاورڈ ایشلے ندیوں، پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے گزرتا کل صبح ہی یہاں پہنچا تھا، وہ سری منگل سے کاروبار کے سلسلے میں چاٹگام آیا تھا جہاں سے اس کی چاء ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔

چاٹگام میں پھر دل کی وحشت نے زور باندھا اور پیٹر پر کام کی دیکھ بھال چھوڑ کر اس نے پہاڑیوں کا رخ کیا، وہ دو ہزاری اور بندربن اور چندرگونا کے جنگلوں میں مارا مارا پھرا اور رانگا ماٹی کے ڈاک خانے سے اپنے بھائی کو اس نے فرمانبرداری سے اپنی خیریت کا خط بھی بھیجا جس میں آسام اور سلہٹ اور چاٹگام کے علاقوں کی خوبصورتی پر اس نے روشنی ڈالی اور لکھا کہ امید ہے کہ اگلی کرسمس وہ اس کے ساتھ سلہٹ میں منائیں گے۔

یہ خبر سن کر سرل نے روزمیری کو طلاق دے دی (اس کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی)۔ اس کے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا تھا کہ بوہیمیا سے نکل کر ان کا چھوٹا بھائی بالآخر اپنی دنیا کو واپس لوٹ آئے گا۔ لارڈ موصوف نے کلکتے سے اپنا کاروبار سمیٹ کر اب بڑے پیانے پر مشرقی پاکستان میں روپیہ لگایا تھا جہاں ان کے چاء کے باغات بھی تھے۔ سرل، جواب کیمبرج سے نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لندن میں مارا مارا پھر رہا تھا، اسے ایک روز انہوں نے اپنے کلب میں بلایا اور بغیر تمہید اس سے کہا:

''میں تم کو پاکستان بھیج رہا ہوں۔''

''بہت اچھا۔'' سرل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ اب زندگی میں مزید جھگڑا کرنے کی گنجائش کہاں تھی!

پچھلے چھ مہینے سے وہ پاکستان میں تھا۔ اسے لندن چھوڑنے کا زیادہ رنج نہیں ہوا۔ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال، مائیکل، سریکھا، سب لوگ پہلے ہی انگلستان کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے شنیلا دیبی کو فون کیا اور طلعت کو بھی مگر طلعت گھر پر موجود نہ تھی۔

اب وہ سری منگل میں ایک بے حد خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ کام سے فرصت ملتے ہی ہندوستان کا چکر لگا آتا تھا۔ دارجلنگ، شیلانگ، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد دکن، عمارتیں، کھنڈر، مکانات اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے۔

کل شام جب وہ ایک پگوڈا کے باغ میں گھنٹہ بھر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد سرکٹ ہاؤس واپس پہنچا تو ایک نوجوان کی پشت پر اس کی نظر پڑی جو پچھلے

برآمدے کی ریلنگ پر جھکا نیچے کرنافلی ندی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے قدموں کے آہٹ پر اس نوجوان نے پلٹ کر سرل کو دیکھا۔

یہ نوجوان کمال رضا تھا۔

کمال نے اسے اپنی داستان سنائی اور اسے مطلع کیا کہ وہ ایک لیبارٹری قائم کرنے کراچی سے ادھر آیا ہے اور سارے صوبے کا دورہ کرتا پھر رہا ہے۔

اب وہ صبح سے برآمدے میں بیٹھے تھے اور زندگی کا غم ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے ڈال رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ملازمین نے سرکٹ ہاؤس میں لیمپ روشن کر دیئے۔

چند روز قبل کھیدا ختم ہوا تھا۔ برابر کے کمروں میں ہاتھیوں کا ٹھیکے دار ایک اینگلو انڈین مع اپنے اینگلو انڈین عملے کے ٹھہرا ہوا تھا جو شراب پینے کے بعد بے حد فلسفیانہ باتیں کرتا۔

رات کو نوجوان خوش مزاج افسروں کی ایک ٹولی شور مچاتی ہوئی آئی۔ ان میں سے دو ایک لڑکے علی گڑھ کے تھے۔ کمال کی ان سے علیک سلیک ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ بنگال کے مسئلے کا تذکرہ کرنے لگے۔

"بہت سے لوگ تو بس نام کے مسلمان ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اچھا! میرا تو خیال تھا کہ اسلام کا یہاں بڑا زور ہے جتنا سارے برصغیر میں نہیں ہے۔ مثلاً اتنے نمازی اور اتنے سخت پردہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔" کمال نے کہا۔

''.........سارا روپیہ یہاں کلکتے کی کمیونسٹ پارٹی سے آتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''بنگال کا مسئلہ ہے.........نازک.........''

کمال چپ چاپ بیٹھا ان سب کو دیکھتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ سرل اور کمال پھر پچھلے برآمدے میں آ بیٹھے جس پر نارنجی پھولوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ سارے میں خاموشی چھا گئی۔ ندی جہاں مڑتی تھی وہاں پہاڑی پر پاور ہاؤس تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کی گھڑگھڑاہٹ بڑی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے قریب بانس کا سینما ہاؤس تھا جس میں سے ''بیجو باورا'' کے گانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لتا کی آواز ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سرکٹ ہاؤس تک آ رہی تھی۔ کمال جنگلے پر سر رکھے اس آواز کو سنتا رہا۔ لتا کی آواز ایک ایسا مضبوط پل ہے جس نے دو دشمن ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے، اس نے سوچا۔

''تم نے لتا کو سنا ہے؟'' اس نے بآوازِ بلند سرل کو مخاطب کیا۔

''وہ کون ہے؟'' سرل نے چونک کر کہا۔

کمال بوریت کے دریا میں غوطہ زن رہا۔

خانساماں کافی کی کشتی لے کر نمودار ہوا۔

کمال کی اس خانساماں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ کئی بار ان دونوں کا مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات ہو چکا تھا۔

''کہیے خانساماں جی، کیا حال چال ہے؟'' کمال نے کہا۔

''مہربانی ہے حضور۔ آپ لوگوں کے آنے سے رونق لگی رہتی ہے ورنہ اس جنگل بیابان میں کیا رکھا ہے۔''

''تم بڑی صاف اردو بولتے ہو۔ ڈھکیا ہو کیا؟''

''جی نہیں سرکار، ہم تو کلکتیہ ہیں۔''

''اچھا۔ ہم بھی تھوڑے سے کلکتیہ تھے ایک زمانے میں۔''

''جی حضور۔''

کمال نے ایک اور جمائی لی۔ خانساماں جھک کر کافی بنانے لگا۔ سرل حسب معمول آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

گورنر جنرل اور ان کی پارٹی کھیدا کے بعد بندربن سے لوٹ کر کراچی واپس جا چکی تھی۔ ان کی آمد کے لیے باشا کا سرکٹ ہاؤس خاص طور پر آراستہ کروایا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی شان و شوکت دیکھ کر خانساماں کو سرفریڈرک کا زمانہ یاد آ گیا جو بنگال کے گورنر تھے اور جب شکار کے لیے آتے تھے تو اسی طرح جنگل میں منگل لگ جاتا تھا اور خوب بخشش ملتی تھی۔

''پچھلے دنوں تو یہاں بڑی چہل پہل رہی ہوگی۔'' کمال نے کہا۔

''جی حضور۔ آپ کو اس زمانے میں آنا چاہیے۔ دور دور سے صاحب لوگ آیا تھا۔ اب خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے لاٹ صاحب انگریز کے بجائے مسلمان ہیں مگر شان میں انگریزوں سے کم نہیں۔ اسی پر تو غیر لوگ جلتے ہیں۔ اسلام کی شان دیکھ کر حاسدوں کے آگ لگتی ہے۔''

''کون جلتے ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''ارے صاحب'' اس نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''یہاں بڑا بڑا مفسد پڑا ہوا ہے۔''

''یہاں کہاں؟'' کمال کو اس کے رازدرانہ لہجے سے ایسا لگا جیسے ان گھنے جنگلوں میں بڑے جید کمیونسٹوں کی کمین گاہیں ہیں۔ ابھی ان کے گوریلا دستے اندھیرے سے نکل کر سرکٹ ہاؤس پر دھاوا بول دیں گے اور وہ بے چارا اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہوا شہید ہو جائے گا۔

سرل کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ خانساماں نے کافی کے برتن اٹھا لیے، پھر خاموشی چھا گئی، کچھ دیر بعد ایک امریکن ڈرائنگ روم میں سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بے تکلفی سے آن کے کمال کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہاؤڈی...... '' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ار...........ہاؤ ڈو یو ڈو......'' کمال نے ہاتھ ملایا۔

''میں جان ٹائٹس ہبل جونیئر ہوں۔ مجھے جونی کہو۔''

''ہلو جونی۔ یہاں کیسے آنا ہوا؟'' پھر دفعتاً کمال کو خیال آیا کہ یہ کیسا غیر ضروری سوال تھا۔

''میں چکمہ قبائل کے متعلق ایک ڈوکومنٹری فلم بنا رہا ہوں۔''

''او.........ہاؤ اکسائیٹنگ!'' کمال اور ٹانگیں پھیلا کر آرام کرسی پر لیٹ رہا۔ ''سگریٹ؟''

''تھینکس۔''

دوسرے لمحے جونی بھی فضا کے اس سحر میں کھوگیا، وہ جنگلے پر بازو رکھ کر ندی کو دیکھتا رہا۔ جونی کی بش شرٹ پر جو اخبار چھپے تھے کمال آنکھیں کھول کر برآمدے کے مدھم اجالے میں ان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس سے بھی اکتا گیا۔ دریا پر مکمل سکوت کے ساتھ کشتیاں گزر رہی تھی۔ کبھی کسی ملاح کے گانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ان کشتیوں مس چراغ جل رہے تھے۔ اب گھپ اندھیرا سامنے وادی پر چھا گیا تھا۔

پھر جونی نے بڑے دوستانہ اور بھولے انداز میں کمال سے باتیں شروع کر دیں۔ کمال ہوں ہاں کرتا رہا۔ سرل نے ڈریسنگ گاؤن پہن کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا اور کمال کو امریکن کے ساتھ سر کھپاتا دیکھ کر چپکے سے غسل خانے کے راستے باہر نکل کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بھی دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں لرز رہی تھیں۔ اندھیارا چکر کاٹتا سارے میں چھایا جا رہا تھا۔ برآمدے میں جونی اپنی یکساں آواز میں کمال کو بتا رہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ قبل ہی مشرقی پاکستان آیا ہے لیکن انڈر ڈیولپڈ ممالک کا اسے خاصہ تجربہ ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ ویت نام میں رہ چکا ہے۔ اس کی بیوی نیویارک میں پریس فوٹو گرافر ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ اس نے جیب سے اپنے بیوی بچوں کی تصویر نکال کر دکھائی اور دیر تک اپنے چھوٹے بچے کا تذکرہ کرتا رہا۔ جو دو سال کا تھا، پھر اس نے ایشیا میں کمیونزم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور کمال کو بتایا کہ مسلم ممالک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کمیونزم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

''اب تو کافی پی لو۔'' کمال نے جمائی لے کر کہا۔

''نہیں۔ اب میں کھانا کھاؤں گا۔'' اس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات پر گفتگو شروع کی۔ کمال کو بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ساری تفصیلات، اعدوشمار، ہر چیز اسے نوک زبان تھی اور اسے یہاں آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔

اتنے میں دو اور امریکن رنگین بش شرٹ پہنے ڈرائنگ روم عبور کرتے ہوئے برآمد میں آگئے۔ ایک دفعہ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت اخلاق کی باتیں کی گئیں۔ یہ دونوں یو۔ایس۔آئی۔ایس ڈھاکے کے افراد تھے اور اسی جونی کے ہمراہ رانگا مائی آئے تھے۔ لوکیشن ڈھونڈنے کے لیے وہ سارا دن چکمہ گاؤں میں گھومتے پھرے تھے۔ ان کے پاؤں گرد آلود تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ بچوں کے ایسے جوش وخروش سے وہ کمال کو اپنے ایڈونچرز سناتے رہے۔

''تم کو معلوم ہے۔ ریڈ چائنا یہاں سے کس قدر قریب ہے............ ان پہاڑیوں سے ذرا ہی آگے بڑھ کر............'' جونی نے ایک اور انکشاف کیا۔

سرکٹ ہاؤس کے خدمت گار نے آن کر اطلاع دی کہ غسل کے لیے پانی لگا دیا گیا ہے، وہ سب اسی طرح باتیں کرتے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سرل نے منڈیا نکال کر پھر کھڑکی میں سے جھانکا۔

''گئے تمہارے یار دوست۔''

''آجاؤ۔ اب میدان صاف ہے۔'' کمال نے جواب دیا۔

سرل باہر آکر اپنی آرام کرسی پر لیٹ گیا، وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراقبے

میں ڈوب گئے۔ کمال اور سرل پانچ چھ دن وہاں رہے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرنافلی رواں تھی جس پر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بہا کر چندر گونا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر اینگلو انڈین ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ تھا۔ اس کی آرٹسٹ لڑکی جین سیفد ساری پہنے پہاڑیوں پر بیٹھی خاموشی سے تصویریں بناتی نظر آتی۔ بل کھاتے راستوں پر منگول شکلوں والے پہاڑی بوجھ پیٹھ پر لادے گزرا کرتے۔ سرکاری جیپ گاڑیاں زن سے نکل جاتیں۔ صبح شام مندروں میں گھنٹے بجتے۔ ہاٹ میں وادی سے آئی ہوئی چیزیں بکتیں۔ رنگ برنگے سوتی کپڑے، مونگے اور فیروزے کے ہار، چاندی کے زیور۔ لمبے لمبے پائپ پیتی ہوئی ہنس مکھ پہاڑی عورتیں دکانیں لیے بیٹھی رہتیں۔ ہندو، مسلمان، بدھ۔ سب سکون اور قناعت سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اناس کے کھیتوں میں کٹائی کر رہے تھے۔ چاول اگا رہے تھے۔ عمیق خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لا رہے تھے۔ اکثر کسی انتہائی ویران اور غیر آباد جنگل کی اونچی پگڈنڈی پر کمال کو ایک بوڑھا تہمد باندھے سر پر بانسوں کا بھاری گٹھا اٹھائے اپنا راستہ طے کرتا دکھلائی دے جاتا۔ اس گٹھے کو بیچ کر وہ چند آنے کمائے گا۔ صدیوں سے وہ یہی کرتا آ رہا تھا۔ آج بھی اس کی حالت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ جنگلوں میں چکمہ اور ماگھ اور مونگ قبیلے اپنے بانس کے جھونپڑوں میں زندہ تھے۔ بیسیوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہاٹ کے لیے رانگاماٹی آتے تھے۔ یہاں سڑکیں نہیں تھیں۔ یا ریل گاڑیاں یا ہوائی جہاز کی سروس۔ یہ حسین ترین، پرامن علاقہ، وحشیوں کا ملک، کہلاتا تھا۔ یہ جگہ انتھر وپولوجسٹ

کے لیے جنت ہے، جونی کہتا اور ران کو اپنے ساتھ لوکیشن پر گھسیٹ کر لے جاتا۔ یا دونوں خود ہی جیپ پر بیٹھ کر ساگوان کے جھرمٹوں میں گھس جاتے اور پرندوں کی چہکار سنتے پھرتے۔ پہاڑی لڑکیاں سیاہ دھاری دار سیرونگ باندھے، گگریاں اٹھائے ان جنگلوں میں سے گزر جاتیں۔ کسی بھکشو کے نارنجی لباس کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ کرنافلی کے دھارے پر انہوں نے دور دور تک کشتی رانی کی۔ بندربن جا کر موگھ راجہ سے ملے اور اس کا محل دیکھا اور وہ گھنے جنگل جن میں ہاتھی رہتے ہیں۔

''آسام میں اس سال جو سیلاب آیا تو بے شمار ہاتھی ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ ویسے بھی ان جنگلوں کی سرحد کا صحیح تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔'' ایک افسر نے کمال کو بتایا۔

''تو گویا ان پاکستانی ہاتھیوں میں، جن کا کھیدا ہوا، مہاجر ہاتھی بھی شامل تھے؟'' کمال نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

انہوں نے بندربن کے سارے علاقے کی سیر کی۔ انسانوں کو دیکھا۔ کمال ان کی زبان نہ سمجھتا تھا، وہ کمال کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ بھولے، معصوم لوگ جواب تک تقریباً پتھر کے زمانے میں رہ رہے تھے۔

ان جنگلوں میں خوبصورت جانور بھاگے پھر رہے تھے۔ چیتے اور گلدار اور بارہ سنگھے۔

یہ کیسی صاف ستھری، پاکیزہ دنیا تھی۔

ایک روز شام کو وہ رانگاماٹی سے کرنافلی کے اس پار راج باڑی گئے جہاں چکمہ

راجہ رہاتا تھا۔ یہاں گویا ہندوستانی ریاستوں کے دم واپسیں کا بڑا موثر منظر کمال کو دکھلائی دیا۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی توپ رکھی تھی۔ ایک مندر تھا۔ آم کے درختوں پر شام کی اداسی میں کوئلیں چلا رہی تھیں۔ سامنے معمولی سے محل میں مدھم بلب روشن تھے کیونکہ رانگاماٹی کا پاور ہاؤس بے حد کمزور تھا۔

ہال میں راجہ کے پرکھوں کی قد آدم روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ ''ان پرکھوں میں بنگال اور آسام کے مغل گورنر بھی شامل تھے۔'' سرل نے فوراً اس علاقے کی ہسٹری کی اس کرم خوردہ کتاب کا حوالہ دیا جو سرکٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں رکھی تھی۔

انگلستان کے پڑھے ہوئے نوجوان راجہ اور اس کی ماں نے سرل اور کمال کا استقبال کیا۔

ڈرائنگ روم میں پیانو کے اوپر سادھنا بوس کی تصویر رکھی تھی۔ کیشپ چندر سین کی تصویر آتش دان پر موجود تھی۔ راج ماتا کیشپ چندر سین کی نوتی اور سادھنا بوس کی بڑی بہن تھیں۔ ''کیشپ چندر سین نے جب اپنی کمسن لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بہار سے کر دی تو برہمو سماج میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔'' کمال نے سرل کے گوش گزار کیا۔

''ہاں۔ میں نے ستی دیوی، مہارانی کوچ بہار کی خودنوشت سوانح حیات پڑھی ہے۔ شنیلا دیبی نے پڑھنے کو دی تھی جب وہ برہمو سماج پر لیکچر دیتی تھیں۔'' سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

''آپ پاکستان سے آئے ہیں؟'' راج ماتا نے پوچھا۔

کمال ایک لمحے کے لیے ہڑبڑا گیا۔ یہ بھی تو پاکستان ہے، پھر دوسرے لمحے اس نے صورت حال پر غور کیا۔ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کسی **ملک** کا تصور دراصل کیا ہے؟ یہ راج باڑی اب کس **ملک** میں شامل ہے؟ کیشپ چندر سین اب کدھر کھپتے ہیں؟

رانی صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں جو ایک خوبصورت سی سترہ سالہ لڑکی تھی جس نے ساری عمر دارجلنگ کے کانونٹ اسکول میں گزاری تھی، وہ دونوں فوراً تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔ کمال کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب راجہ، جو کافی خوش شکل تھا، اوکسفرڈ کے لہجے میں سرل سے کہہ رہا تھا:

''حکومت کرنافلی میں بند باندھ کر سارے صوبے کے کارخانوں کے لیے ہائیڈرو الیکٹرک کا ذخیرہ بنانے والی ہے۔ میرے قبیلے کے لوگوں کا علاقہ بھی زیر آب ہو گا۔ ان کو حکومت معاوضے دے کر کہیں اور بسا دے گی۔ یہ میرا مکان مع رانگامائی کے غرقاب ہو جائے گا۔''

''تغیر کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔'' کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

''ہاں۔'' راجہ نے کہا۔

راج ماتا کلکتے کی باتیں کرنے لگیں۔ کمال کا ذہن پھر دور دور بھٹک گیا۔ بنگال کے راجوڑوں کا ماحول، بردوان، کوچ بہار، میمن سنگھ۔ یہ اس الف لیلوی سلسلے کی ایک چھوٹی سی گمنام کڑی تھی جو اب ہائیڈرو الیکٹرک کے پانی کے ذخیرے میں غرق ہونے والی تھی۔

کمال اور سرل نے کچھ دیر بعد اجازت چاہی۔ راجہ اور راج ماتا دروازے تک

پہنچانے آئے......

''پھر کبھی ضرور تشریف لائیے گا۔'' راج ماتا نے کمال سے کہا۔

''ضرور۔ خدا حافظ۔''

وہ باہر آ گئے۔ راج باڑی کی روشنیاں ٹمٹمایا کیں۔ کرنافلی پر کشتیوں کا ٹریف اب کم ہو چلا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔

دوسری صبح وہ رانگا ماٹی کو خیر باد کہہ کر نیچے میدانوں میں اتر آئے۔

چٹا گانگ سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر سیتا کنڈ روانہ ہوئے۔

راستے میں نوجوان ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

تشریف رکھیے۔ سگریٹ لیجیے گا؟ کمال نے کہا۔

اس نے ذرا بھونچکا ہو کر کمال کو دیکھا اور پھر جھجکتے ہوئے سیٹ کے کنارے پر ٹک گیا۔

''آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ سپاری کے اس جھنڈ کے ادھر میرا گاؤں ہے۔'' ٹکٹ چیکر نے جواب دیا۔

کمال کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں: اس کو ٹی بی ہو چکی ہے۔ اس کی تنخواہ بہت کم ہے اور گھر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا ہے، وہ موجودہ وزارت سے مطمئن نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی سیاسی معلومات حیرت انگیز تھیں، وہ یونیورسٹی کے کسی جوشیلے طالب علم کی طرح مدلل گفتگو کر رہا تھا حالانکہ وہ

محض ایک مدقوق ٹکٹ چیکر تھا جس کی زندگی چھوٹی لائن کی ٹرین پر سفر کرتے گزرتی تھی۔

''پاکستان بننے سے پہلے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ بنگالی مسلمان سماجی اور اقتصادی طور پر اس حد تک پس ماندہ تھے۔ آج آپ لوگوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔'' اس نے کمال سے کہا۔

اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم ہونا شروع ہوئی۔

''آپ کو پتا ہے'' ٹکٹ چیکر نے کھڑے ہوتے ہوئے معاً کمال کو مخاطب کیا، ''۴۷ء سے آج تک اس لائن پر چیکنگ کرتے مجھے اتنے برس بیت گئے۔ آپ پہلے بڑے افسر ہیں جنھوں نے مجھ سے اخلاق سے بات کی اور مجھے ایک باعزت انسان سمجھا۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

دوسرے لمحے وہ سرعت سے ڈبے کے باہر نکل گیا۔

کمال اور سرل اسٹیشن پر اترے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو تھی۔

''ہم سیتا کے مندر جانا چاہتے ہیں۔'' کمال نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''اب اس وقت نہ جائیے۔ پہاڑی کی چوٹی بہت اونچی اور پرخطر ہے۔ لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔'' اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ہم ضرور جائیں گے۔'' سرل نے ضد کی۔

اسٹیشن ماسٹر نے ذرا محظوظ ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ دس پندرہ لوگ جھجکتے

ہوئے ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا خاندان تھا۔ اسٹیشن کا عملہ۔ پولیس کانسٹیبل۔ چاء کے اسٹال والا۔ گاؤں کے باشندے۔ مندروں کے سادھو۔ ان کی اس مکمل پرسکون دنیا میں یہ دوانوکھے اجنبی کہاں سے آن ٹپکے۔

فوراً بستی میں خبر پھیل گئی: دو یاتری آئے ہیں اور ان میں سے ایک انگریز ہے۔ (انگریز بھی یاتری ہی ہوگا ورنہ اس کا دماغ خراب ہوا تھا کہ جان جوکھم میں ڈال کر اتنی دور سیتاجی کی مقدس آگ کے درشن کرنے آتا؟) ایک پالکی لاکر پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ اس کے پردے ہٹا کر ساری کے گھونگھٹ میں سے ایک لڑکی نے بھی ان دونوں اجنبیوں کو حیرت سے دیکھا۔

سرل پالکی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''یہ ہمارے بڑے مولوی صاحب کی بٹیا ہے۔ اپنے سسرال واپس جا رہی ہے۔'' کانٹابدلنے والے نے بتایا۔

کانسٹیبل آگے بڑھا۔ ''آیئے آپ کو گاؤں تک پہنچا دوں۔'' اس نے کہا۔ گاؤں کے راستے میں اس نے بھی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔ گرانی۔ مسلم لیگ کی سیاست۔ مصنوعی قحط۔ عوامی لیگ۔ اے۔ کے۔ فضل الحق۔ کمال کا سر چکرا گیا۔ اس صوبے کا بچہ بچہ کتنے زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک لڑکا کمال کے پیچھے چلنے لگا، وہ کانسٹیبل سے چٹا گانگ کی علاقائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

''پرفلا کہتا ہے کہ آپ کو کنڈ تک لے جائے گا۔'' کانسٹیبل نے کہا۔

''ہلو پرفلا۔'' سرل نے اس سے مصافحہ کیا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

کمال نے اس سے کلکتے کی بنگالی میں پوچھا۔

''پرفلا کمار بسواس۔''

''اسکول میں پڑھتے ہو؟''

''جی نہیں۔کھیتی کرتا ہوں۔''

''یہاں آرام سے رہتے ہو؟''

''آرام سے کیوں نہیں رہوں گا؟''پرفلا نے حیرت سے پوچھا۔

کمال خاموش ہوگیا۔

بازار کی کچی سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔چھوٹی چھوٹی دکانوں پر لوگ جمع تھے۔سب کی نظریں ان دونوں کی طرف تھیں۔سفید دیو کی طرح سرل آگے آگے اس ننھے سے بازار میں داخل ہوا۔کمال ایک چاء خانے کے سامنے رک گیا۔صاف ستھرے بانس کی ٹٹیوں سے بنے ہوئے چاء خانے میں بلز نہیں تھا اور نہ غنڈہ پن کا ماحول اس پر طاری تھا۔چند آدمی چادریں لپیٹے بنچوں پر بیٹھے بنگالی اخبار پڑھ رہے تھے۔کونے میں گراموفون بج رہا تھا۔دیواروں پر بنگالی فلموں کے اشتہار لگے تھے۔یہ بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔''ہمارے لیے خوب گرم چاء بنانا۔ہم ابھی پہاڑی پر سے واپس آتے ہیں۔''کمال نے چاء خانے کے مالک سے کہا۔لوگ اپنے اپنے گھروں سے کیلے اور پھل لے کر خاطر کے لیے آن موجود ہوئے۔

''آپ یاتری ہیں۔بڑی دور سے آئے ہیں۔آپ کی خدمت ہمارا فرض

ہے۔'' ایک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

کمال حیرت سے یہ سب سنتا رہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نواکھالی اور بہار میں ایک دوسرے کو ذبح کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔

پرفلا کی معیت میں انہوں نے پہاڑی کی اور بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں خوبصورت جھونپڑے تھے اور سرسبز کنج۔ جگہ جگہ سرسوتی پوجا کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ گھاس پر اور مکانوں کے سامنے سرسوتی کی بے حد خوبصورت اور سب مورتیاں رکھی تھیں جن کو کمہاروں نے خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کمال ایک مورتی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ ''علم کی دیوی۔ ہنس پر سوار ہو کر ستار بجانے والی برہما کی بی بی۔ مادر کائنات۔'' اس نے کہا۔ ''ہم انسانوں نے تیرا کیا حشر کیا۔''

سرل بھی گھاس پر دوزانو بیٹھ گیا۔ ''تمہارے گاؤں کے کمار کس قدر زبردست ماہر فن ہیں۔'' اس نے مورتی کو بغور دیکھ کر کہا۔

''ہاں۔'' کمال نے فخریہ جواب دیا۔

پھر وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے نکل کر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے سرخ پتھر کا تالاب تھا جس کے چاروں اور سرخ مندر تھے اور سنگ سرخ کی چوڑی سیڑھیوں پر برگد کی شاخیں جھکی تھیں۔ چاروں اور ہو کا عالم طاری تھا۔

تالاب کا چکر کاٹ کر وہ ایک اور کنج میں داخل ہوئے۔ یہاں لڑکیاں ننھی ننھی جھیلوں کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جھونپڑوں اور مکانوں پر ترگی کے زرد پھولوں میں بیلیں پھیلی تھیں۔ درختوں سے معطر پھول گر رہے تھے۔

''یار یہ تو بالکل کسی ترقی پسند بنگالی فلم کا سیٹ معلوم دے رہا ہے۔'' کمال نے

کہا۔

''بنگال کے گاؤوں سے زیادہ حسین مناظر اور کہاں ہوں گے۔ بنگالی استادوں کے ناول انہی خطوں کے عکاس تھے۔'' سرل نے جواب دیا۔

وہ پہاڑی کی سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ اب ان کے دونوں طرف بے حد گھنے ٹروپیکل جنگل تھے اور عمیق غار اور کھڈ۔ جگہ جگہ سینکڑوں برس پرانے مٹھ درختوں میں چھپے کھڑے تھے۔ بھورے رنگ کے لرزہ خیز ڈراؤنے معبد جن کی مقفل کوٹھریوں میں مہنت دفن تھے۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ عقیدتمندوں کے روپے سے بنائی ہوئی ہزارہا شکستہ سیڑھیاں پیچ در پیچ خطرناک موڑوں سے گزرتی چوٹی تک چلی گئی تھیں جہاں گندھک کے ذخیرے میں ہزاروں برس سے آگ روشن تھی۔

''سیتا مہارانی کو راون نے لنکا سے لا کر یہاں چھوڑ دیا تھا۔'' پرفلا نے بڑے تیقن اور عقیدت کے ساتھ میٹر آف فیکٹ انداز میں اس طرح مطلع کیا گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

چند سادھو نشیب میں مندروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتے دکھلائی دیے۔ سرل اوپر پہنچ کر ایک درخت سے ٹک گیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ شکستہ سیڑھیوں کے نیچے جھرنا گر رہا تھا۔ شام کے گہرے سناٹے میں پرندوں کی سیٹیاں، پتوں کی سرسراہٹ، پانی کی آواز اور شعلوں کی سنسناہٹ پجاریوں کے منتروں کی مدھم صداؤں میں گھل مل کر بلند ہوتی گئی۔ بہت دور، نشیب کے گاؤں میں روشنیاں اندھی اندھی ٹمٹما رہی تھیں۔ پرفلا اطمینان

سے اچک کر درخت کی شاخ سے لٹک گیا۔ ''صاحب! ذرا دھیان رکھیے گا یہاں اژدھے اور بچھو بہت ہیں۔''

''اچھا۔'' سرل نے کہا، مگر ان دونوں نے بالکل دھیان نہ رکھا اور مزید سیڑھیاں طے کر کے ایک اور مٹھ تک پہنچ گئے۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی کرنیں، جو اب تک پہاڑی کے جنگل پر طرح طرح کے رنگ بکھیر رہی تھیں، تاریکی میں گم ہو گئیں۔ اب واپس چلو، ہمیں دس بجے کی ٹرین پکڑنا ہے۔ کمال نے یاد دلایا۔

انہوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ان کو ایک گھنٹہ لگ گیا کیونکہ تاریکی بہت گہری تھی اور ان کے پاس ٹارچ تک نہیں تھی۔

گاؤں کے چاء خانے میں ان کا انتظار ہو رہا تھا، وہ اندر جا کر ایک صاف ستھرے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چاء اور دو دو پیسے والے بسکٹ رکھے گئے۔ میزبان لوگ ذرا شرمائے شرمائے، سہمے سہمے، مہمانوں سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''سرل۔''

''ہاں''

''دنیا میں اس چاء خانے سے زیادہ خوبصورت جگہ تم نے کوئی اور دیکھی ہے؟''

''نہیں۔'' سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر وہ باہر نکلے۔ بہت سے لوگ ان کو اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ پرفلا پرانے

دوستوں کی طرح چپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گاؤں کے بچوں نے ان سے بخشیش کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ پر فلا نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگا جیسے روپے کی پیش کش کر کے کمال نے اس کی دل شکنی کی ہے۔

"میں بھکاریوں کی دنیا کا رہنے والا ہوں۔ اگر کوئی بھیک مسترد کر دے تو مجھے متعجب نہ ہونا چاہیے؟" کمال نے کہا۔

"ہاں۔" سرل نے جواب دیا۔

راستے میں ایک جھونپڑی کے برآمدے میں چراغ جل رہا تھا۔ کمال ٹھٹھک گیا۔ دیکھوں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے اندر جھانکا۔ ایک بوڑھا پھونس ہندو سفید براق دھوتی اور چادر لپیٹے مٹی کے دیے کی روشنی میں چند بچوں کو بنگالی قاعدہ پڑھا رہا تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ گرد کے لیے انہوں نے ایک بوسیدہ چٹائی بچھا رکھی تھی۔ اجنبیوں کو دیکھ کر بوڑھا گھبرا کر باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہ منظر کبھی بھول سکو گے۔" سرل نے کہا۔

"نہیں" کمال نے جواب دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین آئی، وہ چٹا گانگ واپس پہنچ گئے۔ جہاں جگمگاتے کلب میں پیٹر جیکسن بار روم میں ان کا منتظر تھا۔

"آپ سیتا کنڈ ہو کر آ رہے ہیں۔" اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "غضب خدا کا۔ معلوم ہے وہ پہاڑی، اژدھوں، چیتوں اور خطرناک ترین بچھوؤں کا مسکن ہے، وہاں تو دن کے وقت بھی سمجھ داری آدمی بندوق لیے بغیر نہیں جاتے۔"

"مگر وہاں جو اتنے انسان بستے ہیں وہ؟" کمال نے اعتراضا کہا۔

''اجی وہ آئے دن سانپ بچھو کے کاٹے سے مرتے رہتے ہیں اور پھر ان کا کیا ہے، وہ تو ہیں ہی جنگلی، وحشی، بن مانس لوگ۔''

دوسرے دن انہوں نے سلہٹ کا رخ کیا، وہاں سے سرل کمال کو راج شاہی لے جا کر پہاڑ پور کے گپتا عہد کی سنگتراشی کے شاہکار دکھانا چاہتا تھا۔ سارے ملک میں چپے چپے پر جو پرانے مندر، مٹھ، مسجدیں اور درگاہیں بنی تھیں سرل کسی ماہر آرکیالوجسٹ کی طرح ان کے متعلق کمال کو بتاتا رہا۔

''تم کو آرکیالوجی میں کب سے دخل ہو گیا۔'' ایک روز باریسال جاتے ہوئے کمال نے اداسی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' سرل نے اسٹیمر کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کے ایسے وسیع دریا کی پرشور لہروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''کہ میرے پاس ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے، جسے دوسرے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے، جو وقت کی دسترس سے باہر ہے، میں خود اب ماضی ہوں تمہاری طرح اور ہندو پاکستان کے یہ پرانے کھنڈر ہی میرے دوست ہیں، میں ان کی زبان سمجھتا ہوں۔ اس دیوانے برصغیر میں صرف وہ ہی میرے ہم نوا ہیں۔ مورخین کے متضاد نظریوں کو مسترد کر کے یہ اپنی رام کہانی مجھے الگ سے سنا رہے ہیں۔ میں ان کا واحد، تن تنہا آڈینس ہوں۔ یہ پتھر میرے دوست رہیں گے۔ کمال، خدارا یہ نہ کہنا کہ میں ایک اور مغربی یورپین برطانوی ڈی جنریٹ ڈیکیڈنٹ انٹلکچول بن گیا ہوں۔ مجھے اب ان لیبلوں کی پرواہ نہیں رہی۔ میں اب سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ روم اور بازنطیم میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے کائنات سے جو یہ نیا رشتہ قائم کیا ہے اپنی تلخی

جذبات کے ذریعے اسے توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔''

سلہٹ میں وہ خوبصورت بل کھاتے پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ایک روز سرحد تک گئے۔ سامنے لکڑی کا بڑے شہتیر کا پھاٹک تھا جس کے ادھر پاکستانی سپاہی مستعد کھڑا تھا۔ شہتیر کے دوسری طرف چند آسامی کاہلی سے کھڑے پان چبا رہے تھے۔ چند قدم پر آسام کی سرسبز پہاڑیاں تھیں جن پر خوبصورت مکان بنے تھے۔ کمال لکڑی کے شہتیر پر کہنیاں ٹیکے دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

سلہٹ سے اگلے روز انہوں نے سری منگل کا رخ کیا، یہ بہت لمبا سفر تھا ندیاں اور گھنے جنگل اور مولی بازار کا خوبصورت علاقہ عبور کر کے وہ سرل کے مستقر پر پہنچے۔ ایک نیچے سے ٹیلے پر سرل کا بنگلہ تھا جس کی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔

یک لخت کمال نے محسوس کیا کہ اس کا جانا پہچانا سرل کسی پراسرار طریقے سے پل کی پل میں بڑے صاحب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کار روک کر وہ سر اٹھائے سامنے کی اور دیکھتا برساتی کی سیڑھیاں چڑھا۔ اس کے ملازمین کی پلٹن استقبال کے لیے لپک کر آگے بڑھی۔ برآمدے کے نیچے کھڑے ہوئے چند مزدوروں نے جھک جھک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اس نے آواز دی: ''عبدالرحمٰن، غسل کا پانی لگاؤ۔'' پھر وہ کمال کو ساتھ لیے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے۔'' اس نے کہا

بنگلہ شیر کی کھالوں اور چیتے اور بارہ سنگھے کے سروں اور بیش قیمت ساگوان کے فرنیچر سے مزین تھا۔ کمال کو محسوس ہوا وہ ۱۹۲۸ء کے ہندوستان میں داخل ہو

گیا ہے اسے گل فشاں شدت سے یاد آئی اور اس کا دوسرا مکان خیابان جو دہرہ دون میں تھا۔ عبدالرحمٰن کو دیکھ کر اسے امیر خان کا خیال آیا۔ سرل نے ڈرائیور کو پکارا تو کمال نے محسوس کیا شاید میاں قدیر لپکے ہوئے آئیں گے۔

جلاوطنی..........جلاوطنی..........خداوند! تو نے مجھے کیوں جلاوطن ہونے دیا کمال نے آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈرائننگ روم میں بیرے نے کھانا لگانا شروع کیا۔ سارے ملازمین اپنی اپنی جگہوں پر کام میں سرعت سے مصروف ہو گئے۔

بنگالی منشی جی مزدوروں کا حساب کتاب لے کر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹریڈ یونین کا ایک فرد بہت دیر سے سرل کے انتظار میں برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ملازمین کا دستہ سرل کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا منتظر تھا: بیرہ، خانساماں، خدمتگار، بوائے، اس کا یوریشین کلرک رالف جوزف برآمدے میں کاغذات لیے کھڑا تھا۔ سرل صاحب کئی دن بعد لوٹے تھے اور بہت سے ضروری کاغذات پر ان کے دستخط درکار تھے۔ کئی چپراسی ادھر ادھر موجود تھے۔ ایک تن تنہا سرل اور اس کے ذاتی عملے میں ان گنت آدمی شامل تھے: مالی اور گراس کٹ اور سائیس اور بہشتی، چوکیدار۔ دریا پر اس کی اپنی موٹر لانچ تھی۔ اس سلطنت کا، جو سری منگل میں دور دور تک پھیلی تھی، سرل اپنے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کی شرکت کے ساتھ مالک تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج میں بودلیئر اور رایلیٹ کی کتابیں لیے گھوما کرتا اور کوہ نور میں مائیکل کے ساتھ جا کر آلو کھاتا تھا۔

صبح سات بجے چوکیدار نے بنگلے کے ہال کا دروازہ کھولا۔ دھوپ جھلملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی تو سرل اپنی مسہری سے اٹھا۔ کمال اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں کھڑا اسگریٹ پی رہا تھا۔ ''یادِ صبح وطن دے رہی تھی ہوا............ داغ دل پھول بن بن کر کھلنے لگے ....

میری پلکوں پہ بدرِ کمال آ گیا۔'' اس نے زیر لب کہا اور لمبا سانس بھر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جس کی دیواریں مکل ڈے، اتل بوس، ابانی سین، رضا اور حسین کی پینٹنگز سے مزین تھیں۔ کونوں میں تانبے کے مجسمے رکھے تھے۔ الماریوں میں کتابیں چنی تھیں۔ بریکفاسٹ کے بعد وہ سرل کے ساتھ باہر نکلا۔ سرل نے سولا ہیٹ پہنی، وہ دونوں کار میں سوار ہوئے۔ پیٹر جیکسن اور رالف جوزف کی قیادت میں منشیوں اور کارکنوں کا جلوس جیپ گاڑیوں میں پیچھے پیچھے چلا۔ سرل نے کمال کو اپنی فیکٹری دکھائی جہاں چاء کی پتیاں تیار کی جا رہی تھیں۔

دوپہر کو لنچ کے لیے وہ کلب گئے اور چند ساتھی پلانٹرز سے نارائن گنج کی شیئر مارکیٹ کے اس روز کے نرخ پر سرل نے تبادلۂ خیالات کیا۔ اسٹیٹسمین اور امرت بازار پتریکا اور ڈھاکے کے مارننگ نیوز پر نظر ڈالی۔ ابھی کھانے سے قبل بیئر کا دور چل رہا تھا کہ دفعتاً کمال غائب ہو گیا۔

''مسٹر رضا کہاں گئے؟'' برآمدے میں آ کر سرل نے پیٹر سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ ابھی میں نے ان کو نورالاسلام چودھری کے ہمراہ باغوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔''

''نورالاسلام چودھری؟'' سرل خاموش ہو گیا۔

چودھری مزدوروں کا نمائندہ تھا اور رات سرل سے ملنے آیا تھا مگر سرل نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ صبح دفتر میں آئے۔

سرل کار میں بیٹھ کر مال کو ڈھونڈھنے کے لیے نکلا۔ اپنی ٹی اسٹیٹ میں پہنچ کر وہ خاموش سایہ دار سڑکوں پر چکر لگاتا پھرا مگر مال کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آخر اکتا کر اس نے ایک جگہ کار روک لی اور بے دھیانی سے جھاڑیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ پرندے درختوں میں چہچہا رہے تھے۔ شاخوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ نے چاء کی جھاڑیوں پر طرح طرح کے پیٹرن بنا دیئے تھے۔ چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے معاً نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک پوربن لڑکی بڑے ماہرانہ انداز میں پتیاں توڑ رہی تھی۔ بڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ سرل مسکرایا۔ اس نے خیالات کے دھارے میں بہتے بہتے ایک لمحے کے لیے ساحل پر آ کر سوال کیا:

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ہمرا نام؟ چمپا۔''

''چمپا۔'' اس نے طرح دہرایا گویا یہ نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔ ''چمپا.........اچھا نام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔

لڑکی ذرا تعجب سے اسے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ اور اس کی پچھلی نسلیں ہر طرح کے انگریزوں کو دیکھتی آئی تھیں۔ سنکی، بد دماغ، بیہودہ، بے حد دارو پینے والے۔

یہ والا بڑا صاحب سنکی تھا۔

کلب واپس آ کر وہ دھڑام سے ایک آرام کرسی پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر ملکہ الزبتھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ایک تصویر میں شیر کے شکار کا سین تھا۔ ایک میم سفید ٹوپ پہنے احمقوں کی طرح بندوق سنبھالے ہودے پر بیٹھی تھی۔ برابر میں مہاراجہ کوچ بہار رونق افروز تھے۔ میم کی شکل میں اسے اپنی دادی لیڈی بارن فیلڈ کی جھلک نظر آئی جو پچاس برس قبل اکثر ہندوستان آ کر مہاراجاؤں کے ساتھ ٹائیگر شوٹ سے شغل کیا کرتی تھیں۔ گڈ مارننگ! گرینی۔ آج کی صبح تم کیسی ہو؟ اس نے دل میں کہا اور پھر سوچنے میں مصروف ہو گیا کہ کمال اس وقت کہاں ہوگا۔

شام کو سرل سے کمال کے اعزاز میں ایک مخصوص سے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

"آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

"کہیں نہیں۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔"

"مزدوروں کی بستی گئے تھے؟"

"ہاں"

"میرا یہی خیال تھا۔"

"تم ناراض ہو؟"

"نہیں تو۔ تم بھی اس نظام میں اتنی ہی حد تک شامل ہو جتنا میں۔ ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہاں مزدوروں کو صرف ایک روپیہ چار آنے مزدوری ملتی ہے؟"

''ہاں''

''کوئی ٹریڈیونین نہیں ہے؟''

''نہیں''

''کوئی کمیونسٹ عناصر؟''

''پتا نہیں''

''بکواس مت کرو، تم کو سب پتا ہے۔''

''کمال کائنات کی ذمے داری کا بوجھ میں نے بھی دنوں اٹھائے رکھا۔ آخر اسے اتار پھینکا تم بھی اس بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ پھر اس ہٹ دھرم کا کیا فائدہ۔ اس طرح کیا تم اپنے ضمیر کو تسکین دینا چاہتے ہو کہ تم مجرم نہیں ہو؟ تم بہت بڑے مجرم ہو کمال رضا، مجھ سے کہیں بڑے مجرم۔''

کمال خاموش رہا۔ سرل نے اٹھ کر اس کے لیے وہسکی اور گلاس نکالا۔

''پھر میں تمہارے جیسے ایک نہایت چغد انسان سے ملا، وہ بھی تمہارے ساتھی پلانٹر ہیں شری نہار رنجن داس گپتا۔'' کمال نے کہا۔

''داس گپتا۔ اس سے تم کہاں ملے۔ واپس کلب گئے تھے؟''

''نہیں میں پیدل ایک پگڈنڈی پر سے آ رہا تھا۔ میرا سوٹ بوٹ دیکھ کر انہوں نے لفٹ دینے کے لے کار روک لی، وہ ہی مجھے تمہارے مکان تک چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمہاری رح کے رئیس ابن رئیس ہیں۔''

سرل نے وہسکی دو گلاسوں مین انڈیلی۔ کمال کہتا رہا، ''میں نے ان سے پوچھا آپ ترک وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے فرمایا، آپ بھی حد کرتے

ہیں۔ انڈیا گورنمنٹ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ سرمایہ داروں پر دھڑا دھڑ بھاری بھاری انکم ٹیکس لگائے جا رہے ہیں وہ الگ۔ میرا دماغ خراب ہوا ہے جو ترک وطن کروں گا؟ یہ صاف گوئی قابل تعریف تھی۔''

سرل خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: ''میں تم کو پھر یہی رائے دوں گا، دنیا بھر کی ہر چیز میں ناک ڈبونے کی جو تمہاری عادت ہے اسے خدا را اب چھوڑ دو۔ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔''

کمال وہسکی کے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔

دوسرے روز صبح وہ راج شاہی روانہ ہو گئے۔ کئی دن تک اس خوبصورت ضلعے کی وسعتوں میں خاک چھانتے پھرے۔ دور افتادہ سنتھال گاؤں میں پہنچے جہاں راستے اتنے خراب تھے کہ کئی بار ان کی جیپ الٹتے الٹتے بچی۔ سنتھالوں نے کمال کو اور زیادہ مغموم کر دیا۔

''ان بیچاروں کے لیے تو میں ذہن مں بڑا رومینٹک تصور لیے بیٹھا تھا۔ لوک ناچ اور زین العابدین کی مشہور و معروف آبی رنگوں کی تصویر اور جانے کیا کیا۔''

''اور اصلیت میں بوجہ اپنے افلاس یہ درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں اور جنگلی جانوروں کی طرح زندہ ہیں۔ ہے نا؟'' سرل نے جیپ چلاتے چلاتے مڑ کر کہا۔

''میرا بھی شروع میں قدم قدم پر یونہی دل ٹوٹا تھا۔''

''جونی یہاں نہیں آیا اپنی مووی بنانے کے لیے۔'' کمال نے کہا۔

''یہاں بھی آ جائے گا۔'' سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

سنتھالوں سے بھی ان دونوں کا بڑا دوستانہ ہو گیا۔ جس روز وہ لوگ واپس

لوٹ رہے تھے ایک گاؤں میں سارے سنتھال ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ایک سیاہ فام بے حد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی۔ان کا مکھیا، جس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی، جس سے اس نے لاٹھی باندھ رکھی تھی، ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تار تار قمیض پہن کر ان کو رخصت کرنے بستی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سرخ کنول نکال کر سرل کو پیش کیا۔

رات کو وہ راج شاہی کے سرکٹ ہاؤس واپس پہنچے تو ڈرائنگ روم میں چند امریکنوں کی آوازیں آئیں۔

جونی سنتھالوں کے متعلق ایسٹ مین کلر میں ڈاکومنٹری بنانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں گنگا بہتی تھی۔ دوسرے کنارے پر مرشدآباد تھا۔

مرشدآباد؟ سراج الدولہ؟ کرنل کلائیو؟ کیا بے کار کی باتیں ہیں، وہ سنو۔زن سے گولی چلی۔کوئی اور اسمگلر مارا گیا، وہ دونوں گھپ اندھیری رات میں گنگا کے کنارے کنارے خاموش سڑک پر ٹہلا کرتے اور آگے بڑھ کر ضلع کے اعلیٰ حکام کی کوٹھیاں تھیں اس کے بعد بازار چھوٹے چھوٹے چوراہے۔گلیاں۔اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اداس مکانات۔

''مکان کیسی کیسی کہانیاں سناتے ہیں۔'' سرل نے پھر دہرایا۔

سایہ دار کنجوں میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کی حویلیاں اور کوٹھیاں چھپی ہوئی تھی جن میں سے بیشتر سنسان پڑی تھیں۔

''سنا ہے زمینداری ختم کر دی گئی ہے۔'' کمال نے کہا۔

سرل نے اسے پھر دیکھا۔ ''اب تم نے پھر ناک ڈبونا شروع کی۔'' اس نے ڈانٹا۔

وہ اسٹیشن واپس جا رہے تھے۔

ڈھاکے واپسی میں پھر ٹرین دریا کے کھاٹ پر رکی۔ مسافر اتر کر اسٹیمر پر سوار ہوئے۔ ٹرین کا تجارتی مال اتار کر اسٹیمر پر چڑھایا گیا۔ یہاں کرین نہیں تھے۔ سینکڑوں قلیوں نے آواں یں لگا لگا کر سامان ڈھونا شروع کیا۔ اس طرح کی صداؤں کو کمال نے IPTA والوں کے ساتھ خود کورس میں گایا تھا اور ترقی پسند فلموں میں اس طرح کے گیت سنے تھے مگر اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سارا مشرقی بنگال ایک نہایت شدید حقیقت پرست، ترقی پسند فلم کے مناظر کا بہت بڑا Sequence ہے۔

جہاز پر داڑھیوں والے چند بوڑھے اور برقعہ پوش عورتیں آ کر تھرڈ کلاس کے فرش پر بیٹھ گئیں، یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سیکنڈ کلاس میں گھس رہی تھیں۔

اب فرسٹ کلاس میں لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ کیبن میں گئے، ڈیک پر بکھر گئے، دوربینیں اور کیمرے نکالے گئے، اخبار کھولے گئے۔ دو اسمارٹ بیگمات نے ننٹنگ شروع کر دی۔ چند امریکن، جو کسی دور افتادہ ضلعے میں یو۔ایس۔آئی۔ایس کی شاخ کھولنے جا رہے تھے، ایک نوجوان طالب علم سے

مصروف گفتگو ہو گئے، جو تعطیلات کے بعد ڈھاکے واپس جا رہا تھا۔ ایک طرف دو بنگالی مولانا عوامی لیگ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ ڈھاکے کا ایک اردو اخبار نویس۔ یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس والوں کی دعوت پر بحیثیت ان کے مہمان ان کا ہم سفر تھا۔ ایک اعلیٰ افسر کیبن میں بیٹھے تھے۔

کمال جہاز کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسا جھمیلا تھا؟ یہ کیسی دنیا تھی جو وجود میں آ گئی تھی؟ یہ گتھی کس نہج پر سلجھے گی؟ اور اس سارے گھپلے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، کتنے گھر لٹے، کتنے لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلاوطن ہوئے اور کتنے کروڑوں انسان جو پہلے بھوکے مرتے تھے اب بھی بھوکے مرتے ہیں۔

کمال ریلنگ پر جھک کر افق کو دیکھتا رہا جہاں تک صرف پانی ہی پانی تھا .... عظیم دریا، عظیم ملک، عظیم انسان۔ کیا یہ سارے انسان عظیم نہیں جو سلاخوں کے ادھر مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے؟

اردو اخبار نویس ٹہلتے ہوئے کمال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔

"آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟" انہوں نے پان کی ڈبیا نکالتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی" کمال نے مختصر جواب دیا۔

"کراچی؟"

"جی"

انہوں نے دوبارہ کمال سے ہاتھ ملایا۔ "صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھئے کہ

کالے پانی میں پڑے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں کے لیے بسا اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یو۔پی کے رہنے والے تھے) سچ عرض کرتا ہوں قبلہ، اس خطے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ بالکل نتھنوں میں دم کر رکھا ہے ہمارا ان لوگوں نے۔"

ایک نوجوان سرل سے باتیں کرتا قریب سے گزرا۔ اخبار نویس ایک ذرا کی ذرا رکے۔ جب وہ آگے چلا گیا تو بولے: دیکھا آپ نے انگریزی کیا لاجواب بولتے ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ بس آگئے جوٹ کوٹا میں۔

"جوٹ کوٹا۔" کمال نے حیرت سے دہرایا۔ اس نے یہ اصطلاح آج ہی سنی تھی۔

"جی ہاں صاحب۔ آپ کا قیام ڈھاکے میں ہے؟ شاہ باغ؟ اچھا کہیں اور ٹھہرے ہیں۔"

اب اعلیٰ افسر بھی کیبن سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے کمال کو سگریٹ پیش کیا۔ دریا کا پانی سورج کی کرنوں میں سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ برابر سے ایک جوٹ کی بار برداری کرنے والی سیاہ رنگ کی مہیب کارگو بوٹ بڑی تمکنت سے تیرتی ہوئی نکل گئی کمال مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"کس قدر حسین منظر ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"جی ہاں" اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ان مناظر کی پبلسٹی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام سجھائی نہیں دیتا۔ مگر بس دور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھلے۔ ہم کو

دیکھیے تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قید تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔''

''قید تنہائی؟''

''جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ ملک ہے یہ ذرا یہاں کے باشندوں سے آپ کو سابقہ پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ ایک سے ایک کاہل، سازشی، متعصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔''

کمال کو یاد آیا: اٹھارہویں انیسویں صدی کے انگریزی سفرناموں میں اہل بنگالہ اور عموماً سارے نیٹوز کے لیے یہی الفاظ پڑھے تھے۔ اسے لگا گویا وہ اٹھارہویں صدی کے کسی انگریز کلکٹر کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔

''یقین فرمائیے'' اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی، ''جس روز یہ خطہ پاکستان سے علیحدہ ہو گا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرنک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔ وزیر اعظم کو پردھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں۔ سنسکرت سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا ہے۔''

بیرے نے چاء لا کر میز پر رکھی۔ ''جہاج جگن ناتھ گھاٹ کو بے پہنچے۔''

کمال نے اس سے پوچھا: ''امرا اونی کھن دھورے جہاجے روئے چھی۔''

اخبار نویس اور اعلیٰ افسر دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

''معاف کیجیے گا، آپ کے لب و لہجے سے میں سمجھا تھا کہ آپ بھی لکھنؤ کی طرف ہیں۔'' اخبار نویس نے کہا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔

''جناب کا اسم شریف تو اب تک پوچھا ہی نہیں۔''

''سید کمال رضا۔''

''آپ مٹیا برج کے نواب علی رضا بہادر کے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟''

''جی ہاں۔ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔''

''اوہو............ہو............ہو............بڑی خوش قسمتی ہے میری کہ جناب سے ملاقات ہو گئی۔'' اخبار نویس نے تیسری بار کمال سے مصافحہ کیا۔ ''کیا لوگ تھے۔ صاحب کیا خاندان تھا۔ لکھنؤ کی کلچر کی آخری یادگار تھے یہ حضرات کلکتے میں۔ واہ............واہ............وہ زمانے ہی خواب خیال ہو گئے۔ سنا ہے نواب عباس رضا بہادر کا بھی انتقال ہو گیا۔''

''جی ہاں۔''

اعلیٰ افسر کی بیگم اور سالی گوگلز لگائے آرام کرسیوں پر دھوپ کے رخ بیٹھی تھی سالی فلم فیئر کے مطالعے میں مشغول تھی۔ سرل مقابل کی ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے سنہرے بال سورج کی کرنوں میں سونے کی طرح جگمگا رہے تھے اور وہ غیر معمولی طور پر حسین نظر آ رہا تھا۔

زینے کے دوسری جانب سیکنڈ کلاس کا عرشہ تھا۔ ایک سیاہ فام اینگلو انڈین لڑکی جالی سے ٹیک لگائے بیٹھی ٹرو اسٹوری میگزین کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اس کے قریب فرش پر اس کا بڑا سا دار جلنگ کا بنا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں اس کی

ٹنگ، میک اپ کا سامان اور ایک ٹافی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں چند ہالی ووڈ کے فلمی رسالے اور برطانیہ کا زنانہ رسالہ وومن اور ایک رومانی ناول ٹھنسا ہوا تھا۔ ناول کی چمکدار کاغذی سرورق پر ایک سنہرے بالوں والا ہیرو، نائیلون کے نائٹ گاؤن میں ملبوس، ہیروئن کو گلاب کا پھول پیش کر رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ دیر بعد سنہرا رومانی ناول نکالا۔ سرورق کے ہیرو کے دیکھتے دیکھتے ان کی نظر ہینڈسم انگریز تک پہنچی جو جالی کے ادھر ریلنگ کے سہارے کھڑا بالکل مارلن برانڈو معلوم دے رہا تھا۔ لڑکی نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ناول پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

اس سانولی سلونی لڑکی کا پورا نام مس مارگریٹ ازابل کرسٹینا ٹینر ڈیل تھا۔ یوں اس کے بوائے فرینڈ اور دفتر کے ساتھی اسے میگی کہتے تھے۔ گو اس کے اتنے لمبے چوڑے نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خاندانی روایت کے مطابق اس کی پردادی مارگریٹ ازابل، سر سرل ایشلے کی اور ایک نیٹو عورت کی اولاد تھی۔ سر سرل ایشلے پچھلی صدی کے بنگال کے بہت نامور آدمی تھے قحط کے زمانے میں اس کی ماں ڈھاکے سے کلکتہ آ کر نواب ایشلے کے حرم میں داخل ہوئی۔ مارگریٹ ازابل نے بڑے ہو کر کانپور چھاؤنی کے سارجنٹ جارج ٹینر ڈیل سے شادی کر لی تھی جو اصل نسل گورا تھا اور بوجہ کثرت شراب نوشی جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔ چنانچہ مارگریٹ ازابل اپنے بچوں کو لے کر پھر کلکتہ واپس آ گئی اور اس کا خاندان کلکتے کے نچلے طبقے کی اینگلو انڈین سوسائٹی میں رل مل گیا۔

میگی ٹینر ڈیل کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے، وہ گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ٹیلی فون آپریٹر تھی اور چھٹی لے کر اپنی بیمار خالہ کو دیکھنے آئی ہوئی تھی جو پکسی میں

رہتی تھی اب وہ پکسی سے کلکتے واپس جا رہی تھی۔

وہ ناول کے کلائمیکس تک پہنچی ہی تھی کہ جس میں ہیرو اسپین جا کر ہیروئن کو ایک بدمعاش کاؤنٹ کے چنگل سے چھڑانے والا ہے کہ اسٹیمر کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گھاٹ قریب آ رہا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے عرشے پر کھڑا ہوا ہیرو بھی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا، اس نے جھک کر اپنی سینڈل کے تسمے باندھے۔ اپنے رنگین پھولدار سکرٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں آئینے میں اپنے بالوں کے کرل سنوارے اور بیگ اور رسالے سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرل اور کمال جہاز سے اتر کر کنارے پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جم غفیر ٹرین کی طرف بڑھا جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پر ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں۔ چاروں طرف اہل ہنود کی ریل پیل تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں۔ غریب طبقے کے بدحال ہندو مرد اور عورتیں۔ کمال اٹیچی کیس اٹھائے سرل کے ساتھ ساتھ پٹری پر چلتا رہا۔ ''ان اضلاع میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔'' سرل نے کہا۔

''یہاں کس قدر سکون ہے۔'' کمال نے دوبارہ کہا۔ ''دراصل میری سائیکولوجی اتنی خراب ہوگئی ہے۔ میرے ذہن اور اعصاب پر ہندو مسلم پرابلم اس تکلیف دہ شدت سے مسلط ہے۔ جب میں ان دونوں فرقوں کو کہیں پرسکون انداز اکٹھے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں فساد کیوں نہیں ہو رہا۔''

چڑھائی پر کالی اینگلو انڈین لڑکی سر جھکائے اس کے آگے آگے جا رہی تھی۔ ٹرین کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھا اور رومال سے چہرہ پونچھنے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے سرل نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھاکے پہنچ کر کمال اور سرل اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ روز شام کو وہ کلب میں ملتے اور اکٹھے اپنی جائے قیام واپس لوٹتے۔ کام ختم کرنے کے بعد سرل ڈھاکے کی گلیاں اور کونے کھدرے سونگھتا پھرتا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزرتی ہوئی جھلملیوں والی بند گھوڑا گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً ٹیگور اور سیتا دیوی کے ناولوں کا حوالہ دیتا۔ پیچ در پیچ قدیم محلوں میں سے نکلتے ہوئے ارمنی ٹولہ کے چار سو سال پرانے قبرستان میں جا کر اس نے سارا دن ارمنی تاجروں کی قبروں کے کتبے پڑھنے میں گزارا۔

اسٹیٹ بنک کی عمارت کے جغادری پیل پائے دکھا کر اس نے کمال کو بتایا کہ یہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک روز وہ ویز گھاٹ گئے جہاں دریا کے کنارے ایک شکستہ، کھنڈر ایسی دو منزلہ کوٹھی میں بلبل اکیڈیمی قائم کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے اوپر بلبل کی تصویر آویزاں تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا، ہال میں اندھیرا تھا۔ اندر اور اوپر کی منزل میں بڑے بڑے ڈھنڈار لق و دق شکستہ کمرے پڑے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ زینے کی لکڑی پر برما کا انتہائی خوبصورت نقش و نگار کا کام بنا تھا، وہ سارے کمروں میں گھومتے پھرے۔ نیچے ایک کمرے سے گھنگھروؤں کی آواز آئی، وہ

دونوں اندر گئے جہاں ایک اور خستہ حال کمرے میں، جس کی دیواروں سے پلاستر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناچ کی گت بجا رہے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی مسلمان وائلن بجا رہا تھا۔ دبلے پتلے شری سوشل کمار میتر ا اچک اچک کر لڑکیوں کو ناچ سکھانے میں مصروف تھے۔ کمال دروازے کی چوکھٹ میں مسحور کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پر، یہ چند لوگ، جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھ اور کمینے پن اور ظلم و ستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے سے لمحات کے لیے تال اور سر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں کسی نے نوواردوں پر توجہ نہیں دی اور ناچنے اور ساز بجانے میں مصروف رہے۔ کمال دبے پاؤں وہاں سے لوٹا اور وسطی ہال عبور کر کے پچھلے پورٹیکو کی طرف گیا۔ دو لڑکیاں ماتھے پر کم کم کے بڑے بڑے ٹیکے لگائے دریا کے رخ، شکستہ سیڑھیوں پر خاموش کھڑی تھیں۔ سامنے ایک گائے گھاس چر رہی تھی۔ احاطے کی دیوار کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں۔ اوپر کی منزل میں برآمدے کے جنگلے پر دھوتیاں دھوپ میں سکھانے کے لیے پھیلی تھیں اور رپیتل کی گڈویاں چم چمارہی تھیں۔ یہاں کتنی بے پناہ، انتہا اداسی تھی۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر کیسا الم برس رہا تھا یا ممکن ہے وہ سب بے حد بشاش ہوں۔ کمال ہی کو ہر شے میں غم نظر آتا تھا، وہ سرل کو آواز دیتا ہوا باہر نکل آیا، وہ نواب پور روڈ کی رکشاؤں، چھکڑا ایسی بسوں، فقیروں کی ٹولیوں اور یونیورسٹی کے طلباء کے ایک احتجاجی جلوس میں گزرتے رمنا کی طرف واپس لوٹے۔

ریس کورس کی سڑک پر ڈھاکہ کلب جگمگا رہا تھا۔ آج وہاں گیسٹ نائٹ تھی۔ اعلیٰ طبقے کی موٹریں باہر کھڑی تھیں اور بال روم میں بیگمات رقصاں تھیں جو کلکتے سے ساریاں خرید کر لاتی تھیں اور جن میں سے اکثر کے بچے دارجلنگ اور شیلانگ کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاؤنج میں بڑے بڑے تاجر اور مل اونر بیٹھے تھے۔

ذرا آگے بڑھ کر نیا شاہ باغ ہوٹل تھا جس میں امریکنوں کی فراوانی تھی۔

دوسرے روز وہ سرل کے ہمراہ لانچ کے ذریعے بوڑھی گنگا پر سرکاری کام سے ایک اور ضلعے کی سمت جا رہا تھا۔ سرل کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا پھر معاً اس نے مڑ کر کمال کو مخاطب کیا:

''وہ سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟''

''ہاں''

''یہ بکرم پور ہے۔ یہاں سروجنی نائیڈو اور بی سی رائے وغیرہ کے بے حد خوبصورت گارڈن ہاؤس ہیں اور بے حد خوبصورت مناظر ہیں۔ یہ گاؤں اب سنسان پڑے ہیں۔ ان کے باسی مغربی بنگال ہجرت کر گئے۔ چلتے ہو دیکھنے؟''

''میں قبرستانوں کی زیارت کرتے کرتے عاجز آ گیا ہوں۔ کیا تم مجھے جینے نہیں دو گے۔''

''نہیں۔'' سرل نے جواب دیا۔

''مہاراجہ وکرم سین کی مانند، جو لاش کو کندھے پر اٹھائے مرگھٹ سے آتا تھا اور لاش کا عفریت راستے میں وقت کاٹنے کے لیے روز ان کو ایک قصہ سناتا تھا تم

مجھے قصے سناتے ہو میں نہیں سنوں گا تمہارے قصے۔'' کمال نے ضد سے کہا۔

''وہ دومنزلہ گارڈن ہاؤس نظر آیا تمہیں؟'' سرل نے اسی طرح ساحل کی طرف اشارہ کیا۔'' اس میں رابندنا تھ ٹیگور رہا کرتے تھے۔''

''چلو میں تم کو آج کا منظر دکھاؤں۔'' لانچ پانی پر چکر کاٹ کر نارائن گنج کی سمت مڑ گئی اور کمال نے ریلنگ پر جھک کر سرل کو مخاطب کیا:

''ہم آدم جی جوٹ مل جا رہے ہیں۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں سرل سے کہا۔

''اور وہاں پہنچ کر تم منیجر کے ساتھ لنچ کھانے کے بجائے مزدوروں کی اجرت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا شروع کر دینا، مفسد کہیں کے!!'' سرل نے جواب دیا۔

کمال مسکراتا رہا۔ وہ مل پہنچ گئے عظیم الشان کارخانے جن میں بہاری عورتیں اور بنگالی مزدور کام کر رہے تھے بھاری مشینیں شور مچا رہی تھیں۔ کمال مبہوت بنا مشینوں کو دیکھا کیا۔

پھر وہ لانچ میں سوار ہو کر واپس مڑے۔

ساحلوں پر بیل گاڑیاں پٹ سن کے گٹھے لادے آ رہی تھیں کسان تنکوں والی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ دریا کی سطح پر چاروں طرف چھوٹے بڑے اسٹیمر اور لانچ رواں تھے جن کے انگریزی نام تھے: میری اینڈرسن، اینی لاری، لیڈی فلورا، روز ماؤنٹ۔ انگریزوں کے عہد کی یادگاریں۔ دریائی جہاز رانی آج بھی ایک برطانوی کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔

لانچ دریا کے چوڑے دھارے پر چلتی رہی۔ آسمان کے اودے بادلوں میں سے سورج سرخ تلک کی طرح چمک رہا تھا۔ لہریں سورج کی کرنوں میں سونے کی ایسی جھلملانے لگیں۔ ہزاروں کشتیاں سطح پر حدِ نظر تک تیر رہی تھیں ایک بوڑھی عورت تیزی سے اپنا نوکا کھیتی ہوئی لانچ کے قریب سے نکل گئی۔ دریا پر ایک عظیم الشان، طاقت ور دنیا آباد تھی۔

مغرب کا وقت ہوا۔ کشتیوں میں چراغ جلے۔ پانی پر دیوالی منائی گئی۔ مانجھیوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ہوا اٹھی اور روشنی کی مخالف سمت میں جاتے ہوئے کشتیوں کے بادبان سفید بگلوں کے پروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

یہ سارا منظر ایک عظیم سمفنی تھا۔ بڑا گمبھیر راگ تھا۔ سارا بنگال راگ میں ڈوبا تھا۔ دکھ کا راگ، موت کا راگ، زندگی کا راگ۔

رات کو رمنا کی سڑکوں پر مدھم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دور ایک مندر سے ایک ویشنو بھجن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرل اور کمال برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ساون کی گھٹائیں امنڈ کر اٹھی تھیں۔

سرل نے دوبارہ کتاب کھولی: ''تالاب کے چاروں اور چمپا کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر کالے بادل گرجتے ہیں۔ میرے جی میں جذبات کا دھارا موجیں مارتا ہے جیسے اگست کے مہینے میں ندی میں بہیا آ جاتی ہے۔ ندی تو تو نہیں جانتی کہ کدھر کو جا رہی ہے، پھر اتنی تیزی سے کیوں بہتی ہے؟ او گھڑے! پانی میں بوند کی طرح ڈوب جا۔ میں بھی تیری طرح اتھاہ سمندر میں ڈوب چکی ہوں۔''

سرل قرونِ وسطیٰ کے بنگال لوک گیتوں کے صفحات پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جو صرف بنگال کی بھیگی فضاؤں میں رات کے وقت گھنے باغوں پر چھاتا ہے۔ لیمپ کی مضمحل سی زرد روشنی برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً بجلی کی چمک کے ساتھ زور کی گھٹا اٹھی اور ہوا چلنی شروع ہوگئی۔

''میں کل صبح انڈیا کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔'' کمال کہہ رہا تھا۔ سرل چونکا۔

''معلوم ہے۔''

''تم سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''ہاں۔''

ہوا کا جھکڑ تیز ہوگیا۔ برآمدے کے نیچے اسوک کی شاخیں سرسرانے لگیں۔

''اسوک کا درخت!'' سرل نے گوجا اسے مخاطب کیا۔ ''جسے کوئی حسین لڑکی چھو لے تو اس میں فوراً پھول کھل جاتے ہیں!''

کمال نے بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے کرسی اندر کو گھسیٹ لی۔

''کوا کالا ہے۔'' سرل نے پڑھا۔ ''کوئل اس سے زیادہ کالی ہے اور رنجا کھالی ندی کا پانی اس سے بھی زیادہ کالا ہے۔ پر اس کے بال سیاہ ترین تھے۔''

بارش کی بوندوں نے باہر تالاب میں جل ترنگ بجانا شروع کر دی۔ بجلی چمکی تو باغ کا ایک ایک پتا ایک پل کے لیے اس میں جگمگا اٹھا۔

''چمپک کے درختوں کے پار، بوڑھی گنگا کی موجیں بیکار شور کر رہی ہیں۔'' سرل نے کہا۔ ''ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہاری آواز کی طرف سے کان بند کر

لیے ہیں میں اپنی کشتی کنارے سے باندھ چکا ہوں۔''

''اچھا میں کہہ دوں گا۔'' کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

دوسری صبح کمال نے سرل ایشلے کو ڈھاکے میں چھوڑا اور فلائنگ کلب کا طیارہ لے کر کلکتے پہنچا۔ اس نے سوچا اپنے مرحوم ماموں نواب عباس رضا بہادر کے گھر والوں سے ملنے دت ہاؤس جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

وہ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس افسر کو اپنی اور آتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات کو چھوا اور مطمئن ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹرین چلا گی۔ بردوان، آسنسول، پٹنہ، مغل سرائے، الہ آباد، لکھنؤ، ٹرین ایک اجنبی سرزمین میں چل رہی تھی۔ سال بھر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا، اب اس میں وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی کی طرف ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو۔ تم پاکستانی ہو۔ مسلمان۔ جاسوس۔ مسلمان جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ غدار۔ جاسوس۔ غدار جاسوس۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین حسب معمول بڑی شان و شوکت کے ساتھ چار باغ جنکشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چار باغ۔ لکھنؤ۔ لکھنؤ۔

دو دن وہ عزیزوں کے پاس ٹھہرا۔ اب اسے خیابان کے کلیم کی خانہ پری کے

سلسلے میں ضروری کاغذات لینے دہرہ دون جانا تھا۔تیسرے دن وہ لکھنؤ سے چلا۔ (یہاں اب کیا رکھا تھا، وہ کس کے لیے یہاں ٹھہرتا، وہ بدل چکا تھا لہٰذا لکھنؤ بھی بدل گیا تھا) جب ٹرین مراد آباد کے قریب پہنچی تو اسے معاً یاد آیا کہ لکھنؤ میں سیتا ڈکشت نے اسے بتایا تھا کہ چمپا ولایت سے لوٹ آئی ہیں اور اپنے چچا کے پاس مراد آباد میں مقیم ہیں۔اس اطلاع پر کمال نے ویزا پر مراد آباد کا اضافہ کروالیا تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی تو وہ اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا۔اسٹیشن سے باہر آ کر اس نے ایک تانگہ لیا اور سیتا ڈکشٹ کا بتایا ہوا پتا دیکھنے کے لیے جیب سے نوٹ بک نکالی۔پھر اس نے تانگے والے سے کہا: ''کٹھ گھر چلو۔''

تانگہ روشن بازاروں اور کالجوں اور ہسپتالوں کی بلند عمارتوں کے سامنے سے گزرتا ایک سمت کو چلا۔سڑک پر ٹھیلے چل رہے تھے اور پردے دار ریڑوے اور ڈولیاں اور یکے۔لڑکے بالے۔برقعہ پوش عورتیں سلیپر گھسیٹتی گلیوں میں گھس رہی تھیں۔تانگہ اب ایک محلے میں داخل ہوا جو شاید کمال کی منزل مقصود تھی۔ دروازوں کے آگے ٹوٹے پھوٹے چبوترے تھے اور مسجد کی منڈیر پر ایک چیل بیٹھی اونگھتی تھی، یہ چمپا باجی کا محلّہ تھا؟

وہ تانگے سے اترا سامنے بڑا سا پرانے وقتوں کا پھاٹک تھا جس کے دروازے میں ایک چھوٹی کھڑکی کھلتی تھی۔اندر سلین تھی اور بھوسے کا ڈھیر۔دو تین کھٹیاں پڑی تھیں۔اندر ایک اور بے حد تنگ و تاریک زینہ تھا جو شاید اٹھارہویں صدی میں بنا ہوگا پھاٹک میں وہ چاروں طرف آوازیں دیتا پھرا، جب کسی نے اس کو جواب نہ دیا تو وہ ہمت کر کے خود ہی اس زینے پر چڑھ گیا۔دوسری منزل پر چھوٹا

سا آنگن تھا جس میں چینی کے گملے رکھے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور ایک بڑا کمرہ جو شاید اس گھر کی بیٹھک کا کام دیتا ہوگا۔ اس میں صرف ایک کرسی پڑی تھی اور ایک مسہری۔ ایک الماری میں خدائی فوجدار اور اودھ پنچ کی جلدیں رکھی تھیں۔ دروازوں میں ان گنت اودے، نارنجی، سبز اور سرخ شیشے لگے تھے۔ باہر کے رخ چھجا تھا جو پھاٹک کے عین اوپر شہ نشین کی طرح نظر آتا۔ چھجے میں کھڑے ہو کر اس نے پچھّم کی اور نظر ڈالی۔ گلی بے حد صاف تھی، اس نے غور سے دیکھا۔ نیچے مسجد میں پیش امام نماز پڑھ رہے تھی۔ ان کی جا نماز کے سامنے سجدہ گاہ کے قریب تام چینی کی رکابی میں کچھ رکھا تھا اور محلے کے تین چار لڑکے بالے ''بٹ کلیجی، بٹ کلیجی'' کہہ کر ان کو چڑا رہے تھے۔ امام صاحب سلام پھیر کر جلدی سے اٹھے۔ لڑکوں کو ڈھیلے سے مار بھگانے کے بعد پھر جا نماز پر واپس چلے گئے، نا قابل بیان سناٹا سارے میں طاری تھا۔ اسی مکان کے دائیں ہاتھ ایک سرسبز ڈھلان پر قبرستان تھا۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ زندہ روحیں، مری ہوئی روحیں، یہاں کتنی نحوست تھی۔ مردوں کا شہر۔ چمپا باجی تم یہاں کہاں ہو؟ قبرستان کے سرے پر چھپر تھا اور نیم کا درخت جس کے نیچے بکری بندھی تھی۔ چھپر کے اوپر کھڑکی میں سے کوئی لڑکی جھانک رہی تھی۔ کمال کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے جھٹ کھڑکی بند کر دی۔ وہ زینے سے نیچے اتر کر دوسرے پھاٹک کے سامنے آیا۔ اس کی بھی وہی وضع تھی۔ رنگ برنگے شیشوں والا شہ نشین۔ نیچے دربان کے کھڑے ہونے کے لیے طاقچے، شکستہ چبوترہ۔ اس نے پھاٹک کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی۔

مایوسی اور ڈیپریشن کی وجہ سے کمال کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی۔

''کون ہے؟'' دھاری دار گبرون کا سیاہ تنگ پائجامہ پہنے ایک بڑھیا نے اندر سے جھانکا۔

''میں ہوں۔''

''گے کیا بات ہوئی۔اے نام تو بتاؤ بھیئے۔''

''میں ہوں کمال رضا۔پاکستان سے آیا ہوں۔''

بڑھیا نے کچھ دیر بعد واپس آ کر کھڑی کھولی۔

''آؤ۔آ جاؤ میاں۔'' اس نے کہا

وہ اندر آ گیا۔انگنائی میں اینٹوں کا فرش تھا۔دیوار کے ساتھ کیاری میں کسی زمانے میں پودے رہے ہوں گے،اب وہ ویران پڑی تھی۔باورچی خانے کے سامنے مرغیوں کا ڈربہ تھا۔مرغیوں کے پر ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔سامنے بڑا دالان تھا۔دالان میں تخت،اس پر چمپا بیٹھی تھی۔

''ارے لو۔کمال،بھئی حد ہوگئی!''

''چمپا باجی!''

''تم! گڈ گاڈ!!'' وہ آہستہ سے اٹھی اور معذرت طلب انداز میں جلدی جلدی تخت پوش ٹھیک کرنے لگی۔

''میں سامنے والے مکان میں گھس گیا تھا۔'' کمال نے کہنا شروع کیا۔

''میرے گھر والے سب چچا میاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں،وہیں چلو،وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

اس نے الگنی پر سے دلائی اتاری اور اسے بڑے سلیقے سے اوڑھا تا کہ سر سے پاؤں تک دلائی اسے ڈھانپ لے اور گھونگھٹ سا نکال کر کمال کے ساتھ گلی میں آ گئی۔ ''ہمارے یہاں برقعے کا رواج نہیں ہے اب تک چادریں اور دلائیاں ہی اوڑھی جاتی ہیں۔'' اس نے گویا تشریح کی، وہ قدیم مسجد کے پاس پہنچ کر دوسری گلی میں مڑ گئی جو قبرستان کی ڈھلان کے برابر سے گزرتی تھی، یہ بھی بے حد صاف ستھری تھی۔ دیواروں میں گھاس اور پیپل کے درخت اگ آئے تھے۔

''یہ؟'' کمال نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم ہی لوگ ہیں۔'' چمپا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔

''یہیں جیتے ہیں اور یہیں مریں گے۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

چند قدم چل کر ''دیوان خانہ'' آ گیا۔

''چچا میاں کا مکان؟''

''ہاں۔''

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ آنگن میں بہت سے تخت بچھے تھے۔ ویرانی کی شدت سے جگہ سنسنا رہی تھی۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا؟'' کمال نے ذرا دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

''نہیں'' چمپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''یہ امام باڑہ ہے، یہ جو تخت پڑے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اس میں ہمارے یہاں کی مشہور تختوں کی مجلس ہوا کرتی تھی۔''

اب انہوں نے پھر ماضی کی گردان شروع کر دی، کمال نے بوکھلا کر سوچا۔

''اصل مکان اندر ہے۔'' چمپا نے بات جاری رکھی۔ ''چلے آؤ۔تم سے پردہ کوئی نہیں کرے گا۔''

وہ ڈیوڑھی میں سے گزرتا اندر چلا گیا۔صحن میں کرسیاں اور چارپائیاں بچھی تھیں، ایک چارپائی پر کڑھا ہوا پلنگ پوش پڑا تھا۔باورچی خانے میں بگھار کی تیز مہک آرہی تھی، دو تین غیر واضح، غیر اہم سے لوگ ادھر ادھر بیٹھے تھے۔بادل گھرے ہوئے تھے مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے شدید حبس ہو گیا تھا، برساتی کیڑے چراغوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

''چا ابا.........یہ کمال ہیں..........''نیم تاریکی میں چمپا کی آواز آئی۔

''آؤ......آؤ......بیٹھو میاں......بڑی عزت افزائی کی تم نے ہماری۔'' چا ابا نے، جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لالٹین اٹھا کر ایک لڑکی باورچی خانے کی اور لپکی۔ایک اور لڑکی دالان میں میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔یا اللہ! مڈل کلاس اس قدر ڈیپریسنگ ہوتا ہے؟ کمال نے لرز کر سوچا۔آنگن میں آنے والوں کی آہٹ سن کر دالان والی لڑکی نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا۔کمال نے جلدی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔اس نے مسلمان مڈل کلاس لڑکیوں کے فرسٹریشن اور رومان پرستی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکی یا وہ لڑکی جو باورچی خانے میں اس کے لیے چاء بنا رہی تھی اس کے ساتھ وقتی رومان شروع کر دیں اور بعد میں اسے لمبے لمبے کھرے لکھا کریں۔محبت نامے۔

اس کی کوفت میں اضافہ ہوتا گیا۔

''یہ میری کزنز ہیں دونوں۔'' چمپا اسی آواز میں پائینتی بیٹھی اسے بتا رہی تھی۔

''وہ والی زیب النساء ہیں انہوں نے دلی سے لائبریری سائنس میں ایم۔اے کیا ہے۔ چھوٹی والی مریم زمانی ہیں، یہ اگریکلچر میں ایم۔ایس۔سی کر رہی ہیں۔ جب میں انٹر کے بعد لکھنؤ پڑھنے گئی تھی یہ دونوں کی دونوں بالکل ذرا ذرا سی تھیں۔ کس قدر تیزی سے گزرتا ہے، تم کو چپ کیوں لگ گئی؟''

''کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔''

پھر چچا میاں اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ وہی پرانے قصے۔ پاکستان، ہندوستان ہماری تو میاں بدھیا بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔

''یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟'' کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔

''ساری آبادی کہاں چلی گئی۔''

''وہیں جہاں تم چلے گئے۔'' چچا میاں نے جواب دیا۔ ''کھوکھرا پار کے راستے سے سب نکل لیے، روہیل کھنڈ خالی ہو گیا۔ بس ہم چند بڈھے ٹھڈے باقی رہ گئے ہیں۔ دو تین سال کی بات اور ہے، جب ہم مر جائینگے تو یہاں ہمارے بعد گدھے لوٹیں گے۔''

کمال اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مریم زمانی نہایت بے تعلقی سے چاء بنا کر لا رہی تھی۔ اس کا رومان شروع کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔ کمال نے ذرا اطمینان اور ذرا مایوسی سے سوچا۔

''پاکستان کے کیا حال ہیں؟'' چچا ابا پوچھتے رہے۔ ''سنا ہے یہاں سے دھڑنے

جولاہے جا کر وہاں لکھ پتی ہو گئے، اپنے کو سید کہویں ہیں اور کوٹھیوں میں رہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے میاں؟ میرے بھانجے نے لکھا ہے کہ وہاں ہر جگہ پنجابیوں نے یو۔ پی۔ والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اندھیر گردی مچی ہے۔ میاں ہم تو تباہ ہو گئے تباہ اور وہاں بھی کون سے لڈو مل جائیں گے۔ میرے بھانجے کا خط کل ہی آیا ہے جہلم سے، اس نے شعر لکھا ہے، وہ کیا شعر ہے زیبا بٹی؟''

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ہی...... ہی۔ انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ''مریم سکٹ بھی تو لاؤ بھیّے کے لیے۔ کمال میاں اسی ڈیوڑھی پر چار چار ملازم موجود تھے، اب یہاں سارے میں الو بول رہا ہے۔''

کمال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے مسلمان قوم کے متعلق پھر اپنی محبوب تھیوری دل میں دہرانا شروع کر دی۔ یہی بڑے میاں ۴۶ء میں سٹی مسلم لیگ صدر رہے ہوں گے۔ سن اڑتالیس تک سوچتے ہوں گے کہ لشکر اسلام سری نگر فتح کرنے کے بعد لال قعلہ، دلی پر فتح کر پرچم لہراتا یہاں کے مسلمانوں کو لبریٹ کرنے کے لیے بس اب آیا ہی چاہتا ہے، کمال کا دم گھبرانے لگا۔

''یہاں بجلی کی روشنی اب تک نہیں آئی۔'' چمپا غیر شخصی آواز میں بتلا رہی تھی۔ محلے میں تو کب کی آ چکی ہے جہاں پھوا ماں کی کوٹھی تھی، وہ چلی گئیں حیدر آباد سندھ مع اپنے گھر والوں کے لہذا کوٹھی کسٹوڈین نے لے لی۔ اس میں سکھوں نے اسکول کھول کر بجلی منگا لی ہے ہمارے مکانوں میں نہیں آ سکی۔ چمپا کی آواز نیم تاریکی میں ڈرون کرتی رہی۔

''بجلی کے لیے میاں پیسے چاہئیں۔'' چا ابا نے چاء کی سینی زور سے اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ سینی کا توازن قائم نہ رہ سکا، جگ ٹوٹنے سے سارا دودھ انگنائی کے فرش پر بہہ گیا۔ چمپا اسے افسوس سے دیکھتی رہیں۔ ''اب اتنی رات گئے دودھ کہاں سے آئے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''اس پر افسوس نہ کرو چمپا باجی۔'' کمال نے گہری آواز میں آہستہ سے کہا۔

چمپا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

کمال نے چمپا کو آج ان کی زندگی کی ایک اور سیڑھی پر ایک پس منظر میں دیکھا جو ان کا حقیقی پس منظر تھا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھ بند کر لی۔ لکھنؤ، پیرس، کیمبرج، لندن، روم اور میڈرڈ والی چمپا، مراد آباد کے محلے کٹھ گھر کے اس نیم تاریک مکان والی چمپا، مڈل کلاس چمپا، بہادر چمپا عرف نئے ہندوستان کی عاقلہ ورولا ور حسینہ۔ واہ بچیا۔ تمہارا جواب نہیں۔ مانتا ہوں۔

کمال مراد آباد میں دو دن رکا۔ رات کو اسے اسی اودے اور نارنجی شیشوں والے کوٹھے کے کمرے پر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سب سے پہلے جا پہنچا تھا۔ آدھی رات تک وہ چھجے میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا جہاں چاند نے اپنی مٹیالی روشنی مکانوں کی چھتوں، مسجدوں کے میناروں اور نیم کے درختوں پر پھیلا رکھی تھی۔

دوپہر میں قیلولے کے لیے اس کا کھٹولہ زینے کی آخری سیڑھی پر بچھا دیا گیا جہاں رام گنگا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔

''سنا ہے تمہارے یہاں ہندوستان کی ساریوں کی بڑی مانگ ہے۔'' چمپا باجی نے آکر دہلیز پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بشاشت سے بات شروع کی۔

''تمہاری ہم وطن اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین یہاں آتے ہی کپڑے کی دکانوں پر یلغار کرتی ہیں۔ سنا ہے تمہارے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی۔''

''کیا اعلیٰ سوسائٹی کی گردان کر رہی ہو۔'' کمال نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹی۔ ''یہ نہ بھولو چمپا باجی کہ خود تم کو طبقاتی شعور حاصل کرنے میں پورے پندرہ سال لگے۔''

چمپا زور سے ہنسی۔ ''طبقاتی شعور کی بات کرنا ہے تو میری کزنز سے گفتگو کرو۔ زیبا اور مریم، بڑی بھاری اسٹوڈنٹ ورکرز ہیں دونوں۔ دلی کے سالانہ انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹول میں ہمیشہ یہ لوگ جانے کیا کیا کرامات کرتی ہیں۔ جھانکیاں عوامی ناچ، موسیقی کے مقابلے۔ زیبا نے پچھلے سال کے فیسٹول میں سنگتراشی میں پہلا انعام حاصل کیا۔''

کمال کی سمجھ میں آ گیا۔ اس کا خدشہ بے کار تھا، یہ مڈل کلاس لڑکیاں اپنے فرسٹریشن اور اپنی رومانیت پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اگر وہ چمپا کی جگہ ہوتیں تو شاید اسی کی طرح رومان پرست ہوتیں، یہ نئی لڑکیاں تھیں۔ چمپا عبوری دور کی لڑکی تھی اس لیے لامحالہ اس نے تجربے کیے اور ٹھوکریں کھائیں۔

زیبا اور مریم، ہمت والی لڑکیاں۔ ان کے دماغوں میں کوئی الجھن نہیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دیس میں ایسی لڑکیاں نہیں، وہاں ابھی عبوری دور بھی پوری طرح شروع نہیں ہوا۔

''کاش میں ۱۹۴۱ء میں ان دونوں کی ایسی بن گئی ہوتی۔'' چمپا نے گویا کمال کے دل کی بات پڑھ لی۔ ''اب ہم لوگوں کے اختیار میں تو واقعات نہیں ہوتے۔''

کمال نے جواب دیا۔ اس نے محسوس کیا وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔ چمپا، جو اس کے سامنے چوکھٹ پر بیٹھی ہے، کتنی بوڑھی عورت ہے۔ ہم دونوں نے من کی دنیاؤں کی کتنی لمبی سیاحت کی۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ اس وقت ایک اجنبی شہر مین ایک نیم تاریک زینے پر بیٹھا تھا۔ دریا پر سے آتی ہوئی برساتی ہوا اس کے بال پریشان کر رہی تھی۔ وطن کی برسات، مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزے کی معیاد ختم ہونے والی تھی، کل سویرے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد، کٹھ گھر، یہ زینہ، چمپا احمد، زیبا، مریم، چاچا ابا۔ سب یہیں رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر اسے آنسو بہانا چاہیے؟ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آ گیا ہے۔ ضبط، توازن اور سکون، گریک آئیڈیلز............ اسے ہری شنکر کے الفاظ یاد آئے۔

چمپا نے پھر اس کے دل کی بات پڑھ لی اور اس نے پرانی عادت کے مطابق دہرایا: ''کہاں ہے تمہارا ہمزاد ہری شنکر؟''

''چمپا باجی'' اس نے ذرا غصے سے کہا: ''ہری شنکر اب میرا ہمزاد نہیں رہا، مجھے کیا معلوم وہ اس وقت کہاں ہے۔''

''کیوں اسے خط نہیں لکھتے؟''

''چمپا باجی'' اس نے پہلو بدل کر کہا، ''تم کو یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ میں دوستوں کو خط نہیں لکھا کرتا۔ میں ہری شنکر سریواستوا کو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں؟''

''اب تک جذباتی ہو!''

''نہیں۔'' اس نے بل کھایا۔ چمپا نے اسے پھر چوری کرتے پکڑ لیا تھا۔

''ہٹائیے چمپا باجی۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''میں اس سارے انڈو پاکستان میلوڈراما سے، جو چاروں طرف کھیلا جا رہا ہے، قسم خدا کی عاجز آ چکا ہوں۔ ہری شنکر آج کل شاید بنگلور میں ہے، اب میں کیا جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤں؟ لاحول ولا قوۃ۔''

''تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا ''تم ہری شنکر سے ملنا نہیں چاہتے کیونکہ تم کو ڈر ہے کہ واقعی جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ گے۔ اچھا پھر مجھ سے ملنے کیوں آئے؟ یہ بھی بڑی سخت میلوڈریمٹک بات تھی۔''

''آخر انسان ملتا ملاتا ہی رہتا ہے پرانے دوستوں سے۔'' کمال سے کوئی اور معقول جواب نہ بن پڑا۔ ''اور پھر مراد آباد راستے میں ہی پڑتا تھا۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹین کے چھجے پر برسنے لگیں۔ گلی کی مٹی کی سوندھی خوشبو اڑ کر کمال تک پہنچی۔ ایک عورت تنگ پائجامہ پہنے، آم کی کھانچی سر پر اٹھائے، آواز لگاتی نیچے سے گزری۔ چمپا دہلیز پر بیٹھی موکھے سے باہر دیکھتی رہی۔

بہت دیر سے کمال ایک سوال دل میں لیے بیٹھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ آخر اس نے دبی زبان سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا:

''چمپا باجی اب تم کیا کرنے والی ہو؟''

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہم کسی سے اس کے مستقبل کے بارے میں کس طرح پوچھ سکتے ہیں!

''میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں بالآخر بنارس واپس جا رہی ہوں۔ تم کو یاد ہے میں نے کیم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں تم سے کہا تھا: میں واپس جانا چاہتی ہوں، کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈھنا کس قدر زبردست حماقت تھی۔ میں خود ہی بنارس لوٹتی ہوں، جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے؟''

''ہاں۔ مسرت کا شہر، وہ بھی ایک نہ ایک دن واقعتاً مسرت کا شہر بنے گا۔ سارے شہروں کی طرح اس **ملک** کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟'' اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا۔ ''رقاصہ کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں .... یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جو اب کام کرنا چاہتی ہے۔''

وہ خاموش ہو گئی، کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا۔

''کمال!'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمہارا وطن ہے۔'' اس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑیں۔ ''اور تم کیوں چلے گئے؟ کیا میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عمدہ نہ مل جائے گا! دیکھو میں پیرس اور کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں۔''

ہرسنگھار میں رنگے دوپٹے اور پتمبری ساڑیاں پہنے چمپا کے رشتے دار لڑکیاں

نیچے دالان میں پکوان چڑھا رہی تھیں۔ ''بھئی کچھ یہاں بھی بھجواؤ۔'' چمپا نے کھڑکی میں سر نکال کر آواز دی۔

''اچھا بجیا۔ابھی تھمیے۔'' پھر انہوں نے ایک گیت شروع کر دیا۔ جھولا کن نے ڈالوری امریاں۔

کمال نے کھٹولے پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بچپن سے یہ گت سنتا چلا آرہا تھا۔ آتے ہی اس کے خاندان کی لڑکیاں بھی کڑھائی چڑھا کر یہ گیت الاپنا شروع کر دیتی تھیں۔

زینے پر پائچے کی جھونک دکھلائی دی۔ زیبا پھلکیوں کی پلیٹ لے کر اوپر آرہی تھی۔ سج سج وہ اندر آئی اور پلیٹ فرش پر رکھ کر گنگناتی ہوئی پھر نیچے اتر گئی۔

چمپا چوکھٹ پر بیٹھی رہی۔ ''تم سوچ رہے ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا، ''کہ اب میرے دوار کون آئے گا۔ لیکن کمال میں سمجھتی ہوں، جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے، میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سراغ پالیا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو چمپا باجی۔''

نیچے حوض میں برکھا کی پھوہار کا جھالا بج رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارے میں ہریالی اور تروتازگی چھا گئی تھی۔ گلیوں میں ننھی ننھی ندیاں بہہ رہی تھیں، چھجوں اور پرنالوں سے پانی کے آبشار گر رہے تھے، نیچے آنگن میں پانی کی چھوٹی سی شفاف جھیل بن گئی تھی، اوپر چینی کے گملوں میں لگے ہوئے پودے پانی میں لہلہا رہے تھے۔ ''یہ میرا جل محل ہے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا۔ ''یہاں میرے آنسوؤں کا پانی بہتا ہے۔''

دالان میں لڑکیوں کے دوپٹے لہرائے، ہلکی کاسنی، زرد اور سبز رنگ کی چنری اوڑھے ایک لڑکی نے، جو شاید مریم تھی، میرا کا گیت شروع کر دیا۔

''میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں'' چمپا کہتی رہی۔ ''اگر میں خدا کا خاص الخاص بندہ ہوتی۔ میرا، ملتا بائی، سینٹ صوفیہ۔ تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے، میرا لبادہ میرے مقدس خون سے سرخ ہوتا، میرے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوتیں، میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا، مجھے وش کے پیالے اور سانپ کے پٹارے بھجوائے گئے ہوتے، لیکن میں محض چمپا احمد ہوں۔ میرے زخم کسی کو نظر نہیں آسکتے کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں، وہ کمزور اور فانی انسان ہیں۔ چشم بینا نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہنستے بھی ہوں جبکہ سینٹ صوفیہ کی پرستش کی جاتی ہے۔''

ہوا کے زور سے بہت سی جامنیں ٹپ ٹپ کرتی سیڑھیوں پر آن گریں۔ چمپا نے اپنے بالوں میں سے ایک زرد پتا نکالا۔

''کمال'' اس نے سوچتے ہوئے کہا، ''تمہیں وہ لنکا کی آرٹسٹ لڑکی یاد ہے؟ برسوں تک وہ کینوس پر کینوس رنگتی چلی گئی۔ دنیا کے نگارخانوں کی اس نے خاک چھانی، لندن اور پیرس میں اس کی نمائشیں ہوئیں جن میں بیویاں نئی نئی ساریاں اور فراک پہن کر آتیں، معزز مہمان تقریریں کرتے، تصویریں لی جاتیں، پریس کے نمائندے اس کا انٹرویو کرتے، وہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کرتی، آخر میں سب چلے جاتے، اس کا ہال خالی ہو جاتا، اپنی پینٹنگز کی معیت میں وہ تنہا رہ جاتی اور چپ چاپ باہر نکل کر بس میں بیٹھتی اور گھر کی راہ لیتی۔ تین

مرتبہ میں نے یہی منظر دیکھا۔''

''میں نے طرح طرح کے جینئس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت بتایا۔ان میں سے ہر ایک کبھی اپنی جگہ خوش ہوتا کبھی رنجیدہ۔تم خوش کیوں ہو؟ میں ہر ایک سے پوچھتی۔اتنے ذہین ہوتے ہوئے بھی بشاش ہو، حد ہے۔میں برا مان کر کہتی، مگر آخر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں اپنے غم کو جنہوں نے دنیا کے غم میں سمو دیا تھا۔کس قدر آسان بات تھی۔پہاڑ کے نیچے پہنچے تو معلوم ہوا ہم خود اور ہمارا ذاتی الم کس قدر حقیر شے ہے۔''

''آٹھ سال بعد تمہاری طرح میں اپنے وطن واپس لوٹی اور میں نے یہاں کے حالات دیکھے۔ایسی باتیں دیکھیں جن سے میرا سر ندامت سے جھک گیا اور میرا دل دکھی ہو گیا۔میرے سامنے مسائل کا بہت اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔تب جانتے ہو کیا ہوا؟ چیونٹی نے کیا کیا۔اس نے کانوں مین ہاتھی لٹکا کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔''

''اب بھی معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں کیا کرنے والی ہوں؟''

دوسرے روز شام کو وہ وہاں سے چلا۔اس کے لیے تانگہ منگوایا گیا۔چمپا اور مریم اور زیبا اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئیں۔''ہم اب تک اس محلے میں زبردست پردہ کرتے ہیں ورنہ چا ابا کو خواہ مخواہ صدمہ ہو گا اس لیے ہم بوجہ پردے کے تم کو اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں جا سکتے۔''چمپا نے ہنس کر کہا۔

کمال تانگے پر بیٹھا۔تانگہ گلی سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اور کمال نے دیکھا: چمپا باجی ایک بار پھر دور کھڑی رہ گئیں، ٹوٹے ہوئے مکان کی دہلیز پر۔اسی

طرح اس نے ان کو اوکسفرڈ اسٹریٹ پر چوزے کی سرائے کے شیشوں والے دروازے کے پیچھے تنہا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مرتبہ گل فشاں کے پھاٹک کے سامنے اندھیری سڑک پر کھڑی رہ گئی تھیں جب بھیا صاحب ان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔

لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں، اب وہ ہجوم کا حصہ تھیں۔ انہوں نے بالآخر غیر مشروط طور پر ہجوم کی دوسراتھ قبول کر لی تھی۔ چند سال پہلے کمال سوچا کرتا تھا: وہ آگے جا رہا ہے۔ چمپا پیچھے رہ گئی ہیں، وہ دور نکل جائے گا......نئی دنیائیں، نئے خواب، عزائم، آئیڈیلز۔

مگر آج، اس سمے، اس نے دیکھا کہ وہ آگے نہیں جا رہا، وہ مع اپنی دنیا کے مسلسل، مستقل مراجعت میں ہے اور تنہا ہے۔ چمپا، جواب تنہا نہیں، جلوس میں شامل ہیں، آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے محلے کی گلیاں، مسجد کے مینار، زیبا اور مریم، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، ٹھیلے والے، برقعہ پوش عورتیں، سب ہیں۔ چمپا باجی ان سب کی ساتھن بن گئی ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔ آج نہیں، کل سہی۔ ایک نہ ایک روز بہت جلد یہ لوگ ترقی یافتہ ہو چکے ہوں گے۔ اس نکتے پر پہنچ کر سرل کے فلسفے کے سارے غیر مرئی تار جھن جھنا کر ٹوٹ گئے۔

تانگہ اب قاضی کے بازار سے گزر رہا تھا، دکانیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ چاء خانوں میں ریڈیو بج رہے تھے، سینما گھروں کے آگے ہجوم تھا، مغرب کے آسمان پر ایک آدھ کنکوا اڑتا ہوا دکھلائی دے جاتا تھا۔

کیا کروں پارٹنر.........ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا، میرا بڑا افسوسناک خاتمہ ہوا ہے۔

ٹرین شوالک کی پہاڑیوں سے گزرتی ہمالیہ کے ہرے بھرے دامن میں پہنچی۔ ہردوار، رشی کیش، ہرکی پوڑی، دیودار کے جنگل، بانسوں کے جھنڈ، جھرنے، پہاڑی ندیاں، مندر، سادھو، چٹانیں، پھولوں سے لدے ہوئے درخت، دہرہ دون کے اسٹیشن پر اتر کر وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ کلیم اور منقولہ اور غیر منقولہ کے کاغذات اور مکان کے قبالے نکالے گئے۔ سرکاری قسم کی گفتگو ہوئی۔ پھر اس نے ڈالن والا کی خوبصورت سڑکوں پر گھومنا شروع کیا۔ اس نے آخری بار مکانوں کے ناموں کی تختیاں پڑھیں۔

سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

''یار ہری شنکر۔'' کمال نے کہا۔

''ہاں یار۔''

''یار یہ پروفیسر ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں خدا کی قسم۔''

اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہی۔ آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے۔ چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

''ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔'' کمال نے

کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر جذبات زدہ ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔''

''خوابستان۔ لاحول والاقوۃ۔''

''مگر تم خود گل فشاں میں رہتے ہو۔''

''جانتا ہوں۔''

''یار کمال۔''

''ہاں یار۔''

''ذرا سوچو لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں، یہاں سے وہاں تک، ایک سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔''

''ہاں یار بڑی عجیب بات ہے۔''

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوص کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ''ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو، حد ہے۔''

''اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ معنی کے معنی............''

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے ''دلستر ن'' ''دولت'' ''شیم روک'' ''راج محل''

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کی مہلک سارے میں اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمبی سی کار آ کر اس کے قریب رکی، وہ چونک پڑا۔ آنکھیں مل کر اس نے چاروں اور دیکھا ہری شنکر غائب ہو چکا تھا۔ یہ ۴۲ء نہیں تھا، وہ ۵۶ء کے دہرہ دون میں موجود تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں ملیں، وہ تو اپنے ہی مکان کے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ کار میں سے ایک خوش پوش سردار جی اتر کر اس کی طرف بڑھے۔

''آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں جی؟''

''میں.........میں.........'' وہ گڑبڑا گیا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سردار جی شاید اسے ٹھگ سمجھ رہے تھے جو ان کے ڈرائنگ روم سے ریڈیو چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔ اس نے دوبارہ پھاٹک میں لگی ہوئی سنگ مرمر کی تختی پڑھی: نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور۔

یہ اس کا مکان تھا، وہ پلیا پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ اس نے ثبوت کے طور پر قبالے کے کاغذات نکال کر سردار جی کو پیش کیے اور کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''اوہ.........آپ موو ایبل پراپرٹی کے سلسلے میں آ رہے ہو۔ تشریف لاؤ جی تسی۔''

وہ سردار جی کے ساتھ باغ کی سڑک پر داخل ہوا۔

''آپ کا اسٹور روم حفاظت سے بند ہے جی۔ کنجی لائے ہو آپ؟''

''جی ہاں۔''

ڈرائنگ روم میں لے جا کر سردار جی نے اسے چاہ پلائی اور کھانا کھلانے پر مصر رہے۔

سردار جی راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہاں بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ دیر تک وہ اپنے وطن کی یاد میں رویا گایا کیے۔ کمال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''باکس روم کھولنے میں کل صبح آ سکتا ہوں؟''

''ضرور جی اپنا ہی گھر سمجھو۔'' سردار جی نے کہا اور اپنی کار میں بٹھال کر اس کی قیام گاہ تک پہنچایا۔ صبح کو وہ پھر ''خیابان'' پہنچا۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ باغ میں دو نوجوان لڑکیاں ننگے پیر بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ سردارنی جی نوکروں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں اور بھینسوں کی سانی کروا رہی تھیں۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا، بڑا پرسکون منظر تھا، وہ پہلو کے راستے سے گزرتا اسٹور روم پہنچا اور تالہ کھولنے سے پہلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہاں ان سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا وہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی ''گم شدہ نسل'' کا ایک فرد تھا۔ اس نے محسوس کیا اس کے خاندان والوں کی دنیا خزاں زدہ جنگلوں، گلاب کے پھولوں، پہاڑی کالجوں اور تیسرے پہر کی چاء میں چاندی کی جھلملاتی ہوئی چاءدانی کی دنیا تھی۔ سامنے دیوداروں کے درمیان سے جو پگڈنڈی گزرتی تھی اس کے خاندان کی خواتین رنگین چھتریاں سنبھالے اس پر چلتی ہوئی کسی پرانی ترکی یا یورپین افسانے کی خوابناک فضاؤں میں تیرتی معلوم ہوا کرتی تھیں۔

''خیابان'' میں چھ بڑے بڑے کمرے تھے جن کے چاروں اور مزید کمرے اور برآمدے اور گیلریاں۔ جاڑوں میں جب کبھی وہ یہاں آتے وسط کے کمرے میں فرش پر گدے بچھا دیے جاتے۔ پہاڑی خانساماں فقیرا چاء کی کشتی لا کر آتشدان کے سامنے رکھ دیتا۔ آنگن میں چمپا کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کے تین طرف برآمدے تھے جن میں سے ایک کے سرے پر یہ اسٹور روم تھا۔ آنگن میں اس طرح کا گھریلو ماحول رہتا جس کا ذکر سرت چندر کے ناولوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں میں کمال اور طاعت کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ رنگ بھرنے کی کتابیں، پریوں کی کہانیاں، گڑیاں اور میکینو سیٹ، جب کبھی یہ گودام کھلتا تو سب بچوں کی طرح شدید تجسس اور اشتیاق سے وہ بھی اماں بیگم کے پیچھے پیچھے اس میں جا گھستا۔ کیسی کیسی پراسرار چیزیں اس میں بند رہتی تھیں۔ صندوق، ٹوکریاں، برتن، جھاڑ فانوس، بڑے بڑے لیمپ، پرانے رسائل، خطوں سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس، نواڑوں کے بنڈل، دریاں۔

سردیوں میں کرسیاں بجری پر ڈالے بابا بیٹھے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ لیچیوں کے درختوں پر سے کہرہ رفتہ رفتہ چھٹتا۔ شاگرد پیشے میں ترلوچن مالی نے کمرے کی دیوار پر ایک بڑی سی رنگین تصویر لئی سے چپکا رکھی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ جو منش دنیا میں برے کام کرتے ہیں نرک میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ (مثلاً ایک تصویر تھی کہ ایک آدمی نرک میں ایک گاڑی میں جتا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکالے بندر نما فرشتے گرز مار مار کر اس کو ہانک رہے تھے) اور روزی جمعدارنی جس کی لڑکی انگریزوں کے یہاں آیا گیری کرتی تھی، جب چاءدانی کوڑے کی بالٹی میں

انڈیلی جاتی تو وہ چاء کی پتیاں اس میں سے نکال کر گھاس پر سکھاتی اور ان کی چاء بنا کر پیتی۔

لکھنؤ سے سارا عملہ ساتھ آیا۔ قدیر جو ہرے رنگ کی لوئی اوڑھے ٹھاٹھ سے بے ٹانگ کی کرسی پر اپنے کمرے کے آگے بیٹھے رہتے۔ باورچی خانے کے سامنے کٹھل کا درخت تھا۔ حسینی کی بی بی روز کھڑی ہو کر اس کے پھل گنتیں۔

فرنیچر پر سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا تھا۔ موزنج کے فرش، سرخ اور عنابی قالین۔ سامنے برآمدے میں دیوار پر ایک رنگین تصویر فریم میں لگی تھی جس میں شکاری کتے ایک بارہ سنگھے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کا آتشدان بانات کی کار چوبی جھالر سے آراستہ تھا۔ اس پر چاندی کے فریموں میں اہل خاندان کی تصویریں دھری تھیں۔ کونوں میں پیتل کے بول اسٹینڈز پر رکھے تھے جن میں پام کے گملے رکھے جاتے۔ ڈرائنگ روم کی چلمچی میں روز تازہ پتے بھرے جاتے جن کی بڑی اچھی سی مہک آتی۔ ڈنرز کے موقعے پر میز خالص انگریزی اسٹائل سے سجائی جاتی۔ چھری کانٹے، فنگر بول جن میں گلاب کی پتیاں تیرتیں۔ بیرہ ہمیشہ ضابطہ چپکن پہنتا اور صافے پر چاندی کا بلا لگاتا اور کمر میں پٹا باندھتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو کمال چپکے سے باہر نکل کر لیچیوں کے خنک جھنڈ میں جا بیٹھتا۔ ایک عظیم آفاقی کاہلی سارے میں چھائی ہوتی۔ بڑے پرسکون خیالات دماغ میں آتے۔ دور دیواروں میں ایک پرندہ متواتر بے تکان چلائے جاتا: میں سوتا تھا............ میں سوتا تھا...... کہا جاتا ہے کہ یہ پرند شوالک کی وادیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا اور اسے کبھی کسی نے دیکھا

بھی نہیں۔ پہاڑی نوکر کہا کرتے تھے کہ جب پرجاپتی دنیا بنا رہے تھے اور سارے جانداروں کو ان کی قسمتیں اور اوصاف بانٹے جا رہے تھے (مور کو پر ملے، کوئل کو آواز، وغیرہ) اس وقت یہ یہیں پڑا سو رہا تھا۔ لہٰذا یہ اس کا جنم جنم کا رونا ہے۔ اس کی آواز پر کان لگا کر سنو تو صاف سنائی دیتا تھا: میں سوتا تھا۔

سردانی جی ننگے پیر سٹر پٹر کرتی ایک کمرے سے دوسرے میں جا رہی تھیں۔ انہوں نے زور سے پنٹری کا دروازہ بند کیا۔

کمال چونک کر ۳۵ء کے دہرہ دون سے بھی واپس آ گیا۔

سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اس نے جیب سے کنجی نکالی اور گودام کا دروازہ کھولا۔ اندر جا کر وہ الماریوں کو بے دھیانی سے کھولتا بند کرتا رہا۔ صندوقوں میں جھانکا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ملکیت کا کیا مصرف ہے۔ اس نے اس انبار پر نظر ڈالی جسے انسان اپنی ذاتی ملکیت کہہ کر خوش ہوتا ہے اور اس طرح کے سامان کے پشتارے ابھی گلفشاں اور کلیان پور کی حویلی کے کمروں میں مقفل تھے۔ کمرے کے وسط میں تھوڑی سی خالی جگہ کا جو جزیرہ سا بن گیا تھا اس میں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا: اس ملکیت کے لیے دنیا مری جاتی ہے! ان سب کے بدلے میں ایک مرگ چھالا، ایک مرگ چھالا!

اب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ لوگ دنیا تج کر جنگلوں میں کیوں جا بیٹھتے تھے۔

پھر اس نے اکڑوں بیٹھ کر کاغذات کی صندوقچیاں کھولیں۔ چاروں طرف رسالوں اور کتابوں اور پرانی تصاویر کے انبار لگے تھے۔ اس نے ''خط و کتابت'' کا ایک ٹوٹا پھوٹا اٹیچی کیس اٹھایا۔ لفافے جن پر عجیب و غریب مہریں تھیں۔ پٹنہ

۱۹۳۳ء۔ بلاسپور ۱۹۲۸ء۔ جھالا وار ۱۹۳۷ء۔ جانے ان خطوں میں کیا تھا اور کن لوگوں نے یہ خط لکھے تھے اور اب وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مثلاً راس بہاری لال کا خط جو ۱۹۳۴ء میں پیلی بھیت سے آیا تھا اور شکست میں لکھا تھا، یہ صاحب کون تھے اور کیوں تھے؟ اور وشوا نندن پانڈے، رانی کھیت اور محمد احمد عباسی منصف ضلع گونڈہ، فرہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے ''خط و کتابت'' کے صندوقچے واپس ایک الماری میں ٹھونس دیے۔ قالینوں کے انبار کے نیچے فائلیں دبی تھیں۔ مقدمات، زمینیں، مکانات، نان ونفقہ، خالی چنی بیگم کا جھٹم چھٹا جب میر مرغی سے ہوا تھا اس کے سارے کاغذات اور ایک تاریخ اودھ باتصویر جس کا کاغذ اتنا پیلا ہو چکا تھا کہ ہاتھ لگنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ جس کے اولین صفحے پر ہز ہائی نس دی آنریبل سر مہاراجہ ڈگپے سنگھ بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی بلرام پور و تلسی پور، صوبہ اودھ کی نہایت مسخرے پن کی قلمی تصویر چھپی تھی اور ان کے قلم سے لکھا ہوا نہایت مقفع و مسجع عبارت کا دیباچہ تھا: ''القصہ ایسی بے اتفاقی کی باتوں سے مضطر ہو کر ایک دن عالی جاہ بسبب تحریک مصاحبان سفاہت شعار بغور تائل وفکر و مال اندیشی لباس گیروا فقرا کا پہن کر بعد یے پ رجیٹھے رفقائے خاص بھی اسی صورت سے بنے انگشت نمائے خاص و عام ہوئے۔ جناب عالی نے اپنی رفع بدنامی سمجھ کر علی ابراہیم خان کو نواب عالیہ کی طرف سے کہلا بھیجا کہ میں نے بادشاہ کے حکم سے............''

کمال نے دوسرا صفحہ پلٹا:

''پس صاحبان عالی شان نے سمجھا تسخیر بلاد ہندوستان تو اسی دن ہو چکا تھا۔

شرق سے غرب تک حقیقت کھل چکی تھی لہذا اس زینہ وزارت پر مستقل رہنا چاہیے پھر مدارج سلطنت پر جانا آسان ہو جاوے گا اور یکا یک کسی کے گھر میں چلے نجانا چاہیے اگر چہ اس مین ایک مدت گزر جائے۔ اب یہ سب حقیقت حال اس زمانے کی کھل گئی۔ اتفاق قوم سب کا جاتا رہا۔ گویا سب چراغ ہندوستان بجھ گئے۔''

''انتقال مرزا وزیر علی خان.......... بابت ماہ جون ۱۸۱۶ء کلکتہ کے کاسی باغ میں، جہاں ٹیپو سلطان کا بیٹا بھی دفن ہے، مدفون ہوئے۔ چند غربائے شہر وزیر ہند سمجھ کر ساتھ تھے۔ کچھ شہر کی کسیاں ان کی سخاوت و بیکسی یاد کر کے اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی روتی تھیں۔ صاحب نے حکم دیا گورے قنات کے باہر کھڑے رہیں۔ تابوت پر گوروں کا پہرہ تھا۔ اوس عہد میں صاحب ریذیڈنٹ لکھنؤ جان لمسڈن صاحب۔ بنارس میں جان چیری صاحب مقتول نائب تفضّل حسین خان تھے۔''

''مرزا مظفر بخت شاہزادے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ ایک دفعہ اپنی اولوالعزمی و طمع دنیا سمجھ کر لکھنؤ سے باہر نکلے۔ لکھنؤ کے جو لوگ پریشان حال و معطل تھے ساتھ ہوئے، جب ناکام لکھنؤ پھرے سیلی بیگم مجملہ بی بی ہائے جرنل مارٹن سے نکاح کیا اونہیں کی پنشن میں بسر اوقات رہی۔ بعد گوری بی بی کے مرنے کے انہیں کے مکان میں رہتے تھے۔''

''جانا کرنل ڈبوا صاحب و فریل صاحب و مولوی محمد اسماعیل کا لندن کو سفارت مع ہدایائے شاہ جم جاہ جارج چہارم..........''

کتاب اس نے ٹوکری مین واپس پھینک دی۔ اس کے ہاتھ جو گرد لگ گئی تھی

چند لمحوں تک وہ اسے افسردگی سے دیکھا کیا۔ بہت دیر تک اس نے اپنے ہاتھ نہیں پونچھے۔

یہ سامان کہیں نہیں جائے گا۔ ان سب چیزوں کو ضبط ہو لینے دو۔ اس نے دل میں کہا گودام سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بیس سال پرانا گروپ فوٹو فرش پر سے اٹھا لیا۔ اس مین بڑے ابا مرحوم ہار پھول پہنے درمیان میں بیٹھے تھے، یہ کسی ضلع کا الوداعی گروپ تھا جس میں بہت سے ڈپٹی کلکٹران اور وکلاء قطار میں بیٹھے تھے۔ پیچھے بڑے بڑے دروازوں والا برآمدہ تھا۔ سکینہ صاحب، رضوی صاحب، ٹھاکر رام نرائن صاحب، مسعود الحسن صاحب، یہ کیسے عجیب لوگ تھے۔ سیدھے سادے۔ شریف۔ بھولے بھالے جعلسازی غالباً ان میں سے کسی کو نہ آتی ہوگی۔ ریکٹ چلانا ان کا مشغلہ نہ رہا ہوگا۔ فراڈ اور چار سو بیس سے یہ حضرات ناواقف تھے۔ کس قدر بے وقوف لوگ تھے۔ ان کے مخصوص طرح کے مذاق ہوتے تھے۔ مخصوص مشغلے۔ مشاعرے۔ مقدمے بازیاں۔ شکار پکے گانے کی محفلیں۔ کیسی پر امن زندگیاں یہ لوگ گزار گئے۔ اسے ان لوگوں کے مذاق یاد آئے۔ رضوی صاحب کی چڑ گلاب جامن تھی۔ ان کے سامنے گلاب جامن کا دونا دھرا ہے اور وہ ہائے توبہ کر رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی توند پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ میرٹھ کی نوچندی جانے کے پروگرام بن رہے ہیں، چھڑیوں کے سیلے کا تذکرہ ہے، سالے بہنوئیوں کی چوٹیں چل رہی ہیں، کیسا پرسکون ان کا معاشرہ تھا۔ کمال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر ثابت کیا؟ بے چارے بوڑھو۔ میں تمہارے آگے شرمندہ ہوں۔ میں تم کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا۔ میں اپنا

منہ چھپا کر دور بھاگ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔ اس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا اور تالہ لگا کر باہر آ گیا۔

دیوداروں میں پرندہ بدستور چلائے جا رہا تھا: میں سوتا تھا.......... میں سوتا تھا۔

ارے سوتا بھی تھا تو کیا حرج تھا؟ کمال نے جھنجلا کر دل میں کہا۔ جگ رہا ہوتا تب بھی پرجاپتی تجھے کون بڑا سکھ عطا کر دیتے مگر پچھتاوے کے احساس اور تو بہ تلا سے بھی تو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارے میں پوچھتا ہوں آپ ہیں کون چیز، کمال رضا اور سرل ایشلے اور گوتم نیلمبر؟ جو طرح طرح کی ٹرٹر لگا رکھی ہے۔

دلی کے اسٹیشن پر جیجا جی اس کے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ وہ جمنا روڈ آیا۔

لاج برآمدے میں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی: ”مت جاؤ کمن۔ نرمل سورگباشی ہو گئی۔ شنکر سدا باہر رہتا ہے۔ تم پاکستان چلے گئے۔“ روتے روتے لاج وتی کی ہچکی بندھ گئی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ”کاہے روتی ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”روؤ متی۔“

اس کی ٹرین شام کو امرتسر جاتی تھی مگر وہ جلد از جلد لاج وتی کے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جیجا جی کے ساتھ نئی دلی جانے کے لیے تیار ہوا۔

”ارے گوتم کو تو فون کر لو، وہ چندی گڑھ گیا ہوا تھا، شاید لوٹ آیا ہو۔“ جیجا جی نے کہا۔

کمال نے بے دلی سے ٹیلیفون ڈائریکٹری اٹھائی اور اوراق پلٹنے لگا۔ بہت

سے جانے پہچانے نام صفحات پر اسے نظر آ ہے۔ مس صولت رحمٰن، فلمز ڈویژن، مس کملا اُپال، منسٹری آف ایکسٹرنل افیرز۔

اس نے صفحے پلٹے ترولا، ہریش چند، نرائن ایم جے، نیلمبر، گوتم......اس نے نمبر ڈائل کیا۔

''ہلو.....ارے تم یہیں موجود ہو۔ الو کے..... پٹھے'' اس نے بے حد کوشش کر کے نارمل بشاش آواز میں بات شروع کی۔ ''ابے یار........ ہاں ہاں۔ آج ہی صبح دہرہ دون سے........ ہیں؟ ہاں ڈھاکہ سے آرہا ہوں بذریعہ ریل گاڑی۔ لکھنؤ میں؟ ہاں۔ اپی نے تم کو دعا کہلوائی ہے۔ ہاں..... ہاں مزے میں ہیں۔ سب مزے میں ہیں الامیرے۔ کیا کہا میں نے؟ کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا میں بھی بہت ٹھاٹھ کررہا ہوں آج کل۔ نام بنام سب کی خیریت بتاؤں؟ پوچھو.....قدیر اور قمرن؟ بھئی واہ۔ تم کو خوب یاد رہے۔ تم کو کون چیز یاد نہیں ہے؟ سب یاد ہے؟ تمہارا حافظہ بہت تیز ہے ماشاءاللہ قدیر تو زمانہ ہوا مرزاپور واپس چلے گئے۔ موٹر کب کی بک گئی۔ کیوں بک گئی؟ اجی یہاں زندگیاں ہی بک گئیں۔ تم ایک موٹر لیے پھرتے ہو۔ تم نہیں بکے؟ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں میں تو اپنی بات کررہا تھا۔ قیمت اچھی مل رہی تھی۔ بونی کا وقت تھا۔''

''اور پوچھو۔ کس کس کی خیریت دریافت کرنا ہے۔ چھٹکی۔ رم دیا؟ غضب خدا کا، تم کو چھٹکی اب تک یاد ہے؟ اس غریب کا انتقال ہوگیا۔ ہاں بڑا افسوس ہوا۔ کیسے؟ برسات میں گلفشاں مرحومہ کے باغ کی گھاس کھود رہی تھی، سانپ نے کاٹ لیا۔ ہاں کئی سال ہو گئے اسے مرے۔ گنگا دین تو آج کل کہیں مدھیہ

پردیش میں ٹریکٹر چلا رہا ہے۔اس نے اپنی بتا رہی تھیں ایف۔اے۔ پاس کرلیا ہے ہاں۔اسے اصل ترقی کہتے ہیں۔ میں گنگادین کے کیریر کا احوال سن کر بہت خوش ہوا اور با تیں کروں؟ نہیں میں تم سے مل نہیں سکتا۔ مجھے فرصت نہیں۔ ہیں؟ تمہاری کانفرنس تین بجے ختم ہوگی، اس کے بعد تم میرا انتظار کروگے، الپس میں؟ کیا کروگے انتظار کرکے۔نہیں۔ میں کسٹوڈین سے ملنے جا رہا ہوں پی بلاک۔ اس کے بعد۔اچھا دیکھو پہنچنے کی کوشش کروں گا۔مگر میرا زیادہ انتظار نہ کرنا۔اچھا سولونگ۔''

کمال نے ٹیلیفون بند کردیا۔لاج وتی دروازے میں کھڑی تھی۔''اچھا اب میں چلا۔''

''جلدی آنا۔''

''ہاں ہاں۔''

''تمہارے ناشتے کے لیے کیا کیا بنادوں۔''

''وہی سب جو ہمیشہ بناتی ہو۔'' وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔تم یہ اپنا بہنوں کی محبت والا جال پھیلاتی رہو۔میرا دل اس سے تھوڑا ہی پسیج سکے گا۔ نہ میرے قدم ڈگمگائیں گے، میں مضبوط ہوں، میں بوڑھا ہوں مجھ میں ضبط اور توازن اور سکون ہے۔اس نے دل میں کہا۔

وہ جمنا روڈ سے نکلا۔علی پور روڈ، کشمیری گیٹ۔سینما کے بڑے بڑے اشتہار، لال قلعے کا میدان، دکانیں، نئے نئے بازار، کناٹ پلیس پہنچ کر وہ دکانوں میں رکھی ہوئی نئے ہندوستانی مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا پھرا۔ برآمدے میں سے

گزرتی ہوئی ایک لڑکی میں اسے سریکھا کی جھلک نظر آئی، وہ ذرا آگے بڑھا، وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تین بجنے میں بہت دیر تھی۔ سارا دن باقی پڑا تھا۔ سریکھا ہی سے چل کر مل لوں۔ اس نے کاہلی سے سوچا۔

''یہاں ڈانس اکیڈیمی کا پتا بتا سکتے ہیں۔'' اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''کون سی ڈانس اکیڈمی؟ یہاں بے شمار ڈانس کالج ہیں۔ آپ سنگیت اکادمی تشریف لے جائیے، وہاں سے آپ کو شریمتی سریکھا دیوی کا پتا معلوم ہو جائے گا۔'' اس نے یہ ارادہ بھی ترک کیا۔ اپنے جانے پہچانے کناٹ پلیس میں وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ موٹر کاروں، خوشحال، مطمئن انسانوں، مصروف کاروباریوں، عظیم الشان دکانوں کے وسط میں کھڑے ہوئے اسے بے حد ڈر لگا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جانے سے پہلے اسے سول لائنز کے تھانے میں جا کر اطلاع کرنی ہے کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے۔

بھادوں کے مہینے کی دھوپ بڑی سخت تھی، وہ بہت مضطرب، بہت تھکا ہوا تھا، وہ چاہتا تھا کہ پر لگا کر کراچی واپس پہنچ جائے۔ اس نے طے کرلیا اب وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے گا۔

''وہ دیکھو سامنے سے کون آتا ہے؟'' اس نے ڈاکٹر ہینس کریمر کو دیکھ کر مصنوعی بشاشت سے کہا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پہاڑ سی دوپہر ان کی سنگت میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

''ہلو۔ ہلو۔ مائی ڈیئر بوائے۔'' ڈاکٹر ہینس کریمر نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا عجیب اتفاق ہے۔''

ان کے ساتھ انفرمیشن ڈویژن کی ایک لڑکی تھی۔ اس نے متانت سے کمال کے سلام کا جواب دیا اور ایک پمفلٹ سے پنکھیا جھلتی رہی۔

''بڑی شدید گرمی ہے۔'' ڈاکٹر ہینس کریمر نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔

''بالکل خالص مشرقی موسم!!''

کمال بھی تکلفاً ہنسا۔

''میں ڈاکٹر کو قومی میوزیم لیے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چلئے اگر آپ کو اور کوئی کام نہ ہو۔'' لڑکی نے، جس کا نام شاید ماری ارونا باچپئی تھا، کمال کو مخاطب کیا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر نرملا زندہ ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح کام میں مصروف ہوتی۔

''جی ہاں۔ ضرور۔'' اس نے جواب دیا۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے دو اور یورپین دانشوروں کو ہمراہ لیتے ہوئے وہ راشٹر پتی بھون روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ہینس کریمر اور ان کے ساتھی اسی دنیا کے باسی تھے جس مین کمال کچھ عرصہ قبل خود شامل تھا۔ ان کا بھی زندگی سے وسیع تر آوٹ لک تھا۔ انہین بھی چیزوں میں رمزیت نظر آتی تھی۔ ان کے پاس بھی علم کے علاوہ ادراک تھا، یہ بدھ جینتی کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور سرینگر کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہ کر ہندوستانی فن سنگتراشی پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے ان ہی کی طرح دوسرے ملکی اور غیر ملکی دانشوران کے یہاں جاتے، یہ ہاتھ ملتے جاتے اور فرش پر کشن اور چٹائیاں بچھاتے اور سبز چاء تیار

کرتے اور کپل کا تذکرہ ہوتا۔ ''ابھی میں راہل سنکرائتن سے ملنے الموڑے گیا تھا۔'' ڈاکٹر کریمر نے کمال سے کہا۔

''خوب۔''

''مارگ میں میرا نیا مضمون ضرور پڑھنا۔''

''ضرور''

''تم ملک راج سے واقف ہو۔''

''جی ہاں۔''

پھر انہوں نے دوسرے ناموں کا ذکر شروع کیا: ہمایوں کبیر۔ تارا علی بیگ۔ ذاکر حسین۔ کارل کھنڈالا والا۔ کمال موٹر کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

راشٹرپتی بھون کی سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈاکٹر ہینس کریمر نے ہاتھ ملتے ہوئے نظریں اوپر اٹھائیں اور سونے کے شیروں کے نیچے لکھا ہوا ''ستیہ میو جیتے'' بآوازِ بلند پڑھا۔ ''سچ جیتے گا۔'' انہوں نے کمال کی خاطر اس کا ترجمہ کیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بند کر لیں پھر وہ سب کماری ارونا کی قیادت میں اندر داخل ہوئے۔ سابق وائسریگل لاج کے عظیم الشان مرمریں ایوانوں میں بے اندازہ خنکی تھی جو باہر کی کڑی دھوپ کے مقابلے میں بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ عہد عتیق اور قرون وسطیٰ کے مجسموں نے کمال کو اپنی بے نور آنکھوں سے گھورنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ایک ایک مجسمے کے سامنے ٹھٹھک کر فرانسیسی یا جرمن میں تبادلہ خیالات کرتے۔ دربار ہال میں وائسرے ہند کے تخت کی جگہ مہاتما بدھ کا شاندار قدیم مجسمہ ایستادہ تھا۔ اس کے پس منظر میں عنابی رنگ کے مخملیں پردوں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ کمال

تخت کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف برٹش میوزیم کا سا ماحول طاری تھا۔

''یہ تو عارضی میوزیم ہے۔'' اس کے قریب آ کر کماری ارونا نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔ ''ہمارا زیر تعمیر قومی عجائب خانہ ہمارے ورثے کے شایان شان ہو گا۔''

''جی...... یقیناً............'' کمال نے جواب دیا۔ سال بھر قبل وہ خود اسی دلی میں شام سے اسی لہجے میں باتیں کرتا رہا تھا۔ آپ نے ہماری تازہ ترین عمارات دیکھیں؟ ریزرو بنک آف انڈیا............ اور...... اخباروں کے دفاتر کی فلیٹ اسٹریٹ جو بننے والی ہے اور اسوکا ہوٹل............ کماری ارونا نے بحیثیت ایک فرض شناس انفارمیشن آفیسر اس سے پوچھا۔

''جی۔'' کمال نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خود بھی یہیں کا رہنے والا تھا

''آیئے ادھر چلیں۔ آپ نے ہمارے موہن جوڈارو کی قدیم تہذیب کی ''ڈانسنگ گرل'' دیکھی؟''

کماری ارونا اسے سنگ مرمر کی گیلریوں میں گھماتی پھری چن ہودارو۔ موہن جوڈارو وادی سوات۔ ہڑپہ۔ ٹکشلا۔ روپڑ۔ اب ہم موجودہ زمانے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ''یہ پتھر دیکھیے، یہ اشومیدھ تیسری صدی قبل مسیح میں دہرہ دون کے علاقے میں منعقد کیا گیا، یہ اہی چھتر کے مجسمے ہیں۔ اہی چھتر کو اب ضلع بریلی کہتے ہیں۔'' اس نے مڑ کر ہینس کریمر سے کہا

جو اس دوران ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک عورت کے مجسمے کے سامنے آئے۔ archaic وضع کا تھا۔

"یہ شرواستی کی کھدائی سے اسی سال نکلا ہے۔" ایک لڑکی کدم کی ٹہنی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔ "سرخ مٹی کی اس مورتی کا سنہ غالباً چوتھی صدی قبل مسیح ہے۔" ڈاکٹر ہینس کریمر نے اپنا مسودہ نکال کر پروفیشنل آرکیالوجسٹوں کے انداز میں اپنے فرنچ ساتھی سے کہا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر مورتی کے آگے بیٹھ گئے۔ مورتی کے نقوش میں قوت تھی، زندگی کی سرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے حیات۔ زمین کی اپنی تخلیق۔ اس کی بانہیں بہت گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی، جسم مضبوط اور سڈول، خطوط اور حجم اور توازن شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج، ایک لرزہ خیز حسن پتھروں سے تشکیل ہوا ہے: بھاری، منجمد، خوفناک، موسیو راول نے ایٹس کی مانند کہا۔

"فن سنگتراشی کے آئندہ نظریوں کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔" ڈاکٹر کریمر نے کہا۔ "یہ متھرا سے پہلے کا نمونہ ہے۔ اب ہمیں اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت سی تھیوریز کو بدلنا پڑے گا۔"

"اس عہد کے فن کاروں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہوگا کہ خیال محض علامت کے ذریعے دیکھنے والے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی نظریے نے ویدوں کے عہد کے بعد اصنام پرستی کی ترویج کی۔" ارونا نے اظہار خیال کیا۔

روپ اور اروپ اور بھاؤ اور ابھاؤ کے متعلق وہ جو کچھ جانتا تھا اب وہ کس سے

کہنے جائے گا۔ اس سارے علم کا اسے اب کوئی فائدہ نہیں۔ کمال نے سوچا۔ اس حیرت انگیز مورتی کے پاس اس کے لیے کوئی پیغام نہیں۔

''ویدانت کے نزدیک خالق جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے۔'' ڈاکر راول نے کہا۔ ''بجلی کی طرح اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی سو پرکاش ہے۔ جس طرح فن کار کا تصور وشوا کرمن کے تصور میں شامل ہے اسی طرح دیکھنے والا آتما یا خود میں موجود ہے جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے۔ وشوا روپ روپم روپم پرتی روپ۔ تمہارا کیا خیال ہے ویدانت کے اس نظریے کے متعلق؟ تمہیں یہ مجسمہ اچھا لگا یا تم متھرا کے اسٹائل کو ترجیح دو گے؟'' ڈاکٹر موصوف نے مڑ کر کمال سے پوچھا۔

''بھو کشتم ناپرتی بھاتی کم چت۔ (بھوکے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی) میں جمالیات اور ما بعد الطبیعیات کی موشگافیاں کرنے سے قاصر ہوں۔'' اس کی آواز کی بے پناہ تلخی اور اداسی نے سب کو چونکا دیا۔

''یہ کمیونسٹ ہے۔'' ڈاکٹر آئیورٹ نے طے کیا۔

اس کے فرسٹریشن کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کماری ارونا نے سوچا جو امریکہ سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا اور سوچا۔

پڑھا لکھا لڑکا ہے اور کتنا خوش شکل۔ ''آپ سنسکرت بھی پڑھ چکے ہیں۔'' اس نے توصیفاً پوچھا۔

''پڑھی تھی ایک زمانے میں۔'' کمال نے مختصر جواب دیا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ کسٹوڈین سے ملنے کا وقت قریب آرہا تھا۔

وہ مورتی کے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مورتی کا پتھر خنک تھا۔ پتھر جو become timeless کی علامت ہے۔ حال کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ جو پتے پچھلے کلپوں سے بہتے ہوئے آرہے ہیں، وہ اب ان کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اس نے دل میں سوچا۔ جبھی سے تو میں کہتا ہوں، ایک کدال لے کر ان پتوں، اس کوڑے کرکٹ کی صفائی کر دو۔ آج کل میں صفائی میں لگا ہوں: دماغ کی، دل کی، ذہن کی، عقل کی صفائی، اسپرنگ کلیننگ۔ اس ماضی سے میں ناطہ توڑ چکا ہوں۔ اس نے ان یورپین ماہرین کو بتانا چاہا، پھر وہ مورتی کی طرف مڑا۔ اسی لیے، شرواستی کی سدرشن یکشنی! جو کوئی بھی تیرا بنانے والا تھا وہ اپنا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکتا۔ تیرا خالق اب مجھ سے کمیونی کیٹ نہیں کرے گا۔ میں روپ اور اروپ کی بحث میں حصہ لینے سے انکار کرتا ہوں، یہ قومی عجائب خانہ مع سارے ماضی، سارے ہندوستان کے میں نے کماری ارونا کو سونپا، وہ وہاں سے آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ آگے چلتا ہوا گیلری عبور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کانوں میں یورپین دانشوروں کی آواز آتی رہی۔

''کاش ہم جان سکتے کہ سنگتراش کا نام کیا تھا جس نے یہ مورتی بنائی۔ مگر اس عجیب وغریب ملک میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔'' ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔ ''واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت روایت ہے۔ وقت کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لمحہ لافانی ہے۔ انسان گمنام ہے، اس کی تخلیقات، فن پاروں، تصنیفات کی بھی ابدیت کے اس سمندر میں کوئی علیحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔''

''ہاں۔'' موسیو راول نے کہا۔ ''انسان مر جاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں۔''

''کوئی کرائسس ہندوستانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی کرائسس بھی وقت بھی شامل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ ماضی، مستقبل، فنا، بقا...... کسی شے کا وجود نہیں لہذا اب اس جسم کو جلا دو کیونکہ یہ اب حال میں شامل نہیں رہا۔'' ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے کہا۔

''اسی لیے مشرق کے فن کار نے اپنا نام ثبت کرنے کی ضرورت کبھی نہ سمجھی۔ کاش ہم ان سنگتراشوں کے متعلق بھی کچھ جان سکتے۔'' ڈاکٹر کریمر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہاں کتنے مائیکل اینجلو اطمینان سے ہنسی خوشی گمنام مر گئے!؟''

کمال گیلری سے باہر نکل آیا۔

''یہ احساس کہ ہم خود وقت ہیں۔'' موسیو راول کہہ رہے تھے۔

''وسعت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وقت کو صرف سوچا جاسکتا ہے۔'' ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔

کمال سیڑھیاں اتر کر باہر سرخ بجری کی چوڑی سڑک پر آ گیا اور پی بلاک کی طرف روانہ ہوگیا۔

کسٹوڈین سے دماغ کھپانے کے بعد وہ گوتم نیلمبر سے ملنے الپس نہیں گیا، وہ سیدھا لاج کے گھر پہنچا اور اس نے لاج سے کہا، اگر میرا فون آئے تو کہہ دینا میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں، پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اسٹیشن جانے کے وقت تک پڑا سوتا رہا۔

گوتم ایک گھنٹے تک ریسٹوران میں کمال کا منتظر رہا۔ اس نے کئی جگہ ٹیلیفون کیے، جب کمال کی طرف سے بالکل نا امید ہو گیا تو پھر اپنے دفتر لوٹا۔ بدھ جینتی کے سلسلے میں حکومت بڑے زوروں کی پبلسٹی کر رہی تھی اور اسے چراغ جلے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ایک انتہائی ضروری اور فوری فائل کے سلسلے میں اس نے اپنی نمبر ٹو کماری ارونا باجپئی کو فون کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ کماری ارونا باجپئی ڈاکٹر کریمر کو لے کر نیشنل میوزیم گئی ہوئی ہیں۔

لاحول ولا قوۃ! اس نے غصے سے کہا۔ کمال سے نہ مل سکنے کی وجہ سے وہ بے حد مضمحل تھا۔ اسے اس ملک پر اپنے آپ پر، کمال پر، دنیا کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر کریمر اور ڈاکٹر اسٹیوارٹ اور کماری ارونا باجپئی..........ان سب کو کچا چبا ڈالتا۔

فائل بے حد ضروری تھی اور اسی جلد از جلد محکمے کے جوائنٹ سیکرٹری کو پہنچانا تھا، وہ کار میں بیٹھ کر راشٹر پتی بھون پہنچا۔ میوزیم کے اندر جا کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بے دھیانی سے وہ کمروں میں گھومتا رہا۔

ایک مورتی کے سامنے انفرمیشن ڈویژن کے پمفلٹ پڑے تھے جو شاید ڈاکٹر کریمر یہاں بھول گئے تھے۔ گوتم نے جھک کر وہ اٹھائے، پھر اس نے بے دھیانی سے مورتی کو دیکھا۔ شراوتی کی سدرشن یکشنی۔

اس کی شکل بھیا! کیسی تھی؟ اس نے دفعتاً سوچنا شروع کیا، پھر اس نے غصے

سے چلتے چلتے مرمریں فرش پر ذرا زور سے پیر پٹخے۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو میں نے تمہیں کبھی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں تو تمہاری شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل تو محض ہیولی ہوتا ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف وشوا کرمن ہی پہچان سکتا ہے۔

مورتی، جو شراوستی کی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی، کدم کی ٹہنی جھکائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھا کی۔ گوتم نے اس کے قریب جا کر اس کے چہرے کو چھوا۔ archaic سنگتراشی کا اچھا نمونہ ہے، اس نے دل میں کہا۔ کلچرل پبلسٹی کے رسالے میں اس تازہ دریافت کے متعلق ایک مضمون ہو جانا چاہیے۔ اس نے ایک مستعد اور فرض شناس پبلسٹی ایکسپرٹ کی طرح سوچا، پھر باہر نکل آیا۔

شام پڑے کمال لاج کے گھر سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔

''ابھی ٹرین میں دیر ہے۔ آؤ تمہیں گھما لائیں۔'' جیجا جی نے تجویز کیا۔ ''تم دن بھر گھام میں مارے مارے پھرے ہو اب تازہ ہوا کھاؤ گے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ پہاڑی پر گئے۔ حدِ نظر تک نئی بستیوں کی روشنیاں تیزی سے جگمگا رہی تھیں۔ پٹیل نگر آزاد نگر، قرولباغ، رج کے علاقے میں کالجوں کی دنیا میں چہل پہل تھی۔ یونیورسٹی، میرانڈا ہاؤس، سینٹ اسٹیونز، بے شمار نئے کالج بن گئے تھے۔ سپرو ہال میں بڑے غلام علی خاں کا کونسرٹ ہو رہا تھا۔ ایک تھیٹر میں ہیر رانجھا کا اوپیرا دکھایا جا رہا تھا۔ آرٹ گیلریوں میں نمائشیں منعقد ہو رہی تھیں۔ بڑی بڑی دکانوں پر ساریاں پہنے، جوڑے باندھے سیلز گرل باوقار انداز میں سامان فروخت کر رہی تھیں۔ برلا مندر کے سامنے ہجوم تھا۔ اوپر سنگ مرمر کے

فرش پر جگہ جگہ لوگ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

کاشی نرائن کی بھدی، بدذوق، خالص مڈل کلاس بنیا مورتیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمعے کو دیکھ رہی تھیں۔اوپر گیتا بھون میں ہارمونیم پر کیرتین ہو رہا تھا، چاندنی کے فرش پر مڈل کلاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ جامع مسجد کے سامنے شکستہ حال مسلمان اپنی دکانیں لیے بیٹھے تھے۔

''دلی دنیا کے خوبصورت ترین دارالسلطنتوں میں سے ہے۔'' کار میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی لاج خوشی سے کہہ رہی تھی۔''کل امریکن سفیر کی بیوی روشن آرا ءکلب میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ تو واشنگٹن کی طرح خوبصورت ہے اور ٹوکیو کی طرح ترقی یافتہ......اور پرانی دلی کو دیکھ کر لندن کی گلیاں یاد آتی ہیں۔تم تو دنیا گھوم آئے ہو،ٹھیک ہے یہ بات؟''

راج گھاٹ میں لوگوں کے غول ہوا خوری کر رہے تھے۔فوارے چل رہے تھے ایک بوڑھی عورت گاندھی جی کی سمادھی کے سامنے سجدے میں پڑی تھی۔

ٹرین کا وقت ہو گیا، وہ لاج اور جیجا جی کو خدا حافظ کہہ کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلی۔ جمنا کا پل۔ لال قلعے کی دیواریں۔ بازار۔سڑکیں۔مکانات۔وہ کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔وہ جا رہا ہے۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے زینے پر رکھا ہوا نٹ راج کا عظیم الشان مجسمہ۔جامعہ نگر۔نظام الدین اولیاء۔متھرا روڈ۔سب یہیں رہ جائے گا۔زندگی جاری رہے گی۔ایک آدمی کے نکل جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ لوگ اب مختلف تھے۔ دوسرے راستے پر جا رہے تھے، ان کے اور کمال کے پاس اب کوئی موضوع

مشترک نہیں۔ اسے اب ان سے کوئی غرض نہیں، وہ بھی اب کمال کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔

پریس کلب میں دنیا بھر کے اخباروں کے نمائندے جمع تھے۔ لوک سبھا میں پنڈت نہرو تقریر کر رہے تھے۔ جامعہ نگر میں اردو ڈرامے پر ریسرچ کی جا رہی تھی۔ للت کلا مندر میں سریکھا دیوی رقصاں تھیں۔

موسیقی۔ تھیٹر۔ مووِیز۔ ڈوکومنٹری فلمز۔ بچوں کے تھیٹر اور ہسپتال۔ عورتوں کی یونیورسٹیاں۔ فیشن شوز۔ بیلے یونیورسٹیوں کی ایئر کنڈیشنڈ لائبریریاں۔ دوسرے پانچ سالہ پلان کے بلیو پرنٹ۔ بھاری انڈسٹری۔ افلاس۔ سوشلسٹ اسٹیٹ۔ نئی دلی کے انتہائی پوش ریستوران۔ امپریل دلی۔ سوشلسٹ دلی۔ ضلعوں کی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خواتین۔ سادھو اور بھکاری۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے قصبے اور گاؤں۔ بھودان کی تحریک۔

قدسیہ باغ، روشن آرا باغ اور بیلا روڈ پر ٹھنڈی ہوائیں چلی رہی تھیں۔ اولڈ سول لائنز کی کوٹھیوں میں پھول کھلے تھے۔ ان کے گھاس کے قطعوں پر پرانے زمانے کے کائستھ خاندانوں کے چند افراد بیٹھے طباطبائی کی شاعری پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

نیشنل فزیکل لیبارٹریز کی عظیم الشان ایئر کنڈیشنڈ گیلریوں میں سے سائنس دان لڑکیاں سرعت کے ساتھ نکل کر الٹرا ماڈرن سیلف سروس کیفے ٹیریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ نئی دلی میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ روشن آرا کلب کے وسیع لان پر پنکھوں کے نیچے چند اعلیٰ عہدے داروں اور سیٹھوں کی بیبیاں تاش کھیلنے

میں مصروف تھیں۔

ٹرین اب کھیتوں میں آ گئی ہر سفر میں بڑی معنویت ہے۔ ہمارا ادھر سے ادھر جانا۔ ایک مرتبہ گوتم نے کہا تھا جب وہ بقول طاعت خلیل جبران کے المصطفیٰ کی طرح مکالے ادا کیا کرتا تھا۔

ہندوستان کا سارا سمبل سفر ہے۔ چلتے رہنے، تلاش کرنے کی عادت ....

شاید اشپنگلو نے لکھا تھا۔ اس نے رادھا کرشنن کی کتاب اٹھائی:

''ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دیتا: یہ ضرور کرو یا یوں تم کو کرنا پڑے گا۔

یہاں انسان اپنے فعل کو خود مختار ہے۔''

اس نے کتاب کھڑکی سے باہر پھینک دی اور سیٹ پر لیٹ گیا۔

پنجاب کے اسٹیشن گزرتے رہے۔ انبالہ، لدھیانہ، امرتسر، دیواروں پر اردو میں فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ پلیٹ فارم کے دھلے ہوئے فرش پر سکھ عورتوں کی رنگین شلواریں رات کی روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔

صبح ہوئی۔ ٹرین امرتسر پہنچ رہی تھی۔ جگہ جگہ مسلمان پیروں کی زیارات تھیں جو سنسان پڑی تھیں۔ سکھ عورتوں کے غول پگڈنڈیوں پر سے گزر رہے تھے۔ سکھ ہلواہے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ اب بھی مکان جلے ہوئے پڑے تھے۔ امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال برقعہ پوش عورتیں اور بوڑھے سلاخوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک موٹا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے درشتی سے پوچھ رہا تھا: ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''امینہ، یہ میری بیٹی سکینہ ہے، یہ پاکستانی ہے۔ میں خورجے سے اسے لینے آئی ہوں۔ اس کا باپ مر رہا ہے۔'' پاکستانی سکینہ اپنی بھارتی ماں امینہ سے علیحدہ، سلاخوں کے اس پار کھڑی، سہمی نظروں سے افسر کو دیکھ رہی تھی۔ ''اس کا وی جا ٹھیک ہے نا۔'' ماں پر امید آواز سے پوچھ رہی تھی۔

ٹرین چلی۔ دونوں طرف کے سپاہی ڈبوں میں چڑھے۔

یکا یک دوسرا ملک شروع ہو گیا۔ دو سردار جی گھاس پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔

میں اب پاکستان میں ہوں۔ ہندوستان سے آیا ہوں۔ مہاجر۔ یو۔ پی کا مسلمان۔

مہاجر............ پناہ گزین............ بے خاناں۔

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ، جو اتنے دنوں سے اپنی ساری ہمت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا، کھمبے کے پاس ایک سردا جی کو کھیسیں نکالے، بندوق تانے کھڑے دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہم سفر، جو پولیس کا افسر تھا اور امرتسر سے واپس جا رہا تھا، اسے غور دیکھ رہا ہے۔

کمال بہت پشیمان ہوا اور اسے لگا جیسے پولیس افسر کہہ رہا ہے: تم اب تک دو متضاد وفاداریوں کے دوراہے پر کھڑے ہو، لعنت ہو تم پر۔

اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہیں۔ تم ہندوستانی ہو، ہندوستانی جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے:

جاسوس۔ غدار۔ جاسوس غدار۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین آہستہ آہستہ لاہوراسٹیشن کے کسٹم کی سلاخوں والے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

لاہور سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ ہوائی جہاز نے کراچی کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔

اب اس کی نئ زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس نے ڈائری نکالی۔ کراچی واپس پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔ چچا فلاں سے کلیم کے متعلق سفارش کرانا تھی۔ کوٹھی کے لیے بلیک سے سیمنٹ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔ مسٹر ایکس کو جم خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی۔ بتاؤ میں کہاں جاؤں، اس نے خود سے سوال کیا۔ خراب، انحطاط پذیر سوسائٹی میں انسان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے؟ اس مسئلے پر سوچنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایئر ہوسٹس سے پھر کافی منگوائی اور ڈان اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

کابینہ میں کرائسس۔ وزیر اعظم کا استعفیٰ۔ نئے وزیر اعظم کا جہانگیر پارک میں ملت سے خطاب۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر بادل تیزی سے پھیلنے لگے۔ کوئی دم میں بارش شروع ہو جائے گی۔

اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گورکن اور میں ہی نوحہ گر۔ اس نے دل میں کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچی سڑک پر لڑکا بیل گاڑی ہانکتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن ویگن دھواں چھوڑتی، دھول اڑاتی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک بیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑیبان نے بیل کی دم مروڑ کر موٹر والوں کو ڈانٹا۔ ''دیکھ کر نہیں چلات ہو موٹریا۔ ابھی جو ہمرا بیل چمک جایت۔'' امریکن اخبار نویس نے فوراً کیمرہ نکال کر اس کی تصویر لے لی۔ پیچھے پیچھے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی مسز راج واڑے نے منڈیا نکال کر جھانکا اور پھر لیڈی کملیش ورما سے باتوں میں لگ گئیں۔ شرواستی ابھی بہت دور تھا۔ سورج بادلوں میں چھپا جا رہا تھا اور بارش سر پر کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راول نے اگلی اسٹیشن ویگن میں بیٹھے ہوئے کماری اروناباچپئی سے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اس نے فوراً پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابوں کا بنڈل ان کی ناک میں ٹھونس دیا اور سوالات سے بچنے کے لیے نٹنگ میں جٹ گئی۔ تیسری موٹر میں لنکا اور جاپان کے چند بھکشو لدے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فلمز ڈویژن کا کیمرہ مین تھا۔ دو تین کسان لڑکیاں منڈیر پر کھڑی اس قافلے کو دیکھتی رہیں پھر ارہر کے کھیت میں کود کر کام میں لگ گئیں۔ دوسری طرف ٹریکٹر چل رہے تھے۔ سامنے کی موٹر میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں نے جن گن من گانا شروع کر دیا پچھلی سیٹ پر زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز گوتم نیلمبر نے، جواب تک موٹر چلا رہا تھا، مڑ کر کماری اروناباچپئی سے کہا:

''اگر وبیل تم لے لو تو میں یہاں سے اتر کر پیدل اپنے گھر چلا جاؤں۔''

''کیا بہت بور ہو گئے؟'' کماری ارونا نے پوچھا۔ اسے خود سفر کی تکان کی وجہ سے نیند آ رہی تھی۔

''ہاں میں یہیں سے کھیتوں کھیتوں نکل کر چلا جاؤں گا، شارٹ کٹ سے۔ ذرا جا کر نہا دھو کر آرام کر لوں۔ صبح سے پھر یہ سارا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ موسیو راول اگر آپ اجازت دیں۔'' اس نے فرنچ مصنف کو مخاطب کیا۔

اس نے موٹر روکی اور اتر کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ موٹریں ایک ایک کر کے دھول اڑاتی آگے نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ بارش کا ایک قطرہ ٹپ سے اس کے بالوں پر آن گرا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر ہوا کو سونگھا اور ارہر کا ایک ڈنٹھل توڑ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اس نے پھوار سے بچنے کے لیے آم کے ایک گھنے جھنڈ میں پناہ لی۔ درخت کی جڑ پر بیٹھ کر وہ دیر تک ہوا اور پتوں کے سنگیت سنا کیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے پھر اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔ حد نظر تک کھیت لہلہا رہے تھے۔ شہر ابھی بہت دور تھا۔

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی گو اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد

کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھتا رہے تھے۔

بہرائچ کے مضافات شروع ہو گئے۔ سول لائنز کی سایہ دار سڑک پر پہنچ کر وہ اپنے باپ کی زرد رنگ کی دو منزلہ کوٹھی میں داخل ہوا۔

اس کے بابا سر دیپ نرائن لان پر ٹہل رہے تھے۔

''ہلو بیٹے۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں سمجھتا تھا۔ تم غیر ملکی مہمانوں کو لے کر سیدھے سہت مہت چلے گئے۔''

''جی نہیں بابا۔'' اس نے جھک کر ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ ''پہلے راستے میں ان کو ہم فارم دکھانے لے گئے تھے۔ ان لوگوں کو سوائے فارم دیکھنے اور کانفرنسیں اٹینڈ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔ ایک مہینے سے مجھے سر کھجانے کی مہلت نہیں۔''

''تمہاری ڈاکٹر باجپئی تو بڑی قابل لڑکی ہے۔ وہ ان کو سارا ڈوپ دے رہی ہوگی۔''

''جی''

پھر وہ اندر جا کر اپنی ماں سے ملا۔

''دمینتی بوا کہاں ہیں؟'' اس نے غسل خانے میں نہاتے ہوئے آواز دی۔

''شہر میں، ان کے پاس بھی ہو آنا۔''

''جی اچھا۔''

''تم اچھی طرح ہو بیٹے۔''

''جی ہاں، بچن کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟''

''اگلے پھاگن میں۔'' ماں نے جواب دیا۔

''پرکاش چاچا کی کوٹھی بن گئی۔''

''نہیں۔ وہ خان بہادر محمد حسن، نہیں تھے، ریٹائرڈ جج۔ وہ پاکستان چلے گئے، ان کی کوٹھی نیلام ہو رہی تھی۔ وہ پرکاش نے لے لی، بہت سستی مل گئی۔''

غسل خانے سے نکل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسی طرح کی دو چار اور گھریلو باتیں لیڈی دیپ نرائن سے اس نے کیں۔ پاکستان کے نام پر اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ پاکستان کو تو وہ ہمیشہ بھلائے رکھتا تھا حالانکہ ابھی اسے شراوستی کے ان مغربی زائرین کو کشمیر کا مسئلہ بھی سمجھانا ہوگا۔

اس کا دم بے طور گھبرانے لگا۔ اس پر وہی وحشت طاری ہوگئی جس نے چند روز قبل اسے نئی دلی میں آ ناد بوچا تھا۔

''میں ذرا ہوا کھانے دریا تک جاتا ہوں۔'' اس نے اپنی ماں سے کہا۔

''ابھی تو اتنا لمبا سفر طے کر کے آ رہے ہو، اب پھر چل دیے۔ لیٹ کر آرام کرو۔'' ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا

بیٹھا۔ یہاں مکمل تنہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے زندگی میں پہلی بار خیال آیا: کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تنہائی کا احساس، رنج، نفرت، فرار کی خواہش، وسعت اور اضافیت کا تصور.........نروان.........جو زندگی سے، موت سے، سونے جاگنے، محبت، رحم اور لاتعلقی سے ماورا ہے اور پھر بھی حقیقی ہے۔ معدومیت.........صفر.........صفر.........

کیا یہ غیر ملکی مفکرین سمجھ سکتے تھے کہ اس کے، ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں؟ اس نے سگریٹ سلگایا اور مندر کے فرش پر نیم دراز ہو گیا۔ برسات کا زمانہ ہے، یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔ اسے لگا گویا جنگل سے اس کی بہت پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ انہی فضاؤں، انہی پودوں اور درختوں کی معیت میں پلا بڑھا تھا۔

دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''تم کون ہو بھائی۔'' نیچے سے کسی نے پوچھا۔

''میں ہوں۔'' گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دوسرا نوجوان مندر کی منڈیر کود کر اندر آ گیا۔

''یہ کیا وحشت ہے؟ میں تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا۔ تمہارے اماں ابا نے بتلایا کہ تم دریا پر براج رہے ہو۔''

''ہاں یار۔ اس وقت غیر معمولی حبس طاری ہے۔ ایک پتا تک نہیں ہل رہا۔ تمہارا دن کیسا بیتا۔''

''بور ہو گئے میاں۔'' ہری شنکر نے قریب کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ

بدھا جینتی کچھ دن اور اسی طرح چالو رہی تو استعفیٰ مرا با حسرت ویاس۔ دیکھو اسی چکر میں میں لکھنؤ نہ جا سکا۔ بنگلور سے جے۔ ایس کا تار ملتے ہی پہنچا دلی اور اب یہ یاتری لوگ، ارونا باجپئی کہہ رہی تھی کہ یہاں سے سیدھے کپل وستو اور گیا جانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ راستے بھر ڈاکٹر ہینس کریمر نے مجھے مہاپانا اور زین کے فری پر وہ وہ لیکچر دیے ہیں کہ پڑا ہو گیا میرا۔ تمہاری موٹر میں تو صرف موسیو راول ہی تھے۔''

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے حد اداس ہو گئے۔

''یار گوتم۔''

''ہاں۔''

''یار کمال ہمیں دغا دے گیا۔'' ہری شنکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔

''تم کو پتا ہے سالا دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے آ کر وہیں مل لیتا۔''

''میں تو دلی میں موجود تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا۔'' گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

''جانے اس وقت وہ کہاں ہوگا؟'' ہری شنکر نے تاسف سے کہا۔

''کراچی میں ہوگا اور کہاں ہوگا۔'' گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور کمال الدین کس

طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

ندی رواں رہی۔ وہ دونوں جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔ گوتم نے ایک کنکر پانی میں پھینکا اور لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جس میں ان دونوں کے عکس پھیل سے گئے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونٹی پروجیکٹ کے سنٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یوتھ فیسٹول لیے کے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آ رہی تھیں۔ دور گاؤں کی چوپال میں نوٹنکی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آلہا اودل گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میلاد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول لائنز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یورپین مہمان ڈنر کھا رہے تھے۔

گوتم نے ایک الٹی ہوئی ناؤ پر پیر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شنکر کسی کسان سے باتیں کرتا کمیونٹی پروجیکٹ سنٹر کی طرف جا چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

اس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو دیکھا، بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی! وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھیگی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا: زمین، تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کے ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے کھیتوں کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاش او جو کی بالیو تا کہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو۔ جو کی الوہی بالیو............سمندر کی طرح اتھاہ رہو............وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پگڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہے چلاتے تھے بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔

منڈلی نے گایا۔

بنجر   آج   ہرے   رے

کھیتن میں ناج بھرے رے

جیون آج سپھل رے

اچھی دھان اچھی فصل رے

وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں:

ڈالوں کے بیچ بیچ پتیوں کے بیچ بیچ

موتین کی لالن کی لڑیاں اگائے ہو..........

اونیرے آئے ہو..........

وہ غور سے سنا کیا جب الفاظ اس کی سمجھ میں آئے اور تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔

چٹانیں، او الانش، گلیشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ..........ان سب میں سے گزرتا ہر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانوں بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش پر امید، انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو

قانون کا پرچار مبارک ہو

سنگھ میں امن مبارک ہو

ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو

جنہیں شانتی میسر آ گئی ہے

شاکینہ منی نے کہا............

وہ منڈیر پر سے اترا، اس نے لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی طرف واپس چلا گیا۔

ماری پور، کراچی

اگست ۵۶ء............دسمبر ۵۷ء

ختم شد________________The End